جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

فرحت اشتیاق

Ali Mian Publications

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

اٹلی کے شہر روم میں سکندر کی لیزا سے ہونے والی ملاقات کیا محض ایک اتفاق ہے یا سکندر کی زندگی پھر کسی امتحان سے دوچار ہونے والی ہے؟ اپنے جس ماضی کو وہ برسوں پہلے دفن کر چکا تھا کیا وہ ایک بار پھر زندہ ہو جانے والا ہے؟

کیا وہ اطالین آرٹسٹ لڑکی لیزا سکندر کی زندگی کے اندھیروں کو مٹانے اُس کی زندگی میں آئی ہے یا پھر ان اندھیروں کو بڑھانے؟

سکندر کو ہر رات نظر آنے والے خوفناک خوابوں کا آخر اُس کی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ وہ خوش کیوں نہیں ہو پاتا؟ وہ زندگی سے نفرت کیوں کرتا ہے؟ وہ مر جانے کی خواہش کیوں رکھتا ہے؟

تاریخی و رومانوی شہر روم سے شروع ہونے والی یہ داستان اپنے انداز میں سکندر اور لیزا دونوں کو اُن کے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے جائے گی۔ وہ ماضی جہاں محبت، نفرت، حسد، رقابت، جھوٹ اور دشمنی سب کچھ تھا۔ ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ محبت، نفرت، حسد اور رقابت کے جذبوں کے گرد گھومتی دل کو بے چین کر دینے والی داستان ہے۔

فرحت اشتیاق کے دیگر بہترین ناول

- ہمسفر
- دل سے نکلے ہیں جو لفظ
- وہ جو قرض رکھتے تھے
- بن روئے آنسو
- متاعِ جاں ہے تو
- تم جیتی ایسی لگتی ہو
- میرے ہمدم میرے دوست
- سفر کی شام
- جنوں تھا کے جستجو
- جدا ہے میرے ہمراز کا رنگ

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
E-mail:alimian_publications@yahoo.com

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

مکمل ناول

وہاں اندھیرا بہت تھا۔ ہیبت ناک سناٹا تھا۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ بھاگنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ ہاتھ پاؤں ہلا نہیں رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ کوئی تو آجائے اس کی مدد کے لیے۔ کوئی تو۔ کوئی تو آ کر اسے اس اندھیرے سے نکال دے۔ وہ رو پڑا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا، مگر اس ہیبت ناک سناٹے میں اس کی آواز سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اسے اندھیرے سے روشنی میں لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے رونے کی آواز میں کسی کے قہقہے کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

یہ کون تھا؟ کون اس کی بے بسی پر ہنس رہا تھا؟

بے چینی سے کروٹ بدلتے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم پہ ایک لرزش سی طاری تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد چاروں طرف نگاہیں گھمائیں۔ اسے اندھیرا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ روشن کیا۔ لیمپ روشن کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ لیمپ نے کمرے میں پھیلے اندھیرے کو کم کر دیا تھا مگر اسے یہ روشنی ناکافی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اس اندھیرے، اس سناٹے اور اس خاموشی سے وحشت ہو رہی

تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھا۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ اس نے سوئچ بورڈ کے پاس آکر کمرے کی تمام لائٹس آن کردی تھیں۔ یہاں تک کہ چھت پر لٹکتا فانوس بھی۔ ایک پل میں کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ روشنی ہوجانے کے بعد اس کی وحشت تو ختم ہوگئی تھی مگر گھٹن کا احساس ابھی بھی تھا۔ وہ کمرے کے دوسری طرف کھڑکیوں کے پاس آیا۔ اس نے ایک ایک کرکے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ پھر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے روم کی بالکونی میں آگیا۔ وہ بہت گہری گہری سانسیں لے رہا تھا' خود کو پرسکون اور نارمل کرنے کے لیے۔

اسے یاد آچکا تھا کہ وہ کسی اندھیری اور ہیبت ناک جگہ نہیں بلکہ یورپ کے ایک خوب صورت ملک میں ہے۔ وہ اٹلی میں ہے۔ وہ اس وقت روم کے ایک خوب صورت اور شان دار ہوٹل کے پرآسائش کمرے میں ہے۔ وہ ریلنگ پر بازو جما کر کھڑا ہوگیا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا' اس لیے سامنے نظر آتی سڑک پر اکادکا گاڑیاں گزرتی نظر آرہی تھیں۔ اس کا دل ابھی تک گھبرا رہا تھا۔

آخر یہ خواب اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

برس ہا برس ہوئے اس نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا تھا۔ اسے سونے سے خوف آیا کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا ادھر وہ سوئے گا' ادھر کچھ نہ کچھ برا ہوجائے گا۔ نیند سے فرار کی یہ کوششیں اتنی کامیاب ثابت ہوئی تھیں کہ اب جب وہ خود کو ایک مضبوط اور توانا مرد سمجھتا تھا' یہ سمجھتا تھا کہ اسے کسی بھی چیز سے ڈر نہیں لگتا' وہ رات کو پرسکون نیند سونا چاہتا تھا' تب اسے نیند لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہیں آتی تھی۔ وہ insomnia (بے خوابی) کا مریض ہوگیا تھا۔ وہ پوری پوری رات نیند کے آجانے کی کوششیں کرتے گزار دیا کرتا تھا۔ جب اس کیفیت کو بہت راتیں گزر جاتیں نیند نہ ہونے کی وجہ سے دن کے اوقات میں معمولات زندگی متاثر ہونے لگتے تو وہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ گولیاں لے لیا کرتا تھا۔ ان گولیوں کے ساتھ نیند اسے آجاتی تھی۔ مگر یہ نیند اپنے ساتھ بہت سے ڈراؤنے خواب بھی لے کر آتی تھی۔ غلط سوچتا تھا وہ کہ وہ خوابوں سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو ان خوابوں سے آج بھی اتنا ہی ڈرتا ہے جتنا بارہ سال پہلے ڈرتا تھا۔

چند منٹ گہری گہری سانسیں لینے کے بعد گھٹن کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بدن کی لرزش بھی بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔ وہ واپس کمرے میں آگیا۔ اس نے کھڑکیاں اور بالکونی کا دروازہ اسی طرح کھلے رہنے دیے تھے۔ وہ ٹی وی آن کرکے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے اپنے گرد آوازیں چاہیے تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک چینل تبدیل کررہا تھا۔ اٹالین میں آتے یہ پروگرام اسے قطعاً ”سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر وہ پھر بھی انہیں سننا چاہتا تھا۔ اب اپنے اندر کی وحشت اور سناٹا مٹانے کو باقی رات اس نے یہی کام کرنا تھا۔ زندگی کی بے شمار راتوں کی طرح یہ رات بھی جاگ کر صبح کا انتظار کرتے ہوئے گزارنی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ ایک نارمل انسان کی طرح آفس روانگی کے لیے تیار تھا۔ یوں جیسے رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بہترین تراش خراش والے سوٹ میں ملبوس ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ اس کی یہ تیاری دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خود سے اور ساری دنیا سے نفرت میں مبتلا ایک انسان ہے۔ وہ اندر سے کھوکھلا ہوچکا ہے۔ یہ سوٹ' یہ ٹائی' یہ سلیقے سے جمے بال' یہ ٹائی پن' یہ کف لنکس اور یہ بہترین جوتے دیکھ کر کون سوچے گا کہ وہ سکندر شہریار self destructive (خود تخریبی) اور suicidal temperament (خود کشی کا رجحان) رکھتا ہے۔ خود پر سے نفرت اور حقارت کی نگاہیں ہٹاتا وہ شیشے کے سامنے سے ہٹا۔ اس نے اپنا بلیک لیدر بریف کیس لیا' لیپ ٹاپ بیگ میں لیپ ٹاپ رکھا۔ وہ اپنے ہوٹل روم سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا ہوٹل via vittorio veneto

سے کچھ ہی فاصلے پر تھا جبکہ اس کا آفس barberini via پر تھا۔ گویا آفس اور اس کے ہوٹل کے بیچ میٹرو کے بس ایک ہی اسٹاپ کا فاصلہ تھا۔ مگر کل جب وہ ہوٹل سے آفس پہلے دن گیا اور آفس کی گاڑی نے اسے پک کیا تب محض ایک اسٹاپ کا یہ فاصلہ طے کرنے میں اسے سوا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں کی طرح ٹریفک جام روم کا بھی مسئلہ تھا۔ تب کل ہی اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ آئندہ وہ آفس میٹرو میں جایا آیا کرے گا۔ اس کے لیے یہ کوئی ناک کا مسئلہ نہیں تھا۔ روم کا انڈر گراؤنڈ ٹرین سسٹم لندن اور پیرس جتنا مربوط تو نہ تھا مگر پھر بھی ٹریفک جام میں پھنسنے سے بدرجہا بہتر تھا۔ یوں آفس جانے آنے کے لیے ملی گاڑی اور ڈرائیور والی سہولت کو اس نے پہلے دن ہی خیرباد کہہ دیا تھا۔

میٹرو اسٹیشن پر رش کا حصہ بنا وہ بھی ٹرین میں سوار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اردگرد کھڑے اور بیٹھے ہوئے رومن مردوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر کو اپنے کام پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ مگر اس جلدی اور بھاگ دوڑ والے انداز کے باوجود بھی ان میں سے کوئی ایک بھی اسے ایسا نظر نہیں آ رہا تھا جو خوش لباس نہ ہوتا۔ فیشن اور اسٹائل رومنوں کے لیے ایک بہت سنجیدہ بات ہے۔ عورتوں کے لباس، ان کا میک اپ، ہینڈ بیگز، سینڈلز، مردوں کے سوٹس، ٹائیاں، جوتے، بریف کیس ہر کچھ فیشن کے عین مطابق تھا، بے حد اسٹائلش تھا۔ ٹھیک ہی کہا جاتا تھا کہ رومنز بڑے classy اور اسٹائلش لوگ ہوتے ہیں۔ اسے اگلے ہی اسٹیشن پر اترنا تھا۔ اور اس کا اسٹیشن فوراً ہی آ گیا تھا۔ via barberini پر میٹرو اسٹیشن سے بہت نزدیک ہی اس کا آفس تھا۔

یہ اس کی دوہا میں اپنا ہیڈ آفس رکھتی ملٹی نیشنل کمپنی کا جنوبی یورپ میں واقع ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ آفس آ گیا تھا۔ وہ جن کاموں کی انجام دہی کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا ان میں مصروف ہو گیا تھا۔ آفس میں جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑ رہا تھا ان سے کل اور آج رسمی ہائے ہیلو کے بعد اس کی صرف اور صرف پروفیشنل نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی۔ کام کی بات، مکمل پیشہ ورانہ انداز میں۔

☼ ☼ ☼

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اسے یہاں سے جا کر کچھ نہیں کرنا تھا۔ اپنے ہوٹل روم میں بند ہو جانا تھا یا شاید روم کی گلیوں کوچوں میں تنہا پھرنا تھا اور اس میں سے کوئی بھی چیز اس کے لیے ایسی کشش نہ رکھتی تھی کہ وہ آفس سے جلدی اٹھنے کی خواہش رکھتا۔ مگر چونکہ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ ایک ایک کر کے سارا آفس خالی ہو رہا تھا سو وہ بھی آفس سے نکل آیا تھا۔

اسے راستے کا دو دن میں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اور اس کی جیب میں روم کا بڑا جامع نقشہ بھی موجود تھا گویا راستہ بھٹکنے کا امکان نہ تھا چنانچہ بجائے میٹرو اسٹیشن کی طرف جانے کے اس نے پیدل اپنے ہوٹل تک جانے کا فیصلہ کیا۔

یہ جون کا مہینہ تھا اور روم میں موسم خاصا خوش گوار تھا۔ سورج آج کل تقریباً پونے نو بجے غروب ہوا کرتا تھا سو ان دنوں یہاں شامیں بڑی لمبی تھیں۔ وہ via barberini سے via veneto کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد قدیم عمارتیں تھیں، فوارے تھے۔ مگر اسے روم کی ہسٹری میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ابھی بھی اس خواب کے حصار میں تھا۔ اب اگلے کئی روز اسے اس خواب کے حصار ہی میں رہنا تھا۔ اور اگلے کئی دن خوف کے سبب سونا نہیں تھا۔

اس نے آج صبح نہ تو ناشتا کیا تھا نہ ہی دوپہر میں لنچ۔ آفس میں خالی پیٹ کافی کے تین کپ ضرور پیے تھے۔ اسے سڑک کے کنارے ایک pizzeria نظر آیا، تب اسے اپنے آج تمام دن کچھ بھی نہ کھانے کا احساس ہوا۔ وہ یہاں سے پزا کھاتا ہوا چلا جائے پھر ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر رات گئے تک اپنا آفس کا کام کرتا رہے گا اس نے دل ہی دل میں طے کیا۔ ابھی چونکہ ڈنر ٹائم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس چھوٹے سے پزیریا میں اسے میزوں پر دو چار لوگ ہی بیٹھے نظر آئے۔ وہ سیدھا پزا آرڈر کرنے کاؤنٹر پر آ گیا تھا۔ مگر اٹلی میں اٹالین سیکھے بغیر اپنے لیے کچھ آرڈر کرنا اس قدر مشکل کام ہے اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

پزا آرڈر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو تقریباً دس منٹ گزر گئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے درمیانی عمر کے اٹالین مرد اور عورت انگریزی سے قطعاً ناواقف تھے۔ وہ دونوں مرد و عورت خوش اخلاقی سے مسکرا مسکرا کر اس کے انگریزی لفظوں کے جواب میں مختلف اشیا اٹھا اٹھا کر اسے دکھا رہے تھے۔

اچھا وہ اپنے پزا کی یہ topping چاہتا ہے، فلاں طرح کے مشرومز کا اضافہ چاہتا ہے، pomodoro چاہتا ہے۔ نجانے وہ اسے کیا کیا اٹھا اٹھا کر دکھا رہے تھے۔ ساتھ ان اشیا کے نجانے کیا کیا اٹالین نام لے رہے تھے۔ وہ دونوں تحمل سے اسے وقت دے رہے تھے۔

وہ اس بے کار کی مشقت سے بیزار ہو گیا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے ہوٹل جا کر کھانا کھائے۔ جہاں انگریزی سمجھی بھی جاتی ہے اور بولی بھی جاتی ہے۔ قریب تھا کہ وہ انگریزی ہی میں ان دونوں کا شکریہ ادا کرتا وہاں سے پلٹ جاتا کہ اچانک ہی بالکل پیچھے والی میز سے اٹھ کر ایک اٹالین لڑکی اس کے پاس آئی۔

"may I help you" (میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں) وہ بڑی شستہ انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ اس نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ اتنا وقت یہاں کھڑے ہو کر برباد کر چکا تھا تو اب یہاں سے کھانا کھا کر ہی جانا چاہیے۔ اس نے دل میں سوچا تھا۔

وہ ابھی اس لڑکی کو انگریزی میں یہ سمجھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ کس طرح کا پزا آرڈر کرنا چاہتا ہے کہ وہ بڑی روانی سے گٹ پٹ کرتی سامنے کھڑے مرد و خاتون سے اٹالین میں چند جملے بولی۔ جملے اگر الفاظ توڑ توڑ کر بھی بولے گئے ہوتے تب بھی اس کے سر کے اوپر ہی سے گزرنے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی عورت "si" کہتی، مسکراتے ہوئے اندر غالباً کچن میں چلی گئی تھی جبکہ مرد اس اٹالین لڑکی سے اٹالین ہی میں کچھ بات کرنے لگا تھا۔ وہ زبان غیر میں باتیں کرتے۔ ان دو افراد کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ مرد کے مسکرا مسکرا کر اپنی طرف دیکھنے سے اتنا اندازہ اسے ہو رہا تھا کہ گفتگو اسی کی بابت ہو رہی ہے۔

"یہ آپ سے معذرت کر رہے ہیں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔"

لڑکی اب اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ گویا اٹالین جملوں کا انگریزی ترجمہ سو خلاصہ بیان کیا گیا تھا۔

"میں نے آپ کا پزا آرڈر کر دیا ہے۔ اصل میں' میں اس ٹیبل پر بیٹھی تھی اور آپ کی ساری بات سن رہی تھی۔"

اس نے کاؤنٹر کے قریب ترین میز کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر اس میز کی طرف دیکھا۔ وہاں اس لڑکی کا چند لقمے کھایا پزا اور کولڈ ڈرنک کا ان چھوا گلاس رکھا ہوا تھا۔

"تھینکس!" اس نے پر تکلف انداز میں سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سا شکریہ ادا کیا۔

"آپ کے پزا میں کسی بھی طرح کا میٹ نہیں ہونا چاہیے میٹ اسٹاک بھی نہیں ہونا چاہیے اور وائن بھی نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کو بالکل سادہ مشرومز اور سبزی والا پزا چاہیے۔" وہ مسکرا کر اس سے بولی۔

"یس! تھینکس اگین" اس بار اس نے یہ الفاظ سنجیدگی سے کہے۔

"مائی پلیژر" وہ خوش اخلاقی سے مسکرائی۔

"آپ بل پے کر دیجئے گا پزا تیار ہو رہا ہے۔ دس سے پندرہ منٹ لگیں گے۔ تب تک آپ بیٹھ جائیں۔" وہ بل پے کرنے کے بعد اپنے لیے کوئی اور میز منتخب کر کے وہاں بیٹھنے کے ارادے سے مڑا تھا۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ کاؤنٹر سے ہٹی تھی مگر جیسے ہی کاؤنٹر سے ہٹ کر وہ اس لڑکی کی میز کے قریب پہنچے وہ اس سے بولی۔

"آئیے بیٹھیے۔" اس نے بالکل ابھی ابھی اس کی مدد کی تھی۔ وہ فوراً" بد اخلاقی دکھا کر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں دل میں اسے یہ پیش کش اور بے تکلفی گراں گزری تھی۔ بہرحال وہ مجبوراً" اور مروتاً" اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا' بے حد پر تکلف انداز میں۔

"نیکسٹ ٹائم آپ کو اپنے لیے کچھ آرڈر کرنا ہو یا کہیں سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے رہے ہوں اور ان کے اجزا دیکھنا چاہیں تو پورک کے لیے strutto کا لفظ یاد رکھیے اور وائن کے لیے vino کا۔ اور آپ کو یہ دونوں چیزیں اپنے کھانے میں نہیں چاہئیں۔ اس کے لیے senza کا لفظ استعمال کیجئے گا۔ یعنی آپ کہیں گے senza strutto vino۔"

وہ مسکرا کر اسے بتا رہی تھی۔ غالباً" اسے بلا وجہ اور بات بے بات مسکرانے کی عادت تھی۔ اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کا کسی سے بھی خوش اخلاقی دکھانے اور گفتگو کرنے کا موڈ نہ تھا مگر اس سے مدد لینے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ اس کا خمیازہ تو بھگتنا ہی تھا۔ اس نے سنجیدگی سے صرف اس کی بات سنی تھی۔ جواب میں کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ مگر اس باتونی لڑکی کو اس کے کچھ بولنے یا نہ بولنے سے یقیناً" کچھ فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے اسے مزید بتا رہی تھی۔

"اٹالین زیادہ مشکل زبان نہیں ہے۔ اٹالین کے بہت سے لفظ تو آپ یقیناً" پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ papuccino' espresso' gelato' pasta' pizza cafe' solo' paparazzi۔"

وہ اپنی آنکھوں پر لگے اسٹائلش گلاسز کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے بولی۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے بلیک کلر کی کیپری پینٹ' ریڈ کلر کے اسٹائلش ٹاپ کے ساتھ پہن رکھی تھیں۔ اس کے سلکی بال سرخی مائل براؤن کلر کے تھے اور اس نے ان کی اونچی کر کے پونی بنا رکھی تھی۔ لبوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگی تھی۔ اس کے خوب صورتی سے تراشے ناخنوں پر سرخ رنگ کی نیل پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے بلیک فریم والے اسٹائلش اور فیشن کے مطابق گلاسز دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا کہ یہ ڈیزائنر گلاسز ہیں۔ شاید ارمانی کے یا اسی کی ٹکر کے کسی اور ڈیزائنر کے۔ دیگر تمام اٹالینز کی طرح فیشن اور اسٹائل یقیناً" اس کے لیے بھی بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے انداز شاہانہ تھے اور اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ جب وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھی اس سے گفتگو کر رہی تھی تو بغیر کسی دلچسپی کے ہی سہی پر وہ اسے دیکھ تو رہا تھا۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا مردان کی میز پر آ کر اس کا پزا سرو

رہا تھا۔ وہ بڑی مسکراہٹ سے بولی تھی۔

"Grazie signore alberto"

البرٹو مسکراتا ہوا وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ "Grazie شکریہ کو بولتے ہیں' یہ تو پتا ہوگا ناں آپ کو؟"

"جی۔" اس کے طویل جملوں کے جواب میں اس کے جملے ایک یا دو الفاظ سے زیادہ طویل نہیں تھے۔

"البرٹو اور سلویا میاں' بیوی ہیں۔ اور میں چھوٹی سی تھی ناں جب سے یہ دونوں یہ پزیریا چلا رہے ہیں۔" جن معلومات کے حصول میں اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اسے وہ فراہم کر رہی تھی۔

اس گلے پڑی مصیبت سے پیچھا چھڑانے کا واحد طریقہ اسے یہ سمجھ میں آیا کہ اپنا پزا کھانا شروع کردے۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اس سے معذرت کر کے یہاں سے اٹھ جائے گا۔ سکندر کو کھانا شروع کرتے دیکھ کر اس نے بھی اپنا ٹھنڈا ہو چکا پزا کھانا شروع کردیا تھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا کہ پزا کھانے پزیریا آئے ہیں۔ آپ کو صحیح معنوں میں اٹالین پزا کا جو مزا ان چھوٹے چھوٹے پزیریا میں ملے گا' وہ بڑے ہوٹلوں میں نہیں مل سکتا۔ رومن پزا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا کرسٹ (crust) بڑا پتلا ہوتا ہے۔ اور اٹالین پنیر کا جو مزا آپ کو اس میں ملے گا' وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اٹلی سے باہر دیگر بیشتر ممالک میں جو پزا لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں' وہ عموماً "پزا کا امریکن ورژن" ہوتا ہے۔ ان بے چاروں نے کبھی اصلی اٹالین پزا کا مزا ہی نہیں چکھا ہوتا' اس لیے وہ اسی پر خوش ہو جاتے ہیں۔"

وہ اس طویل گفتگو میں دلچسپی رکھتا بھی ہے یا نہیں' اسے پزا کے اٹالین اور امریکن فرق معلوم کرنے میں کوئی دلچسپی ہے بھی یا نہیں اس سے بے نیاز وہ کھاتے ہوئے مسلسل بولنے میں مگن تھی۔ اس کی انگریزی بڑی رواں اور شستہ تھی۔ اس کا لہجہ برٹش تھا۔ مگر پھر بھی اس کی انگریزی میں کہیں کہیں اٹالین تلفظ کی ہلکی سی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پزا کھاتے ہوئے کچھ سوچ کر مسکرائی تھی۔

"اتنی دیر سے آپ کے ساتھ بیٹھی ہوں اور میں نے اپنا تعارف بھی نہیں کروایا" وہ جواباً "خاموش رہا۔ پزا کا نوالہ لیتے ہوئے اس نے محض خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔

"میں لیزا ہوں۔" وہ اب اس کی طرف ان نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ بھی اپنا تعارف کروائے۔

"سکندر۔"

"ٹورسٹ (سیاح) ہیں؟ روم گھومنے آئے ہیں؟"

"نہیں' آفیشل کام سے۔"

اب قبل اس کے کہ اس کا مزید تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ گفت و شنید جس میں اسے رتی برابر بھی دلچسپی نہ تھی' مزید ذاتیات کی طرف جاتی' وہ اپنے پزا کا آخری لقمہ کھا کر چھری اور کانٹا میز پر رکھتے ہوئے اس سے بولا۔

"آپ کا بہت شکریہ لیزا! آپ نے میری مدد کی۔ اب میں چلتا ہوں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے زبردستی چہرے پر مروت اور شائستگی کی مسکراہٹ سجائی ــــ وہ جواباً "خوش دلی سے مسکرائی تھی۔ اس نے چھری اور کانٹا پلیٹ پر رکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا

"چاؤ (ciao) سکندر۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" سکندر نے اس کا بڑھا ہاتھ مصافحے کے لیے تھام لیا تھا۔

"چاؤ لیزا۔" اس نے بھی اٹالین ہی انداز میں اسے خدا حافظ کہا' چہرے پر خوش اخلاقی والی ہلکی سی مسکراہٹ رکھتے۔

وہ اپنے ہوٹل کی طرف جانے والے راستے پر رواں تھا۔ وہ پتھروں سے بنی کئی سو سال قدیم اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ ارد گرد کئی کئی سو سال پرانی عمارتیں تھیں۔ اس سڑک پر بھی ایک فوارہ تھا۔ ایسا لگتا تھا روم کی ہر سڑک ہر گلی میں ایک فوارہ تھا۔ کئی جگہ یہ محض خوب صورتی کے لیے تھے اور کئی جگہ پانی پینے کے لیے۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں بنائے گئے یہ زیادہ تر اس زمانے میں لوگوں کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

بغیر راستہ بھٹکے وہ اپنے ہوٹل تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہوٹل کی بلڈنگ بھی سولہویں صدی میں کسی رومن بادشاہ کے لیے بنایا گیا ایک محل تھی جسے بعد میں نئے سرے سے تعمیر کرکے اس ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ ہوٹل میں تمام ترجدتیں اور جدید ترین سہولیات موجود تھیں مگر اس طرح کہ اس کی اصل شکل اور تاریخی حیثیت بھی برقرار رکھی گئی تھی۔

کھانا وہ کھا کر آچکا تھا۔ اب رات گئے تک اسے خود کو آفس کے کاموں میں مصروف رکھنا تھا۔ اس نے روم سروس کال کرکے اپنے لیے کافی منگوائی تھی۔ اور خود کو کاموں میں غرق کرلیا تھا۔ وہ گزری رات کے خواب کو آج کسی بھی قیمت پر سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دوپہر سے گھر سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ آج کل via barberini کے پاس ایک ذیلی کئی سو سال قدیم پتھروں سے بنی ایک ذیلی سڑک اور اس سڑک پر موجود سولہویں صدی میں بنائی گئی چند بلڈنگز کو پینٹ کر رہی تھی۔ وہ اپنا ایزل، کینوس، پینٹ اور برش لے کر دن کے ان اوقات میں وہاں لوگوں کی زیادہ آمدورفت نہیں ہوا کرتی تھی تب وہاں آجایا کرتی تھی۔ اس نے ہر ہر زاویے سے وہاں کی کئی تصاویر کھینچ رکھی تھیں۔ وہ ان تصاویر کی مدد سے بھی اس جگہ کو پینٹ کرسکتی تھی۔ مگر ایک تو اسے کسی بھی لینڈ اسکیپ کو اس کی اصل جگہ پر موجود رہ کر پینٹ کرنے میں مزا آیا کرتا تھا اور دوسرے اسے اپنے روم کی گلیوں میں وقت گزارنا اچھا لگا کرتا تھا۔ اگلے ماہ کے آخر میں فلورنس میں اس کی پینٹنگز کا سولو شو تھا۔

اس بار اس کا موضوع رومن لینڈ اسکیپ تھا۔ کچھ لینڈ اسکیپ بھی اسے پینٹ کرنے تھے۔ چار پانچ دن لگ کر اس کو اس پینٹنگ کے خدوخال یہاں آکر واضح کرنے تھے۔ باقی پھر نوک پلک سنوارنے کا کام گھر پر اپنے اسٹوڈیو میں کرنا تھا۔ نینی نے اسے بہت تاکید کرکے بھیجا تھا کہ وہ گھر سے بغیر کھانا کھائے جارہی ہے لہٰذا پینٹنگ شروع کرنے سے پہلے کہیں باہر سے لنچ کرلے۔ مگر کام کی دھن میں اسے کھانے پینے کی خواہش ہوا ہی نہیں کرتی تھی۔ یہاں دوپہر میں دکانیں اور بار بند ہوجاتے تھے اور لوگوں کی آمدورفت بھی قدرے کم ہوجاتی تھی۔ سو یہ وقت اسے پینٹنگ کے لیے اچھا لگا کرتا تھا۔

پانچ بجے کے قریب جب دفاتر کی چھٹی ہونے لگی اور لوگوں کی آمدورفت شروع ہوئی تو اس نے اپنا پورٹیبل ایزل اور دیگر سامان سمیٹ کر گاڑی میں رکھا تھا۔ سال کے ان مہینوں میں جب وہ روم میں ہوتی تھی تب اسے یہاں اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنا اچھا لگا کرتا تھا۔ ان یادوں میں البرٹو اور سلویا کا پزیریا بھی شامل تھا تب ہی وہ اکثر و بیشتر یہاں پزا کھانے چلی آیا کرتی تھی۔ اپنے بچپن میں وہ یہاں کتنا آتی تھی۔ اس نے گاڑی پزیریا کے پاس لاکر روکی تھی۔ وہ اندر آگئی تھی۔

اندر آتے ہی اسے ایک میز پر وہ بیٹھا نظر آیا تھا۔ وہ جس سے وہ کل یہاں پر ملی تھی۔ سکندر، جو شاید پاکستانی تھا یا شاید انڈین۔ خاموش خاموش سا، اپنے آپ میں گم سا۔

وہ آرٹسٹ تھی اور اسے حسن متاثر کرتا تھا۔ اور وہ شخص مردانہ حسن اور وجاہت کا مجسمہ تھا۔ اس کا چھ فٹ سے نکلتا قد، مضبوط جسم، چوڑا سینہ، گھنے سیاہ بال جن میں ہلکا سا خم تھا۔ اس کی پوری شخصیت، اس کے چہرے کا ہر نقش مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ گہری سیاہ آنکھیں جن میں مقناطیسیت تھی، ایک حزن تھا، اداسی تھی اور ایک اسرار تھا۔ اس کے ہونٹوں کا کٹاؤ بڑا خوب صورت تھا اس کا نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ سے زیادہ بھرا ابھرا تھا، اس کی پیشانی بہت چوڑی تھی۔ ناک آریائی نسل کے کسی فرد کی طرح بالکل سیدھی اور لمبی تھی۔ کل اس سے ملنے کے بعد جب اس نے

اس کے بارے میں یہ سب سوچ کر وہ خود ہی ہنس بھی پڑی تھی۔ وہ واقعی پکی آرٹسٹ تھی۔ اسے راستے میں ملتے، آتے جاتے لوگوں کو بھی بغور ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت تھی۔ گھر جا کر اس کی نینی سے گپ شپ ہوئی پھر سیم کا فون آ گیا اور وہ اس غیر معمولی مردانہ حسن و وقار لیے چہرے کو بھول گئی۔ مگر اس وقت اسے دیکھ کر اسے وہ پھر سے یاد آ گیا تھا۔ کیا خوب ہو اگر وہ اس چہرے کو پینٹ کر سکے۔

وہ خوش دلی سے مسکراتی اس کی میز کے نزدیک آ گئی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنا پزا کھانے میں مصروف تھا۔ جلدی جلدی جیسے کھانے کو انجوائے نہ کر رہا ہو۔ بلکہ کوئی ضرورت پوری کر رہا ہو۔ وہ اس کے پاس آ گئی تھی۔

"سینیور سکندر!" اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا۔

"چاؤ (ciao)" جواباً" مسکرایا نہیں تھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچانا نہ ہو۔ صرف ایک دن میں تو کوئی کسی کو نہیں بھول سکتا' وہ دل ہی دل میں حیران ہوئی۔

"کیسا اتفاق ہے۔ ہم آج پھر ایک ہی وقت پر یہاں موجود ہیں۔" وہ عادتاً" مسکرا کر بولی۔

وہ ہنسنے ہنسانے والی زندہ دل سی لڑکی تھی۔

وہ جواباً" اسے خاموش اور اجنبی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

جب اس نے مروتاً" اور اخلاقاً" بھی اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت نہ دی تو کچھ ڈھیٹ بن کر اس نے خود ہی پوچھا۔ کیا واقعی وہ اسے نہیں پہچانا تھا؟ کل وہ اتنی دیر تک ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھ کر پزا کھایا تھا۔ اسے اس کا پزا آرڈر کرنے میں مدد کروانے کے لیے اس نے اپنا پزا ٹھنڈا تک ہو جانے دیا تھا۔

"یہاں کئی اور میزیں خالی ہیں' آپ وہاں بیٹھ جائیں۔" وہ سنجیدگی سے اسے کھرا صاف انکار کر کے دوبارہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگا تھا۔

اس کا لہجہ یا الفاظ بدتمیزی والے نہیں تھے مگر سرد' خشک اور سپاٹ ضرور تھے۔ وہ اس کی وہاں موجودگی سے بے نیاز سر جھکا کر دوبارہ کھانا کھا رہا تھا۔ اپنی اس عزت افزائی پر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ شرمندہ سی ہوتے وہ ایک دم ہی خاموشی سے اس کی میز کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ شرمندگی اور غصہ محسوس کرتی وہ کاؤنٹر پر آ کر البرٹو سے بات کرنے لگی تھی۔

البرٹو کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں تھی کہ اسے کیسا پزا چاہیے۔ وہ یہاں آ کر ہمیشہ ایک ہی طرح کا پزا کھایا کرتی تھی۔ البرٹو سے ہائے ہیلو اور خیر و عافیت دریافت کرتے اس نے مڑ کر دیکھا تو جس میز پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ اب خالی تھی۔ وہ اپنا کھانا ختم کر کے وہاں سے جا چکا تھا۔

وہ اس کی بداخلاقی اور بدتہذیبی پر حیران تھی۔ لگتا تو اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ پھر اس درجہ بدتہذیبی؟ وہ حیران بھی ہوئی تھی اور اس کا موڈ بھی خراب ہوا تھا۔ یہ خراب موڈ اس وقت مزید خراب ہو گیا تھا جب گھر آتے ہی اس نے وٹوریا کی کال ریسیو کی۔ اپنی ماں سے بات کرنا اس کے لیے کبھی بھی خوش گوار ثابت نہیں ہوا کرتا تھا۔ سو ایسا ہی آج بھی تھا۔ پہلے منٹ اس کی خیریت پوچھنے اور اس سے محبت کا اظہار کرنے کے بعد اگلے منٹ وہ اپنے اصل مقصد اور کام کی بات پر آ گئی تھیں۔

"میں rehab centre (بحالی صحت سینٹر) سے آ گئی ہوں۔ اب اپنی ساری زندگی الکحل کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ مجھے کچھ پیسے چاہئیں لیزا۔ جیسے ہی مجھے جاب ملے گی میں تمہارے پیسے واپس کر دوں گی۔"

اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ آئی تھی۔ محبت میں' پیار میں' یاد آنے پر وہ کبھی بھی یاد نہیں کی جاتی تھی۔ جب پیسوں کی ضرورت پیش آتی تھی تب یاد آیا کرتی تھی۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اس کی ماں کی اپنے چوتھے شوہر سے بھی گزشتہ سال طلاق ہو چکی

تھی۔ اور اس درجہ شراب نوشی ہی کے سبب آئے دن ان کی ملازمت ختم ہو جایا کرتی تھی۔ پچھلے پانچ سالوں میں وہ پانچ ہی مرتبہ علاج کے لیے جا چکی تھیں۔ ہر بار وہاں سے واپس آکر اس عہد کو دہراتی تھیں کہ اب شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گی مگر چند ہفتے بھی نہیں گزر پاتے تھے انہیں اپنے عہد پر قائم رہتے۔

اسے وٹوریا سے کوئی تلخ یا کڑوی بات کرنا بے معنی محسوس ہوا تھا۔ لڑا تو وہاں جاتا ہے جہاں کچھ امیدیں ہوتی ہیں، محبتیں ہوتی ہیں۔ اس کا اپنی ماں سے کبھی ماں اور بیٹی والا تعلق رہا ہی نہیں تھا۔ جب اس کے پاپا سے انہوں نے طلاق نہیں لی تھی، جب وہ سب ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ تو تب بھی کبھی اسے اپنی ماں نہیں لگی تھیں۔

"میں پیسے بھجوا دوں گی۔"

وٹوریا میلان MILAN میں رہتی تھیں اور سال کے جن مہینوں میں ان کے پاس نوکری نہیں ہوتی تھی تب وہ اس سے اسی طرح فون پر رابطہ کیا کرتی تھیں۔ اسے غصہ بھی تھا، وہ دکھی بھی تھی مگر اس نے کل ہی آن لائن اپنی ماں کے اکاؤنٹ میں پیسے ڈلوا دیے تھے۔

"دنیتی! مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

وہ کچن میں ڈنر کی تیاری کرتی نینی کو اطلاع دیتی اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آگئی تھی۔ وہ اداس تھی، بچپن کی بہت سی محرومیاں تازہ ہو گئی تھیں۔ وہ بے دلی سے کینوس پر رنگ بکھیر رہی تھی تب ہی فون کی بیل بجی تھی۔

"وسیم" کال کرنے والے کا نام دیکھتے ہی اس کی اداسی ایک لمحے میں دور ہو گئی تھی۔ اس نے لپک کر کال ریسیو کی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے سیم! کہ اس وقت مجھے تمہاری ضرورت ہے؟" اس کے لہجے میں بہن کے لیے والہانہ محبت اور شدتیں تھیں۔

"میرا دل مجھے بتا دیتا ہے۔" وہ جواباً "کھلکھلائی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سیم کی کھلکھلاتی، زندگی سے بھرپور آواز سن رہی تھی۔

اس سے اگر کوئی سچا پیار کرتا تھا، کسی کو اگر اس کی پروا بھی تو وہ صرف اور صرف سیم تھی۔ کہنے کو وہ اس سے صرف ایک سال بڑی تھی مگر اس کی یوں پروا کرتی، یوں اس کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔ بچپن میں جب ان دونوں بہنوں نے ماں اور باپ دونوں کی جانب سے عدم توجہ کا دکھ سہا تھا، تب اس کی پروا کرتی، اس سے بے تحاشا محبت کرتی سیم بہن اور دوست ہونے کے ساتھ ساتھ جیسے اس کی ماں اور باپ بھی بن گئی تھی۔ جیسے ماں باپ اپنے بچوں کی پروا کرتے ہیں ایسے وہ اس کی پروا کیا کرتی تھی۔

"کیسی گزر رہی ہیں تمہاری چھٹیاں؟" سیم نے اس سے پوچھا۔

"مزے میں۔ سیم تم بھی آجاؤ روما۔" دیگر تمام اٹیلینز کی طرح وہ بھی روم کو روما کہا کرتی تھی۔ اور اپنے روما سے اسے عشق تھا۔

"دم بھی تو میں آفس کے کام سے ترکی جا رہی ہوں لز۔ اگر کام جلدی ختم ہو گیا تو آجاؤں گی تمہارے پاس۔"

وسیم نے عادت کے مطابق اسے اس کے نک نیم سے پکارا۔ یہ نک نیم اسے دیا بھی اسی نے تھا اور اس سے پکارا بھی وہی کرتی تھی۔ اس نے سیم کو ماں کے فون کی بابت بتایا۔ سیم اس کے مقابلے میں بہت مضبوط اور بہادر تھی۔ وہ اب بھی بردباری اور پیار سے سمجھا رہی تھی۔

"کیوں ممی پاپا کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا دل دکھاتی ہو لز؟ وہ دونوں جیسے ہیں ایسے ہی رہیں گے۔ ممی کو پیسے بھجوا دو مگر پلیز یہ سوچنا اور دل جلانا چھوڑ دو کہ وہ ایسی کیوں ہیں۔ تم روما اپنی چھٹیاں انجوائے کرنے آئی ہو۔ خوب انجوائے کرو۔ اور اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری کتنی پینٹنگز مکمل ہو گئیں؟"

سیم نے اس کا موڈ تبدیل کرنے کے لیے فوراً ہی گفتگو کا موضوع اس کی سولو ایگزیبیشن کی طرف موڑ دیا تھا۔ سیم سے اس پورے ایک گھنٹے بات ہوتی رہی تھی۔ اور ایک گھنٹے بعد جب وہ فون بند کر رہی تھی تب

اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ گھنٹہ بھر پہلے وہ کس بات سے اداس اور دکھی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آفس میں وہ اور روبرٹو ساتھ بیٹھے ایک کانٹریکٹ پر نظرثانی کررہے تھے۔ روبرٹو بھی اسی کی طرح ان کی کمپنی میں ایک لیگل ایڈوائزر تھا۔ جنوبی یورپ میں ان کی کمپنی کی جو لیگل ٹیم کام کررہی تھی اس کا ایک ذہین وکیل۔

وہ دونوں انتہائی سنجیدگی سے آپس میں پیشہ ورانہ گفتگو کررہے تھے جب روبرٹو کے آفس کے دروازے پر ایک کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس آفس میں اپنے عارضی قیام کے دوران اسے ایک علیحدہ کیبن فراہم کیا گیا تھا۔ مگر کسی نہ کسی ڈسکشن یا میٹنگ کے لیے اس کا زیادہ وقت روبرٹو کے آفس ہی میں گزرتا تھا۔

اس نے اور روبرٹو دونوں نے ''giorno buon'' کہتی اس خوب صورت نسوانی آواز کی طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ انہیں صبح اور دن کے وقت کا اٹالین میں سلام کرتی لڑکی کوئی اور نہیں اسے پزیریا میں ملی لڑکی ہی تھی۔ کیا روم اتنا چھوٹا شہر تھا جہاں یہ لڑکی اسے بلاوجہ بار بار ٹکرا رہی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر خوامخواہ ہی چڑا۔ وہ زبردستی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھی اور یہ چیز اسے اس لڑکی سے چڑوا رہی تھی۔

''چاؤ لیزا۔'' روبرٹو گرم جوشی سے مسکراتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا تھا۔ وہ انتہائی پرتپاک اور دوستانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کررہا تھا۔

''میں اندر آجاؤں؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آؤ بیٹھو۔''

سکندر نے ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد فوراً ہی کانٹریکٹ کے صفحات اپنے سامنے کرلیے تھے۔ وہ سنجیدگی سے ان کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔ مگر وہ محسوس کررہا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئی ہے۔

''اس لیے پوچھ رہی تھی کہ کہیں تم بزی نہ ہو۔'' لیزا روبرٹو کو جواب دیتی سکندر کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ روبرٹو اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں اٹالین میں بات کررہے تھے اور اسے سلام سے ہٹ کر ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ہاں یہ ضرور پتا چل رہا تھا کہ وہ دونوں آپس میں بے تکلف ہیں، غالباً دوست ہیں۔

''ہائے۔'' چونکہ اس بار اسے مخاطب کیا گیا تھا اس لیے اسے کانٹریکٹ پر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا پڑا۔

''ہائے۔'' وہ جواباً سنجیدگی سے بولا۔

''آپ نے پہچانا مجھے؟'' وہ اس سے انگریزی میں مخاطب تھی۔ یہ سوال اس نے بظاہر مسکرا کر پوچھا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا وہ اس روز پزیریا میں اس کے اسے نہ پہچاننے کا تاثر دینے کا قدرے جتانے والے انداز میں حوالہ دے رہی تھی۔

''جی۔ آپ لیزا ہیں۔ آپ نے پزیریا میں مجھے پزا آرڈر کرنے میں مدد کی تھی۔'' وہ چہرے پر بغیر شرمندگی کا کوئی تاثر لائے اسی سنجیدگی سے بولا۔

''میں آپ کو یاد ہوں؟ میں سمجھ رہی تھی شاید آپ مجھے پہچانے نہیں ہیں۔'' وہ پھر مسکرا کر درپردہ طنز کررہی تھی۔

روبرٹو جو ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، فوراً مسکرا کر بولا تھا۔

''آپ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ یعنی میں تعارف کروانے والی خوار میلٹی سے بچ گیا۔''

لیزا اس کی بات پر مسکرائی۔ بلاوجہ اور بات بے بات مسکراتے رہنے سے یہ لڑکی تھکتی نہیں تھی اس نے کوفت سے سوچا۔ روبرٹو اب اس سے مخاطب تھا۔

''اس تعارف میں بس یہ اضافہ کرلو سکندر کہ لیزا میری بچپن کی دوست ہے۔ ویسے میں اس سے چار سال بڑا ہوں۔ ہم اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ میں اسکول میں اس سے سینئر تھا مگر ہماری دوستی بہت

تھی۔" اب اس کی وجہ سے کمرے میں انگریزی بولی جارہی تھی۔

"بہت سے لوگ تو اس غلط فہمی تک میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم بوائے فرینڈ گرل فرینڈ ہیں۔"

لیزا ہنس کر روبرٹو اور اس کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔

روبرٹو اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"اور ہم دونوں لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے بجائے اس پر خوب ہنسا کرتے تھے۔"

وہ سکندر کو بتا رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص پُر تکلف انداز میں بہت ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔ شائستگی اور مروت کا مظاہرہ کرتا ہوا۔

"میرا تعارف تو پورا ہو گیا۔ اب تم سکندر صاحب کا بھی مکمل تعارف کروا دو۔ میں ان کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان کا نام سکندر ہے' یہ اپنے کسی آفیشل کام سے روما میں ہیں اور انہیں ویجز اور مشروم والا پیزا پسند ہے۔"

اس لڑکی کی نان سیریس باتیں اور بلاوجہ فری ہونا اسے کس قدر برا لگا کرتا ہے۔ کاش روبرٹو یہاں نہ ہوتا تو وہ اسے بتاتا۔

"سکندر روما میں ہماری کمپنی کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ بہت ہی قابل اور ذہین لائر ہیں۔ آفس ہی کے کام سے دو تین ہفتوں کے لیے روم میں ہیں۔" روبرٹو لیزا کو بتانے لگا۔ اب اس وقت کانٹریکٹ کا کچھ کام تو ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ روبرٹو سے معذرت کر کے اپنے کیبن میں چلا جائے' ان دو دوستوں کو گفتگو کرتا چھوڑ کر کہ لیزا روبرٹو سے انگریزی ہی میں بولی۔

"میٹنگ میں ابھی دیر ہے۔ میں کچھ جلدی آ گئی۔ میں نے سوچا میں پہلی مرتبہ تمہارے آفس آئی ہوں۔ تم یقیناً" مجھے اپنے ساتھ لنچ کرنے کی دعوت دو گے۔"

وہ مسکرا کر بے تکلفی سے بولی تھی۔ روبرٹو پھر [illegible]

کہنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"لنچ ٹائم تو ہو ہی گیا ہے۔ چلو سکندر! کہیں باہر چل کر لنچ کرتے ہیں ہم تینوں۔"

روبرٹو نے اسے بھی لنچ کی دعوت دی تھی۔ اسے اپنا پروفیشنل سنجیدہ اور لیا دیا انداز برقرار رکھنا تھا وہ انکار کر کے بچکانہ پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ دونوں یہ تاثر لیں کہ وہ لیزا کو قصداً" اگنور کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے انکار کر رہا ہے۔

"اوکے چلو۔" اس نے سنجیدگی سے چلنے کی ہامی بھری تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس سے قریب ہی ایک ریسٹورنٹ میں وہ تینوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی ان کا لنچ سرو نہیں کیا گیا تھا۔ ویٹر نے سب سے پہلے ایک باسکٹ جس میں کئی طرح کے رولز رکھے ہوئے تھے اور ایک باؤل جس میں اولیو آئل تھا' ان کی میز پر لا کر رکھا۔

وہ دو اٹالین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ اٹلی کے لوگ اپنے کھانے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں۔ لیزا اور روبرٹو نے اپنی اپنی پلیٹوں میں ایک ایک رول اٹھا کر رکھا تھا۔ وہ رول کے ٹکڑے ہاتھوں سے توڑ توڑ کر اولیو آئل میں ڈبو رہے تھے اور اسے مزے لے کر کھا رہے تھے۔ اسے بھی آفر کی گئی تو ان کے کھانوں کے طور طریقوں کا ساتھ دینے کے لیے چند نوالے رول کے اس نے بھی اولیو آئل میں ڈبو کر کھا لیے تھے۔

اسی دوران ان کا آرڈر کردہ کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔ وہ فرائیڈ مشرومز اور پاستا کھا رہا تھا۔

"اس کے اس نان سیریس سے (attitude) پر نہ جانا یہ کافی سنجیدہ قسم کی آرٹسٹ ہے۔ اور خاصی مہنگی بھی۔"

روبرٹو لیزا کی طرف دیکھ کر سکندر سے ہنستے ہوئے بولا۔ وہ اسے اس کی معلومات میں اضافے کے لیے بتا رہا تھا کہ گزشتہ دنوں ان لوگوں نے اپنے آفس کا

انٹریئر دوبارہ کروایا ہے۔ اس نئے انٹریئر میں بورڈ روم اور ریسپشن ایریا کی دیواروں پر چند پینٹنگز کا بھی اضافہ کیا جانا ہے تاکہ ایک اچھا آرٹسٹک لک بن سکے۔ اس مقصد کے لیے کسی اچھے آرٹسٹ سے ان کی کمپنی کو رابطہ کرنا تھا اور روبرٹو کے مشورے پر انہوں نے لیزا سے رابطہ کیا ہے آج اسی حوالے سے لیزا کی ان کی کمپنی کے کچھ سینئر ایگزیکٹیوز کے ساتھ میٹنگ ہے، جس میں ان پینٹنگز کا موضوع اور معاوضہ طے کیا جانا تھا جو لیزا انہیں بنا کر دے گی۔

"دیکھو پتا نہیں یہ ہم سے اپنی صرف ایک پینٹنگ کے لیے کیا ڈیمانڈ کرتی ہے۔" لیزا جواباً ہنسی تھی۔

"اب مہنگی آرٹسٹ کے نخرے تو ہوں گے نا؟"

روبرٹو کو جواب دینے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"تمہیں آرٹ میں انٹرسٹ (دلچسپی) ہے؟"

اس بار اس کے لہجے اور الفاظ میں نمایاں بے تکلفی تھی۔ اس نے جیسے از خود ہی یہ فرض کر لیا تھا کہ اگر وہ اس کے بچپن کے دوست کا کولیگ نکل آیا ہے تو وہ اس کے ساتھ بے تکلف ہو کر بات چیت کر سکتی ہے۔

"نہیں۔ مجھے بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔"

فورک سے پاستا کھاتے ہوئے اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ لیزا نے بغور اسے دیکھا تھا، پتا نہیں کیوں۔

"تم Destiny (تقدیر) پر یقین رکھتے ہو سکندر؟"

کچھ دیر کے بعد روبرٹو سے بات کرتے کرتے لیزا نے اچانک اس سے پوچھا تھا۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اسے اس کا دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں بات کرنا گراں گزر رہا تھا۔ مگر وہ اس کا اظہار اپنے چہرے سے ہونے نہیں دے رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے پہلے پزیریا اور اب روبرٹو کا آفس، یہ تقدیر ہی ہے نا جو ہم بار بار کہیں نہ کہیں مل رہے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں شاید۔" اس نے شانے اچکا کر بے نیازی سے مبہم انداز میں کہا۔ چونکہ انہیں آفس جلدی واپس پہنچنا تھا، اس لیے بقول روبرٹو کے وہ لوگ لنچ جلدی ختم کر کے اٹھ رہے تھے۔ اپنے حساب سے اس نے لنچ کرنے میں ایک گھنٹہ ضائع کر دیا تھا۔ جبکہ کھانا دس سے پندرہ منٹ کے اندر کھا لیے جانے والی چیز تھی۔

روبرٹو ہنستے ہوئے اسے بتا رہا تھا، آفس ٹائمنگ کے دوران بھی ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا لنچ اٹالینز کے لیے بڑی عام سی بات تھی۔ وہ لوگ ریسٹورنٹ سے اٹھ رہے تھے، جب لیزا نے اسے اپنا فون نمبر دیا۔

"کیا پتا کبھی تمہیں آرٹ میں دلچسپی ہو جائے اور تم مجھ سے کوئی پینٹنگ بنوانا چاہو۔" وہ بلاوجہ بے تکلف ہوتی مسکرا کر بولی تھی۔

"یا قسمت تم دونوں کو ملوانا چھوڑ دے اور تم لیزا سے ملنا چاہو۔" روبرٹو مسکرا کر بولا تھا۔ وہ لیزا کو چھیڑ رہا تھا۔

لیزا ہنسی تھی۔ "ہاں بالکل۔"

وہ تینوں آفس آ گئے تھے لیزا اپنی میٹنگ کے لیے چلی گئی تھی، جبکہ وہ آتے کے ساتھ ہی اپنے کیبن میں آ گیا تھا۔ اس طویل لنچ میں اچھا خاصا وقت برباد ہو گیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے فوراً اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔"

اگلے روز وہ اور روبرٹو آفس میں ساتھ بیٹھے تھے۔ کام کے دوران جب کافی کے لیے وقفہ کیا گیا تب کافی کے گھونٹ لیتا روبرٹو اپنی بیوی اور بچے کی بات کرتے کرتے ایک دم ہی لیزا کے بارے میں بات کرنے لگا۔ یا وہ خود ملتی رہے گی یا پھر اس کا ذکر ہوتا رہے گا۔ ایسے جیسے پتا نہیں وہ کتنی اہم شخصیت ہے۔ اس نے دل میں بے زاری اور کوفت محسوس کی، پر چہرے پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

"اسے بڑی لاابالی، لاپروا اور غیر سنجیدہ سی لگتی ہے،"

مگر وہ دو مردوں کی بہت پروا کرنے والی بڑی پیاری لڑکی ہے۔ پتا ہے سکندر لاسٹ ایئر جب میری بیوی پریگننٹ تھی' ڈلیوری کا ٹائم بالکل قریب تھا' تب اچانک ہی مجھے آفس کے کام سے تین' چار دنوں کے لیے اسپین جانا پڑ گیا تھا۔ میں اپنی بیوی کے لیے فکر مند تھا۔ میں اس کی ماں اور بہن سے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گیا تھا۔ لیزا ان دنوں چھٹیوں میں روم آئی ہوئی تھی۔ جانتے ہو' جس روز میری بیوی کو اسپتال جانے کی ضرورت پڑی تب اس کی ماں اور بہن سے بھی پہلے لیزا اس کے پاس پہنچی تھی۔ وہ اسے اسپتال لے کر گئی تھی۔"

اس قصے میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ مگر جب اسے قصے ہی میں کوئی دلچسپی نہ تھی تو کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی کہاں تھی۔ اس نے محض سر ہلا کر یہ تاثر دیا تھا کہ اس نے روبرٹو کی لیزا کے متعلق ساری بات سن لی ہے۔

☆ ☆ ☆

اسے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ چلا رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اسے اندھیرے سے نکلنا تھا۔ کوئی کیوں نہیں آرہا اسے اندھیرے سے نکالنے' وہ مدد کے لیے چلا تا' بری طرح رو رہا تھا۔ اسے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہاں کوئی تھا جو اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس پر قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔

وہ بے چینی اور اضطراب میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ پورا کا پورا پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سوتے میں کہیں چلے جانے' کہیں بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لبوں سے بہت ہلکی ہلکی بچاؤ' بچاؤ اور ہیلپ' ہیلپ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ بے چینی سے ہاتھ پاؤں چلاتے اس نے یک دم ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"سکندر! میں چاہتا ہوں تم ہارورڈ میں ایڈمیشن لو۔" کھانے کی میز پر وہ چاروں موجود تھے۔ شہریار خان سکندر سے مخاطب تھے۔

"ہارورڈ سے گریجویشن کے بعد پھر وہیں سے لاء پڑھو۔"

"جی پاپا۔" وہ مؤدب بنا جواباً گردن ہاں میں ہلا کر بولا تھا۔

زین نے اسے بغور دیکھا تھا۔ اسے سکندر کی فرماں برداری اور سعادت مندی والی اس اداکاری سے نفرت تھی۔ پاپا کے سامنے اتنا اچھا بن کر آخر وہ خود کو کیا ثابت کرنا چاہتا تھا؟ ان کی امی جان' شہریار خان کے آگے مختلف ڈشز رکھ رہی تھیں۔ وہ اسی طرح شوہر کی خدمت میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ شہریار خان اس گھر کے حاکم اعلا تھے۔ جو وہ پسند کرتے تھے وہ یہاں ہوا کرتا تھا جو ناپسند کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی وہ کر سکتا۔ بے کار سی امید تھی' پھر بھی وہ امید سے باپ کی طرف دیکھتا رہا شاید ابھی وہ اس کے بارے میں بھی اپنی کسی خواہش کا اظہار کریں۔ "زین میں چاہتا ہوں تم یہ پڑھو زین تم فلاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا۔" مگر اس کی حسرت' حسرت ہی رہی تھی۔ سکندر' شہریار کے آگے انہیں وہ نہ کبھی نظر آیا تھا' نہ ہی آ سکتا تھا۔ وہ سنجیدگی سے سکندر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ اس کے کیریئر' پروفیشن اور مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کیا کیا پلان کر رکھا ہے' وہ یہ سب کچھ سکندر کو بتا رہے تھے اور وہ۔ جی پاپا' اچھا پاپا اور اوکے پاپا کہتا ان کے ہر پلان سے اتفاق کر رہا تھا۔

سکندر کی تمام تر کیریئر پلاننگ شہریار خان نے کر رکھی تھی' جبکہ زین شہریار کے لیے ان کی کوئی کیریئر پلاننگ نہ تھی۔ وہ جہاں پر بھی پڑھنا چاہے اور جو کچھ بھی پڑھنا چاہے' انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ پیسہ اس پر بھی خرچ کریں گے' مگر اس کے لیے ان کے اس طرح کے کوئی خواب نہ تھے جیسے سکندر کے لیے اور ان کے گھر کی اس ugly duckling نے ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دے دینا تھا جو وہ اس سے امیدیں اور آس باندھتے۔ ان کی امیدوں کا مرکز تو ان

کا اٹھارہ سالہ ولی عہد شہزادہ سکندر شہریار تھا۔ وہ اپنے اندر بہت سی کڑواہٹ محسوس کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد کمرے میں آگیا تھا۔ عجیب سی ایک سوچ اس کے اندر آئی تھی۔ کاش ایسا ہو سکندر کا ہارورڈ میں داخلہ نہ ہوسکے۔ گو ناممکن سی بات تھی، پھر بھی وہ سوچ رہا تھا سکندر ہمیشہ ہی تو فاتح عالم نہیں ہوا کرتا۔ سکندر کبھی ہار بھی تو جاتا ہے، تو اب کی بار کیوں نہیں؟

☆ ☆ ☆

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں تمام افراد غیر معمولی تھے۔ high achievers تھے۔ اس کے دادا، اس کے پاپا، اس کا بھائی۔ اس کے پاپا بڑے فخریہ انداز میں اپنے والد کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں کیمبرج پڑھنے گئے تھے، جب کسی کا بچہ اگر میٹرک پاس کرلیا کرتا تھا تو ماں، باپ کے خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ اس زمانے میں نہ صرف یہ کہ کیمبرج میں پڑھ کر آئے تھے بلکہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ذہانت و قابلیت کا سکہ جما کر آئے تھے۔ پھر اس کے پاپا جو ہارورڈ کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ وہاں کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ اس کے پاپا ایک مغرور آدمی تھے۔ ایسے ویسے لوگ اور ایسی ویسی کارکردگی تو ان کی نگاہ میں جچ ہی نہ سکتی تھی۔ وہ اپنے اونچے خاندان، اعلا نسب اور اپنی خاندانی ذہانت و قابلیت پر فخر کیا کرتے تھے۔

"پیسہ تو بہت لوگ کما لیتے ہیں۔ پیسہ ہونا خوبی کی بات نہیں، خوبی کی بات تو آپ کا اعلا نسب اور اعلا علمی و تعلیمی قابلیت کا ہونا ہے۔ ان دو چیزوں کے ساتھ آپ نے پیسہ بھی کما لیا ہو تو یہ اصل فخر کی بات ہے۔" اس نے بچپن سے اپنے پاپا کے منہ سے یہ ہی جملے سنے تھے۔

مگر دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کے طے کردہ معیار کے مطابق ذہین و قابل نہ تھا۔ وہ غیر معمولی قابلیت، ذہانت اور مثالی وجاہت کی حامل اپنی فیملی میں شاید بدصورت ہی ٹھہرتا۔

اس کے والد ایک بے تحاشا ہینڈسم آدمی تھے۔ ایک بھرپور مردانہ و رعب دار شخصیت کے حامل، مضبوط جسم، لمبا قد، چوڑا سینہ، چہرے پر گھنی مونچھیں، گہری سیاہ آنکھیں جن میں خوب صورتی اور ذہانت دونوں چھلکتی تھیں۔ لمبی مغروریت لی ناک، کشادہ پیشانی۔ وہ چلتے تو یوں لگتا کسی ریاست کا حاکم چلا آرہا ہے۔ بولتے تو ان کی شخصیت کے رعب بھاری مردانہ آواز اور جاہ و جلال کے آگے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جایا کرتا۔

وہ زندگی میں ہر جگہ، ہر میدان میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ ورلڈ بینک میں ایک انتہائی اونچی اور اہم پوسٹ پر جاب کررہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں پاکستان میں اپنے خاندانی بزنس کو سنبھالنا تھا، جسے ابھی اس کے دادا سنبھال رہے تھے۔

شہریار خان کی ملازمت کے سبب وہ لوگ واشنگٹن میں رہتے تھے۔ ان کی فیملی چار افراد پر مشتمل تھی۔ شہریار خان، ان کی ماں جنہیں وہ بھائی امو جان بلایا کرتے تھے اور وہ دونوں بھائی۔

ان کی ماں ایک بڑی ہی نرم خو اور مہربان خاتون تھیں۔ دھیمے سروں میں بولنے والی، ہر ایک سے ہمدردی کرنے والی، اپنے بچوں اور شوہر پر جان چھڑکنے والی، وہ اعلا تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھیں۔ مگر شادی کے بعد شہریار خان کے کہنے پر انہوں نے شوہر اور پھر بعد میں بچوں کی خاطر اپنے کیریئر اور پروفیشن کی قربانی دے کر خود کو پوری طرح اپنے گھر کے لیے وقف کردیا تھا۔ شہریار خان کا جس طرح کا مزاج تھا، وہ جس طرح اپنی بات منوانے کے عادی تھے، جس طرح کی حاکمانہ ان کی طبیعت تھی، ایسے مزاج کے حامل شخص کے ساتھ گزارا کرنا ان کی امو جان ہی کا وصف تھا۔ وہ شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی اور شوہر کی ہر بات کو حکم کا درجہ دینے والی خاتون تھیں۔ ان کے شوہر نے کہہ دیا ہے، بس ان کے لیے حکم ہو گیا ہے۔ وہ شکل و صورت میں اپنی ماں پر تھا اور ان کی ماں

ایک خوب صورت خاتون تھیں، سو وہ بھی خوب صورت تھا مگر اس کا قد کاٹھ اپنے باپ جیسا نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں سے وہ رعب اور ذہانت نہیں جھلکتی تھی جو اس کے باپ کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی شخصیت میں وہ Charisma (سحر) نہیں تھا جو اس کے باپ کی شخصیت میں تھا۔ یہ سب اگر کسی میں تھا تو صرف اور صرف سکندر شہریار میں۔ اسے اپنے بھائی کے ساتھ نہ دیکھا جاتا تو وہ ایک خوش شکل ہینڈسم اور چارمنگ لڑکا تھا، مگر جہاں وہ دونوں بھائی ساتھ ہوتے، وہ پس منظر میں چلا جایا کرتا تھا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سکندر شہریار اور زین شہریار ایک ساتھ کسی جگہ پر ہوں اور دیکھنے والے اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ بہت بچپنے میں وہ اس چیز کو زیادہ محسوس نہیں کیا کرتا تھا، گو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے پاپا سکندر کو اس سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ان دونوں بھائیوں کی عمروں میں دس ماہ کا فرق تھا۔ وہ سکندر سے دس ماہ چھوٹا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سکندر سے دنیا میں آنے میں دس ماہ پیچھے نہیں، بلکہ اسے زندگی بھر ہر میدان میں سکندر سے چند قدم پیچھے رہنا تھا۔ جب وہ دونوں بھائی چھوٹے تھے وہ تب بھی محسوس کرتا تھا کہ پاپا کے لیے جو اہمیت سکندر کی ہے، وہ اس کی نہیں ہے۔ وہ سکندر کو اس سے زیادہ اس لیے اہمیت دیتے ہیں کیونکہ سکندر ان کے جیسا ہے۔ سکندر بچپن کی بچکانہ باتوں میں بھی ذہانت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا کرتا تھا۔

زین نے ریموٹ کنٹرول والی گاڑی کھلونے کی دکان پر پسند کی تھی اور سکندر نے اسکریبل۔ شہریار خان تو بڑے بیٹے کی اس ادا پر نہال ہی ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے اسے تو محض ریموٹ کنٹرول والی گاڑی ہی دلوائی تھی، جبکہ سکندر کو اسکریبل کے ساتھ ریموٹ کنٹرول والی کار، ایروپلین اور کھلونوں کی ڈیلکس کارز کا ایک پورا اسیٹ بھی دلوایا تھا۔

اس کے دل کو چوٹ لگی تھی۔ اسے دکھ ہوا تھا، وہ گھر آکر اپنی کار سے کھیلا بھی نہیں تھا۔ شام میں سکندر اپنے کھلونے لے کر اس کے پاس آگیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ شہریار خان نے ہر وہ چیز جو اسے نہیں، صرف سکندر کو دلائی ہوتی تھی، سکندر اس کے ساتھ شیئر کیا کرتا تھا۔ سکندر اس سے پیار کرتا تھا۔

وہ کبھی اس کے ساتھ کھیل لیا کرتا اور کبھی اگر شہریار خان کے جانب دارانہ رویے پر اس کا دل زیادہ دکھا ہوتا تو بدتمیزی سے اسے اپنے کمرے ہی سے نکال دیا کرتا تھا۔ عجیب سا رشتہ تھا اس کا اپنے بھائی کے ساتھ۔ کبھی اسے اس پر پیار آتا، اس کے ساتھ کھیلنے کو جی چاہتا اور کبھی کبھی وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن، سب سے بڑا حریف نظر آتا، پھر اسے سکندر سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ اپنے پاپا کی نگاہوں میں کبھی بھی اہمیت اس لیے نہیں پا سکتا کہ اس کے مدمقابل ہر جگہ پر سکندر موجود تھا۔

سکندر ہر سال اسکول میں ٹاپ کرتا تھا اور وہ اپنی کلاس میں سیکنڈ، تھرڈ پوزیشن لیا کرتا تھا۔ اسکول ایک ہی تھا تو رزلٹ بھی ایک ہی دن ہوا کرتا تھا۔ اس کی رپورٹ کارڈ پر ایک افسوس بھری نگاہ ڈالنے کے بعد شہریار خان کی توجہ کا اصل مرکز سکندر ہوا کرتا تھا۔

وہ سکندر کو ہرانے کے لیے ہر سال گزشتہ سال سے زیادہ محنت کیا کرتا تھا۔ عجیب سی ایک ریس لگی تھی۔ ایک غیر اعلانیہ مقابلہ تھا جو اس کا اپنے بھائی سے تھا۔ وہ سکندر سے آگے نکل سکے، اس سے زیادہ اچھے مارکس لا سکے، مگر تمام تر کوششوں کے باوجود وہ سکندر سے پیچھے ہی رہتا۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں اس کے مارکس تو زیادہ ہوتے، مگر کہیں نہ کہیں وہ سکندر سے پھر پیچھے ہی ہوتا۔

وہ مڈل اسکول میں تھا۔ مڈل اسکول میں یہ اس کا آخری سال تھا، جبکہ سکندر اس سے ایک کلاس آگے ہونے کے سبب مڈل اسکول سے نکل چکا تھا۔ اس سال اس نے بے تحاشا محنت کی تھی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ تو امو جان نے اسے اتنا پڑھتے دیکھ کر آرام کرنے اور پڑھائی کو اتنا

سر پر سوار نہ کرنے تک کی تاکید کی تھی۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ اسے اس بار سکندر سے اگر آگے نہیں نکلنا تھا تو کم از کم اس کے برابر تو آنا تھا۔ اسے تو کر کے دکھانا ہے جو سکندر کر کے دکھا چکا ہے اور پھر جب ان کا رزلٹ آیا تو اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی تھی' بلکہ پورے مڈل اسکول میں بھی اس نے ٹاپ کیا تھا۔

سکندر اس کی کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

"مجھے پتا تھا زین! اس بار تمہیں ایسا ہی کوئی کارنامہ کرنا ہے۔ پڑھائی بھی تو کتنی کی تھی تم نے۔"

اسے لگا تھا سکندر اس سے جلے گا' ناخوش ہوگا' مگر ایسا نہ ہوا تھا۔ شاید یہ مقابلہ بازی یک طرفہ تھی یا شاید سکندر اسے اس قابل ہی نہ سمجھتا تھا کہ اس سے مقابلہ کرتا۔ اس نے جل کر سوچا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں اپنا رزلٹ باپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے امید تھی آج وہ باپ پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کہ وہ سکندر شہریار سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ اس قابل ترین خاندان میں وہ کسی سے کم نہیں۔

"گڈ... ویل ڈن زین... اچھی کوشش کی ہے تم نے۔ اس کا مطلب ہے اگر تم کوشش کرو تو اس سے بھی بہتر رزلٹ لا سکتے ہو۔ اوور آل 88 پرسینٹیج ہے نا تمہاری۔ لاسٹ ایئر سکندر نے مڈل اسکول میں ٹاپ کیا تھا تو اس کی 92 پرسنٹیج تھی۔ تم بھی اگر اور محنت کرو تو اتنی اچھی پرسنٹیج لا سکتے ہو۔"

باپ کے ان ریمارکس پر اس کی ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ وہ کتنی بھی کوشش کر لے' کتنی بھی محنت کر لے' وہ سکندر شہریار سے ہمیشہ پیچھے رہے گا۔ وہ اس روز اپنے کمرے میں چھپ کر گھنٹوں رویا تھا۔

اس کے باپ کو احساس تک نہ ہوا تھا کہ اپنے چند جملوں سے انہوں نے اپنے معصوم بیٹے کا دل کس بری طرح توڑا تھا۔ اس روز سے پہلے تک اسے سکندر سے صرف حسد محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے ہرانا چاہتا تھا' مگر اس روز کے بعد اسے سکندر سے عجیب سی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ سکندر سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ سکندر اس سے جتنا پیار کرتا' اسے جتنا اپنی طرف کھینچتا' وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا' اس سے الگ الگ رہتا۔

"تم نے میرے ساتھ کھیلنا کیوں چھوڑ دیا ہے زین؟ اپنے الگ دوست بنا لیے ہیں' ان کے ساتھ کھیلتے ہو' کیوں؟"

وہ اس کے پاس آ کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس سے صرف دس ماہ بڑا تھا' مگر پیار یوں کرتا' اس کی فکر یوں کرتا گویا اس سے کئی سال بڑا ہو۔

"مجھے تمہارے ساتھ کھیلنے میں مزہ نہیں آتا سکندر! تمہارے کھیل بھی کیا ہوتے ہیں؟ پاپا کو خوش کرنے کے لیے تم نے سوئمنگ کرنی ہوتی ہے یا رائیڈنگ' کیونکہ اس سے اسٹیمنا بڑھتا ہے' جبکہ مجھے فٹ بال کھیلنا ہوتا ہے۔ تمہاری طرح پاپا کی خوشامد کرنے کے لیے میں یہ بورنگ کام نہیں کر سکتا۔" وہ اچھی خاصی بدتمیزی سے بولا تھا۔

سکندر کے چہرے پر ایک دم ہی شرمندگی اور دکھ آ گیا تھا۔ اس کے تلخ اور بدتمیز لہجے نے سکندر کے دل کو دکھایا ہے' وہ جانتا تھا' مگر پھر بھی اس نے اپنے دل کو کٹھور بنا لیا تھا۔

سکندر ہر چند کوشش کرتا رہتا تھا کہ وہ اس سے قریب ہو جائے' مگر اس نے اس کی کوششوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیا تھا۔ اس نے اپنے دوست' اپنی دلچسپی سب سکندر سے اس حد تک الگ کر لی تھیں کہ بعض اوقات دن بھر میں صرف کھانے کی میز پر ہی ان بھائیوں کی ملاقات اور گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس نے خود کو بظاہر بڑا لاپروا اور مضبوط سا بنا لیا تھا جیسے اب اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پاپا سکندر کو اس سے زیادہ کیوں اہمیت دیتے ہیں' جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سکندر سے ہمیشہ پیچھے کیوں رہ جاتا ہے۔ وہ اس کی طرح غیر معمولی کیوں

نہیں۔ مگر سترہ سال کی عمر میں وہ اندر سے آج بھی وہی بچہ تھا جو باپ کی ایک نگاہ التفات کا متمنی رہا کرتا تھا۔ جو چاہتا تھا وہ سکندر سے بڑھ کر کچھ ایسا کر دکھائے کہ اس کے پاپا اسے سکندر کی مثال نہ دے سکیں' بلکہ سکندر کو اس کی مثال دیں۔

✵ ✵ ✵

مگر سکندر واقعی سکندر تھا۔ وہ جیتنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ دنیا فتح کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں کہیں شکست کا سامنا نہیں کیا تھا تو اب کی بار کیسے کرلیتا؟ اس کا ہارورڈ میں ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ ایڈمیشن مل جانے کی خبر شہریار خان اور امو جان کو سنانے کے بعد وہ بھاگا بھاگا اس کے کمرے میں آیا تھا۔ گھر میں پھیلتے شور شرابے نے اسے یہ خبر پہلے ہی دے دی تھی۔ اسی لیے وہ فوری طور پر گھر سے باہر جا رہا تھا۔

"زین! میرا ہارورڈ میں ایڈمیشن ہو گیا۔" سکندر بے تحاشا خوش نظر آرہا تھا۔ اس نے سنجیدہ نگاہوں سے سکندر کی طرف دیکھا تھا۔

"مبارک ہو۔"

"پاپا اور امو جان بہت خوش ہیں زین۔ تم بھی خوش ہوئے ہو نا زین؟"

"ہاں بہت۔" اس کے لہجے میں خوشی نہیں بلکہ تمسخرانہ ہنسی شامل تھی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر سکندر حیرت سے بولا تھا۔

"جمی کے پاس' ہمارا فٹ بال میچ ہے۔"

"آج تو مت جاؤ زین پلیز۔"

"کیوں آج کیا خاص بات ہوئی ہے؟ تمہارا ایڈمیشن؟ آئی ایم سوری میرے لیے یہ اتنی امپورٹنٹ بات نہیں کہ میں اپنے سارے پروگرامز کینسل کر کے تمہارے ساتھ گھر پر بیٹھ جاؤں۔"

امو جان اور پاپا کے سامنے تو ہرگز نہیں' مگر اکیلے میں وہ سکندر کے ساتھ اسی ٹون میں بات کیا کرتا تھا بلکہ سکندر کی بات کا جواب دیا کرتا تھا' کیونکہ خود سے تو وہ اسے بہت ہی کم شاذ و نادر ہی مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس کے بے رخی اور بدتمیزی لیے جواب نے سکندر کے چہرے پر پھیلی خوشی کو کس طرح مٹا دیا ہے' وہ کتنا ہرٹ ہوا ہے۔ اس پر دھیان دیے بغیر وہ کمرے سے ہی نہیں' گھر سے ہی نکل گیا تھا۔ وہ جمی کے پاس نہیں گیا تھا' وہ فٹ بال کھیلنے نہیں گیا تھا' وہ غصے میں مختلف سڑکوں پر اکیلا پھر رہا تھا۔ کیوں سکندر ہر بار جیت جاتا ہے' کیوں؟ کیا ہو جاتا اگر زندگی میں ایک بار وہ ہار جاتا؟

وہ جانتا تھا' بچپن سے دہرائی جاتی کہانی ایک بار پھر دہرائی جانی تھی۔ اب اگلے سال اپنے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اسے ہارورڈ میں ایڈمیشن کے لیے جان کی بازی لگا دینی تھی۔ جتنی محنت اور کوشش اس کے بس میں تھی' کر ڈالنی تھی۔ وہ سکندر کو ایک بار پھر ہرا نہیں سکا تھا' تو کم از کم اس کے برابر تو آجائے۔ اس کے اندر سکندر کے لیے کڑواہٹیں ہی کڑواہٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ باپ نے اس سے کوئی امید نہ باندھی تھی۔ مگر وہ خود اپنے آپ سے یہ ضد باندھ رہا تھا کہ اگلے سال اسے ہر حالت اور ہر قیمت پر ہارورڈ ہی میں داخلہ لینا ہو گا۔

✵ ✵ ✵

رات کے خواب کے اس پر ابھی تک اثرات تھے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اتنے کم دنوں کے وقفے سے وہ خواب پھر نظر آکر اس کی تمام توانائیاں نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کل رات نیند لانے کے لیے اس نے دوا لے لی تھی۔ کیونکہ اس کے سر میں شدید درد تھا اور اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لیے چند گھنٹوں کی نیند بے حد ضروری ہے۔ مگر وہ چند گھنٹوں کی نیند ہی اس کے لیے بے پناہ اذیتوں کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ خواب سے بیداری کے بعد وہ پھر اسی درد اور اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

وہ 32 سال کا بظاہر بہت صحت مند اور بھرپور مرد نظر آتا تھا' مگر اس کے ساتھ صحت کے کئی مسائل تھے۔ وہ ڈپریشن کا دائمی مریض تھا۔ اسے انسومنیا

(بے خوابی) کی تکلیف لاحق تھی۔ اسے ڈراؤنے خواب آتے تھے اور یہ ڈراؤنے خواب اپنے ساتھ اس کے لیے مائیگرین کا درد لاتے تھے۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے سے ایک شدید درد اٹھتا تھا جو اس کے کندھوں' ہاتھوں اور سر تک پھیل جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے اعصابی درد بتایا تھا۔ اس کی میڈیسنز دے رکھی تھیں۔ اسے خوش رہنے اور کوئی بھی پریشان کن بات نہ سوچنے کو ہدایت کر رکھی تھی۔ مگر کیا خوش رہنے کی کوشش کرنے سے انسان خوش رہ سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے اس کی تمام تکالیف کا سبب اس کے ڈپریشن اور زندگی سے ناامیدی کو قرار دیا تھا۔

یہ وجوہات ختم کرنے سے وہ قاصر تھا' سو وقتاً "فوقتاً" اٹھتے اس درد کو خاموشی سے سہ لیا کرتا تھا۔ کبھی نہ ہوتا تو یہ درد مہینوں نہ ہوتا اور اگر ہونے پر آتا تو کئی کئی دن اس کو نڈھال اور اذیت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔ اس درد کے ساتھ اس کے اندر غصہ اور زندگی سے نفرت لوٹ آیا کرتی تھی۔ وہ بہت غصہ ہو جاتا تھا' معمولی معمولی باتوں پر اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ یہ غصہ درحقیقت اس کے اندر کی اداسیاں اور محرومیاں تھیں۔ جیسے جیسے یہ درد بڑھتا اس کا ڈپریشن بھی بڑھتا اور اس کے اندر اپنی زندگی ختم کر لینے کی خواہش پھر بیدار ہونے لگتی۔ یہ کیفیت مستقل نہیں رہتی تھی۔ کبھی چند دن' کبھی چند گھنٹے' کبھی محض چند منٹ' مگر یہ اس کا مستقل طور پر پیچھا بھی نہیں چھوڑتی تھی۔

طبیعت جیسی بھی تھی اسے دفتر تو ہر حال میں جانا تھا۔ وہ ہوٹل میں بیٹھ کر اس درد کے نخرے اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس پر طاری ہوا خود کو ختم کر دینے کا احساس اسے خود کو تکلیف اور اذیت دینے پر اکسا رہا تھا۔ اس کی گردن میں اس شدت کا درد تھا کہ وہ اپنی گردن دائیں بائیں گھما نہیں پا رہا تھا۔ اس درد سے پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سانس بھی جیسے کچھ کھنچ کھنچ کر آ رہی تھی' مگر وہ روز کی طرح تیار ہو کر آفس جا رہا تھا۔ دفتر میں وہ کسی کو پتا نہیں چلنے دے رہا تھا کہ اسے کتنی شدید تکلیف ہے۔ اسے گردن دائیں بائیں نہ گھماتا دیکھ کر زیادہ سے زیادہ کسی نے کچھ سوچا ہو گا تو یہی کہ رات سوتے میں اس کی گردن میں کوئی جھٹکا ڈ نکا آ گیا ہے۔ روبرٹو نے تو اس سے یہ بات پوچھ بھی لی تھی۔

"ہاں سوتے میں جھٹکا آ گیا تھا۔"

اس نے روبرٹو کی بات کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ روبرٹو اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ چار' پانچ دنوں کے لیے گھومنے پھرنے وینس جا رہا تھا۔

"تم بھی وینس ضرور جانا سکندر۔ اٹلی آئے ہو' وینس گھومے بغیر واپس چلے گئے تو تمہارا ٹرپ ادھورا رہ جائے گا۔"

روم جہاں وہ قیام پذیر تھا' اسے اسے دیکھنے اور وہاں گھومنے پھرنے کا کوئی شوق نہ تھا تو وہ اٹلی کے کسی اور شہر میں کیا جاتا' بہرحال اس نے "ہاں کوشش کروں گا" کہہ کر روبرٹو کی اس بات کا بھی اثبات ہی میں جواب دیا تھا۔ آج رات اسے آفس کے انتہائی اہم کام سے نیپلز جانا تھا۔ وہاں کی ایک کمپنی کی ان کی کمپنی کے ساتھ ایک انتہائی اہم نوعیت کی میٹنگ تھی۔ آفس کی جانب سے اس کے جانے کے انتظامات مکمل تھے۔

اٹلی کی انتہائی تیز رفتار اور مہنگی ترین ٹرین Alta velocita جو اٹلی کے مختلف شہروں کے درمیان چلا کرتی تھی اس میں اس کی سیٹ ریزرو کروائی جا چکی تھی۔ Alta velocita نے اسے سوا گھنٹے میں نیپلز پہنچا دینا تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے اس کی میٹنگ تھی اور میٹنگ سے قبل کے چند گھنٹے گزارنے کے لیے آفس کی جانب سے نیپلز کے ایک پرآسائش ہوٹل میں اس کے لیے روم بھی بک کروایا جا چکا تھا۔

وہ آفس میں پورا دن گزار کر شام میں ہی اٹھا تھا۔ درد تھا تو ہوا کرے۔ اس نے واپسی کے لیے روزانہ کی طرح واک کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میٹرو' ٹیکسی' یا آفس کی گاڑی میں اپنے ہوٹل نہیں جائے گا۔ اس نے خود اذیتی سے سوچا تھا۔ ابھی وہ Via Barberini

ہی پر تھا جب پیچھے سے ایک گاڑی اسے ہارن دیتی اس کے نزدیک آ کر رکی۔

"دیکھو تقدیر نے پھر ہمیں ملا دیا۔"

لیزا ہنس کر گاڑی کا شیشہ نیچے کرتی ہوئی اس سے بولی تھی۔ وہ جواباً کچھ بھی نہیں بولا۔ آخر اس لڑکی کی یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کی بے تکلفی سخت ناپسند کرتا ہے۔

"آؤ بیٹھو۔ کہاں جانا ہے تمہیں میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس کی کوئی دوست ہو۔ وہ اپنا غصہ دبا تا ہوا خشک سے لہجے میں بولا۔

"نو تھینکس! میں واک کر کے جانا چاہتا ہوں۔"

"کم آن سکندر.... تکلف مت کرو۔ میں تمہیں ڈراپ...." لیزا کا بے تکلفی اور اصرار لیا جملہ اس نے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔ بھاڑ میں جائے روبرٹو اس کی یہ دوست اور بھاڑ میں جائے لحاظ اور اخلاقیات۔ غصہ اور جارحیت اس پر پوری طرح حاوی تھی۔

"جب میں تمہیں منع کر چکا ہوں تو تمہاری سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی؟ میں تمہارے ساتھ بات کرنے، بیٹھنے یا دوستی کرنے میں بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ روبرٹو کی دوست ہو تو اس کی دوست بن کر رہو۔ میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش مت کیا کرو۔"

وہ بہت بدتمیزی سے خاصی تیز آواز میں بولا تھا۔ لیزا اس کی بدتمیزی پر حیرت سے آنکھیں پھاڑے بالکل ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے وہاں رکا نہیں تھا۔ وہ غصے سے تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے فوراً آگے بڑھ گیا تھا۔

وہ اپنے ہوٹل آ چکا تھا۔ اسے شدید تکلیف تھی۔ وہ آتے ہی بغیر لباس تبدیل کیے بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ مگر اسے لیٹنے میں بھی بہت تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ گردن، کندھے اور بازوؤں میں درد کی شدت کے سبب وہ اپنی مرضی کے مطابق کروٹ بھی نہیں لے پا رہا تھا۔ اس کے سر میں ناقابل بیان حد تک درد تھا۔

جب یہ درد حد سے بڑھتا محسوس ہوا تب وہ بیڈ سے اٹھا۔ وہ اپنے ساتھ وہ تمام میڈیسنز لایا ہوا تھا جو ڈاکٹر نے اس کے لیے تجویز کر رکھی تھیں۔ اس نے گلاس میں پانی نکالا اور خالی پیٹ وہ تیز اثر دوا لے لی جو ڈاکٹر نے اس کے اس درد کے لیے تجویز کر رکھی تھی۔

دوا لے کر وہ واپس بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ خود کو پرسکون کرنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس دوا سے درد کم ہونے کے ساتھ ساتھ نیند بھی طاری ہوا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود پر نیند کا غلبہ محسوس کیا تو سوچا کہ اچھا ہے وہ تھوڑی دیر سو لے ابھی اس کی روانگی میں خاصے گھنٹے باقی ہیں۔ وہ سو کر اٹھے گا تو درد ختم نہیں بھی ہوا ہو گا تو کم ضرور ہو چکا ہو گا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کتنی دیر سویا ہے اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مائیگرین میں کمی تھی مگر گردن اور کندھے کا درد اپنی جگہ برقرار تھا۔ اسے یاد آیا وہ آفس سے آ کر دوا لے کر سو گیا تھا۔ اس وقت چونکہ سورج غروب نہیں ہوا تھا، باہر سے روشنی آ رہی تھی، اس لیے اس نے کمرے کی لائٹس بھی آن نہیں کی تھیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟ اسے جانے کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔ اس نے پاس رکھا موبائل اٹھا کر اس میں وقت دیکھا۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ شاید وہ موبائل میں ٹائم غلط دیکھ رہا ہے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے چار بج کر دو منٹ اور اس کی ٹرین کو رات کے ایک بجے روانہ ہونا تھا۔

وہ گھبرا کر ایک دم ہی بیڈ پر اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اس کی ٹرین مس ہو گئی۔ اب وہ وقت پر نیپلز کس طرح پہنچ پائے گا؟ وہ اس طرح سے کیسے سوتا رہ گیا۔ اسے دوا نہیں لینی چاہیے تھی۔ چند گھنٹوں کی تو بات تھی برداشت کر لیتا درد۔ بہرحال جو ہو چکا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب اس کو فوری طور پر اس پریشانی کا کوئی حل ڈھونڈنا تھا۔ اسے فوری طور پر نیپلز پہنچنے کے لیے کوئی

اور راستہ ڈھونڈنا تھا۔

اس نے ہوٹل کے ریسیپشن کا نمبر ملایا۔ وہاں پر اسے بتایا گیا کہ Alta velocita یا eurostar ان دونوں تیز رفتار ٹرینوں میں سفر کے لیے پہلے سے سیٹ ریزرو کروانی پڑتی ہے۔ اچھا تو وہ سیٹ ریزرو کروالیتا ہے' اگلی ٹرین روانہ کتنے بجے ہوگی۔ ریسیپشن پر موجود لڑکی نے اسے اس کی مطلوبہ معلومات پچیس منٹ کے بعد فون پر پہنچائی تھیں۔ صبح چھ بجے eurostar نے روانہ ہونا تھا' مگر اس میں کوئی سیٹ دستیاب نہیں تھی اور اگلی Alta velocita نے روم سے نیپلز کے لیے روانہ ہی صبح آٹھ بجے ہونا تھا۔

وہ حقیقتاً" پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھا تھا۔ میٹنگ کی اہمیت' اس کی حساس نوعیت' اسے تو وہاں وقت سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا' جبکہ یہاں تو اس کے صحیح وقت پر ہی پہنچنے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ روبرٹو کے علاوہ اس کے پاس اپنے یہاں کے آفس کے کسی بھی فرد کا کنٹریکٹ نمبر نہیں تھا۔ اب وہ کیا کرے' کسی نہ کسی سے تو اسے مدد لینی پڑے گی۔ اٹلی اس کا ملک نہیں' اسے یہاں کی زبان نہیں آتی' ہوٹل سے تو معمولی سی معلومات ہی اسے آدھے گھنٹے بعد پہنچائی گئی تھیں۔

"کیا پتا کبھی تمہیں آرٹ میں دلچسپی ہو جائے اور تم مجھ سے کوئی پینٹنگ بنوانا چاہو۔"

روبرٹو کے علاوہ اور کون اٹالین ہے جسے وہ جانتا ہے اور جس کا کنٹریکٹ نمبر اس کے پاس موجود ہے۔ اس نے ذہن دوڑانا شروع کیا تو یک دم ہی اسے دو روز قبل لیزا کے ساتھ لنچ کرنا اور اس کا اسے اپنا فون نمبر دینا یاد آیا۔ اس نے وہ چٹ کہاں رکھی تھی۔ پھینکی تو نہیں تھی' یہ اسے یاد تھا۔ ہاں روبرٹو کے سامنے مروت ظاہر کرنے کو اس نے وہ چٹ جیب سے اپنا والٹ نکال کر اس میں رکھی تھی۔ یہ سوچ کر کہ باہر جا کر پھینک دے گا۔ مگر پھر اسے وہ پھینکنا یاد نہیں رہی تھی۔

وہ ایک دم ہی تیز رفتاری سے اٹھا' والٹ اس کے کوٹ کی جیب میں تھا اور کوٹ صوفے پر پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے والٹ میز پر پورا کا پورا خالی کر دیا۔ اس میں سے وہ چٹ نکل آئی تھی۔ وہ لیزا کا موبائل نمبر تھا۔ اس نے تیز رفتاری سے وہ نمبر ڈائل کیا تھا۔ وہ نیپلز جلدی پہنچنے کا کوئی متبادل ذریعہ اس سے پوچھ لے گا۔ اس کا تو یہ ملک ہے' وہ اسے ضرور کوئی متبادل بتا سکے گی۔ بیل جا رہی تھی۔ مگر یہ ٹائم کیا اسے فون کرنے کا کوئی مناسب ٹائم ہے؟ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو پونے پانچ بجا رہی تھی۔

وہ لیزا کا دوست نہیں۔ اس کا لیزا پر ایسا کوئی حق نہیں کہ وہ اسے بے وقت فون کھڑکا سکے' جبکہ گزشتہ شام وہ اس سے کافی ٹھیک ٹھاک بدتمیزی بھی کر چکا ہے۔ اس خیال کے آنے کی دیر تھی' اس نے فوراً" ہی لائن کاٹ دی تھی۔ نہیں' لیزا کو فون کرنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ ابھی اس نے لائن کاٹی ہی تھی کہ لیزا کے نمبر سے اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے فوراً" ہی کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔ جواباً" وہ اٹالین میں روانی سے کوئی جملہ بولی تھی' جو ظاہر ہے' اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ جواباً" انگریزی میں بولا تھا۔

"لیزا! یہ میں ہوں سکندر۔"

"اوہ سکندر! تم ہو؟" وہ جیسے ان جانے نمبر سے کال کرنے والے کو اب شناخت کر پائی تھی۔

"میرے پاس نامعلوم نمبر سے کال آئی اور پھر فوراً" ہی لائن کاٹ دی گئی تو میں نے حیران ہو کر سوچا کون ہے' اس ٹائم پر کال کرنے والا کون ہے' یہ چیک کرنے کے لیے وہ ہی نمبر ملا لیا۔" وہ اپنے اسی مخصوص خوش اخلاق انداز میں بولی تھی۔

"آئم سوری میں نے تمہیں غلط وقت پر کال کی۔"

"کوئی بات نہیں' میں جاگی ہوئی ہی تھی۔ تم بتاؤ کیسے فون کیا تھا؟ کوئی پرابلم؟" وہ کل اس سے کتنی بدتمیزی سے پیش آ چکا ہے' اس بات کا ہلکا سا بھی تاثر اس کے لہجے میں موجود نہیں تھا۔ اس کی وہ ہی بے

تکلفی و خوش دلی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"مجھے صبح آٹھ بجے نیپلز پہنچنا ہے' ایک بہت ہی اہم میٹنگ کے لیے۔ اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور میری ٹرین مس ہو گئی ہے۔ پلیز تم مجھے یہ گائیڈ کر دو کہ میں اب کس ذریعے سے سفر کروں کہ نیپلز درست وقت پر پہنچ سکوں۔"

"تمہیں نیپلز جانا ہے' ہوں۔" اس نے سوچنا شروع کیا۔

"جہاز کا آپشن تو فضول ہے۔ فلائٹ کا ٹائم تو ایک گھنٹے سے بھی کم ہے۔ مگر یہاں سے ایئر پورٹ پہنچتے' پھر وہاں تمام فارمیلٹیز سے گزرتے سفر کرنے کے بعد نیپلز پہنچو گے تو وہاں بھی ایئر پورٹ سے شہر کے مرکز تک پہنچنے میں تمہیں کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ جتنی بھی فاسٹ ٹرینز ہیں ان میں تمہیں کم سے کم بھی ایک دن پہلے سیٹ ریزرو کروانی پڑے گی کیونکہ ٹورسٹ سیزن ہے اور ان پر رش ہو گا' سلو ٹرینز سے پہنچنے میں تمہیں تین سے ساڑھے تین گھنٹے لگ جائیں گے۔"

وہ جیسے مختلف آپشنز پر غور کرتی جلدی جلدی بول رہی تھی۔

"بائے روڈ۔" وہ ایک دم ہی بولی۔ "تمہیں بائے روڈ نیپلز جانا چاہیے۔ صبح سویرے کا وقت ہے' اس وقت تمہیں زیادہ ٹریفک نہیں ملے گا اور ڈرائیور اگر مجھ جیسا ہوا تو تم ڈھائی گھنٹے میں نیپلز میں ہو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔

ابھی وہ جواباً کچھ بول بھی نہیں پایا تھا کہ وہ فوراً" ہی مزید بولی۔

"تم مجھے اپنے ہوٹل کا نام بتاؤ۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں' جتنی دیر مجھے پہنچنے میں لگے گی تم اس میں اپنی تیاری کر لو۔"

وہ اس سے صرف مشورہ اور حل معلوم کرنا چاہتا تھا' اس کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ بالکل بھی مناسب نہیں تھا' اپنی وجہ سے کسی کو زحمت دینا' نیند سے اٹھانا اور پھر دوسرے شہر جانا۔

"تم زحمت مت کرو لیزا میں ــــ" اسے خود نہیں پتا تھا' وہ خود کس طرح بائے روڈ نیپلز پہنچ جائے گا۔ ٹیکسی وغیرہ کا بھی اگر بندوبست کرتا ہے تو زبان کا مسئلہ راستے میں اور منزل تک پہنچنے میں در پیش آ سکتا تھا۔ لیزا اس کے ادھورے جملے کے جواب میں فوراً" بولی تھی۔

"ابھی ان فارمیلٹیز کو رہنے دو' اس وقت تمہارے لیے اہم ہے وقت پر نیپلز پہنچنا۔ تم جلدی سے تیاری کرو' میں فوراً" پہنچ رہی ہوں۔"

ہاں اس وقت اسے مسئلے کا حل ڈھونڈنا تھا۔ اس نے نیم رضامندی کے ساتھ لیزا کو اپنے ہوٹل کا نام بتا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا گھر قریب تھا یا وہ واقعی اپنے دعوے کے مطابق تیز ڈرائیونگ کرتی تھی جو محض پندرہ منٹ کے اندر اس کے ہوٹل میں موجود تھی۔ وہ ہوٹل کی لابی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لیزا نے اسے کال کی تھی۔

"میں پہنچ گئی ہوں' تم باہر آ جاؤ۔"

وہ اپنا لیدر بریف کیس ہاتھ میں لیے باہر آ گیا تھا۔ اسے سخت شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ کسی سے آپ اتنی بدتمیزی کریں اور پھر محض بارہ گھنٹوں کے اندر اندر اسی شخص سے مدد لیں۔ اسے لیزا کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ مگر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی مسکراتے ہوئے ــــ اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اس نے کریم کلر کی جرسی ٹی شرٹ بلیک جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ اس کے سرخی مائل براؤن بال شانوں سے کچھ نیچے آتے تھے اور اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ اس نے آگے کے بالوں کو کانوں کے پیچھے کر رکھا تھا۔ پنک لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر سجی تھی۔ ہمیشہ کی طرح نفیس اور ڈیسنٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ سیٹ بیلٹ باندھے ہوئے بیٹھی تھی۔

"چاؤ سکندر۔"

"چاؤ۔" وہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

اس نے بھی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ پانچ پینتیس، پانچ چالیس پر سورج طلوع ہوا کرتا تھا گویا ابھی سورج بھی طلوع نہ ہوا تھا جب سوا پانچ بجے انہوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔

"آئم سوری لیزا! تمہیں میری وجہ سے اس قدر زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

جو وقت لوگوں کے سونے اور آرام کرنے کا ہوتا ہے اس وقت اپنے آرام دہ بستر سے نکل کر وہ اسے ایک دوسرے شہر پہنچانے جا رہی تھی۔ وہ سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے ایسا کون سا دوستانہ رویہ رکھا تھا جو بدلے میں اپنے لیے کسی احسان کی توقع رکھتا۔

"اتنے پر تکلف بھاری بھرکم جملے مت بولو، تم روبرٹو کے کولیگ ہو اور روبرٹو میرے بچپن کا دوست ہے۔ وہ اگر روما میں موجود نہیں ہے تو اس کی غیر موجودگی میں مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

"تم اس وقت جاگی ہوئی کیسے تھیں؟" اسے یاد آیا وہ فون پر یہی کہہ رہی تھی کہ وہ جاگی ہوئی تھی۔

لیزا اس کے سوال پر ہنسی۔ "میں اپنے اسٹوڈیو میں تھی، پینٹنگ کر رہی تھی۔ تمہارا شاید کبھی واسطہ نہیں پڑا ہم آرٹسٹ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کام کی دھن سوار ہو جائے تو دن اور رات کے احساس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"

اس کی نگاہیں اسٹیئرنگ پر جمے لیزا کے ہاتھوں پر پڑیں۔ اس کی انگلیاں لمبی مخروطی تھیں۔ بلاشبہ یہ ہاتھ ایک آرٹسٹ ہی کے ہاتھ تھے۔ ٹرین مس ہونے کی فکر اور نیپلز وقت پر پہنچنے کی پریشانی میں اسے اپنا درد بھول گیا تھا۔ اب پرسکون ہو کر گاڑی میں بیٹھا تھا تو درد کا احساس جاگا تھا۔ وہ لوگ ہائی وے کی طرف رواں دواں تھے۔ لیزا کا دعوا تھا کہ وہ اسے ساڑھے سات اور پونے آٹھ کے بیچ نیپلز پہنچا دے گی۔ اسے دوبارہ درد کی شدت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہی گردن کے پچھلے حصے سے اٹھتا کندھے اور بازوؤں تک جاتا ہوا درد، اس وقت صرف اس کے سر میں درد نہیں ہو رہا تھا۔ ایک، دو منٹ کے لیے اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔ سیٹ کی پشت سے کمر ٹکائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لیزا کی توجہ ڈرائیونگ پر ہے۔ اس کا دھیان اس پر نہیں گیا ہوگا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں لیزا نے اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنے الفاظ میں زور پیدا کرتا فوراً بولا۔

"مجھے نہیں لگ رہی۔" وہ جواباً سنجیدگی سے بولی۔ اس بار وہ جواب میں چپ رہا تھا۔ اس کا اپنی طبیعت کو موضوع گفتگو بنانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چونکہ اسے گردن دائیں بائیں کرنے میں تکلیف ہو رہی تھی، اس لیے اس سے بات کرنے کے لیے وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوما۔ اب جبکہ وہ اس کا احسان لے چکا تھا اور وہ اتنی غیر معمولی حد تک جا کر اس کی مدد کر رہی تھی، تب اخلاق اور تہذیب کا تقاضا یہ ہی تھا کہ وہ اپنے کل شام کے رویے پر اس سے معذرت کرے۔ اس کے کچھ کہنے سے بھی پہلے پتا نہیں لیزا نے اسے اتنے غور سے کیوں دیکھا تھا۔ وہ سنجیدگی بردباری سے گویا ہوا تھا۔

"آئم ایکسٹریملی سوری لیزا! میں نے کل تمہارے ساتھ کافی مس بی ہیو کیا تھا۔ ایکچوئلی میں کسی اور بات پر اپ سیٹ تھا۔"

"شکر کہ میں تمہارے سامنے آگئی اور تم مجھ پر خفا ہوگئے۔" وہ اس کا جملہ اچک کر مسکرا کر بولی۔ جملے کے اختتام پر وہ جیسے اپنی ہی کہی بات کا مزہ لیتی ہنسی۔ اسے اتنی ملاقاتوں کے بعد اب اندازہ ہو چکا تھا کہ بات بے بات مسکرانا اور بے تحاشا بولنا اس لڑکی کی عادت تھی۔

"بے فکر رہو، میں نے تمہاری باتوں کا برا نہیں مانا۔ مجھے کل ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کسی اور بات سے اپ سیٹ ہو۔ ویسے تم کس بات پر اپ سیٹ تھے؟"

پھر وہی ذاتی سوال، آخر یہ لڑکی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کیوں کرتی تھی؟ شاید نہیں۔ یقیناً"

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات آئے تھے کہ وہ اس سوال کو ناپسند کر رہا ہے تب ہی وہ جلدی سے معذرت کرنے والے انداز میں بولی۔

"نہیں بتانا چاہتے۔ مت بتاؤ، مگر دوبارہ مجھ پر اپ سیٹ مت ہونا۔"

جملے کے آخر میں وہ مسکرائی تھی، تکلیف کے باوجود اس بار وہ بھی مسکرایا تھا۔

"تمہاری گردن میں تکلیف ہے؟" اسے اب لیزا کا چند منٹ قبل اپنی جانب بغور دیکھنا سمجھ میں آیا تھا۔ وہ جس طرح پورا کا پورا اس کی طرف گھوما تھا بات کرنے کے لیے اسے لیزا نے محسوس کیا تھا۔

"ہاں شاید سوتے میں جھٹکا آگیا۔" وہ لہجے کو قصداً بہت لاپروا بنا کر بولا۔ لیزا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی سیٹ بیک کو پیچھے کی طرف کر دیا۔

"تم آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ، چاہو تو پیچھے سیٹ پر لیٹ جاؤ۔" وہ اس آفر پر اب کی بار ہنس پڑا تھا۔

"تم کیوں ہنسے؟ میں نے کیا کوئی لطیفہ سنایا ہے؟" لیزا نے اسے گھورا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی۔" وہ ہنسی روک کر بولا۔

"تم کیا پینٹ کرتی ہو؟" اس نے پہلی بار اس سے کوئی سوال کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پوچھا تھا۔

"زیادہ تر لینڈ اسکیپ، اسٹل لائف اور پورٹریٹس، کبھی کچھ اور موڈ بن جائے تو وہ بھی پینٹ کر لیتی ہوں، ورنہ میرے خاص موضوعات یہ ہی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تم روما میں رہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہاری فیملی بھی وہیں رہتی ہے؟"

لیزا نے یہ سوال شاید یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ مگر اس کے لب ایک دم ہی بھنچ گئے تھے۔ چہرے پر سختی اور کھردراپن آگیا تھا۔

"بہتر ہوگا لیزا! اگر تم مجھ سے پرسنل سوالات نہ کرو۔" سخت لہجے میں بولتے بولتے اسے ایک دم ہی یاد آگیا کہ وہ اس وقت اس کی گاڑی میں، اس کے آسرے پر اس کی مدد کے سہارے نیپلز جا رہا ہے تب ذرا سا اپنی ٹون نارمل کر کے اپنے سخت جملے کا اثر زائل کرنے کے لیے بولا۔

"میں اکیلا ہوں، میری فیملی نہیں ہے۔" لیزا نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اس کے فیملی نہ ہونے والے جملے کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا، اس نے اگر نوٹس لیا تھا تو اس کے پل بھر میں بدلتے لب و لہجے کا۔ ایک اٹالین لڑکی کے لیے فیملی کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی جو وہ اس کے جملے میں موجود کرب کو محسوس کر پاتی۔

"ہو تم اچھے خاصے بدتمیز، پر سچ کہوں یہ بدتمیزی تمہیں سوٹ کرتی ہے۔"

وہ جملہ مکمل کرنے کے بعد مسکرائی تھی۔ وہ جس رفتار سے ڈرائیونگ کر رہی تھی اسے یقین تھا وہ اسے مقررہ وقت سے پہلے نیپلز پہنچا دے گی۔ ایک، دو بار تو اس نے اتنے خطرناک انداز میں موڑ کاٹا تھا کہ اسے لگا تھا اب ایکسیڈنٹ ہوا کہ تب۔

"تم مجھے ٹائم پر پہنچانے کے لیے اس اسپیڈ سے ڈرائیو کر رہی ہو؟"

"نہیں، یہ میری عادت ہے، ان فیکٹ یہ تمام اٹالینز کی عادت ہوتی ہے، فاسٹ ڈرائیونگ، ہم اٹالینز کی پہچان ہے۔"

جو بات قابل فخر ہرگز نہ تھی، وہ اسے بھی فخریہ انداز میں بیان کر رہی تھی۔ وہ اس کے فخریہ انداز میں گردن اونچی کر کے بولنے پر مسکرایا تھا۔ چند منٹ خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہنے کے بعد لیزا نے اس کی طرف دیکھا — وہ سیدھا بیٹھا ونڈ اسکرین سے اس پار ہائی وے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی نگاہیں محسوس کر کے وہ پھر گردن اس کی طرف نہ گھما سکنے کے باعث سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پورا اس کی طرف گھوما۔

"تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے نا؟ تم نے کوئی میڈیسن لی؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میڈیسن لے لی تھی۔ تکلیف زیادہ نہیں ہے۔ لاؤ اب میں ڈرائیو کروں؟" اس نے لیزا سے کہا تاکہ صبح سویرے وہ اسے دوسرے شہر پہنچا نے جا رہی تھی،

اسے مسلسل شرمندگی کا احساس تھا۔

"تم آرام سے بیٹھو اور میری ڈرائیونگ سے لطف اندوز ہو۔" وہ مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں بولی۔

"تمہاری اس ڈرائیونگ کے دوران صرف اللہ یاد آسکتا ہے اور آرہا ہے۔" وہ اسی کی ٹون میں جواباً بولا۔

لیزا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ "میری یہ ڈرائیونگ ہی تمہیں ٹھیک وقت پر تمہاری منزل پر پہنچائے گی۔"

اسے بات بے بات کس قدر ہنسنے کی عادت تھی۔

"تم نے میرے روما میں اب تک کہاں کہاں گھوم لیا؟ کتنی جگہوں کی سیر کرلی؟"

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد لیزا نے اس سے پوچھا۔ اس کے میرے روما کہنے میں اپنے شہر کے لیے بے پناہ محبتیں چھپی ہوئی تھیں۔

"کسی بھی جگہ کی نہیں' میں نے صرف Via Veneto اور Via Barberini کے آس پاس کی جگہیں آتے جاتے دیکھی ہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"کیا؟ تم eternal city میں ہو' دنیا بھر کے ٹورسٹ کی فیورٹ جگہ پر آئے ہوئے ہو اور وہاں پر کچھ بھی نہیں دیکھا؟"

وہ حیرت کی زیادتی سے چلائی تھی۔ لیزا کے لفظ اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنے شہر سے محبت کرتی ہے اور اس پر فخر میں بھی مبتلا ہے۔

"ہاں' میرے پاس ٹائم نہیں تھا اور میرا دل بھی نہیں چاہا تھا۔"

وہ جواباً سنجیدگی سے بولا تھا۔ لیزا نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

لیزا نے اپنے وعدے کے مطابق پونے آٹھ بجے اسے نیپلز پہنچا دیا تھا۔

"Wel come to naples the birth place of pizza" -

(پیزا کے پیدائشی شہر نیپلز میں خوش آمدید۔) لیزا نے مسکرا کر قدرے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا' وہ جواباً فوراً بولا۔

"and organized crime" - (اور منظم جرائم) لیزا نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ وہ اپنے روما ہی سے نہیں وہ اپنے پورے اٹلی سے محبت کرتی تھی۔ تب ہی اس کے خلاف کچھ سننا اسے پسند نہیں تھا۔

"کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا۔ پزا کی پیدائش نیپلز میں ہوئی تھی تو دنیا بھر میں منظم جرائم کا آغاز بھی تو یہیں سے ہوا تھا۔ کیا یہاں کا مافیا کامورا (camorra) دنیا کا خطرناک ترین مافیا نہیں؟"

وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا' اب پرسکون تھا' اس لیے اسے لیزا کو چڑانے میں لطف بھی آیا تھا۔

"ہاں ہے۔ مگر عام لوگوں کے ساتھ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ نیپلز کی ریپوٹیشن بری زیادہ ہے۔" وہ فوراً نیپلز کے دفاع میں بولی تھی۔

آٹھ بجے وہ اسے اس سڑک پر لے آئی تھی جہاں اس کمپنی کا ہیڈ آفس واقع تھا جن کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔ جس علاقے میں وہ تھے وہاں جدید عمارتیں تھیں۔ وہ سامنے نظر آتی بلڈنگز کو دیکھ رہا تھا' جب لیزا اس سے بولی۔

"نیپلز کے دو رخ ہیں۔ ایک تاریخی اور ایک ماڈرن' اس ماڈرن علاقے سے ذرا نکلو تو تمہیں تاریخی عمارتیں گرجا گھر اور فوارے جابجا نظر آئیں گے۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ اپنی ول پاور کو استعمال کر کے تکلیف اور درد کے کسی بھی احساس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دے رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد اس کی میٹنگ تھی اور اس کے لیے اسے بہت الرٹ اور ایکٹو رہنا تھا' اپنے ذہن کو مکمل طور پر حاضر رکھنا تھا۔ اب چونکہ اس کی منزل نزدیک آچکی تھی گویا لیزا کا شکریہ ادا کرنے کا وقت آچکا تھا۔

اس نے دل میں ارادہ کیا تھا' وہ اٹلی سے واپس جانے سے قبل لیزا کو کوئی بہت اچھا اور قیمتی تحفہ دے کر جائے گا۔ اس کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے

نہیں' یہ تو بہت چھوٹی سوچ ہوتی' مگر اسے یہ ضرور جتانے کے لیے کہ وہ اس کے خلوص اور دوستانہ رویے کی دل سے قدر کرتا ہے۔

"تمہارا بہت شکریہ لیزا! تم آج حقیقت میں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنی ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نیپلز ٹھیک وقت پر پہنچ پایا ہوں۔"

اس نے تشکر کے احساس سے لبریز الوداعی جملے بولنے شروع کیے ہی تھے کہ لیزا گاڑی کو ایک بار کے پاس لاکر روکتی ہوئی بولی۔

"ابھی کہاں سے شکریہ آگیا؟ جب ہم روما واپس پہنچ جائیں گے تب میرا شکریہ ادا کرنا۔"

"تم یہاں رکو گی؟ مگر کیوں؟ دیکھو' میری دونوں طرف کی ٹرین کی سیٹس ریزروڈ تھیں۔ میں شام میں اپنے طے ہوئے پروگرام کے مطابق Velocita Alta سے روم آجاؤں گا۔"

"اور میں اتنی لمبی ڈرائیو' وہ بھی خالی پیٹ کرکے واپس روما روانہ ہوجاؤں؟ مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے' سینیور سکندر؟" میں نے ابھی ناشتا کرنا ہے' کچھ دیر آرام کرنا ہے' پھر جاؤں گی واپس تمہیں ساتھ لے کر' مجھے ڈر ہے' کہیں تم پھر نہ اپنی ٹرین مس کردو۔"

لیزا اسے جواب دے کر گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی۔

"آجاؤ ناشتا کرلیتے ہیں' جلدی سے۔ پھر تمہاری میٹنگ کا ٹائم ہوجائے گا۔"

وہ مسکرا کر کہتی گاڑی سے اتر گئی تھی۔ لیزا کا انداز اٹل تھا' گویا وہ اسے ساتھ لے کر ہی واپس جائے گی۔ وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ امریکہ میں گزارا تھا۔ جہاں بار کا مطلب وہ جگہ تھی جہاں شراب نوشی کے لیے جایا جاتا تھا۔ اٹلی آکر اسے پتا چلا تھا کہ یہاں بار کا مطلب امریکہ والے بار سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں بار کا مطلب وہ جگہ تھی جہاں اٹالینز صبح اپنے کام پر جانے سے پہلے کافی پینے اور ناشتا کرنے آیا کرتے تھے' اسی طرح شام یا رات کے اوقات میں بھی یہاں زیادہ تر اٹالینز کافی پینے ہی کے

لیے میزوں پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ بار ہی سے لوگ اپنے روزمرہ استعمال کے دودھ کے ڈبے اور بوتلز خرید اکرتے تھے۔ یہ بارز اٹالین سوشل لائف کا ایک اہم حصہ تھے۔ وہ جتنے دنوں سے روم میں تھا' روزانہ آفس جاتے وقت راستے میں پڑتے ایک بار پر لوگوں کو سینڈوچ' پیسٹری' ڈونٹ کے ساتھ جلدی جلدی کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ یہ جلدی ان کے اپنے کام پر پہنچنے کی عجلت کو ظاہر کیا کرتی تھی۔ وہ دونوں اندر آگئے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے جو بار ٹینڈر کھڑا تھا۔ لیزا نے اس کو دو سینڈوچز اور دو کپ کافی کا آرڈر کیا تھا۔ وہاں کچھ لوگ میزوں پر بیٹھے کافی اور پیسٹری یا سینڈوچز کھا رہے تھے' جبکہ زیادہ تعداد میں لوگ کاؤنٹر کے سامنے ہی کھڑے جلدی جلدی اپنا ناشتا نمٹانے میں مصروف تھے۔ وہ اور لیزا ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔

"تم پلیز اپنی سہولت کے حساب سے واپس چلی جاؤ۔ میری میٹنگ پتا نہیں کتنے گھنٹے چلے؟" وہ سینڈوچ کھاتے ہوئے اس سے بولا۔ وہ اسے اپنی وجہ سے مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

"وسینور سکندر! میں کوئی بھی کام ادھورا نہیں کرتی' یہ میری عادت ہے۔ تمہیں ساتھ لے کر آئی ہوں تو اب ساتھ واپس لے کر بھی جاؤں گی۔ ایسی دکھی شکل مت بناؤ۔ میں آج کافی سالوں بعد نیپلز آئی ہوں۔ تمہاری بدولت اگر یہاں آہی گئی ہوں تو تھوڑا وقت یہاں گزارنا چاہتی ہوں۔ جب تک تم اپنی میٹنگ میں مصروف ہوگے میں یہاں کی کچھ آرٹ گیلریز کو وزٹ کرلوں گی۔ Napoletana پزا کھا لوں گی۔ بڑا عرصہ ہوگیا مجھے نیپلز کا پزا کھائے ہوئے۔"

وہ اسے یہاں نہ رکنے کے لیے اب مزید کچھ بھی کہہ نہیں سکتا تھا۔ پانچ چھ منٹ میں اپنے اس مختصر ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ لیزا نے اسے اس کمپنی کے آفس کے سامنے اتار دیا تھا۔

"جب تمہاری میٹنگ ختم ہوجائے تو تم مجھے کال کردینا۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے بولی تھی۔

وہ لیزا پر سے اپنی سوچ کو ہٹاتا ہوا بلڈنگ کے اندر داخل ہوگیا تھا کہ سردست اس کے لیے سب سے اہم چیز اس کی میٹنگ تھی۔

☆ ☆ ☆

میٹنگ ختم ہونے پر اس نے لیزا کو کال نہیں کی تھی۔ اسے یہ بات ہی بہت غلط محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اپنے دس کام چھوڑ کر یہاں نیپلز میں اس کی خاطر رکی ہوئی تھی۔ مگر لیزا نے خود ہی اسے فون کرلیا تھا۔

"وہ ختم ہوگئی میٹنگ؟"

"ہاں۔" وہ آج صبح سویرے سے اس کے احسان لیتا شرمندہ سے شرمندہ تر ہوئے چلا جا رہا تھا۔

"آجاؤ باہر میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔" وہ فوراً" ہی باہر آگیا تھا۔

"تم یہاں کب سے میرا انتظار کررہی ہو؟"

"پندرہ بیس منٹ ہوئے ہیں' مجھے آئے ہوئے زیادہ دیر سے نہیں کھڑی۔ جتنی دیر تمہاری میٹنگ چلی ہے میں نے دو آرٹ گیلریز وزٹ کرلیں۔ ایک دو جگہیں اور بھی جانے کا موڈ تھا' بچپن کی کچھ یادیں تازہ کرنے کا مگر میں نے سوچا وہاں کہیں مجھے دیر نہ لگ جائے۔ پھر بلاوجہ تمہیں میرا انتظار کرنا پڑے گا۔"

وہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔

"تمہاری میٹنگ کیسی رہی؟"

"بہت اچھی۔ سب کچھ بالکل ٹھیک ہوگیا۔" وہ پرسکون انداز میں بولا۔ لیزا کے چہرے پر خوشی بھرا تاثر آیا تھا۔

"چلو' یہ تو بہت اچھا ہوگیا۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔"

اس نے میٹنگ کے اچھے انداز میں ہوجانے پر خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی فوراً" اس کی طبیعت بھی پوچھی۔ ابھی وہ اس سوال کے جواب میں کچھ بھی

نہ بولا تھا کہ وہ فوراً سنجیدگی سے بولی۔

"اگر یہ پرسنل سوال نہیں اور تم جواب دینا چاہو تو بتادو ورنہ کوئی بات نہیں۔"

وہ اسے اس کی کہی بات جتا رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"نہیں یہ پرسنل سوال نہیں۔ میری طبیعت ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے۔ مگر صبح سے کافی بہتر ہے۔ اصل میں مجھے cervical pain ہو رہا تھا۔"

"اوہ تب ہی تم اتنی تکلیف میں لگ رہے تھے۔ تمہاری شکل دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ فکر سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہ اس بار جواباً کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

"تمہاری طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ورنہ میں نے سوچا تھا تمہیں نیپلز کی ایک دو خوب صورت جگہیں دکھاؤں گی تاکہ آئندہ تم نیپلز کو صرف منظم جرائم ہی کے حوالے سے نہیں بلکہ اس کے خوب صورت کوسٹل ایریا اور اس کی history rich (تاریخی اہمیت) کے حوالے سے بھی یاد رکھو۔" وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔

"تم نے میری بات دل پر لے لی۔ مجھے یقین ہے نیپلز بہت خوب صورت شہر ہے۔ میں نیپلز پہلی بار آیا ہوں مگر میں نے کئی موویز میں نیپلز کی کافی خوب صورت جگہیں دیکھ رکھی ہیں۔" لیزا اس کا جواب سن کر مسکرائی تھی۔

"چلو پزا کھاتے ہیں۔ نیپلز آکر تم نے یہاں کا پزا نہیں کھایا تو یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہو جائے گی۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دنیا بھر میں مقبول یہ ڈش نیپلز میں غریبوں کی خوراک کے طور پر تیار کی گئی تھی آج سوچو تو کس قدر عجیب ہوتا ہے۔"

وہ اور لیزا نیپلز کی ایک خوب صورت پتھروں سے بنی سڑک کے کنارے واقع چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے باہر میز پر بیٹھے پزا کھا رہے تھے۔ باہر لگی میزوں پر ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگ بیٹھے تھے جن میں کچھ مقامی افراد تھے کچھ ٹورسٹ تھے۔ یہ نیپلز کا وہ حصہ تھا جو تاریخی عمارتوں سے بھرا تھا ہر دوسری بلڈنگ کم سے کم بھی دو تین سو سال پرانی تھی۔ جس ریسٹورنٹ میں وہ پزا کھا رہے تھے لیزا بتا رہی تھی کہ وہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل اور بہت قدیم تھا۔

"ہاں۔ نیپلز میں جب خوراک کی کمی ہو گئی تھی۔ غربت بہت بڑھ گئی تھی۔ تب غریب گھریلو عورتوں نے اپنے بچوں اور دیگر افراد خانہ کی خوراک کے لیے جو کچھ ان کے پاس دستیاب تھا اس سے کھانا بنانا شروع کیا تھا۔ انہوں نے میدہ، اولیو آئل ٹماٹر اور چند ہربس (herbs) کو اپنے گھروں میں موجود تندور میں بیک کر کے دنیا کا سب سے پہلا پزا تیار کیا تھا۔"

لیزا اس کی بات کے جواب میں پزا کے دریافت ہونے کی ہسٹری بیان کرنے لگی تھی۔

"آج بھی سارے اٹلی میں نیپلز کا پزا بیسٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔" لیزا اسے بتا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح کسی بھی طرح کے گوشت کے بغیر والا پزا کھا رہی تھی۔ شاید وہ گوشت کے دلدادہ نہیں تھی۔ پزا تو مزے کا تھا ساتھ آس پاس کا ماحول بھی بڑا زندگی سے بھرپور سا تھا۔ آس پاس سے گزرتے مقامی لوگ ٹورسٹس بندہ اکیلا بھی بیٹھا ہو تو بور نہ ہو۔ تاریخی عمارتوں کے درمیان گھری یہ جگہ واقعی دیکھے جانے اور وقت گزارے جانے کے لائق تھی۔

☆ ☆ ☆

جو کچھ زندگی اب تک اس کے ساتھ کرتی آئی تھی وہی ایک بار پھر دہرایا گیا تھا۔ وہ نہ سکندر کو ہرا سکتا تھا نہ ہی اس کے برابر آسکتا تھا۔ وہ نمبر دو تھا اسے ساری زندگی دوسرے نمبر ہی پر آنا تھا اتنی سی خواہش کی تھی اس نے کہ سکندر کی طرح اس کا بھی ہارورڈ میں داخلہ

ہو جائے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا' بے تحاشا محنت کی تھی' راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھا تھا' مگر وہ سکندر کے مقابلے میں پھر ہار گیا تھا' جہاں سکندر کو رسائی نصیب ہوئی تھی وہاں اس کے قدم پہنچ نہ سکے تھے۔

شہریار خان کو اس کے ہارورڈ میں داخلہ نہ مل سکنے کا زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بچپن کی باتیں تھیں جب وہ اسے سکندر کی مثالیں دے کر اس جیسا high achicever بننے کی تاکید کیا کرتے تھے اب شاید وہ اس سچائی کو تسلیم کر چکے تھے کہ ان کا دوسرے نمبر کا بیٹا ان صلاحیتوں اور قابلیت سے محروم ہے جو پہلی پوزیشن لینے والوں کے پاس ہوتی ہے' جو سکندر شہریار کے پاس ہے۔

وہ ذہین ہے مگر غیر معمولی ذہین نہیں' وہ قابل ہے مگر غیر معمولی قابلیت کا حامل نہیں' وہ محنتی ہے مگر اس قدرتی خوبی سے محروم ہے' جس کے بل پر لوگ دنیا فتح کرلیا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ سکندر شہریار نہیں۔ شہریار خان اس کی تعلیم پر بھی اتنا ہی پیسہ خرچ کر رہے تھے جتنا سکندر کی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے حوالے سے انہوں نے کچھ پلان نہیں کر رکھا تھا' مستقبل کی ساری پلاننگ انہوں نے سکندر کی کر رکھی تھی۔ کس سال اس کی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز پوری ہوں گی اور کس پوزیشن کے ساتھ ہوں گی' پھر کس سال وہ لاء کا امتحان پاس کرے گا اور کتنے امتیازی نمبروں کے ساتھ کرے گا' پھر وہ کس جگہ ملازمت سے اپنے شاندار و بے مثال پروفیشنل کیریر کا آغاز کرے گا۔ لہٰذا اس کا ہارورڈ میں ایڈمیشن نہ ہونا ان کے لیے کوئی دکھ کی خبر نہیں بنا تھا' اس کا کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا' سکندر نے اسے اس کے داخلے کی مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا۔

"مبارک ہو زین۔"

"کس بات کی مبارک باد؟" اس نے خشک لہجے میں پوچھا تھا' اسے لگا تھا سکندر نے اس پر طنز کرنے اور اس مذاق اڑانے کے لیے اسے فون کیا ہے۔ دیکھ لو جہاں میں ہوں وہاں تمہاری رسائی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

"تمہارا اتنی اچھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے' اس بات کی مبارک باد۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی بہت اچھی ہے زین۔"

"مگر ہارورڈ سے کم۔" اسے لگا دل ہی دل میں اس پر ہنستے سکندر نے یہ ضرور کہا ہوگا۔ اسے سکندر کی خوشی تمسخرانہ اور اس کی ہنسی اپنا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا' وہ سکندر کے لبوں کی ہنسی اور اس کی زندگی کی ہر خوشی اس سے چھین لے۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں واپسی کے سفر پر تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا تھا۔

"میری وجہ سے تمہارا آج کا پورا دن ضائع ہو گیا۔ یقیناً" تمہاری آج کے دن کے لیے اپنی بہت سی مصروفیات ہوں گی۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اب اس کے درد میں بہت کمی تھی۔

"میں آج کل اپنی ویکیشن (چھٹیاں) انجوائے کر رہی ہوں۔ لہٰذا وقت کی کوئی کمی نہیں۔ اچھا ہوا تمہارے ساتھ آ گئی' اس بہانے کئی سال بعد میں نے نیپلز دیکھ لیا' میں یہاں آخری بار شاید چھ' سات سال پہلے آئی تھی۔"

وہ جتنا اس کا ممنون' زیر بار اور احسان مند ہو رہا تھا وہ اتنا ہی یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ آ کر اس نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ وہ کہاں جاب کرتی ہے' جو آج کل اپنی چھٹیاں انجوائے کر رہی ہے' اس نے پوچھا نہیں۔

پھر ڈھائی گھنٹے کا سفر طے کیا گیا تھا۔ وہ روما کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ لیزا اس کی طرف دیکھ کر خیر مقدم کرنے والے انداز میں مسکرا کر اٹالین میں بولی۔

a roma la citta eterna"

"Benvenuto

وہ اس کے اٹالین جملے پر مسکرایا تھا۔

"La citta eterna تو سمجھ میں آگیا۔ باقی جملے کا مطلب بتاؤ۔"

"Welcome to roma the eternal city"

(لافانی شہر روما میں خوش آمدید)

وہ بڑے جذب سے بولی تھی۔ اس نے بغور لیزا کو دیکھا تھا۔

"تم اپنے شہر سے بہت پیار کرتی ہو' ہے ناں؟"

"ہاں بہت۔ مجھے اپنے روما سے عشق ہے۔ یہاں کی سڑکیں' یہاں کی گلیاں' یہاں قدم قدم پر بکھری ہسٹری۔ میں ان سب کی عاشق ہوں۔"

"حالانکہ تم تو رہتی ہی یہیں ہو۔ یہاں کی ہسٹری' آرٹ ہو یا آرکیٹیکچر سب کچھ ہر وقت ہی تو تمہارے ارد گرد موجود ہوتا ہے۔ عموماً" تو خوب صورت شہروں اور تاریخی جگہوں پر رہنے والے لوگ ان سب کو صبح شام دیکھ دیکھ کر فار گرانٹڈ (for granted) لینے لگتے ہیں۔"

وہ اپنے شہر سے اس کی والہانہ محبت محسوس کر کے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں اپنے شہر کی کسی بھی چیز کو for granted نہیں لیتی۔ میں روما کی ہسٹری' آرٹ' آرکیٹیکچر کسی بھی چیز سے بور نہیں ہوتی۔"

لیزا نے بولتے بولتے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اپنی عادت کے مطابق مسکرا نہیں رہی تھی بلکہ قدرے سنجیدہ تھی۔

"پتا ہے سکندر! جب کوئی چیز ہم سے چھن جاتی ہے تب ہمیں اس کی زیادہ قدر ہو جاتی ہے۔ اگر میں ہمیشہ روما میں رہتی تو شاید اس کی یوں قدر نہ کرتی جتنی آج کرتی ہوں کیونکہ اب یہ ہر وقت میرے سامنے نہیں ہوتا۔"

اس نے لیزا کے چہرے پر ایک دکھ بھرا احساس ابھرتے دیکھا۔ وہ جس روز سے اس سے ملا تھا اس نے اس لڑکی کو صرف بے تحاشا بولتے اور ہنستے ہی دیکھا تھا۔ نجانے وہ اپنے اندر کس طرح کا دکھ بسائے ہوئے تھی۔ کیا دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں؟ اور کسی کو نہیں مگر کم از کم مسکراہٹیں اور خوشیاں بکھیرتی اس لڑکی کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ زندگی کو اس لڑکی کو تو خوشیاں دینی چاہیے تھیں۔

وہ آج صبح جب سے اس کے ساتھ تھا' اپنی عادت کے برخلاف کتنا زیادہ بولا تھا' کتنی بار مسکرایا تھا۔ وہ چند دنوں بعد جب روما سے واپس چلا جائے گا تب لاکھ وعدے کر لینے کے باوجود بھی اس انجان لڑکی سے کبھی کوئی رابطہ نہیں رکھے گا مگر پھر بھی وہ اس اجنبی لڑکی کو اس لیے ہمیشہ یاد رکھے گا کہ اس کی وجہ سے آج پورے بارہ سالوں بعد وہ اس طرح مسکرایا ہے' اتنا زیادہ بولا ہے۔ لیزا اس کی سوچوں سے انجان اسے بتا رہی تھی۔

"میں تیرہ سال کی تھی جب میرے ممی پاپا کی ڈائی ورس ہو گئی تھی۔ علیحدگی کے وقت ان دونوں کے درمیان جس طرح باقی تمام چیزوں کا بٹوارہ ہوا تھا' اسی طرح ہم دونوں بہنوں کا بھی۔ اس مہذبانہ بٹوارے میں' میں پاپا کے حصے میں آئی تھی اور میری بہن ممی کے۔ میری ممی کا تو یہ ملک تھا' وہ یہاں سے کیوں جاتیں۔ میرے پاپا البتہ اٹالین نہیں تھے' انہوں نے یہاں کی صرف نیشنلٹی لے رکھی تھی۔ ممی سے علیحدگی کے بعد وہ یہاں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر لندن چلے گئے تھے۔ اور یوں سکندر! تیرہ سال کی عمر میں مجھ سے میرا روما چھن گیا تھا۔"

وہ دکھ بھرے لہجے میں بولتے بولتے ایک پل کے لیے خاموش ہوئی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات توجہ سے سن رہا تھا۔

"میں یہاں سے گئی تو میرا دل یہیں رہ گیا تھا۔ میرا دل کبھی لندن کا نہ ہو سکا۔ میرا دل ہمیشہ یہیں رہا' میرے روما میں۔ میرے پاپا کا ملک تو نہ اٹلی تھا نہ انگلینڈ' ان کا ملک تو پاکستان تھا' سو وہ روم میں رہتے یا لندن میں ان کے لیے کچھ فرق نہ تھا۔ ان کی جذباتی

وابستگی تو ان دونوں میں سے کسی بھی جگہ سے نہیں تھی۔"

لیزا کی ساری بات میں اس کے لیے حیرانی کی بات اس کے والد کا پاکستان سے تعلق ہونا تھی۔ اسے پہلے دن سے لے کر آج تک کبھی ایک پل کے لیے بھی لیزا کے مکمل اٹالین ہونے پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار حیرت سے پوچھا تھا۔

"تمہارے والد پاکستان سے ہیں لیزا؟"

لیزا نے اس کی حیرت کو حیرت سے دیکھا پھر جیسے کچھ یاد کر کے اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

"دیکھو ذرا ہم کتنے دنوں سے مل رہے ہیں مگر ابھی تک ایک دوسرے سے مکمل طور پر اپنا تعارف تک نہیں کروایا ہے۔"

بات مکمل کر کے پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی پھر کچھ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

"ویسے ابھی تک تعارف ٹھیک سے نہ ہو پانے کی وجہ یہ بھی رہی کہ تمہیں پرسنل باتیں کرنا پسند نہیں ہے سو میں تمہارے تعارف سے محروم رہی اور تم اتنا روڈ ہو کر ملتے تھے کہ اپنے بارے میں بھی کبھی ڈھنگ سے کچھ بتا نہیں سکی۔"

وہ اس کی بدتمیزی اسے جتا رہی تھی اور آج مشکل وقت میں اس کی مدد کر کے اب اتنا حق تو وہ رکھتی تھی کہ اس کی بدتمیزی اور بداخلاقی کا ذکر کر سکے۔ وہ تھوڑا شرمندہ سا ہوا تھا۔ یہ بالکل سچ تھا کہ آج تک اس نے اسے یہ موقع دیا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا مکمل تعارف کرا پاتی۔ وہ شرمندگی کے حصار سے نکلنے کے لیے سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری شکل صورت سے لے کر نام تک کسی بھی چیز سے مجھے کبھی یہ نہیں لگا کہ تم اٹالین اور کرسچن نہیں ہو۔"

"لیزا Hebrew (عبرانی) نام ہے اور یہ نام مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کی ہوئی۔"

تو لیزا پاکستانی اور مسلمان باپ اور اٹالین اور کرسچن ماں کی بیٹی تھی۔ اسے اس انکشاف پر حیرت ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی حیرت کا اظہار کر نہیں رہا تھا۔ ایسا کرنا اسے بچکانہ پن لگ رہا تھا۔

"باقی میرا تعارف یہ ہے کہ میں لندن میں رہتی ہوں۔ میں نے لندن سے پینٹنگ میں ماسٹرز کیا ہے۔ میں وہاں رائل کالج آف آرٹس میں پینٹنگ لینڈ اسکیپ اور اسٹل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ پینٹنگ میرا پیشن (عشق) بھی ہے۔ پروفیشن بھی۔ جاب سے بچ جانے والے ٹائم میں، میں پینٹنگز بناتی ہوں، اپنی ایگزیبشن کی تیاریاں کرتی ہوں۔ اپنی لائف میں کافی مگن، کافی مصروف رہتی ہوں۔ مگر میں جتنی بھی مصروف ہو جاؤں، سال کے یہ دو مہینے لازماً روما میں گزارتی ہوں۔ اپنے اس روٹین پر میں اٹھارہ سال کی عمر سے کاربند ہوں۔ میں نے روما سے جا کر بھی اپنا رشتہ کبھی یہاں سے ٹوٹنے نہیں دیا، اسی لیے میرے اسکول کے دوست، بچپن کے ملنے جلنے والے ان سب سے میرا آج بھی یہاں پر وہی پہلے جیسا تعلق ہے۔ میں آج بھی لندن سے زیادہ روما ہی میں خود کو ایٹ ہوم محسوس کرتی ہوں۔ میں یہاں ایسے آتی ہوں جیسے کوئی اپنے گھر آتا ہے، شاید اسی لیے تمہیں میں مکمل اٹالین بھی لگی تھی اور روما میرا گھر بھی لگا تھا۔"

وہ دونوں اب روم کی مصروف اور ٹریفک سے بھری سڑکوں پر سے گزر رہے تھے۔ اس کا ہوٹل اب نزدیک ہی تھا۔ مگر ٹریفک میں پھنسنے کے سبب وقت لگ رہا تھا۔

"میرا تعارف تو ہو گیا۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ؟" وہ دونوں اس سڑک پر سے ٹریفک میں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تب لیزا اس سے بولی۔

"میں!" اس نے ایک پل کے لیے سوچا، پھر سنجیدگی و بردباری سے بولا۔

"میں نے امریکہ سے لاء میں بیچلرز ڈگری لی ہے۔ روبرٹو ہی کی کمپنی کے دوہا میں واقع ہیڈ آفس میں لیگل ایڈوائزر ہوں۔"

وہ جیسے ہی اپنے بارے میں مختصر لفظوں میں بول کر

خاموش ہوا۔ لیزا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"اتنا تفصیلی تعارف؟ میں سنتے سنتے تھک گئی۔ تم بولتے بولتے نہیں تھکے؟"

وہ اس کا طنز سمجھ رہا تھا، مگر جواباً خاموش رہا تھا۔ لیزا! آنکھوں میں شرارتی سی چمک لیے، مسکرا کر مزید بولی۔

"تم اگر اپنے تعارف میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی اور بولتے تو میں بہت حیران ہوتی کیونکہ میں یہی توقع کر رہی تھی کہ سینور سکندر نے مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتانا ہے۔"

وہ اس کے صاف گو انداز پر تھوڑا کھسیانا سا ہوا تھا۔ گاڑی اس کے ہوٹل کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ خود کو اس کھسیاہٹ سے نکال کر اس نے ممنونیت سے لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ بہت اچھے لفظوں اور بہت اچھے انداز میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔

"لیزا! تمہارا بہت شکریہ۔ تم نے میرے لیے بہت زحمت اٹھائی ہے۔"

وہ مزید بھی کچھ اور جملے بولنا چاہتا تھا مگر لیزا نے اسے اس کی بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"سینور سکندر! اس طرح کی رسمی باتوں سے مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے اور ویسے بھی آپ کے اوپر آپ کا روڈ انداز زیادہ جچتا ہے۔ ساری دنیا سے ناراض، غصے میں بہت کم کم بولتے ہوئے۔"

وہ ہنس کر اسی بے تکلفانہ و شریر انداز میں بولی تھی۔ اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے وہ بھی خوش دلی سے مسکرا دیا تھا۔ لیزا نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

"کیا اب ہم دوست ہیں؟"

اس نے مصافحہ کے لیے بڑھا لیزا کا ہاتھ تھاما تھا۔

"ہاں۔" وہ روم سے جا کر زندگی بھر اس سے ملے گا نہیں، اس سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھے گا تو دوستی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ مگر وہ نا بول کر اس کا دل بھی نہیں توڑ پایا تھا۔ "او کے سینور سکندر تمہاری اس دوست کی تمہیں advice (نصیحت) یہ ہے کہ اپنے ہوٹل روم میں جا کر اب میڈیسن لے کر صرف اور صرف آرام کرنا کیونکہ تمہاری طبیعت مجھے ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ سینور سکندر کا لفظ بولا بڑے مزے میں کرتی تھی۔ وہ اس کے اس انداز پر ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہوٹل روم میں آ کر ابھی جوتے ہی اتار پایا تھا کہ اس کے موبائل پر کسی کی کال آنے لگی۔ اس کا موبائل ٹیبل پر رکھا تھا۔ وہ اٹھ کر میز کے پاس آیا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ یہ کال آمنہ کی تھی۔ اس کے چہرے کے سخت سے تاثرات یکلخت ہی نرمی میں تبدیل ہوئے تھے۔ اس نے بہت جلدی کے عالم میں کال ریسیو کی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات سے عاری نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہی وقت میں بہت سے جذبات تھے۔ محبت، خوشی، اداسی، شکوہ، رنج، وہ فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سکندر کو اس کے ہوٹل چھوڑنے کے بعد وہ سیدھی گھر آ گئی تھی۔

Eur Fermi پر اس کا اپنا خوب صورت اپارٹمنٹ تھا۔ خوب صورت رہائشی عمارتوں کے بیچ کشادہ سڑک پر یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی جس کی تیسری منزل پر اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ بیسمنٹ میں مکینوں کے لیے پارکنگ ایریا تھا جبکہ گراؤنڈ فلور سے لے کر چوتھی منزل تک ہر فلور پر بس ایک ایک اپارٹمنٹ تھا۔ تمام اپارٹمنٹس کشادہ اور خوب صورت تھے۔

5 سال قبل اس کے بابا نے اپنی کچھ پراپرٹی ان دونوں بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی تھی تب اپنے حصے کا کچھ پیسہ بینک میں رکھ چھوڑنے کے بعد بقایا رقم سے اس نے یہ اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ اس سے قبل ہر سال وہ چھٹیوں میں روم آتی تو ہوٹل میں ٹھہرتی تھی۔ اپنا یہ اپارٹمنٹ یہاں خرید کر اسے بڑا سکون ہوا تھا۔ اب اپنے روما سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ کہ اب یہاں اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ سال کے دو ماہ یہاں گزارتی تھی باقی وقت اس کے اپارٹمنٹ کی دیکھ بھال نینی کیا کرتی تھیں۔

کچن سے کام کیے جانے کی آوازیں آ رہی تھیں گویا نینی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

”ہائے نینی!“ اس نے کچن کے دروازے سے اندر جھانکا۔ رات بھر کے جاگنے اور دوسرے شہر تک جانے آنے کی تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر مسکراہٹ بدستور اس کے لبوں پر موجود تھی۔

”آ گئیں؟ یہ اچانک صبح سویرے تمہیں Naples جانے کی کیا سوجھی؟ صبح ہڑبونگ مچاتی اتنی جلدی میں گئیں، مجھے پوچھنے تک کا موقع نہیں دیا کہ اتنی افراتفری میں جا کس کام سے رہی ہو؟“

نینی نے گردن گھما کر قدرے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

ساٹھ سال کی عمر میں وہ اب بھی چاق و چوبند تھیں اور لیزا کو وہ اسی طرح عزیز تھیں جیسے ایک بچے کو اپنی ماں۔ وہ بچپن میں اس کی اور سیم کی آیا تھیں مگر اس نے انہیں کبھی اپنی ملازمہ نہیں سمجھا تھا۔

”وہ لمبی کہانی ہے نینی! ذرا فریش ہو آؤں پھر سناتی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی اور چھپاک سے کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کے اپارٹمنٹ میں 2 بیڈ رومز، کچن، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے علاوہ اوپر کی منزل پر واقع ایک کمرہ جسے اس نے اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا موجود تھے۔ ایک کمرہ اس کا تھا ایک نینی کا۔

ڈرائنگ روم زیادہ تر لیونگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ تب ہی اس نے ٹی وی بھی وہیں رکھا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے بیچ میں کوئی دیوار نہ تھی۔ یہیں سے لکڑی کی گول چکردار سیڑھی اوپر کمرے میں جاتی تھی۔ جہاں آخری اسٹیپ چڑھا اور اوپر کمرے میں موجود۔ وہ کمرہ اندر داخل ہوتے ہی پتا دیا کرتا تھا کہ وہ کسی آرٹسٹ کا اسٹوڈیو ہے۔ وہاں جا بجا اس کی مکمل اور نامکمل پینٹنگز اور پینٹنگز بنانے سے متعلقہ سامان بکھری حالت میں پڑا نظر آتا تھا۔ اسٹوڈیو کا باہر کی طرف کھلنے والا شیشے کا دروازہ چھوٹی سی بالکونی میں کھلتا تھا۔ وہاں اس نے کچھ گملے اور ایک آرام دہ کرسی رکھی ہوئی تھی۔ جب کبھی کام کرتے کرتے تھکاوٹ کا احساس ہوتا یا کئی گھنٹے اسٹوڈیو میں گزارنے پر گھٹن محسوس ہونے لگتی تب وہ بالکونی میں آ کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

اپنے اس اپارٹمنٹ کو اس نے اپنی سہولت کے مطابق سیٹ کر رکھا تھا۔ اس کے لندن کے اپارٹمنٹ سے جہاں وہ سال کے 10 ماہ گزارا کرتی تھی، یہ اپارٹمنٹ کہیں زیادہ پیارا تھا جس میں وہ سال کے صرف دو ماہ گزارتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اب پوچھیں آپ کیا پوچھ رہی تھیں؟“

کچن میں موجود 4 کرسیوں والی چھوٹی میز پر وہ اور نینی ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ تبھی اس نے اپنے

دوستوں وغیرہ کو کھانے پر بلا رکھا ہوتا تب ڈائننگ روم میں بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا تھا ورنہ صرف وہ اور نینی ہوتے تو کچن ہی میں میز پر کھانا' ناشتہ سب ہو جایا کرتا۔

"اتنی افراتفری میں منہ اندھیرے Naples جانے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔" نینی نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"روبرٹو کا ایک کولیگ ہے سکندر نام ہے اس کا' روما میں روبرٹو ہی کی کمپنی میں لیگل ایڈوائزر ہے میں اس سے کئی بار مل چکی ہوں۔ اسے ایک میٹنگ کے لیے نیپلز جانا تھا اس کی ٹرین مس ہو گئی تو بس پھر میں اسے وہاں لے گئی۔ میں نے سوچا اس بہانے Naples بھی دیکھ لوں گی۔ کتنے سال ہو گئے تھے مجھے وہاں گئے۔"

اس نے اپنی پلیٹ میں پاستا ڈالتے ہوئے نینی کو جواب دیا۔

"روبرٹو کے کسی کولیگ کے لیے خود کو اتنا خوار کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔" نینی نے تھوڑا برا سا منہ بنایا۔

"وہ اب صرف روبرٹو کا کولیگ نہیں ہے' میری بھی اس سے دوستی ہو گئی ہے۔"

"تمہاری دوستیوں میں نیا کیا ہے۔ کس سے نہیں ہو جاتی تمہاری دوستی؟"

"میری اچھی عادت کا ذکر تو اچھے انداز میں کریں نینی۔" اس نے جیسے برا مان کر صدائے احتجاج بلند کی۔

نینی اس کے انداز پر مسکرائی تھیں۔ انہوں نے اس کی پلیٹ میں چکن کا ایک پیس رکھا۔

"ٹھیک سے کھاؤ۔" وہ ان کے محبت بھرے انداز پر مسکرائی تھی۔ اسی وقت فون کی بیل بجی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھی تھی۔ کچن کے سامنے والا کمرہ اس کا تھا درمیان میں خوب صورت اٹالین ٹائلز سے مزین کوریڈور تھا۔

وہ تیز رفتاری سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور اسکرین پر چمکتا نمبر دیکھ کر ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ یہ کال کس کی ہے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم ہی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہ محمود خالد اس کے پاپا کی کال تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

"السلام علیکم پاپا!" سپاٹ انداز میں اس نے انہیں سلام کیا۔ ایسے جیسے کسی جان پہچان کے خود سے عمر میں بڑے شخص کو ادب اور احترام سے سلام کیا جاتا ہے۔

"وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟" محمود خالد نے محبت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایک تلخ سا تاثر آ گیا۔ اسے اپنے پاس پاکستان بلانے کے لیے' سیم کی طرح اس کی بھی اٹھا کر کسی پاکستانی سے زبردستی شادی کروانے کے لیے یہ محبت بھرا لہجہ اور فکر ظاہر کرتا انداز بنایا جاتا تھا ورنہ ساری زندگی اپنی دونوں بیٹیوں کو نظر انداز کرنے اور انہیں تکلیف پہنچانے کے سوا انہوں نے کیا ہی کیا تھا؟

"میں ٹھیک ہوں پاپا! آپ کیسے ہیں؟"

اس نے ان سے کبھی بدتمیزی نہیں کی تھی' کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی مگر جس روز سے ان کی وجہ سے اس سے اس کا ملک' اس کا گھر اور اس کی بہن چھن گئی تھی وہ ان سے پھر کبھی ویسی محبت نہ کر پائی تھی جیسی زندگی کے 13 سالوں تک کرتی رہی تھی۔ اس کے اندر وہ 13 سال کی بچی آج بھی اپنے باپ سے اپنا گھر چھن جانے اور اپنی بہن سے بچھڑ جانے پر خفا تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! بس آج تمہاری یاد آ رہی تھی۔ میں نے سوچا تمہیں فون کروں۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ آج کل تم روم آئی ہوئی ہو گی۔"

"ہاں میں اپنے روما آئی ہوئی ہوں جسے آپ نے مجھ سے چھین لیا تھا۔"

وہ یہ بول نہیں پائی تھی ہاں سوچا ضرور تھا۔ بولی تو صرف اتنا تھی۔ "جی۔"

وہ ذہنی اور جذباتی طور پر خود کو ان سے اتنی دور لے جا چکی تھی کہ ان سے بات کرتے ہوئے اسے گفتگو کا موضوع یا جملے یوں سوچنے پڑتے گویا کسی اجنبی سے

بات کر رہی ہو۔

"آج کل کیا ہو رہا ہے بیٹا؟ ریسٹ کر رہی ہو یا کسی ایگزیبیشن کی تیاری ہے؟"

"ایگزیبیشن کی تیاری کر رہی ہوں۔ اگلے مہینے فلورنس میں میرا سولو شو ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر تو خوب مصروف ہو گی تم؟"

وہ اس کے آرٹسٹ بننے کے مخالف رہے تھے۔ ہر وہ چیز جس سے اسے خوشی ملتی تھی، وہ اس کے مخالف رہے تھے، پھر پتا نہیں اب وہ کیسے اس کی پینٹنگز اور ایگزیبیشنز کے متعلق اتنے خوشگوار انداز میں بات کر لیا کرتے تھے۔

"آنٹی کیسی ہیں؟"

اس نے مروتاً اپنی سوتیلی ماں کی خیریت پوچھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے اور اس کی سوتیلی ماں کے بیچ کوئی روایتی قسم کے تعلقات تھے، بس ایک غیریت اور اجنبیت تھی وہ کئی سال لندن میں محمود خالد اور ان کی بیوی کے ساتھ رہی تھی مگر یوں جیسے کسی دور کے واقف یا ملنے جلنے والے کے ساتھ رہ لیا جائے۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ مجھ سے کہتی رہتی ہے کہ میں تمہیں تمہاری چھٹیوں میں پاکستان بلواؤں۔"

ان کے دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔ ایک تلخ سا تاثر اس کے چہرے پر ابھرا تھا۔

دو منٹ کی فون کال جس میں رسمی باتوں کے سوا اس نے کوئی بات نہیں کی تھی، ختم کر کے وہ بجھے بجھے سے انداز میں بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی، زندگی سے خوش رہتی تھی مگر جس وقت بھی اس کی اپنے ماں یا باپ سے بات ہوتی اس کے لبوں کی ہنسی اور چہرے کی خوشی درد اور غم میں بدل جاتی، پھر آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ بچپن کی ہر محرومی ہر دکھ یاد آ جایا کرتا۔ اپنا وہ گھر یاد آ جایا کرتا جہاں اس کا اور سیم کا بچپن گزرا تھا۔

اس کی جاب لندن میں تھی۔ اگر جاب کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کب کا دوبارہ روم ہی میں سیٹل ہو چکی ہوتی۔ اپنی اتنی اچھی جاب کو چھوڑ دینا اسے حماقت لگا تھا۔ اب وہ 13 سال کی لیزا محمود نہیں تھی جس کے بارے میں اس کے ممی پاپا فیصلہ کریں گے کہ اس نے کہاں رہنا ہے اور کس کے ساتھ رہنا ہے۔ اپنی عمر کے 18 ویں سال سے اپنے فیصلے اس نے خود کرنے شروع کر دیے تھے۔

محمود خالد کو اس کے کسی ایک نہیں، بے شمار فیصلوں سے اختلاف تھا، مگر اسے ان کے اختلاف کی کبھی فکر نہ رہی تھی۔ وہ دنیا میں اگر کسی کی مانتی تھی تو وہ سیم تھی۔ اس کی بہن، اس کی دوست، اس کی ماں، اس کا باپ۔ کبھی وہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں ساتھ رہا کرتی تھیں۔ کتنا پیار تھا ان دونوں بہنوں میں سیم اس کا کس طرح خیال رکھا کرتی تھی۔ اسکول کے اندر، اسکول سے باہر وہ ہر جگہ لیزا کا سایہ بنی رہتی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں ساتھ سوتی تھیں۔ رات دیر تک جاگ کر باتیں کیا کرتیں۔ نینی ان کے کمرے میں انہیں دیکھنے آتیں تو وہ دونوں سوتی بن جایا کرتیں۔ ان کے والدین کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ یہ شادی ہی غلط ہوئی تھی۔ محمود خالد مغرب کی ایک عورت کو بیوی بنا لینے کے بعد اس سے مشرقیت کی توقع رکھتے تھے۔ اگر ایک اعلا تعلیم یافتہ، خوب صورت اور دولت مند پاکستانی مسلمان مرد سے شادی کرنے کے لیے وٹوریا جیووانی نے اسلام قبول کیا تھا، اپنا نام تبدیل کر لیا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ یہ تبدیلی دائمی تھی۔ جس خطے سے ان کا تعلق تھا اس تعلق کی نسبت سے انہیں جیسا ہونا چاہیے تھا، وہ ویسی ہی تھیں۔ محمود خالد وٹوریا کو خدیجہ بنانے کی لاکھ کوششیں کر لیتے، انہیں کامیابی نہیں ملنا تھی۔ وہ مغرب کی ایک عورت کو مشرقی انداز کی بیوی اور ماں کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے مگر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟ وٹوریا نے اسے اور سیم کو صرف پیدا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بحیثیت ایک ماں کے ان کا ان دونوں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

اوپر تلے کی چھوٹی بچیاں گھر پر آیا کے رحم و کرم پر ہوتیں اور ان کی اٹالین ماں رات گئے پارٹیز اٹینڈ کر کے گھر واپس آیا کرتی تھیں۔ لیزا ماں اور باپ دونوں کی جانب سے نظر انداز کی گئی تھی جبکہ سیم اس معاملے میں اس کے مقابلے میں نسبتاً" یوں خوش قسمت رہی تھی کہ بچپن میں محمود خالد سیم سے بہت پیار کرتے تھے۔ سیم شکل و صورت اور ذہانت میں بالکل محمود خالد جیسی تھی جبکہ لیزا دکھتی بھی وٹوریا کی طرح تھی اور ذہنی صلاحیتیں اور قابلیت بھی اس میں اپنے باپ جیسی نہ تھیں۔ وہ نہ کبھی ماں کی توجہ پا سکی نہ باپ کی۔ اسے توجہ' پیار اور محبت اگر کہیں سے ملی تو سیم کے پاس سے۔ سیم بے تحاشا خوب صورت تھی' بے پناہ ذہین پُر اعتماد اور غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی جبکہ وہ سیم کے مقابلے میں ہر چیز میں اوسط درجے کی رہی تھی۔ پڑھائی میں بری نہیں تھی' اچھی تھی پر سیم کی طرح پوزیشن ہولڈر اور گولڈ میڈلسٹ کبھی نہیں رہی تھی۔ اسکول میں سب اسے سیم کی وجہ سے پہچانا کرتے تھے۔ وہ سیم پر فخر کیا کرتی تھی۔ اپنی اس بے تحاشا حسین اور ذہین بہن پر اسے ناز ہوتا تھا۔

دوسری جانب سیم اسے اس کے آرٹ کے حوالے سے سراہتی رہتی تھی کہ اس میں پینٹنگ کی خداداد صلاحیت ہے اور وہ بڑی ہو کر ایک کامیاب آرٹسٹ بن سکتی ہے۔ اسے بچپن ہی میں یہ اعتماد سیم نے دیا تھا۔ جو ذمہ داریاں ماں باپ کی ہوتی ہیں اس کے لیے تو وہ ذمہ داریاں بھی سیم ہی نے نبھائی تھیں۔ اس کی ہمت بڑھانا' اس کی پروا کرنا ہر مشکل میں اس کے ساتھ کھڑے ہونا اور اس سے بے حد' بے حساب پیار کرنا۔

اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وٹوریا اور محمود خالد باضابطہ طور پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ محمود خالد نے اپنی پوسٹنگ لندن کروالی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر لندن جا رہے تھے جبکہ وٹوریا اور محمود کے مابین طے شدہ معاہدے کے تحت سیم کو وٹوریا کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ اور سیم ایک دوسرے سے لپٹ کر بہت روئی تھیں۔ آخری رات جو انہوں نے اپنے گھر میں ساتھ گزاری' وہ دونوں بہنیں اس ساری رات روتی رہی تھیں۔ سیم روتی بھی رہی اور اسے پیار کر کر کے یہ سمجھاتی بھی رہی تھی کہ ان دونوں بہنوں کو کوئی بھی' کبھی جدا نہیں کر سکتا۔

"الگ ممی' پاپا ہو رہے ہیں لز! ہم دونوں نہیں ہمیں کوئی بھی الگ نہیں کر سکتا۔ میں ابھی 14 سال کی ہوں ناں! صرف 4 سال رک جاؤ۔ ذرا میں 18 سال کی ہو جاؤں' پھر دیکھنا تم سے ملنے میں جب دل چاہے گا آیا کروں گی۔ پھر نہ ممی مجھے تم سے ملنے' تمہارے پاس آنے سے روک سکیں گی نہ پاپا۔"

پھر وہ محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی اور سیم

وہ وٹوریا کے ساتھ اٹلی ہی میں رہی تھی۔ محمود خالد سے شادی کے لیے جو ان کی ماں نے ظاہری طور پر اپنا مذہب تبدیل کیا تھا اسے ترک کر کے وہ واپس اپنے اصل مذہب پہ چلی گئی تھیں۔ وہ خدیجہ سے پھر وٹوریا ہو گئی تھیں۔ طلاق کے فوراً" بعد ہی انہوں نے اس فرنچ فیشن ڈیزائنر سے شادی کر لی تھی جو ان کی اور محمود خالد کی طلاق کی وجہ بنا تھا۔ وہ ایک مشہور فیشن ڈیزائنر اور ارب پتی تھا۔ گویا محمود خالد سے طلاق لے کر وٹوریا نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ ان کا فیشن ڈیزائنر شوہر دنیا بھر کے فیشن اور ڈیزائن کے دار الحکومت سمجھے جانے والے شہر Milan میں رہتا تھا سو شادی کر کے وہ اس کے ساتھ Milan چلی گئی تھیں۔ سیم بھی ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ سیم روم میں تھی تو اس کا اپنے روما سے ایک رابطہ تو تھا وہ Milan چلی گئی تو روما سے جیسے ناتا ٹوٹتا محسوس ہوا۔

محمود خالد کی ملازمت شاندار تھی سو لندن میں بھی ان کے گھر میں وہی ٹھاٹ باٹ اور عیش و آرام تھے جو روم میں تھے مگر وہ وہاں کبھی ایک پل بھی دل سے خوش نہ رہ سکی تھی۔ وہ نہ اس گھر کو اپنا سمجھتی تھی نہ اس اسکول کو نہ لندن کی سڑکیں اور گلیاں کبھی اسے اپنا پنا

سکیں۔ اس کا دل تو وہیں اس کے روما میں سیم کے اور اس کے مشترکہ کمرے ہی میں رہ گیا تھا۔

سیم Milan میں پڑھ رہی تھی اور وہ لندن میں۔ سیم کے تعلیمی اخراجات و دیگر اخراجات کے لیے محمود خالد اسے باقاعدگی سے رقم بھجواتے تھے سو سیم کی تعلیم پہلے ہی کی طرح بہت اچھی ہو رہی تھی' وہ اسی طرح کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہی تھی ورنہ شاید وٹوریا کا فرنچ شوہر نکولس سوتیلی بیٹی کی شاندار تعلیم کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا۔ وہ سوتیلی بیٹی پر اپنا کوئی پیسہ خرچ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کا رویہ سیم کے ساتھ کوئی بہت دوستانہ نہ تھا۔ سیم فون پر بات ہونے پر اسے بتایا کرتی تھی کہ نکولس بیوی کے ساتھ جہیز کے طور پر ملی اس بیٹی کو صرف اور صرف ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ لیزا' سیم کے لیے کڑھا کرتی کہ وہ خود باپ کے ساتھ لندن میں عالیشان زندگی گزار رہی ہے اور سیم ماں کی شفقت و محبت سے محروم سوتیلے باپ کی تلخ نگاہوں اور کڑوی باتوں کے بیچ انتہائی مشکل زندگی گزار رہی تھی۔ وہ تو سیم تھی جو بہت بہادر اور پُراعتماد تھی تب ہی ان تمام حالات سے سمجھوتا کر گئی اگر سیم کی جگہ وہ خود ہوتی تو کبھی ان کٹھن حالات کا سامنا نہ کر پاتی۔

وہ 16 سال کی تھی اور سیم 17 کی جب ایک رات نشے کی حالت میں نکولس سیم کے کمرے میں آدھمکا تھا' مگر اس کے شور مچا دینے پر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اسے جب یہ بات پتا چلی' وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ اس کی نازوں پلی' بہن کس آزمائش میں گھر گئی تھی۔ اسے اس روز اپنے ماں اور باپ دونوں سے شدید ترین نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو زندگی بھر معاف نہیں کرے گی۔ ان دونوں بہنوں کا کیا قصور تھا جو انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا گیا؟ اس کے باپ نے ایک بیٹی کو گھر کا عیش و آرام اور تحفظ دے دیا اور دوسری کو سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا؟

وہ اس واقعہ کے بعد محمود خالد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی تھی۔ سیم اس واقعہ کے بعد ہوسٹل شفٹ ہو گئی تھی۔ وٹوریا بجائے اپنے بدکردار شوہر کو برا سمجھنے کے سیم کے خلاف ہو گئی تھیں اور باپ نے اس واقعہ کے بعد ایسی کوئی عملی کوشش نہ کی تھی کہ سیم کو اپنے پاس بلوا لیتے۔ وہ milan میں ہوسٹل میں رہ کر اپنے تعلیمی مدارج طے کر رہی تھی اور پہلے ہی کی طرح اب بھی سال میں ایک مرتبہ چھٹیوں میں محمود خالد اسے اپنے پاس لندن بلوایا کرتے تھے۔ سال بھر میں وہ واحد موقع ہوتا تھا جب وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے مل پاتی تھیں ورنہ تو وہ صرف فون پر ہی ایک دوسرے کی آواز سن پاتی تھیں۔

وہ 17 سال کی تھی جب محمود خالد نے ایک پاکستانی خاتون سے جنہیں اس کی دادی نے ان کے لیے منتخب کیا تھا' شادی کر لی۔ ان کی ماں سے محمود خالد کی شادی کو اس کی دادی بیٹے کا جوانی کے جنون میں کیا گیا ایک غلط فیصلہ قرار دیتی تھیں۔

عائشہ ایک پڑھی لکھی' اچھے خاندان کی' میچیور اور مذہبی رجحان رکھنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے لیزا کے ساتھ نہ کوئی بیر باندھا نہ اسے اپنا دشمن سمجھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتی تھیں' وہ انہیں آنٹی کہتی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ وہ باپ سے مزید دور ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ باپ کے گھر میں باپ اور ان کی بیوی کے ساتھ یوں رہتی تھی جیسے کوئی مہمان ہو۔ جیسے وہ اس کا گھر نہ ہو۔ اس کا دل باپ کی طرف سے کبھی صاف نہ ہو سکا تھا۔ وہ ان سے کبھی لڑی نہ تھی' کبھی کوئی گستاخی نہ کی تھی مگر اس نے زندگی کے کسی بھی چھوٹے بڑے فیصلے میں کبھی ان کی رائے اور ان کا مشورہ نہ مانا تھا۔

وہ چاہتے تھے وہ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھے' اس نے فائن آرٹس پڑھا۔ وہ جاب سے ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان واپس جا رہے تھے' وہ چاہتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے' اس نے صاف منع کر دیا۔ تب وہ اپنی

تعلیم مکمل کر کے لندن ہی میں جاب تلاش کر رہی تھی۔ پھر اسے جلد ہی ملازمت بھی مل گئی تھی۔

محمود خالد اسے ساتھ لے جانے کی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ اس اکیلی کے لیے وہ گھر بہت بڑا تھا سو اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا اور اپنی مرضی کے مطابق اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے پر پوری طرح مطمئن تھی۔ وہ کیوں وہ کام کرے جو محمود خالد اس سے کہہ رہے ہیں۔ اس کے اور سیم کے بچپن میں انہوں نے اور وٹوریا نے ان دونوں بہنوں کی پروا کی تھی جو آج وہ ان کی پروا کرے؟ وہ پچھلے 5 سالوں سے لندن میں تنہا رہ رہی تھی۔ محمود خالد کی آج بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ان کے پاس کراچی آجائے۔ وہ اس کی شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرانا چاہتے تھے۔ وہ 27 سال کی ہو گئی تھی اس کی شادی اب ہو جانی چاہیے تھی مگر وہ شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی تھی اور کم از کم کسی پاکستانی سے ہرگز نہیں۔ کم از کم یہ اطمینان اور خوشی وہ اپنے سنگدل باپ کو ہرگز نہ دینا چاہتی تھی کہ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں اپنے ملک کے مردوں سے کروائی ہیں۔ ساری زندگی پاکستان سے باہر گزار کر بھی وہ زندگی بھر اندر سے پاکستانی ہی رہے تھے تب ہی ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں لوٹے تھے۔ وہیں اپنا بزنس شروع کیا تھا اور سیم جسے 14 سال کی عمر میں وٹوریا اور سوتیلے باپ کے حوالے کر کے اس کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے تھے اس پر پھر اپنا حق جتانے کھڑے ہو گئے تھے۔

اپنے نئے نئے شروع کیے بزنس میں مزید فائدوں کے لیے انہوں نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف کے ساتھ کروادی تھی۔ سیم کا شوہر ہاشم اسد اس سے عمر میں پورے 15 سال بڑا تھا۔ اسے اپنے باپ کی موقع پرستی پر شدید غصہ آیا تھا۔ کیا کوئی باپ ایسا ہو سکتا ہے؟

سیم کے ساتھ دست درازی کی کوشش والے واقعہ کے فوراً بعد ہی وٹوریا کی نکولس سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک سال بعد پھر ایک اٹالین آدمی سے شادی کرلی تھی۔ سیم پھر بھی ماں کے پاس نہ رہی تھی۔ اس کی باقی تمام تعلیم ہوسٹلز وغیرہ میں ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے روم میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی وہ وہاں رہ رہی تھی۔

وہ چھٹیوں میں چند ہفتوں کے لیے محمود خالد کے پاس پاکستان گئی تھی۔ وہیں محمود خالد کے کاروباری دوست ہاشم اسد کی نگاہ انتخاب سیم پر آکر ٹھہری تھی۔ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ روپیہ پیسہ بے شک اس کے پاس بہت تھا' دولت کی ریل پیل تھی' personality (شخصیت) بھی اچھی تھی' مگر اس کی شہزادی جیسی بہن کی شادی ایک شادی شدہ مرد سے' جو اس سے عمر میں 15 سال بڑا تھا اور جس سے وہ بالکل بھی محبت نہ کرتی تھی' کس طرح کروائی جا سکتی تھی؟

لیزا نے سیم کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہ شادی نہ کرے۔ وہ پاپا کو چھوڑ کر واپس اٹلی چلی جائے' مگر سیم نے روتے ہوئے اسے یہ سمجھایا تھا کہ اس کے لیے یہ شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس نے شادی سے انکار کیا تو پاپا کو بزنس میں بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ جو نیا project وہ شروع کرنے جا رہے تھے' اس کے لیے انہوں نے ہاشم سے قرض لے رکھا تھا اور وہ قرض معمولی نہیں' ایک بہت بڑی رقم تھی۔

"ہونے دو پاپا کو Loss' ختم ہو جانے دو ان کا بزنس' وہ زندگی بھر تمہاری خوشیوں اور سکون کا گلا گھونٹتے آئے ہیں' میں اس بار انہیں تمہاری زندگی تباہ نہیں کرنے دوں گی۔"

وہ روتے ہوئے چلائی تھی' مگر اپنے چیخ و پکار کے باوجود بھی سیم کو بچا نہیں پائی تھی۔ سیم کی شادی ہاشم اسد کے ساتھ ہو گئی تھی۔

سیم کی شادی والے دن وہ لندن میں اپنے اپارٹمنٹ میں خود کو بند کر کے سارا دن روتی رہی تھی۔ وہاں اس کے پاپا کے ملک میں ان ہی کا ایک ہم وطن اس کی بہن کی خوشیوں کو اجاڑنے جا رہا تھا۔

دلہن بنی سیم نے اسے کراچی سے نکاح سے کچھ دیر قبل فون کیا تھا۔ وہ بڑی بہادر لڑکی تھی۔ وہ الٹا اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

"لز! میں خوش رہوں گی' ہاشم اچھے آدمی ہیں۔ تم میری فکر کیوں کرتی ہو سوئٹ ہارٹ؟"

"اپنے سے 15 سال بڑے' شادی شدہ اور طلاق یافتہ جس شخص کے ساتھ تمہیں زبردستی باندھا جا رہا ہے' تم اس کے ساتھ خوش رہو گی سیم؟" وہ جواباً" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی تھی۔

"میں پاپا کو اس ظلم کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی سیم! میں تمہاری زندگی کی خوشیاں چھیننے پر انہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی تھی۔

اور پھر وہ واقعی محمود خالد کو کبھی معاف نہیں کر سکی تھی۔ باپ سے بات کر کے جیسے سب کچھ پھر سے یاد آ گیا تھا۔ وہ سیم کو یاد کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہوئے ظلم و زیادتی کو سوچ کر آزردہ ہوتے ہوئے' بھیگی پلکوں کے ساتھ سو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
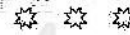
اور یہ خوب کمال بات تھی کہ صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی ہی سیم کے فون سے تھی۔

ہمیشہ کی طرح پھر یہی ہوا تھا کہ ادھر اس نے دل سے سیم کو یاد کیا ادھر سیم موجود ہوئی' یا فون پر یا پھر روبرو۔ سیم کی آواز سنتے ہی رات کی ساری اداسی اور دکھ پل بھر میں رخصت ہو گیا تھا۔

"سیم! آئی لو یو۔" اس نے بے اختیار اس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

"ہائیں! خیریت تو ہے Sis؟ میرے ہیلو کا جواب اس قدر رومانٹک؟" سیم حسب عادت خوشگوار موڈ میں تھی۔

"پتا ہے میں رات تمہیں سوچتے ہوئے سوئی تھی اور ابھی میری آنکھ تمہارے فون سے کھلی ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

سیم سے بات کر لینے کے بعد اب اس کا بگڑا موڈ ٹھیک ہو ہی جاتا تھا۔

سیم اس سے بات کرتے ہوئے کبھی اپنی شادی شدہ زندگی کے دکھڑے نہیں سناتی تھی۔ وہ اس طرح ظاہر کرتی تھی گویا اپنی شادی سے خوش ہو' مگر وہ صرف بہنیں نہ تھیں' سہیلیاں بھی تھیں' اور وہ جانتی تھی سیم نے زندگی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا' اس رشتے کو بہت اچھی طرح نبھا بھی رہی تھی مگر وہ دل سے خوش نہیں تھی۔ کبھی باتوں باتوں میں غیر اختیاری طور پر سیم کے منہ سے کچھ ایسا نکل جاتا جو اسے یاد دلا دیتا تھا کہ سیم نے اپنی خوشیوں اور خواہشات کا گلا گھونٹ کر' سمجھوتے کی زندگی کو اپنا لیا ہے' صرف اور صرف باپ کی خوشی کی خاطر۔

سیم اس سے بات کرتے ہوئے نہ خود کوئی اداسی ظاہر کرتی تھی' نہ اسے اداس رہنے دیتی تھی۔ وہ ان دنوں دفتری کام سے ترکی آئی ہوئی تھی اور اس کے پاس اسے سنانے کے لیے وہاں کے بہت سے دلچسپ قصے تھے۔ شادی کے بعد سیم نے ہاشم کی خواہش پر اس کی کمپنی کو جوائن کر لیا تھا۔ شکر تھا کہ سیم جیسی غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل لڑکی کو ہاشم نے گھر پر بٹھانے کی جاہلانہ کوشش نہیں کی تھی۔

سیم سے بات کر لینے کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے آفس میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی۔ کال کرنے والی شخصیت کے نام کو قدرے تعجب سے دیکھتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو!" اس کے ہیلو میں ہلکی سی اجنبیت موجود تھی۔

"Ciao سکندر۔" لیزا خوشگوار موڈ میں بولی۔ جواباً" وہ خاموش رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لیزا نے اسے کیوں فون کیا تھا۔

"کہاں گم ہو گئے؟ کیا یادداشت کھو گئی؟ میں لیزا ہوں۔" وہ اس کی خاموشی پر جیسے حیران ہو کر بولی تھی۔

"میں تمہیں پہچان گیا ہوں لیزا! میرے پاس تمہارا نمبر Save (محفوظ) ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"نمبر تو محفوظ ہے' پہچان بھی گئے ہو۔ مگر لگتا ہے یہ بھول گئے ہو کہ کل ہماری آخری بات یہ ہوئی تھی کہ ہم دونوں دوست بن گئے تھے۔" وہ اپنے اسی خوشگوار دوستانہ انداز میں بول رہی تھی۔

"مجھے یہ بات بھی یاد ہے۔" اس بار وہ ہلکا سا مسکرایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔

"شکر' صد شکر تمہیں میں بھی یاد ہوں' میری دوستی بھی یاد ہے' ورنہ تمہارے اجنبی سے "ہیلو" سے تو میں ڈر ہی گئی تھی۔ خیر اس بات کو چھوڑو' یہ بتاؤ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے قدرے حیرانی سے اپنی خیریت بتائی۔ کیا اس نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟

کل آمنہ سے بات کرنے کے بعد وہ بہت دکھی ہو گیا تھا۔ دس سے پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد وہ پھر سے جیسے دکھ کے سمندر میں اتر گیا تھا۔ ایسا بہت کچھ یاد آگیا تھا جس نے اس کی طبیعت کو پھر سے بوجھل کر دیا۔

"آواز سے تو بہت ٹھیک ابھی بھی نہیں لگ رہے۔" وہ دوستانہ سی فکر مندی کے ساتھ بولی۔

"میں نے ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس سے تمہارا موڈ اور تمہاری طبیعت دونوں اچھے ہو جائیں گے۔ تم آج شام بزی تو نہیں ہو ناں!"

لیزا کے سوال کے جواب میں وہ فوراً" بولا۔ "میں بزی تو نہیں ہوں مگر مجھے۔۔۔"

"بزی نہیں ہو نا بس پھر done ہو گیا۔ میں تمہارے آفس آف ہونے کے ٹائم' پر تمہیں لینے آؤں گی۔ شام کے وقت روما میں سیاحوں کے لیے جو خاص اور پرکشش مقامات ہیں وہ تو تمہیں دیکھنے میں اتنا مزا نہیں آئے گا۔ ان کے لیے ہم کسی دن صبح سے نکلیں گے۔ آج میں تمہیں Spannish steps لے کر چلوں گی۔ شام کے وقت وہ جگہ تمہیں اچھی لگے گی۔"

اسے اس کی گائیڈ کس نے بنایا تھا کم از کم اس نے تو ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ روم گھومنا چاہتا ہے۔

"تمہارا شکریہ لیزا! مگر میرا کہیں بھی گھومنے پھرنے کا۔۔۔" وہ شائستگی کے ساتھ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا۔

"تمہارا موڈ نہیں ہے' مگر میرا موڈ ہے تمہیں اپنا روما دکھانے کا۔ میں تو کل تم سے یہ سن کر حیران رہ گئی کہ تم نے اتنے دنوں میں ابھی تک روما کی کوئی خاص جگہ نہیں دیکھی۔ میں جانتی ہوں یہ تمہاری رومن ہالی ڈیز نہیں ہیں تم یہاں آفس کے کام سے آئے ہو مگر آفس سے بچ جانے والے فارغ ٹائم میں تم یہاں ان دنوں کو چھٹیوں کی طرح انجوائے کر سکتے ہو۔ میں تمہاری دوست بن گئی ہوں ناں' بس میری بات مانو۔ آج روما کو ایک رومن لڑکی کے ساتھ اس کی نظر سے دیکھو۔" اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر لیزا نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اس لڑکی پر حیران تھا۔ آخر اسے اس میں اس درجہ دلچسپی کس وجہ سے تھی؟ اس نے سوچ لیا تھا وہ آج آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی آفس سے اٹھ جائے گا۔ اس کا لیزا کے ساتھ کہیں بھی گھومنے پھرنے کا قطعاً" کوئی موڈ نہ تھا۔ کل اس سے اتنی مدد لے چکنے کے بعد آج وہ اسے بدتمیزی اور بے مروتی سے منع نہیں کر سکتا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ پہلے ہی اپنے ہوٹل روانہ ہو جائے' مگر لیزا کو جیسے اس کے اس ارادے کی بھنک پہلے ہی پڑ گئی تھی وہ آفس ٹائم ختم ہونے سے پہلے اس کے آفس میں موجود تھی۔

اسے یہاں دفتری کاموں میں معاونت کے لیے جو سیکریٹری فراہم کی گئی تھی' وہ اسے ایک معاہدہ ٹائپ کرنے کے لیے دے رہا تھا' جب ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر اس کے لیے کسی لیزا محمود کے آنے کی اطلاع دی۔

اس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"انہیں اندر بھیج دیجیے۔" دفتر میں وہ اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

سیکریٹری اس کے آفس سے نکل رہی تھی جب وہ ہنستی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔

اس نے میرون کلر جارجٹ کے پرنٹڈ ڈھیلے سے بلاؤز کے ساتھ آف وائٹ ٹراؤزر پہن رکھا تھا' پیروں میں اونچی ایڑی والے آف وائٹ سینڈلز' بال کھلے ہوئے تھے۔ جس طرح تمام اٹالین عورتیں اور لڑکیاں ہر وقت موقع اور موسم کے لحاظ سے میک اپ کیے رکھتی تھیں' اسی طرح اس نے بھی شام کے وقت کے لحاظ سے لائٹ سا میک اپ کر رکھا تھا۔ ناخنوں پر نیل پالش بھی سجی تھی' اس کے ڈیزائنر گلاسز ہمیشہ کی طرح اس کی شخصیت کے وقار کو بڑھا رہے تھے۔

اس نے ایک نظر میں سر سے پاؤں تک اس لڑکی کو اوپر دیکھا۔ اس میں ایسی کوئی کمی نہ تھی کہ اسے لوگوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک مرد اس کی رفاقت کی تمنا کر سکتا تھا' پھر اس لڑکی کے ساتھ مسئلہ کیا تھا؟

"چاؤ سینیور سکندر!" وہ اس کی میز کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

"چاؤ لیزا!" وہ اخلاقاً مسکرایا تھا۔ "بیٹھو۔"

"میں جلدی آ گئی۔ بس کاموں سے فارغ ہو گئی تو میں نے سوچا تمہارے آفس چلتی ہوں۔ اگر ابھی فارغ نہیں ہوئے تو میں تمہارا انتظار کر لوں گی۔ ویسے تم مصروف تو نہیں رہے۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اب وہ کیا بتاتا کہ اس سے بچنے کے لیے وہ آفس میں اپنے کو پر تول ہی رہا تھا۔ لیزا کی نگاہیں اس کی میز پر تھیں جس پر سر دست اس کے سامنے نہ کوئی فائل کاغذات اور نہ ہی اس کا لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔

"ہاں بس کام ختم ہی ہو گیا تھا۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر؟" لیزا نے فوراً اس سے پوچھا۔

اسے لوگوں کے احسان لینے کی عادت نہ تھی اور اسے یہ بھی ہرگز نہیں پتا تھا کہ اگر آپ کسی سے احسان لے چکے ہوں تو پھر اس سے پیچھا کس طرح چھڑاتے ہیں۔ وہ کرسی پر سے اٹھ گیا تھا۔

"چلو!" وہ اس کے دفتر اسے لینے آ چکی تھی۔ اس کے اسے Naples لے کر جانے اور واپس لانے کے احسان کے بدلے اسے اور کیا کیا کچھ اپنی مرضی کے خلاف برداشت کرنا تھا وہ فی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ لیزا کے ساتھ دفتر سے نکل آیا اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ بغیر اپنی مرضی اور خواہش کے اس کے ساتھ Piazza di spagna جا رہا تھا۔

انہیں Barberini سے Spagna پہنچنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

قدیم آرکیٹیکچر والی بلڈنگز کے درمیان گھرے Spannish Steps کے سامنے وہ دونوں کھڑے تھے۔ شام کا وقت ہونے کے سبب وہاں سیاحوں کا رش تھا۔ تاریخی اہمیت کی حامل ہسٹری میں شغف رکھنے والوں کے لیے جادوئی سا تاثر رکھتی یہ چوڑی اور کشادہ سیڑھیاں بہت دور سے کھڑے ہو کر دیکھنے پر بھی نظر آتی تھیں۔ خوب صورت انداز کی کشادہ سیڑھیوں کی تین منزلیں چڑھنے کے بعد اوپر خوب صورت آرکیٹیکچر کا حامل دو ٹاورز والا چرچ تھا جو فرانسیسی حکومت نے اٹلی میں 18 ویں صدی میں بنوایا تھا۔ Steps کے بالکل سامنے سڑک پر Bernini کا بنایا مشہور Barcaccia فاؤنٹین (فوارہ) تھا' جو دیکھنے میں ایک کشتی جیسا نظر آتا تھا۔ گویا سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے بالکل سامنے کشتی سے مشابہت رکھتا خوب صورت اور تاریخی فوارہ تھا اور ڈھیر سارے steps چڑھ کر بالکل اوپر پہنچ جائیں تو دو خوب صورت میناروں والا چرچ دیکھنے والے کو اپنے آرکیٹیکچر سے مبہوت کر دیا کرتا تھا۔ موسم بہار سے لے کر گرمیوں کے موسم تک یہ جگہ سیاحوں کے ساتھ ساتھ روم کے مقامی لوگوں کی بھی آماجگاہ بن جایا کرتی تھی۔ ان

مہینوں کے دوران ان سیڑھیوں کو خوب صورت پھولوں سے سجا بھی دیا جاتا تھا۔

اس وقت بھی اسے سیڑھیوں کے دائیں جانب پہلے زینے سے لے کر اوپر تک جاتے ڈھیر سارے خوش رنگ و خوب صورت پھول سجے نظر آرہے تھے۔ بہت سے لوگ ان سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ بہت سے سیاح فاؤنٹین کے اردگرد کھڑے تصویریں کھنچوا رہے تھے' کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چرچ تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لے سے وہاں کچھ مقامی آرٹسٹ بھی کام کرتے نظر آرہے تھے جو وہاں تفریح کے لیے آئے لوگوں کو ان کے پورٹریٹس بنا کر اسی وقت بیچ بھی رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے Piazza di spagna صدیوں سے شاعروں' ادیبوں' مصوروں' موسیقاروں اور آرکٹیکٹس کی پسندیدہ جگہ رہی ہے۔ بائرن' شیلے' آسکروائلڈ' جارج ایلیٹ' ہنری جیمز' میری شیلے' پرسی' کیٹس' کس کس کے نام یاد آجاتے ہیں اس جگہ کے ساتھ۔ شام ہو گئی وزٹنگ آورز ختم ہو گئے ہیں ورنہ میں تمہیں وہ گھر بھی ضرور دکھاتی جہاں کیٹس نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ اب اسے ایک میوزیم بنا دیا گیا ہے۔"

اس نے اپنا کوٹ لیزا کی گاڑی میں چھوڑ دیا تھا' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رکھی تھی۔ وہ لیزا کی بات سن رہا تھا۔ مگر اس کی نگاہیں بے شمار سیڑھیوں اور اوپر دور سے نظر آتے چرچ پر تھیں۔

وہ دونوں سیڑھیوں کے پاس پہنچے۔ وہاں پہلے steps پر بیٹھی ایک لڑکی ایک اٹالین آرٹسٹ سے اپنا پورٹریٹ بنوا رہی تھی۔ وہاں چند اور آرٹسٹس بھی اسی طرح سیاحوں کے پورٹریٹس بناتے نظر آرہے تھے۔ لیزا نے بھی اس کے ساتھ اس آرٹسٹ اور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔

"مصوروں کا یہاں کھڑے ہو کر لوگوں کو ان کے پورٹریٹس بنا کر دینا اس جگہ کی تاریخ کا حصہ ہے۔ پتا ہے سکندر! اٹھارویں صدی میں خوب صورت اٹالین مرد اور عورتیں یہاں پر اس امید پر جمع ہوا کرتے تھے کہ شاید وہ کسی مشہور مصور کے ماڈل کے طور پر منتخب کر لیے جائیں۔"

لیزا مسکرا کر اسے اس جگہ کے متعلق تمام معلومات اس طرح فراہم کر رہی تھی جیسے کوئی گائیڈ کسی سیاح کو' وہ جواباً" چپ رہا تھا۔

"اب تمہارا کیا موڈ ہے' ہم نے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا ہے یا یہیں بیٹھنا ہے؟"

سیڑھیوں کے پاس آکر رکتے ہوئے لیزا نے اس سے پوچھا۔ اس کا موڈ تو سرے سے یہاں آنے ہی کا نہیں تھا مگر اس کے کوئی جواب دینے سے قبل لیزا مزید بولی۔

"ویسے اگر اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنے کا تمہارا موڈ نہیں ہے مگر تم چرچ دیکھنا چاہتے ہو تو اوپر جانے کے لیے لفٹ بھی ہے۔"

"یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" گھومنے پھرنے تاریخی جگہیں دیکھنے میں اسے قطعاً" دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کوئی اور دنیا تھی' کوئی اور زندگی تھی جس میں تاریخ سکندر شہریار کو مسحور کیا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے اپنے دوستوں کے ساتھ مصر گھومنے گیا تھا۔ وہ کہتا تھا اس نے قلوپطرہ کا مصر دیکھ لیا' اب اسے جولیس سیزر کا اٹلی بھی دیکھنا ہے' پھر کبھی فرصت میں وہ ان دونوں ملکوں کے اوپر ایک کتاب لکھے گا۔

وہ دونوں چند سیڑھیاں چڑھ کر قدرے اونچائی پر آکر ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے۔

"آج میں نے تمہیں اسپینش اسٹیپس دکھا دیے' کل سیٹرڈے ہے' تمہاری چھٹی ہو گی ناں؟ روبرٹو کی تو ہوتی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مسکراتے ہوئے مزید بولی۔ "کل صبح میں تمہیں تمہارے ہوٹل سے پک کر لوں گی۔ پھر ہم کولوزیم فورم اور پینتھن دیکھیں گے۔ پھر ویٹی کن سٹی میں تمہیں کسی اور دن لے کر چلوں گی۔"

اس نے از خود ہی یہ کس طرح فرض کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ روم گھومنا پھرنا چاہتا ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان...... یکدم اس پر چڑچڑے پن اور غصے کا حملہ ہوا۔

اس نے بے حد سنجیدہ نگاہوں سے لیزا کو دیکھا۔ اسے ایک دم ہی یہ بہتر لگا کہ وہ اس سے براہ راست خود میں اس غیر معمولی دلچسپی کی وجہ پوچھ لے چاہے اسے برا ہی کیوں نہ لگ جائے۔ لیزا اس کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔

"لیزا! میں تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"نہیں، مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی ہے۔" وہ جو سوال پوچھنے کے لیے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا لیزا کے اس بے ساختہ جملے پر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم یہی پوچھنا چاہتے تھے نا؟" وہ ہنس کر بولی۔ وہ حیرت کے جھٹکے سے باہر نکلا تو بے اختیار اس کے لبوں سے ایک قہقہہ نکلا۔ وہ لیزا کے اتنے اچانک اور اس قدر صاف گو جملے پر اپنا بے ساختہ قہقہہ روک ہی نہیں پایا تھا۔

اتنے Blunt انداز میں بدتمیزی کے ساتھ تو نہیں مگر پوچھنا تو وہ واقعی اس سے یہی چاہتا تھا۔

"نہیں۔" وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

"جھوٹ، تمہارے چہرے پر صاف صاف لکھا ہے کہ تم مجھ سے مشکوک ہو رہے ہو اور تمہارے جیسے ہینڈسم بندے کے پیچھے کوئی لڑکی آئے تو تمہیں یہ سوچنا ہی چاہیے کہ وہ تم پر فدا ہو گئی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کوئی بھی لڑکی منٹوں میں تم پر عاشق ہو سکتی ہے۔"

وہ اب مسکراتے ہوئے دلچسپی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا خراب موڈ اور بیزاری جیسے یک دم کہیں غائب ہو چکی تھی۔

"دیکھو اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ تم مجھے بھی بہت اچھے بہت ہینڈسم لگتے ہو اور سے تمہارا یہ غرور اور خود پسندی بھی تم پر بہت سجتی ہے مگر میرے بارے میں تم بے فکر رہو۔ مجھے تم میں اس طرح کی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے مگر پُرزور انداز میں کہہ رہی تھی۔

وہ پھر ہنس پڑا تھا۔

"اصل میں سکندر! میرا ابھی زندگی میں بہت دور دور تک محبت اور شادی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں شادی اس سے کروں گی جس سے مجھے محبت ہو گی اور جس سے مجھے محبت ہو گی وہ جب میری زندگی میں آئے گا تو مجھے پتا چل جائے گا میرے دل میں اسے دیکھتے ہی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔"

"اور مجھے دیکھ کر چونکہ تمہارے دل میں کوئی گھنٹیاں نہیں بجیں اس لیے مجھے یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی ہے۔" وہ اس کی باتوں کو انجوائے کرتا ہنس کر بولا تھا۔ وہ واقعی ٹھیک ٹھاک قسم کی آؤٹ اسپوکن لڑکی تھی۔

"جس دن تم مجھے پہلی بار Pizzeria میں ملے تھے مجھے بہت ہینڈسم لگے تھے۔ نہیں، نہیں، گھنٹی کوئی نہیں بجی تھی۔" سنجیدگی سے بولتے بولتے اس نے لفظ ہینڈسم بولنے کے ساتھ ہی فوراً حلفیہ انداز میں اسے یقین دلایا تھا۔

وہ پھر ہنس پڑا تھا۔ ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کرتی وہ خود بھی مسکرا رہی تھی۔

"اب میری بات کا کوئی اور مطلب مت نکالنا۔ مجھے تمہارا چہرہ خاص طور پر تمہاری آنکھیں بہت پُرکشش لگتی ہیں۔ تم سے پہلی بار مل کر ہی میرا دل چاہا تھا کہ تمہارا چہرہ پینٹ کروں۔ میں تمہارا چہرہ پینٹ کرنا چاہتی ہوں سکندر! تمہاری اجازت سے۔" اس بار وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی اگر مجھے اچھا لگے اور میں اسے پینٹ کرنا چاہوں تو سیدھا سیدھا اس شخص سے جا کر پوچھ لیتی ہوں اور ابھی تک ہر کسی نے بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے مجھے خود کو پینٹ کرنے کی اجازت دی ہے۔ مگر تم جیسے مغرور اور بے نیاز بندے کے بارے میں مجھے یقین

تھا کہ تم نے خوش تو کیا ہونا ہے' الٹا مجھے صاف صاف انکار کر دینا ہے۔"

"تو اس لیے مجھ سے دوستی کی جا رہی تھی۔ میں بلاوجہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید تمہارے دل میں کوئی گھنٹی وغیرہ بج رہی ہے۔" وہ اپنی عادت اور مزاج کے برخلاف اس کے ساتھ اس قدر باتیں کس طرح کر رہا ہے وہ خود حیران تھا۔ اب اسے لیزا کی کمپنی بری نہیں لگ رہی تھی۔

ان کے پاس سے سیاحوں کا ایک گروپ سیڑھیاں چڑھتا اوپر چرچ کی جانب جا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اتنا خوش کس بات پر ہے؟ آخر وہ ہنس کس بات پر رہا ہے؟ کیا سکندر شہریار کو خوش ہونے اور ہنسنے کا کوئی اختیار حاصل ہے؟ اس کے اندر خود سے شدید ترین نفرت میں مبتلا شخص نے یکدم ہی سوال کیا۔

لمحے بھر میں اس کے لبوں سے مسکراہٹ رخصت ہو گئی تھی۔ چہرے پر نرمی اور دوستانہ تاثر کی جگہ سختی اور سنجیدگی آ گئی۔ اس نے لیزا سے نظریں ہٹا کر سامنے Fountain کی طرف نگاہ کی۔ وہ یہاں سے فوراً واپس چلے جانا چاہتا تھا۔ لیزا اس کے اندر کی شکست و ریخت سے انجان تھی۔ وہ اسی دوستانہ انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ چلو چل کر کچھ کھاتے ہیں۔ یہاں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانے پینے کی بالکل اجازت نہیں ہے ورنہ یہاں بیٹھ کر کھانے میں اور مزا آتا۔"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں لیزا؟" وہ یک دم ہی سیڑھی پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں بھئی اتنی جلدی کیوں؟ ابھی تو میں تمہیں ——" لیزا اسے حیرت سے دیکھتی کچھ کہنے لگی تھی مگر وہ سنجیدگی سے اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا۔

"مجھے آفس کا کچھ ضروری کام ہے۔ میں اپنے ہوٹل جانا چاہتا ہوں۔"

وہ اب کہیں کچھ لمحے پہلے کا وہ ہنستا مسکراتا' قہقہے لگاتا شخص نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا قطعیت بھرا انداز دیکھ کر لیزا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ جیسے سکندر کے موڈ کی یوں اچانک تبدیلی کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

☆ ☆ ☆

لیزا اسے ہوٹل چھوڑنے آئی تھی۔ ہوٹل تک آنے کا راستہ اس نے خاموشی سے گزارا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو اتنا سنجیدہ اور سخت بنا رکھا تھا کہ لیزا جیسی باتونی لڑکی بھی اس سے پھر کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔

ہوٹل آنے پر گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے پرتکلف انداز میں بغیر مسکرائے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"تھینکس لیزا! تم مجھے Spannish Steps دکھانے لے کر گئیں۔" وہ حسب عادت جواباً مسکرائی۔

"اور کل صبح میں تمہیں Forum اور Pantheon دکھانے لے کر چلوں گی۔"

"میں شاید نہ جا سکوں۔ مجھے آفس کا کچھ کام ہے۔"

"آفس کا کام آفس میں کیا کرو ناں۔ روم میں چھٹی کا دن تو Vacanze Romane کی طرح گزارو۔ کل پھر تم مجھے یہ بھی بتانا کہ تم مجھے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے رہے ہو یا نہیں۔" وہ اس کے انکار کے جواب میں مسکرا کر بولی تھی۔

اس نے Roman Holiday کے الفاظ اٹالین میں ادا کیے تھے۔ وہ مزید بحث یا انکار کیے بغیر سر ہلاتا اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آ گیا۔

اس کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں تھا کل لیزا کے ساتھ کہیں پر بھی جانے کا اور یہ انکار اسے کس طرح کرنا تھا وہ سوچ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات وہ اپنے اسٹوڈیو میں تھی۔ وہ اپنی ایک نامکمل پینٹنگ مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے [illegible]

ڈھالی سی ٹی شرٹ ٹراؤزر کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو کیچو میں لپیٹا ہوا تھا۔

کینوس پر رنگ بکھیرتے اسے یک دم ہی سکندر کا خیال آیا۔ وہ آج شام سے مسلسل اسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ ایسا کیوں تھا؟ وہ دوسرے لوگوں سے اتنا مختلف کیوں تھا؟ جیسے اندر ہی اندر کوئی غم اسے ختم کررہا تھا، جیسے وہ خود سے ہی ناراض تھا۔

آج شام وہ اس کے ساتھ کتنے خوشگوار انداز میں باتیں کررہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا پھر ہنستے ہنستے یک دم اسے کیا ہوگیا تھا؟ وہ جانتی تھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے ناگوار گزری ہو۔ وہ سکندر کے پل پل بدلتے موڈ کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

وہ اس بہت مختلف سے شخص کے چہرے کو واقعی پینٹ کرنا چاہتی تھی۔ سکندر کی آنکھوں کی مقناطیسیت، ان کی گہرائی، ان کی اداسی، ان کا حزن اور ان کا اسرار اسے کینوس پر اتارنا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب رات وہ سویا ہی نہیں تھا تو صبح جاگنے کا کیا سوال۔ وہ بیڈ پر لیٹا تھا اور اس نے ناشتہ کمرے ہی میں منگوا کر کرلیا تھا۔ اس وقت وہ غیر دلچسپی سے اٹالین میں نیوز کا کوئی چینل دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے موبائل پر لیزا کی کال آنے لگی۔ بجائے اس کال کو اگنور کرنے کے اس نے اسے ریسیو کرلیا۔

"ہیلو!"

"چلو سینور سکندر!" اس کے لہجے میں شرارتی سی کھنک تھی۔

"آجاؤ نیچے میں تمہارے ہوٹل کے باہر تمہارا انتظار کررہی ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے قصداً حیرانی سے پوچھا جیسے اسے کل کی بات یاد ہی نہ ہو۔

"کیا مطلب؟ تم بھول گئے کیا؟ کل یہی تو طے ہوا تھا آج صبح ہم کولوزیم چلیں گے۔ اگر تیار نہیں ہو تو جلدی سے تیار ہوکر نیچے آجاؤ میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔" وہ اس کی حیرت پر حیران ہوکر بولی تھی۔

"وہ ایم سوری لیزا! مجھے یہ بات بالکل بھی یاد نہیں رہی تھی۔ میں آفس کے ایک کولیگ کے ساتھ Pompeii گھومنے نکل چکا ہوں۔ ان فیکٹ اس وقت ہم دونوں ٹرین میں ہیں۔ میں آج رات یا پھر کل صبح واپس آؤں گا۔"

اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں، وہ ٹرینڈز ہی کو دیکھ رہا تھا۔

کل لیزا کے ساتھ جو چند منٹوں کے لیے وہ خوش ہوا تھا، مسکرایا تھا، اس نے قہقہے لگائے تھے اس پر وہ رات بھر خود سے لڑا تھا۔ اسے خوش ہونے اور قہقہے لگا کر ہنسنے کا حق کس نے دیا۔ وہ اس لڑکی سے اب نہیں ملنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اسے خوش ہونے اور ہنسنے پر مجبور کردیتی تھی اور وہ چند منٹوں کے لیے تو کیا چند سیکنڈز کے لیے بھی خوش رہنا نہیں چاہتا تھا۔

"اچھا۔" اس نے لیزا کے لہجے میں بڑی واضح مایوسی محسوس کی۔ "تم نے مجھے بتایا نہیں، کب بنا تمہارا جانے کا پروگرام؟"

"کل رات، مجھے تمہارے ساتھ کولوزیم جانے کا پروگرام یاد نہیں رہا تھا ورنہ میں تمہیں فون کرکے بتا دیتا۔ آئم سوری۔" اس نے لہجے میں مصنوعی سا تاسف شامل کرتے ہوئے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ تم انجوائے کرو Pompii بھی ہسٹری میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میں گھر جاکر اپنی کچھ ادھوری پینٹنگز پوری کرلیتی ہوں۔ کولوزیم کا پروگرام پھر کسی دن رکھ لیں گے۔" اس بار وہ خوش دلی سے بولی تھی۔

سکندر نے سکون کا سانس لیا۔ اور بیڈ سے اٹھ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ مسلسل جاگ جاگ کر اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگتی اور سر بھاری بھاری رہتا تھا۔ نہانے کے بعد وقتی طور پر اس کی طبیعت فریش ہوگئی تھی۔

ابھی وہ بالوں میں برش کرہی رہا تھا کہ اس کے پاس

ہوٹل کے ریسپشن سے کال آئی کہ اس سے ملنے کوئی صاحب ہوٹل کی لابی میں آئے بیٹھے ہیں۔

اس نے نام پوچھا تو جواب میں ایک اٹالین نام لے سے بتایا گیا۔ وہ اس نام کے کسی بھی شخص سے واقف نہیں تھا، مگر وہ ابھی دفتر میں سب لوگوں سے کہاں واقف تھا۔ وہ صرف یہاں متعلقہ ڈپارٹمنٹ سے منسلک لوگوں سے ہی واقف تھا۔ یقیناً "یہ آفس ہی سے کوئی شخص تھا اور یقیناً" آفس ہی کے حوالے سے کوئی ضروری کام تھا۔

وہ فوراً" ہی بذریعہ لفٹ نیچے آگیا۔ خوب صورت انٹیریر والی اس لابی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نرم و گداز صوفے اور میزیں موجود تھیں۔ چکنے، خوب صورت ٹائلز، قیمتی فانوس اور دیواروں پر بنے حسین نقش و نگار اس جگہ کو بہت آرٹسٹک لک دے رہے تھے۔

وہ وہاں کسی اٹالین مرد سے ملنے آیا تھا مگر وہاں آتے ہی سامنے ہی ایک صوفے پر لیزا بیٹھی نظر آگئی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے نہ دیکھنے کا تاثر دے ہی نہیں سکتا تھا۔

اپنے جھوٹ پر شرمندگی اور کھسیاہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اس کے پاس آگیا۔ لیزا اسے گھور رہی تھی۔

"تو سینور سکندر اس وقت Pompii جا رہے ہیں اور ٹرین میں ہیں۔"

"آئم سوری لیزا! میں نے تم سے جھوٹ بولا۔" بات کھل چکی تھی تو اب مزید جھوٹ نہیں بولا جا سکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہاری بات سننے کے بعد میں یہاں سے جانے ہی لگی تھی کہ اچانک مجھے یاد آگیا کہ آج تو روم سے باہر اٹلی کے دیگر تمام شہروں میں جانے والی نارمل ٹرینز کی ہڑتال ہے۔"

لیزا اسے گھور کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی۔

اس نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

زبان نہ آنے کا نقصان۔ حالانکہ وہ صبح سے جاگا ایک نیوز چینل ہی دیکھ رہا تھا اور اس پر اس نے ٹرین اور روم کے ریلوے اسٹیشنز کی فوٹیجز دیکھی تھیں۔ اگر زبان آتی ہوتی تو کم از کم وہ ٹرین کا لفظ تو ہرگز نہ بولتا۔

"سمجھ تو مجھے آگیا تھا کہ تم میرے ساتھ کولوزیم نہیں جانا چاہتے اس لیے جھوٹ بول رہے ہو، مگر دل چاہا کہ میں جھوٹے کو اس کے جھوٹ کے کھل جانے کا تو پتا کر جاؤں۔"

وہ حقیقتاً" بہت شرمندہ ہوا تھا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا وہ اس کو صاف لفظوں میں جانے سے منع کر دیتا۔ "تمہارے ساتھ جانے سے نہیں، بس میرا کہیں پر بھی جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔" وہ شرمندگی سے ہلکا سا مسکرا کر قدرے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"تو تم مجھے سچ بھی بتا سکتے تھے۔ بہرحال مجھے سمجھ میں آگیا ہے کہ تم میرے ساتھ کہیں پر بھی جانے آنے میں بلکہ شاید میرے ساتھ دوستی کرنے میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے ہو تو اب میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔" وہ یکدم ہی سنجیدگی سے بولتی ہوئی صوفے پر سے اٹھی۔

"میں چلتی ہوں۔ بائے۔" وہ سنجیدہ انداز میں اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے جانے لگی۔

"لیزا! میں تمہارے ساتھ کولوزیم جانا چاہتا ہوں۔" وہ بے اختیار صوفے سے اٹھا تھا۔

لیزا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہنوز خاموش تھی۔

"میں آج روم کو ایک رومن لڑکی کے ساتھ اس کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا کر لیزا ہی کا کہا دہرا رہا تھا۔

"جب تم کہیں پر بھی جانا نہیں چاہتے تو اب جھوٹ پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے زبردستی تمہیں کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

"پلیز لیزا! میں تمہارے ساتھ کولوزیم جانا چاہتا ہوں۔ رومنز کتنے ظالم اور سفاک لوگ تھے میں وہاں وزٹ کرکے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

معذرت خواہانہ انداز میں بھی وہ جان بوجھ کر اسے نہیں بھولا تھا۔ وہ جس طرح اپنے ملک کی ہر چیز قصیدے پڑھتی تھی، جس طرح اپنے ملک کی ہر چیز فخر کرتی تھی، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنی سفاک ... کا وہ کس طرح دفاع کرے گی۔

"تھوڑے بہت نہیں، تم خاصے ٹھیک ٹھاک قسم بدتمیز آدمی ہو سکندر شہریار! اگر مجھے تمہارا ... ٹریٹ بنانے کا لالچ نہ ہوتا تو اب میں تمہارے ... کبھی بھی کہیں نہیں جاتی۔" وہ اسے گھورتے ... ئے بولی تھی۔

وہ مبہم سا مسکرایا۔ "چلیں؟"

"چلو۔" لیزا جواباً اسی خفگی بھرے انداز میں بولی۔

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ لیزا کو شاید زیادہ دیر ... راض رہنا یا غصہ کرنا آتا ہی نہیں تھا تب ہی اب وہ ... کے ساتھ نارمل انداز میں باتیں کر رہی تھی۔

گاڑی اب ایک اونچائی کی طرف جاتی سڑک پر چل رہی تھی۔

بہت دور سے ہی اس سڑک پر کولوزیم نظر آنا شروع ... گیا تھا۔ رومیوں کے جاہ و جلال اور ان کی بربریت کی ... ہزار سال پرانی داستانیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ... کے 7 عجائبات میں سے ایک عجوبہ اس کی نگاہوں ... کے سامنے تھا۔ رومیوں کی انجینئرنگ اور آرکیٹکچر ... مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت۔ صدیوں سے شان و ... شوکت سے اپنی جگہ ایستادہ۔ اس کی بیرونی دیوار کا ... حصہ اسے ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا جس طرح اس نے ... شمار تصاویر، موویز اور ڈاکومنٹریز میں دیکھ رکھا تھا۔

"اٹلی آنے والوں کے لیے کولوزیم دیکھنا تو لازمی ... میں حیران ہوں تم ابھی تک یہاں کیوں نہیں ... ئے تھے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھے بغیر ... آنے والا کوئی شخص یہاں سے واپس نہیں جاتا۔ ... کوئی نان اٹالین مووی ایسی نہیں ہو سکتی جس میں ... زیم کو نہ دکھایا گیا ہو۔"

"تب تو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں تمہیں یہاں لے آئی ورنہ تم سے تو کچھ بعید نہ تھا کولوزیم دیکھے بغیر ہی یہاں سے واپس چلے جاتے۔"

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیزا محمود!" وہ اسی جیسی ٹون میں بولا۔

"تمہاری شکر گزاری کا اندازہ تو مجھے تمہارے آج صبح کے جھوٹ سے ہی ہو گیا تھا۔ تمہیں قائل کرنا چاہتی ہوں تاکہ مجھ سے اپنا پورٹریٹ بنوا لو، ورنہ تمہاری اس بدتمیزی پر مجھے بہت غصہ ہے۔ پتا ہے کل تمہیں ڈراپ کرنے کے بعد میں نے اپنے سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے ہمارے آج کلوزیم وزٹ کرنے کے لیے آن لائن ٹکٹس خریدے تھے۔ ایسے یہاں آجائیں تو معلوم ہے ٹکٹ خریدنے کے لیے کتنی لمبی لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ اب ہم لائن میں لگنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔"

لیزا نے اس کی صبح کی حرکت اسے دوبارہ جتائی تھی۔

وہ اب گاڑی پارک کر رہی تھی۔ سکندر اردگرد دیکھ رہا تھا۔ کلوزیم کے اندر داخل ہوتے اور اس کے بیرونی حصے کے اطراف گھاس پر کھڑے ـــــ ہو کر تصویریں کھنچواتے سیاح وہاں بے شمار تھے۔ جو لوگ گھاس پر کھڑے ہو کر تصاویر بنوا رہے تھے، وہ تصویر میں اپنے عقب میں کلوزیم کو لانا چاہتے تھے۔

وہ اور لیزا گھاس کے اوپر چلتے کلوزیم کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے نہ اس لڑکی میں کوئی دلچسپی تھی نہ روم کی تاریخ میں، مگر پھر بھی وہ اس وقت یہاں آکر خود کو خوش محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس لڑکی کے ساتھ یہاں آنا اچھا لگ رہا تھا۔

"اندر چلیں؟" اس نے لیزا کی طرف دیکھ کر خود اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"چلو۔" وہ جواباً مسکرا کر بولی تھی۔

وہ دونوں کلوزیم کے اندر آ گئے تھے۔ سیاحوں کے ساتھ رش کا حصہ بنے وہ بھی 72 اے ڈی میں بنے اس Amphitheatre کا نظارہ کر رہے تھے۔

درمیان میں بہت بڑا کشادہ صحن نما حصہ اور اس کے اطراف سیڑھیوں کی طرح اونچی ہوتی پتھروں سے بنی نشستوں کی قطاریں جیسے کہ موجودہ دور کے فٹ بال اسٹیڈیمز نے اپنی تعمیر کا بنیادی نقشہ Colosseum ہی سے چرایا تھا ایسا لگتا تھا۔ یہاں اس کھلے میدان میں انسانوں کا خونخوار درندوں کے ساتھ مقابلہ کروایا جاتا تھا اور یہ غیر انسانی اور بربریت لیا عمل Romans کے لیے ایک کھیل ایک تفریح تھا۔ پچاس ہزار افراد پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھے تالیاں بجا بجا کر اس غیر انسانی عمل کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے سے پتھر کے سامنے کھڑے ہو کر نیچے میدان کو دیکھ رہے تھے۔

loser who ever he may be"

"Kill the۔

بے ساختہ colosseum میں ان گلیڈی ایٹر لڑائیوں کے متعلق پڑھا گیا جملہ اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اگر خونخوار درندے کو جان سے مار دیا تو غلام اور مجرم آزاد نہیں تو درندے کے ہاتھوں اس کی موت جو ہارے گا وہ مرے گا۔

"تم لوگوں کی تاریخ ظلم اور سفاکی سے بھری ہوئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' رومن بادشاہ اپنے وقت کے ظالم ترین لوگ تھے۔" وہ اس بار بغیر برا مانے بولی تھی۔

"پر رومن اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔ میں ایک رومن لڑکی کو جانتا ہوں اور وہ کافی اچھی ہے۔"

اپنی شخصیت اور اپنے مزاج سے بہت مختلف جملہ بالکل بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ لیزا اس تعریفی جملے پر خوش ہو کر مسکرائی تھی۔

"تو تم اس اچھی رومن لڑکی کو یہ اجازت دے رہے ہو کہ وہ تمہارے چہرے کے تمام نقوش' خاص طور پر تمہاری آنکھیں ان کے تمام تر تاثر کے ساتھ کینوس پر اتار سکے؟"

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔" وہ جواباً مسکرایا۔

"اوہ۔ میں خوش ہو گئی تھی۔ لیکن خیر! ابھی تو تمہارا یہاں کافی دنوں کا قیام باقی ہے' دیکھ لینا میں تمہیں راضی کرنے میں کامیاب ہو ہی جاؤں گی۔"

وہ دونوں اب وہاں اس قدیم آرکیٹکچر کے آہستہ آہستہ چلتے اور گردوپیش کو دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

وہ لیزا کے پُر یقین سے انداز پر مبہم سا مسکرایا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا ایسا کبھی بھی ہونے والا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کہیں چلے جانا' گھومنے پھرنے پر راضی ہو جانا الگ بات تھی' مگر اس سے ہٹ کر وہ کسی کی بات کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے دنیا میں ابھی تک Cheese (پنیر) کھائی ہی نہیں ہے' اگر تم نے اٹالین چیز نہیں کھائی ہے۔ اور تم نے دنیا میں ابھی تک کافی نہیں پی ہے' اگر تم نے اٹالین کافی نہیں پی ہے۔"

وہ دونوں کلوزیم سے نزدیک ایک ریسٹورنٹ میں کر رہے تھے' تب لیزا اس سے بولی تھی۔ ریسٹورنٹ کے باہر شیڈ میں لگی میزوں میں سے ایک پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

اٹالین پنیر اور زیتون کے مزے دار ذائقے والا اس سے تیار کیا پاستا کھاتے ہوئے وہ لیزا کی بات دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہ اپنی اس ٹون کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پل کا ذرا سا وقفہ دینے کے بعد مزید بولی۔

"اور تم ابھی تک دنیا میں کسی سچے آرٹسٹ سے نہیں ملے ہو' اگر تم لیزا محمود سے نہیں ملے ہو۔"

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"تم خود اپنی کتنی تعریفیں کرتی ہو۔"

"ہاں تو ہوں نا میں تعریف کے قابل۔" وہ ہنس کر بولی۔

"لیزا! تم مسلمان ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے والد مسلمان اور والدہ کرسچن ہیں۔"

کچھ دیر کے بعد کھانا کھاتے کھاتے اس نے پوچھا مگر سوال منہ سے نکلتے کے ساتھ ہی اسے اس

نامناسب ہونے کا احساس ہوا۔

"سوری یہ سوال کچھ پرسنل ہو گیا۔" اس نے فوراً ہی معذرت کی۔

"نہیں' یہ سوال مجھے تو پرسنل نہیں لگا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں مسلمان ہوں سکندر! اس لیے نہیں کہ میرے پاپا مسلمان ہیں' بلکہ اس لیے کہ میں نے خود اپنے لیے اس مذہب کو چنا ہے۔ جب ماں اور باپ الگ الگ مذاہب سے ہوں تو بچے خود اپنے لیے کسی بھی مذہب کو چن نہیں پاتے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ میرے لیے نہ اسلام کی کچھ خاص اہمیت تھی' نہ عیسائیت کی۔ یوں سمجھ لو' میں بس نام کی مسلمان تھی۔ مگر 9/11 نے دنیا میں جہاں بہت کچھ تبدیل کر دیا' وہاں میرے جیسے نوجوان نسل کے لڑکے اور لڑکیوں کو جن کے لیے ان کا اسلامی تشخص کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا' بہت کچھ سمجھا گیا۔

جب 9/11 کا واقعہ رونما ہوا میں 18 سال کی تھی۔ ایک کنفیوزڈ سی نوعمر لڑکی جس کے لیے اپنی ماں یا باپ میں سے کسی ایک مذہب کو چننا دشوار کام تھا' جس کے لیے مذہب ایک ثانوی چیز تھی۔ مگر پھر جب میں نے اسے اپنے ساتھ' اپنے جیسے بہت سے نام کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے محض اسلامی نام یا اسلام سے سرسری سے تعلق کی وجہ سے امتیازی سلوک ہوتا دیکھا' تب جیسے میں چونک سی گئی تھی۔ لندن میں میری بہت سی دوستوں اور ملنے والوں نے مجھے میرے پاپا کے مسلمان ہونے کی وجہ سے جب چھوڑ دیا یا مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے' تب پہلی بار میرے دل میں خواہش جاگی کہ جس مذہب کے خلاف دنیا بھر میں اس قدر نفرت پھیلائی جا رہی ہے جسے ختم کر دینے کو سارا مغرب درپے ہے' وہ درحقیقت ہے کیسا؟ پھر میں نے اسلام کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کی اور میں نے اسے بہت روشن خیال اور فطرت سے قریب پایا۔

میں نے اسلام کو جاننے اور سمجھنے کے بعد اپنی مسلم شناخت برقرار رکھی ہوئی ہے سکندر!"

اسے لیزا کے مسلمان ہونے کا سن کر خوشی ہوئی تھی۔ اسے اب یہ بھی سمجھ میں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ پیزا یا پاستا کچھ بھی کھاتے ہوئے لیزا گوشت کی جگہ سبزیوں یا مچھلی سے بنی ڈش کا انتخاب کیوں کرتی ہے اور اس کا لباس چاہے جتنا بھی مغربی وضع کا ہو' مگر جسم کو مکمل طور پر ڈھانپے ہوئے کیوں ہوتا ہے۔

"تم پاکستان سے ہو نا سکندر؟" کھانا کھا لینے کے بعد وہ دونوں وہیں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ڈارک اسٹرونگ کافی بغیر کریم یا دودھ کے "خالصتاً" اٹالینز کی طرح۔ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے لیزا نے اچانک اس سے پوچھا۔

"نیشنلٹی کا پوچھ رہی ہو تو وہ امریکن ہے۔ ہاں تعلق کی بات کرتی ہو تو وہ میرا پاکستان ہی سے ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دے تو دیا۔ مگر وہ کچھ بے چین سا ہو اتھا۔

وہ لیزا کے مزید اپنی ذات سے متعلق کسی سوال سے کترا رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سخت رویہ نہیں رکھنا چاہتا تھا' مگر وہ اپنے بارے میں کچھ بتانا — بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تمہارے پاپا بھی تو پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں' مگر تمہیں اردو نہیں آتی۔"

اس نے جلدی سے گفتگو کا رخ لیزا کی طرف موڑ دیا۔ اسے اندازہ تھا۔ وہ باتونی لڑکی اب اس موضوع پر اور پھر اس موضوع سے کچھ اور بات نکال کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔

"کس نے کہا مجھے اردو نہیں آتی؟ مجھے اردو آتی ہے۔ میں اردو کے بہت سارے لفظ بول سکتی ہوں۔ خبیث' ذلیل' کمینہ' الو کا پٹھا۔ مجھے سارے لفظ آتے ہیں۔"

وہ اس کے اردو ذخیرہ الفاظ پر ہونق بنا اسے منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ جملہ اردو میں بولی تھی۔ اس کی اردو کھڑی کھڑی اطالوی لہجے والی اردو تھی۔

"تمہیں یہ اردو آتی ہے؟ گالیاں؟ پتا ہے جو لفظ تم نے بولے ہیں۔ یہ سب کے سب گالیاں ہیں۔ بہت

خراب گالیاں۔"

وہ اسے لاعلم سمجھ کر سنجیدگی سے انگریزی ہی میں سمجھانے لگا۔ مگر اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لیزا کو سراثبات میں ہلاتا دیکھ کر لگا۔

"ہاں مجھے پتا ہے۔ پاپا نے تو ہمیں کبھی اردو نہیں سکھائی۔ مگر ہماری نینی بچپن میں مجھ سے اور میری بہن سے چونکہ اردو میں بات کرتی تھیں تو ہم دونوں ہی نے اردو سیکھ لی تھی۔ میرا تلفظ اور لفظوں کی ادائیگی صاف نہیں ہے' مگر اردو مجھے پوری آتی ہے۔"

"تمہاری نینی تم لوگوں کو گالیاں سکھاتی تھیں؟"

"نہیں۔۔۔ یہ گالیاں تو میں نے اور سیم نے خود سے فرمائش کرکے سیکھی تھیں۔ اسکول میں ہمیں کسی پر غصہ آتا یا لڑائی ہو جاتی تو ہم اسے یہ لفظ بول دیا کرتے تھے۔ ایک بار میرے ایک کلاس فیلو سے میری اور سیم کی لڑائی ہو گئی تو اس سے بدلہ لینے کے لیے کچھ دنوں بعد ہم نے اسے جاکر بتایا کہ تم الو کے پٹھے ہو' اس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ تم بہت جینئس اور اسمارٹ ہو۔ پتا ہے پھر ساری کلاس کے سامنے اپنی قابلیت جھاڑنے کے لیے' یہ جتانے کے لیے کہ اسے بہت ساری زبانیں آتی ہیں اس نے خود اپنے منہ سے پوری کلاس کے سامنے "میں الو کا پٹھا ہوں۔" کہا تھا۔ تب مجھے اور سیم کو بہت مزا آیا تھا۔ بعد میں ہم دونوں خوب ہنسے تھے۔"

وہ فخریہ انداز میں بتا رہی تھی۔

"مگر مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہو رہی کہ جو لڑکی تازہ تازہ میری دوست بنی ہے۔ وہ ٹرک ڈرائیوروں والی اردو Vocabulary (ذخیرہ لفظ) رکھتی ہے۔"

اس نے سے اسے دیکھا۔

وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر ہنسی۔

"اگر تم سیکھنا چاہو تو میں تمہیں اٹالین میں کچھ گالیاں سکھا سکتی ہوں۔ بوقت ضرورت تمہارے کام آئیں گی۔" اس نے اپنی خدمات اسے پیش کیں۔ وہ دونوں اب میز سے اٹھ رہے تھے۔ آج اس نے لیزا کو بل پے نہیں کرنے دیا تھا۔

"شکریہ' بہت شکریہ۔۔۔ میں خاصا مہذب آدمی ہوں۔"

"دیکھو آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہے' میری مانو چند ایک اٹالین گالیاں سیکھ لو۔ بوقت ضرورت تمہارے کام آئیں گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ بولنے سے تھکتی تھی نہ ہنسنے سے۔

"تم اتنا کیسے بول لیتی ہو؟ میں پوری زندگی اتنا زیادہ نہیں بولا ہوں گا' جتنا تمہارے ساتھ ان تین دنوں میں ۔۔۔ بولا ہوں۔"

"میں زیادہ تو نہیں بولتی' لگتا ہے تم نے کبھی کوئی باتونی لڑکی دیکھی نہیں ہے۔"

وہ اب اس کے ساتھ مسلسل اردو ہی میں بات کر رہی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

چہل قدمی کرتے ہوئے اسے ایک ریسٹورنٹ کے پاس سے گزرتے اس کے شیشے کے دروازے میں اپنا عکس نظر آیا۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی نظر آئی۔ اپنے چہرے کی اس مسکراہٹ کو دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ فوراً" رخصت ہو گئی۔

سکندر شہریار کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کرے' مسکرائے' ہنسے' خوش ہو؟ اسے زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح گزارنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

"اب ہم Forum اور پھر Palatine Hill چلتے ہیں۔ شام تک گھومنے کے لیے ہمارے پاس کافی ٹائم ہے۔"

لیزا اس کی سوچوں اور موڈ کی تبدیلی سے انجان مسکرا کر بولی۔

"میرا کہیں اور جانے کا موڈ نہیں ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

اچانک وہ خشک لہجے میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ بولا۔ لیزا اس کے موڈ کی تبدیلی کو محسوس کر گئی تھی۔

"تمہیں اچانک کیا ہو جاتا ہے سکندر! کل بھی تم نے اس طرح کیا۔ تمہیں میری کوئی بات بری لگی

ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ بس میں تھک گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

لیزا چپ ہوگئی۔ وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔

"ایم سوری لیزا! اگر میری وجہ سے تمہارا دن خراب ہوا ہے تو۔ تم اپنے بہت سے کام چھوڑ کر مجھے روم کے تاریخی مقامات دکھانے آئی تھیں۔ بس مجھے زیادہ بولنا' باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں تھکن اور کوفت محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

لیزا نے گاڑی اسٹارٹ کی' تب وہ اس سے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"مجھے اندازہ ہے سکندر! اور تم فکر مت کرو' میرا دن ہرگز خراب نہیں ہوا۔ میرا مقصد تو مسٹر سکندر پر اپنا اچھا تاثر قائم کرنا' دوستی کرنا ہے تاکہ اس دوستی کے لحاظ میں وہ مجھے اپنی پینٹنگ بنانے کی اجازت دے دے۔"

وہ سنجیدگی سے بولی' مگر وہ کوشش کے باوجود بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر لیزا بھی مسکرائی تھی۔ وہ اسے اچھے انداز میں رخصت کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک رسمی مسکراہٹ چہرے پر لیے اسے خدا حافظ کہہ کر اندر آگیا تھا۔ اندر آتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے نیند کے لیے ڈاکٹر کی تجویز کردہ ٹیبلٹ لی اور اپنا موبائل فون آف کردیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا وہ خود کو سزا دینا چاہتا تھا۔ وہ ارادتاً "اپنے ان ڈراؤنے خوابوں کو دیکھنے کے لیے سو جانا چاہتا تھا جو اس کی طبیعت کو کئی دنوں تک نڈھال رکھا کرتے۔

تین دن سے خوش ہونے اور قہقہے لگا کر ہنسنے کی کم سے کم سزا بھی یہ خواب ہی ہوسکتے تھے۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ سوئے اور اسے وہ ڈراؤنے خواب نظر نہ آئیں' پھر وہ سو کر اٹھے تو اسے اعصابی درد نہ ہو رہا ہو؟ سکندر شہریار کو سزا ملنی چاہیے' اسے کوئی سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔

ہنسی اور سکندر شہریار کے لبوں پر؟

خوشی اور سکندر شہریار کی آنکھوں میں؟

وہ خاموش لیٹا چھت پر لٹکتے فانوس کو دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
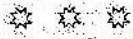
"کہاں رہیں سارا دن؟" نینی رات کے لیے کھانا پکا رہی تھیں اور وہ میز پر چڑھ کر بیٹھی ناشپاتی کھا رہی تھی۔ اسے پھلوں میں ناشپاتی بہت پسند تھی۔

"ساڑھے تین بجے تک تو گائیڈ بنی ہوئی تھی' اس کے بعد۔ سینڈرا سے ملنے چلی گئی تھی۔ جب سے روم آئی ہوں اس سے مل ہی نہیں سکی تھی۔"

"گائیڈ؟" نینی کو اس کے لاابالی پن سے بولے جملے میں زیادہ قابل توجہ گائیڈ والی بات لگی تھی۔

"جی گائیڈ۔۔۔ وہ بے چارہ یہاں ٹورسٹ نہیں ہے' آفس کے کام سے آیا ہوا ہے' مگر میں زبردستی اسے ٹورسٹ بنانے پر تلی ہوئی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

نینی نے اسے بغور دیکھا تھا۔ "وہ کون؟ وہ روبرٹو کا کولیگ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"سکندر۔" اس نے جھٹ انہیں نام بتایا۔

"کیسا ہے وہ؟" نینی نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"پرسنالٹی پوچھ رہی ہیں یا مزاج؟" اس نے ناشپاتی کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"ظاہری شخصیت کی بات کریں تو وہ بہت ہینڈسم ہے۔ اپالو کا خیال آتا ہے اسے دیکھ کر۔ اور نیچر کی بات کریں تو دوسرے لوگوں سے بہت مختلف سا ہے وہ۔۔۔ کھویا کھویا' اداس سا' خود سے خفا خفا سا۔ کبھی زندہ دلی سے ہنستا ہے' کبھی بالکل سنجیدہ ہوجاتا ہے۔ بات کرتے کرتے اچانک ہی رک جاتا ہے ہنستے ہنستے ایک دم ہی چپ ہوجاتا ہے۔"

وہ کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں جیسے تصور میں سکندر کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"شادی شدہ ہے کہ کنوارا؟" نینی نے یک دم ہی

بے حد دلچسپی ظاہر کی۔ وہ سبزیاں کاٹتی رک کر بغور اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"نینی!" اس نے بے حد ناراضی سے انہیں دیکھا۔ "تم اس کی اس قدر تعریف کر رہی ہو نا تو مجھے لگا کہ شاید۔۔۔"

"آپ کو بالکل غلط لگا نینی۔" وہ نینی کا وضاحتی جملہ کاٹتے ہوئے قدرے خفگی سے بولی۔

"وہ مجھے بس ایک دوست کی حیثیت میں اچھا لگا ہے۔ میں اسے پینٹ کرنا چاہتی ہوں' اس لیے اچھا لگا ہے۔"

"لیکن کسی اور طرح بھی تو وہ اچھا لگ سکتا ہے۔ جب وہ اتنا اچھا ہے تو پھر۔"

"ناممکن۔۔۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس کی سب سے بڑی خامی اس کا پاکستان سے تعلق رکھنا ہے۔ ناممکن ہے کہ میں دوستی سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ اور سوچوں۔"

نینی کو اس کی بات بری لگی تھی۔ وہ پاکستان کی برائی سن کر ہمیشہ اسی طرح ردعمل ظاہر کیا کرتی تھیں۔

"پاکستانی ہونا کیا اتنا برا ہے لیزا؟"

"ہاں میرے لیے برا ہے' میں کسی مسلمان آدمی سے شادی کروں گی' مگر وہ مسلمان آدمی پاکستان سے ہرگز تعلق نہیں رکھتا ہوگا اور آپ مجھے اس طرح ناراضی سے مت گھوریں۔ آپ خود کون سا اب پاکستانی ہیں۔ گزشتہ چوبیس سالوں سے آپ اٹالین ہیں۔"

ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا۔ وہ برملا پاکستانی مردوں کو برا کہا کرتی تھی اور نینی اس کے برا کہنے پر ہر بار یوں ہی بدمزہ ہوا کرتی تھیں۔

"پاکستان کے خلاف یہ ساری نفرت سیم نے تمہارے اندر ڈال دی ہے لیزا۔" انہوں نے خفگی سے کہہ کر دوبارہ سبزیاں کاٹنا شروع کر دی تھیں۔

"پاکستان کے خلاف یہ ساری نفرت پاپا نے میرے اندر ڈالی ہے نینی! انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر کے بتایا ہے کہ پاکستانی مرد کتنے برے ہوتے ہیں۔ وہ پاپا ہوں یا ہاشم اسد۔ سارے پاکستانی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ منافق' دوغلے اور سنگ دل۔"

وہ بے تلخی سے فوراً" ہی میز سے نیچے اتری اور کچن سے باہر چلی گئی۔

نینی کے چہرے پر بھی کچھ برہمی تھی۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آکر خود کو پینٹنگ میں مصروف کر چکی تھی۔ جب اسے سیڑھیوں سے کسی کے اوپر چڑھنے کی آوازیں سنائی دیں۔

نینی اوپر اس کے پاس آئی تھیں۔ ان کے چہرے پر اب اس کے لیے خفگی نہیں بلکہ ممتا اور محبت تھی۔ وہ ان کے پیار کے اظہار پر اب مزید اپنا موڈ خراب رکھ نہیں سکتی تھی۔

"آپ چلیں میں آرہی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ وہ گردن ہلاتی واپس نیچے جارہی تھیں۔ لیزا کام روک کر انہیں جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ماں کی اصلی گود اور اصل پیار تو اس نے پایا نہیں تھا' ہاں ماں کے جیسے پیار کی جھلک اس نے نینی کے پیار میں دیکھی تھی۔

وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اولاد تھی نہیں۔ وہ اور ان کا خاندان اس کے دادا کے خاندان کے جدی پشتی ملازم تھے۔ اس کی دادی کو بیٹے کی اٹالین عورت سے شادی کے سبب اپنی پوتیوں کی تربیت اور پرورش سے متعلق تفکرات لاحق تھیں۔ پوتیوں کی اسلامی خطوط پر تربیت کے لیے انہوں نے اپنی قابل بھروسا ملازمہ مہرالنساء کو اٹلی بیٹے کے پاس بھیج دیا تھا۔ تب نینی چھتیس' سینتیس سال کی تھیں۔ پھر جب ان بہنوں کا گھر ٹوٹا' ان کا ساتھ چھوٹا' تب ان بہنوں کی زندگیوں میں نینی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی تھی۔ جب گھر ہی نہ رہا تھا تو کسی آیا یا ملازمہ کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ مگر پیچھے پاکستان میں بھی نینی کا کون تھا' وہاں جا کر بھی انہیں اس کی دادی کے گھر رہنا یا پھر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے گھر پر آیا ہی بننا تھا تو پھر یہ ملک کیا برا

وہاں روم میں پاکستانی ایمبیسڈر کو اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے پاکستانی آیا کی ضرورت تھی۔ وہ اچھے حسب نسب والی ملازمہ تھیں، محمود خالد کے گھران کی ان کی آیا رہ چکی تھیں، اس حوالے کی بنیاد پر انہیں وہاں میں دوسری ملازمت "فوراً" ہی مل گئی تھی۔ پھر آنے والے برسوں میں وہ کسی نہ کسی پاکستانی سفارت کار یا بزنس مین کے گھر پر ان کے بچوں کی آیا کے طور پر یا ان کے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کا کام کرتی رہی تھیں۔ ان تمام برسوں میں لیزا کا ان سے برابر رابطہ رہا تھا۔

پانچ سال قبل جب اس نے روم میں اپنا فلیٹ خریدنے کا سوچا تب اس کے ذہن میں "فوراً" ہی یہ خیال آیا تھا کہ وہ اپنے فلیٹ کی دیکھ بھال کے فرائض ان کے سپرد کردے گی۔ اس نے اب نینی کو کہیں پر ملازمت کرنے سے منع کردیا تھا۔ وہ خود تو یہاں سال کے دو ماہ گزارا کرتی لیکن باقی سارا سال اس کے فلیٹ کا خیال نینی رکھتی تھیں۔ وہ انہیں ان کے اخراجات کے لیے پابندی سے ہر ماہ لندن سے پیسے بھجوایا کرتی تھی۔ اس کی پرورش اور تربیت میں ان کا ہاتھ تھا۔ وہ ماں نہیں تھیں، ماں جیسی تو تھیں۔ ان کا حق تھا اور اس کا فرض کہ اب جب وہ بوڑھی ہو گئی ہیں، وہ ان کا خیال رکھے۔

وہ کھانا کھانے کے لیے نیچے آگئی تھی۔ کھانے اور اس کے بعد آج اس کا رات بھر کام کرنے کا موڈ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت اندھیری بڑی ہیبت ناک جگہ تھی۔ جیسے غار کوئی سُرنگ، وہاں روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسے وہاں بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اسے اس اندھیرے سے وحشت اور تنگ جگہ پر گھٹن ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا، وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ کوئی تھا جو اس اندھیرے میں چلتا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے اس کی بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مگر نہ وہ وہاں سے بھاگ پا رہا تھا، نہ ہی اس شخص سے خود کو دور کر پا رہا تھا۔ زور زور سے چلاتے یک دم ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

چند سیکنڈ زدہ بالکل کسی مردے کی طرح ساکت بیڈ پر پڑا رہا۔ اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہوا تب اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے چہرے پر گیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اسے پسینہ آنے لگا۔ اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔

اسے اپنے کمرے کے گھپ اندھیرے میں شدید ترین گھٹن ہونے لگی۔ وہ اپنی ساری ہمت جمع کر کے بستر سے اٹھا تھا۔ وہ کمرے کی تمام کھڑکیاں کھولنا چاہتا تھا، وہ کمرے کی تمام بتیاں روشن کرنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ لاس اینجلس میں رہ رہا تھا اور کیلی فورنیا یونیورسٹی میں اپنی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز میں مصروف تھا۔ اسے گھر کی یاد بالکل نہیں آتی تھی۔ اسے اگر کوئی یاد آتا تھا تو وہ اس کی امو جان تھیں۔ باقی اسے اپنے گھر کے نہ کسی فرد کی یاد آتی تھی نہ کسی اور چیز کی۔

امو جان سے اس کی فون پر خوب لمبی گفتگو ہوتی تھی۔ جبکہ شہریار خان اس سے فون پر انتہائی مختصر بات کیا کرتے تھے۔ سرسری انداز میں اس کی تعلیم اور کیمپس سے متعلق چند سوالات اور پھر مخصوص جملہ کہ اسے پیسوں یا کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ وہ اس کا رزلٹ کیسا دیکھنا چاہتے ہیں، آگے اس کے مستقبل کے لیے کیا کچھ سوچتے ہیں کچھ بھی نہیں۔ یہ سب وہ یقیناً "سکندر سے کہتے ہوں گے۔

وہ اپنے گھر کے مقابلے میں خود کو لاس اینجلس میں زیادہ پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ یہاں اسے ہر وقت کسی کے ساتھ اپنا موازنہ نہیں کرنا ہوتا تھا۔ وہ سکندر کو کبھی بھولے سے بھی فون نہیں کرتا تھا۔ سکندر خود ہی

ہر دس' پندرہ دن میں اسے فون کیا کرتا اور وہ جان چھڑانے والے انداز میں چند منٹ کی بات کرکے سکندر سے پیچھا چھڑالیا کرتا۔

باپ کے رویے اور ایک بے مقصد سی مقابلہ بازی اور اس مقابلے بازی میں پے در پے شکست نے اسے خاصا تلخ اور سنجیدہ بنادیا تھا۔ کیمپس میں اس کی بہت زیادہ دوستیاں نہیں تھیں۔ گنتی کے چند ایک ہی دوست تھے جن کے ساتھ وہ اکثر نظر آتا تھا۔

جس طرح شہریار خان نے سکندر کو بوسٹن میں رہائش کے لیے کرائے پر فلیٹ دلا رکھا تھا اسی طرح اسے بھی لاس اینجلس میں فلیٹ مہیا کیا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سکندر کے لیے رہائش کا انتظام کرنے وہ بوسٹن خود گئے تھے' خود اس کی رہائش کے لیے جگہ منتخب کی تھی' گھر کا سامان ڈلوایا تھا' جبکہ اس کے لیے یہ سارا کام لاس اینجلس میں اپنے ایک واقف کے ذریعے کروادیا تھا۔ پیسہ اس کے لیے بھی اتنا ہی خرچ کیا گیا تھا' مگر اس پر اپنا وقت اور اپنی توانائیاں برباد نہیں کی گئی تھیں۔

اس روز رات میں سکندر کا اس کے پاس فون آیا تھا۔ وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر سکندر سے بہت دور لے جاچکا تھا۔ وہ اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا' اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سکندر کو سوچ کر' اس سے بات کرکے' اس سے مل کر سوائے اپنے ہارے ہوئے ہونے اور دوسری پوزیشن پر کھڑے ہونے کے اسے اور کوئی احساس نہیں ملا کرتا تھا۔

"کیسے ہو زین؟" اس کے خشک سے ہیلو کے جواب میں سکندر گرم جوشی سے بولا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے جواباً" اس کی خیریت معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"اسپرنگ بریک (چھٹیوں) میں' میں گھر جارہا ہوں! تم بھی آجاؤ' کتنے مہینے ہوگئے ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے نہیں ہیں۔"

اس سے قبل وہ چھٹیوں میں جب گھر گیا تھا تب اس نے قصداً" جانے میں دیر کردی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ سکندر چھٹیاں گزار کر واپس جاچکا ہوگا۔ سکندر اس کے آنے کا انتظار کرتے کرتے' اسے فون پر بلاتے بلاتے آخر کار مایوس ہوکر جس روز بوسٹن واپس لوٹا تھا وہ اس سے اگلے ہی دن واشنگٹن اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔ میں چھٹیاں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

وہ خشک سے لہجے میں بولا تھا۔ اس کا لہجہ کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ اب بچہ نہیں تھا۔ بڑا ہوچکا تھا۔ اسے اب اپنے جذبات لوگوں سے چھپانا آگیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ سکندر کے لیے جو کچھ بھی محسوس کرتا' اس کا لفظوں میں اظہار بھی کرے۔ اس کا سرد اور خشک رویہ سکندر کو زین کی زندگی میں اس کی جگہ بتانے کے لیے کافی تھا۔

"پھر بھی تم کوشش تو کرو زین! دوستوں کے ساتھ پھر چلے جانا۔ مجھے تم بہت یاد آرہے ہو۔"

سکندر کے لہجے کی محبت اسے بناوٹی محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ خود کو بہت اچھا ثابت کرنے کے لیے یوں کرتا تھا۔ اسے سکندر کی اس منافقت اور دوغلی شخصیت سے نفرت تھی۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا میں نہیں آسکوں گا پھر کسی اور چھٹیوں میں میرا آنے کا موڈ بنا تو تمہیں بتادوں گا۔"

وہ اسی خشک سے لہجے میں بولا تھا۔

"اچھا۔ چلو جیسی تمہاری مرضی۔" سکندر کے لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔

وہ سمجھتا تھا خود سے ہر چیز میں کمتر بھائی پر وہ ترس کھاتا ہے محبت ہرگز نہیں کرتا۔

اس نے سکندر کے لہجے کی مایوسی پر دھیان دیے بغیر فون بند کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے بنیادی مضمون کے طور پر آرٹ منتخب کیا تھا۔ اپنی خواہش پر نہیں بلکہ اس لیے کہ انڈر گریجویٹ ڈگری کے لیے سکندر کا بھی مضمون یہی تھا۔

اسے قانون پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی' مگر
اس نے بھی قانون پڑھنا تھا۔ پتا نہیں اس
ساختہ مقابلے بازی سے وہ کبھی باہر نکل بھی سکے گا
نہیں یا ساری زندگی سکندر جیسا بننے کی خواہش
گزر جائے گی۔ وہ خود کو اس جنون سے نکالنا چاہتا
وہ اپنے راستے سکندر سے بالکل علیحدہ کرلینا چاہتا
لیکن اس کے اندر سکندر کو شکست دینے کی خواہش
آج بھی کہیں چھپی بیٹھی تھی۔

اپنے میجر سبجیکٹ اکنامکس ہی کے لیے اسے
سمسٹر میں Calculus کا اضافی کورس پڑھنا
اور یہ کورس پڑھنے کے لیے اسے میتھس
ڈیپارٹمنٹ میں کلاسز اٹینڈ کرنا تھیں۔

اس روز وہ اس سبجیکٹ کی پہلی کلاس لینے
Maths ڈپارٹمنٹ آیا تھا۔ اور وہاں اسے وہ ملی
تھی۔ اِمِ مریم۔

وہ اس دن کو ایک عام سا دن سمجھ کر کیمپس آیا تھا۔
تاہی نہیں تھا کہ آج اسے وہ ملے گی جس سے مل کر
کی زندگی سے تمام شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ اس
اندر سے تمام تلخیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ اپنے
ٹمنٹ سے بھاگتا دوڑتا یہاں پہنچا تھا۔ امِ مریم کا
سبجیکٹ Maths تھا تو اس نے تو اس کلاس
ہونا ہی تھا۔

وہ کلاس میں سنجیدگی اور خاموشی سے بیٹھا لیکچر سن
رہا تھا۔ تب اس لڑکی نے پروفیسر کو مسلسل زچ کرتے
سوالوں سے اسے چونکا دیا۔ وہ مختلف فارمولوں
سے متعلق ایسے تکنیکی سوالات کررہی
ذہن میں سے بعض کے جوابات پروفیسر کو بھی
معلوم نہیں تھے۔

شاید نہیں یقیناً" وہ لڑکی بہت ذہین تھی۔ وہ
maths خصوصاً" Calculus میں بہت
تھی' تب ہی انڈر گریجویٹ لیول پر اپنے پی ایچ
قابل پروفیسر کو ٹف ٹائم دے رہی تھی۔

اس کا امِ مریم سے پہلا تعارف تھا۔ جس میں وہ
کا نام نہیں جان سکا تھا۔ صرف اس کی قابلیت اور
خود اعتمادی سے آگاہ ہوا تھا اور یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ شاید
انڈیا یا پاکستان سے ہے۔

ہفتے میں تین' چار بار یہ کلاس لینے اسے یہاں آنا
تھا۔

دوسری بار وہ وہاں کلاس اٹینڈ کرنے آیا تو اتفاقاً"
اسے امِ مریم کے برابر والی کرسی پر جگہ ملی۔ وہ خاموشی
سے بیٹھا لیکچر سن رہا تھا۔

اس کے برابر بیٹھی وہ آج بھی اسی دن کی طرح
مختلف سوالات پروفیسر سے کررہی تھی۔ اور کہیں سے
بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر استاد کو پریشان
کرنے کے لیے اس طرح کے سوالات کررہی ہے'
بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے ذہن میں جو سوالات ابھر
رہے تھے' وہ برملا پروفیسر سے ان کا ذکر رہی تھی۔

کلاس ختم ہونے پر ایک ایک کرکے تمام
اسٹوڈنٹس کلاس سے جانے لگے' مگر وہ وہیں بیٹھی
تھی۔ اسے Derivation میں ابھی بھی ایک
الجھن تھی' جسے پروفیسر سمجھانے سے قاصر رہے
تھے۔

وہ Maths میں شروع سے بہت اچھا تھا۔ اسے
اس Derivation میں کہیں کوئی کنفیوژن
نہیں تھی۔ اپنی عادت اور مزاج کے برخلاف وہ بے
ساختہ اس سے کہہ بیٹھا۔

"اس Point پر آپ کنفیوز ہیں نا؟ لائیں
میں سمجھاؤں۔" اس لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا اسے
یوں دیکھنے لگی' ایسے جیسے ابھی تک وہ اس کی موجودگی
ہی سے لاعلم تھی۔

"ہاں ایسی کون سی غیر معمولی بات تھی۔ زین شہریار
میں کہ اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کا نوٹس لیا
جائے۔" سکندر سے حسد محسوس کرتے کرتے اب وہ
اس حد تک تلخ سوچ کا حامل ہو گیا تھا کہ اپنے بارے
میں بھی بہت کم ہی کچھ اچھا سوچ پاتا تھا۔

"آپ کو یہ Derivation سمجھ میں آگئی
ہے؟" اس لڑکی نے کچھ حیرت' کچھ خوشی سے کہا تھا۔
اس نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا اور پھر اسی

کی نوٹ بک پر اسے Derivation شروع سے آخر تک سمجھا دی۔
کل دس منٹ لگے تھے اسے۔ سمجھانے میں۔
"آپ کا بہت شکریہ۔" وہ مسکراتے ہوئے تشکر آمیز انداز میں بولی تھی۔
"یو آر ویلکم۔" وہ جواباً" مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھا تھا۔
"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟" وہ بھی اس کے ساتھ ہی کرسی سے اٹھی تھی۔ اس وقت کلاس میں صرف وہ دونوں تھے۔
"زین شہریار۔"
"میں امّ مریم ہوں۔"
"تم سے مل کر خوشی ہوئی زین۔" اس کے تعارف کے جواب میں اس نے دوستانہ انداز میں اپنا تعارف کروایا تھا۔ اس کا بے تکلف انداز اسے اچھا لگا تھا۔
"تم پاکستان سے ہو زین؟" وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے کلاس سے نکل رہے تھے۔
اس نے مختصر لفظوں میں اسے اپنے بارے میں بتایا۔ ان دونوں بھائیوں کی پیدائش امریکہ میں ہوئی تھی۔ شہریار خان کی ملازمت کے سبب ان بھائیوں کی اب تک کی ساری زندگی پاکستان سے باہر گزری تھی۔ اب گزشتہ کئی سالوں سے تو وہ لوگ تھے ہی امریکہ میں۔ ہاں چھٹیوں میں ان کا ہر سال پاکستان اپنے دادا کے گھر جو اسے اپنا خاندانی اور آبائی گھر لگا کرتا تھا' جانا لازمی ہوا کرتا تھا۔ وہ امریکی شہری تھا' جبکہ امّ مریم امریکی نہیں تھی۔ وہ یہاں پڑھنے کے لیے آئی تھی۔
اس مختصر رسمی سے تعارف اور گفتگو کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تھے۔
چند ہی دنوں کے اندر سے یہ بات پتا چل گئی کہ وہ لڑکی صرف کلاس روم کے اندر لیکچرز کے دوران ہی اپنی ذہانت ثابت نہیں کرتی بلکہ کلاس سے باہر اپنے پورے ڈپارٹمنٹ میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی ہے۔
Maths ڈپارٹمنٹ کا جو سہ ماہی میگزین نکلا کرتا تھا وہ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ڈرامیٹک کلب کی وہ روح رواں تھی' اپنے ڈپارٹمنٹ کے علاوہ دیگر کئی سائنس ڈپارٹمنٹس کی مختلف آرگنائزیشن اور کلبز کی وہ سرگرم ممبر تھی۔
وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار کارکردگی اور ریکارڈ رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ امریکہ میں ایک امریکن یونیورسٹی میں امریکیوں پر سبقت حاصل کر رہی تھی اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔
پہلے دن کی تعارفی گفتگو کے بعد اس نے امّ مریم سے از خود گفتگو کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں ہفتے میں تین بار جب وہ —— کلاس اٹینڈ کرنے آتا تب امّ مریم کبھی اس کے پاس آکر اور کبھی دور ہی سے اس سے سلام دعا کر لیا کرتی تھی۔ اپنے آپ میں گم رہنے والا سنجیدہ مزاج لڑکا تھا' ایسے میں امّ مریم یا کسی بھی اور لڑکی سے دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
امّ مریم کا ڈرامیٹک کلب رومیو جولیٹ اسٹیج کر رہا تھا۔ آتے جاتے جتنی باتیں اس کے کانوں میں پڑی تھیں اس سے اتنا تو اسے پتا چل ہی چکا تھا کہ اس ڈرامے کا اسکرپٹ امّ مریم نے لکھا تھا' ڈائریکشن بھی اسی کی اور جولیٹ کا کردار بھی وہ ہی ادا کر رہی تھی۔
یہ ڈرامہ وہ لوگ کسی چیریٹی کے لیے کر رہے تھے اس نے بھی خاموشی سے ٹکٹ خرید لیا تھا۔
آڈیٹوریم میں پچھلی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا امّ مریم اسٹیج پر آئی تو واقعی چراغوں میں روشنی رہی تھی۔ وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھی۔ وہ واقعی جولیٹ لگ رہی تھی۔ اس کے آجانے کے بعد پھر کسی اداکار کا رنگ جم نہیں پا رہا تھا۔ ڈرامہ دیکھنے والا ہر فرد جولیٹ کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔
وہ خوب صورت تھی' مگر خوب صورت تو بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں' اسے جو چیز دوسری لڑکیوں بلکہ سب سے نمایاں کرتی تھی وہ اس کی آنکھوں سے چھلکتی ذہانت' اس کی چھا جانے والی شخصیت تھی۔

وہ مبہوت سا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہا تھا۔ ڈرامہ ختم ہونے پر وہ خاموشی سے آڈیٹوریم سے اٹھ آیا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں کی طرح اس نے ام مریم سے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

ام مریم کو تو یہ پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ وہاں وہ بھی آیا تھا، اتنی بہت سی تالیوں کے بیچ اس بے تحاشا حسین و ذہین لڑکی کو زین شہریار کی تالیاں کہاں سنائی دی ہوں گی؟ وہ اپنے اندر ایک بے نام سی اداسی محسوس کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
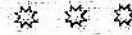
ام مریم اپنی کامیابی کی خوشی میں تمام کلاس فیلوز کو پارٹی دے رہی تھی۔

اسے سراہنے، اسے پسند کرنے والے بہت تھے۔ زین شہریار تو کہیں پس منظر میں تھا۔ ہجوم کا حصہ بننے کے لیے وہ اس کے گھر پارٹی میں جاتا؟ ظاہر ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ پارٹی میں نہیں گیا تھا۔ پارٹی سے اگلے روز اس کی کلاس بھی نہیں تھی تو وہ ڈپارٹمنٹ بھی نہیں گیا۔ وہ اپنے ہی ڈپارٹمنٹ میں تھا اور لائبریری کی طرف جارہا تھا۔ جب اسے سامنے سے ام مریم آتی نظر آئی۔

وہاں وہ جتنی مقبول تھی، جتنی اس کی دوستیاں تھیں، یہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ دوست ضرور ہوں گے جن سے وہ ملنے آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ لینے کے باوجود نہ دیکھنے کا تاثر دے کر خاموشی سے گزر جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر اسے اپنی جگہ پر رک جانا پڑا کہ وہ اسی کی طرف آرہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سا خاموش کھڑا اسے اپنے پاس آتے دیکھ رہا تھا۔

"کل کہاں تھے تم؟" وہ آتے ہی بغیر سلام دعا کے خفگی سے بولی۔

"کل؟"

"ہاں کل۔ اب یہ مت کہنا کہ تمہیں پتا نہیں ہے کل کیا تھا۔" وہ خفا خفا سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کل کیا تھا ام مریم؟" اپنے دل میں حیرت اور بے تحاشا خوشی محسوس کرتے اس نے بظاہر اسے چھیڑا تھا۔ کیا واقعی ام مریم نے کل اس کے نہ آنے کو محسوس کیا تھا۔

"کل پارٹی رکھی تھی نا میں نے اپنے گھر پر۔ سب آئے تھے سوائے تمہارے۔" وہ ناراضی سے اسے گھور رہی تھی۔

"مگر تم نے مجھے بلایا کب تھا؟" وہ مسکرا رہا تھا۔

"میں نے ساری کلاس کو انوائٹ کیا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے کلاس میں پارٹی کا اعلان کیا تھا تم بھی کلاس میں موجود تھے۔"

"میں اجتماعی دعوت ویسے جانے پر کہیں نہیں جاتا۔ مجھے مجمع کا حصہ بننے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ اس بار قدرے سنجیدگی سے بولا تھا۔

"بڑے مغرور ہو تم زین شہریار! اگر مجھے پتا ہوتا تم اس قدر مغرور اور خود پسند ہو تو تمہیں علیحدہ سے پارٹی کی دعوت دیتی۔" اس نے جواباً ام مریم پر یہ ثابت کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی کہ وہ مغرور اور خود پسند نہیں ہے۔ وہ خاموش رہا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

" Play والے دن بھی آئے، مگر مجھ سے ملے نہیں۔ سب مجھ سے ملنے، مجھے مبارک باد دینے آئے، سوائے تمہارے۔ کل پارٹی پر میں نے تمہارا اس قدر انتظار کیا، مگر تم غائب۔ اس قدر مغرور بھی نہیں ہونا چاہیے انسان کو۔"

تو اس نے اسے Play والے دن دیکھا تھا؟ وہ ام مریم کی شخصیت کے سحر میں گرفتار بے شمار افراد میں سے ایک فرد نہیں تھا۔ وہ اس کے ہونے اور نہ ہونے کو محسوس کیا کرتی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ذات کے بارے میں اس نے اپنے اندر ایک سچی خوشی ابھرتی محسوس کی۔ اسے زندگی میں پہلی بار خود اپنے آپ پر پیار آیا، خود سے محبت کا احساس جاگا۔ وہ اتنا غیر اہم بھی نہیں، وہ اتنا عام سا بھی نہیں کہ یوں ہی نظر انداز کر دیا جائے۔

"میں نے سوچا اتنے لوگ تمہیں مبارک باد دے

رہے ہیں' سراہ رہے ہیں' ان سب کے بیچ میری مبارک باد کی شاید تمہیں ضرورت ہی نہ ہو۔"

"تم نے بالکل غلط سوچا تھا زین! میں نے تمہاری مبارک باد کا بہت انتظار کیا۔ میں نے کل پارٹی پر بھی تمہارا بہت انتظار کیا۔"

"چلو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آج تمہاری اس خوشی اور کامیابی کو سیلیبریٹ کر لیتے ہیں۔ کہیں ساتھ لنچ کر لیتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

ام مریم کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی بڑی بے ساختہ تھی۔ کیا وہ اس لیے خوش تھی کہ وہ اس کے ساتھ وقت گزارنے کی بات کر رہا تھا؟ کیا وہ زین شہریار اس غیر معمولی لڑکی کے لیے کچھ غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا تھا؟ جو اسے نظر آ رہا تھا' جو ام مریم کی نگاہیں اسے بتا رہی تھیں اسے سمجھ لینے کے باوجود بھی وہ سمجھنے سے ہچکچا رہا تھا۔

بچپن سے خود کو نظر انداز ہوتے دیکھنے کا وہ احساس اس طرح اس کے اندر بیٹھ چکا تھا کہ اب یک دم ہی یہ مان لینا کہ وہ نظر انداز کی جانے والی شخصیت کا مالک نہیں ہے' مشکل ہو رہا تھا۔ ام مریم نے بخوشی اس کی لنچ کی دعوت قبول کر لی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ لنچ کرنے جا رہا تھا۔ امریکہ جیسے ملک کا شہری ہوتے' وہیں پلتے بڑھتے 19 سال کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود اس کی ابھی تک کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی۔

وہ صرف اسے لنچ ہی نہیں کروا رہا تھا بلکہ وہ اس کے لیے پھولوں کا ایک گلدستہ اور چاکلیٹس کا ایک باکس بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس کی کامیابی پر اسے مبارک باد دینے کے لیے بطور تحفہ۔

ام مریم اس لنچ کے لیے بطور خاص تیار ہو کر آئی تھی' اس نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ سلیقے سے کیے میک اپ اور شانے سے کچھ نیچے آتے سلکی بال جو صبح کیمپس میں بینڈ میں جکڑے ہوئے تھے اس وقت کھلے تھے۔ وہ اس کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔

اسے بے پناہ خوشی کا احساس ہو رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہے کہ یہ اہتمام اس پیاری لڑکی نے اسی کے لیے کیا تھا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"شکریہ! میں نے سوچا تم خاص طور پر میرے اعزاز میں مجھے یہ لنچ دے رہے ہو تو مجھے بھی ذرا اچھی طرح تیار ہو کر آنا چاہیے۔" وہ جواباً" مسکرا کر بولی۔

ساتھ لنچ کرتے ہوئے وہ دونوں دنیا زمانے کے تمام موضوعات پر باتیں کر رہے تھے۔ وہ لڑکی صرف حسن اور ذہانت میں ہی یکتا نہیں تھی وہ ہر چیز اور معاملے میں منفرد تھی۔

اس کا ذوق بہت ہی اعلا تھا۔ کھانے پینے سے لے کر لباس' دلچسپیوں' دوستوں اور زندگی گزارنے کے انداز تک میں۔

اس کی گفتگو کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ اس کا جی چاہتا وہ بولتی رہے اور وہ اسے سنتا رہے۔

اس روز لنچ کر کے وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ چکے تھے۔ وہ لڑکی اس کے لیے بے حد اہم ہو چکی تھی۔

اب وہ کلاس اٹینڈ کرنے آتا تو وہ دونوں کلاس میں ساتھ بیٹھتے۔ لائبریری میں ساتھ بیٹھ کر اپنے اسائنمنٹس بناتے' لائبریری' جم' کیفے ٹیریا' کیمپس کے آس پاس کی دیگر جگہیں' ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی جہاں وہ ساتھ وقت نہیں گزارتے تھے۔

وہ کم گو تھا' اپنی ذات میں گم رہتا تھا۔ کچھ زیادہ سوشل بھی نہیں تھا مگر اب ام مریم کے ساتھ وہ بے تکان گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کیمپس میں جن کلچرز کی سرگرمیوں میں وہ مصروف رہا کرتی تھی اسے بھی زبردستی ان میں شامل کرنے کی کوشش کرتی اور وہ صرف اور صرف اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی دھن میں ان سب میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔

وہ پاکستان سے آئی تھی۔ اور یہاں اپنے چچا کے

پاس رہ رہی تھی۔ وہ بہت اچھی فیملی کی لڑکی تھی۔ وہ جس وقت اس کے ساتھ ہوتی تب تو اس کے ساتھ ہوتی ہی تھی مگر جب ساتھ نہ ہوتی تب بھی ساتھ محسوس ہوا کرتی۔ وہ رات اسے سوچتا اس کی باتیں یاد کرکے مسکراتے ہوئے سوتا تھا۔ اب اسے گھر کی رتی برابر بھی یاد نہیں آتی تھی۔

شہریار خان اب بھی اس میں اور سکندر میں واضح فرق رکھتے مگر اسے اس سے بھی اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب وہ سکندر کو سرے سے سوچا ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے زندگی سے پیار ہو گیا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار خود اپنے آپ سے پیار ہو گیا تھا۔ اس کا خوش رہنے کو دل چاہتا اور وہ بے پناہ خوش رہتا بھی تھا۔

اس کے دل نے اس سے کہا وہ ام مریم کا ساتھ کچھ گھنٹوں، کچھ مہینوں یا چند سالوں کے لیے نہیں بلکہ عمر بھر کے لیے چاہتا ہے۔ ہاں وہ ام مریم سے محبت کرنے لگا۔ وہ لڑکی اس کے لیے ناگزیر ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے جو بھی جذبات رکھتے تھے مگر ابھی تک ایک دوسرے سے ان کا اظہار نہیں کیا تھا۔

یہ ایک ان کہی تھی جسے دونوں سمجھتے تھے پر محبت کا لفظ ابھی تک زبان سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک ڈر ایک ہچکچاہٹ سی تھی اگرچہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے والہانہ ——— پیار کرتی ہے مگر کیا وہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے؟

نجانے رد ہو جانے کا کیسا خوف تھا اس کے اندر جو وہ لاکھ کوشش کے باوجود اتنے مہینوں بعد بھی ام مریم سے اقرار محبت نہیں کر پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

کیلکولس کا پہلا کورس ختم کرکے وہ اگلے سمسٹر میں جا چکا تھا۔ مگر اب انہیں ملنے کے لیے اس کلاس کی ضرورت بھی کہاں تھی وہ دونوں ہمہ وقت ساتھ ہوتے تھے۔ ایشین اسٹوڈنٹس کی ایک تنظیم تھی جو وہاں زیر تعلیم ساؤتھ ایشین اسٹوڈنٹس کے لیے وقتاً" فوقتاً" مختلف پروگرامز کا اہتمام کرتی رہتی تھی تاکہ اس طرح ان ممالک کے طالب علموں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملتا رہے۔ ام مریم اس کی ممبر تھی اور اس کی خواہش پر وہ بھی اس کا ممبر بن گیا۔

اس روز اس تنظیم کی جانب سے باربی کیو پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پارٹیوں میں جانے کا شوقین نہ ہونے کے باوجود وہ ام مریم کے ساتھ بصد شوق تمام پارٹیز میں جاتا۔ وہ اس رات بھی اس کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

ساؤتھ ایشین ممالک سے تعلق رکھتے بہت سے اساتذہ کو بھی آج اس پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا۔

ان کے پروفیسرز اور لیکچررز چاہے جتنے بھی سخت مزاج ہوں مگر کلاس روم سے باہر خصوصاً" اس طرح کی تقریبات میں وہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ خوب گھل مل جاتے۔ آج کی اس پارٹی کے لیے ان کے ایک پروفیسر نے اپنے گھر کا بیک یارڈ ان لوگوں کو خود آفر کیا تھا۔

ان کا گھر خاصا بڑا تھا اور بیک یارڈ میں اتنی جگہ تھی کہ وہاں باربی کیو کیا جا سکے اور تمام افراد وہاں بیٹھ بھی سکیں۔ وہ maths ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر تھے۔

اڑتیس سال کے بالکل ینگ ایسوسی ایٹ پروفیسر۔ غالباً" والدہ امریکن تھیں اور والد انڈین۔ زین لڑکوں کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور مریم اپنے پروفیسر اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ باربی کیو کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

اسے پروفیسر کا اس سے اتنا گھلنا ملنا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بلاوجہ ہر بات کے لیے اسی کو آواز دے رہے تھے۔ ام مریم سے قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے ان کی نگاہوں میں ام مریم کے لیے پسندیدگی محسوس ہوئی تھی۔

یک دم ہی اس کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ فوراً" ہی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اسے ام مریم پر شدید غصہ آرہا تھا۔ وہ اس سے کچھ بھی کہے سنے بغیر وہاں

ے چلے جانا چاہتا تھا مگر ام مریم نے شاید اسے بیگ
گارڈ سے جاتے دیکھ لیا تھا وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔
تب اس نے اپنے پیچھے ام مریم کی آواز سنی۔

"زین! کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟" اس نے
مڑ کر گھما کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ
اور ناراضی تھی۔

"میرے سر میں درد ہے۔ گھر جا رہا ہوں۔"

"مجھے بتائے بغیر؟ میں تمہیں اٹھ کر آتا نہ دیکھتی تو
تم مجھے بتائے بغیر چلے جاتے۔ چاہے میں جتنا بھی
پریشان ہوتی رہتی؟" اس کے لہجے میں واضح شکوہ تھا۔

"میں نے ضرورت محسوس نہیں کی تمہیں بتانے
کی۔ تم ڈاکٹر خان کے ساتھ کافی مصروف تھیں۔"
اس کا لہجہ طنزیہ اور کچھ جتانے والا تھا۔ ام مریم اسے
حیرانی سے دیکھتی رہ گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے تم یونہی چلے جاتے اور مجھے کچھ
فرق نہیں پڑتا؟"

"ہاں تمہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں چاہنے اور
سراہنے والے لوگ بے شمار ہیں۔ زین شہریار اتنے
لوگوں کے درمیان نظر کہاں آئے گا۔"

وہ بہت بے مروتی سے بولا۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔
اس نے ام مریم کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھے تھے۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ زین شہریار مجھے کیسے نظر آسکتا
ہے۔ اس کی میرے لیے اہمیت کیا ہو سکتی ہے سوائے
اس کے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ سوائے اس
کے کہ وہ میرے لیے ساری دنیا کے تمام لوگوں سے
زیادہ اہم ہے۔ سوائے اس کے کہ جس وقت وہ میرے
ساتھ ہوتا ہے میں خوش ہوتی ہوں۔ سوائے اس کے
کہ جب وہ آس پاس نظر نہیں آتا میرا دل اداس رہتا
ہے۔ سوائے اس کے کہ ساری دنیا میری تعریف
کرے مگر زین شہریار مجھے غلط سمجھے تو اپنی ہر اچھائی ہر
پل میرے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔
اپنے رویے اور اپنے لفظوں کی سختی پر شرمندہ ہونا
شروع کیا۔

وہ ام مریم کے آنسوؤں پر بھی دھیان نہیں دے
پا رہا تھا۔ وہ اس کے لفظوں میں موجود محبت کی شدت
پر ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

"مریم!" وہ بے اختیار اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس سے کیا کہے۔

"لوگ مجھے کتنا پسند کرتے ہیں یا نہیں کرتے مجھے
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا زین! مجھے فرق پڑتا ہے تو
اس بات سے کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہ مجھ
سے محبت نہیں کرتا یا شاید محبت تو کرتا ہے مگر اس کا
اقرار نہیں کرنا چاہتا۔ شاید میں اس کے لیے اتنی اہم
ہوں ہی نہیں کہ وہ میرے ساتھ اپنی ساری زندگی
گزارنا چاہے۔"

ام مریم اس کا جواب سننے کے لیے وہاں رکی نہیں
تھی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے
نہیں گیا تھا۔ چند منٹ وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ
وہاں سے واپس آگیا۔ اسے ام مریم کے اظہار محبت
نے خوشی دی تھی۔ اسے اس کے آنسوؤں سے
تکلیف پہنچی تھی۔

اپنی خود ساختہ سوچوں اور احساس کمتری میں گھر کر وہ
اس لڑکی کو گنوانے چلا تھا؟ وہ لڑکی ہونے کے ناتے
اظہار محبت میں پہل اس کی جانب سے چاہتی تھی۔
اس کے لبوں سے کسی خوبصورت اقرار کو سننے کی منتظر
رہی تھی اور وہ اسے یہ خوشی نہیں دے پایا تھا۔ اسے
خود پر شدید غصہ آیا۔

وہ اپنی اس زیادتی اور اس غلطی کا ازالہ اب کسی
بہت بہت خوبصورت اور منفرد انداز میں کرنا چاہتا تھا۔
اسے کیا کرنا تھا یہ وہ سوچ چکا تھا۔

آنے والے چند دن اس نے بالکل خاموشی سے
گزارے۔ بظاہر ام مریم اس کے ساتھ پہلے والے
انداز ہی میں مل رہی تھی۔ وہ دونوں کیمپس میں پہلے
ہی کی طرح ساتھ ہوتے تھے مگر وہ جانتا تھا ام مریم اس
سے سخت ناراض تھی۔ اتنی ناراض کہ اپنی ناراضی
کا اظہار کرنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

ویک اینڈ پر اس نے اسے اپنے ساتھ CRUISE

SHIP (جہاز) پر انوائٹ کیا تھا۔ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس cruise پر صرف وہ دونوں ہی ہوں گے بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ CRUISE SHIP پر دونوں کے لیے جا رہا ہے۔

اس cruise ship نے لاس اینجلس سے لے کر catalina آئی لینڈ تک جانا تھا۔ درمیان میں وہ اور خوبصورت مقامات پر رکنا تھا۔ ابتدائی طور پر انکار کرنے کے بعد وہ اس کے اصرار پر مان گئی تھی۔ لاس اینجلس سے ان کی cruise ship نے روانگی کا آغاز کیا تب ام مریم اس سے تعجب سے پوچھنے لگی۔

"تمہارے دوست کہاں رہ گئے؟"

"میری دوست ام مریم میرے ساتھ ہے۔ مجھے اس کے علاوہ اور کسی کا ساتھ نہیں چاہیے۔"

وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے لفظوں میں گہرائی تھی۔ سچائی تھی۔ ام مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہاں پر انجوائے کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ میوزک، گیمز، بہترین کھانے اور بھی بہت کچھ۔ سارا دن وہ اس سب کو انجوائے کرتے رہے۔ رات میں وہ اسے اپنے ساتھ عرشے پر لے آیا تھا۔ وہ کھلے سمندر کے بیچوں بیچ خوبصورت جہاز کے deck پر خوبصورت سرخ گلابوں کے ساتھ اسے پرپوز کرنا چاہتا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم! میں تمہارے ساتھ اپنی پوری عمر بتانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری محبت اور میرا ساتھ قبول ہے؟"

اس نے آہستگی سے بولتے ہوئے پھول اس کی طرف بڑھائے اور اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"زین" وہ جیسے اس سے اس انداز سے اظہار محبت کی امید نہیں رکھتی تھی۔ وہ خوش بھی تھی اور وہ حیران بھی۔ ام مریم نے بے اختیار اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے اور اپنا ہاتھ زین کے بڑھے ہاتھ میں دے دیا۔

"تم کبھی بھی اور کہیں بھی کہتے۔ مجھے اچھا لگتا مگر مجھے پرپوز کرنے کے لیے یہ خوبصورت جہاز اور یہ سمندر منتخب کر کے تم نے ان لمحوں کو میرے لیے بہت یادگار بنا دیا ہے زین!"

وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بول رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے والہانہ نظروں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس سے وہ شدید محبت کرتا تھا۔

"بیٹا جی بیس سال کی عمر شادی کے لیے کچھ چھوٹی عمر نہیں ہے؟" اس کی اموجان چھیڑنے والے انداز میں اس سے فون پر کہہ رہی تھیں۔

جہاز سے واپس آ کر اس نے اس رات ہی اپنی اموجان کو فون کیا۔ وہ انہیں ام مریم کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ اپنے گھر میں وہ صرف ماں ہی سے قریب تھا کہ باپ نے اسے کبھی در خور اعتنا سمجھا ہی نہ تھا۔

سو باپ سے وہ ام مریم کا کیا تذکرہ کرتا۔ رہ گیا سکندر تو اسے وہ اس قابل سمجھتا نہیں تھا کہ اپنی اتنی ذاتی بات اس سے شیئر کرے اس نے شہریار خان اور سکندر شہریار دونوں کے متعلق سوچنا اور کڑھنا ان دنوں بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے سکندر کے ساتھ نہ کوئی مقابلہ کرنا ہے نہ موازنہ۔

"میں ابھی شادی کی بات نہیں کر رہا۔ ابھی تو ہم دونوں پڑھ رہے ہیں۔ وہ بڑی ambitious لڑکی ہے۔ اگلے چار، پانچ سال تو ہم دونوں ہی کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن منگنی یا بات تو طے کی جا سکتی ہے اس دوران۔ پلیز اموجان! آپ پاپا سے بات نہ کریں۔"

زندگی بھر اس نے اپنی ہر بات باپ تک پہنچانے کے لیے اموجان ہی کا سہارا لیا تھا۔

"اچھا میں بات کرتی ہوں تمہارے پاپا سے۔" اس کے اصرار کے جواب میں اموجان نے محبت بھرے انداز میں اسے امید دلائی۔

"تھینک یو اموجان۔" وہ سرشار سا ہو گیا۔

"یہ بتاؤ وہ ہے کیسی؟" انہوں نے اشتیاق ظاہر کیا۔ اور وہ انہیں ام مریم کی خوبیوں سے آگاہ کرنے لگا۔

"ام مریم بہت خوبصورت ہے اموجان! وہ ذہین ہے، وہ بہت اچھی فیملی سے تعلق رکھتی

کوئی اگر ڈھونڈنے کی کوشش کرے تب بھی کوئی
معمولی سی برائی بھی اس میں نہیں نکال سکتا۔"

"تب تو میں ام مریم سے جلد از جلد ملنا چاہوں گی
زین۔" امو جان ہنس کر بولیں۔

ماں سے بات کرلینے کے بعد اس نے مطمئن ہو کر
فون بند کر دیا تھا۔ ام مریم کو کون ناپسند کر سکتا تھا؟ اسے
یقین تھا وہ اس کے پاپا کو ضرور پسند آئے گی۔ بلکہ وہ ان
کے معیار سے بھی بہت بڑھ کر ثابت ہو گی۔ ایسی بیوی
اس کے لیے نہیں انہوں نے شاید اپنے شہزادے
سکندر شہریار کے لیے سوچ رکھی ہو گی۔ اور سکندر اس
کا کیا رد عمل ہو گا جب وہ ام مریم سے ملے گا؟

اس نے کسی کو شکست دینے کے لیے ام مریم کو
نہیں چنا تھا مگر اس وقت امو جان سے بات کرنے کے
بعد جب اس نے اپنے پاپا اور سکندر کو سوچنا شروع کیا
تب بے اختیار یہ سوچ اس کے دل میں ابھری تھی کہ
سکندر خود اپنے لیے یا اس کے پاپا چاہے جتنی بھی اچھی
لڑکی سکندر کے لیے ڈھونڈ لائیں مگر وہ ام مریم جیسی
ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک عجیب سی طمانیت ایک عجیب سا سکون وہ
اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا تھا۔

سکندر لیونگ روم میں آیا تو امو جان کو کسی گہری
سوچ میں گم پایا۔ وہ زین سے فون پر بات کرنے کے بعد
ریسیور واپس رکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں تھیں وہ
زین کے مقابلے میں گھر جلدی جلدی آتا تھا۔ وہ یا تین
ماہ بعد بھی چھٹی آتی تو وہ دوڑا دوڑا گھر آجایا کرتا تھا۔
اپنا گھر، اپنی امو جان اور اپنے پاپا سب بہت یاد
آتے تھے۔ یاد تو اسے زین بھی بہت آتا تھا۔ مگر اسے
لاس اینجلس اتنا پیارا ہو گیا تھا کہ چھٹیوں پر بھی بمشکل
آیا کرتا۔ اسے زین کی یاد آتی تو وہ خود اسے فون
کرتا تھا۔

"کیا بات ہے امو جان! کس کا فون تھا؟" ڈرائی
فروٹ کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ نمکین پستے
انجوائے کر رہا تھا۔

"زین کا فون تھا۔" امو جان نے اس کی طرف
قدرے سنجیدہ تھیں۔ سکندر ان کے پاس
صوفے پر بیٹھ گیا۔

"زین ٹھیک تو ہے نا؟" ماں کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ
کر اسے فکر لاحق ہوئی تھی۔ اپنا چھوٹا بھائی اسے کتنا
پیارا تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

"ہاں وہ ٹھیک ہے' سب خیریت ہے۔" امو جان
نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے اطمینان دلایا۔

"تمہارے چھوٹے بھائی صاحب کو یونیورسٹی میں
کوئی لڑکی پسند آگئی ہے۔" انہوں نے اسے اصل بات
سے آگاہ کیا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا۔

"تب ہی میں کہوں... محترم چھٹیوں میں میرے
اس قدر اصرار کے باوجود بھی گھر آنے کا نام کیوں نہیں
لیتے۔ لاس اینجلس میں ان کے اس قدر دل لگ جانے
کی وجہ اب سمجھ میں آرہی ہے۔ امو جان!"

"زین کہہ رہا ہے میں تمہارے پاپا سے اس بارے
میں بات کروں۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے امو جان؟
ہمارا زین بہت سمجھدار ہے۔ اس نے یقیناً ایک
اچھی لڑکی ہی کو اپنے لیے چنا ہو گا۔ آپ پاپا سے بات
کریں۔ اگر وہ لڑکی آپ کو اور پاپا کو پسند آجاتی ہے تو
منگنی کر دینے میں تو کوئی حرج نہیں؟"

اس کی سمجھ داری پر وہ مسکرائی تھیں۔

"لگے ہاتھوں تم بھی بتا دو اگر تمہیں کوئی پسند ہے
تو، تاکہ میں تمہارے پاپا سے ایک ہی وقت میں تم
دونوں بھائیوں کی بات کرلوں۔" وہ جواباً قہقہہ لگا کر ہنسا
تھا۔

"جو سکندر شہریار کو اچھی لگ جائے ایسی کوئی لڑکی
ابھی تک تو ملی نہیں ہے۔ جس دن مل جائے گی سب
سے پہلے آپ کو بتاؤں گا امو جان!"

اس نے شرارتی سے انداز میں بولتے ہوئے ماں
کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر
مسکرا رہی تھیں۔

باقی آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ

لیزا ایک مصورہ ہے۔ سکندر کی مکمل مشابہانہ شخصیت اور اس کے تیکھے مغرور نقوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ وہ اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کردیتا ہے۔

ایک دو اتفاقیہ ملاقاتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہوجاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکھڑ مغرور انداز ہے۔

لیزا کا روم میں اپنا اپارٹمنٹ ہے جو اس کے باپ نے اسے خرید کردیا ہے۔ جہاں وہ مینی کے ساتھ رہتی ہے۔

سکندر کو نیپلز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی ٹرین مس ہونے کی بنا پر اسے مجبوراً لیزا کی مدد لینا پڑتی ہے۔ لیزا اس کو نیپلز لے کر جاتی ہے۔ اور واپس بھی لاتی ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر تلے دو بیٹیوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

وٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔

بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر گئی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اوردرمیانہ درجہ کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدے کے مطابق سیم کو وٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

وٹوریا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس مین سے شادی کرلی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روما سے بھی بہت پیار تھا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔

محمود خالد، سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے، اس کے باوجود وٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہوگئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کرلی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہوسکی، وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کردیا۔ مایوس ہو کر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف ہاشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے، یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کرکے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے — باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہریار کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہریار کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پروپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پروپوزل بہت خوش دلی سے قبول کرلیا۔ زین شہریار نے اپنی والدہ کو فون کرکے بتادیا۔ زین کو یقین تھا کہ ام مریم جیسی لڑکی کو اس کے والد انکار کرہی نہیں سکتے۔

۳
تیسری قسط

ہفتے کی پوری رات اور اتوار کا پورا دن اعصابی درد میں گزار کر پیر کے روز وہ آفس میں موجود تھا۔ ابھی بھی اسے شدید درد تھا۔ اس کے آدھے سر میں درد تھا۔

اس کی گردن کے پچھلے حصے سے درد کی شدید لہر [illegible] "اٹھ رہی تھی اور وہ اس کے بازوؤں تک [illegible] رہی تھی۔ ہفتے کی وہ سہ پہر لیزا کے ساتھ جو اس نے [illegible]

کھایا تھا اس کے بعد سے آج پیر کے دن تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا فقط جو چیز اس کے حلق سے نیچے اتری تھی۔

وہ بے حساب چائے اور کافی کے کپس تھے یا پھر درد سے نجات کے لیے ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویہ۔ اس پر خود سے بھی اور زندگی سے بھی بیزاری پوری طرح حاوی تھی۔ اپنی زندگی ختم کرنے کا جی چاہ رہا تھا مگر دفتر میں اس نے کسی کو بھی نہ اپنی طبیعت کے متعلق کچھ پتا لگنے دیا تھا نہ اپنا چڑچڑا پن اور بد مزاجی کسی پر ظاہر کی تھی۔ کام کی بات کے علاوہ وہ یہاں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا، جو کوئی کام کی بات سے آگے جا کر کچھ اور بات کہتا اور وہ جواباً کسی بد مزاجی کا مظاہرہ کرتا۔ ایک روبرٹو تھا یہاں جس سے دوسروں کی نسبت اس کی زیادہ بات چیت ہو جایا کرتی تھی مگر اسے بھی دوستی یا بے تکلفی کے زمرے میں ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ اگر روبرٹو واپس آ بھی چکا ہوتا تب بھی وہ کم بولتا اور اپنے کام سے کام رکھتا اور اس پر اپنے مزاج کی کوئی تبدیلی آشکار نہ ہونے دیتا۔

یہاں تو وہ چند ہفتوں کے لیے آیا تھا۔ دوہا، جہاں وہ اب مستقل رہا کرتا تھا، وہاں اس نے کسی کو خود سے ایک حد سے زیادہ نزدیک نہیں آنے دیا تھا۔ اس کے کولیگ بہت تھے، اس کے واقف بہت تھے، اس کے ملنے والے بہت تھے مگر اس کا دوست کوئی نہ تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ دوستی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک لکیر کھینچ کر رکھتا تھا وہ اپنے اور اپنے سے واقف ہر شخص کے بیچ۔ اس حد فاصل سے آگے آنے کی اس نے کبھی کسی کو جرأت نہیں دی تھی، سوائے اس لڑکی لیزا محمود کے جو زبردستی اس کے نزدیک آنے کی کوشش کر رہی تھی، زبردستی اس سے بے تکلف ہونے اور دوستی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتوار کا پورا دن اس نے اپنا موبائل آف رکھا تھا۔ وہ لیزا محمود سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی ہنسی کی اتنی کڑی سزا! درد کی اٹھتی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے سوچا، وہ اب لیزا سے کبھی نہیں ملے گا۔ نہ وہ اس سے ملے گا نہ ہی پھر وہ کبھی ہنسے گا، نہ خوش ہو گا، نہ قہقہے لگائے گا اور نہ ہی پھر اسے خود کو یوں سزا دینے کی ضرورت پڑے گی، مگر اسے پتا نہیں تھا وہ آج پھر اس کے آفس آ دھمکنے والی ہے۔ وہ ڈائریکٹر فنانس کے آفس سے سنجیدہ و پیشہ ورانہ نوعیت کا ڈسکشن کر کے باہر نکلا تو اسے لیزا سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سکندر!" اسے سکندر کسی آفس سے نکل کر کوریڈور میں آگے بڑھتا نظر آیا تو اس نے حسب عادت بے تکلفانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ یقیناً سکندر نے اسے دیکھا نہیں تھا ورنہ وہ ہائے ہیلو کرنے ضرور رکتا۔ یہاں کمپنی کے اس آفس کے لیے اس نے جو پینٹنگز بنا کر دی تھیں، انہیں کے حوالے سے آج اس کی کمپنی کے چند سینئر ایگزیکٹیوز کے ساتھ دوبارہ میٹنگ تھی۔

اس کی یہاں گزشتہ میٹنگ خاصی کامیاب رہی تھی۔ کمپنی اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھی۔ آج پینٹنگز کا موضوع طے کرنا تھا، کچھ ممبرز پر ان سب نے گزشتہ میٹنگ میں بات چیت کی تھی، کچھ پروپوزلز وہ آج لائی تھی۔ آج موضوع طے کر لیے جانے کے بعد اس نے اس پروجیکٹ پر کام شروع کر دینا تھا۔ وہ آج یہاں لانے کے لیے کل سارا دن مختلف آئیڈیاز پر کام کرتی رہی تھی، خاص مصروف رہی تھی مگر مصروفیت میں بھی اس نے دن میں دو بار سکندر کو کال کی تھی اور دونوں مرتبہ اس کا نمبر بند ملا تھا۔

ہفتے کے روز وہ اس کے ساتھ خوشگوار موڈ میں رہا تھا۔ انہوں نے بہت باتیں کی تھیں۔ سکندر نے اسے

اپنی تازہ تازہ بنی دوست قرار دیا تھا اور اس کی نئی نئی بنی دوست ٹرک ڈرائیوروں والی اردو زبان بولتی ہے' اس پر اظہار افسوس بھی کیا تھا۔ آخر میں آکر اس کا موڈ تھوڑا اپ سیٹ ہو گیا تھا وہ کچھ ڈسٹرب سا نظر آنے لگا تھا' ورنہ باقی تو وہ سارا وقت بڑے اچھے اور دوستانہ موڈ میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ ایسے میں وہ یہ تو ہرگز نہیں سوچ سکتی تھی کہ سکندر نے اپنا موبائل اس کی وجہ سے آف کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا تو بس یہی کہ شاید وہ آرام کرنا چاہتا ہو گا یا پھر شاید اسے آفس کے کاموں کی کوئی مصروفیت لاحق تھی اور وہ ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتا ہو گا۔ اس لیے سیل آف کر دیا ہو گا مگر اس کے یہ تمام اندازے اور تمام خیالات اس وقت سکندر کے سرد اور سپاٹ سے چہرے کو دیکھ کر غلط ثابت ہو گئے تھے۔

وہ اس کے آواز دینے پر رکا تھا۔ نگاہوں میں اجنبیت نہیں تھی مگر ایک سرد سا تاثر موجود تھا۔ جیسے وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"چاؤ سینور سکندر!" اس نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔

"چاؤ۔" بغیر مسکرائے' سنجیدہ اور سپاٹ سے انداز میں اسے کہتا وہ وہاں بالکل بھی نہیں رکا تھا۔ وہ جواباً کیا کہنے کے لیے لب کھول رہی ہے' یہ سننے کی زحمت کیے بغیر وہ وہاں سے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے کوریڈور میں کھڑے کھڑے ہی نظر آ رہا تھا وہ کوریڈور کے آخر تک جا کر دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ اب وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے اپنے آپ میں بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے' کیسے آئی ہے' رسمی سی خیر و عافیت' کچھ بھی پوچھے بغیر وہ اس طرح اسے نظر انداز کرتا ہوا چلا گیا تھا' جیسے اس سے ہائے ہیلو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے کوفت سی بھی ہو رہی تھی اور سکندر کی سرد مہری اور خاموش بدتمیزی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

"آپ زبان سے بدتمیزی کا مظاہرہ نہ کریں' بس اپنا رویہ بدتمیز بنا لیں' وہ ایسا ہی کیا کرتا تھا ناں؟ ایسا ہی ابھی بھی کر کے گیا تھا ناں؟ سکندر پر جھنجلاہٹ اور کوفت محسوس کرتی وہ میٹنگ کے لیے چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دو گھنٹے کی طویل میٹنگ جس میں ہر چیز حتمی طور پر طے کر لی گئی تھی کے اختتام پر وہ کمپنی دو ایگزیکٹیوز کے ساتھ ہی کانفرنس روم سے باہر نکلی تھی۔ ان دونوں سے خوشگوار انداز میں رسمی نوعیت کے الوداعی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئی تھی شام کے پانچ بج رہے تھے اور یہ آفس ٹائم ختم ہو جانے کا وقت تھا۔ اسے آتے جاتے مختلف لوگ جلدی جلدی کام سمیٹ کر گھر جانے کی فکر کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ لفٹ کے پاس آکر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے لفٹ کا بٹن دبا دیا تھا۔

لفٹ آ گئی اور وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تب اس کے پیچھے کوئی اور بھی لفٹ میں داخل ہوا تھا۔ سیدھے ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دیکھا وہ سکندر تھا۔ اس کا بلیک لیدر بریف کیس اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور لیپ ٹاپ بیگ بائیں کندھے پر لٹکا تھا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس بار سکندر نے بھی اسے ابھی ہی دیکھا تھا۔ لفٹ میں داخل ہو جانے کے بعد کم از کم اتنا وہ بتا سکتی تھی کہ اس نے اسے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ سکندر کا دو گھنٹے قبل کا رویہ اسے یاد تھا' اس لیے وہ مسکرائی تو نہیں بس اخلاقاً' سنجیدگی سے پوچھ لیا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بظاہر بالکل صحت مند اور نارمل لگ رہا تھا' مگر بھی پتا نہیں کیوں اس بار لفٹ میں اس کے پاس کھڑے ہو کر جب اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا وہاں بہت سا درد' تکلیف اور ویرانی سی نظر آئی۔

"ٹھیک ہے۔" سکندر کا جواب مختصر اور سنجیدہ تھا۔
اس کی آنکھوں کی ویرانی، خاموشی اور درد نے اس کے غصے کو پل بھر میں کہیں دور لے جا پھینکا۔ نجانے کیا دکھ لاحق تھا اسے، جو وہ یوں اتنا عجیب، اتنا مختلف سا مزاج رکھتا تھا۔ وہ سکندر پر اپنا غصہ قائم نہیں رکھ پائی تھی۔

وہ آرٹسٹ تھی اس لیے حساس زیادہ تھی، شاید اسی لیے وہ اس شخص کے لفظ اور رویے نہیں اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کے لفظوں اور رویوں میں سرد مہری، بے گانگی، اجنبیت اور بے مروتی ہوتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں؟ درد ہی درد، غم ہی غم، اتنی اداسی اور اتنی ویرانی اس نے کبھی کسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی۔

لفٹ گراؤنڈ فلور پر آگئی تھی۔ وہ سکندر کو دیکھ رہی تھی اور وہ لفٹ کے فرش کو اس سے لاتعلق، بے نیاز، بے پروا۔ وہ دونوں لفٹ سے باہر آگئے تھے۔

"میں تمہیں ڈراپ کردوں سکندر؟"

"ہاں؟" اس نے ایک دم چونک کر یوں اسے دیکھا، جیسے یہاں پر موجود ہی نہیں تھا۔ وہ بہت الجھا اور بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں تمہیں تمہارے ہوٹل ڈراپ کردوں۔ یہ پوچھ رہی تھی میں؟" اس نے ہلکی دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سوال دہرایا۔ سکندر نے اسے بغور دیکھا تھا، یوں جیسے وہ کچھ سوچنے لگا ہے۔ یک دم ہی وہ اس سے بولا۔

"تمہیں اس وقت کوئی اور کام تو نہیں ہے لیزا؟"

"نہیں، کیوں؟" وہ اتنا غیر متعلقہ سا سوال سن کر حیران ہوئی تھی۔

"تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کردو جہاں سبزہ ہو، تازہ ہوا ہو۔ میں کچھ دیر کھلی آب و ہوا اور ہریالی کے بیچ رہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے بولتے ہوئے کھینچ کر یوں سانس لیا جیسے اس کی سانس گھٹ رہی ہو کہ سانس لینے میں دقت کا سامنا ہو۔

"ٹھیک ہے، چلو۔" وہ جواباً" مسکرا کر بولی۔ اب وہ یہ بات یقین سے کہہ سکتی تھی کہ سکندر کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں تھی۔ شاید اسے پھر Cervicalpain ہو رہا تھا۔ نیپلز جاتے ہوئے بھی اس نے سکندر کی یہی کیفیت دیکھی تھی۔ وہ دونوں باہر آگئے تھے۔ سکندر اس کے برابر والی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔ ایک، دو سیکنڈ خاموشی سے ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے سکندر کو دیکھا۔ "تمہیں cervicalpain ہو رہا ہے؟" سکندر نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ ایک پل اسے بغور دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر ہاں میں ہلا دیا۔

"تم کسی اچھے ڈاکٹر سے کنسلٹ کرو ناں۔ اتنی ینگ ایج میں اس طرح کی تکلیف اور وہ بھی اتنی جلدی جلدی تو نہیں ہونی چاہیے۔" وہ دوستانہ انداز اور پرخلوص لہجے میں بولی تھی۔

"تم مجھے کہاں ڈراپ کروگی؟" اپنی صحت سے متعلق اس کے جملے پر محض ہلکا سا سر ہلا کر سکندر نے فوراً" ہی موضوع تبدیل کردیا گویا اور بہت ساری باتوں کے ساتھ وہ اپنی صحت کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "ہم Villa borghese جارہے ہیں بورگ ہیز گارڈنز کا تم نے نام تو ضرور سن رکھا ہوگا؟"

"ہم؟" اس نے سکندر کو حیرانی سے اپنی سمت دیکھتا پایا۔

"جی ہم۔ تمہیں وہاں چھوڑ کر آجاؤں، تم اکیلے اکیلے وہاں انجوائے کرو اور میں اپنے اپارٹمنٹ جاکر بند ہوجاؤں۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں۔ تم سے سن کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے کھلی کھلی سرسبز سی جگہ پر وقت گزارنے کا۔"

وہ جواباً" مسکرا کر بولی تھی۔ اس بار اس نے سکندر کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آتی دیکھی۔

"لیجیے جناب پہنچ گئے ہم Piazza del Popolo۔ یہیں سے مین انٹرنس ہے ولا بورگیز کے اندر جانے کے لیے۔"

چند منٹوں کے بعد گاڑی ایک دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے لیزا نے سکندر سے کہا۔

"Villa borghese gardens میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ مگر اندر جانے کے بعد — میں وہاں موجود میوزیمز یا آرٹ گیلریز وزٹ کرتی ہوں تو اس کے لیے ٹکٹ خریدنا لازمی تھا۔" آرٹ گیلریز اور میوزیمز میں جانے کے خواہش مند افراد وہاں طویل قطاریں لگائے نظر آرہے تھے۔ چونکہ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا' چنانچہ گارڈنز میں سبزے اور ہریالی کو انجوائے کرنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بھی کثیر تھی۔

"مجھے پتا ہوتا آج میں تمہارے ساتھ آنے والی ہوں تو آرٹ گیلریز میں جانے کے لیے آن لائن ٹکٹ خرید لیتی۔ اب اس وقت اتنی لمبی قطار میں لگنے کا تو کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔" قدیم رومن آرکیٹکچر والے داخلی راستے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سکندر سے بولی تھی۔

"تمہیں آرٹ میں دلچسپی نہیں ورنہ تم یہاں موجود خوب صورت اور بے مثال آرٹ کلیکشن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے۔

یہاں Rafaello Raphael Bernini اُن سب کا بڑا نادر کام موجود ہے۔ آرٹ کے شائقین کے لیے تو نا ممکن ہے کہ وہ روم آئیں اور یہاں وزٹ کیے بغیر چلے جائیں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بول رہی تھی۔

"تم تو ابھی بہت سارے دنوں تک روم میں موجود ہو۔ پھر کسی دن ٹکٹ خرید کر یہاں آجانا اور یہاں موجود تمام آرٹ گیلریز اور میوزیمز کی سیر کر لینا۔"

سکندر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ لیزا نے بغور اسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر تناؤ والی کیفیت نہیں تھی۔ سرد و سپاٹ تاثر کی جگہ چہرے پر دوستانہ سی مدھم مسکراہٹ نے لے لی تھی جیسے اسے یاد آگیا ہو کہ وہ دونوں کئی دفعہ مل چکے ہیں' بہت باتیں کر چکے ہیں اور بہت سارا وقت ساتھ گزار چکے ہیں۔ شاید یہاں کے سبزے اور ہریالی نے اس کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا تھا یا پھر اسے یہ بھولی ہوئی بات یاد آگئی تھی کہ وہ لیزا سے دوستی کر چکا ہے۔ وجہ جو بھی تھی بہر حال اب وہ قدرے پرسکون اور مسکراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت اور سناٹا بھی کچھ کم نظر آرہا تھا۔

"ہم لیک گارڈن میں چل کر بیٹھیں؟"

اردگرد ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ وہ دونوں اس وقت چیڑ اور صنوبر کے درختوں کے درمیان ایک خوب صورت راستے سے گزر رہے تھے۔

"یہ ایک نہیں دراصل کافی سارے گارڈنز کا مجموعہ ہے۔ ہر گارڈن کی اپنی اپنی الگ خوبی ہے۔ کہیں تمہیں پھلوں کے درخت زیادہ ملیں گے' کہیں مشہور فنکاروں کے بنائے قدیم مجسمے اور فاؤنٹین اور کہیں کسی جنگل کا سا قدرتی تاثر دیتے گارڈن۔ مجھے ذاتی طور پر لیک گارڈن زیادہ پسند ہے۔ وہاں جھیل میں کشتی چلائی جائے یا جھیل کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا جائے' مجھے تو دونوں میں بہت مزا آتا ہے۔" سکندر کے چہرے کی سوالیہ سی حیرانی دیکھ کر اس نے وضاحت کی تھی۔

"جو جگہ تمہیں ٹھیک لگے' وہی مناسب ہے۔ تمہیں تو پتا ہے میں یہاں کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ کبھی بہت پہلے روم کے متعلق کسی سفر نامے میں ضرور یہاں کے بارے میں پڑھا تھا مگر وہ بھی اب کچھ خاص یاد نہیں۔"

وہ اب مسکراتے ہوئے بالکل اسی طرح بات کر رہا تھا جیسے کلوزیم میں اس کے ساتھ کی تھیں۔

"یہاں کے بارے میں میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔" خوب صورت درختوں اور سبزے سے بھرے را[illegible] سے گزرتے وہ دونوں لیک گارڈن تک پہنچ گئے [illegible] اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ اردگرد نگاہیں [illegible] اس جگہ کو تعریفی نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔

"ہے ناں یہ جگہ خوب صورت؟" اس نے [illegible] انداز میں یوں پوچھا گویا اس گارڈن کی تخلیق کر[illegible]

سولہویں یا سترہویں صدی کی آرکیٹیکٹ وہ خود ہی تھی۔ سکندر نے اس کی طرف فوراً" دیکھا تھا اور بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"تم جس طرح اپنے روما اور روما کی ہر چیز سے پیار کرتی ہو' مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے لیزا!"

دھوپ چھاؤں کا سا مزاج رکھتا وہ شخص اب یوں مسکرا رہا تھا' یوں دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا گویا آج اس کے آفس میں لیزا سے سرد مہری سے پیش آنے والا شخص کوئی اور تھا۔

"یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔" جھیل سے نزدیک گھاس پر درختوں کی چھاؤں میں ایک جگہ سکندر کو بیٹھنے کے لیے اچھی لگی تھی۔ وہ سر ہلاتی اس کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی تھی۔ سکندر کی نظریں پانی کی طرف تھیں جبکہ وہ ان کئی کئی سو سال قدیم درختوں میں سے ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سکندر کی نگاہوں کے تعاقب میں جھیل کی طرف دیکھا تھا۔ بہت سے سیاح پانی میں چپوؤں والی کشتی چلاتے نظر آرہے تھے۔ جھیل ہر طرف سے سبزے میں گھری تھی۔ اس کے ہر کنارے پر درختوں کے جھنڈ تھے' بیلیں تھیں' پھلوں اور پھولوں سے لدی درختوں کے شاخیں تھیں۔

"پانی پر سبزے اور پھولوں کا جو یہ شیڈ پڑ رہا ہے کتنا خوب صورت لگ رہا ہے ناں سکندر؟ ادھر دیکھو تو پانی سبز نظر آرہا ہے' وہاں دیکھو تو سرخ' ادھر گلابی اور وہاں نیلا' ایک ہی جھیل بیک وقت کتنے سارے رنگوں سے سجی ہے۔"

وہ مسکرا کر سکندر سے کہہ رہی تھی۔ سکندر نے جواباً" اس کی طرف دیکھا ضرور مگر بولا کچھ نہیں۔ اسے اس کی خاموشی بڑی عجیب سی لگی۔

"تمہیں رنگ اچھے نہیں لگتے سکندر؟"

"پتا نہیں' مجھے رنگوں کو محسوس کرنا نہیں آتا۔" وہ بے خیالی میں بول گیا مگر جیسے ہی اسے بے خیالی میں منہ سے نکلی بات کا دھیان آیا فوراً" بات بدل کر اس سے پوچھنے لگا۔

"تم تو یہاں پہلے بھی بہت دفعہ آئی ہوگی؟"

"ہاں۔" سکندر کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ان کے بالکل سامنے درختوں کے پاس سیاحوں کا ایک گروپ آکر کھڑا ہوا تھا۔ اس میں دو افراد اٹالین لگ رہے تھے جبکہ باقی تمام افراد امریکن تھے۔ شاید وہ امریکن ان اٹالینز کے مہمان تھے یہاں۔ وہ سب جیسے کسی موضوع پر زور و شور سے گفتگو اور بحث مباحثہ کرتے ہوئے آرہے تھے۔ گروپ میں شامل ایک امریکن جوڑے نے وہاں تصویر کھنچوانی تھی۔ وہ لوگ اس لیے وہاں رکے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی یہ چاہتے تھے کہ تصویر میں ان کے عقب میں جھیل اس طرح آنی چاہیے کہ جھیل کے بیچوں بیچ بنا ٹیمپل بھی نظر آئے۔ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا کرتا تھا۔ جتنی دیر وہ میاں بیوی وہاں تصویر کھنچوا رہے تھے باقی افراد وہیں کھڑے باہم گفتگو کر رہے تھے۔

امریکن مہمانوں کی خاطر ان کے اٹالین میزبان بھی انگریزی ہی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی گفتگو کے چند جملوں ہی سے سمجھ میں آگیا تھا کہ کیا موضوع ڈسکس کیا جا رہا ہے۔ کل رات یہاں ولا بورگیز کے باہر والی سڑک پر ایک سترہ سالہ لڑکی کا ریپ ہوا تھا۔ غالباً" آدھی رات سے بھی اوپر کا ٹائم تھا۔ آج سارا دن یہ خبر تمام نیوز چینلز پر چلتی رہی تھی۔

"نیوز چینلز کے پاس جب اور کچھ خبر نہیں بچتی تو وہ اس طرح کی خبریں چلا چلا کر لوگوں کا بی پی ہائی کرواتے ہیں۔" سیاحوں کا وہ گروپ تصویر کھنچنے کے بعد وہاں سے ہنوز اسی موضوع پر باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا تب وہ سکندر سے بولی تھی۔ سکندر بھی ان لوگوں کی گفتگو سنتا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے مجھے بھی ہمدردی ہے اس لڑکی سے' اس کے ساتھ جو ہوا بہت برا ہوا ہے' مگر میں یہ پوچھتی ہوں رات کے دو ڈھائی بجے وہ اکیلی سڑکوں پہ کیا کرنے نکلی ہوئی تھی؟ ایک تنہا خوب صورت لڑکی آدھی رات کو سڑک پر کسی بد فطرت و بد کردار کو ٹکرے تو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ ماں' باپ سے لڑائی

ہوئی تھی یا بوائے فرینڈ سے جھگڑا، تب بھی اس طرح آدھی رات کو سڑکوں پر پھرنے کی تک کیا تھی؟"

اپنی دھن میں مگن بولتے ہوئے اسے سکندر کے تاثرات کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر اس کا دھیان گیا تو وہ حیران پریشان سی رہ گئی۔ سکندر کے چہرے پر عجیب سا جنون اور وحشت پھیلی تھی۔ وہ انتہائی سخت نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا فوراً" ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سکندر؟ کیا ہوا؟" وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی وہ بالکل ہکا بکا سی اس کے ساتھ ہی فوراً" کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا سکندر؟" اس نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

"کسی کے بارے میں کچھ بھی بول دینا، جو مرضی تبصرہ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے لیزا محمود! کیا جانتی ہو تم اس لڑکی کے بارے میں؟ بتاؤ مجھے؟"

وہ شدید غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اور انتہائی غیظ و غضب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیزا نے اس کی سرد مہری، اجنبیت، بے گانگی سب کچھ دیکھ رکھا تھا مگر یہ انداز اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"نیوز چینلز کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی اندازے لگا لینا، اس لڑکی پر تبصرے کر لینا، تنقید کر لینا، مذاق اڑا لینا بہت آسان ہے۔ کیا تم نے سوچا اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہوگا جو وہ آدھی رات کو سڑکوں پر تھی؟ کیا گزری تھی اس پر جو وہ اپنے گھر سے نکل پڑی۔۔۔؟ لیزا محمود! زندگی برباد ہو گئی ہے اس لڑکی کی۔ کل رات جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ اب زندگی بھر اس خوف، بے بسی اور ذلت سے باہر نہیں نکل سکے گی۔"

سکندر کے لفظوں میں تختی تھی، بے پناہ غصہ اور نفرت تھی۔ وہ فوراً" ہی وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گیا۔ ایک پل تو وہ بالکل حیران پریشان، ساکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی، مگر جیسے ہی اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے، وہ فوراً" اس کے پیچھے بھاگی۔

"سکندر! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم اس طرح ناراض کیوں ہو گئے ہو؟ پلیز رکو تو سہی۔"

اس نے اسے پیچھے سے ہی چلا کر آواز دی تھی، کیونکہ وہ جس تیز رفتاری سے جا رہا تھا، وہ اس کا ساتھ دینے میں ناکام تھی۔ سکندر نے نہ مڑ کر اسے دیکھا، نہ کوئی جواب دیا، نہ ہی رکا۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار کچھ اور بھی تیز کر لی تھی۔

اس نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ ارد گرد سے گزرتے لوگ اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

"سکندر پلیز رک جاؤ۔" تھک کر مایوس سی ہوتی وہ اپنی جگہ رک گئی تھی۔ بے ہنگم انداز میں بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔

وہ وہیں کھڑے ہو کر سانس بحال کرتے ہوئے سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب اسے ولا بورگیز سے باہر جاتا نظر آ رہا تھا۔

وہ چیڑ کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ یونہی بے مقصد "گفتگو برائے گفتگو" کے طور پر منہ سے نکلے اس کے وہ چند جملے سکندر کو اس قدر ناگوار گزر جائیں گے، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بار بار ذہن میں اپنے کہے جملوں کو دہرا رہی تھی۔ اسے ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس پر یوں غصے سے بے قابو ہو جایا جائے۔

ایک واقعہ پر اس نے اپنی رائے دی تھی۔ وہ بھی جواباً" اس سے اختلاف کرتا، اپنی رائے دے سکتا تھا۔ وہ حیران تھی، وہ بے حد پریشان تھی۔ اسے سکندر پر غصہ نہیں آ رہا تھا، اسے تعجب ہو رہا تھا۔ حیرت ہو رہی تھی، حیرت میں گھری وہ سکندر کو سمجھنے سے قاصر بھی تھی اور بہت دکھی بھی تھی۔

آج اسے بھرپور دن ہو رہا تھا، وہ کچھ وقت کسی کھلی کھلی سرسبز سی جگہ پر گزارنا چاہتا تھا اور اس کی اس بے موقع بات نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا وہ سکندر کو ولا بورگیز چھوڑ کر خود یا ہر سے ہی واپس چلی جاتی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھلی ہوا میں سانس تو لے لیتا، وہ سبزہ، ہریالی، جھیل کا پانی، آبی پرندے یہ سب کچھ اس کی طبیعت کی اداسی اور پژمردگی کو دور نہ بھی کرتے، کم تو کر دیتے۔

اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا، وہ سکندر کے لیے فکر مند ہو رہی تھی، وہ اس کے لیے اداس بھی ہو گئی تھی۔
نجانے کیا غم، کیا دکھ اسے لاحق تھا، اس کے ساتھ نے اس دکھ کو کم نہیں کیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا آج۔
بہت دل گرفتہ سی وہ اپنے اپارٹمنٹ واپس آگئی تھی شکر تھا نینی گھر پر نہیں تھیں۔ وہ آج دوپہر سے اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ اس کا دل اتنا اداس تھا کہ اس وقت اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے نہ لباس تبدیل کیا تھا، نہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کی کوشش کی۔ اندر آ کر خاموشی سے لیونگ روم میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔
اب اسے یہ فکر شروع ہو گئی کہ وہ اپنے ہوٹل پہنچ گیا ہو گا نا؟ وہ ٹھیک تو ہو گا نا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہو گی؟ وہ کیا ابھی بھی غصے میں ہو گا؟ وہ کیا کر رہا ہو گا؟
روم میں ایک اور طویل شام کا اختتام ہوا تھا۔
سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح صوفے پر اداس سی بیٹھی تھی۔ نینی بھی کچھ دیر قبل گھر واپس آ چکی تھیں۔ غالباً مغرب کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ اسے سکندر کی شدید فکر لاحق ہو رہی تھی۔
اس نے اپنا موبائل اٹھا کر سکندر کا نمبر ملایا۔ وہ تلخی سے بات کرے گا، یا اس سے بات ہی نہیں کرے گا، اس کا فون ہی نہیں اٹھائے گا وہ جو کچھ بھی کرے گا مگر وہ اب سکندر سے بات کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔
تیسری بیل پر اس کی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ "ہیلو۔" اس نے سکندر کی آواز سنی۔ اس کے لہجے اور آواز میں غصہ نہیں تھا، ناراضی بھی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔
"تم ٹھیک ہو سکندر؟ اپنے ہوٹل پہنچ گئے تم؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔
"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ سوری میں اس طرح تمہیں وہاں چھوڑ کر آگیا۔"
اس کی معذرت بڑی پر تکلف تھی، جیسے وہ خود کو پھر اپنے اسی خول میں بند کر چکا تھا جو آج کچھ پل کے لیے چیچ کیا تھا۔ اس نے نہ سکندر کی معذرت پر دھیان دیا نہ اس کے پر تکلف انداز پر۔ اسے سکندر کے لہجے اور انداز میں جو غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا اور جسے وہ فوری طور پر کوئی نام نہ دے پائی تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ سمجھ گئی کہ سکندر تکلیف میں ہے۔ اسے کہیں پر شدید تکلیف یا درد ہو رہا ہے، وہ لہجے کو چاہے جتنا بھی نارمل بنا لیتا مگر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہ تکلیف سے نکلنے والی اپنی کراہ کو دباتا، لب بھینچ بھینچ کر بات کر رہا ہے۔
"تمہاری طبیعت کیسی ہے سکندر؟" اس کی معذرت کے جواب میں اس نے بے اختیار فکر مندی سے پوچھا۔
"ٹھیک ہے۔" اس بار اس نے ایک دبی دبی سی کراہ کی آواز سنی تھی۔ اب تو وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ سکندر ٹھیک ہے۔
"تم کہاں ہو سکندر پلیز۔ مجھے بتاؤ؟ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ پلیز سچ بتاؤ تم کہاں پر ہو؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"
اس نے پریشان ہو کر قدرے بلند آواز میں پوچھا تھا وہ اب مزید کوئی جھوٹ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔
"ایزا میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں ہسپتال میں ہوں۔" وہ تنگی سے بولا تھا۔
"او مائی گاڈ۔" وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھی تھی۔
"کس ہسپتال میں ہو تم، مجھے نام بتاؤ۔" اس نے سینٹر ٹیبل سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔
"تم زحمت مت کرو پلیز، میں ٹھیک....."
"تم مجھے ہسپتال کا نام بتاؤ۔" اس نے غصے سے سکندر کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تیزی سے جوتے پہنتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیز ڈرائیونگ کرتی وہ بہت جلدی ہسپتال پہنچ گئی

تھی۔ استقبالیہ سے معلومات لیتی وہ فوراً" ہی مطلوبہ کمرے تک پہنچی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اسے سکندر بیڈ پر لیٹا نظر آیا۔ اس کا دایاں پیر پٹیوں میں جکڑا تھا۔ ماتھے پر بھی پٹی بندھی تھی اور ہاتھ بھی زخمی نظر آرہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"یہ سب یہ کیسے ہوا سکندر؟" وہ اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا دل دکھا کر نکلا تھا ناں' بلاوجہ تم پر چیختا چلاتا بس قدرت نے اس بدتمیزی کی فوراً" ہی سزا دے دی کہ لیجیے سکندر شہریار! اب اس دیار غیر میں جہاں لیزا محمود کے سوا کوئی آپ کی زبان سمجھنے والا نہیں بستر پر پڑ جائیے۔"

وہ ہنس کر یوں بولا گویا خود اپنا مذاق اڑا رہا ہو' وہ اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ کر فکرمندی اور تشویش سے اسے پٹیوں میں جکڑا دیکھ رہی تھی۔

"خوب تماشا ہو رہا تھا ہسپتال میں ڈاکٹر' نرسیں سب میرے گرد جمع اٹالین میں میری چوٹوں کا احوال پوچھ رہے تھے اور میں انہیں انگریزی میں "میرے کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔" سمجھانے کے جتن کر رہا تھا۔ آخر میں ہم نے اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے کو اپنا مدعا سمجھایا تھا۔"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بہت لطف لینے والی بات بتا رہا ہو۔ جیسے اس کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ کوئی مزا لینے والا واقعہ تھا۔

"اتنی غمگین شکل مت بناؤ لڑکی! میں ٹھیک ہوں۔"

وہ بالکل سنجیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سکندر کے لیے اس کا ایکسیڈنٹ مذاق ہو سکتا تھا اس کے لیے نہیں۔ نہ جانے اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں۔ نہ جانے زبان کے مسئلے کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کو اپنی چوٹوں کے بارے میں ٹھیک سے بتا بھی سکا تھا کہ نہیں۔ وہ یک دم ہی کرسی سے اٹھی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو دوبارہ بلا کر لانا چاہتی تھی' تاکہ ڈاکٹر اس کے سامنے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کرے۔

"کہاں چلیں؟ بیمار کی عیادت پھولوں کے ساتھ کی جاتی ہے تم میرے لیے پھول بھی نہیں لائیں۔ کہیں پھول لینے ہی تو نہیں جا رہی ہو؟"

اس کا وہ تلخ موڈ' اس کا بیزار' اکتایا ہوا انداز جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہو' یک دم ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کی بات کر کے' اپنی چوٹوں کا ذکر کر کے حظ اٹھا رہا تھا' جیسے اسے بڑا مزا آرہا ہو' کیا وہ اپنا ایکسیڈنٹ ہو جانے پر خوش تھا؟

یہ بہت ہی عجیب سا خیال اس کے دل میں ابھرا تھا۔ نہیں' وہ ایک نارمل انسان ہے۔ وہ ایک پریشان ہونے والی' فکر کرنے والی بات پر خوش کیونکر ہو سکتا ہے۔

"ڈاکٹر کو بلانے۔"

"ڈاکٹر کو' مگر کیوں؟" وہ سکندر کی بات کا جواب دینے کے لیے وہاں رکی نہیں اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد ڈاکٹر کے ساتھ وہ دوبارہ وہاں موجود تھی۔ ڈاکٹر اسے مطمئن کرنے کے لیے سکندر کا دوبارہ تفصیلی معائنہ کر رہا تھا اگرچہ وہ اسے پہلے ہی یہ بتا چکا تھا کہ اس کے دوست کو فوری' بروقت اور بہترین ٹرٹمنٹ دیا جا چکا ہے۔ سکندر کی چوٹوں کے بارے میں ڈاکٹر سے اس کی تفصیلی بات کوریڈور میں ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ چوٹ سکندر کے پیر میں لگی تھی باقی چوٹیں فکر کرنے والی نہیں تھیں مگر پیر کی چوٹ کے لیے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو جانے کے بعد بھی اگلے ایک سے دو ہفتے بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ ڈاکٹر سکندر کا دوبارہ معائنہ کر رہا تھا اور وہ اس سے اردو میں پوچھتی جا رہی تھی۔

"تمہارے اور تو کہیں کوئی چوٹ نہیں لگی ناں؟"

"تمہیں کسی اور جگہ تو درد نہیں ہو رہا ناں؟" وہ اسی طرح مسکراتا ہوا مطمئن سا لیٹا تھا۔ ڈاکٹر معائنہ کر لینے کے بعد اسے اطمینان دلاتا وہاں سے جانے لگا' تب اس نے سکندر کی دواؤں اور احتیاط کے متعلق چند

اور سوالات کیے۔

ڈاکٹر اس کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

"ہو گئی تسلی؟ صحیح کہہ رہا تھا ناں کہ میں ٹھیک ہوں۔"

"تمہارے پیر میں کافی سیریس چوٹ لگی ہے سکندر! یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ کافی وقت لگے گا تمہاری چوٹ ٹھیک ہونے میں۔ وہ بھی اگر تم احتیاط رکھو گے' ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرو گے تب۔"

وہ اس کے پاس واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جواباً "لاپروائی سے سر ہلا کر مسکرایا تھا۔ اس کا ڈنر لیٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اب اس کے لیے ٹرے میں رات کا کھانا لایا گیا تھا۔

"کھانا کھالو سکندر!"

"ہاں' واقعی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے فوراً" ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

"ابھی زیادہ ہلو جلو نہیں کہیں پھر بلیڈنگ نہ شروع ہو جائے۔ لیٹے رہو۔"

پھر اس نے پلیٹ ہاتھ میں اٹھائی اور چاول بھر کر چمچ اس کے منہ کی طرف بڑھایا تھا۔ سکندر اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا مگر بولا کچھ نہیں۔

"منہ کھولو' کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے قدرے خفگی سے کہا تو اس نے منہ کھولا۔

"فش بھی ہے۔ لو گے؟"

اس نے دوسری پلیٹ میں رکھے مچھلی کے پیس کی طرف اشارہ کیا۔ سکندر نے جواباً "سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ اسے کانٹے سے فش بھی کھلانے لگی تھی۔ وہ خاموش لیٹا نوالے چباتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا تھا سکندر؟" چمچ اس کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں' میں ولا بورگیز سے باہر نکل کر سڑک پر تھوڑا ہی آگے گیا ہوں گا تو ایک تیز رفتار گاڑی نے ٹکر مار دی۔ غلطی شاید کچھ گاڑی والے کی تیز رفتاری کی بھی تھی اور کچھ میری لاپروائی کی بھی۔ اب ٹھیک سے یاد بھی نہیں آ رہا کہ ہوا کیا تھا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال بھی وہ گاڑی والا ہی لایا تھا۔"

"شکر ہے۔ زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ تمہارے پیر کی چوٹ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے گی ان شاء اللہ۔"

وہ بہت سچائی اور اپنائیت سے بولی تھی۔

جواب میں سکندر کی مسکراتی نظریں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے قدرے برا ماننے والے انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"تمہاری اردو انجوائے کر رہا ہوں۔ تمہارے اٹالین لہجے والی اردو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" وہ جواباً "کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"میں اردو بس نینی کے ساتھ بولتی ہوں یا اپنے پاپا اور ان کی وائف کے ساتھ یا پھر کبھی کبھار سیم کے ساتھ اور اب تمہارے ساتھ بول رہی ہوں۔ دیکھو! میرے غلط تلفظ اور لفظوں کی ادائیگی پر ہنسو مت۔ میں کم از کم تمہاری زبان جانتی تو ہوں۔ تم تو میری زبان جانتے بھی نہیں ہو۔"

آج شام سے کیا ہوا تھا' وہ اتنے غصے میں کیوں آ گیا تھا' اس نے جارحانہ رد عمل کیوں ظاہر کیا تھا' وہ خود کو تکلیف اور اذیت میں پڑا دیکھ کر خوش کیوں تھا' شدید خواہش کے باوجود بھی اس نے ان میں سے کوئی بات نہیں پوچھی تھی۔

اسے سکندر سے یہ سوالات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پھر ناراض ہو جائے گا اور وہ نہ تو اس کا موڈ خراب کرنا چاہتی تھی' نہ ہی اسے ناراض کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سوئٹ ڈش بھی کھلا چکی تھی۔

"تھینکس لیزا! تم مجھے دیکھنے آئیں۔ پتا ہے تمہارے آنے سے میرا موڈ اچھا ہو گیا ہے۔"

"یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ سینور سکندر کو میرا آنا اچھا لگا ہے۔" وہ شرارت بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ سکندر نے اس کی مسکراہٹ کا

ساتھ دیا۔

"کافی منگواؤں تمہارے لیے؟"

"نہیں' اب اور کچھ بھی نہیں لوں گا۔ آرام کرنا چاہتا ہوں اب۔ تم بھی میرا خیال ہے اب اپنے گھر جاؤ۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"فی الحال تو میں کہیں نہیں جارہی ہوں۔ سینور سکندر!" وہ اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جاسکتی تھی۔

کیا وہ تکلیف میں مبتلا اپنے دوست کو تنہا چھوڑ کر گھر چلی جاتی؟ اس کی دیکھ بھال کرنے والا یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ملک اور اس کی زبان سے انجان تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر گھر چلی جاتی۔ وہ سکندر سے کچھ کہنے کے لیے لب وا کر رہی تھی کہ اسی وقت اس کے موبائل پر نینی کی کال آنے لگی۔

"ہیلو' جی نینی؟" وہ گھر سے نینی کو دروازے سے بس یہ بتاتی نکلی تھی کہ کہیں باہر جارہی ہے سو اب فکر میں مبتلا ہو کر ان کا فون آنا لازمی تھا۔

"گھر کب آؤ گی لیزا؟"

"نینی! میرا دوست ہے ناں سکندر' اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ میں اس کے پاس ہاسپٹل میں ہوں۔ صبح آؤں گی گھر' آپ سو جائیں۔"

اس نے سکندر کی اپنی جانب اٹھتی نگاہیں دیکھیں جن سے وہ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں نہ رکے لیزا نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نینی کو جواب دیا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا۔

"لیزا! تم گھر جاؤ پلیز۔ میں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ تم میری وجہ سے بے آرام ہو۔" وہ سنجیدگی و بردباری سے بولا۔

"میں آپ کے پاس یہاں رک رہی ہوں سینور سکندر! چاہے آپ کو اچھا لگے چاہے برا۔" وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی تھی۔

"لیزا پلیز۔"

"سکندر پلیز۔" اس نے اسی کے انداز میں دہرایا۔

"گویا تم نہیں مانو گی۔" وہ ہار ماننے والے انداز میں بولا۔

"ہاں میں نہیں مانوں گی۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ' پھر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی مگر اس سے پہلے نہیں۔ مغرور' بدتمیز اور خود پسند سکندر شہریار کو دیکھنے کی عادت ہوگئی ہے مجھے۔ یہ ہسپتال میں زخمی و بیمار پڑا سکندر شہریار مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔"

"مصورہ! اس جملے میں آپ مجھ سے اپنی دوستی ظاہر کرنا چاہ رہی ہیں یا دوستی کی آڑ میں میری برائیاں گنوانا چاہ رہی ہیں میں سمجھ نہیں سکا۔" وہ اسے گھور کر دیکھتا ہوا مصنوعی ناراضی سے بولا تھا اور وہ جواباً کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"تمہارا جو دل چاہے' سمجھ لو۔" نرس سکندر کو دوا دینے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے سکندر کو دی جانے والی دوائیوں کے متعلق نرس سے سوالات کیے تھے۔ ان میں چند پین کلرز تھے اور ایک نیند لانے کے لیے دی جانے والی دوا تھی کیونکہ ڈاکٹر کا اندازہ یہی تھا کہ اگلی چند راتیں اور دن سکندر کے بہت تکلیف میں گزرنے تھے اور وہ پرسکون نیند سو سکے اس لیے اسے ادویہ دی جارہی تھیں۔

نرس دوا دے کر چلی گئی تب اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ بند کردی۔

"سونے کی کوشش کرو سکندر!"

"میں تو سو جاؤں گا مگر تم کیا ساری رات یہاں اسی طرح بیٹھی رہو گی؟"

سکندر نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تھا۔ پیر پٹیوں میں جکڑے ہونے کے سبب وہ کروٹ لینے سے قاصر تھا۔ شاید ایک ہی طرح لیٹے لیٹے اسے الجھن ہونے لگی تھی۔

"مجھے نیند آئے گی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔ تمہیں کروٹ دلواؤں؟" وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے اسے کروٹ لینے میں مدد دی تھی۔

"تھینکس۔" وہ بہت ہلکی آواز میں بولا تھا۔

"اب تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔"

وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

"اوکے مگر پلیز تم بھی صوفے پر لیٹ جاؤ۔"

سکندر نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ اچھا تھا اسے نیند آ گئی تھی۔ ورنہ اس کی رات بڑی تکلیف میں گزرتی۔ سوتے میں وہ کئی بار تکلیف سے کراہا تھا' کئی بار بے چینی سے اس نے پہلو بدلا تھا' اپنے پیر کو ہلانے کی کوشش یوں کی تھی جیسے شدید درد ہو رہا ہو۔ تکلیف سے ہی اسے بخار چڑھ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے کمبل اوڑھا دیا تھا۔

وہ ڈاکٹر کو بلا کر لائی تھی۔ ڈاکٹر کے اطمینان دلانے پر کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں اور یہ کہ بخار کے لیے بھی سکندر کو دوا رات دی جا چکی ہے' وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ یہ ضرور چیک کر رہی تھی کہ بخار تیز تو نہیں ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حلق بالکل سوکھ گیا ہو۔ پیاس کے شدید احساس سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک اجنبی کمرے میں خود کو موجود پا کر حیران سا ہوا مگر اگلے ہی پل پیر سے اٹھتی درد کی ٹیسوں نے اسے یاد دلا دیا کہ وہ کہاں پر ہے۔ اس نے پہلے سر سے پاؤں تک خود کو دیکھا۔ وہ جس کروٹ سویا تھا' اس سے اٹھا نہیں تھا' وہ کچھ بھی اوڑھے بغیر سویا تھا' مگر کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ کمرے میں ہنوز اندھیرا تھا مگر کھڑکی سے باہر نظر ڈالنے پر اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک نیا دن طلوع ہوا ہی چاہتا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے ہر طرف نظریں گھما رہا تھا۔ اس نے لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح رات کو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اس نے ساری رات اس طرح تکلیف میں گزاری ہے' اسے شرمندگی کا احساس ہوا۔

اس ساری زندگی کبھی کسی کا کوئی احسان نہیں لیا تھا اور اس وقت اس نے اپنے اندر شدید قسم کی بے چینی محسوس کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر اس کا دھیان رکھتی رہی ہے۔ اسے کروٹ بدلواتی رہی ہے' اسے سردی تو نہیں لگ رہی' وہ بے آرام تو نہیں' اس سب کا خیال رکھتی رہی ہے۔ ایسا کوئی دوستانہ اور غیر معمولی سلوک اس نے لیزا کے ساتھ کبھی روا نہ رکھا تھا کہ بدلے میں اس کے خلوص اور اپنائیت کی توقع رکھتا مگر وہ تو ایسی ہی دوستانہ مزاج اور دوسروں کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ یہی بتایا تھا ناں روبرٹو نے اسے لیزا کے بارے میں۔۔۔ مگر وہ اپنا خلوص' اپنی اچھائی بہت ہی غلط جگہ بہت ہی غلط شخص پر ضائع کر رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے نفرت سے سوچا۔

اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ لیزا اتنی چوکس نیند سو رہی تھی کہ معمولی سی آواز سے بیدار ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا' کچھ چاہیے سکندر؟"

"پانی۔" وہ آہستگی سے بولا۔

لیزا جلدی سے اٹھی' اس نے گلاس میں پانی ڈالا پھر اپنے ہاتھ سے ہی اسے لیٹے لیٹے پانی پلانے لگی۔ وہ اتنا پیاسا تھا کہ پورا گلاس دو گھونٹ میں پی گیا تھا۔

"اور لاؤں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

گلاس واپس رکھ کر وہ پھر اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"شکر ہے ٹمپریچر کم ہو گیا۔" وہ اس کے پاس سے ہٹی تھی۔

"تمہیں ٹھیک سے نیند آئی ناں سکندر؟" وہ سوال پوچھتی ہوئی کھڑکی کے پاس جا رہی تھی۔

"نیند؟" اس نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ اتنی بے خبری والی گہری نیند سو گیا؟ اس نے سوتے میں وہ خواب کیوں نہیں دیکھے' وہ روتا اور چیختا ہوا بیدار کیوں نہیں

ہوا! لیزا کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا رہی تھی۔

"کھڑکی کھول دوں؟ صبح ہو رہی ہے۔ تازہ ہوا کمرے میں آئے گی تو تم اچھا محسوس کرو گے؟"

وہ کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی۔ اس کی سوچوں سے انجان وہ گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

لیزا نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ صبح کی تازہ ہوا کمرے کے اندر آنے لگی تھی۔ سیاہر ایک نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆
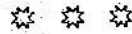
اس کے لیے ناشتا آگیا تھا۔ اس بار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے مدد نہیں مانگی تھی۔ وہ خود اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔

"آرام سے" آہستہ آہستہ سکندر! تمہارے زخم ابھی بالکل تازہ ہیں۔"

اس نے سکندر کے شانوں کے گرد اپنے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ وہ بیٹھا تو لیزا نے اس کی کمر کے پیچھے تکیے لگا دیے تھے۔ اس نے اس کے لیے سلائس پر مکھن لگایا تھا۔

"تم بھی ناشتہ کرو۔" اس کے ہاتھ سے سلائس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ ناشتہ پیشنٹ کے لیے ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"پیشنٹ چاہتا ہے اس کی تیمار دار بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرے اور ویسے بھی پیشنٹ اتنا خوش خوراک نہیں کہ یہ سب کھا جائے۔" وہ اسی کے انداز میں جواباً" مسکرا کر بولا تھا۔ لیزا نے اس کے ساتھ ناشتا شروع کر دیا تھا۔

"تم رات بھر سوئی نہیں ہو ناں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ بالکل روکھا پنیر کھانے لگی۔

"تمہارے سامنے سو تو رہی تھی سینور سکندر! تم آملیٹ تو لو۔" وہ جیسے اپنی اچھائی کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"لیزا! میں تم سے اپنے کل کے رویے کی معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے دس کام چھوڑ کر مجھے ولا بورگیز گھمانے لے کر گئی تھیں۔ مجھے تمہارے ساتھ اس طرح بدتمیزی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ ناشتہ روک کر یکدم ہی اس سے سنجیدگی سے بولا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا' اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر کی کڑواہٹیں دوسروں پر نکالتا پھرے اور دوسرے بھی کون ۔۔۔؟ یہ لیزا محمود! جو خلوص اور محبت سے لبالب بھری ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔

اپنے رویے کی بدصورتی پر وہ لیزا سے حقیقتاً" شرمندہ تھا۔ لیزا نے بھی ناشتہ روک دیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے سکندر! میں نے تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مانا۔ میں بس یہ نہیں سمجھ سکی کہ تمہیں اچانک ہو کیا گیا تھا۔"

"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا لیزا! پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔" وہ جواباً" بہت آہستگی اور نرمی سے بولا تھا۔

وہ اب کبھی بھی اس سے تلخ لہجے میں کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا احسان مند ہو گیا تھا اس لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ لیزا محمود کے اندر کی اچھائیاں اور محبتیں ختم کرنے کا باعث کم از کم وہ ہرگز نہیں بنے۔ جلد یا بدیر زندگی لیزا محمود کو یہ سمجھا دے گی کہ نہ تو یہ دنیا اتنی اچھی جگہ ہے نہ ہی یہاں بسنے والے لوگ۔ مگر اسے دنیا اور لوگوں سے مایوس کروانے والوں میں وہ کیوں شامل ہو۔ اگر وہ محبتیں بانٹتی ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ وہ لڑکی سدا محبتیں ہی تقسیم کرتی رہے۔ زندگی کا بدصورت چہرہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے۔

لیزا اثبات میں سر ہلا کر مسکرائی تھی۔

"تم نہیں بتانا چاہتے، ٹھیک ہے۔ میں نے بالکل برا نہیں مانا۔ اب تم لیٹ جاؤ، کافی دیر سے بیٹھے ہوئے ہو۔"

وہ اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تو وہ فوراً بولا۔

"میں خود لیٹ جاؤں گا لیزا! تم بیٹھو۔"

لیزا نے اس کے انکار کی پروا کیے بغیر اسے لیٹنے میں مدد دی۔ اس کے پیر میں شدید تکلیف تھی۔ اٹھ کر بیٹھنے اور پھر واپس لیٹنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ پیر کی تکلیف کے آگے بازوؤں اور سر پر لگی چوٹیں انتہائی معمولی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان تکالیف کی طرف دھیان ہی نہیں جا رہا تھا۔ پیر میں جتنی شدید درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے اندر سکون اور اطمینان اترتا محسوس کر رہا تھا۔ خود کو تکلیف میں مبتلا دیکھ کر اسے ایک ان جانی سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

کل ایکسیڈنٹ کے بعد جب وہ سڑک پر زخمی پڑا تھا، اس کے پیر، بازوؤں اور سر سے خون بہہ رہا تھا، تب بجائے پریشان ہونے کے، تکلیف اور درد محسوس کرنے کے، وہ خوش ہو رہا تھا۔ اپنا خون بہتا دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ ہاں، وہ خون اتنا ہی ارزاں تھا، اسے یوں ہی بہہ جانا چاہیے تھا، اس کا وجود اتنا ہی بے مصرف تھا، اسے اسی طرح کسی اجنبی سرزمین پر غیروں اور اجنبیوں کے بیچ دنیا سے ناتا توڑ جانا چاہیے تھا۔

شعوری طور پر وہ یہ کبھی بھی قبول نہ کرتا کہ یہ ایکسیڈنٹ درحقیقت ہوا کس کی وجہ سے تھا مگر لاشعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ غلطی گاڑی والے کی نہیں اس کی تھی۔ خود کو انجان اور بے پروا ظاہر کرتا، وہ اس تیز رفتار گاڑی کو آتا دیکھ کر بھی اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہیں دائیں بائیں یا پیچھے نہ ہوا تھا۔ وہ گاڑی اسے ٹکر مارتی ہوئی دو قدم آگے جا کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے فوراً بریک لگائے تھے مگر رکتے رکتے بھی گاڑی اسے ٹکر مار ہی چکی تھی۔

وہ سڑک پر اوندھے منہ پڑا سرشاری سے مسکرایا تھا۔ وہ نہ مدد کے لیے چلایا تھا، نہ درد اور تکلیف سے کسی کو پکارا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈرائیور سے یہ درخواست بھی نہیں کی تھی کہ وہ اسے ہسپتال لے جائے۔ وہ سڑک پر سکون سے پڑا تھا۔ اگر گاڑی کا ڈرائیور اسے اٹھا کر ہسپتال نہ لاتا تو وہ اسی طرح سڑک پر پڑا رہتا تاوقتیکہ کوئی اور اس کی مدد کو نہ آتا، جو کہ وہ چاہتا تھا کبھی بھی نہ آئے۔

بظاہر تو سکندر شہریار ذہنی طور پر ایک نارمل اور صحت مند شخص تھا۔ باشعور، فہم و فراست رکھنے والا مرد۔ وہ خودکشی کی کوشش کیونکر کر سکتا تھا؟ خود اپنے آپ سے بھی وہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ اس کی بے دھیانی اور کار کے ڈرائیور کی تیز رفتاری کے سبب ہوا ہے۔

اس کے اندر خود سے نفرت میں مبتلا شخص اس کے جھوٹ پر ہنس رہا تھا۔

ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لیے آیا، ساتھ میل نرس بھی تھا۔ ڈاکٹر اسے سکندر کے بازوؤں اور سر کی بینڈیج تبدیل کرنے سے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ وہ سکندر کے زخمی پیر کو مختلف انداز میں ہلا جلا کر دیکھ رہا تھا۔ پیر کی پٹیاں فی الحال نہیں کھولی جانی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا ڈاکٹر کے پاس کھڑی اٹالین میں جلدی جلدی بولتی اس کی چوٹوں ہی کے متعلق ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ غالباً اس کی رات کی بے سکونی اور تکلیف ڈاکٹر کو بتا رہی تھی۔

ڈاکٹر اور میل نرس وہاں سے چلے گئے۔ تب اس نے لیزا سے اپنا موبائل اٹھا کر دینے کو کہا۔ آفس ٹائم شروع ہو چکا تھا، اسے آفس فون کر کے بتانا تھا کہ وہ آج نہیں آ سکتا۔ اسے دوبارہ اپنے ہیڈ آفس بھی فون کر کے اپنے ایکسیڈنٹ کی اطلاع دینی تھی۔

وہ ہسپتال میں بیٹھ کر آفس کا کچھ ضروری کام کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے اسے آفس سے کچھ معلومات اور چند فائلز درکار تھیں۔ اسے یہ تمام چیزیں ای میل کر دی جائیں اس کو آفس فون کر کے یہ بھی کرنا تھا۔

سب سوچتے کے ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ کل ولا بورگیز جاتے وقت اس کے ساتھ اس کا لیپ ٹاپ بیگ اور بریف کیس بھی تھا۔ اس کے یہاں تمام ضروری کاموں کی تفصیلات لیپ ٹاپ میں موجود تھیں۔ اسے اپنا لیپ ٹاپ درکار تھا۔

"لیزا! تمہاری گاڑی میں میرا لیپ ٹاپ بیگ ہوگا پلیز وہ مجھے لادو اور پلیز اب تم گھر جاکر آرام کرو۔ ساری رات بے آرام رہی ہو' گھر جاکر ریسٹ کرو۔" وہ نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"تم خیریت سے ہو سکندر شہریار؟ کوئی ضرورت نہیں ہے آج آفس کا کوئی بھی کام کرنے کی۔ دو تین دن کام نہ کرنے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ لیپ ٹاپ پر کام کرنے کے لیے بیٹھو گے' باربار جسم کو ہلاؤ جلاؤ گے' ہاتھوں اور پیروں پر دباؤ پڑے گا۔ سکون سے لیٹو۔ جو ڈاکٹر نے کہا ہے' وہ کرو۔"

لیزا نے باقاعدہ اسے ڈپٹا تھا۔

"بہت ضروری کام ہیں لیزا!" وہ بے بسی سے بولا تھا مشکل یہ تھی کہ فی الحال وہ خود اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا ورنہ خود جاکر لیزا کی گاڑی سے اپنا لیپ ٹاپ لے آتا۔

"ہوں گے ضروری' مگر وہ ضروری کام سکندر شہریار کی صحت اور اس کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔"

وہ بہت محبت اور اپنائیت سے بولی تھی' بہت پروا کرنے والا انداز تھا مگر' پھر بھی پتا نہیں کیوں دل میں کہیں بہت زور سے جاکر چبھی تھی اس کی بات۔

"سکندر شہریار کی زندگی۔" تلخی سے بولتا وہ یکدم ہی چپ ہو گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سکندر شہریار کی زندگی سے زیادہ بے مول اور بے وقعت اس دنیا میں کسی کی بھی زندگی نہیں' سات سمندر دور' اس سے بہت دور بسنے والی صرف ایک ہستی ہے' جو اس کی موت پر روئے گی' باقی دنیا میں کسی کو بھی اس کی زندگی یا اس کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس ہستی کے ساتھ شاید لیزا محمود بھی چند آنسو اس کے لیے بہالے کہ یہ لڑکی سرتاپا محبت ہے۔ یہ صرف سکندر شہریار کی نہیں بلکہ ہر کسی ہی کی تکلیف پر رو پڑتی ہوگی۔ لیزا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا' کیا کہتے کہتے رک گئے تم؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سنجیدگی سے مختصراً" بولا تھا۔

"کاموں کے لیے پریشان مت ہو۔ تمہاری چوٹیں ٹھیک ہوجائیں' کام بھی سارے ہو جائیں گے۔" وہ اس کی طرف جھک کر دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

"میل نرس آتا ہوگا' تم اپنی بینڈیج تبدیل کرواؤ۔ میں گھر جارہی ہوں' تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔"

اس نے خاموشی سے محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے آفس فون کردیا تھا۔ روبرٹو کل رات ہی اپنی فیملی کے ساتھ گھوم پھر کر واپس آیا تھا' اس نے آج سے ہی آفس جوائن کرلیا تھا۔ سکندر کی اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ اس کے ایکسیڈنٹ کا سن کر فکر مند ہوا تھا۔ تفصیلات پوچھ رہا تھا مگر وہ اپنی چوٹوں سے زیادہ آفس کے کاموں کے لیے فکر مند تھا۔ اس نے روبرٹو سے وہ تمام ڈاکومنٹس ای میل کرنے کو کہا تھا' جو اسے آفس سے دور بیٹھ کر آفس کا کام کرتے ہوئے درکار تھے۔ وہ اسپنج باتھ اور بینڈیج کی تبدیلی والے تمام کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیم گرم پانی سے ہاتھ' منہ اور جسم کا اوپری حصہ دھلنے سے وہ خود کو کافی تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا مزید کئی دنوں تک اپنی ان چوٹوں کے ناز اٹھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

وہ آج ہی ہاسپٹل سے چھٹی لے کر چلا جانا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ کل کا دن اپنے ہوٹل میں گزارے گا پھر پرسوں سے آفس۔

لیزا دوپہر میں پھر ہسپتال میں موجود تھی۔

"تم سوئیں نہیں گھر جاکر؟"

"سو گئی تھی دو گھنٹے کی نیند لے لی' کافی ہے۔ تم اپنی سناؤ' تکلیف کچھ کم ہوئی؟"

وہ اس سے کیا کہتا کہ تکلیف جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اتنا ہی اچھا محسوس کرتا ہے۔ اس نے محض سرہاں

میں ہلا دیا تھا۔ لیزا اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔
"تم نے لنچ کر لیا؟"
"ہاں۔"
"تم میوزک سنو گے؟ میں تمہارے لیے اپنا آئی پوڈ لے آئی۔ میوزک میں تمہاری پسند تو مجھے پتا نہیں اس میں اٹالین گانے بھی ہیں اور انگلش سونگز بھی ہیں۔"
اس نے بیگ سے نکال کر اپنا آئی پوڈ اسے دیا۔ وہ یہ کہہ کر اس کے خلوص کی توہین نہیں کر سکتا تھا کہ اسے میوزک، مووِیز، کتابیں کسی بھی چیز میں رتی برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو زندہ لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ برسوں ہوئے اس نے خود کو زندہ لوگوں میں شمار کرنا چھوڑ دیا تھا۔
"میں کچھ انگلش میگزینز اور کتابیں بھی لائی ہوں مگر پھر وہی بات کہ تمہاری پسند مجھے پتا نہیں تھی۔ بس جو مجھے پسند ہیں، وہ لے آئی۔"
وہ اس کے لیے یہ سارا اہتمام یوں کر رہی تھی گویا وہ یہاں کئی دنوں تک پڑا رہنے والا ہے۔ اسے سوچ کر ہنسی آئی۔
"تم مسکرا کیوں رہے ہو؟" اس نے اس کے لبوں پر آئی مسکراہٹ فوراً" دیکھ لی تھی۔
"کچھ نہیں، ویسے ہی۔"
"ویسے یہ موقع اچھا نہیں ہے سینور سکندر! تم زخمی ہو کر بیڈ پر پڑے ہو، تمہارے کہیں پر بھی چلے جانے، بھاگ جانے کا کوئی خطرہ موجود نہیں ہے۔ اس بہترین موقع سے فائدہ اٹھا کر میں تمہاری پینٹنگ کیوں نہ بنا لوں۔ تم چاہے جتنا بھی ناراض ہو گے، منہ پھلاؤ گے مگر اٹھ کر جا تو نہیں سکو گے۔"
وہ شرارت بھرے انداز میں بولی تھی اور وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"مصورہ! میں نے تمہیں اپنی دوست سمجھا تھا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میری دوست میری مجبوری کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔"
اس نے تاسف سے سر ہلا کر جیسے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک اجنبی ملک میں ملنے جلنے، چلنے پھرنے سے قاصر ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا چاہے اسے اپنی صحت اور زندگی کی پروا تھی یا نہیں مگر بہرحال اسے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے دوہا اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنی تھی۔ یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی اور وہ۔۔۔
وہ لیزا کے ساتھ بڑے ہلکے موڈ میں ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ باتیں کرنے، اس کے ساتھ وقت گزارنے کو انجوائے کر رہا تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً" یہ کمال اس لڑکی کا تھا ورنہ ایک عمر گزری، وہ تو ہنسنے والی باتوں پر بھی ہنسنا بھول بیٹھا تھا۔
"نہیں سینور سکندر! میں آپ کی مجبوری کا فائدہ ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ میں آپ کی پینٹنگ اس وقت بناؤں گی جب آپ خود مجھے اپنی خوشی سے یہ اجازت دیں گے۔"
وہ مسکراتے ہوئے جواباً" بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

لیزا سے باتیں کرتے کرتے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی، اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ دو، تین گھنٹے سوتا رہا تھا، بغیر کسی دوا کے؟ نہیں، شاید دوپہر کو نرس نے جو پین کلرز دیے تھے۔ ان میں سکون اور نیند لانے والی بھی کوئی دوا شامل رہی ہو گی۔ اس نے فوراً" خود سے کہا تھا۔

چلو نیند دوا کے ساتھ آئی تھی مگر اس کے وہ خواب؟

اس نے فوراً" ہی اپنے اندر سے ابھرتے اس سوال کو ذہن سے جھٹکا۔
"اٹھ گئے تم۔" وہ اس کے پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ لائی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔
"ہاں کافی دیر سو گیا میں۔"
"اچھا ہے ناں۔ جتنا آرام کرو گے، خود کو ریلیکس

رکھو گے؟ اتنی ہی جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" وہ مسکرا کر پرخلوص انداز میں بولی تھی۔

"تمہارے لیے اسنیکس اور کافی آئی تھی تم سو رہے تھے تو میں نے واپس لوٹا دیا۔ اب بول کر آتی ہوں۔ ویسے تم کافی کی جگہ چائے تو نہیں لینا چاہتے؟ اصل میں یہاں کافی کا استعمال زیادہ ہے۔ لوگ چائے کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔"

وہ کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"کافی ہی ٹھیک ہے بلیک تم اپنے لیے بھی لے کر آنا۔" وہ بغیر تکلف کے بولا تھا۔ لیزا سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔

وہ مشروم اور پنیر والا سینڈوچ کھا رہا تھا لیزا کوکیز کھا رہی تھی۔ کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے میں اس نے لیزا کی مدد لینے سے منع کرنا چاہا تھا مگر اس نے پھر بھی اسے مدد دی تھی۔

"لیزا! ابھی ڈاکٹر آئے گا ناں تو تم اس سے کہنا مجھے ہسپتال سے چھٹی چاہیے۔"

ڈاکٹر تک اپنا مدعا پہنچانے کے لیے اسے لیزا کی ضرورت تھی۔ وہ آج ہی ہاسپٹل سے چلا جانا چاہتا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ یکدم ہی یوں اچھلی تھی گویا کوئی بہت ہی عجیب بات سن لی ہو۔

"کل شام تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ابھی تمہاری چوٹیں بالکل تازہ ہیں اور تم ہسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہتے ہو خیریت ہے ناں؟" وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی تھی۔

"لیزا! بیڈ پر لیٹ کر آرام ہی کرنا ہے ناں وہ میں اپنے ہوٹل میں کر لوں گا۔ یہاں ہسپتال میں اس طرح پڑ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں بالکل ہی معذور ہو گیا ہوں۔ تم اسے کچھ بھی کہو مگر ہسپتال کا روایتی ماحول مجھ پر نفسیاتی طور پر اتنا منفی اثر ڈال رہا ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو ٹھیک ہونے میں بہت ٹائم لوں گا۔"

لیزا جواباً اس بات کی مخالفت میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر روبرٹو اندر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔

"Buona Sera"۔ اس نے اٹالین میں شام اور رات کا سلام ان دونوں کو مشترکہ طور پر کیا تھا۔

"یہ کیا کر لیا تم نے میرے پیچھے ہیں؟" وہ اس سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ وہ جواباً مسکرایا تھا۔

"بیٹھو روبرٹو!" لیزا نے اپنی کرسی روبرٹو کے لیے خالی کر دی تھی۔ روبرٹو نے مسکرا کر لیزا کو دیکھا تھا۔

"تم ہو سکندر کے پاس چلو یہ اچھا ہے۔ صبح جب سکندر نے مجھے اپنے ایکسیڈنٹ کا بتایا میں یہی سوچ رہا تھا کہ اٹالین نہ آنے کی وجہ سے اسے یہاں مشکل ہو رہی ہو گی۔"

"دوستی کی ہے سینور سکندر سے تو اپنے دوست کا خیال تو رکھوں گی ناں روبرٹو!"

وہ سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے روبرٹو اور لیزا انگریزی ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ روبرٹو اس بات پر ذرا سا بھی حیران نہیں تھا کہ لیزا اس کے پاس ہسپتال میں کیوں ہے؟ ہاں وہ یونہی تو ہر کسی کے ساتھ نیکیاں اور اچھائیاں کیا کرتی تھی۔ روبرٹو نے اسے لیزا کے بارے میں یہی تو بتایا تھا ناں؟ جب روبرٹو اسپین میں تھا تو لیزا اس کی بیوی کو ہسپتال لے کر گئی تھی اس کے پاس وہاں رہی تھی۔ یہ اچھائیاں یہ غیر معمولی سلوک و توجہ خصوصیت کے ساتھ اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ یہ اس لڑکی کے مزاج کا حصہ تھا یہ اس لڑکی کے واقف ہر شخص کے لیے تھا۔

پھر آخر روبرٹو حیران ہوتا بھی کیوں؟ وہ اس کی بچپن کی دوست تھی جانتا تھا وہ اپنی دوست کے مزاج کو۔

"ہاں! یہ بات تو ہے۔ تم سے اچھی دوستی نبھانے والا کون ہو سکتا ہے لیزا!" روبرٹو نے مسکرا کر لیزا کی بات کا جواب دیا تھا۔ "میں نے سارے ڈاکیومنٹس تمہیں ای میل کر دیے تھے مل گئے ناں تمہیں؟"

"کہاں دیکھ پایا ہوں میں۔ میرا لیپ ٹاپ لیزا کی گاڑی میں پڑا ہے یہ مجھے لا کر نہیں دے رہی۔ اور اپنے موبائل پر میں نے اٹیچ منٹ کھولنے کی کوشش کی تو ساری اٹیچ منٹ کھل نہیں سکیں۔"

وہ روبرٹو کی بات کے جواب میں قدرے فکر مند

سے بولا تھا۔ اسے دفتر کے کاموں کی فکر تھی۔

"ہاں تو بالکل ٹھیک کر رہی ہوں میں۔ بائی دا وے تمہارا لیپ ٹاپ اور بریف کیس اب میری گاڑی میں نہیں بلکہ میں نے اپنے گھر لے جاکر حفاظت سے رکھ دیا ہے۔ باتیں سنو ذرا ان محترم کی روبرٹو! مجھ سے فرما رہے ہیں میں ڈاکٹر سے کہہ کر انہیں ہسپتال سے ڈسچارج کروا دوں۔ ذرا اس کی چوٹیں دیکھو اور پھر یہ بات سنو۔"

اس نے پہلے اسے اور پھر روبرٹو کو ایک ہی وقت میں مخاطب کیا تھا۔

"مجھے ہاسپٹلز کا ماحول سوٹ نہیں کرتا۔ طبیعت الجھتی ہے روبرٹو! ریسٹ کرنا ہے' باقاعدگی سے بینڈیج چینج کرواتے رہنا ہے تو یہ سب تو میں ہوٹل جاکر بھی باآسانی کر سکتا ہوں۔ میرا یقین کریں آپ لوگ میں یہاں رہ کر اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہو سکوں گا جتنا جلدی یہاں سے جاکر ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

اس کے لیے روبرٹو اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ہسپتال سے چھٹی کروانے کی وجوہات سے آگاہ کرتا۔ اس نے روبرٹو سمیت اپنے کسی بھی جاننے والے' ملنے والے کو یہ حق نہیں دے رکھا تھا کہ وہ اس کی ذاتیات میں دخل دے مگر یہاں مسئلہ لیزا محمود کا تھا۔ وہ اسے ٹوک نہیں سکتا تھا اور نہ ہی خفا ہو کر اسے اس موضوع پر بولنے سے روک سکتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہاں روبرٹو موجود تھا بلکہ اس لیے کہ اب وہ لیزا کے ساتھ تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"اگر یہ بات ہے تم نے یہاں سے جانا ہی ہے تو پھر تم میرے گھر چلوگے۔ ہوٹل تو میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔"

لیزا اس کی بات کے جواب میں فوراً" دھونس بھرے انداز میں بولی تھی۔ اس کا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا تھا۔ وہ یہ کیا نیا قصہ نکال بیٹھی تھی۔ اب یہ ایک نئی مصیبت تھی۔

"یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے لیزا!" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔

"کیا مناسب نہیں ہے؟" لیزا نے اسے غصے سے دیکھا تھا۔

"لیزا ٹھیک کہہ رہی ہے سکندر! اگر تمہیں لگتا ہے کہ ہسپتال کا ماحول تمہیں سوٹ نہیں کر رہا تو پھر تمہیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں تمہاری دیکھ بھال ہو سکے۔ لیزا اگر تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہے تو یہ تو بہت اچھا ہے۔ وہاں اس کی ننی ہیں وہ تمہارا خیال رکھ لیں گی' تم سہولت سے رہ لوگے۔"

روبرٹو نے اپنی رائے پیش کی تھی۔ وہ ہسپتال سے جانے کی بات بول کر پچھتا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے اتنا زیر بار آچکا تھا' مزید کوئی بھی احسان لینے کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"مجھے اصل میں عادت نہیں ہے اس طرح کسی کے بھی گھر پر رہنے کی۔ میں ایزی فیل نہیں کروں گا۔" اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے اس نے لیزا کو انکار کیا۔

وہ اپنی عادت کے مطابق صاف' دو ٹوک اور بے مروتی بھرا انکار اسے کر نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے اب لیزا سے بات کرتے ہوئے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کا دل دکھے۔

"تم وہاں اچھا محسوس کروگے' یہ میری گارنٹی ہے سکندر! اور اگر تمہیں اچھا نہ لگا تو تم مجھے صاف صاف بتا دینا۔ میں خود تمہیں اسی وقت تمہارے ہوٹل چھوڑ آؤں گی' یہ میرا وعدہ ہے۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ کے پاس آگئی تھی۔ اور دوستانہ لہجے اور اپنائیت بھرے انداز میں بولی تھی۔

"مان جاؤ سینور سکندر! تمہاری دوست لیزا محمود کا گھر کم از کم تمہارے ہوٹل سے تو زیادہ آرام دہ ہے۔"

وہ بے بس سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی اپنائیت' خلوص اور محبتوں کو پانے کا ذرا سا بھی حقدار نہیں تھا مگر وہ اس لڑکی کو انکار کیسے کرے؟ [illegible] اپنائیت بھرا اصرار کر رہی تھی۔ [illegible] انداز میں

حق جتا رہی تھی اور اس اپنائیت اور دوستانہ حق سے انکار کرنے کے لیے اسے لازما" بے مروتی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرنا پڑتا جو وہ اس کے ساتھ کر نہیں پا رہا تھا۔

وہ لیزا محمود کے گھر ہرگز نہیں جانا چاہتا تھا مگر اخلاقی دباؤ میں یوں آگیا تھا کہ اسے اس کے گھر جانا ہی پڑ رہا تھا۔

روبرٹو آدھا پون گھنٹہ بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا۔ لیزا نے اس سے اس کی چھٹی کی بات کی تھی۔ کافی مشکلوں سے ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ وہ بھی یہ کہہ کر مریض اپنی ذمہ داری پر جلدی ڈسچارج ہو رہا ہے۔ اس نے سکندر کو کل آکر دکھانے کی تاکید کی تھی۔

☼ ☼ ☼
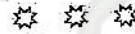
"آرام سے' آہستہ آہستہ اترو۔" وہ اس کے اپارٹمنٹ آگیا تھا۔ لیزا نے گاڑی بیس منٹ میں لے جا کر روکی تھی' اب وہ اسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکلنے میں مدد دے رہی تھی۔ اسے اپنے دائیں پاؤں پر بالکل بھی زور نہیں ڈالنا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات پر وہ راستے سے آئرن کریچ ــــــ خرید کر لائے تھے۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ کم از کم بھی وہ اگلا ایک ہفتہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اگر چلنا ناگزیر ہو ہی جائے تو پھر بیساکھی کے سہارے اپنے دائیں پیر پر بالکل بھی وزن ڈالے بغیر چلے۔

وہ بیساکھی کے سہارے اپنا سارا وزن بیساکھی اور بائیں پاؤں پر ڈالے دائیں پاؤں کو محض گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ لیزا اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"تمہیں درد تو نہیں ہو رہا ناں سکندر! "تم سے چلا جا رہا ہے ناں؟"

مین دروازے سے اندر داخل ہوتے' لفٹ میں جاتے' باہر نکلتے' اس کے اپارٹمنٹ تک آتے آتے وہ یہ سوال نجانے کتنی بار دہرا چکی تھی۔ اسے ہنسی آگئی تھی۔

"ہنسو مت' مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ ضدی اتنے ہو کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ہی دم لیا ہے جبکہ ابھی دو تین دن تمہیں ہسپتال میں رہنا چاہیے تھا۔" وہ اس کے ہنسنے پر چڑ کر ناراضی سے بولی تھی۔ لیزا کے بیل بجانے پر اپارٹمنٹ کا دروازہ ایک بڑی عمر کی خاتون نے کھولا تھا۔ وہ چونکہ غائبانہ تعارف حاصل کر چکا تھا' چنانچہ جانتا تھا' یہ لیزا کی نینی ہیں۔ بچپن میں اس کی آیا تھیں اور اب روم میں لیزا کے فلیٹ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے شلوار قمیض اور دوپٹہ پہن رکھا تھا' بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ چہرے پر نرمی اور محبت بھرا تاثر تھا۔

"السلام علیکم۔" ساری زندگی کبھی اس طرح کسی کے گھر منہ اٹھا کر نہیں گیا تھا۔ بہت عجیب محسوس کر رہا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آؤ اندر آؤ۔" انہوں نے پر شفقت انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ ان کی اردو میں گفتگو سنتے ہی اسے لیزا کی گالیاں یاد آئیں۔ اپنی نینی ہی سے فرمائش کر کے اس نے اردو میں گالیاں سیکھی تھی ناں۔ اسے لیزا کی وہ خطرناک اردو یاد کر کے دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔

"نینی! آپ نے اور میں نے مل کر سکندر کی بہت کیئر کرنی ہے۔ تیار رہیے! ڈاکٹر ابھی اسے ڈسچارج نہیں کر رہا تھا۔ یہ ضد کر کے ہسپتال سے چھٹی لے کر آیا ہے۔"

وہ لیزا اور اس کی نینی کے ساتھ چلتا ایک کمرے میں آگیا تھا۔ لیزا کا اپارٹمنٹ خوب صورت تھا۔ آرٹسٹک لک دے رہا تھا۔ لگ رہا تھا' یہ لیزا کا اس کے عزیز از جان روما میں اپنا فلیٹ ہے جسے اس نے بڑی محبت سے سجا اور سنوار رکھا ہے۔

"بیٹا! تم بالکل تکلف مت کرنا۔ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو بے جھجک مجھ سے کہہ دینا۔"

وہ بیساکھی کو ٹائلز پر مضبوطی سے جما کر اس پر اپنا وزن ڈال کر بیڈ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا' تب نینی اس سے بولی تھیں۔ اسے بیٹھنے میں کچھ وقت کا سامنا

تھا اس لیے اس نے محض سر اثبات میں ہلا دیا۔ لیزا جو اس کے بالکل پاس کھڑی تھی اس نے اسے فوراً" ہی بیٹھنے میں مدد دی تھی۔

"چائے' کافی کچھ لاؤں تم لوگوں کے لیے؟" نینی نے لیزا کو اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نینی! کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ ایسا کریں' ڈنر ہی کا انتظام کرلیں۔" لیزا اس کی بیساکھی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکا کر رکھ رہی تھی۔

"کھانا تو میں پہلے ہی تیار کرچکی ہوں۔"

وہ بیڈ کے اوپر اپنا دایاں پاؤں خود ہی اٹھا کر رکھ رہا تھا مگر لیزا نے جلدی سے پٹیوں میں جکڑے اس کے پاؤں کو بڑی آہستگی سے ایسے کہ اسے ذرا بھی تکلیف نہ ہو' اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ ساتھ وہ نینی کو جواب بھی دے رہی تھی۔

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا نینی! بس پھر اب تھوڑی دیر میں آپ میرا اور سکندر کا کھانا یہیں لے آئیے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" نینی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیزا نے اس کی کمر کے پیچھے تکیے لگا دیے تھے۔

"تکلیف تو نہیں ہو رہی پاؤں میں؟ اتنا چلے ہو۔" وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"لیزا! میں تمہارے اصرار پر آتو گیا ہوں مگر مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اس طرح تمہیں اور تمہاری نینی کو اپنی وجہ سے پریشان کرنا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ پاؤں میں درد والے سوال کا نفی میں جواب دینے کے بعد۔

"مجھے اور نینی کو کوئی تکلیف نہیں ہو رہی سکندر! دوست آخر ہوتے کس لیے ہیں؟ کیا صرف ہنسی مذاق کرنے اور اچھے وقت پر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے؟ تمہارا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے' تم تکلیف میں ہو اور اٹلی تمہارا ملک بھی نہیں ہے۔ تم نہ یہاں کی زبان جانتے ہو' نہ راستوں سے واقف ہو۔ اس پریشانی میں بحیثیت دوست میں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہوں۔"

وہ بھی جواباً" سنجیدگی سے بولی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ لیزا کچھ بھی کہتی' بہرحال اسے اس طرح یہاں آکر خاصی شرمندگی ہو رہی تھی' چاہے وہ اسے بضد ہو کر' اصرار کرکے اس کی مرضی کے خلاف دھونس اور حق جتا کر لائی تھی تب بھی۔

"یہ تمہارا کمرا ہے؟" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ آج رات کی بات ہے۔ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا۔

"ہاں!" وہ جواباً" مسکرائی تھی۔ اس نے ایک پیار بھری نگاہ اپنے کمرے میں ڈالی تھی۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر لگی ایک تصویر پر گئی تھی۔ لیزا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

"یہ میری اور میری بہن' سیم کی تصویر ہے۔"

تصویر میں لیزا اور اس کی بہن پانچ چھ سال کی بچیاں تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال رکھی تھیں۔ دونوں بے تحاشا ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

"رائٹ سائڈ والی تم ہو' ہے ناں؟" اس نے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس' بالوں کی دو پونیاں بنائے خوب صورت اور خوب صحت مند سی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں! میں ہوں۔ بہت موٹی تھی میں بچپن میں۔" وہ تصویر کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنسی تھی۔

"یہ سیم کی برتھ ڈے پارٹی والے دن کی تصویر ہے۔"

"سیم تمہاری بہن کا نک نیم ہے؟" اسے ایسا لگا تھا جیسے لیزا کو اپنی بہن کی باتیں کرنا اچھا لگ رہا ہے اس لیے اس نے اخلاقاً" اس حوالے سے گفتگو بڑھائی۔

"ہاں' اس کا پورا نام سامنتھا ہے۔ ہم لوگ پیار سے اسے سیم بلاتے ہیں۔" لیزا کے چہرے پر اس کی بہن کی محبت کے رنگ بکھرے تھے۔

"تمہاری بہن بھی اٹلی میں رہتی ہے؟"

"نہیں، اس کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ پاکستان میں رہتی ہے۔" وہ اس بار کچھ دکھ بھرے انداز میں مسکرائی تھی۔ شاید وہ اپنی بہن کو بہت مس کرتی تھی۔

وہ لیزا کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"مجھ میں اور سیم میں بہت پیار ہے سکندر! ہم دونوں صرف بہنیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی بیسٹ فرینڈز بھی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب میں اور سیم ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔"

لیزا کی بات اس کے دل کو بڑی تیز جا کر چبھی تھی۔ وہ پچھلی زندگی کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر پھر بھی لیزا کا اس کی بہن کے لیے پیار دیکھ کر اسے بھی کوئی یاد آگیا تھا۔

"جو بات بہن بھائیوں کی ہوتی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہوتی ناں! سکندر مجھے لگتا ہے آپ کے بھائی یا بہن آپ کے جتنے اچھے دوست بن سکتے ہیں، اتنا اچھا دوست اور کوئی نہیں بن سکتا۔ ان کے سامنے آپ خود کو عیاں کرنے سے جھجکتے بھی نہیں ہیں۔ بھائی، بہن کا پیار قدرت نے بڑا انمول بنایا ہے۔" وہ اپنی دھن میں بڑے جذبے سے بول رہی تھی۔

"بھائی!" اس پر ایک وحشت سی طاری ہوئی تھی۔

"لیزا! میں کچھ دیر آرام کرلوں؟" اپنے اندر کی وحشت سے گھبرا کر اس نے لیزا سے کہا۔ وہ اس کی بدلتی کیفیتوں سے انجان مسکرا کر بولی۔

"ہاں تم کچھ دیر ریسٹ کرلو۔ پھر ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔"

لیزا اس سے مسکرا کر بولتی کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ وحشتوں میں گھرا کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی جب امو جان نے اسے فون پر یہ خبر سنائی تھی کہ اس کے پاپا کو اس کا خود اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کرلینا برا نہیں لگا ہے۔

"تمہارے پاپا سے میں نے بات کی ہے زین! وہ ام مریم کی فیملی سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ام مریم اور اس کی فیملی انہیں پسند آگئی تو انہیں اس کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تھینک یو امو جان تھینک یو سو مچ۔ آپ نے مجھے بہت بڑی خوش خبری دی ہے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پاپا کو یہ نہ لگے کہ میں اپنی منگنی وغیرہ کی بات جلدی کر رہا ہوں۔ آئی مین ابھی تو میری انڈر گریجویٹ اسٹڈیز بھی مکمل نہیں ہوئیں۔" خوشی کا بے پایاں احساس تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"میں بھی اسی حوالے سے تھوڑی فکر مند تھی زین! مگر تمہارے پاپا نے اس بات کو اتنے مثبت انداز میں لیا۔ بولے "ہمارے بچے امریکہ میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے ہیں۔ یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیاں بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا بیٹا تو پھر بیس سال کا ہونے والا ہے اور ایک لڑکی پسند کرنے اور اس سے شادی کا سوچنے کے لیے درست راستہ اپنا رہا ہے تو ہم اس کے لیے رکاوٹ کیوں بنیں؟"

زندگی میں پہلی بار اس کے باپ نے اس کے لیے وہ سوچا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس کی آرزوؤں اور خوابوں کو روند ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اسے اس پل بے اختیار اپنے باپ پر پیار آیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اس کے دل کو، اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی، پہلی مرتبہ اس کے دل کی خوشی کا انہوں نے خیال کرلیا تھا۔

وہ بے پناہ خوش تھا۔ اس کا سب سے بڑا خوف کہ پاپا اس بات پر کیا ردعمل ظاہر کریں گے، دور ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی ام مریم سے بھی اس خوشی کو شیئر کیا تھا۔

"سچ زین... تم نے اپنے پیرنٹس سے بات بھی کر لی؟" ام مریم نے خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

کتنی اہم تھی یہ لڑکی اس کے لیے۔ کتنا اہم تھا اس کا ساتھ اس کے لیے۔ امو جان سے ام مریم کے متعلق بات کرنے کے بعد اس نے ام مریم کو اس بابت

کچھ نہ بتایا تھا۔ اندر ہی اندر ایک خوف تھا' نجانے پاپا کیا کہیں' کس طرح کا ردعمل ظاہر کریں۔ اگر انہوں نے انکار کردیا؟ وہ ام مریم کو کسی بھی طرح کا کوئی دکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کرسکتا تھا۔ اگر شہریار خان کا ردعمل مخالفت میں ہوتا' تب وہ کیا کرتا' یہ اس نے نہیں سوچا تھا اور اب جب سب کچھ بالکل ٹھیک ہوتا ہوا نظر آرہا تھا' تب اسے ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت بھی کہاں رہی تھی۔ زندگی پہلی بار اس کے ساتھ سب کچھ ویسا کررہی تھی جیسا وہ چاہتا تھا۔ اسے پہلی بار زندگی پر پیار آرہا تھا۔

"میرے پاپا اور اموجان تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتے ہیں مریم!" وہ اس کے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیتا ہوا بولا تھا۔

"ٹھیک ہے زین! میں نے ابھی تک اپنے گھر میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ میں اپنے پاپا سے بات کرکے تمہیں بتاتی ہوں۔"

"وہ مان جائیں گے ناں مریم؟" اسے ایک نیا خوف لاحق ہوا تھا۔

"میں نے اپنے لیے اتنا ہینڈسم' ذہین اور چارمنگ لڑکا ڈھونڈا ہے۔ وہ کیوں نہیں مانیں گے زین؟"

مریم اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جواباً ہنس پڑا تھا۔

"میں ایسا کچھ خاص ہینڈسم ہوں نہ ذہین۔ تمہیں لگتا ہوں۔"

"تم جو ہو' مجھے ویسے ہی لگتے ہو زین! میں سب سے پہلی تمہاری طرف اٹریکٹ ہی اس لیے ہوئی تھی کیونکہ تم مجھے بہت ہینڈسم اور چارمنگ لگے تھے۔"

وہ مسکراتا ہوا خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ تعریف کرتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی تعریفیں سن سن کر اب کبھی کبھی اسے خود ہی شک سا ہونے لگتا کہ شاید اب تک کی زندگی میں سکندر کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کرنے کی دھن میں وہ خود کو انڈر اسٹیمیٹ (under estimate) کرتا رہا تھا ورنہ اتنا عام سا بھی نہیں تھا وہ۔

☼ ☼ ☼

ام مریم کے پاپا اپنے آفیشل کام سے امریکہ آنے والے تھے۔ کام چاہے انہیں نیویارک میں تھا مگر ظاہر ہے انہوں نے اپنی بیٹی سے ملنے تو لاس اینجلس آنا ہی تھا۔ کچھ دنوں بعد ام مریم نے اسے یہ اطلاع دی تھی۔ وہ فون پر اپنے پاپا کو اس کے متعلق پہلے ہی بتا چکی ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ اس کے پاپا ایک روشن خیال آدمی ہیں۔ وہ بیٹی کی شادی اس کی پسند کی جگہ پر ہی کرنا چاہیں گے۔ ابھی اس کے پاپا کے آنے میں کافی دن باقی تھے اور وہ ابھی سے ہی پرجوش سا تھا' کچھ خوف' کچھ اندیشے بھی تھے دل میں اور بہت سی امیدیں' آرزوئیں اور خواب بھی دل میں آبسے تھے۔ وہ دن گن گن کر انتظار کررہا تھا۔

جیسے ہی ام مریم نے اپنے پاپا کے امریکہ آنے کی تاریخ کنفرم کی' اس نے جھٹ گھر فون کرکے اموجان کو یہ بات بتائی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! وہ یہاں پہنچ جائیں' پھر میں اور تمہارے پاپا ان سے اور ام مریم سے ملنے لاس اینجلس آجائیں گے۔"

اس کی اموجان محبت سے گندھے لہجے میں بولی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ام مریم ان کے بیٹے کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے' اس کی زندگی کا پہلا خواب ہے۔

ام مریم اپنے چچا کے گھر رہتی تھی۔ اس کے پاپا کو بھی آکر وہیں ٹھہرنا تھا اور وہیں ان دونوں فیملیز کی ملاقات ہونی تھی۔ شہریار خان اور اس کی اموجان لاس اینجلس آگئے تھے۔ وہ ان دونوں کو ام مریم کے گھر لے آیا تھا۔

وہ بے حد نروس تھا۔ اگرچہ دل میں یہ یقین راسخ تھا کہ ام مریم اس کے مغرور اور خود پسند پاپا کو بہت پسند آئے گی کہ وہ ان کے اعلیٰ ترین معیار کے عین مطابق تھی۔ مگر اس کی فیملی' اس کے پاپا؟ وہ دعا کررہا تھا کہ ام مریم کے پاپا اور اس کی فیملی شہریار خان کے ۔۔ یار پر

پوری اتر جائے۔

وہ پیسے کو اہمیت دیتے تھے مگر ساتھ ہی وہ اعلا حسب نسب کو بھی بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس کے لیے بے معنی تھیں' سو اس نے ان سب کے بارے میں جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ام مریم کے آباؤ اجداد انڈیا میں کہاں سے تھے اور اس کے دادا' پردادا کیا کیا کرتے تھے اس میں اسے دلچسپی نہ ہو' مگر اس کے پاپا کو ہوتی تھی۔

اور زندگی اس پر واقعی مہربان ہو چلی تھی۔ ام مریم کے پاپا' اس کا اعلا حسب نسب سب کچھ شہریار خان کے اعلیٰ معیار کے مطابق تھا۔ وہ بڑوں کے بیچ میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ باتوں باتوں میں شہریار خان نے ام مریم کے والد کا پورا شجرہ نسب معلوم کر ڈالا تھا' اور اب وہ بڑے مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔ ان کے بیٹے نے اپنے ہم پلہ خاندان کی لڑکی کو چنا ہے۔ اس نے باپ کی نگاہوں میں پسندیدگی بھانپ لی تھی۔ اس کی امو جان مسکرا زیادہ رہی تھیں' بول کم رہی تھیں۔ جہاں شہریار خان بول رہے ہوتے تھے' وہاں وہ خاموش ہی رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں شہریار خان سے اجازت لی تھی پھر اس کے بعد ام مریم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ام مریم ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

اس کے والدین سے ملنے کے لیے اس نے شلوار قمیص اور دوپٹے پر مشتمل خوب صورت لباس زیب تن کیا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنی امو جان اور شہریار خان کے چہروں پر پسندیدگی محسوس کی۔

"یہاں آجاؤ بیٹا!" امو جان نے پرشفقت انداز میں اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا تھا۔ وہ اس کی امو جان کے برابر میں اور اس کے پاپا کے عین مقابل بیٹھی تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہیں بیٹا آپ؟" شہریار خان نے قدرے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

ام مریم کے بولنے کا وہی انداز تھا جس سے وہ دلوں کو مسحور کرلیا کرتی تھی۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں' اس کے گفتگو کے انداز میں شہزادیوں جیسی آن بان اور نزاکت تھی۔ وہ مقابل کو اپنی شخصیت کے سحر میں لمحوں میں گرفتار کرلینے والی اہلیت کی مالک تھی۔ اسے ام مریم پر فخر کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے شہریار خان اس سے گفتگو کرتے جا رہے تھے' ویسے ویسے ان کے چہرے پر ام مریم کے لیے پسندیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے شوق' مشاغل' مستقبل کے ارادے' شہریار خان ان سب کے متعلق اس سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ لبوں پر دھیمی سی مسکان لیے انہیں حیران کر رہی تھی۔

اتنی سی عمر میں وہ جو جو کچھ پڑھ چکی تھی اور جو جو اس نے حاصل کر لیا تھا' اس سے شہریار خان واضح طور پر متاثر نظر آرہے تھے۔ جیسے وہ ام مریم کے سحر میں گرفتار ہوا تھا ایسے ہی وہ اپنے باپ کو بھی اس کے سحر میں مبتلا پا رہا تھا۔ اس کے خوابوں کی اس شہزادی نے اس کے باپ کا بھی دل موہ لیا تھا۔

شہریار خان کو ام مریم بطور اپنی ہونے والی بہو کے دل و جان سے پسند آگئی تھی۔ وہ آج صرف ام مریم کے والد سے ملاقات کرنے آئے تھے' باقاعدہ رشتہ مانگنے کا کوئی ارادہ آج کے لیے نہیں تھا' مگر ام مریم انہیں اتنی پسند آگئی تھی کہ وہ اس روز ہی باقاعدہ رشتہ مانگے بغیر رہ نہیں سکے تھے۔

ان کے رشتہ مانگنے پر وہ بھی حیران تھا' ام مریم بھی حیران تھی اور اس کی امو جان بھی۔ گو وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی امو جان کو بھی ام مریم بہت اچھی لگی ہے۔ "آنا" فانا" سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ کیا کسی کو اس کی محبت اتنی آسانی سے بھی مل سکتی ہے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ دونوں طرف کی فیملیز نے اس کے اور ام مریم کے رشتے کو قبول کرلیا تھا۔

شہریار خان کی خواہش تھی کہ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی کردی جائے۔ زندگی سے اس کے سارے گلے شکوے لمحہ بھر میں دور ہو گئے تھے۔ مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایک دو

بعد ویک اینڈ تھا اور وہ ہی دن منگنی کے لیے طے کر لیا گیا تھا۔ سادگی سے تقریب منعقد کی جانی تھی۔ ام مریم کے چچا ہی کے گھر پر۔

اگلے روز اس کی امو جان منگنی کی انگوٹھی خرید لائی تھیں اور ساتھ ہی کسی پاکستانی یا انڈین بوتیک سے ام مریم کے لیے منگنی کا جوڑا بھی۔ وہ اور شہریار خان اس کے اپارٹمنٹ ہی پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ منگنی کے بعد اسی رات ان دونوں کی واشنگٹن روانگی تھی اور اس سے اگلی صبح ام مریم کے پاپا کی امریکہ سے واپسی تھی۔

اس نے سکندر کو اپنی منگنی کی اطلاع دینی ضروری نہ سمجھی تھی مگر شہریار خان اور اس کی امو جان نے اسے فون کر دیا تھا۔ ان دونوں نے اس سے منگنی پر آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا خوشی خوشی امو جان کا ام مریم کے لیے لایا منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی دیکھ رہا تھا۔ شہریار خان کو سکندر کو فون ملاتا دیکھ کر اس کے منہ کا مزا خراب ہو گیا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی کے موقع پر سکندر کی بالکل بھی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اپنی خوشی میں اس کی موجودگی اور اس کی شمولیت ہی نہیں چاہتا تھا۔

"اوہ! تمہارا پیپر ہے۔ ہاں میں بالکل بھول گیا تھا کل تو تمہارا پیپر ہو گا۔"

اس نے شہریار خان کو فون پر بولتے سنا۔ سکندر کے ایگزامز چل رہے تھے' اس کا آنا مشکل تھا۔ اس نے طمانیت محسوس کی تھی۔

"ڈیٹ آگے بڑھا لیں؟ مشکل لگ رہا ہے سکندر! اچھا میں پوچھتا ہوں۔"

شہریار خان نے فون پر گفتگو ختم کی تو امو جان نے ان سے پوچھا تھا۔

"کیا کہہ رہا ہے سکندر؟"

"کہہ رہا ہے منگنی دو' تین دن آگے بڑھا لیں۔ کل اس کا پیپر ہے اور پرسوں بھی کوئی Presentation وغیرہ ہے۔"

"سکندر کے بغیر تو بالکل مزا نہیں آئے گا۔" امو جان سنجیدگی سے بولی تھیں۔

وہ جلدی سے سر نفی میں ہلا کر بولا تھا۔

"نہیں' مریم کے پاپا کی پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔ مریم مجھے بتا رہی تھی اس کی دادی کافی بیمار ہیں اور اس کے پاپا کو فوراً" ان کے پاس جانا ہے۔"

مریم نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کی دادی بے شک بیمار تھیں مگر ایسا کچھ نہیں ہو گیا تھا کہ پرسوں صبح اگر اس کے پاپا روانہ نہ ہوتے تو کوئی قیامت آجاتی۔ اگر وہ مریم سے کہتا تو اس کے پاپا کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ تین چار دن بعد کی اپنی سیٹ بک کروا لیتے مگر جب وہ ایسا چاہتا ہی نہیں تھا تو کہتا کیوں؟

امو جان چاہتی تھیں کہ ان کے گھر کی پہلی خوشی میں ان کے سارے گھر والے موجود ہوں۔ وہ دو ہی تو بھائی ہیں۔ ایک بھائی کی خوشی ہو اور دوسرا بھائی موجود نہ ہو' ایسا کس طرح ہو سکتا تھا؟

شہریار خان تو ظاہر ہے اپنے ولی عہد کی موجودگی صرف اسی تقریب میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر محفل میں چاہتے تھے۔ اس کے ماں' باپ سکندر کی کمی محسوس کر رہے تھے' مگر اسے اپنے بھائی کی کمی قطعاً" محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے نہ آنے پر زیادہ خوش تھا۔ اگر سکندر آجاتا تو اس کی خوشی بدمزا سی ہو جاتی۔

سکندر نے اسے کچھ ہی دیر بعد فون کیا تھا۔ وہ خوش بھی ہو رہا تھا' اسے مبارک باد بھی دے رہا تھا اور اس سے یہ اصرار بھی کر رہا تھا کہ وہ منگنی کی تقریب دو' تین روز آگے بڑھا لے تاکہ وہ بھی اس میں شریک ہو سکے۔ وہ صاف لفظوں میں اس سے یہ نہ کہہ سکا تھا کہ اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی میں اسے اس کی موجودگی قطعاً" درکار نہیں ہے۔ اس نے غیر جذباتی اور سپاٹ سے لہجے میں ام مریم کے والد کے امریکہ میں مزید نہ رک سکنے کا جواز پیش کر دیا تھا۔

"پھر بھی یار کوشش تو کرو۔ کیا پتا وہ اپنی سیٹ آگے کروا لیں۔ آخر کو ان کے ہونے والے داماد کے اکلوتے بھائی کی منگنی میں شرکت کا سوال ہے۔ کیا [illegible] زین شہریار کے بھائی کی اہمیت کو دیکھتے ہو [illegible]

آگے کرواہی نہیں۔"

وہ شوخ و شریر لہجے میں بولا تھا۔

"بہت مشکل ہے سکندر! انہیں فوری واپس جانا ہے۔ منگنی کا دن آگے نہیں کیا جا سکتا۔" وہ بے مروت اور خشک سے لہجے میں بولا۔

"اچھا۔" اس کے سپاٹ اور دو ٹوک انکار نے سکندر کو مایوس کیا تھا۔ اسے اس کے آہستہ آواز میں بولے "اچھا" سے اندازہ ہو گیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے زین! میں موجود نہیں بھی ہوا تب بھی میری دعائیں تو تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ میری ہونے والی بھابھی کو میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے اور بہت جلد میں ان سے ملوں گا بھی۔"

سکندر پُرجوش سا ہو کر یوں بول رہا تھا جیسے اس کی منگنی پر بہت خوش ہو۔ اسے سکندر کی خوشی مصنوعی اور بناوٹی لگ رہی تھی۔ زندگی میں ہمیشہ ہر چیز اس نے پہلے حاصل کی تھی اور زین نے بعد میں۔ یہاں وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اس سے پیچھے رہ جانے پر خوش کیونکر ہو سکتا تھا؟ ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی اور اس کے بھائی کی منگنی ہونے جا رہی تھی وہ بھی اتنی حسین اور بے مثال لڑکی کے ساتھ۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ سکندر دل سے اس کے لیے خوش ہوتا۔

☆ ☆ ☆

اس کی منگنی کا دن اس کے اور ام مریم دونوں کے لیے بے حد یادگار دن تھا۔ ام مریم اس کی امو جان کا لایا جوڑا پہنے 'مشرقی انداز کی دلہن کا روپ اپنائے بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ خود کو زمین پر نہیں 'کہیں آسمانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ام مریم کو اپنے ہاتھوں سے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے پاپا اور امو جان نے اسے ڈائمنڈ کا بیش قیمت سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ اس کے اپنے باپ سے سارے شکوے ختم ہو گئے تھے۔ آج کے بعد اسے زندگی سے بھی کوئی شکایت باقی نہ رہی تھی۔

اس کے پاپا اور امو جان پروگرام کے مطابق منگنی کے بعد اسی رات واشنگٹن واپس روانہ ہو گئے تھے اور اگلی صبح ام مریم کے پاپا بھی واپس چلے گئے تھے۔

وہی زندگی تھی۔ وہی کیمپس کی بھاگ دوڑ' وہی پڑھائی کی مصروفیت مگر پھر بھی اب سب کچھ بدلا بدلا لگتا تھا۔ وہ اور ام مریم اب پہلے سے بھی زیادہ وقت ساتھ گزارا کرتے تھے۔ اب ان کے رشتے کو ایک نام مل چکا تھا' بزرگوں کی رضامندی مل چکی تھی۔ اب کہیں کوئی خوف 'کوئی اندیشہ نہ تھے۔

☆ ☆ ☆

کرسمس کی چھٹیاں آنے والی تھیں۔ چھٹیوں کے لیے کچھ خاص پلان نہیں کیا تھا اس نے۔ اس روز امو جان کا اس کے پاس فون آیا تھا۔

"تمہارے پاپا کا پیغام ہے تمہارے اور مریم کے لیے۔" سلام دعا کے بعد انہوں نے کھنکتے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"کیا امو جان؟" اس نے محسوس کیا تھا ام مریم جیسی بے مثال اور شاندار لڑکی کا انتخاب کرنے کے بعد سے وہ باپ کی نگاہوں میں تھوڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ساری زندگی اسے نظرانداز کرتے رہنے کے بعد انہیں اب کہیں جا کر یہ یقین آیا ہے کہ وہ انہیں کا بیٹا ہے' انہی کی طرح اعلا معیار رکھنے والا' انہی کی طرح بہتر نہیں بلکہ بہترین کا انتخاب کرنے والا۔

"انہوں نے مجھ سے کہا ہے میں کرسمس کی چھٹیوں میں ام مریم کو گھر انوائٹ کروں تاکہ وہ یہاں آ کر ہمارے رہن سہن اور طور طریقوں کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکے۔ تم چھٹیوں میں اسے لے کر گھر آجاؤ بیٹا!"

"واقعی پاپا نے ایسا کہا ہے امو جان؟" اسے حیرت سی حیرت تھی۔ اس کے مغرور پاپا اور کسی کو اس طرح انوائٹ کریں؟

"ہاں زین! ان کی خواہش ہے' یہ چھٹیاں تم اور مریم ہمارے ساتھ گزارو۔"

"ٹھیک ہے امو جان! ہم دونوں ضرور آئیں گے۔"

اس نے ام مریم سے پوچھے بنا ہی ہامی بھرلی تھی۔ اس کی محبت پر ایسا بھروسا اور ایسا یقین تھا' پتا تھا وہ اس کی کسی بھی خواہش کو کبھی رد نہیں کرے گی اور یہاں تو جانا بھی اسے اپنی ہونے والی سسرال میں تھا۔ اپنی سسرال تو وہ بصد شوق جانا چاہے گی۔

اور اس کا یہ یقین سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ ام مریم نے اس کی بات سنتے ہی بڑی خوشی اور گرم جوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ہاں ہاں میں چلوں گی۔ انکل نے اتنے پیار سے بلایا ہے میں کیوں نہیں جاؤں گی؟"

وہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ اس کے گھر جانے کے لیے بڑی پرجوش تھی۔

جیسے ہی چھٹیاں شروع ہوئیں' اس نے اسی روز ام مریم کو ساتھ لے کر واشنگٹن کے لیے رخت سفر باندھا وہ ام مریم کو اپنے گھر لے کر جارہا ہے' وہ بے حد خوش تھا۔ ام مریم بھی اپنی سسرال جانے پر بہت خوش تھی۔ اس کے ساس سسر نے اسے دل و جان سے انوائٹ کیا تھا' وہ خوش کیوں نہ ہوتی؟

مگر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا' اس بار اپنے گھر جانے پر اس کی زندگی میں کیا قیامت آجانے والی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کی عمر بے حد مختصر تھی۔ وہ واشنگٹن اپنے گھر خوشیاں منانے نہیں جارہا تھا۔ وہ اپنی خوشیوں کو ختم ہوتا' بکھرتا اور فنا ہوجاتا دیکھنے کے لیے جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

لیزا کی نینی نے ان دونوں کا کھانا انہیں کمرے ہی میں دے دیا تھا۔

"اور کچھ تو نہیں چاہیے بیٹا؟" انہوں نے لیزا سے پوچھا تھا جو اس کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھی تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔

"نہیں نینی! بس اب آپ آرام کیجیے۔ کھانے کے بعد اگر ہمارا کافی کا موڈ بنا تو وہ میں خود بنالوں گی۔"

لیزا ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ نینی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ لیزا اس کے لیے پلیٹ میں کھانا ڈال رہی تھی۔

"نینی نے پاکستانی کھانے بنائے ہیں تمہارے لیے۔"

وہ اس کے لیے پلیٹ میں یخنی پلاؤ ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جوابا" بالکل چپ رہا تھا۔ اس کی سوچوں پر ابھی بھی ایک وحشت سی طاری تھی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیزا کا اپنی پروا کرنا' خیال رکھنے والا انداز بھی اس وقت اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"بس' اور مت ڈالو۔" سنجیدگی سے بولتے ہوئے اس نے اسے اپنی پلیٹ میں مزید کوئی بھی چیز ڈالنے سے روک دیا تھا۔

وہ خاموشی سے پلاؤ کھانے لگا تھا۔ کسی بھی طرح کا ذائقہ اور خوشبو محسوس کیے اس نے تین چار منٹ میں اپنی پلیٹ ختم کردی تھی۔ وہ خالی پلیٹ واپس ٹرے میں رکھ رہا تھا جبکہ لیزا نے تو ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"بس میں کھاچکا۔"

"اور یہ جو اتنی ساری پاکستانی ڈشز نینی نے بنائی ہیں یہ کون کھائے گا؟" وہ کچھ خفگی اور کچھ اصرار سے بولی تھی۔

"تھوڑا سا تو اور لوناں؟"

اس نے بغور لیزا کی طرف دیکھا۔ "تم اپنے سب جاننے والوں کی بہت پروا کرتی ہو' ان کا بہت خیال رکھتی ہو' ان کے ساتھ بڑی نیکیاں کرتی ہو' یہ تم پہلے ہی مجھ پر ثابت کرچکی ہو لیزا! مزید کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ بری طرح چڑ کر بولا تھا۔ لیزا کے ساتھ کبھی تلخ نہیں ہوگا' کبھی کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کرے گا' وہ لحہ بھر میں خود سے کیے سارے عہد و پیمان بھول گیا تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ نیکیاں کرتی ہے تو کرے مگر اس پر بلا وجہ کیوں اپنے احسان رکھ رہی ہے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو سکندر؟"

"تم روبرٹو کی بیوی کا اس کی غیر موجودگی میں دھیان رکھتی ہو' اپنی بچپن کی آیا کو عزت اور احترام سے اپنے گھر کی بزرگ کا درجہ دے کر رکھتی ہو۔ بہت اچھی بات ہے لیزا! کہ تم ہر ایک کے لیے محبت اور خلوص دل میں رکھتی ہو۔ تمہارے دل میں سب کے لیے ہمدردی ہے' ترس ہے' مگر مجھے تمہاری ہمدردی اور تمہارے ترس کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ساتھ کی جانے والی تمہاری نیکیاں مجھے احسان لگ رہی ہیں۔ مجھے تمہاری نیکیوں اور اچھائیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیزا!"

اس بار وہ چڑ کر تو نہیں بولا تھا مگر سرد اور سپاٹ' بے مروت سے انداز میں ضرور بولا تھا۔ لیزا چند لمحے بغور اسے دیکھتی رہی تھی۔

"تم اور کچھ بھی نہیں لینا چاہتے؟ سوئٹ ڈش بھی نہیں؟"

ایک پل کے بعد اس نے سنجیدگی سے پوچھی تھی تو یہ بات پوچھی تھی.... وہ اپنی دل دکھانے والی بات کے جواب میں اس کا کوئی سخت رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اتنے سکون سے بات بدلتے دیکھ کر اس کا موڈ شدید خراب ہوا تھا۔

"میں اب سونا چاہتا ہوں۔"

لیزا نے کھانے کے چند ہی لقمے لیے تھے۔ اس نے اپنا کھانا اسی طرح ادھورا چھوڑ کر کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھالی تھی۔

"ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کال یا میسج کر کے بلا لینا۔ میں جاگی ہوئی ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے بولتی' کمرے کی لائٹ آف کرتی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

لیزا کے ساتھ اس انداز میں' اتنی بدتمیزی سے بات [illegible] بے سکون ہوا تھا۔ اس کی زندگی [illegible] تھا' [illegible] کا تھا اس میں لیزا کا کیا قصور تھا جو وہ اس کے ساتھ اس لہجے میں بات کر گیا تھا۔ وہ اس کا احساس نہیں لینا چاہتا تو ٹھیک ہے' نہ لے مگر اس کے لیے بدتمیزی اور بے رخی کی تو کوئی ضرورت نہیں۔ وہ چپ چاپ گم صم سائیڈ پر اسی طرح بیٹھا تھا اس نے لیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے خود پر بہت غصہ آرہا تھا۔

لیزا جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گئی تھی۔ وہ اس کمرے کے در و دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لیزا کا میک اپ کا سامان' ہیر برش' پرفیومز وغیرہ رکھے تھے۔ خوب صورت وارڈ روب میں یقیناً" اس کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہوں گے۔ وہ اسی کے گھر میں' اسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اسے اپنی بدتمیزی پر کچھ اور بھی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کل صبح ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ کمرے کا دروازہ بجا تھا۔

قدرے حیران سے ہوتے اس نے "کم آجائیں" بولا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ لیزا کی نینی ہوں گی' اس کی بدتمیزی کے بعد اتنی جلدی لیزا کے دوبارہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

وہ لیزا تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس پر وہ مخصوص مسکراہٹ نہیں تھی جو ہمہ وقت اس کے لبوں کا احاطہ کیے رکھتی تھی۔ سنجیدگی کے ساتھ' ناراضی سے' بغیر مسکراہٹ کے ساتھ ہی سہی پر وہ آئی تو تھی اس کے پاس۔ ابھی جبکہ دو تین گھنٹے قبل ہی وہ اس کے ساتھ خاصی بدتہذیبی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

"تم نے دوا لے لی؟" اس کے قریب آکر اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

دوا کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے [illegible] سے انداز میں سر نفی میں ہلا دیا تھا۔ وہ اس [illegible] ناراض ہے اس کے چہرے سے ظاہر تھا مگر ناراضی [illegible] بھی وہ اس کی فکر کرنا نہیں بھولی تھی۔ لیزا نے [illegible] بورڈ کی طرف جا کر کمرے کی لائٹ جلائی تھی۔

"جب دوسروں کے احسان لینے کا شوق نہیں

"تو تم اپنا خیال رکھنا چاہیے ناں؟"
ناراضی سے بولتے ہوئے اس نے گلاس میں پانی ڈالا تھا۔ اب وہ ٹیبلٹ اور کیپسول نکال رہی تھی۔ لیزا نے وہ اس کے ہاتھ پر دھری۔ اس نے بغیر کچھ کہے پانی سے نگل لی۔

"تم نے مرہم لگایا؟" وہ بغور اس کے بازوؤں کے زخم دیکھ رہی تھی۔ آج ہسپتال سے ڈسچارج ہونے سے قبل ڈاکٹر نے اس کے بازوؤں پر سے بینڈیج اتار دی تھی۔ اسے زخم پر لگانے کے لیے مرہم دیا تھا۔

اس کے ایک بازو پر کہنی سے لے کر کلائی تک ذرا زیادہ گہرا زخم تھا جبکہ دوسرے پر معمولی نوعیت کی چوٹ تھی۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ لیزا بیڈ کے ساتھ رکھی اس کرسی پر فوراً" بیٹھ گئی تھی جس پر بیٹھ کر کچھ دیر قبل وہ اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔

اس نے بغیر کچھ کہے مرہم کی ٹیوب ہاتھ میں اٹھائی تھی۔ وہ اس کا بازو ہاتھ میں لے کر اس کے زخم پر بہت آہستگی اور نرمی سے مرہم لگا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی' اس کے چہرے پر سنجیدگی اور ناراضی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم ابھی تک جاگی ہوئی تھیں؟"
لیزا نے صرف سر ہاں میں ہلایا تھا۔
"کچھ پینٹ کر رہی تھیں؟" اس نے پھر سر ہاں میں ہلا دیا تھا۔
"کیا؟"
"ایک لینڈ اسکیپ۔" وہ اس کے سوالوں کے مختصر ترین اور ٹو دی پوائنٹ جواب دے رہی تھی۔ وہ ایک بازو پر مرہم لگا چکی تو اس نے خود ہی اپنا دوسرا بازو بھی اس کے آگے کر دیا۔

"تمہارا یہاں کوئی باقاعدہ اسٹوڈیو ہے؟ میں نے سنا ہے آرٹسٹ لوگ اپنے گھروں میں اپنا ایک برابر قسم کا اسٹوڈیو ضرور رکھتے ہیں۔"

اس کے طویل سوال کے جواب میں لیزا نے محض سر ہاں میں ہلا دیا تھا۔ وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں سوالات کر رہا تھا' وہ سنجیدگی سے سر ہاں یا نہ میں ہلا کر یا پھر یک لفظی جملہ بول کر اسے جواب دے رہی تھی۔

"کہاں ہے تمہارا اسٹوڈیو؟"
"اوپر۔"
"مجھے دکھاؤ گی؟"
"دیکھ لینا۔"
"کب؟"
"جب تمہارا دل چاہے۔" وہ ایک کے بعد ایک سوال کر رہا تھا اور وہ بغیر اس کی طرف دیکھے' سپاٹ سے انداز میں جواب دیے جا رہی تھی۔ گویا وہ اس سے بہت سنجیدگی سے ناراض تھی۔

"اور تم مجھے پینٹ کب کرو گی؟" اس لڑکی کے چہرے پر اس کی زندگی سے بھرپور وہ مسکراہٹ دیکھنے کی ایسی شدید خواہش ابھری تھی اس کے دل میں کہ بے اختیار وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ اس کا اندازہ سو فیصد درست تھا لاتعلقی' بے نیازی اور ناراضی کا تاثر لمحہ بھر میں لیزا کے چہرے سے غائب ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے تو اس نے اسے حیران ہو کر دیکھا تھا' وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف نرمی سے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر۔۔۔ کیا واقعی؟ کیا تم سچ میں۔۔۔"
اس کی وہ مخصوص مسکراہٹ اس کے لبوں پر واپس آ چکی تھی۔ وہ خوشی اور حیرانی سے تصدیق چاہنے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"کیا میرے احسانوں کا بدلہ چکانے کے لیے تم ایسا کر رہے ہو؟"
وہ یک دم ہی دل گرفتہ سی ہوئی تھی۔ اس نے یہ الفاظ یوں ادا کیے تھے گویا اسے سکندر کے ان لفظوں سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔

"تمہارے خلوص اور تمہاری اپنائیت کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا لیزا! کم از کم چکانا چاہتا بھی نہیں ہوں۔"
وہ بہت سچائی سے بول رہا تھا۔ وہ اپنے دلی جذبات اور سوچیں کچھ بھی چھپانے کی کوشش کیے بغیر اس وقت اس سے بات کر رہا تھا۔

"پھر؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"میری آرٹسٹ دوست لیزا محمود کی اگر یہ خواہش ہے کہ وہ میرا چہرہ پینٹ کرے تو میں چاہتا ہوں روما سے واپس جانے سے قبل اس کی یہ خواہش ضرور پوری کر کے جاؤں۔"
وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا تھا۔ وہ اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی مرہم لگا چکی تھی' وہ بے حد خوش نظر آرہی تھی۔
"اوہ مائی گاڈ! مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا سکندر! تم جیسا سڑیل مجھے اپنا چہرہ پینٹ کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ میرے خدایا! کہیں یہ خواب تو نہیں۔"
"لیزا محمود! میرے بارے میں اپنے یہ غیر پارلیمانی الفاظ آپ واپس لیجئے۔" وہ اس کی سی ٹون میں شگفتگی سے بولا۔
"سڑیل کو سڑیل ہی کہوں گی ناں... سڑیل' بدتمیز' بداخلاق' بے مروت سکندر شہریار صاحب نے مجھے اپنی پینٹنگ بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ خدایا اگر یہ خواب ہے تو میں اس سے جاگوں نہ۔"
وہ اپنے لیے اتنے شاندار القاب سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ لیزا بھی ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی دیکھ کر اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ ناراض تھی' ہنس نہیں رہی تھی تب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
رات کافی ہو رہی تھی۔ وہ اسے سونے کا کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر جانے لگی تھی۔ اس نے لائٹ دوبارہ آف کر دی تھی۔
"میں جاگی ہوئی ہوں سکندر! اسٹوڈیو میں کام کر رہی ہوں' کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھے بلا لینا۔"
وہ وہاں سے جانے کے لیے پلٹی تھی۔ مگر پلٹتے پلٹتے جیسے اسے کچھ یاد آیا تھا۔
"تم مجھے اپنی دوست سمجھتے ہو سکندر! میں اپنے دوست سکندر شہریار کا خیال رکھ رہی ہوں' اس کی پروا کر رہی ہوں خلوص اور اپنائیت کے ساتھ۔ پھر سے احسان اور نیکی کے لفظ میرے لیے مت بولنا سکندر!
دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"
وہ بہت سنجیدگی اور آہستگی سے بولی تھی۔ وہ جواباً چپ رہا تھا۔ لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح ہو گئی تھی۔ اسے دوا لے کر بھی رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ اسے رات بھر پیر میں کافی تکلیف بھی رہی تھی۔ وہ درد کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ ساری رات جاگ کر صبح ہونے کا انتظار کیا تھا۔ اسے ہسپتال میں اسی سکون آور دوا کے ساتھ رات میں اور پھر دوپہر میں بھی اتنی گہری نیند کس طرح آگئی تھی کل نیند آئی تھی تو آج بھی آنی چاہیے تھی۔
وہ بیساکھی کے سہارے اٹھ کر باتھ روم گیا تھا۔ بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوتے اور منہ ہاتھ دھونے میں قدرے دقت کا سامنا تھا مگر اپنی چوٹوں' تکلیفوں اور زخموں کی اس نے پہلے پروا کب کی تھی جو اب کرتا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو لیزا کمرے میں کھڑی تھی۔
"گڈ مارننگ!" وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ "ایم سوری! میں بغیر اجازت اندر آگئی۔ دراصل میں کافی دیر سے دروازہ ناک کر رہی تھی تم نے کوئی جواب نہیں دیا تو مجھے فکر ہوئی۔"
"تم سوئی نہیں؟" وہ بیساکھی کے سہارے واپس بیڈ کی طرف جانے لگا۔ لیزا جلدی سے اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ وہ کل کے مقابلے میں تیز تیز قدم اٹھا کر بیڈ تک اس کی مدد کے بغیر ہی پہنچ گیا تھا۔ لیزا نے اسے بیڈ پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ اسے مدد کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ منع کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں سیدھی پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔
"تھوڑی دیر سو گئی تھی۔ میرا سونا جاگنا تو بس ایسا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ناشتہ کر کے پھر سے سو جاتی ہوں کبھی کبھی دن میں لیٹ جاتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی

کی۔

"نینی سے میں بول کر آئی ہوں۔ وہ ناشتہ بنا رہی ہیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے لوز سی ٹی شرٹ جینز کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ بالوں کو کیچر میں لپیٹا ہوا تھا۔ وہ دھلے ہوئے منہ کے ساتھ بھی اتنی ہی پیاری لگ رہی تھی جتنی میک اپ کے ساتھ لگا کرتی تھی۔

"رات بھر میں تمہارا ارادہ بدلا تو نہیں ناں؟" وہ کس حوالے سے یہ سوال پوچھ رہی تھی وہ جانتا تھا۔

"نہیں۔" وہ جواباً مسکرایا تھا۔ "تم سے پینٹنگ بنوائے بغیر میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ بس یہ جو ایکسیڈنٹ کی وجہ سے تھوڑا میرا آفس کے کاموں کا حرج ہوا ہے مجھے وہ کام نمٹا لینے دو پھر ایک دن پورا تمہارے نام ہو گا۔ تم تسلی سے اپنی پینٹنگ بنانا۔"

وہ زندگی کے چند مختصر سے دن یہاں گزار کر واپس چلا جائے گا۔ ایک بار یہاں سے گیا تو زندگی میں اس لڑکی سے دوبارہ کبھی ملے گا بھی نہیں۔ وہ ملنا چاہے گا ہی نہیں۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ زندگی کے یہ چند دن اس لڑکی کے خلوص اور دوستی کا جواب خلوص اور دوستی ہی سے دے۔

کچھ دنوں کے لیے ملی اس پیاری لڑکی کا ساتھ پردیس میں اسے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ ان دونوں ہنس بھی رہا ہے' باتیں بھی کر رہا ہے' کسی کسی پل خود کو زندہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے' وہ بھی بغیر کسی احساس جرم کے۔ اس نے لیزا کے حسین چہرے کی طرف بغور دیکھا تھا۔ یہ لڑکی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اسی لیے نہ تو یہ اسے ملامتی نگاہوں سے دیکھتی ہے' نہ دل میں یہ سوچتی ہے کہ سکندر شہریار بڑا ڈھیٹ اور بے غیرت آدمی ہے۔ اسے کوئی حق نہیں ہے زندگی کے ایک بھی لمحے کو انجوائے کرنے کا' مسکرانے کا' خوش ہونے کا۔

یہ زندگی سے بھرپور لڑکی اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اور اسے اس کا اپنے بارے میں کچھ

بھی نہ جاننا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ پردیسیوں سے ملنے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے' آپ ان سے جو آپ نہیں ہیں' وہ بن کر مل سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ اپنے بارے میں چھپا لینا چاہتے ہیں' با آسانی چھپا لیتے ہیں۔

اس نے سوچ لیا تھا وہ لیزا ہی کے مشورے پر عمل کرتا روما میں اپنے باقی دنوں کو رومن ہالی ڈیز ——— کی طرح یہ یاد رکھے بغیر گزارے گا کہ وہ سکندر شہریار زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح جینے کا کوئی حق نہیں رکھتا کہ وہ تو کب کا مر چکا ہے' سنگسار کیا جا چکا ہے' تختہ دار پر چڑھایا جا چکا ہے۔

☼ ☼ ☼
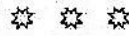
ناشتے کے بعد وہ بیڈ پر ہی اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ درد اور تکلیف کو خاطر میں لائے بغیر آفس کا کام کر رہا تھا۔ لیزا نے کہا تھا انہیں شام چار بجے ہسپتال جانا تھا۔ وہاں ڈاکٹر کے تفصیلی معائنہ اور پیر کی بینڈیج وغیرہ کی تبدیلی میں نجانے کتنا وقت لگنا تھا' اسی لیے وہ چاہتا تھا آج آفس ٹائم ختم ہونے سے قبل جو زیادہ اہم اور فوری کیے جانے والے کام ہیں' وہ نمٹا کر ڈاکومنٹس آفس ای میل کر دے۔ لیزا ناشتے کے بعد اسے دوا اور اس کا لیپ ٹاپ دے کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ اسے وقتاً"فوقتاً" باہر سے لیزا اور اس کی نینی کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"لیزا لنچ میں کیا بناؤں؟" اس نے نینی کی آواز سنی۔ جواب میں لیزا کی آواز آئی تھی۔

"میں سکندر سے پوچھ لیتی ہوں نینی!" فوراً" ہی کمرے کا دروازہ ہلکے سے تھپتھپا کر لیزا اندر آئی تھی۔

"جو ڈش تمہیں پسند ہے' وہی بنوا لو۔ میں بھی وہی کھالوں گا۔"

وہ اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولا تھا۔ وہ جواباً" مسکرائی تھی۔

[illegible] تمہارے۔" وہ اندر آ کر اس [illegible] گئی۔

"کچھ خاص ڈش کھانے کا دل چاہ رہا ہے تو بتا دو۔ نینی کھانے بہت مزے کے بناتی ہیں چاہے وہ پاکستانی ہوں' چاہے اٹالین یا چائنیز۔"

ابھی وہ جواباً" کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ موبائل اٹھانے کے لیے اسے اپنی جگہ سے تھوڑا ہلنا پڑتا' لیزا نے فوراً" ہی اسے موبائل اٹھا کر دے دیا تھا۔ موبائل پر چمکتے نام کو دیکھ کر اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ وہ یہ کال لیزا کے سامنے ریسیو نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ ڈاکٹر آمنہ شہریار خان کی کال تھی' اس کی امو جان۔ ماں سے بات کرتے ہوئے جس طرح کے جذبات اس کے چہرے پر آ جانے تھے' وہ انہیں لیزا کے سامنے عیاں کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا' مگر لیزا جیسے اس کے بغیر کہے ہی یہ بات سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کال کو ریسیو کرنے کے لیے تنہائی چاہتا ہے سو فوراً" ہی کرسی پر سے اٹھ گئی۔

"تم کال ریسیو کرو۔ میں نینی کو کھانے کا کہہ آؤں۔"

لیزا کمرے سے چلی گئی تھی۔ اس نے فوراً" ہی کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم امو جان!" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا' مگر اس سنجیدگی میں بھی اس میں بہت سے جذبات شامل تھے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر؟" ہمیشہ کی طرح ان کا لہجہ نرم اور مہربان تھا۔ وہ بیٹے کی جدائی سے ہلکان ہیں' یہ تاثر لیا غم میں ڈوبا انداز تھا ان کا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور کرب ابھر آیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں امو جان!" اپنے ایکسیڈنٹ کے متعلق انہیں کچھ بھی بتائے بغیر اس نے [illegible] سے اپنی خیریت سے متعلق اطمینان دلایا تھا۔

"ابھی روم ہی میں ہو؟"

"جی امو جان!" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"آفس کے کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ [illegible] بھی رہے ہو کہ نہیں؟ ہر طرف تمہاری [illegible]

ہسٹری بکھری ہو گی۔ روم میں۔" وہ شگفتگی سے بولی تھیں۔ وہ جواباً" اداسی سے مسکرایا تھا۔

وہ انہیں یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ ہسٹری' آرٹ' لٹریچر اب اسے کوئی چیز مسحور نہیں کرتی۔ جس سکندر کو وہ جانتی تھیں' وہ اب وہ سکندر نہیں ہے۔

"جی! کافی گھوم پھر رہا ہوں۔" وہ لہجے کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہوا بولا تھا۔

"پتا ہے سکندر! شادی کے دو ماہ بعد میں اور تمہارے بابا اٹلی' اسپین اور فرانس گھومنے گئے تھے۔ ہم روم ہی میں تھے جب مجھے یہ خوش خبری ملی تھی کہ میں ماں بننے والی ہوں' تم میری زندگی میں آنے والے ہو۔"

کیا اس کا اپنے ماں' باپ کی زندگی میں آنا خوش خبری تھا؟ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

"شاید اسی لیے روما مجھے اتنا فیسینیٹ کرتا ہے امو جان!"

اپنے دل میں بکھرتے درد کو نظر انداز کر کے وہ مسکرا کر بولا تھا۔ آمنہ دھیمے سُروں میں ہنسی تھیں۔ اسے بہت سی چیزوں اور بہت سی باتوں کے لیے قصوروار ماننے کے باوجود ان کی ممتا نے اس سے محبت کرنا کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے دل کے زخم جیسے پھر سے تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اپنے وجود کو شعلوں کی لپیٹ میں پا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کانٹوں پر گھسیٹا جا رہا ہے۔

"چھٹیاں ملیں تو گھر آؤ ناں بیٹا!" ایک دکھ بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری' جیسے خود پر بھی نہیں بلکہ اپنی ماں کی بے بسی پر اسے ترس آیا ہو۔

"جی امو جان! موقع ملا تو آؤں گا۔" وہ سچ بول کر ماں کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ وہ بھی جانتی ہیں کہ وہ وہاں کبھی بھی نہیں آئے گا اور وہ وعدہ کرنے والا بھی جانتا ہے کہ اس نے وہاں کبھی نہیں جانا' پھر لفظوں سے یہ بات کہی جائی' دل دکھایا جانا ضروری تو نہیں؟

جواب میں آمنہ بالکل چپ ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی تھیں۔ وہ ان کا بیٹا تھا' ان کے وجود کا حصہ' کیسے نہ جان پاتا یہ بات کہ وہ اس وقت رو رہی تھیں۔

ماں کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ وہ خود کو درد اور تکلیف کی انتہاؤں پر محسوس کرتا بالکل خاموش تھا۔ اس کی اپنی ماں سے ہمیشہ ایسی ہی بات ہوتی تھی۔ چند منٹوں کی' مختصر سی بات' جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے وہ کبھی بھی نہیں کہہ پاتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

"آپ اپنا خیال تو رکھ رہی ہیں ناں امو جان! میڈیسن لینی چھوڑی تو نہیں ناں؟"

"ہاں بیٹا میں اپنا خیال رکھ رہی ہوں۔ تم بھی اپنا خیال رکھ رہے ہو کہ نہیں؟" وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھیں۔ وہ اب اسی نرم اور محبت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

"آپ میری بالکل فکر نہ کریں امو جان! میں اٹلی آ کر تو کچھ زیادہ ہی کھا پی رہا ہوں۔ کل آفس کے بعد کا سارا ٹائم میں نے روم گھومتے ہوئے گزارا تھا' آج بھی آفس کے بعد کا ٹائم روما کی ہسٹری میں گم ہو کر گھومتے پھرتے ہوئے گزاروں گا۔"

وہ ہنستے مسکراتے انداز میں جھوٹ پر جھوٹ بولتا ماں کو اپنی زندگی کے بہت نارمل اور بہت خوشگوار ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! اپنا خیال رکھنا' اللہ حافظ۔"

"آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا امو جان! اللہ حافظ۔" اس نے مسکرا کر بولتے ہوئے فون بند کیا تھا۔

فون بند کرتے ہی اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کی سطح گیلی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو چھوا تو آنکھ سے گرتا آنسو اس کے ہاتھ پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

لیزا ایک مصورہ ہے۔ سکندر کی مکمل شاہانہ شخصیت اور اس کے تیکھے مغرور نقوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کر دیتا ہے۔

ایک دو اتفاقیہ ملاقاتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہو جاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکھڑ مغرور انداز ہے۔

لیزا کا روم میں اپنا اپارٹمنٹ ہے جو اس کے باپ نے اسے خرید کر دیا ہے۔ جہاں وہ نینی کے ساتھ رہتی ہے۔

سکندر کو نیپلز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی ٹرین مس ہونے کی بنا پر اسے مجبوراً لیزا کی مدد لینا پڑتی ہے۔ لیزا اس کو نیپلز لے کر جاتی ہے۔ اور واپس بھی لاتی ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر تلے دو بیٹیوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

وٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر گئی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اوسط درمیانہ درجہ کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدہ کے مطابق سیم کو وٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

وٹوریا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس مین سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روما سے بھی بہت پیار تھا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔

محمود خالد سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے اس کے باوجود وٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہو گئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہو سکی وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف ہاشم اسد سے کرا دی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہریار کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شاندار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہریار کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پرپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پرپوزل بہت خوش دلی سے قبول کر لیا۔ زین شہریار نے اپنی والدہ کو فون کر کے بتا دیا۔ زین کو یقین تھا کہ ام مریم جیسی لڑکی کو اس کے والدہ انکار کر ہی نہیں سکتے۔

سکندر دو دن تک اعصابی درد میں مبتلا رہا تھا۔ لیزا سے اس کی ملاقات آفس میں ہوئی تو سکندر کا رویہ بہت سرد اور روکھا تھا۔ اس کے باوجود لیزا نے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ سکندر اسپتال میں ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ لیزا فوراً ہی اسپتال پہنچی۔ سکندر کے پیر میں چوٹ آئی تھی لیزا دو دن اس کے ساتھ اسپتال میں رہی۔ سکندر کو اپنی بالکل پروا نہیں تھی۔ دراصل ایکسیڈنٹ بھی سکندر کی لاپروائی سے ہوا تھا۔ ڈسچارج ہونے پر لیزا سکندر کو اپنے گھر لے آئی۔

زین کے والدین کو جب زین کی ام مریم سے وابستگی کا پتا چلا تو انہوں نے ام مریم کے والدین اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہریار خان ام مریم کے والدین سے ملے تو انہیں ام مریم اپنی بہو کی حیثیت سے بہت اس

آئی زین کی منگنی اُم مریم کے ساتھ ہو گئی۔ اُم مریم چھٹیاں گزارنے کے لیے زین کے ساتھ شہریار خان کے گھر آئی۔ سکندر لیزا کے گھر تھا' جہاں لیزا اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی ایک رات امو جان کا فون آگیا۔ سکندر ان سے بات کر کے بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

۴
چوتھی قسط

وہ بہت دیر گم صم بیٹھا رہا تھا' کام کرنے' وقت پر کام مکمل کرنے کی تمام خواہش ایک دم ہی دم توڑ بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی بھی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ابھی بھی ماں کی آنسوؤں بھری آواز گونج رہی تھی۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک ٹک سامنے دیوار کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اس طرح بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی' وہ نہیں جانتا تھا ہاں' وہ چونک کر اپنے حال میں واپس دروازے پر دستک کی آواز سے آیا تھا۔ بجائے کچھ بولنے کے وہ خالی الذہنی سے دروازے کو گھور رہا تھا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تھی' پھر سہ بارہ۔ یہ لیزا ہو گی یقیناً' اس کے لیے لنچ لائی ہو گی۔ عجیب الجھن تھی' اب اس کے ساتھ روڈ بھی نہیں ہونا چاہتا تھا' مگر کھانا کھانے' باتیں کرنے کسی بھی چیز کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ لیٹنے کے بعد اس نے لیزا کی غالباً' چھٹی یا ساتویں دستک کا جواب دیا تھا۔

"آجاؤ لیزا!" وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

"کیا ہوا سو گئے تھے کیا؟" تمہیں لیٹا دیکھ کر اور پھر دستک کا جواب اتنی دیر بعد دیے جانے پر اسے یقیناً یہی لگا تھا کہ سکندر کی آنکھ لگ گئی ہو گی۔

"ہاں شاید آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ یہ سوچ کر لیٹا تھا کہ لیزا سے نیند اور تھکاوٹ کا بہانہ بنا کر کھانا کھانے سے انکار کر دے گا' مگر اب اسے کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں لیے ہوئے کھڑا دیکھ کر اس کے لیے کھانے سے انکار مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس کی ملازمہ نہیں تھی۔ دوستی اور خلوص میں وہ پہلے ہی اس کے ساتھ اتنا زیادہ کر چکی تھی کہ اسے اچھی خاصی شرمندگی ہونے لگتی تھی۔

"لگ رہا ہے' تمہارا ابھی کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کھانا کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے لگا تھا جب لیزا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے کس انداز سے اسے یہ پتا چلا تھا' وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ اتنا تو وہ خود کو جانتا تھا کہ اسے پڑھنا' اس کی سوچ کو جان لینا' اس کے دل میں کیا ہے' پتا چلا لینا کوئی ایسا سہل کام نہیں ہے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بس پتا چل گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے ٹرے بیڈ پر رکھنے لگی۔

"دل نہیں چاہ رہا' پھر بھی تھوڑا سا کھا لو۔ تمہیں میڈیسن لینی ہے۔"

وہ نرم لہجے میں کہتے ہوئے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر کھانا کھانے لگا۔

"اب تم تھوڑی دیر ریسٹ کر لو' پھر ہمیں ہسپتال جانا ہے۔ کافی تکلیف سے گزرنا ہو گا تمہیں وہاں۔ تمہارے پیر کی بینڈیج چینج ہو گی۔"

اس نے تھوڑا سا کھایا تھا۔

"بس کھا چکے؟"

"ہاں!" وہ اب لیزا کے اصرار سے ڈر رہا تھا' مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہ بغیر اصرار کیے وہاں سے اٹھ

گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"چلیں؟" دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ہلکا سا کھول کر لیزا نے باہر سے کھڑے کھڑے اس سے پوچھا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر آفس کا کام کرنے لگا تھا۔ ذہن میں سوچیں اور دل میں تکلیف بہت تھی مگر یہ سب کب نہیں ہوتا تھا' کام تو بہر حال کرنا ہی تھا ناں۔ کچھ کام مکمل کر کے وہ آفس ای میل کر چکا تھا' کچھ ابھی نامکمل تھا۔

"چلو!" لیپ ٹاپ بند کر کے وہ بیڈ سے اٹھنے لگا۔ اسے تکلیف ابھی بھی تھی' مگر نہ وہ تکلیف کو سوچ رہا تھا' نہ اسے اہمیت دے رہا تھا۔ لیزا اسے مدد دینے اس کے نزدیک آئی تھی۔ مگر وہ اس کی مدد کے بغیر ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا کمرے سے باہر آگیا فلیٹ میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔

"نینی سو رہی ہیں۔ لنچ کے بعد روزانہ کچھ دیر نیند لیتی ہیں۔" لیزا ہنس کر بولی تھی۔

وہ اسے لے کر کچن میں آگئی تھی' پتا نہیں کیوں۔

"آؤ!" اس سے کہہ کر وہ کچن میں داخل ہوئی تو نا سمجھی کے سے عالم میں وہ بھی اندر آگیا۔

"بیٹھو!" وہ کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی اس کے لیے کھینچ کر باہر نکال رہی تھی۔ وہاں میز پر ایک پلیٹ میں سلیقے سے کئی طرح کے پھل کٹے ہوئے تھے' چوکور ٹکڑوں میں کٹے مکسڈ فروٹ' پلیٹ میں کانٹا بھی رکھا تھا۔ وہ حیران سا کرسی پر بیٹھا۔ تب وہ اس سے نرمی سے بولی۔

"منع مت کرنا۔ تم نے کھانا بہت کم کھایا تھا۔ تھوڑے سے فروٹس کاٹے ہیں میں نے تمہارے لیے۔ دیکھو یہ بالکل بھی زیادہ نہیں ہیں۔ اچھے بچوں کی طرح خاموشی سے انہیں کھالو۔"

وہ بغور اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"مجھ پر غصہ بعد میں کر لینا' ابھی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

بارہ سال گزر چکے تھے' اس کی عادت ختم ... تھی اپنا خیال رکھوانے کی' اپنی پروا کروانے کی۔ ... کیوں کر لی تھی اتنی پروا؟ شاید اہم سوال یہ ... چاہیے تھا مگر اسے اپنی پروا کیا جانا کیوں اچھا لگا ... ہے؟ اہم سوال یہ بن گیا تھا اس کے لیے۔

لیزا پر سے نظریں ہٹا کر وہ خاموشی سے کانٹے سے مکس فروٹ کھانے لگا تھا۔ ان میں پائن ایپل بھی تھا' اسٹرابری بھی' سیب بھی' ناشپاتی' خوبانی اور انگور وغیرہ بھی۔

"تمہیں ناشپاتی پسند ہے؟" اس نے بے تکلف سے انداز میں اس کی پلیٹ میں سے ناشپاتی کا ایک کیوب چمچ سے اٹھایا تھا۔

"ٹھیک لگتی ہے۔" وہ ناشپاتی کا ٹکڑا منہ میں ڈال رہی تھی۔

"مجھے بہت پسند ہے۔ پھلوں میں میرا فیورٹ پھل ناشپاتی ہے۔"

اس نے اس وقت پرنٹڈ ٹاپ' جس میں زیادہ تر سبز' نیلا اور جامنی رنگ شامل تھے' گہرے کلر کی کیپری کے ساتھ پہن رکھا تھا۔ بالوں میں کیچر لگا تھا۔ چند چھوٹی لٹیں پیشانی اور کانوں کے پاس پڑی تھیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لیزا سے نظریں ہٹا کر اس نے دوبارہ پلیٹ پر نظریں مرکوز کیں۔

"تمہارا کتنا ٹائم برباد ہو رہا ہے میری وجہ سے۔ میرا مطلب ہے بے شک تم یہاں چھٹیوں پر ہو' مگر اتنی فارغ بھی نہیں ہو۔ تمہارے سولو شو کی تیاری ہے اور پھر تمہارے آفس والا پروجیکٹ بھی ہے۔"

"میرا کوئی وقت برباد نہیں ہو رہا۔ رات میں کرتی ہوں ناں میں اپنا کام۔ اب چلو' دیر ہو رہی ہے۔"

وہ ایک دم ہی عجلت کا تاثر دیتے ہوئے کرسی پر سے اٹھی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھتا کرسی پر سے اٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

انہیں ہسپتال میں کافی ٹائم لگا تھا۔ وہاں اس کے

کی بینڈیج تبدیل کیے جانے کا عمل خاصا تکلیف دہ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا سخت جان نہ ہوتا تو شاید اتنی تکلیف سے گزرنے کے بعد رات تک بستر پر نڈھال ہی پڑا رہتا۔

"لیزا! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو کیا اب میں اپنے ہوٹل چلا جاؤں؟"

وہ اب اپنے ہوٹل واپس جانا چاہتا تھا، مگر لیزا کو ناراض بھی ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کس خوشی میں؟ تمہیں کیا میرے گھر پر کوئی تکلیف ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیزا! دراصل میں بس...."

"دراصل تمہیں میرے گھر پر رہنا میرا احسان لگ رہا ہے اور مغرور و خودپسند سینور سکندر کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے۔ یہی بات ہے ناں؟"

لیزا خفگی سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے ساتھ اسے لیزا کے چہرے پر ایک دکھ بھرا تاثر بھی نظر آیا تھا۔

"سینورا لیزا! اتنی اموشنل (جذباتی) مت ہو ہوٹل جانے کی بات صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ کل سے میں آفس جانا چاہتا ہوں۔ اور آفس جانے کے لیے میرے کپڑے وغیرہ سب ہوٹل میں ہیں۔ تم لاکھ یقین دلاتی رہو، مگر یہ میری رومن ہالی ڈیز ہیں تو نہیں ناں؟ مصوره پلیز! میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے وہاں اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنی ہے۔ پہلے ہی اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میرے کاموں کا خاصا حرج ہو چکا ہے۔"

وہ نرمی اور آہستگی سے دوستانہ انداز میں بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو چلو! ابھی تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔ تم وہاں سے اپنے کپڑے لے لو۔ آج تمہارے اتنی تکلیف ہے۔ میں تمہیں واپس ہوٹل تو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ ویسے تو کل سے آفس جانے کی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہارے ہیڈ آفس والے کیا انسان نہیں ہیں؟ ایک شخص بری طرح زخمی ہو کر بستر پر پڑا ہے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں اسے مشکل ہے وہ آفس کیسے آسکتا ہے؟ لیکن میرے روکنے سے تم نے رکنا تو ہے نہیں۔ اگر سینور سکندر طے کر چکے ہیں کہ کل آفس جائیں گے تو وہ لازماً جائیں گے، لیکن وہ آفس لیزا محمود کے گھر سے جائیں گے۔ یہ میں طے کر چکی ہوں۔"

وہ دوستانہ دھونس بھرے لہجے میں بولی۔

انکار کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ چپ ہو گیا۔

گزرے ماہ و سال کی ایسی بہت سی باتیں بہت سے حادثات یاد آنے لگے تھے، جب وہ اس سے بھی زیادہ شدید زخمی اور بیمار ہو کر تنہا پڑا رہا تھا۔ خیال رکھنا اور پروا کرنا تو دور، اسے ہوا کیا ہے یہ تک پوچھنے کوئی نہیں آیا تھا۔ اب جب دل میں یہ خواہش بھی ختم ہو گئی تھی کہ کوئی اسے پوچھے، اس کا خیال رکھے تب یہ لڑکی نہ جانے کہاں سے زندگی میں آگئی تھی۔ لیزا کا خیال رکھنا نہ اسے اچھا لگ رہا تھا نہ برا۔ اچھا برا تو اس وقت لگتا جب وہ اس رویے کو قبول کر پاتا۔ ابھی تو وہ یہ ہی قبول

[illegible] اس حالت میں رکھا جا سکتا ہے؟ اس [illegible]؟

[illegible] گاڑی اس کے ہوٹل کی پارکنگ میں لاکر روکی تھی۔ اس کا خیال تھا' وہ وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گی مگر وہ اس کے ساتھ اتر کر اندر جارہی تھی۔

"تم صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ مجھے بتاتے رہو' تمہارے کپڑے اور دیگر ضرورت کا سامان کہاں ہے۔" ہوٹل میں اس کے کمرے میں آنے کے بعد وہ اس سے بولی تھی۔

"لیزا میں خود کر..." لیزا نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا تھا۔

"کس بیگ میں چیزیں رکھنی ہیں اور کیا کیا چیزیں رکھنی ہیں۔ جلدی بتاؤ!" ایک بار پھر اس سے ہار مان کر وہ اسے بتانے لگا تھا کہ اس کے کون کون سے کپڑے بیگ میں رکھنے ہیں۔ وہ جلدی جلدی اس کا کوٹ' پینٹ' ٹائی' شرٹ' ٹی شرٹ' جینز وغیرہ بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"لیزا! میں تمہارے خلوص اور دوستی کی دل سے قدر کرتا ہوں' مگر پلیز میں صرف کل کا دن اور رکوں گا تمہارے گھر پر۔ کل کے بعد تم مجھ سے اپنے گھر پر رکنے کے لیے اصرار مت کرنا۔"

وہ دونوں اس کے ہوٹل کے روم سے باہر نکل رہے تھے' جب وہ لیزا سے بولا تھا۔ بیگ میں اس کا سامان رکھنے کے بعد وہ بیگ کندھے پر لٹکا بھی لیزا نے رکھا تھا' باوجود اس کے شدید اصرار کے کہ وہ اسے خود پکڑنا چاہتا ہے۔

☆ ☆ ☆
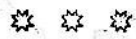
"کھانا لے آؤں سکندر؟"

کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر لیزا نے باہر سے کھڑے کھڑے پوچھا... واپس آنے کے بعد وہ بیڈ پر نیم دراز ہوگیا تھا' اسی نیم دراز انداز میں وہ لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کررہا تھا۔

"میں تمہارے اور تمہاری نینی کے ساتھ باہر ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا۔"

لیزا کے مسکراتے چہرے کو بغور دیکھتے وہ آہستگی سے بولا۔ لیزا یا اس کی نینی کھانے کی ٹرے خدمت پیش کرتی تھیں تو اسے شرمندگی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ان کے ڈائننگ ٹیبل پر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا اسے یہ زیادہ بہتر محسوس ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آجاؤ پھر میں ٹیبل پر کھانا لگاتی ہوں۔"

وہ اس کی فرمائش پر خوش ہوئی تھی۔ وہ پانچ منٹ کے بعد اٹھ کر باہر آیا' اسے لیزا اور اس کی نینی کی آوازیں چونکہ کچن سے آئی تھیں' سو وہ وہیں آگیا۔

"آؤ سکندر! بیٹھو۔" لیزا نے اسے دروازے پر رکتے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ میز پر کوئی ڈش رکھ رہی تھی۔ اس کی نینی کوکنگ رینج کے پاس کھڑی تھیں۔ وہ ڈش میں سالن نکال رہی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مہمان نوازی سے بھرپور انداز میں مسکرائی تھیں۔

لیزا نے جلدی سے اس کے لیے کرسی کھینچی۔

وہ بیساکھی کو ٹائلز پر مضبوطی سے جما کر رکھتے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کرسی پر آکر بیٹھ گیا

"اتنا تیز مت چلو! اور پلیز اس پیر پر وزن ڈال کر مت چلو۔"

لیزا نے فوراً" اسے ٹوکا تھا۔ وہ اس کے زخمی پیر کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ نینی بھی ڈش لے کر آگئی تھیں۔ ڈش میز پر رکھ کر انہوں نے لیزا کے برابر والی کرسی سنبھالی تھی۔

میز پر اطالوی اور پاکستانی دونوں طرح کی ڈشز نظر آرہی تھیں۔ اس نے مشرومز والا پاستا اپنی پلیٹ میں ڈال لیا... لیزا نے سلاد کا پیالا اس کے سامنے کیا بیف کے کباب تھے' وہ اس نے اس کے سامنے رکھے تھے۔

"ہمارے گھر تمہیں حلال گوشت ملے گا... بے فکر ہو کر کھانا کھاؤ۔"

لیزا نے مسکرا کر اس سے کہا' پھر وہ نینی سے مخاطب

لی۔

"پتا ہے نینی امیری اور سکندر کی دوستی کیسے ہوئی تھی؟" وہ کھاتے ہوئے لیزا کو دیکھ رہا تھا۔ "سکندر البرٹو پزیریا میں اپنے لیے پزا آرڈر کررہا تھا' سبزیوں والا۔ زبان کے مسئلے کی وجہ سے سکندر کو آرڈر کرنے میں مشکل ہورہی تھی۔"

"اور تب لیزا نے میری مدد کی تھی۔" مسکرا کر اس نے بات مکمل کی۔

"اس کی اسی طرح سب سے دوستی ہوجاتی ہے۔ بس دو منٹ لگتے ہیں اسے کسی سے بھی دوستی کرنے میں۔"

نینی مسکرا کر بولیں۔ انہوں نے ممتا بھری محبت بھری نگاہوں سے لیزا کو دیکھا تھا۔

"کافی پیو گے ناں؟" ان تینوں نے کھانا ختم کیا' تب لیزا نے اس سے پوچھا۔

"تم بناؤ گی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"آف کورس! میں بناؤں گی۔ نینی! آپ بھی پئیں گی ناں؟"

نینی نے بھی مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آجاؤ بیٹا! ہم لیونگ روم میں بیٹھتے ہیں۔" شفقت سے انداز میں نینی اس سے بولی تھیں۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کرپایا تھا کہ انہیں کیا کہے اس لیے محض "جی" کہتا ان کے ساتھ اٹھا تھا۔ لیزا کچن میں کافی بنارہی تھی کہ وہ اور نینی لیونگ روم میں صوفوں پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ نینی نے ٹی وی آن کردیا۔ ٹی وی کی آواز ہلکی رکھ کر وہ اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ ان کی باتیں لیزا کے متعلق تھیں۔ اس کے بچپن کی باتیں' وہ بچپن سے ہی ان کے کتنے قریب رہی ہے' یہ باتیں۔

"کبھی لگا ہی نہیں یہ میری سگی بیٹی نہیں ہے' اسے میں نے جنم نہیں دیا' جیسے پہلی نظر میں اس نے مجھے اپنی ماں اور میں نے اسے اپنی بیٹی مان لیا تھا۔"

وہ ان کے چہرے پر ممتا کا نور بکھرا دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں کا چہرہ یاد آنے لگا تھا۔ ماں کی آنسوؤں میں بھیگی

آواز کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اسی وقت لیزا ٹرے میں کافی کے مگ لیے [illegible] آگئی تھی۔ [illegible] پیش کرکے وہ خود بھی [illegible] صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ [illegible] نینی لیزا سے کہہ رہی تھیں۔

"آج ساری رات کام مت کرتی رہنا۔ پھر دن میں بھی نہیں لیٹتی ہو۔ تھوڑی بہت دیر تو سوؤ"

وہ اپنا کافی کا مگ ختم کرچکی تھیں۔ اسے اور لیزا کو شب بخیر کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"تم بھی اب آرام کرو لیزا!"

لیزا اس کی دوائیں وہیں لے کر آگئی تھی۔ اس نے دوا اور پانی اسے پکڑایا۔ دوا کھا لینے کے بعد وہ اس سے بولا تھا۔

"ابھی مجھے تھوڑی دیر کام کرنا ہے پھر سوؤں گی۔" لیزا نے مرہم اس کے سامنے رکھا تھا۔

"جیسے کل دوا کھانا اور مرہم لگانا بھول گئے تھے' آج مت بھولنا۔ سونے سے پہلے اسے دونوں ہاتھوں پر لگا لینا۔ اگر تم کہو تو میں لگادوں؟"

"نہیں' میں لگا لوں گا۔ تم اب اپنا کام کرو۔ میں تھوڑی دیر ٹی وی دیکھنا چاہتا ہوں۔ نیند آئے گی تو سونے چلا جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر یقین دلانے والے انداز میں بولا۔

"اوکے! گڈ نائٹ۔" وہ مسکراتے ہوئے لکڑی کے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں جارہی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے مرہم نہیں لگایا تھا' جان بوجھ کر نہیں' بس اسے دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ اپنے نخرے اٹھانے کی عادت جو نہیں تھی۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ کوئی اٹالین اطالوی مووی تھی جو وہ دیکھ رہا تھا۔ آواز اس نے بالکل بند کررکھی تھی۔ بس خاموش فلم دیکھ رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی' وہ کوشش کررہا تھا کہ نیند آجائے۔ دو تین بار وہیں آنکھیں بند کرکے بھی لیٹا تھا مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے سیڑھیوں پر سے کسی کے اترنے کی آواز آئی تھی۔ لیزا نیچے آرہی تھی

۔ چکر دار سیڑھی پر چند زینے اترنے کے بعد لیزا کو لیونگ روم نظر آنے لگا تب اس کی سب سے پہلے اسی پر نظر پڑی تھی۔

"کیا ہوا؟ تم سوئے نہیں؟" حیران پریشان سی تیزی سے اتر کر نیچے اس کے پاس آئی تھی۔

وہ جوابا" دھیمے سے مسکرایا تھا۔

"ہاں! نیند نہیں آرہی۔" لیزا کی نگاہیں وال کلاک پر گئی تھیں، جو رات کے تین بجا رہی تھی۔

"لیکن تمہاری میڈیسنز میں نیند کی دوا شامل ہے۔ وہ کھا کر تو نیند آنی چاہیے تھی۔"

"مجھے نیند بہت مشکل سے آتی ہے لیزا! دراصل مجھے انسومنیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے سچ بولا تھا۔

"اوہ! پھر آج تمہیں ہسپتال میں ڈاکٹر کو یہ بات بتانی چاہیے تھی۔ وہ پھر تمہیں اس لحاظ سے کوئی اور میڈیسن دیتا۔"

"مجھے یہ تکلیف بارہ سال سے ہے لیزا! اور کسی علاج اور کسی دوا سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں عادی ہو گیا ہوں راتوں کو جاگنے کا۔ تم میری فکر مت کرو۔ جا کر آرام کرو۔"

اپنی یہ اتنی ذاتی بات اس نے آج تک کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی، جو دیار غیر میں ملنے والی اس اجنبی لڑکی کو بتا رہا تھا۔ کوئی ضرورت نہیں تھی سچ بتائے جانے کی وہ کہہ سکتا تھا کہ ہاں، آج نیند نہیں آرہی، مگر پھر بھی اس نے سچ بولا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ کارپٹ پر [illegible] رکھا فلور کشن لیزا نے کھینچ کر صوفے کے [illegible] اور اس پر بیٹھ گئی۔

[illegible] اس قدر دکھی کیوں رہتے ہو سکندر؟"

[illegible] آواز میں اس نے پوچھا تھا۔ وہ اسے [illegible] تھی۔

[illegible] تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

[illegible] کبھی دل سے ہنستے نہیں دیکھا۔ [illegible] بھی تمہاری آنکھیں، تمہاری ہنسی [illegible] رہی ہو تیں۔ تمہاری آنکھوں میں [illegible] لگرمیں آتی سکندر!"

اس کا انداز تجسس لیے ہوئے نہیں تھا، اس انداز میں دکھ تھا جیسے وہ اسے دکھی دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی۔

"شاید اس لیے کہ میری زندگی میں خوش ہونے کے لیے کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔"

دن کی روشنی میں وہ شاید یہ بات کبھی نہ کہہ پاتا، رات کی خاموشی اور تنہائی میں کہہ گیا تھا۔

"خوش ہونے کے لیے وجہ ڈھونڈو گے تو کبھی خوش نہیں ہو سکو گے۔ میری زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ ہے جسے اگر میں ہر وقت سوچنا شروع کر دوں تو ایک لمحے کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی، مگر تم دیکھتے ہو میں کتنا خوش رہتی ہوں۔" اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"ہاں اور میری دعا ہے تم ہمیشہ اسی طرح خوش رہو، ہنستی مسکراتی رہو۔ تمہیں دیکھ کر زندگی سے پیار کرنے کا دل چاہنے لگتا ہے۔"

"تو کرو ناں زندگی سے پیار سکندر! زندگی بہت خوب صورت ہے۔ خوشی کو، رنگوں کو اور زندگی کو اندر محسوس تو کر کے دیکھو۔" وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔

"آج جو فون آیا تھا، تم اس سے دکھی ہو ہو ناں؟" وہ آہستہ آواز میں نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بہت۔" جواب دیتے ہوئے اس نے لیزا سے نظریں ہٹالی تھیں۔ چہرہ سیدھا کر کے آنکھیں بند کرلیں، وہ اپنی آنکھوں میں ابھرتے آنسو اس سے چھپا لینا چاہتا تھا۔ اتنا سخت جان ہو جانے کے بعد یہ آنسو کیوں چلے آتے تھے آنکھوں میں۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔

"تم نے آئنٹمنٹ لگا لیا تھا؟" اسے لیزا کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اسی طرح اس کے نزدیک بیٹھی تھی۔

"نہیں۔" اس نے اسی طرح آنکھیں بند کیے جواب دیا۔ اسے اپنے نزدیک سے ابھرتی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میز پر سے مرہم کی ٹیوب اٹھا رہی ہے۔ ایک سیکنڈ بعد بغیر کچھ کہے اس نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ کہنی سے لے کر کلائی تک [illegible]

اس کے ہاتھ پر مرہم لگا رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔
"دکھاؤ میرے جسم پر نہیں میری روح پر لگے ہیں۔
کوئی مرہم لگا سکتی ہو تو ان زخموں پر لگاؤ۔"
وہ چپ چاپ آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا۔ وہ اس کی
انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کر رہا تھا۔ کب وہ
پہلے ہاتھ پر مرہم لگا چکی تھی' کب اس نے دوسرے
ہاتھ پر مرہم لگایا تھا۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ کس
وقت اس کی آنکھ لگی تھی' اسے یاد نہیں تھا۔
اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ صبح کے سات
بج رہے تھے۔ وہ تین بجے سے سات بجے تک پورے
چار گھنٹے اتنی بے خبری کی نیند سو گیا۔
اس نے صوفے پر کروٹ لینے کی کوشش کی تو وہاں
لیزا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ صوفے پر اس کے
نزدیک فلور کشن پر اسی طرح بیٹھی تھی' اس کا سر
صوفے پر اس کے ہاتھ کے نزدیک بالکل کنارے پر ٹکا
تھا۔ وہ صوفے کے کنارے پر سر ٹکائے گہری نیند
سو رہی تھی۔ گویا وہ رات اس کے سو جانے کے بعد بھی
اس کے پاس سے اٹھ کر نہیں گئی تھی۔
وہ چند سیکنڈ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ وہ صوفے
سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس نے
اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی چوکس سی نیند سے بیدار
ہوئی۔ فوراً" سیدھی ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے
دیکھا تھا۔
"گڈ مارننگ سینورا لیزا۔ میری وجہ سے پوری
رات بے آرام ہو کر گزار دی تم نے؟"
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ مسکرا کر آنکھوں میں نرمی
لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی آنکھوں میں نیند بھری
تھی۔ بالوں کو ہاتھوں سے لپیٹ کر جوڑے کی سی شکل
دیتے وہ آہستگی سے ہنسی تھی۔
"اس طرح سونے کا ارادہ تو نہیں تھا' پتا نہیں کیسے
آگئی۔ تمہیں نیند آئی ناں؟"
"ہاں بہت پرسکون اور گہری نیند سویا ہوں میں۔"
"تمہاری اداسی کم ہوئی؟"
"ہاں۔" وہ مسکرا کر جواب دیتا صوفے سے اٹھ گیا

لیزا بھی اس کے ساتھ ہی فلور کشن سے اٹھی تھی۔

"میں تیار ہو جاؤں؟ آفس تھوڑا جلدی جانا چاہ رہا ہوں۔"

لیزا نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ بیساکھی کا سہارا لے کر چلتے ہوئے کمرے میں آگیا۔ وہ تیار ہو کر باہر نکلا تو کچن میں میز پر ناشتا لگائے لیزا اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"نینی! صبح نماز کے بعد دوبارہ سو جاتی ہیں۔ صبح نہ انہیں کہیں جانا ہوتا ہے' نہ مجھے' اس لیے ہمارے فلیٹ میں صبح ذرا دیر سے ہوتی ہے۔" وہ ناشتا خود تیار کرنے کی وجہ اسے بتا رہی تھی۔

"تم نے کیوں زحمت کی لیزا۔ میں ناشتا آفس جا کر کر لیتا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا' تمہیں مسلسل میری وجہ سے بے آرامی۔۔۔"

"یہ جذباتی جملے بعد میں بول لینا' پہلے ناشتا کر لو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ یہ چیز آملیٹ کھاؤ' تمہیں ضرور اچھا لگے گا۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنایا ہے۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً" بولی تھی۔ اس نے چھری کانٹا اس کے سامنے کیے تھے۔

"کھاؤ!" وہ چیز آملیٹ کھانے لگا تھا۔ وہ کرسی پر اس کے سامنے بیٹھی اسے کھاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ میز پر جمائے وہ اسے پیار بھری نظروں سے کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر اس طرح مسکرا کیوں رہے ہو۔ بتاؤ مجھے؟" وہ بضد ہوئی تھی۔

"جس طرح تم مجھے کھاتے ہوئے پیار سے دیکھ رہی ہو' اس طرح پیار سے مائیں اپنے بچوں کو کھاتا ہوا دیکھتی ہیں۔"

بولتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ لیزا قدرے جھینپ کر ہنسی۔

"سچ کہہ رہا ہوں تمہارے دیکھنے اور فکر کرنے کا انداز بالکل ماں جیسا ہوتا ہے۔"

وہ اس کے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔

"اچھا! اب میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں سچ میں تمہاری فکر کرتی ہوں۔" وہ اس کے مسلسل مسکرانے پر قدرے خفت بھرے انداز میں بولی۔

"مجھے پتا ہے۔" اس کی طرف دیکھ کر وہ یک دم سنجیدگی سے بولا۔

"اب تم لیٹ کر سو جاؤ۔ مجھے لینے آفس سے گاڑی آئے گی۔" چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے جب وہ اٹھنے لگا' تب اس سے بولا تھا۔

اسے معلوم تھا وہ اسے آفس چھوڑنے کے لیے ہر حال میں جائے گی' اس لیے اس نے تیار ہونے کے دوران ہی فون کر کے آفس کی گاڑی بلوائی تھی۔

"ٹھیک ہے! لیکن شام میں' میں تمہیں لینے آؤں گی۔"

"ایسا نہ کرو تو بہتر ہے۔ میرا آفس میں دیر تک رکنے کا ارادہ ہے۔"

"تمہیں جب تک بھی رکنا ہے' رکو' مگر لینے میں ہی آؤں گی۔" وہ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں بولی تھی۔ اس نے قدرے بے چارگی سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼
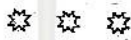
آفس میں جو اسے دیکھ رہا تھا' خیریت پوچھ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا' باقی اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ اسی رفتار سے اپنے کام نبٹا رہا تھا جیسے نبٹایا کرتا تھا۔ لنچ کا اسے ہوش نہ رہا تھا۔ وہ اتنے دنوں کے تمام سب کاموں کو مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ وہ شام ساڑھے سات بجے تک آفس میں رہا تھا۔ لیزا نے پھر فون کر کے اس کی واپسی کا ٹائم پوچھا تھا۔ وہ باہر نکلا تو وہ گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی

تھی۔

"تمہیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟"

"نہیں میں ابھی پانچ منٹ پہلے ہی پہنچی ہوں۔ تم بتاؤ! طبیعت کیسی ہے؟ میری نصیحتوں کا کچھ اثر تو ہوا نہیں ہوگا تم پر۔ خوب خود کو تھکایا ہوگا۔ انسان اتنا ضدی بھی نہ ہو۔ آفس جانا ہے تو جانا ہے۔ دیر تک رکنا ہے تو رکنا ہے۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کچھ خفگی سے بولی وہ اس کے آفس اتنی دیر تک رکنے پر ناراض تھی۔

"ہاں جیسی میری پروا کرنے والی سینورا لیزا! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بالکل ٹھیک ہوں۔ کہیں درد تکلیف کچھ نہیں ہو رہا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تم سارا دن کیا کرتی رہیں؟"

سڑک پر ٹریفک اور لوگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"دوپہر تک سوتی رہی اس کے بعد شام تک پینٹنگ کرتی رہی۔ بیچ میں سیم سے اور اپنی ایک دوست سے فون پر باتیں بھی کیں۔" ٹریفک جام میں پھنس کر انہیں گھر پہنچتے ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔

"تم فریش ہو جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں کھانا تیار ہوا کہ نہیں۔ کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ ڈنر کرتے ہیں۔"

فلیٹ میں آنے کے بعد لیزا اس سے بولی تھی۔ وہ سر ہلاتا کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
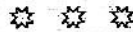
"بہت مزے کی بریانی بنائی ہے آپ نے۔" نینی نے ڈنر میں بریانی بنائی تھی۔ ساتھ رائتہ، سلاد اور میٹھے میں شاہی ٹکڑے۔ اسے کھانا پسند تو آ رہا ہے، انہوں نے اس سے یہ پوچھا تب وہ خوش اخلاقی سے تعریفی جملہ بولا تھا۔

"لیزا نے کہا تھا تمہارے لیے کوئی پاکستانی ڈش بناؤں۔" وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

"میں واقعی گھر کے بنے پاکستانی کھانوں کو بہت مس کر رہا تھا۔"

وہ یونہی خوش اخلاقی کے اظہار کے طور پر بولا تھا۔ ورنہ پاکستانی، چینی، جاپانی وہ کسی بھی طرح کے کھانوں کو نہ تو سوچتا تھا نہ یاد کرتا تھا۔ وہ کھانا اس لیے کھاتا تھا کہ کھڑا ہو سکے، چل پھر سکے، اپنے تمام کام انجام دے سکے۔ کھانے کو ذائقے اور مزے کے لیے بھی کھایا جاتا ہے اسے بھول چکا تھا۔

"کیوں؟ تمہارے گھر میں تو بنتے ہوں گے پاکستانی کھانے؟"

نینی نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً پوچھا تھا۔ اس کا چہرہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مسکراہٹ چہرے پر سے چلی گئی تھی۔

"جی!" اس نے یک لفظی انتہائی مختصر ترین جواب دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگا جیسے لیزا کی نینی نے یہ بات جان بوجھ کر نکالی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ لیزا انہیں ناراضی سے دیکھتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس سے اس کی فیملی کے بارے میں کوئی بات نہ کریں مگر انہوں نے لیزا کے اشارے سراسر نظر انداز کر کے اس سے مزید پوچھا تھا۔

"خیر سے شادی ہوئی بیٹا؟"

"نہیں۔"

"منگنی وغیرہ۔۔۔"

"فی الحال تو وہ بھی نہیں ہوئی۔" وہ زبردستی مسکرایا تھا۔

اسے ان کے سوالات سے شدید الجھن ہو رہی تھی، وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا کی نینی اسے بغور دیکھ رہی ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ اس سے مزید کوئی ذاتی سوال کرتیں لیزا نے جلدی سے گفتگو کا موضوع تبدیل کیا تھا۔

"نینی! اب سوئٹ ڈش بھی سرو کر دیں۔ میں نے شاہی ٹکڑوں کے لالچ میں کھانا بھی کم کھایا ہے۔"

لیزا کے کہنے پر وہ فوراً کرسی پر سے اٹھی تھیں۔

اس کے بعد لیزا نے اس طرح بغیر رُکے ایک کے بعد ایک غیر متعلقہ اور فضول قسم کی باتیں 'شروع کی تھیں کہ اس کی نینی اگر اس سے مزید کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھیں' تب بھی انہیں اس کا موقع نہیں ملا تھا۔

☆ ☆ ☆
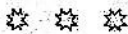
اگر اسے اندازہ ہوتا نینی کھانے کے دوران سکندر سے اس طرح کے نامناسب سوال کریں گی تو وہ سکندر کے ساتھ کمرے ہی میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتی۔ پتا نہیں نینی کو ہوا کیا تھا۔ وہ اچھی خاصی سمجھ دار خاتون تھیں' ان کی سمجھ داری پر بھروسا کرتے ہوئے اس نے انہیں بہ طور خاص یہ تاکید کی ہی نہیں تھی کہ خدارا سکندر سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات نہ کیجیے گا۔ کاش وہ انہیں تاکید کر ہی دیتی۔

سکندر اپنی ذاتی زندگی سے متعلق گفتگو کو ناپسند کرتا تھا' کہیں وہ برا نہ مان گیا ہو' کہیں اس کا موڈ نہ خراب ہو گیا ہو؟

کھانے کے بعد سکندر کے کسی کولیگ کا دوبارہ فون آ گیا تھا۔ وہ اس سے دفتری امور پر کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اسے لیونگ روم میں فون پر بات کرتا چھوڑ کر کچن میں اپنے اور اس کے لیے گرین ٹی بنانے آئی تھی۔ اگر اسے نیند نہ آنے کی شکایت تھی تو پھر سونے سے پہلے کافی پینا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ کچن میں نینی بچا ہوا کھانا فریج میں رکھ رہی تھیں۔

"کافی کا موڈ ہے؟ لاؤ میں بنا دوں؟" اسے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

"گرین ٹی بنا رہی ہوں نینی! میں بنا لوں گی۔ آپ اس کے بعد آرام کیجیے۔"

وہ کیبنٹ کھول کر گرین ٹی کے ٹی بیگز نکالنے لگی تھی۔ کام کرتے کرتے ہی اس نے انہیں مخاطب کیا

"نینی! آپ سے ایک بات کہوں؟"

"نینی! سکندر کو میں بضد ہو کر' بہت اصرار کر کے یہاں لائی ہوں۔ وہ ہوٹل سے یہاں آنے کے لیے کسی بھی طرح راضی نہیں تھا۔ اب میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں کسی بھی طرح کی کوفت یا الجھن محسوس کرے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ذاتی زندگی یا فیملی کے بارے میں اس سے بات کی جائے یا پوچھا جائے۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک حد سے زیادہ اس سے بے تکلف نہ ہوا جائے تو ہمیں اس کی اس خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے گھر پر مہمان ہے نینی!"

"کیا سکندر نے تم سے کچھ کہا ہے؟" نینی کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں وہ کچھ نہیں بولا مگر میں یہ بات پہلے سے جانتی ہوں۔"

"ویسے تو میرے خیال سے میں نے کوئی غلط بات نہیں کی لیکن پھر بھی اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو اب اس کی فیملی اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔"

"تھینکس نینی!" وہ مسکرا کر گرین ٹی بنانے لگی تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنا کام کرتے کے دوران نینی گاہے گاہے اسے بغور دیکھ رہی ہیں' جیسے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"گرین ٹی۔" وہ ٹرے میں کپ رکھ کر لیونگ روم میں آئی تھی۔ سکندر کی فون پر بات ختم ہو چکی تھی۔

"تھینکس۔" اس نے مسکراتے ہوئے ٹرے میں سے کپ اٹھایا تھا۔ اس کے مسکرانے پر اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی تھی' اسے برا تو یقیناً لگا تھا مگر کم از کم وہ ناراض تو نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے پر اپنا کپ لے کر بیٹھ گئی۔

"تمہارا یہ لکڑی کا زینہ مجھے بڑا خوبصورت لگا ہے۔ یہاں لیونگ روم کے ساتھ یہ بڑا آرٹسٹک لک دیتا ہے۔"

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ سیڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔ لیزا نے بھی گردن گھما کر اس طرف دیکھا' وہ مسکرائی تھی۔

"پتا ہے یہ اپارٹمنٹ میں نے اس زینہ ہی کی وجہ سے خریدا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ پرانی موویز میں ہوتے ہیں ناں ایسے گھر' ایسے لکڑی کے گول زینے۔"

"ضرور اسی وجہ سے خریدا ہو گا۔ تم آرٹسٹ لوگ اسی طرح کے ہوتے ہو' پسند آگئی تو کوئی معمولی سی چیز' نہیں آئی تو عالیشان سے عالیشان چیز بھی نظروں میں نہیں سماتی۔" وہ مسکراتے ہوئے بول رہا تھا۔ "یہیں سے اوپر جا کر ہے ناں تمہارا اسٹوڈیو؟"

"ہاں! دیکھو گے تم؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل دیکھوں گا۔ میں نے تو تم سے پرسوں رات بھی کہا تھا' میں تمہارا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں اوپر چڑھ کر جانے میں کوئی مشکل تو نہیں ہو گی؟" ان دونوں نے چائے کے کپ خالی کر کے واپس رکھے تب اس نے سکندر سے پوچھا۔ وہ جواباً" ہنسا تھا۔

"مجھے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ چلو! دکھاؤ مجھے اپنا اسٹوڈیو' اپنی پینٹنگز۔"

وہ دونوں اوپر آ گئے تھے۔ سکندر نے بڑے آرام سے بیساکھی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھی تھیں۔ وہ اوپر آ کر چپ چاپ کھڑی سکندر کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ ویسے تو وہ ایک بار اسے بتا چکا تھا کہ اسے آرٹ میں قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں ہے' مگر وہ آرٹسٹ تھی' اپنے آرٹ کی قدر افزائی چاہتی تھی۔ سکندر نظریں گھما کر ارد گرد مختلف جگہوں پر رکھی اس کی مکمل اور نامکمل پینٹنگز کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک پینٹنگ کو بغور دیکھ رہا تھا' جس پینٹنگ پر وہ آج شام تک کام کرتی رہی تھی' وہ اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا۔ اس پینٹنگ میں اس نے خزاں کے موسم کی عکاسی کی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس آ گئی تھی۔

"ویسے تم بڑی نان سیریس سی لگتی ہو۔ مگر تمہاری پینٹنگز تمہیں ایک بہت ہی مختلف انسان کے طور پر ظاہر کر رہی ہیں۔" وہ پینٹنگ پر نظریں مرکوز کیے اس سے بولا۔

"یعنی؟"

"یعنی بہت سینسیٹو' اپنے اندر کی دنیا لوگوں سے چھپانے والی۔"

بولنے کے دوران چلتا ہوا وہ ایک دوسری پینٹنگ کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تھا جس میں اس نے روم کی ایک اداس شام اور ایک تنہا لڑکی کو پینٹ کیا تھا۔

"تمہیں آرٹ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' پھر بھی تم تبصرہ اور تجزیہ تو ایسے کر رہے ہو میری پینٹنگز پر جیسے بہت جانتے ہو۔"

وہ اس کی بات کی تردید یا تصدیق کیے بغیر مسکرا دیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکیوں اور دروازے پر پڑے مخملیں پردے ہٹانے لگی۔

"آؤ! میری بالکونی بھی دیکھو۔" اس نے شیشے کا سلائیڈنگ ڈور بھی کھول دیا تھا۔ کچھ دیر قبل بارش ہونا شروع ہوئی تھی' موسم بے حد خوبصورت تھا۔

"جب بھی میں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو کافی کا کپ لے کر یہاں بیٹھ جاتی ہوں۔" اس نے بالکونی میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"صرف تمہارا لکڑی کا زینہ ہی نہیں بلکہ تمہارا اسٹوڈیو اور یہ جگہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ یہاں سے تمہارے روما کا نظارہ بھی بہت خوبصورت ہے۔" وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہو کر سڑکوں اور بلند و تاریخی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی جواباً" مسکرائی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے کھڑے برستی بارش کو دیکھ رہے تھے۔ روم کی سڑکوں اور عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔

"کل تم اپنے ہوٹل واپس چلے جاؤ گے؟"

"ہاں! کافی دن تمہارا مہمان بن گیا۔ کل صبح آفس جاؤں گا' وہاں سے شام میں ہوٹل۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

"ٹھیک ہے! میں تم سے اب اور رکنے پر اصرار نہیں کر رہی' لیکن پلیز تم ہوٹل جا کر اپنا خیال رکھنا۔"

"میں اپنا خیال رکھوں گا مصورہ! آپ فکر نہ

کریں۔"

"ہم اب کب ملیں گے؟" اس نے سنجیدگی سے سکندر کو دیکھا۔

"جب تم چاہو۔"

"میں تو یہ چاہوں گی کہ تم مجھ سے کل ہی ملو۔" وہ مسکرا کر بولی۔۔۔ سکندر بے ساختہ ہنسا تھا۔

"تم سے پینٹنگ بنوائے بغیر میں کہیں نہیں بھاگنے والا۔ اطمینان رکھو۔ مجھے پتا ہے روز ملنے کی بات اسی لیے کی جا رہی ہے کہ سینیورا لیزا کو میری وعدے کی پاس داری پر شکوک و شبہات ہیں۔"

"تم اتنی مشکل اردو مت بولو، سمجھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ بے چارگی سے۔۔۔ بولی تھی گویا سکندر کے جملے میں شامل کچھ الفاظ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔

کچھ دیر مزید وہاں کھڑے رہ کر بارش، روم کی سڑکیں اور روم کی رات کو انجوائے کرتے رہنے کے بعد وہ دونوں نیچے آ گئے تھے۔ لیزا اس کے ساتھ کمرے میں آئی تھی۔ وہ اسے دوا اور پانی دے رہی تھی۔ ایک ٹیبلٹ جو وہ دن میں دو بار لے رہا تھا اس کی آج رات اور کل صبح کے لیے ملا کر بس دو ہی ٹیبلٹس بچی تھیں۔

"کل فارمیکیا سے یہ ٹیبلٹ یاد سے خرید لینا۔" وہ کرسی پر بیڈ سے نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔

"لے لوں گا۔" مسکرا کر اسے جواب دیتے ہوئے اس نے پانی سے دوا نگلی تھی۔

"تم سو جاؤ اب جا کر۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"تم چاہو تو میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہوں۔ تم اکیلے لیٹ کر پتا نہیں کیا کیا الٹا سیدھا سوچتے رہتے ہو، ڈپریسڈ ہوتے ہو اور پھر تمہیں نیند نہیں آتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"آج میں سینیورا لیزا محمود اور ان کی پینٹنگز کو سوچتے ہوئے سوؤں گا۔" وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"اتنی خوبصورت چیزیں سوچو گے تب تو خوب پرسکون آئے گی اور خواب بھی بڑے آئیں گے۔"

وہ اس کے شرارتی انداز کا شرارت بھرے انداز میں جواب دیتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

صبح وہ تو وقت پر اٹھ ہی گئی تھی، نینی بھی اٹھ گئی تھیں۔ انہیں پتا تھا آج سکندر اپنے ہوٹل واپس چلا جائے گا اور وہ یقیناً "اپنی رات کی کہی بات کا ازالہ کرنا چاہتی تھیں۔ اسے نینی کی خود سے محبت پر بے حد پیار آیا تھا۔ وہ سکندر سے پوچھے اپنے سوالوں کو بالکل بھی غلط نہیں سمجھ رہی تھیں۔ مگر چونکہ وہ اسے پسند نہیں آئے تھے، سوائے خوش کرنے کو وہ صبح صبح سکندر کے لیے خوب اہتمام سے ناشتا تیار کر رہی تھیں۔

سکندر نے اور اس نے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا تھا۔ نینی گرم گرم پراٹھے توے سے اتار اتار ان دونوں کو قیمے اور آلو کی بھجیا کے ساتھ کھانے کے لیے لا کر دے رہی تھیں۔

"آپ کو بہت زحمت ہوئی میری وجہ سے۔" رخصت ہوتے وقت سکندر نینی کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کا انداز مہذب اور پر تکلف تھا۔

"مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی ہے۔ میری بیٹی کے دوست ہو تم۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک روم میں ہو، جب دل کرے آ جایا کرو۔"

پر شفقت انداز میں بولتے ہوئے انہوں نے سکندر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔۔۔ سکندر نے آج بھی جانے کے لیے آفس کی گاڑی منگوائی ہوئی تھی۔

"تمہارا شکریہ نہیں ادا کر رہا ہوں۔" وہ دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ سکندر سنجیدگی سے اس سے بولا تھا۔

"بہت اچھا کر رہے ہو، اگر کرتے تو مجھے بہت برا لگتا۔"

☆ ☆ ☆

"وہ آفس میں تھا۔ لنچ ٹائم تھا مگر وہ کاموں میں مصروف تھا۔ بغیر ناشتے کے لنچ کا دھیان نہیں رہا کرتا تھا لیکن جب کہ اس نے خاصا ٹھیک ٹھاک ناشتا کر رکھا تھا لنچ کا خیال بھی کیسے آتا۔ وہ ایک کانٹریکٹ ڈرافٹ کر رہا تھا جب اس کے موبائل پر لیزا کی کال آئی۔

"کیسی ہو مصورہ؟" اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی تھی۔ نظریں لیپ ٹاپ سے ہٹالی تھیں اور کرسی سے ٹیک لگا کر اطمینان بیٹھ گیا تھا گویا فرصت سے گپ شپ کے لیے تیار ہو۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنا بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟ زیادہ تھکا تو نہیں رہے خود کو؟ زیادہ چل پھر تو نہیں رہے؟ لنچ کیا؟ میڈیسن خریدلی؟"

وہ اس کے ایک سانس میں اتنی ساری باتیں بیک وقت پوچھنے پر ہنس پڑا تھا۔

"یا خدا لیزا! تم تو واقعی بنی بنائی ماں ہو۔ میرے لال نے کھانا کھایا اور تھکا تو نہیں۔ اس طرح کی فکریں تو صرف ماں ہی کرتی ہے۔"

"بات کو گھماؤ نہیں۔ میرے سوالوں کا جواب دو۔" وہ قدرے ناراضی سے بولی گویا اپنا مذاق اڑائے جانے پر خفا ہوئی ہو۔

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ پراٹھوں والے اتنے ہیوی ناشتے کے بعد لنچ کون کر سکتا ہے لڑکی؟ اور میڈیسن شام میں آفس سے جاتے ہوئے خرید لوں گا۔"

وہ میڈیسن ختم ہوگئی ہے اس بات کو سراسر بھول چکا تھا۔ اب لیزا کے یاد دلانے پر یاد آیا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن خرید لینا یاد سے۔ پتا نہیں خود کو اس طرح اگنور کرنے کی عادت کیوں ہے تمہیں؟"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ اس کے مسکراتے لب یک دم ہی سنجیدہ ہوگئے تھے، چہرے پر درد سے بھرا ایک تاثر ابھر آیا تھا۔ خود کو مزید زیر بحث لائے جانے سے بچنے کے لیے اس نے فوراً" پوچھا۔

"آج تم کیا کر رہے ہو؟ کیا کسی وقت تم ... وہ ... دوستوں سے ... ہے؟"

"شام تک ایک میٹنگ میں بزی رہوں گا اور رات میں ایک ڈنر میں جانا ہے۔"

اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اور مصروفیت نہ ہوتی تو وہ اس سے ضرور ملتا مگر میٹنگ بھی ضروری تھی اور آفیشل ڈنر بھی۔ یہ میٹنگ اس کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ملتوی ہونے کے بعد آج ہو رہی تھی۔ اس کے بعد یہاں کمپنی کے ایک ایگزیکٹو کے گھر رات میں ڈنر پر جانا تھا۔

"گویا آج ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے؟" اسے لیزا کے لہجے میں مایوسی کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی۔

"ہاں! آج اور کل میں تھوڑا بزی رہوں گا۔ پرسوں کا کوئی پروگرام رکھ لیتے ہیں۔"

اب لیزا سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ ہمیشہ بے تکلف ہوتا تھا۔ جس طرح باقی لوگوں سے وہ خود کو بہت فاصلے پر رکھ کر ملتا تھا اس طرح اس سے نہیں مل پاتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بالکل اسی طرح ملتا تھا جیسا وہ تھا۔ اگر وہ خوش ہوتا تھا تو اپنی خوشی اس پر ظاہر ہو جانے دیتا تھا اگر اس کا موڈ خراب ہوتا، وہ اداس اور دکھی ہوتا، تب بھی اپنی یہ کیفیات اس سے چھپا نہیں پاتا تھا۔

وہ کل رات بھی سو نہیں پایا تھا مگر لیزا سے مذاق میں کہی ہوئی بات پر عمل کرتا وہ اسے اور اس کی پینٹنگز کو سوچتا رہا تھا۔ نیند اسے بے شک نہیں آئی تھی مگر وہ روزانہ کی طرح بے سکون اور مضطرب بھی نہیں رہا تھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد سے کبھی ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا سے نیند آجاتی تھی اور کبھی نہیں، وہ اس مسئلے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اسے اتنے دنوں سے وہ خواب نظر کیوں نہیں آرہا۔ وہ آج کل اتنا پرسکون اور مطمئن کیسے ہے؟

☆ ☆ ☆

وہ اور ام مریم واشنگٹن میں تھے۔ شہریار خان اور امو جان ان دونوں کی آمد سے بہت خوش تھے۔ سکندر چھٹیوں کے آغاز میں اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے چلا گیا تھا۔ اسے دو تین روز بعد آنا تھا۔
سکندر کے آنے یا نہ آنے سے اسے کوئی فرق پڑتا نہیں تھا' اس لیے اس نے تو یہ پوچھا تک نہیں تھا کہ سکندر کہاں گیا ہے اور کب آئے گا۔ یہ معلومات امو جان نے اسے اور ام مریم کو اس کے پوچھے بغیر فراہم کی تھیں۔
ام مریم اس کے ماں' باپ کے دل تو پہلے ہی جیت چکی تھی' اب یہاں ان کے گھر آکر' ان لوگوں کے ساتھ رہ کر وہ ان دونوں سے مزید قریب ہو گئی تھی۔ خود اعتماد وہ بلا کی تھی' اس لیے پہلی بار اپنی سسرال آنے پر نروس تھی نہ شہریار خان کی رعب دار شخصیت سے خائف۔
"آنٹی! میں کافی بنا کر لاؤں؟"
رات کے کھانے کے بعد امو جان ان کے پاکستانی ملازم گلزار کو کافی لانے کا کہنے لگیں تب وہ ان سے بولی تھی۔
امو جان اس کے خود کو گھر کا فرد سمجھنے کو پسند کرتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ شہریار خان کھانے کی میز سے اٹھ کر جا رہے تھے۔
"انکل! آپ کافی نہیں پئیں گے؟" باپ کا رعب اور دبدبہ اس پر اتنا تھا کہ وہ ساری زندگی بھی ان سے اس طرح بے تکلفی سے بات نہیں کر سکا تھا جیسے ام مریم کر رہی تھی۔
اس نے ام مریم کی خود اعتمادی کو پیار سے دیکھا۔ وہ شہریار خان کی شخصیت کے رعب میں نہیں آئی تھی' وہ عزت اور احترام لیے بے تکلفی سے ان سے اسی طرح بات کر رہی تھی جیسے اپنے والد اور چچا سے کرتی تھی۔
"میری کافی اسٹڈی میں بھجوا دینا مریم!"
وہ خلاف عادت مسکرا کر اور نرمی سے بولے۔
حیرت سی حیرت تھی' اس نے اپنے باپ کو بہت ہنستے اور مسکراتے دیکھا تھا۔ باہر دفتری حوالے لوگوں سے ملتے ہوں گے تو مسکرا لیا کرتے ہوں گے' گھر پر تو بلا ضرورت انہیں مسکراتے اور بات کرتے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔
"آپ ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھیں گے نہیں؟ لوگ دوپہر سے آئے ہوئے ہیں۔ آنٹی سے تو میری خوب باتیں ہو گئیں۔ میں سوچ رہی تھی آپ سے شام میں ملاقات ہو گی' تب باتیں کروں گی آپ سے بھی۔"
شہریار خان ہونے والی بہو کے بے تکلفانہ انداز پر مسکراتے ہوئے بولے تھے۔
"کافی بنا کر لے آؤ' پھر کر لیتے ہیں باتیں۔" وہ لیونگ روم میں اس کے اور امو جان کے ساتھ آکر بیٹھ گئے تھے۔
ام مریم کافی بنا کر لے آئی تھی۔ امو جان کو اگر اس کے ہاتھ کی بنائی کافی پسند آئی تھی تو شہریار خان اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے خوش نظر آ رہے تھے۔ کیمپس میں جن تنظیموں اور کلبز کی وہ ممبر تھی شہریار خان اس سے ان کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ آگے کیا پڑھنا چاہتی ہے' کیا کیا کچھ کرنا چاہتی ہے' وہ انہیں بتا رہی تھی۔ وہ بظاہر کافی پیتے ہوئے امو جان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا مگر اس کے کان شہریار خان اور ام مریم کی گفتگو پر لگے تھے۔
"کافی ٹھیک ٹھاک طریقے سے امپریس کر چکی ہیں آپ میرے ایروگینٹ بابا کو۔" رات جب وہ ام مریم کو اس کے کمرے میں چھوڑنے جا رہا تھا تب مسکرا کر بولا تھا۔
"اور ان کے بیٹے کو؟" مریم کا سوالیہ انداز شرارت لیے ہوئے تھا۔
"وہ بے چارہ تو آپ پر پورا کا پورا نثار ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔ ام مریم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے پاپا کو اپنی ہونے والی بہو دل و جان سے پسند آگئی تھی اور وہ اس کی ساتھ بیٹھ کر کافی پینے کی خواہش رد نہیں کر پائے تھے۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ہی وہ ام مریم کو لے کر گھومنے نکل گیا تھا۔ شہریار خان اپنے آفس چلے گئے تھے۔ گھر پر اموجان تھیں۔ وہ دونوں سارا دن گھومتے رہے تھے۔

"تم بور تو نہیں ہو رہیں مریم؟ تمہیں میرے گھر آکر مزا آرہا ہے؟"

اس کا ہاتھ تھام کر سبزے پر چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں یار تھوپ پارک کے فلاور گارڈن میں آئے ہوئے تھے۔

اردگرد بے شمار اور بے حساب پھول ہی پھول تھے دلکش اور خوشنما پھول۔ رنگوں، خوشبوؤں، خوشیوں اور محبتوں کا احساس دلاتے پھول۔ فلاور گارڈن کے بالکل درمیان میں دلکش فوارہ اور اس کے چاروں اطراف پھولوں کا ڈھیر۔ ام مریم چلتے چلتے رک گئی تھی۔ وہ بھی رک گیا تھا۔

"تمہارا گھر؟" اس نے اسے فوراً "ٹوکا تھا۔

"میں تمہارے نہیں، ہمارے گھر آئی ہوں زین! میں نے آنٹی، انکل کی دعوت قبول ہی اس لیے کی تھی کیونکہ میں میرا اور تمہارا یہ گھر دیکھنا چاہتی تھی۔" وہ سرشار سا ہو کر مسکرایا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے سب کچھ اک خواب جیسا لگتا ہے۔" وہ ام مریم کی انگلی میں سجی اپنے نام کی انگوٹھی کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں چاہا اور اتنی آسانی سے تم مجھے مل بھی گئیں، سچ مجھے اپنی خوش قسمتی پر خود یقین نہیں آتا۔"

"یقین کرلو زین شہریار! تم ام مریم کے دل کو فتح کرچکے ہو۔" وہ شاہانہ سے انداز میں بول کر کھکھلائی تھی۔

"مجھے جیت لینا آسان نہیں تھا، مگر تم نے یہ مشکل کام بڑی آسانی سے کرلیا ہے۔"

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم!" اس کے لہجے میں جذبات کی شدت تھی۔

"میں جانتی ہوں اور میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" وہ سرشار سا ہو کر مسکرایا تھا۔ پورا دن ساتھ گھوم پھر کر رات آٹھ بجے کے قریب وہ دونوں گھر واپس آئے تھے۔ شہریار خان اور اموجان لیونگ روم میں ساتھ بیٹھے تھے۔

"گھوم لیا واشنگٹن؟" شہریار خان نے مسکرا کر مریم سے پوچھا تھا۔

"ابھی کہاں انکل! ابھی تو زین نے ایک، دو ہی جگہیں دکھائی ہیں۔ اب میرا دل چاہ رہا ہے ہم کہیں آؤٹنگ کا کچھ ایسا پروگرام بنائیں جس میں آپ اور آنٹی بھی ہوں۔ تب زیادہ مزا آئے گا۔" وہ بے تکلفانہ سے انداز میں کہتے ہوئے شہریار خان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"بالکل بنانا چاہیے ایسا کوئی پروگرام۔ ان فیکٹ میرے دل میں یہ خیال تھا بس میں سکندر کے آنے کا منتظر ہوں۔ وہ بھی آجائے تب آؤٹنگ کے دو تین پروگرام بنا لیتے ہیں۔"

شہریار خان ام مریم کے بے تکلف انداز کو مسکراتی، پسند کرتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تھے جبکہ سکندر کے نام پر اس کے لبوں سے مسکراہٹ رخصت ہوگئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ذکر کے بغیر شہریار خان کی کوئی بھی بات مکمل کیوں نہیں ہوتی تھی۔

"سکندر شاید کل یا پرسوں آجائے گا۔" اموجان ابھی مسکرا کر یہ بات کہہ ہی رہی تھیں کہ لیونگ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا سکندر با آواز بلند، شوخ و شریر سے لہجے میں بولا۔

"سکندر آچکا ہے اموجان!" اس سمیت ان سب لوگوں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ لائٹ براؤن پینٹ، ڈارک براؤن جیکٹ، مفلر اور گلوز پہنے ہوئے بکھرے بالوں اور لبوں پر شوخ سی

مسکراہٹ کے ساتھ وہ بے حد ہینڈسم لگ رہا تھا۔

وہ واقعی سکندر لگ رہا تھا' وہ ایلگزینڈر لگ رہا تھا' جیسے وہ دنیا کو فتح کر سکتا ہے' ہمیشہ کی طرح۔

سکندر کو دیکھ کر اس کے لبوں پر سے مسکراہٹ فوراً" رخصت ہو گئی تھی۔ ام مریم کے ساتھ اپنے گھر پر یہ چھٹیاں اب وہ اس طرح انجوائے نہیں کر سکے گا جیسے کرنا چاہتا تھا۔ یہ سن کر کہ سکندر اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے چلا گیا ہے' اس نے دل میں خواہش کی تھی کہ کاش ان چھٹیوں میں سکندر گھر نہ آئے' مگر اس کی خواہش کہاں پوری ہوئی تھی۔ اس کی چھٹیوں کا مزا خراب کرنے کے لیے وہ موجود تھا۔

سکندر کو دیکھ کر جو تاثر اس کے چہرے پر ابھرا تھا' اس پر کسی کا بھی دھیان نہیں گیا تھا' کیونکہ امو جان شہریار خان اور ام مریم تینوں کے تینوں سکندر کی جانب متوجہ تھے۔ امو جان بے ساختہ صوفے سے اٹھی تھیں۔

"آگیا میرا بیٹا۔ بس تمہاری کمی تھی گھر میں۔" انہوں نے سکندر کی پیشانی پر بے اختیار پیار کیا تھا۔ شہریار خان بھی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"اس طرح اچانک؟ تمہاری ماں تو کہہ رہی تھیں' تم دو' ایک دن بعد آؤ گے۔" سکندر نے مسکراتی نگاہیں ام مریم اور اس پر ڈالی تھیں۔

"بس بابا جیسے ہی مجھے پتا چلا زین اور میری ہونے والی بھابھی گھر تشریف لا چکے ہیں میں نے اپنے باقی سارے پروگرام کینسل کر دیے۔ پہلے ہی مجھے زین کی منگنی میں شرکت نہ کرنے کا اتنا افسوس ہے۔" وہ مسکرا کر بولتے ہوئے صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو زین؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" ام مریم کا خیال کر کے وہ قصداً" مسکرا کر بولا۔

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ام مریم اس کے اور سکندر کے بیچ کسی تناؤ کو محسوس کرے۔ اس کے ماں باپ کے لیے یہ بات تعجب کی نہیں تھی کہ بچپن ہی سے وہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت دور رہتے۔ ام مریم اس بات پر حیران ہو سکتی تھی کہ زین کی اکلوتے بھائی سے کیوں بات چیت نہیں ہوتی۔ ان وجوہات کو' بچپن کی محرومیوں کو فی الحال ام مریم سامنے لانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس سے خیریت پوچھنے کے بعد سکندر اب ام مریم کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"بہت شوق تھا مجھے تم سے ملنے کا۔ میں تمہیں "تم" کہہ سکتا ہوں ناں؟ رشتے میں تو تم سے بڑا ہوں۔ زین کا بڑا بھائی جو ہوں۔" وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا تھا۔

"بالکل کہہ سکتے ہو۔" ام مریم سدا کی پراعتماد لڑکی' مسکرا کر بھرپور اعتماد کے ساتھ بولی تھی۔

وہ سکندر کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا جو اس وقت مکمل طور پر ام مریم کی جانب متوجہ تھا۔ وہ سکندر سے بہت دنوں کے بعد مل رہا تھا۔ جب سے ام مریم اس کی زندگی میں آئی تھی' وہ سکندر سے نہیں ملا تھا۔ بالکل سامنے وہ بے تحاشا حسین اور غیر معمولی لڑکی بیٹھی تھی جسے اس کی زندگی کی ساتھی بننا تھا۔ وہ سکندر کے تاثرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار کچھ ایسا اچھا ہوا تھا جو ابھی تک سکندر کی زندگی میں نہ ہوا تھا۔ اس نے سکندر سے پہلے اپنی زندگی کی ساتھی چن لی تھی اور جسے اس نے چنا تھا' اس کی ٹکر کی لڑکی سکندر ساری زندگی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی محسوس کی تھی۔

سکندر اس وقت بیگ سے نکال کر اسے اور ام مریم کو الگ الگ تحفے دے رہا تھا۔

"یہ میری طرف سے تم لوگوں کی منگنی کا تحفہ۔" سکندر سے وہ تحفہ قبول کرتے ہوئے' سکندر کا خوشی اور مسکراہٹ سے بھرپور انداز دیکھتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ سکندر خوش ہونے کا محض ڈرامہ کر رہا ہے۔ وہ خود سے ہر معاملے میں کمتر چھوٹے بھائی کو خود سے آگے بڑھتا' ام مریم جیسی حسین و بے مثال لڑکی

ساتھ پاتا دیکھ کر کیونکر خوش ہو سکتا تھا؟

کم ظرفی کی بات تھی مگر وہ یونان کے اس بادشاہ کو جو دنیا فتح کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا' زندگی کے اس مقام پر خود سے مات کھاتے دیکھ کر عجیب سی خوشی اور طمانیت اپنے اندر اترتی محسوس کر رہا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ ام مریم اور سکندر ساتھ تھے۔ امو جان ان لوگوں کا ساتھ دینے بیٹھی تھیں ورنہ وہ ناشتا شہریار خان کے ساتھ صبح ہی کر چکی تھیں۔ شہریار خان دفتر جا چکے تھے۔

"کافی صبح کا اٹھا ہوا ہے سکندر۔ کہہ رہا تھا میں ناشتا زین اور مریم کے ساتھ کروں گا۔" امو جان اسے اور مریم کو بتا رہی تھیں۔

"تم چھٹیوں میں بھی صبح جلدی اٹھ جاتے ہو؟"

مریم نے آملیٹ کھاتے ہوئے سکندر سے پوچھا تھا۔ وہ اسی دوستانہ و بے تکلف انداز میں سکندر سے گفتگو کر رہی تھی جس طرح باقی سب سے کیا کرتی تھی۔

"ہاں! بس عادت ہے۔ شروع سے میری صبح جلدی اٹھنے کی۔" وہ اپنے لیے توس پر مکھن لگا رہا تھا۔ مریم اب سکندر سے اس کی پڑھائی کے حوالے سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ وہ کیا پڑھ رہا ہے' کس یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے اور کیا کیا مضامین پڑھ رہا ہے۔ اسے چونکہ سکندر کے ساتھ باتیں کرنے میں قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اس گفتگو میں شامل ہونے کے بجائے اخبار کی سرخیوں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے ناشتا کرنے میں مگن تھا۔ اس کا تو یہ بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ مریم 'سکندر کے ساتھ زیادہ خوش اخلاقی دکھائے مگر اس سے روکنے کے لیے اسے ام مریم کو اپنے اور سکندر کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں بتانا پڑتیں جو وہ ابھی بتانا چاہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھتا ہے' وہ اپنے بھائی سے ہمیشہ ہر معاملے میں پیچھے رہا ہے' باپ کے ہاتھوں نظر انداز ہوا ہے' یہ سب زبان سے کہنا اسے دشوار لگ رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہوا' تمہارے اور زین کے

سب [illegible] بال [illegible]

مریم [illegible]

[illegible] کی۔

"ہاں۔" سکندر [illegible]

"تم بھی کہیں زین کی طرح لا [illegible] بننا چاہتے ہو؟"

"بننا تو چاہتا ہوں۔"

اسے ایسا لگا تھا' سکندر مذاق اڑاتی نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہے گا۔ "میں نہیں' زین وہ مضامین پڑھ رہا ہے' جو میں نے اپنے لیے منتخب کیے ہیں۔ وہ وکیل وہ میری نقل اور میری حرص میں بننا چاہتا ہے۔ میں نہیں' وہ مجھے فالو کیا کرتا ہے۔"

سکندر نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا' مگر وہ یکدم ہی عجیب سی الجھن اور بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ کہیں ام مریم کو یہ نہ پتا چل جائے کہ وہ سکندر جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

"مجھے جب آنٹی نے بتایا کہ زین کا ایک بھائی بھی ہے' تب میں اتنی حیران ہوتی تھی۔ زین نے مجھ سے کبھی بھی تمہارا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مجھے تو اپنی منگنی والے دن مجھے پتا چلا کہ زین کا کوئی بڑا بھائی بھی ہے۔"

ام مریم اس کی سوچوں سے انجان دوستانہ انداز میں سکندر سے مخاطب تھی۔

اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور حیرت بھرا ایک تاثر ابھرا تھا۔

"بس! یہ میرے بھائی صاحب ایسے ہی ہیں۔" سکندر چہرے پر ابھرتا ہوا دکھ فوراً" ہی چھپا کر مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا۔

کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ بھی بدقت مسکرایا تھا۔

"آنٹی نے بتایا تھا' تمہارے ایگزامز ہو رہے تھے' اس لیے تم ہماری منگنی پر نہیں آسکے تھے۔"

"ہاں!" ناشتے کی میز سے اٹھ کر وہ تینوں لیونگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔

امو جان کچن میں خانساماں کو لنچ کے متعلق ہدایات دے رہی تھیں۔ ان کے بچے بہت دنوں بعد گھر آئے تھے۔ وہ ہر کھانے اور ہر ناشتے میں خاص اہتمام چاہتی

تھیں۔ وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ام مریم اور سکندر باتیں کررہے تھے۔

"اس کا مطلب ہے تم کافی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہو۔"

مریم نے سکندر کو اپنے مضامین، تعلیمی کارکردگی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے بتایا تب وہ تعریفی انداز میں بولا تھا۔ جس طرح ہر کوئی ام مریم کی ذہانت اور اس کی خوداعتمادی سے متاثر ہوتا ہے' اسی طرح سکندر بھی متاثر نظر آرہا تھا۔

"مریم! کہیں باہر چلیں؟" وہ چھٹیوں میں گھر اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ سکندر کے ساتھ بیٹھے اور اپنا خون جلائے۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تب وہ ٹی وی ریموٹ سے بند کرکے ام مریم سے بولا۔

"چلو! چلتے ہیں۔ سکندر! تم بھی چلو۔" مریم فوراً چلنے پر راضی ہوئی تھی' مگر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سکندر کو بھی چلنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ ادھر اس نے سکندر کا نام لیا' ادھر اس کا دل چاہا' وہ باہر جانے کا پروگرام ہی سرے سے منسوخ کردے۔

"نہیں! تم دونوں جاؤ۔ میں کچھ وقت امو جان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

شکر تھا۔ اسے اتنی عقل تھی کہ وہ چلنے سے انکار کردے۔ ان دونوں کے بیچ اس کی موجودگی کی کوئی تک ہی نہیں تھی۔ وہ اور ام مریم گھومنے پھرنے نکل گئے تھے۔ انہوں نے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی تھی۔ لنچ بھی باہر کیا تھا اور بے مقصد سڑکوں پر گھومے بھی تھے۔ خوب ہنسے تھے اور بہت انجوائے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆
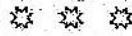
رات میں شہریار خان ان سب لوگوں کو باہر ڈنر کرانے لے کر گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ یہ ڈنر بطور خاص ام مریم کے اعزاز میں ہے جو پہلی بار اپنی ہونے والی سسرال آئی ہے۔ اس کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ اس مناسبت سے وہ خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہنا تھا اور اس سیاہ لباس میں وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

سیاہ لباس کے اوپر اس کی سیاہ کشمیری شال اس حسن کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اس کی شال پر سنہری دھاگے سے کام بنا تھا' اس نے کانوں میں بڑے آویزے پہن رکھے تھے اس پر سلیقے سے میک اپ' وہ واقعی کوئی اپسرا لگ رہی تھی' وہ ہوٹل پہنچے' وہاں ان کے لیے میز پہلے سے بک تھی۔

شہریار خان اپنی ہونے والی بہو کو کسی معمولی جگہ نہیں لے جا سکتے تھے۔ انہوں نے اس ڈنر کے لیے شہر کے بہترین ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔

وہ امو جان اور شہریار خان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ سکندر ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر والی کرسی پر ام مریم بیٹھ گئی تھی۔

کھانے کے دوران تاریخ' ادب' سیاست' معاشیات ان تمام موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ ام مریم کی شہریار خان کے ساتھ۔ شہریار خان اس گفتگو میں اپنے لاڈلے کو بھی شامل کرنے کی کوشش کررہے تھے مگر پتا نہیں کیوں سکندر کچھ چپ چپ سا تھا۔ وہ گفتگو میں شامل تو ہو رہا تھا مگر یوں جیسے کسی اور بات میں اس کا ذہن الجھا ہوا ہو' وہ کچھ اور سوچ رہا ہو۔ اس نے چند ایک بار سکندر کی ام مریم کی جانب اٹھتی سنجیدہ نگاہیں دیکھی تھیں۔ اس بے پناہ سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ سکندر نے ام مریم کو کیوں دیکھا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

ام مریم اسی طرح چہک رہی تھی' وہ شہریار خان اور سکندر سے یونان' یونانیوں اور ان کی تہذیب پر باتیں کررہی تھی۔ شہریار خان دلچسپی سے اپنی معلومات اس کے ساتھ شیئر کررہے تھے جبکہ سکندر سنجیدہ تھا' خاموش تھا' وہ محض سرہلا رہا تھا یا پھر کبھی کبھی ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

سکندر کے اس عجیب و غریب انداز کو وہ قطعاً نہیں سمجھ پایا تھا۔

☆ ☆ ☆

سکندر صرف اسے رات ہی نہیں بلکہ صبح بھی کچھ چپ چپ محسوس ہوا تھا۔ اور شاید کسی اور نے اس کی خاموشی کو بہت زیادہ محسوس بھی نہ کیا ہو مگر وہ سکندر کے ہر انداز کو بغور دیکھتا اور محسوس کیا کرتا تھا۔ سکندر ناشتے کی میز پر کل صبح کی طرح چہک نہیں رہا تھا۔

وہ ام مریم سے بھی کم کم بات کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ گفتگو اموجان سے ہو رہی تھی یا پھر کسی کسی وقت اس کے سپاٹ سے انداز کے باوجود اس سے بھی مخاطب ہو رہا تھا مگر ام مریم سے وہ کم مخاطب ہو رہا تھا کم بات کر رہا تھا۔ اسے سکندر کا رویہ بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"آؤ سکندر! کارڈز کھیلتے ہیں۔" ناشتے کی میز سے اٹھتے ہوئے ام مریم نے پہلے اس سے پوچھا کہ وہ لوگ کوئی گیم کھیلیں اس نے ہامی بھری تو وہ سکندر سے بولی۔

"سوری مریم! تم لوگ کھیلو۔ مجھے ذرا ـــ کام ہے۔"

وہ سنجیدگی سے معذرت کرتا میز پر سے اٹھ گیا تھا۔ ابھی وہ سکندر کے اس عجیب و غریب رویے ہی کو سوچ رہا تھا کہ شام میں اسے سکندر پر ٹھیک ٹھاک قسم کا غصہ آگیا۔ آج ان کے گھر پر کرسمس اور سال نو کے حوالے سے پارٹی تھی جس میں واشنگٹن کے وہ تمام ایلیٹ اور اثر و رسوخ رکھنے والے افراد جو شہریار خان کے دوست تھے مدعو تھے۔ ان افراد میں سیاست دان بھی تھے سینیٹرز بھی تھے کاروباری حضرات بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ایگزیکٹوز اور چیف ایگزیکٹوز بھی تھے۔

گھر پہ پارٹی تھی اس لیے وہ پورے دن کے لیے تو مریم کو لے کر گھومنے نہیں نکلا تھا بس یونہی آس پاس تھوڑا بہت گھوم پھر کر وہ دونوں واپس آگئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو لاؤنج میں سکندر اکیلا بیٹھا نظر آیا۔ ڈرائی فروٹس کھاتے ہوئے ٹی وی پر فٹ بال کا کوئی میچ دیکھ رہا تھا۔

"تو تم یہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہو ہمارے ساتھ چلتے۔" ام مریم مسکرا کر بولتی صوفے پر بیٹھی تھی۔

ام مریم کو بیٹھتا دیکھ کر اسے بھی مجبوراً وہاں بیٹھنا پڑ گیا تھا۔ ام مریم نے سکندر کے ہاتھ میں موجود ڈرائی فروٹ کی پلیٹ سے کاجو اٹھا کر کھایا۔

"کیا بورنگ گیم دیکھ رہے ہو کچھ اور لگاؤ۔" دو تین کاجو اور اٹھا کر کھاتے ہوئے ام مریم نے سکندر کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر چینل تبدیل کر دیا۔

سکندر ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھ گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟ اچھا دیکھ لو تم جو دیکھ رہے تھے۔"

ام مریم کا ہنستا مسکراتا بے تکلف انداز ویسا ہی تھا جیسا وہ سب کے ساتھ رکھا کرتی تھی مگر سکندر کا ردعمل بڑا عجیب نا سمجھ میں آنے والا تھا۔

"تم لوگ ٹی وی دیکھو۔" وہ سخت اور بے تاثر سے لہجے میں کہہ کر وہاں سے جانے لگا تھا۔

"ہم آئے اور تم اٹھ کر جا رہے ہو کیا ہمارے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہ رہے تھے سکندر؟"

ام مریم کے اس سوال کے جواب میں سکندر کو اخلاق اور تمیز کا مظاہرہ کرتے کوئی مہذب بات کہہ دینی چاہیے تھی مگر وہ بڑے صاف گو اور واضح انداز میں بولا۔

"ہاں۔ میں اس وقت اکیلا بیٹھنا چاہتا تھا۔" سنجیدہ انداز میں جواب دینے کے بعد وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"سکندر کو کیا ہوا زین! کیا وہ میرے چینل تبدیل کر دینے سے ناراض ہو گیا ہے؟"

حیران پریشان سی ام مریم نے اسے دیکھا تھا۔ ام مریم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر ناراض ہوا جائے کرخت ہوا کیا جائے۔ سکندر بلاوجہ بدتمیزی کر کے گیا تھا۔ اس کا خون کھول گیا تھا مگر وہ ضبط کر کے چپ تھا۔ بہرحال وہ سکندر کے خلاف ام مریم سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"بس اس کی عادت ہے اسی طرح کی تم پلیز مائنڈ مت کرو۔" سکندر پر اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے

وہ ام مریم سے نرمی اور پیار سے بولا تھا۔

رات پارٹی میں وہی تمام اہتمام تھا جو شہریار خان کی پارٹیز میں ہوا کرتا تھا۔ جس خوب صورت مینشن میں وہ رہتے تھے۔ اس کا ایک بڑا ہال نما کمرا ان کے گھر پر پارٹیز کے لیے مخصوص تھا۔ آج بھی پارٹی کا وہیں اہتمام تھا۔ شہریار خان کے مدعو کیے تقریباً" تمام مہمان پارٹی میں موجود تھے۔ وہ جوس کا گلاس لے کر ایک طرف کھڑا تھا۔

شہریار خان سکندر کو ایک اپنے ایک نئے دوست جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے سی ای او تھے ان سے ملوا رہے تھے۔ سکندر بلیک سوٹ میں بے حد شاندار لگ رہا تھا۔ شہریار خان پارٹیز میں سکندر کو اسی طرح اپنے خاص اثر و رسوخ رکھنے والے دوستوں سے ملوایا' متعارف کروایا کرتے تھے گویا سکندر کے عملی زندگی میں قدم رکھنے کی تیاریاں انہوں نے ابھی سے شروع کر رکھی تھیں۔ وہ اس کے سنہرے مستقبل کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے۔ اس کو غالباً" کسی سے اس لیے نہیں ملوایا جاتا تھا کہ وہ سکندر کی طرح ان کے دوستوں اور ملنے جلنے والے اونچے معیار کے حامل لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال نہیں تھا۔

جن لوگوں سے وہ واقف تھا' ان سے دعا سلام کر چکا تھا' اب بالکل تنہا کھڑا تھا۔

ام مریم پتا نہیں تیار ہو کر ابھی تک کیوں نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنا ذہن سکندر اور شہریار خان سے ہٹانا چاہا تھا۔ نہیں' اب ان باتوں پر اس کا دل نہیں دکھتا' وہ بالکل بھی دکھی نہیں ہے۔ اب اس کے پاس' اس کی زندگی میں ام مریم ہے۔

ام مریم کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دی' تب اسے اس کے دیر سے آنے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ وہ بہت اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی' بہت دل سے۔ امو جان نے اسے تحفے میں جو خوب صورت اور بیش قیمت جوڑا دیا تھا اس نے وہ پہن رکھا تھا۔ جیسے سیاہ رنگ اس کے لیے بنا تھا' ایسے ہی سرخ رنگ بھی اس کے لیے ہی بنا تھا۔ ہر رنگ اس کے لیے بنا تھا۔

پارٹی میں جتنی لڑکیاں' جتنی خواتین شریک تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی اس جیسی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر اس کی تمام کلفت دور ہو گئی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ وہ بھی اسے دور سے دیکھ رہی تھی۔ شہریار خان سکندر کو اپنے جن واقف کاروں سے ملوا رہے تھے ملوا چکے تھے۔ سکندر اب وہاں سے ہٹ کر کسی سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ اسے دور سے کھڑے نظر آ رہا تھا کہ سکندر اور ام مریم کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ ام مریم مسکرا کر اس سے کچھ بولی تھی' اس کے چہرے پر شوخی تھی' زندگی سے بھرپور مسکراہٹ۔ مگر جواباً" سکندر نے سنجیدگی سے' بغیر مسکرائے نجانے اس سے ایسا کیا کہا تھا کہ ام مریم کا چہرہ ایک دم ہی پھیکا پڑ گیا تھا۔

آج ایک ہی دن میں سکندر نے دوسری بار ام مریم کے ساتھ ایسا روکھا کرخت رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے ام مریم سے جو کچھ بھی کہا تھا۔ وہ کہہ کر رکا نہیں تھا فوراً" ہی وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

سکندر ہوتا کون تھا' ام مریم سے بد اخلاقی اور بدتمیزی سے پیش آنے والا وہ اس گھر کی بہو ہے' شہریار کی ہونے والی بیوی ہے۔ وہ مہمانوں کا لحاظ کرکے' موقع کی نزاکت کا احساس کرکے خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا تھا۔

شرمندہ شرمندہ سی ام مریم وہاں اسی طرح چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ فوراً" ہی اس کے پاس آگیا۔

"کیا ہوا مریم!" اس کا خیال تھا' وہ فوراً" سکندر کے رویے کی شکایت کرے گی مگر وہ ام مریم تھی۔ اس کی ام مریم۔ وہ اتنی چھوٹی بات کیسے کر سکتی تھی کہ اس کے بھائی کے خلاف اس سے کچھ کہتی۔ وہ فوراً" ہی دل سے مسکرائی تھی۔

"کچھ نہیں' میں تمہارے ہی پاس آ رہی تھی۔"

"تم خوش ہو ناں مریم! تمہیں یہاں کوئی بات تو نہیں لگ رہی؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"اپنے گھر آ کر مجھے کچھ کیوں برا لگے گا؟"

سے اتنا پیار کرتے ہیں' آنٹی انکل اور سب سے بڑھ کر تو تم۔ تم ساتھ ہو تو میں خوش کیوں نہیں ہوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس نے بے اختیار ام مریم کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ام مریم نے سکندر کا نام نہیں لیا تھا' وہ اس فہرست میں شامل ہونے کے قابل تھا بھی نہیں۔ اس وقت اس پل جب وہ ام مریم کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اس کی اچانک ہی سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر کچھ فاصلے پر اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑا تھا' اس کی نگاہیں ان دونوں ہی پر مرکوز تھیں۔ اور اس پل سکندر کی نگاہوں کا تاثر پڑھنے میں وہ ہرگز ہرگز غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ سکندر کی نگاہوں میں اسے اور ام مریم کو ساتھ کھڑا دیکھ کر ناپسندیدگی تھی' غصہ تھا۔

وہ اسے اور مریم کو ایک ساتھ دیکھ کر خوش نہیں تھا۔ سکندر کے جس رویے کو وہ ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا تھا ایک دم ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ سکندر ام مریم کو اس کی زندگی میں دیکھ کر خوش نہیں تھا۔

"دبس اتنا سا حوصلہ ہے تم میں سکندر شہریار! میں ساری زندگی تمہاری برائی برداشت کرتا آیا ہوں اور تم سے آج میری ایک معمولی سی خوشی اور برتری برداشت نہیں ہو رہی؟ بس صرف ایک دن ڈھونگ رچا سکے میری خوشیوں میں خوش ہونے کا؟ اب وہی کم ظرفی دکھا رہے ہو۔ اتنے حاسد اور کم ظرف ہو تم سکندر شہریار کہ بھائی کی خوشی نہیں دیکھی جا رہی تم سے؟ ام مریم جیسی شان دار' حسین اور غیر معمولی لڑکی تمہارے اس معمولی بھائی کو مل گئی ہے' اس لیے حسد کر رہے ہو مجھ سے؟"

اس نے سکندر کے لیے دل میں نفرت اور غصہ محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن سکندر زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہا تھا بقول امو جان کے وہ پڑھائی کر رہا تھا کہ چھٹیوں کے فوراً" بعد اس کے ایگزامز ہوتا تھے۔ اسے یہ سب جھوٹ معلوم ہو رہا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ سکندر اسے اور ام مریم کو ایک ساتھ دیکھ نہیں پا رہا تھا' ہمیشہ جیتنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی اسے کہ زندگی میں پہلی بار زین سے ہارنا اس سے سہا نہیں جا رہا تھا' اپنی جلن اور حسد جب کسی اور طرح نہیں ظاہر کر پا رہا تھا تو ام مریم کے ساتھ سپاٹ لب و لہجہ اور کرخت انداز اپنا کر اس رشتے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ سکندر کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا ورنہ ام مریم سے بدتمیزی کے مظاہرے پر اسے کھری کھری سنا دیتا' اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔ شام میں سکندر کمرے سے نکلا تھا۔

"بڑے بزی ہو صبح سے۔ آؤ بیٹھو ہم لوگوں کے ساتھ۔"

وہ اور مریم شطرنج کھیل رہے تھے جب سکندر سیڑھیوں سے اترتا نظر آیا۔ ام مریم اس کی کل کی بداخلاقی بھلا کر مسکرا کر بولی۔

"تو تھینکس۔ میں ابھی بھی بزی ہوں۔"

"چھٹیوں میں اس طرح پڑھائی کون کرتا ہے۔" ام مریم نے ہنس کر اس سے کہا۔

"میں کرتا ہوں۔" وہ سنجیدہ اور قدرے روکھے سے انداز میں اسے جواب دیتا کچن میں چلا گیا تھا۔

ام مریم شرمندہ سی ہو گئی تھی' اس کے چہرے پر خفت نظر آ رہی تھی۔ وہ سکندر کے رویے پر ام مریم سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ کیا سوچ رہی ہو گی وہ بھی کہ زین کا اکلوتا بھائی اتنا کرخت ہے' اسے گھر آئے مہمان سے اخلاق برتنا بھی نہیں آتا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں مریم! بس سکندر کی عادت اسی طرح کی ہے۔ موڈی ہے بہت' برا مت ماننا اس کی کسی بات کا۔"

اسے سکندر پر شدید غصہ آ رہا تھا مگر اپنے غصے کو کنٹرول کر کے اسے مسکرا کر ام مریم سے یہ بات کہنی پڑی تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ میرا اکلوتا بھائی مجھے اور

نہیں ساتھ دیکھ کر جیلس ہو رہا ہے' اس سے چھوٹے بھائی کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی۔ جو ظرف مجھ میں ہے کہ بچپن سے اس کی کامیابیوں' اس کی جیت' اس کی برتری کو قبول کرتا آیا ہوں وہ ظرف خود میں کہاں سے لائے؟ تمہاری جگہ کوئی عام سی لڑکی میری منگیتر ہوتی تو اسے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اسے تکلیف اپنے معمولی بھائی کو ایک غیر معمولی لڑکی کے ملنے پر ہے۔ کیا پتا اسے یہ ڈر بھی ہو کہ چاہے ساری دنیا کی خاک بھی چھان لے مگر تم سے برتر تو کیا تمہارے جیسی بھی لڑکی اپنے لیے ڈھونڈ نہیں پائے گا۔

ام مریم اس کی سوچوں سے انجان مسکراتے ہوئے اسے یقین دلا رہی تھی کہ اس نے سکندر کی کسی بات کا برا نہیں مانا ہے۔

✵ ✵ ✵

اگلے روز ان لوگوں کا پکنک کا پروگرام تھا' یہ پروگرام شہریار خان نے اپنے بچوں اور ہونے والی بہو کے لیے بطور خاص بنایا تھا۔ شہریار خان اور اموجان کی جن چند فیملیز سے زیادہ قریبی دوستیاں تھیں وہ پانچ فیملیز بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔

کل ملا کر وہ پچیس چھبیس افراد تھے جو پکنک پر جا رہے تھے۔ صبح سویرے ان لوگوں کی روانگی تھی۔ ان کے فیملی فرینڈز میں دو فیملیز پاکستانی تھیں' ایک انڈین اور دو امریکن۔ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں جا رہے تھے۔ وہ لوگ میری لینڈ کے مضافات میں پہاڑوں کے دامن میں واقع خوب صورت اور قدرتی حسن سے مالا مال جھیل کے پاس پکنک منانے جا رہے تھے۔ وہاں خوب صورت جھیل کے ساتھ سوئمنگ' بوٹنگ اور فشنگ کی سہولیات موجود تھیں' کیمپنگ کے لیے بھی وہ جگہ بڑی آئیڈیل تھی' وہاں خوب صورت قدرتی آبشار بھی تھے' گھڑ سواری کرنی ہو یا ہائکنگ وہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔

اس کی خواہش تھی' وہ ام مریم ایک ساتھ گاڑی میں بالکل تنہا جائے۔ مگر فیملی کے ساتھ پکنک میں وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ اموجان اور شہریار خان کے سامنے یہ کہنا کہ وہ ام مریم کے ساتھ جانا چاہتا ہے اسے چھچھورا پن محسوس ہوا تھا۔ ام مریم ابھی تیار ہو کر نیچے نہیں آئی تھی جبکہ اموجان تیار کھڑی تھیں۔

شہریار خان نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں اموجان' ان کی ایک دوست اور ان کے بیٹے کو بٹھا کر لے جائے۔ سب یہیں جمع تھے اور کوئی کسی کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور کوئی کسی کی' تاکہ اپنے ہم مزاج افراد کے ساتھ پکنک اسپاٹ تک جانے کے طویل اور خوب صورت راستے کو انجوائے کیا جاسکے۔

ام مریم کو تیاری میں وقت لگ رہا تھا۔ وہ بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ دل مسوستا اسے یہ جتا کر کہ وہ اموجان وغیرہ کو لے کر جا رہا ہے' وہ گھر سے روانہ ہو گیا تھا۔ ایک لمبے سفر کے بعد وہ لوگ پکنک اسپاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ آگے پیچھے سب ہی کی گاڑیاں وہاں پہنچنے لگی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سب وہاں پہنچ چکے تھے سوائے ام مریم اور سکندر کے۔

سکندر کی وہ کیوں فکر کرتا' اسے ام مریم کی فکر ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب سے پوچھ لیا تھا۔ ام مریم کسی کی بھی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ شکر تھا کہ جلد ہی ام مریم اسے آتی دکھائی دے گئی تھی ورنہ وہ پریشان ہونے لگا تھا۔ وہ سکندر کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئی تھی۔ اس نے سکندر اور ام مریم کو آگے پیچھے وہاں آتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ساتھ نہیں چل رہے تھے۔ سکندر ام مریم سے بہت آگے تھا' وہ پیچھے تھی۔

سکندر کے چہرے پر غصہ نظر آرہا تھا۔ مریم چپ چپ سی لگ رہی تھی۔ اسے یک دم ہی فکر لاحق ہوئی تھی۔ کیا سکندر نے پھر ام مریم کے ساتھ بدتمیزی سے بات کی تھی؟ اسے کچھ کہہ دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آرہا تھا آخر وہ مریم کو گھر پر چھوڑ کر کیوں آگیا تھا۔ کسی اور کی نہیں ام مریم اس کی ذمہ داری تھی' شہریار خان جو بھی کہہ رہے تھے اسے کہہ دینا چاہیے تھا وہ

ام مریم کا انتظار کرے گا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

"کیا ہوا مریم! تمہیں دیر کیوں ہو گئی؟ تم سکندر کے ساتھ آئی ہو؟"

"سکندر کا کیمرا نہیں مل رہا تھا' اس نے مجھ سے کہا' میں اس کے ساتھ مل کر اس کا کیمرا ڈھونڈ دوں۔ اس چکر میں باقی سب گاڑیاں چلی گئیں۔"

وہ مسکرا کر اسے بتانے لگی۔ ام مریم سے سیدھے منہ وہ بات کرتا نہیں تھا اور کیمرا تلاش کرنے میں اس سے مدد مانگ لی؟

اسے سکندر کے اس دوغلے پن پر شدید غصہ آیا تھا مگر اس نے یہ ہرگز ہرگز نہیں سوچا تھا کہ سکندر نے ام مریم کو جان بوجھ کر بہانہ بنا کر اپنے ساتھ روکا تھا۔ یہ بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔

اس کو تو بس سکندر کے دوغلے پن پر غصہ آیا تھا اور پھر اس کے بعد یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ کہیں سکندر نے راستے میں اس طرح کی کسی بدتمیزی اور بدتہذیبی کا مظاہرہ ام مریم کے ساتھ نہ کر دیا ہو جس طرح آج کل کیا کرتا تھا۔ براہ راست ان ہی لفظوں میں تو یہ بات اس سے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ہاں اس نے لہجے کو سرسری سا بنا کر عام سے انداز میں یہ ضرور پوچھا تھا کہ راستہ تو ٹھیک سے گزرا' کوئی پرابلم' کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

ام مریم نے مسکرا کر جواب دیا کہ راستہ بالکل سکون اور آرام سے کٹا' اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ ام مریم کی غیر معمولی اچھائی ہی تھی کہ وہ اس کے بھائی کے خلاف اس سے کچھ کہہ نہیں رہی تھی ورنہ پکنک اسپاٹ پر پہنچنے کے فوراً" بعد جو تاثر ام مریم کے چہرے پر تھا اسے دیکھ کر وہ جانتا تھا کہ سکندر نے راستے میں مریم کے ساتھ اسی لہجے اور اسی بدتمیز انداز میں کوئی بات کی تھی جس کا وہ آج کل کافی مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ چند دنوں کی چھٹیاں گزار کر ان دونوں نے یہاں سے چلے جانا ہے' پھر وہ یا مریم کون سا سکندر سے مل رہے ہوں گے' پھر بلاوجہ بات بڑھانے کا فائدہ کیا ہے۔

اس نے سکندر اور اس کی بدتمیزی پر لعنت بھیج کر اس سے صرف نظر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سکندر شہریار اگر کم ظرف تھا تو وہ تو نہیں اس کے جتنا نیچے اتر سکتا تھا۔

شروع میں تھوڑی سی دیر چپ چپ رہنے کے بعد ام مریم پھر وہی ہنستی بولتی ام مریم بن گئی تھی۔ وہ واقعی اس کی سچی ساتھی اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کے بھائی کی بدتمیزی پر اس کے سامنے رو دھو کر اسے بھائی سے جھگڑا کرنے بھائی سے دوبدو ہونے پر اکساتی' بلاوجہ ایک تماشا لگ جاتا۔ سب کی پکنک کا مزا خراب ہو جاتا۔

مریم نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ سکندر کا موڈ ہنوز خراب ہے۔ وہ بہت چپ بھی ہے اور ایک دبا دبا سا غصہ بھی اس کے چہرے پر نظر آرہا ہے۔ وہ ام مریم کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بدتمیزی کی حد تک ---- وہ اور ام مریم ساتھ مچھلی کا شکار کر رہے تھے ان دوستوں کے ساتھ ساتھ وہاں اس کے چند ایک انکل اور ان کے بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب مچھلیوں کی کچھ تعداد جمع ہو جاتی تب ان کے ساتھ آئے ملازمین نے انہیں دھونا اور صاف کرنا تھا پھر مچھلیوں کو گرل کرنے کا کام اس کی اموجان اور آنٹیوں نے انجام دینا تھا۔

سکندر اور شہریار خان جھیل سے کچھ فاصلے پر گھاس کے اوپر باقاعدہ نیٹ باندھ کر ٹینس کھیل رہے تھے۔ وہاں --- پر موجود مضبوط اور طویل درختوں کے درمیان انہوں نے نیٹ باندھ رکھی تھی۔

"انکل ٹینس کتنا اچھا کھیل رہے ہیں۔" ام مریم نے گردن گھما کر شہریار خان کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ پاپا باقاعدہ ایکسرسائز اور سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں' اسی لیے ان میں اس طرح کے کھیلوں کے لیے اسٹیمنا ہے۔" اس نے بھی گردن گھما کر اسی طرف دیکھا تھا۔

"چلو... ہم بھی وہاں چلیں۔ میرا انکل کے ساتھ

کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے' انکل اتنا اچھا کھیل رہے ہیں۔"

پاپا اپنے بھتیجے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ام مریم کی خواہش اس سے رد نہیں کی جا سکی تھی۔

"چلو۔" وہ دونوں وہاں آگئے تھے۔

"انکل! آپ بہت اچھا کھیل رہے ہیں۔" ام مریم ایکسائٹمنٹ میں اس سے پہلے ان لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھا۔

"تھینکس بیٹا۔" شہریار خان مسکرائے تھے۔ وہ بھی اب مریم کے ساتھ کھڑا تھا۔ قصداً" سکندر کو نظر انداز کر کے صرف باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"انکل! میں اور زین بھی کھیلیں' آپ لوگوں کے ساتھ؟"

"بالکل کھیلو' آجاؤ تم دونوں بھی۔" انہوں نے ام مریم کو مسکرا کر خوش دلی سے جواب دیا۔ "وہاں سے ریکٹ اٹھالو تم دونوں۔"

اس نے سکندر کے چہرے پر ناپسندیدگی ابھرتی دیکھی تھی' کیا سکندر ان دونوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا تھا؟

وہ سکندر کا پارٹنر کبھی بھی نہیں بننا چاہتا تھا' وہ شہریار خان کا پارٹنر بن گیا تھا اور ام مریم' سکندر کی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا اور مریم کا وہاں آجانا اور ان کے کھیل میں شامل ہو جانا سکندر کو پسند نہیں آیا تھا۔ وہ شہریار خان کی طرف ان کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور ام مریم' سکندر کے ساتھ۔

"انکل! میں بھی بہت اچھا کھیلتی ہوں' آپ کو ہرا دوں گی۔"

ام مریم کی شوخ لہجے میں کی بات پر شہریار خان قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ انہیں ہونے والی بہو کی خود اعتمادی پسند آیا کرتی تھی۔

"پاپا! آپ لوگ کھیلیں' میں بھول گیا تھا۔ مجھے حمزہ اور شایان کے ساتھ ہائکنگ کے لیے جانا ہے۔"

ان دونوں کے وہاں آجانے اور کھیل میں شامل ہونے کی وجہ سے سکندر نے محض چار' پانچ منٹ ... ان لوگوں کے ساتھ کھیلا ہو گا' پھر وہ یک دم ہی شہریار خان سے بولا۔

شہریار خان نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کا اندر اگر وہ چھپا بھی رہا تھا تب بھی بہت واضح تھا کہ وہ اس کے اور ام مریم کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا' وہ ان دونوں کے وہاں آجانے کی وجہ سے وہاں سے کھیل چھوڑ کر جا رہا تھا۔

"یہ گیم تو پورا کرلو۔" شہریار خان نے ایک نظر ام مریم اور اس پر ڈالنے کے بعد سکندر سے سنجیدگی سے کہا۔

"پاپا! میرا موڈ بھی نہیں ہو رہا۔ میرا موڈ ہائکنگ کا ہے۔"

سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے وہ اسی وقت کھیل چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں موجود ان تینوں افراد میں سے کسی کو بھی یہ بات سمجھائے جانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ زین اور ام مریم کی وجہ سے وہاں سے گیا ہے۔

"چلو ہم لوگ کھیلتے ہیں۔ زین! اب تم کھڑے ہو کر دیکھو' میرا اور مریم کا گیم۔"

شہریار خان نے فوراً" ہی ماحول کے تناؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی' مسکرا کر اس سے بولے تھے۔

شہریار خان اور ام مریم کھیل رہے تھے۔ اپنے جلن اور حسد میں سکندر تمیز' تہذیب سب بھول گیا تھا۔ اس کا موڈ باپ سے بھی خراب ہو گیا تھا۔

یہاں بدتمیزی ان کا لاڈلا' چہیتا بیٹا کر کے گیا تھا۔ اس لیے اسے سو فیصد یقین تھا وہ اسے بعد میں بھی' اکیلے میں بھی اس بات پر کچھ نہ کہیں گے' جبکہ اگر یہ ہی حرکت وہ کر کے گیا ہوتا تو آج گھر واپس جانے کے ساتھ ہی اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی جاتی' اسے تمیز اور تہذیب سیکھنے اور مینرز کا خیال رکھنے کی ہدایت کی جاتی۔

پکنک پر باقی سارا وقت اس کا موڈ خراب رہا تھا۔ ... ام مریم کی خاطر ہنسا اور بولا تھا' گو کہ لب اس کا ...

بولنے کسی بھی چیز کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سکندر بھی پکنک میں باقی سارا وقت ان دونوں سے بہت الگ تھلگ رہا تھا۔ جہاں جہاں پر بھی وہ اور ام مریم تھے وہاں پر وہ اگر موجود ہوتا تو انہیں دیکھنے کے بعد یا تو وہاں سے کہیں اور چلا جاتا تھا یا پھر اسے اور مریم کو نظر انداز کرکے کسی نہ کسی لڑکے یا لڑکی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

غصے کے ساتھ اسے حیرت بھی تھی، شدید حیرت۔ بچپن سے لے کر آج تک کبھی اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ سکندر اتنی حاسد فطرت کا مالک ہے۔ اسے جیتنے کی ایسی لت پڑ چکی ہے کہ اب کہیں پر بھی اپنا نمبر دو ہونا ہو تا وہ سہہ نہیں سکتا۔ سکندر کی موجودگی میں اپنے گھر پر یہ چھٹیاں گزارنا اس کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دن گن گن کر چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ پکنک سے اگلا روز بھی چھٹی ہی کا دن تھا اتوار تھا۔ شہریار خان گھر پر تھے۔

ام مریم لنچ ٹائم سے پہلے کافی دیر تک ان کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں رہی تھی۔ ان کا کتابوں کا کلیکشن دیکھتی رہی تھی۔ انہوں نے اپنی چند ایک کتابیں اسے مطالعے کے لیے بھی دے دی تھیں، جو ان کی اپنی بہو کے لیے پسندیدگی کا واضح اظہار تھی۔ ایسے ویسے کسی کو تو ان کی اسٹڈی میں داخل ہونے تک کی اجازت نہ تھی۔

"اب تھوڑا ٹائم آپ ہمیں بھی دے دیجیے۔"

کھانے کے بعد اس نے مریم سے چھیڑنے والے انداز میں کہا تھا۔

"کیا یاد کرو گے، دیا، بولو کیا موڈ ہے؟" وہ شاہانہ سے انداز میں بولی تھی۔

"کہیں باہر چلتے ہیں۔" وہ اسے پیار سے دیکھ کر بولا۔ مریم فوراً" جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ وہ دونوں جانے کے لیے تیار ہو کر لیونگ روم میں آئے تو وہاں شہریار خان، امو جان اور سکندر بیٹھے تھے۔

"کہیں جا رہے ہو تم دونوں؟" امو جان نے پوچھا تھا۔

"جی امو جان! تھوڑا آؤٹنگ کا موڈ ہے۔"

"سکندر! تم بھی چلو ہم لوگوں کے ساتھ۔" ام مریم سکندر سے بولی تھی۔

اسے ام مریم کے اس ضرورت سے زیادہ اچھا ہونے پر غصہ آیا تھا، بندے کو اتنا اچھا بھی نہیں ہونا چاہیے، ایک شخص مسلسل آپ سے بدتمیزی کر رہا ہے، دفع کرو، لعنت بھیجو اس پر، مگر وہ اس کے اس رویے کے لیے ام مریم کو غلط بھی نہیں سمجھ رہا تھا، وہ جانتا تھا، مریم فطرتا" اور عادتا" ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج رکھنے والی لڑکی تھی۔

وہ سکندر کو زین کا بڑا بھائی سمجھ کر مسلسل عزت دے رہی تھی۔ وہ اپنے سسرال میں اپنے ہونے والے سسر، ساس اور جیٹھ سب کے اوپر اپنا اچھا تاثر قائم کروانا چاہتی تھی، اپنی سسرال کے ان تینوں افراد کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتی تھی۔

ام مریم کی خواہشات غلط نہیں تھیں، بس وہ پیاری لڑکی یہ نہیں جانتی تھی کہ زین کا بڑا بھائی ایک حاسد اور کم ظرف انسان ہے۔ وہ بھائی کو دیکھ کر خوش ہونے کا ظرف نہیں رکھتا، وہ اپنے چھوٹے بھائی سے حسد میں مبتلا ہے۔

"میرا موڈ نہیں، تم دونوں جاؤ۔" سکندر نے ام مریم کو بے حد سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ وہ اخلاق دکھانے کو بھی نہیں مسکرایا تھا۔

"تم ہم لوگوں کے ساتھ کہیں پر بھی نہیں جاتے، آج تو چلو سکندر!" ام مریم نے دوبارہ اصرار کیا۔

"میرا خیال ہے میں تمہیں منع کر چکا ہوں، میں نہیں جانا چاہتا۔"

اس بار سکندر کا انداز سخت اور کھردرا تھا۔ شہریار خان اور امو جان نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ ام مریم اپنی انسلٹ پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"چلو مریم! دیر ہو رہی ہے۔" غصے سے اس کا دماغ کھول گیا تھا، اس نے فوراً" ہی ام مریم سے چلنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا غصہ بہت واضح تھا۔ وہ ام مریم کو ساتھ لے کر فوراً" ہی لیونگ روم سے

باہر نکل گیا تھا۔

مریم ابھی بھی شرمندہ سی تھی، خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا، وہ آج ام مریم سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دے گا کہ وہ سکندر کو اپنا سسرالی سمجھ کر ہونے والا جیٹھ سمجھ کر، زین کا بڑا بھائی سمجھ کر کسی بھی وجہ سے اہمیت دینا اور اسے منہ لگانا چھوڑ دے۔ بھاڑ میں گئی بھائی کی عزت۔ جب اس کے بھائی کو اپنی عزت اور رشتے میں بڑائی کا خیال نہیں تو وہ کب تک ام مریم کے سامنے اس کی حاسد فطرت کا پردہ رکھ سکتا ہے۔

وہ صاف لفظوں میں ام مریم سے یہ بہرحال پھر بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سکندر کی تم سے بدتمیزی کرنے اور تمہیں اگنور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم سے بری طرح متاثر ہے اور تم جیسی بے مثال اور غیر معمولی لڑکی اسے نہیں بلکہ مجھے مل گئی ہے، اس بات نے اسے جلن اور حسد میں مبتلا کر دیا ہے۔

وہ غصے میں باہر نکلا تھا، گاڑی کی چابی سینٹر ٹیبل سے اٹھانا بھول گیا تھا۔ ام مریم کو پورچ میں کھڑا چھوڑ کر وہ چابی اٹھانے اندر آیا تو امو جان سکندر سے کہہ رہی تھیں۔

''سکندر! کیا ہو گیا ہے تمہیں بیٹا! گھر آئے مہمان سے کوئی اس طرح بات کرتا ہے؟ اور مریم صرف مہمان نہیں بلکہ اس گھر کی ہونے والی بہو ہے، تمہیں نہیں جانا تھا، تم آرام سے بھی منع کر سکتے تھے۔''

شہریار خان سگار پیتے ہوئے خاموشی سے سکندر کو دیکھ رہے تھے۔ جو کسی بات پر چڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''ہونے والی بہو؟ مجھے لگتا ہے امو جان! آپ نے اور پاپا نے زین کی منگنی کا فیصلہ جلد بازی میں کر دیا ہے، مجھے ام مریم کچھ خاص پسند نہیں آئی ہے۔''

امو جان کچھ کہنے کے لیے لب کھول رہی تھیں، مگر اسی وقت ان کی اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ سکندر اور شہریار خان نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سکندر کے چہرے پر گھبراہٹ آتی دیکھی تھی۔ غالباً'' وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ زین اور مریم گھر سے جا چکے ہیں، تب ہی اس طرح کھل کر مریم کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔

غصے اور نفرت سے سکندر کو گھورتے ہوئے [illegible] چابی اٹھائے ہی وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ امو جان [illegible] اسے آواز بھی دی تھی، انہیں خدشہ ہوا تھا [illegible] ناراض ہو کر جا رہا ہے، مگر وہ اس طرح باہر نکل گیا تھا جیسے ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ ام مریم کو ساتھ [illegible] پیدل ہی باہر نکل گیا تھا۔

اس کے دل میں بہت غبار جمع تھا، بہت نفرت [illegible] تھی۔ مختلف سڑکوں پر پیدل چلتے۔ اس نے ام مریم کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ کیسے وہ ہمیشہ اپنے بھائی کے مقابلے میں نظر انداز کیا گیا ہے، کیسے اسے ہمیشہ سکندر سے کم تر سمجھا گیا ہے۔ اس نے ام مریم کو صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اس کے اور سکندر کے درمیان کبھی بھی دوستانہ تعلقات نہیں رہے ہیں اور نہ ہی کبھی قائم ہو سکتے ہیں۔ اس نے ام مریم سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اسے سکندر کو اس کا بھائی سمجھ کر اس کے ساتھ خوش اخلاقی اور اپنائیت ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

رات امو جان نے اس کا دل سکندر کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بتا کر کہ سکندر کا وہ مطلب نہیں تھا جو اچانک اندر آنے پر اس نے سنا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے سکندر کو سمجھا دیا ہے اب وہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گا جو اسے یا مریم کو بری لگے۔

وہ ماں کے دل کو تسلی دینے کے لیے مسکرا بھی دیا تھا، انہیں یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ اس نے کوئی بھی بات دل پر نہیں لی، مگر درحقیقت سکندر کی کوئی ایک بھی بات اور کوئی ایک بھی رویہ اس کے دل سے نکلا نہیں تھا۔ امو جان اور شہریار خان اپنے لاڈلے، بڑے بیٹے کے بدتمیز رویے پر حیران ہوں تو ہوں، کم از کم اسے کوئی حیرت نہیں تھی۔ کم ظرف اور حاسد شخص کم ظرفی اور حسد ہی ظاہر کر سکتا تھا اور کچھ بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

اس نے سوچ لیا تھا، وہ چھٹیوں کے بچے باقی [illegible]

سکندر کو مکمل طور پر نظرانداز کرکے اور ام مریم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گھومنے پھرنے میں گزار دے گا۔ وہ ام مریم کے دل سے سکندر کے رویے کے سبب پیدا ہونے والی سب کلفت اور کوفت دور کردینا چاہتا تھا۔

مریم اس کے کہنے پر اس کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی' وہ چاہتا تھا یہاں سے واپسی کے وقت ام مریم اس کے ساتھ گزاری ان چھٹیوں کی بہت اچھی یادیں ساتھ لے کر جائے۔ مگر اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود ام مریم اب وہاں چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔ بظاہر وہ سب کے ساتھ ہنستی' باتیں کرتی تھی' مگر اسے اس کے چہرے پر سچی خوشی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھمانے لے جاتا تو وہ چپ ہی محسوس ہوتی۔ یہ سب سکندر کے رویے کے سبب تھا' وہ ام مریم کی چپ کو دیکھتا تو اسے سکندر پر مزید طیش چڑھتا۔

سکندر سے اس کا اور ام مریم کا سامنا بہت کم ہو رہا تھا۔ سکندر رہا تو گھر پر ہی نہ ہوتا' اگر گھر پر ہوتا تو زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہا کرتا تھا' پڑھائی کا بہانہ بنا کر۔ وہ تیس دسمبر کی رات تھی جب شہریار خان اور امو جان کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ سکندر شام سے اپنے کمرے میں تھا' بقول اس کے پڑھ رہا تھا' اس نے ڈنر بھی کمرے ہی میں کیا تھا۔ وہ اور ام مریم لیونگ روم میں کھانا کھاتے ہوئے ٹی وی پر ام مریم کی پسند کی مووی دیکھ رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے بجائے لیونگ روم میں بیٹھ کر کھانے کی فرمائش ام مریم ہی نے کی تھی۔ کھانے کے دوران اس کے بچپن کے دوست نبیل کا فون آگیا تھا۔ وہ ایک پاکستانی بزنس مین کا بیٹا تھا اور اس کے اسکول کے دنوں کا دوست تھا۔ اس نے اپنے گھر پر کوئی سرپرائز پارٹی رکھی تھی اور اس سے آنے پر اصرار کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ انکار کرتا رہا' مگر جب نبیل باقاعدہ ناراض ہونے لگا تب اس نے بے چارگی سے ام مریم کو دیکھا۔ وہ ساتھ بیٹھی اس کے جوابات سن رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا وہ کہیں دوستوں کے گیٹ ٹوگیدر میں بلایا جا رہا ہے۔

"تم چلے جاؤ زین!" وہ آہستہ آواز میں بولی تھی۔

"تم گھر پر اکیلے بور ہوگی' تم بھی چلو میرے ساتھ۔" فون پر آنے کی ہامی بھرنے کے بعد اس نے ام مریم سے کہا۔

"مجھے نیند آرہی ہے زین! زیادہ دیر مجھ سے جاگا نہیں جائے گا۔ پارٹی میں پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔"

کل رات ان دونوں نے دیر تک جاگ کر ایک مووی دیکھی تھی' پھر کارڈز کھیلے تھے' بہت دیر سے سوئے تھے وہ دونوں' صبح وہ تو دیر سے اٹھا تھا' مگر مریم آج صبح بھی جلد بیدار ہوگئی تھی۔ اسے یقیناً" نیند آرہی ہوگی۔

"بس ٹھیک ہے' پھر تم لیٹ کر آرام کرو' میں چلا جاتا ہوں۔"

ام مریم نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ پارٹی میں چلا گیا تھا۔ مگر وہاں پر بھی اسے ام مریم ہی کا خیال تھا' کہیں وہ اکیلی بور نہ ہو رہی ہو' اس کے دوست اسے اور بھی روکنا چاہ رہے تھے۔ مگر وہ دو گھنٹے بعد ہی گھر واپس آگیا تھا۔ ام مریم کے کمرے کی لائٹ بند تھی' گویا وہ سو چکی تھی۔ وہ پیار بھری نگاہ اس کے کمرے پر ڈال کر اپنے کمرے میں جانے لگا۔ سکندر کے کمرے کی لائٹ بھی بند تھی۔ سکندر کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

اگلی صبح 31 دسمبر کی صبح تھی۔ ام مریم کے کمرے کا دروازہ ابھی بھی بند تھا۔ وہ یقیناً" ابھی سو رہی تھی۔ اور وہ اس کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے سوتا چھوڑ کر خود ناشتے کے لیے نیچے آگیا۔ وہ ڈائننگ روم میں داخل ہونے لگا تھا۔ مگر داخل ہوتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے اسے ڈائننگ روم کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ مگر وہاں موجود افراد اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل پر سکندر' امو جان اور شہریار خان تینوں بیٹھے تھے۔ وہ لوگ ناشتا کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا

چاہیے کہ شہریار خان اور امو جان ناشتا کر رہے تھے۔ سکندر کچھ بھی نہیں کھا رہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے شہریار خان سے کہہ رہا تھا۔

"پاپا! آپ کو نہیں لگتا' آپ نے زین کی منگنی کرنے میں تھوڑی جلد بازی سے کام لیا ہے؟"

اس کے چہرے پر تناؤ آگیا تھا۔ وہ اس کا سگا بھائی کس قدر اس سے حسد کرتا تھا۔ اس کی خود سے ایک معمولی سی برتری اور خوشی بھی اس سے سہی نہیں جا رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم یہ بات دو' تین روز پہلے بھی کہہ رہے تھے' کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

شہریار خان سنجیدگی سے سکندر کو دیکھ رہے تھے' گویا اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہتے ہوں۔ امو جان تعجب سے سکندر کو دیکھ رہی تھیں۔

"پاپا! زین ابھی چھوٹا ہے' بیس سال کی عمر میں شادی کا اتنا بڑا فیصلہ؟ اسے تھوڑا میچور تو ہو جانے دیں۔"

سکندر قدرے ہچکچا کر آہستگی سے بولا تھا۔ اس کی غصے سے بری حالت تھی۔ وہ خود پر ضبط کیے سکندر کی بکواس سن رہا تھا۔

"امریکی معاشرے کے لحاظ سے بیس سال کی عمر اس طرح کے فیصلوں کے لیے چھوٹی عمر نہیں ہے سکندر! تم بھی کوئی اچھی فیملی کی لڑکی اپنے لیے منتخب کر لو' مجھے تمہاری منگنی پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" شہریار خان چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے پاپا! پر یہ ام مریم مجھے زین کے لیے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی ہے' ہمارے زین میں ابھی تک سادگی اور بچپنا ہے' جبکہ ام مریم مجھے کافی تیز سی لگی ہے۔"

اس کا دل چاہا آگے بڑھے اور سکندر کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے۔ ایسی حاسد فطرت کا مالک تھا وہ؟ اس سے چھوٹے بھائی کی زندگی کی ایک خوشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بظاہر اس کا ہمدرد بنا وہ شہریار خان سے ام مریم کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ ا... بھائی کی محبت کے لبادے میں لپیٹ کر وہ اس کی زندگی کی واحد خوشی' ام مریم کو چھین لینا چاہتا...

"یہ تمہاری غلط فہمی اور وہم ہے' سکندر! ... کہنے سے پہلے بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ تم زین ... مریم کے رشتے سے خوش نہیں ہو۔ اب تم ... ناپسندیدگی کی وجہ بھی بتا دی ہے تو میں تم سے یہ کہوں گا کہ مریم کے متعلق تمہاری آبزرویشن غلط ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار' ہمارے گھر کی بہو بننے کے لائق۔ مجھے اور آمنہ کو وہ بہت پسند ہے۔"

شہریار خان کا جواب بھی اس کے اندر بھڑکتے غصے اور نفرت کو بجھا نہیں سکا تھا۔ وہ اس وقت تو وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ مگر جب وہ لوگ ناشتے کی میز سے اٹھ گئے اور سکندر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا' تب وہ سیدھا اس کے کمرے میں آگیا۔ اس نے دروازہ پر دستک کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھا دروازہ دھاڑ سے کھول کر اور پھر اسے زوردار دھماکے سے واپس بند کر کے اندر آگیا تھا۔

"زین۔۔۔ آؤ زین۔"

سکندر بیڈ پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا' اسے اندر آتا دیکھ کر وہ بے اختیار بیڈ سے اٹھا تھا۔ وہ کئی سالوں بعد سکندر کے کمرے میں آیا تھا۔ سکندر اس سے مصنوعی محبت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا' یوں خوشی سے اس کے نزدیک آیا تھا جیسے اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر بے پناہ خوش اور حیران ہوا ہو۔

"شکر تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین؟ بھائی الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں تو کیا ایک دوسرے سے فون پر بھی بات نہیں کرتے؟"

اس نے سکندر کی اس جھوٹی محبت اور چاہت کو نفرت سے دیکھا تھا۔

"مجھ سے جھوٹی محبت جتانے کے بجائے وہ ... تمہارے دل میں میرے لیے ہے۔ ایک انتہائی ...

اور غیر معمولی ذہین لڑکی کا ساتھ مجھے کیوں مل رہا ہے' اسی بات کی تکلیف ہے نا تمہیں؟؟" وہ نفرت سے پھنکارا' سکندر جواباً "فوراً" ہی رسانیت سے بولا تھا۔

"تمہارا انتخاب درست نہیں ہے زین! کیسے سمجھاؤں تمہیں' مریم کسی بھی طرح تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"میرے لیے کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب اس کا فیصلہ میں خود کروں گا تم نہیں۔" وہ نفرت اور غصے سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔ "میری ہمدردی کی آڑ میں آئندہ اگر تم نے پاپا یا امو جان سے مریم اور میرے رشتے کے خلاف کچھ کہا تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں سکندر سے کہا۔ سکندر جواب میں بالکل چپ کھڑا تھا۔ وہ نفرت اور غصے سے اسے دیکھتا پیر پٹختا اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔ سکندر کو وارننگ دیتے' اس کی طبیعت صاف کرنے کے بعد بھی اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ آخر اس کی جرات کیسے ہوئی ام مریم کے خلاف پاپا اور امو جان کے ذہنوں میں زہر انڈیلنے کی' ان کا برین واش کرنے کی۔

ام مریم سو کر اٹھ گئی تھی۔ اس کی خاطر اس نے زبردستی اپنا موڈ ٹھیک کیا تھا۔ خود کو ہنستا مسکراتا اور خوش باش ظاہر کیا تھا۔ مگر ام مریم کو پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ بہت چپ تھی۔ اسے فکر ہوئی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ رات میں اسے بخار بھی چڑھ گیا۔ الٹیاں بھی ہوئی تھیں۔ اس نے ناشتے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس کے اصرار پر صرف چائے لے لی تھی۔

ام مریم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اب اس کا آج پارٹی میں جانا تو بہت مشکل لگ رہا تھا۔ آج اسے اور ام مریم کو شہریار خان اور امو جان کے ساتھ نیو ایئر کے حوالے سے ایک پارٹی میں جانا تھا۔ یہ پارٹی جرمن ایمبیسیڈر کے گھر پر تھی۔ چونکہ شہریار خان کے ان سے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے۔ سو انہوں نے شہریار کی ساری فیملی کو پارٹی میں انوائٹ کیا تھا۔

سکندر کل شام ہی پارٹی میں جانے سے معذرت کر چکا تھا یہ کہہ کر کہ اسے گھر پر اپنا کوئی اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا جو چھٹیوں کے فوراً بعد اس نے اپنے پروفیسر کو جمع کروانا تھا۔ ام مریم کہہ رہی تھی کہ وہ پارٹی میں جائے گی۔

"انکل نے اتنے پیار سے کہا ہے کہ مریم بھی چلے گی۔ مریم بھی ہماری فیملی کا حصہ ہے۔ اگر میں نہیں گئی تو انکل کو اچھا نہیں لگے گا۔"

طبیعت کی ناسازی کے باوجود وہ اس کے پاپا کی خاطر پارٹی میں جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے امو جان سے بھی یہی کہا تھا کہ وہ پارٹی میں جا رہی ہے' حالانکہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے پارٹی میں بیٹھا نہیں جا سکے گا۔

"بیٹا! تم گھر پر آرام کرو' پارٹی میں جا کر بلاوجہ تھکو گی' طبیعت کہیں زیادہ خراب نہ ہو جائے۔" امو جان نے مریم سے کہا وہ اسے ڈاکٹر کو دکھا کر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے الٹیاں روکنے کے لیے دوا دے دی تھی۔ وہ خود بھی اب پارٹی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر پر ام مریم کے ساتھ رکنا چاہتا تھا۔ بیماری میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' مگر مجبوری تھی۔

شہریار خان کے جرمن دوست نے ان کے تمام فیملی ممبرز کو دعوت دی تھی۔ اگر شہریار خان کے بچوں میں سے کوئی بھی ساتھ نہ جاتا تو یقیناً" وہ برا مانتے۔ وہ مریم کو دوا دے کر' اسے آرام کرنے کی تاکید کر کے شہریار خان اور امو جان کے ساتھ گھر سے روانہ ہوا تھا۔ مریم کو لیونگ روم میں صوفے پر کشنز وغیرہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے اور ٹی وی دیکھتا چھوڑ آیا تھا۔

جرمن ایمبیسیڈر کا گھر ان کے گھر سے کافی دور تھا۔ وہ لوگ راستے میں تھے اور اپنے گھر سے کچھ دور آ چکے تھے۔ جب امو جان کو اچانک ہی گاڑی میں ان تحفوں کی کمی کا احساس ہوا جو وہ ایمبیسیڈر کے گھر لے

جا رہے تھے۔ نیو ایئر کے حوالے سے کیک، چاکلیٹس، پھول، ایک مشہور مصور کی بنائی قیمتی پینٹنگ، جو اموجان نے خوب صورتی سے پیک کروا رکھی تھی۔ ایمبیسیڈر کی بیگم کرسٹلز کی شوقین تھیں تو کرسٹل کے خوب صورت گل دان کا ایک سیٹ بھی تحفوں میں شامل تھا۔

تمام تحفے انہوں نے گلزار سے گاڑی میں رکھنے کے لیے کہا تھا۔ مگر شاید وہ تحفے رکھنا بھول گیا تھا۔ شہریار خان اس لاپروائی پر بیوی کے اوپر برہم ہو رہے تھے۔ ایسی بھی کیا لاپروائی کہ سب کچھ نوکروں کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔ بہرحال اب تحفے لیے بغیر خالی ہاتھ تو وہ لوگ پارٹی میں نہیں جاسکتے تھے۔ غصہ کرنے کے باوجود بھی لامحالہ شہریار خان نے ڈرائیور سے گاڑی موڑنے کو کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ گھر واپس پہنچ گئے تھے۔ ان کی گاڑی پورچ میں رکی تھی۔

شہریار خان اور اموجان گاڑی ہی میں بیٹھے تھے۔ شہریار خان نے اس سے اندر سے تحفے اٹھا کر لانے کو کہا تھا۔ وہ گاڑی سے اترنے لگا، تب ہی اندر سے کسی کے چلانے کی آوازیں اور کچھ گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں ان لوگوں کو پورچ میں سنائی دیں۔ اموجان نے گھبرا کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"یا اللہ خیر۔" گھبرا کر صرف وہ ہی نہیں شہریار خان اور اموجان بھی گاڑی سے اترے تھے۔ وہ اندھا دھند اندر کی طرف بھاگا۔ اموجان اور شہریار خان اس کے پیچھے اندر کی طرف دوڑے تھے۔ "بچاؤ، بچاؤ، کوئی ہے مجھے بچاؤ، چھوڑو مجھے۔" چلاتی ہوئی یہ آواز سن کر اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی، یہ ام مریم کی آواز تھی۔ اس کی حالت ایک پل میں غیر ہو گئی تھی۔ ایک سیکنڈ کے اندر وہ گھر کے داخلی دروازے تک پہنچا تھا۔ یہ دروازہ ان کے لیونگ روم ہی میں کھلتا تھا۔ اس نے خوف، پریشانی اور شدید گھبراہٹ کے عالم میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ لیونگ روم میں داخل ہونے والا سب سے پہلا شخص وہ تھا، اس کے پیچھے شہریار خان اور اموجان بھی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

وہاں جو منظر اس نے دیکھا، کاش اسے دیکھنے سے پہلے وہ مر گیا ہوتا۔ کاش وہ مر گیا ہوتا۔ چلاتی، روتی اور خود کو بچاتی ام مریم کارپٹ پر سکندر کی گرفت میں تھی۔ وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی ساتھ رو رہی تھی، وہ چلا رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں سکندر! مجھے چھوڑ دو۔"

وہ خود کو سکندر کے مضبوط وجود کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے پوری مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سینڈوچز، فروٹس اور کافی پر گزارا کرتی کل شام سے اسٹوڈیو میں تھی۔ پینٹ کرنے کے لیے اس کے اندر کے آرٹسٹ کی تڑپ پوری طرح بے دار تھی، سو وہ بغیر کسی وقفے کے کام کر رہی تھی۔ نینی چونکہ اس کی اس طرح کی کیفیتوں سے پوری طرح آگاہ تھیں، آ آ کر یہ تو کہہ رہی تھیں کہ وہ رات کا کھانا نیچے آ کر کھالے، ناشتا کر لے۔

جب وہ منع کرتی تو کھانا، ناشتا کینوس سے نظریں اٹھائے بغیر ادھر ہی پہنچائے جانے کی بات ہوتی، جب وہ کینوس سے نظریں اٹھائے بغیر اس سے انکار کرتی تب وہ اس کے لیے سینڈوچز، ناشپاتی اور پھر کافی بنا کر اوپر ہی لے آتیں۔ وہ ٹی شرٹ اور ٹریک سوٹ کے ٹراؤزر میں ملبوس تھی، بالوں کو لپیٹ کر کیچر میں جکڑ رکھا تھا۔

صبح گیارہ بجے فلورنس کی آرٹ گیلری جہاں اس کی تصویروں کی نمائش ہونا تھی۔ اس کے ڈائریکٹر کا فون آگیا، یہ پوچھنے کے لیے کہ اس کی کتنی تصاویر مکمل ہو چکی ہیں۔ انہیں یہ اطمینان دلا کر کہ مقررہ وقت تک وہ اپنا کام پورا کر لے گی، اس نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون پر گفتگو ختم کی تھی۔

کال ختم کرتے ہی اسے سکندر کا خیال آیا تھا۔ اس نے اپنی دو دن کی مصروفیات بتائی تھیں اور یہ کہا تھا آنے والے کل وہ اس کے ساتھ جہاں وہ کہے جانے کے لیے تیار ہے۔ اس نے فوراً ہی سکندر کو کال ملائی تھی۔

"ہیلو لیزا۔" اس نے فون پر سکندر کی مسکراتی ہوئی آواز سنی۔ اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کی تھی۔

"کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟" سکندر نے دوستانہ سے لہجے میں ساتھ ہی مزید پوچھا۔

"میں اسٹوڈیو میں ہوں۔ پینٹ کر رہی ہوں۔ میں نے تم سے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ کیا ہم کل مل رہے ہیں اور کیا یہ وہ والی کل ہے جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک پورا دن میرے لیے ہوگا؟"

مسکرا کر پوچھتی وہ دروازہ کھول کر باہر بالکونی میں نکل آئی۔ بالوں کی چہرے کے اطراف بکھری لٹوں کو اس نے ہاتھوں سے پیچھے کیا تھا۔ سکندر اس کی بات کے جواب میں دھیرے سے ہنسا۔

"ٹھیک ہے' کل وہی والی کل ہے جس میں تم نے مجھے پینٹ کرنا ہے۔ تم یہ بتاؤ' چلنا کہاں ہے؟ تم پینٹنگ کہاں بنانا چاہتی ہو؟"

جگہ تو وہ اس وقت سے سوچے بیٹھی تھی جب سکندر نے اپنی پینٹنگ بنوانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

"Tivoli چلتے ہیں۔"

"Tivoli ... اچھا ٹھیک ہے' چلنا کب ہے؟" سکندر نے فوراً ہی اس کی بتائی جگہ کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

"کل صبح' میں تمہیں تمہارے ہوٹل سے پک کرلوں گی۔"

"لو کے مصورہ! کل میں آپ کے ڈسپوزل پر ہوں گا' جو جگہ آپ طے کریں' جو وقت آپ مقرر کریں۔" سکندر کی قدرے شرارتی سے انداز میں کہی بات کے جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "اتنے فرماں بردار بنے ہوئے ہو' خیر تو ہے؟"

"وعدہ نبھا رہا ہوں جو میں نے اپنی رومن فرینڈ سے

آیا تھا۔" وہ بھی اس کے ساتھ ہنس رہا تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے سکندر! تکلیف کم ہوئی؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، جتنے گھنٹے تم کل مجھے پینٹنگ بنانے کے لیے ایک ہی جگہ ایک ہی زاویے سے بٹھائے رکھنا چاہو، میں بیٹھ جاؤں گا۔"

سکندر نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا سکندر سے بات ختم کرنے کے بعد وہ بالکونی ہی میں کھڑی کل کا دن پلان کرنے لگی تھی۔

٭ ٭ ٭

وہ آفس دیر تک رکا تھا۔ اس کے جن کاموں کا حرج ہوا تھا ان دو دنوں میں وہ مکمل کر چکا تھا۔ جو دو ایک کام مزید اس کے ذمے تھے اور اسے یہاں پر مکمل کر کے جانے تھے اس نے آج ان کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ امید تھی کہ مزید دو سے تین دنوں میں وہ اپنے سارے کام مکمل کر کے یہاں سے دوبارہ واپسی کی تیاری کرے گا۔ وہ کل تک بیساکھی کے سہارے چلا تھا اور اسپتال جا کر پیر کی بینڈیج بھی تبدیل کروائی تھی۔ آج وہ بغیر بیساکھی کے آفس آیا تھا، ٹھیک ہے ابھی اس کی چال بالکل نارمل نہیں ہوئی تھی مگر اپنی چوٹ کے مزید چاؤ چونچلے اٹھانے کا اس کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ہوٹل واپس آکر کمرے ہی میں رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنے پیر کی بینڈیج کھولتے، زخم کو صاف کرتے، دوا لگاتے، بینڈیج کرتے چاہے اسے جتنی بھی مشکل ہوئی تھی، جتنا بھی درد ہوا تھا اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ کوئی احتیاط نہیں کر رہا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس لاپروائی اور بداحتیاطی کے باوجود بھی وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ چاہے جتنا بھی بیمار ہو جاتا، چاہے اس کے کتنی بھی خطرناک چوٹیں نہ لگ جاتیں۔ وہ ہمیشہ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ وہ واقعی بہت ڈھیٹ تھا، اسے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا، وہ اب کی بار بھی مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔ چاہے وہ زخم کی سرے سے پروا ہی کیوں نہ چھوڑ دے۔ اس کے جتنا ڈھیٹ اور جان بھی شاید ہی کوئی دوسرا ہوگا۔ بینڈیج کرنے کے دوران بجائے درد اور تکلیف محسوس کرنے کے وہ تلخی سے مسکراتا خود اپنے آپ پر ہنس رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

لیزا نے صبح ساڑھے آٹھ بجے تک نکلنے کے لیے کہا تھا۔ سوا آٹھ کے قریب وہ جانے کے لیے تیار ہو جانے کے بعد نکل آیا تھا۔ اس کا رخ اپنے ہوٹل سے نزدیک ایک بار کی جانب تھا۔ وہ بار میں آگیا تھا۔ وہاں جلدی جلدی ناشتا کرتے رومن مرد اور عورتوں کو اپنے اپنے کام پر پہنچنے کی عجلت تھی۔ وہ کاؤنٹر کے سامنے آگیا۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑے بوڑھے اٹالین بار ٹینڈر سے اس نے اپنے لیے رومنوں ہی کی طرح کافی اور ڈونٹس آرڈر کرنا تھا۔ وہ لیزا سے کتنی اٹالین سیکھ پایا ہے، آج اس کا امتحان تھا۔ بار ٹینڈر نے Buan Goirno کہہ کر مسکراتے ہوئے اسے کیا چاہیے پوچھا تھا۔

کافی کیسی چاہیے، یہ آرڈر اس نے آسانی سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کر دیا تھا۔ وہاں ڈونٹس کے لیے اسے اشاروں کی زبان سے کام لینا پڑا تھا۔ اس کی کیا قیمت ہے، یہ کتنے کا ہے، کتنے پیسے ادا کرنے ہیں اس کے لیے لیزا کیا بولتی تھی، وہ اس نے بہت غور سے سن رکھا تھا۔

اس نے خود اعتمادی سے بار ٹینڈر سے Costa Quanto پوچھا تھا۔ دل ہی دل میں خود کو شاباشی بھی دی تھی۔ وہ اٹلی میں اپنا ناشتا ٹوٹی پھوٹی ہی سہی اٹالین میں آرڈر کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اور اس بات پر بچکانہ سی خوشی محسوس کرنے پر خود پر ہنسا بھی تھا۔

خالص رومنوں کی طرح کاؤنٹر کے سامنے ہی اسٹول پر اپنی کافی اور ڈونٹ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی اس نے ڈونٹ ہاتھ میں اٹھایا ہی تھا کہ اس کے موبائل

پر لیزا کی کال آگئی۔
"میں نے سوچا، تمہیں بتادوں میں گھر سے نکل گئی ہوں۔ دس منٹ میں تمہارے ہوٹل ہوں گی۔" اس نے بتایا تھا۔
"ہوٹل سے ذرا سا آگے چلی آنا۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اس سے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میں۔
"جب تم روم میں ہو تو رومیوں کی طرح رہو۔"
کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے تم رومنز کی طرح بار میں بیٹھ کر ناشتا کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔
"ویری انٹرسٹنگ۔" لیزا نے خوش ہو کر کہا۔
"میں نے خود اپنے لیے ناشتا آرڈر کیا، وہ بھی اٹالین میں۔ کیا تمہیں یقین آرہا ہے؟"
خود کو شاباشی دینے کے بعد جیسے اسے اب لیزا سے بھی اس کارنامے پر تعریف وصول کرنا تھی۔
"مکمل جملے نہیں بول سکا۔ مگر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں، میں نے بار ٹینڈر کو اپنی بات سمجھا ہی دی۔" وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔
"یہ تو واقعی قابل تعریف بات ہے۔ میں آپ کی اس ذہانت پر آپ سے بری طرح امپریس ہو گئی ہوں۔ سینور سکندر۔" لیزا جیسے اس کی بات کا لطف لیتے ہوئے ہنسی تھی۔
"اوکے۔ تم اپنا ناشتا ختم کرو، اتنی دیر میں، میں پہنچ رہی ہوں۔"
بہت سکون سے بیٹھ کر اس نے کافی اور ڈونٹ کو انجوائے کیا۔ اس کے بعد وہ بار کے دروازے سے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے لیزا کی گاڑی آتی دکھائی دی تو اس نے دور سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔ لیزا نے گاڑی اس کے پاس لا کر روکی تھی۔
اس نے براؤن سفاری پینٹ کے ساتھ گرین کلر کا ڈھیلا ڈھالا ٹاپ پہن رکھا تھا۔ بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسٹائلش لگ رہی تھی، رومن لگ رہی تھی، آج اس نے بھی اپنے حلیے پر ذرا زیادہ دھیان دیا تھا کہ آج لیزا نے اسے پینٹ کرنا تھا، ورنہ آج کون سا آفس جانا ہے، سوچ کر شاید اس نے شیو بھی نہیں کرنا تھا۔ لیزا اسے بغیر بیساکھی کے دیکھ کر کچھ حیرت اور کچھ غصے سے چلائی تھی۔
"تمہاری۔۔۔۔۔ بیساکھی کہاں ہے؟" وہ غصے اور فکرمندی سے گاڑی سے اتر آئی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔
"لیزا! میری چوٹ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے، پھر بے کار میں اسے لے کر چلنے کا کیا فائدہ تھا؟ اس سے مجھے الجھن ہی ہو رہی تھی۔"
وہ اس کے غصے اور خفگی سے ڈر کر قدرے مدافعانہ انداز میں بولا۔
"دکھاؤ ذرا مجھے اپنی چوٹ۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے، تمہاری چوٹ کتنی ٹھیک ہو گئی ہے۔"
وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر پکی لڑاکا عورتوں والے انداز میں بولی۔
"اگر اس طرح سے لڑو گی، چیخو، چلاؤ گی تو میں پینٹنگ نہیں بنوا رہا۔" اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی دیکھ کر اس نے جھٹ دھمکی دی تھی۔
"ہوٹل چل کر لے لو سکندر پلیز۔ تمہیں چلنے پھرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔"
وہ اس بار نرمی سے اور دوستانہ انداز میں بولی تھی۔
"میں نہیں لے رہا۔ تم نے چلنا ہے تو ایسے ہی چلو۔ بہت نخرے اٹھالیے میں نے اپنی چوٹوں کے۔"
وہ لاپروائی سے بولتا گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لیزا باہر کھڑی اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔
"اب چلو بھی مصورہ! مجھے گھورنے کا شوق تو راستے میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔"
اسے خود احساس ہوا تھا کہ اس کے بولنے کا لاپروا

انداز' اس کی ٹون' اس کے الفاظ بہت حد تک لیزا جیسے تھے' اتنے دنوں سے ہر روز اس کے ساتھ ملنے اور وقت گزارنے کے بعد وہ شاید کچھ کچھ اس کے جیسا ہوتا جارہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا ہار مانتی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔

"بہت ضدی ہو تم' جو سوچ لیتے ہو کرتے وہی ہو' چاہے تمہیں جتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کرلی جائے۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ خفگی سے بولی۔

"پوری امید ہے مجھے تم ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گئے ہوگے اور میڈیسن لینا بھی چھوڑ دی ہوگی۔"

"یار یہ ایکسیڈنٹ بہت ہوگیا ہے اب۔ میں بور ہوگیا ہوں اسی ایک ٹاپک سے۔ پلیز کوئی اور بات کرو۔"

لیزا نے اسے گھورا۔ وہ جواباً" چپ ہوگئی تھی۔ وہ اب خاموشی سے ڈرائیو کررہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے میں نے کتنی اٹالین سیکھ لی ہے؟" اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اسے بولنے اور ہنسنے پر اکسا رہا تھا۔ لیزا نے صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔

"اب میں نے سوچنا بھی اٹالین میں شروع کردیا ہے۔ ابھی بار کے پاس جب تم گاڑی لاکر روک رہی تھیں تب تمہیں دیکھتے کے ساتھ میں نے پتا ہے اٹالین میں کیا لفظ سوچا تھا؟"

لیزا نے زبان سے کہا "کیا سوچا تھا؟" اب بھی نہیں پوچھا تھا' صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"bella" وہ کوشش کرکے اٹالین لہجے میں بولا تھا۔ bella اٹالین میں خوب صورت اور حسین کو کہتے ہیں' اتنا تو وہ سیکھ ہی چکا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"بہت تیز ہو تم مینیور سکندر! تمہیں پتا ہے لڑکیوں کو کس طرح خوش کیا جاسکتا ہے۔"

وہ جواباً" مسکرا دیا تھا۔

"خیر خوب صورت تو میں ہوں' یہ مجھے پتا ہے۔" فوراً" ہی مغرورانہ سے انداز میں بولی تھی۔

شکر تھا اس کی کوشش کامیاب رہی تھی' اب موضوع گفتگو اس کی چوٹیں' دوائیں اور بیساکھی نہیں رہی تھیں۔

"ہم Tivoli کیوں جارہے ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اس نے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی لیزا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوگیا ہے مینیور سکندر! تمہاری پینٹنگ بنانے اور کس لیے؟" وہ جیسے اس کے سوال پر حیران ہوئی تھی۔

"وہ تو مجھے پتا ہے' میرا مطلب ہے Tivoli ہی کیوں جارہے ہیں' کہیں اور کیوں نہیں؟"

"سوال اچھا ہے۔" وہ اس کے سوال پر مسکرا کر بولی۔ ایک پل رک کر جیسے اس نے اپنی سوچوں کو یکجا کیا۔

"میرا دل چاہ رہا تھا میں Villa d este کے کسی خوب صورت سے فوارے کے سامنے تمہیں بٹھا کر وہاں تمہاری پینٹنگ بناؤں۔ میری پینٹنگ کا مرکز تم ہو اور تمہارے بیک گراؤنڈ میں سولہویں صدی کا کوئی بے مثال آرکیٹکچر رکھتا فوارہ اور اس سے گرتا پانی ہو۔ پانی میں جیسی گہرائی' جیسی طاقت اور جیسا اسرار ہوتا ہے مجھے وہی گہرائی' وہی طاقت اور وہی پراسراریت تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مجھے سوچنے ہی سے یہ منظر بہت انسپائر کرتا ہے' فیسی نیٹ کرتا ہے۔"

وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سچائی سے بول رہی تھی۔

"مجھے تمہاری آنکھوں میں اتنے سارے تاثر نظر آتے ہیں' اداسی' درد' کرب' طاقت' گہرائی' پراسراریت جیسے یہ آنکھیں اپنے اندر نہ جانے

راز چھپائے بیٹھی ہیں' میں پانی کو تمہاری آنکھوں کے ساتھ ایک سمبل کے طور پر دکھانا چاہتی ہوں۔ دونوں میں گہرائی' دونوں میں اسرار۔"

"اس طرح بولتے ہوئے تم پکی پکی مصورہ لگ رہی ہو۔ تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے میں مرعوب ہو رہا ہوں سینوریتا۔"

لیزا کی سنجیدگی کے جواب میں وہ ہنسا۔ لیزا نے اسے ان نظروں سے دیکھا تھا' جیسے اس سے براہ راست کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر اس نے سکندر کی آنکھوں کا وہ تنبیہی تاثر فوراً" پڑھ لیا تھا کہ وہ اس سے اس کی ذات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھے۔ وہ چپ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے تھے۔

"تمہاری ننی کیسی ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اس نے گفتگو کے لیے موضوع تلاش کیا تھا۔

"ٹھیک ہیں' تمہیں دعا' پیار کہلوایا ہے انہوں نے' اور یہ بھی کہا ہے کہ تم ہوٹل واپس جانے کے بعد سے ہمارے گھر آئے کیوں نہیں ہو اور ہمارا آج جانے کا مقصد گو کہ تمہاری پینٹنگ بنانا ہے' مگر ننی نے ہمیں اس میں پکنک کا مزا فراہم کرنے کے لیے بڑی زبردست پکنک باسکٹ تیار کر کے دی ہے۔ Tivoli میں جب لنچ کریں گے' تب تم دیکھنا ننی نے کتنی مزے مزے کی چیزیں ہمارے کھانے کے لیے تیار کر کے بھیجی ہیں۔"

اس نے سکندر کے کسی ردعمل کی وجہ سے کچھ محسوس کیا ہے' یہ تاثر دیے بغیر وہ مسکرا کر بولی۔ باتیں کرتے ہلکی آواز میں میوزک سنتے' لیزا کی فاسٹ ڈرائیونگ کے سبب وہ روم سے باہر اس خوب صورت اور پر فضا ہل ٹاؤن جلد پہنچ گئے تھے۔

پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب ٹائیولی کا موسم وہاں کی آب و ہوا روم سے زیادہ خوش گوار اور پر فضا تھی۔ یوں ہی تو نہیں ٹائیولی سولہویں صدی سے رومنوں کی پسندیدہ ریزورٹ رہی۔ رومن بادشاہوں کے محلات کے ساتھ بنائے گئے یہ گارڈنز پورے اٹلی میں سب سے خوب صورت اور سب سے منفرد گارڈن مانے جاتے تھے۔ ہنرمندی' کاری گری' مہارت' خوب صورتی اور حسن کا شاہکار آرکیٹیکٹس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت یہ باغات اور پانچ سو فوارے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا کرتے تھے۔ ان فواروں کی تخلیق میں سولہویں صدی کے آرکیٹیکٹس' سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں کی بے مثال مہارت اور ہنرمندی جھلکتی تھی۔ روم میں سیاحوں کے شور' ہنگامے' گہما گہمی اور رش سے دور یہ ایک خاموش اور پر فضا ہل ٹاؤن تھا۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر رہے تھے۔ لیزا گاڑی کی پچھلی سیٹ سے سامان نکالنے لگی۔ اس نے پکنک باسکٹ نکال کر اسے پکڑائی تھی۔ اب وہ اپنا کینوس' ایزل اور رنگ وغیرہ نکال رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کر دیتا ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر تلے دو بیٹیوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

وکٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر گئی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اوسط درمیانہ درجہ کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدہ کے مطابق سیم کو وکٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔

وکٹوریا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس مین سے شادی کرلی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے رومانہ سے بھی بہت پیار تھا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔ محمود خالد، سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے اس کے باوجود وکٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہو گئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کرلی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہو سکی وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف ہاشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہریار کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شاندار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہریار کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پرپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پروپوزل بہت خوش دلی سے قبول کرلیا۔ زین شہریار نے اپنی والدہ کو فون کر کے بتا دیا۔

لیزا نے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ سکندر اسپتال میں ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ لیزا فوراً ہی اسپتال پہنچی۔ سکندر کے پیر میں چوٹ آئی تھی لیزا دو دن اس کے ساتھ اسپتال میں رہی۔ ڈسچارج ہونے پر لیزا سکندر کو اپنے گھر لے آئی۔

زین کے والد کو جب زین کی ام مریم سے وابستگی کا پتا چلا تو انہوں ام مریم کے والدین اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہریار خان، ام مریم کے والدین سے ملے تو انہیں ام مریم اپنی بہو کی حیثیت سے بہت پسند آئی زین کی منگنی ام مریم کے ساتھ ہو گئی۔ ام مریم چھٹیاں گزارنے کے لیے زین کے ساتھ شہریار خان کے گھر آئی۔

سکندر کچھ دن لیزا کے گھر رہ کر اپنے ہوٹل آگیا۔ نینی کو سکندر بہت پسند آیا تھا اور انہوں نے بھی اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

ام مریم اور زین واشنگٹن میں آمنہ اور شہریار کے ساتھ بہت خوش ہوتے ہیں۔ شہریار خان کو اپنی ہونے والی بہو ام مریم بہت پسند آتی ہے۔ ان دنوں سکندر بھی واشنگٹن آجاتا ہے۔ ام مریم اور سکندر کی ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم، سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بدتمیزی کی حد تک بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ام مریم سکندر کی ہر بدتمیزی کو نظر انداز کرتی رہتی ہے۔ زین ان دونوں کے مابین اس سرد رویے کو محسوس کرتا ہے اور اسے سکندر پر غصہ آتا ہے۔

سکندر لیزا کو اپنی پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ لیزا بہت خوش ہوتی ہے۔ سکندر شہریار خان سے کہتا ہے کہ ام مریم اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اس کی زین سے منگنی توڑ دیں۔ زین سن لیتا ہے اور مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ وہ سکندر سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

شہریار خان کے جرمن ایمبیسڈر دوست کے گھر نئے سال کی دعوت میں شہریار خان اور ان کی پوری فیملی نے شرکت کرنی ہے مگر ام مریم طبیعت خراب ہونے اور سکندر ضروری اسائنمنٹ مکمل کرنے کی وجہ سے نہیں جا پاتے۔ مجبوراً زین کو جانا پڑتا ہے۔ وہ پارٹی میں لے جانے کے لیے گفٹس بھول جاتے ہیں۔ آدھے راستے میں پلٹ کر واپس گھر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لونگ روم میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کر رہا ہے۔ ام مریم روتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

۵
پانچویں قسط

اس کا ایزل اور پلیٹس وغیرہ سب کچھ پورٹیبل تھا رنگ، برشز، کینوس، پینٹنگ میں استعمال کی جانے والی تمام چیزیں بڑی آسانی سے فولڈ ہو کر اس کے ایزل کے مختلف خانوں میں سمائی ہوئی تھیں۔ ایک ہی جگہ سمائی ان تمام چیزوں کو با آسانی لے کر چلا جا سکتا تھا۔ یہ سارا سامان وہ اپنے ساتھ آوٹ ڈور پینٹنگ کے لیے رکھا کرتی تھی۔ پینٹنگ بنا لینے کے بعد اس کی رنگوں سے گیلی پینٹنگ کو بحفاظت رکھنے کے لیے بڑا محفوظ ساخانہ بھی ایزل میں موجود تھا۔

"اس وقت سے لے کر شام تک جتنا کام ہو سکے گا کروں گی، میری کوشش یہ ہے کہ پینٹنگ کے خدوخال آوٹ ڈور میں واضح کر لوں، باقی پھر فنشنگ کا کام تو اسٹوڈیو میں بھی ہو سکتا ہے۔"

اندر داخل ہوتے ہوئے وہ اس سے بولی تھی۔

"صبح سے شام تک لگ کر بھی پینٹنگ مکمل نہیں ہوگی؟"

وہ پکنک باسکٹ اور ایک دوسرا بیگ جس میں لیزا نہ جانے کیا بھر کر لائی تھی، لے کر چل رہا تھا جبکہ لیزا کے ہاتھ میں اپنا پورٹیبل ایزل تھا اور کندھے پر بیگ لٹکا تھا۔

"پینٹنگ کو کیا بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے مسٹر سکندر؟" لیزا نے اسے گھورا۔

"اوکے، اوکے سوری، یہ ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور وہ بھی آوٹ ڈور پینٹنگ بنانا۔"

"اور وہ بھی اتنے مشکل بندے کی۔ تمہاری آنکھوں کے تمام تاثر میں کینوس پر اتار پائی تو سمجھوں گی میں ایک کامیاب آرٹسٹ ہوں۔"

اس کی بات کاٹ کر لیزا نے فوراً ٹکڑا جوڑا تھا۔ وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔

"تمہیں پتا ہے، مسٹر سکندر! تم بہت ہینڈسم ہو۔ معلوم نہیں کیوں، مگر ہر بار تمہیں دیکھ کر اپالو کا خیال آتا ہے۔"

وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی مگر وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"یہ جوابی تعریف اس لیے ہو رہی ہے کہ ابھی راستے میں آتے ہوئے میں نے تمہارے لیے لفظ bella (خوبصورت) بولا تھا؟"

"نہیں، میں سچے دل سے تمہاری تعریف کر رہی ہوں اور زیادہ بنو مت۔ تمہیں یہ بات خود بھی بہت اچھی طرح پتا ہے۔ صبح سے شام تک کتنی عورتیں اور لڑکیاں تمہاری تعریف کرتی ہوں گی، تم پر فدا ہوتی ہوں گی۔ کیا تمہیں پتا نہیں چلتا؟"

"نہیں، مجھے یہ بات ابھی ابھی لیزا محمود نے کہی تب زندگی میں پہلی بار اس بات کا یقین آیا ہے۔"

بہت دھیمے لہجے میں کہی سکندر کی اس بات میں سچائی تھی، جذب تھا۔

اس نے سکندر کی آنکھوں میں دیکھا' اسے اس کی آنکھیں سچ بولتی ہوئی لگیں' جیسے وہ اندر' باہر' ظاہر اور چھپی ہر بات ان آنکھوں کی پڑھ سکتی ہے۔ ایسا لگا۔ لمحہ بھر کے لیے ان آنکھوں میں آیا وہ تاثر لمحے بھر میں ہی کہیں پھر سے چھپا لیا گیا تھا۔ وہ اپنے لہجے کی سچائی اور سنجیدگی کو فوراً" ہی غیر سنجیدگی اور مزاح کے رنگ میں ڈھال رہا تھا۔

"میں ہینڈسم اور خوب صورت ہوں۔ تب ہی تو مشہور مصورہ لیزا محمود کے ماڈل کے طور پر منتخب کیا گیا ہوں۔ ایسوں ویسوں کو تو وہ پینٹ کرتی بھی نہیں ہوں گی۔"

وہ جواباً" ہولے سے مسکرا کر چپ رہی۔

"تمہیں کیسے لگ رہے ہیں Villa d este کے یہ باغات فوارے اور آبشار؟"

اندر آنے کے بعد وہ دونوں پتھروں سے بنے ایک خوب صورت راستے پر چل رہے تھے' جس کے ایک طرف سبزہ ہی سبزہ اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے سو فوارے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اوپر نیچے تین قطاروں میں بنے فواروں کے درمیان میں بھی سبزہ تھا اور اس سبزے کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر للیز اور عقاب کی اشکال آرکیٹکٹس نے پتھروں سے تراش کر بنائی تھیں۔

ان جانوروں اور پھولوں کے منہ سے پانی بڑے خوب صورت انداز میں گر رہا تھا۔ اوپر والی قطار سے پانی نیچے والی قطار میں لگے فواروں پر گر رہا تھا' پھر اس سے نیچے والی قطار میں اور پھر وہاں سے یہ سارا پانی ایک خوب صورت سے نالے میں جا کر گر رہا تھا۔ بہت سے سیاح وہاں کھڑے ہو کر اور مختلف انداز میں بیٹھ کر تصویریں کھنچوا رہے تھے۔

ان کے بیچ خاموشی جب زیادہ طویل ہونے لگی تو اس نے سکندر کو مخاطب کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ان کے دائیں طرف موجود ان سو فواروں اور وہاں موجود سیاحوں کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"تمہارے روما کی طرح تمہارا Tivoli بھی بہت خوب صورت ہے لیزا! اس قدر سبزہ اور اس قدر ہریالی جس طرف نگاہ اٹھاؤ سبزہ' ارد گرد دور دور تک دیکھو تو سرسبز پہاڑ نظر آ رہے ہیں اور اپنے اطراف نگاہیں دوڑاؤ تو رومن آرکیٹکچر — کا شاہکار یہ باغات' یہ فوارے اور آبشار' ایسا لگ رہا ہے' ہم پندرہویں' سولہویں صدی کے رومن دور میں چلے گئے ہیں۔"

"مجھے بھی یہاں آ کر ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ میں رومن دور میں چلی گئی ہوں۔"

وہ دونوں مضبوط پتھروں سے بنے اونچے نیچے راستے پر جو کہیں کسی ڈھلان میں اترتا لگ رہا تھا' چل رہے تھے۔ وہاں ارد گرد نظریں دوڑانے پر باغات' ان میں بنے فوارے' آبشار' خوب صورت داخلی راستوں والے غار' کہیں ڈھلان کی طرف جاتے نظر آ رہے تھے اور کہیں چڑھائی کی طرف۔ گویا کبھی آپ کو ایسا لگے گا کہ آپ ڈھلان کی طرف جا رہے ہیں اور کبھی اوپر چڑھائی کی طرف۔

وہ ایک آرٹسٹ کی نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی اس مناسب ترین جگہ کی تلاش میں تھی جسے اس کی پینٹنگ کا بیک گراؤنڈ بننا تھا۔

"ہم راستے میں اتنے سارے خوب صورت فوارے چھوڑ آئے ہیں۔ تم نے ان میں سے کسی کو بھی سلیکٹ نہیں کیا' کیا کسی خاص جگہ کی تلاش ہے تمہیں؟"

"فوارے تو مجھے بھی بہت سارے اچھے لگے ہیں مگر وہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ جہاں زیادہ لوگ آ جا رہے ہوتے ہیں' وہاں سکون سے پینٹنگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ بلاوجہ جھانک کر دیکھتے ہیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں' کیا بنا رہے ہیں اور پھر اس پر اپنے کمنٹس دینے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ایک لینڈ اسکیپ آرٹسٹ کے طور پر یہ چیز میں بہت مرتبہ فیس کر چکی ہوں۔ اس دخل اندازی میں خوامخواہ وقت ضائع ہو جاتا ہے' جبکہ

...ے میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل بھی وقت
...یں ہے۔ مینیور سکندر بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے
...یں۔ دوبارہ تو یہ موقع نہیں ملے گا مجھے۔ ہے ناں؟"
اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے سوالیہ نگاہیں اٹھا کر
...کندر کو دیکھا۔

"اگر آج تمہارا کام پورا نہ ہو سکا تو ہم دوبارہ بھی آجائیں گے۔ سینوریتا! جو وعدہ کیا ہے' اسے نبھانا تو ہے۔"

وہ لیزا کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں مسکرا کر بولا تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے بہت دور آچکے تھے۔ کئی ڈھلانی راستوں سے گزرتے' کئی چڑھائیوں پر سے چڑھتے' وہ دونوں اب باغات میں ایسی جگہ پر تھے' جہاں فی الحال ان دونوں کے سوا دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں خاموشی اور سکون تھا اور اس خاموشی اور سکون کو صرف سامنے نظر آتے بلند و خوب صورت فوارے سے گرتے پانی کی آواز توڑ رہی تھی۔ ان کے بالکل سامنے ایک بیضوی شکل کا فوارہ تھا۔ اس کے پیچھے پہاڑ اور سبزہ نظر آرہا تھا۔ بیضوی شکل کے اس فوارے کا پانی بہت اوپر تک جا رہا تھا' اتنا اوپر جانے کے بعد جب یہ پانی نیچے گر رہا تھا تو ایک آبشار کی سی شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ اس کی پینٹنگ بنانے کے لیے آئیڈیل جگہ تھی۔ جس کی اسے تلاش تھی۔

"یہ جگہ پرفیکٹ ہے۔ ہم یہاں پینٹنگ بنائیں گے۔" وہ رک گئی تھی۔ اسے رکتا دیکھ کر سکندر بھی رک گیا تھا۔ وہ واقعی اپنے کہے لفظوں کے مطابق خود کو اس کی منشا پر چھوڑے ہوئے تھا۔

"تم یہاں بیٹھ جاؤ سکندر! مجھے یہاں پانی کی وہ پراسراریت اور طاقت نظر آرہی ہے جو مجھے اپنی پینٹنگ میں پیش کرنی ہے۔" اس نے پول کے آگے بنی چوڑی سی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

"جو آپ کا حکم مصورہ!" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے فورا" ہی سامنے دیوار پر جا کر بیٹھ گیا۔ پول کی دیوار اتنی چوڑی تھی کہ وہ آرام سے اس پر بیٹھ سکے۔ پکنک باسکٹ اور اس کا بیگ سکندر نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ بڑی مہارت اور تیز رفتاری سے اس نے اپنا پورٹیبل ایزل کھولا' اس پر کینوس کو سیٹ کیا' رنگوں اور برشز کا خانہ کھول کر فولڈ ہوئی پلیٹ باہر نکالی۔ چند منٹوں میں اس کام سے فارغ ہونے کے بعد رنگوں کے مکس کرنے سے پہلے اس نے بیگ میں سے اپنا کیمرا باہر نکالا۔ پروفیشنل فوٹو گرافرز والا جدید ماڈل کا کیمرا جو کوئی بھی لینڈ اسکیپ بناتے وقت ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

"اس پینٹنگ پر جب اسٹوڈیو میں کام کروں گی' تب مجھے اس نیچرل تاثر کو لانے کے لیے ان تصویروں کی ضرورت پڑے گی۔ مجھے صبح کی اس روشنی میں تمہاری پینٹنگ بنانی ہے' میری پینٹنگ میں لائٹ میرے سبجیکٹ اور بیک گراؤنڈ میں کہاں کس جگہ اور کس طرف سے پڑنی چاہیے' اس کے لیے مجھے صبح کے وقت کھینچی ان تصویروں سے مدد لینی پڑے گی۔ ابھی پھر جیسے جیسے دوپہر اور شام ہو گی تو پھر روشنی تم پر اور بیک گراؤنڈ پر کسی اور انداز میں پڑنے لگے گی جبکہ مجھے اپنی پینٹنگ میں سن لائٹ ایسی ہی دکھانی ہے' جیسی ابھی ہے۔"

"مجھے تو یہ باتیں سمجھ میں آتی نہیں ہیں مصورہ! جو تم مناسب سمجھو۔" وہ جوابا" مسکرا کر بولا۔ وہ پہلے بیک گراؤنڈ کی تصویریں کھینچ رہی تھی۔ اس نے کئی تصاویر ہر زاویے سے فواروں اور آس پاس کی جگہوں کی کھینچ لی تھیں۔

"اب مجھے تمہاری تصویریں کھینچنی ہیں۔ بس ایسے سیدھے بیٹھ جاؤ۔ میری طرف مت دیکھو' تھوڑا سا دائیں طرف جیسے کسی سوچ میں کھوئے ہو' اپنے اردگرد سے بے نیاز سے ہو۔"

تصویر کھینچنے کے لیے کیمرا ہاتھ میں لیے وہ سکندر کو ہدایات دے رہی تھی' ہاتھوں کے استعمال کے ساتھ' سکندر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"اتنا زیادہ دائیں طرف گردن مت کرو۔ بس تھوڑا سا' بہت ہلکا سا۔" اس نے سکندر کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے کو ہلکا سا دائیں جانب کیا' چہرے کو تھوڑا سا نیچے کیا' اس کے ایک ہاتھ کو دیوار پر رکھا اور دوسرے ہاتھ کو پکڑ کر سوچنے لگی کہ اسے کس طرح رکھا ہونا چاہیے کہ خوب صورت لگے تب یک دم ہی اسے احساس ہوا سکندر اسے بے حد خاموشی سے بغور دیکھ رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ جیسے اسے دیکھتا ہوا کسی گہری سوچ میں کھویا تھا' اس کے سوال پر چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے یک دم کسی خیال سے جاگا ہو۔

"کچھ نہیں۔" ایک گہری سانس لے کر وہ سنجیدگی سے بولا۔

"پھر بھی بتاؤ ناں!" وہ بضد ہوئی۔

"حیران ہو رہا ہوں اپنے آپ پر' جولائی کی اس صبح میں یہاں Tivoli میں ایک رومن آرٹسٹ سے اپنی تصویر بنوا رہا ہوں' وہ بھی اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے' جیسے زندگی میں اس سے اہم اور اس سے سنجیدہ کام کوئی ہو ہی نہیں سکتا؟" اس کے لہجے میں واقعی حیرانی تھی جیسے اسے خود پر یقین نہ آ رہا ہو۔ سکندر کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"سچ پوچھو تو حیران میں بھی ہوں۔ تمہارے وعدہ کر لینے کے باوجود مجھے لگ رہا تھا تم لاسٹ مومینٹس پر بے نیازی اور خود پسندی کا تاثر لیا کوئی بھی بہانہ بنا کر مجھے انکار کر دو گے۔"

وہ سنجیدگی سے اپنے دل کی بات زبان پر لائی اور سکندر جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"باتوں باتوں میں تم میری برائی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔"

ایک پل وہ اتنا قریب لگتا تھا جیسے بس اب اس پر کھل جائے گا اور اگلے پل پھر اتنا ہی دور' اتنا ہی ناقابل رسائی۔

"تصویریں کھینچو مصورہ! پھر تم نے ابھی پینٹ بھی بنانی ہے۔ باتیں کرنے میں تمہاری یہ نیچرل روشنی جو تمہیں چاہیے' رخصت ہو جائے گی۔"

اسے پتا تھا سکندر نے پھر سے خود پر لاپروائی اور بے نیازی کا خول چڑھا لیا ہے' جیسے وہ اس پر اور ساری دنیا پہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے بنا کچھ کہے سر اثبات میں ہلایا اور قریب سے اور دور سے ہر ہر زاویے سے سکندر کی تصویریں کھینچنے لگی۔ کئی تصاویر کھینچنے کے بعد وہ ایزل کے سامنے آ گئی تھی۔

"جب تم بیٹھے بیٹھے تھکنے لگو تو مجھے بتا دینا۔ ویسے میرا ارادہ یہ ہے کہ ہم ہر ایک گھنٹہ بعد پندرہ منٹ کا بریک لیں گے تاکہ تم کمر سیدھی کر سکو۔" کام کرنے کے دوران اس نے خاموش بیٹھے سکندر سے کہا۔

"میں نہیں تھک رہا' تم آرام سے اپنا کام کرو۔" اس نے اسے اطمینان دلایا۔

بجائے ایک گھنٹے کے' انہوں نے پہلا وقفہ ڈھائی گھنٹوں بعد لیا تھا۔ وہ بھی اس نے کہا تھا کہ اب بریک لیتے ہیں تب۔ سکندر تو کسی تھکاوٹ کا اظہار کر ہی نہیں رہا تھا۔

"بس اب بریک لے لیتے ہیں۔ ڈھائی گھنٹے ایک ہی طرح بیٹھے بیٹھے تمہاری کمر اکڑ گئی ہو گی۔" وہ پلیٹ اور برش کھلے خانے میں رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نہیں تھکا لیزا! تمہیں کام کرنا ہے تو اور کر لو۔"

"تم واقعی تھکتے نہیں ہو کیا؟" وہ حیرانی سے بولی اور دیوار پر سکندر کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ جواباً "یوں" مسکرایا تھا' جیسے اتنی معمولی چیزوں سے وہ تھک نہیں سکتا۔ وہ متاثر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"پتا ہے سکندر! تم مجھے بہت اسٹرانگ لگتے ہو۔ لگتے کیا ہو' تم ہو بہت بہادر' جتنا سیریس تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا ناں' تمہاری جگہ کوئی اور ہو تا تو

گھبرا گیا ہوتا جبکہ تم ہنس رہے تھے۔ تم سے زیادہ پریشان تو میں تھی۔ ایک بھرپور مرد کا جو تصور ہوتا ہے نا۔ نڈر، بہادر، دلیر وہ سب تم ہو۔ میں نے پانی کو اپنے بیک گراؤنڈ کے طور پر لیا ہی اس لیے ہے کہ پانی میں تمہاری جیسی پر اسراریت تو ہے ہی، ساتھ ہی پانی طاقت کا سمبل بھی ہے نا۔"

اس کی سنجیدگی اور سچائی سے کی بات کے جواب میں سکندر ہنسا تھا۔

"بہادر اور دلیر سے ملتے جلتے دو لفظ سخت جان اور ڈھیٹ بھی ہوتے ہیں۔" ہنس کر بولتا وہ دیوار پر سے اٹھا تھا۔ وہ حیرت سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر اپنے جسم کا تناؤ کم کر رہا تھا۔ کیا وہ خود سے ناراض تھا؟ کیا وہ خود کو سزا دیا کرتا تھا؟ وہ خود سے ناراض تھا یا دنیا سے؟ کیا زندگی نے اسے اتنے دکھ دیے تھے کہ وہ زندگی ہی سے نفرت میں مبتلا ہو گیا تھا؟

سکندر نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"بریک لیا ہی ہے تو مجھے کچھ کھلا پلا ہی دو۔ یہ باسکٹ تمہاری نینی نے یقیناً "سجانے" کے لیے تو ہرگز نہیں دی ہوگی۔" وہ ہنس کر بولا۔

وہ خاموشی سے سر ہلا کر دیوار پر سے اٹھی تھی۔ اس نے بیگ میں سے فولڈ ہوا غالیچہ نما باہر نکالا۔ وہ فولڈ کرنے کے بعد ایک ہینڈ بیگ جیسا بن جاتا تھا، سامنے کی طرف بٹن تھا۔ اس نے بٹن کھول کر تہیں کھولیں اور سامنے گھاس پر درختوں کی چھاؤں میں بچھانے کے لیے آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے سکندر بھی باسکٹ اٹھا کر وہاں آ گیا تھا۔ وہاں ابھی بھی صرف وہ دونوں ہی تھے اردگرد کوئی اور سیاح نظر نہیں آ رہا تھا۔ سکندر نے غالیچہ نما نمدہ کا دوسرا کونا پکڑ کر اس کے ساتھ اسے بچھوایا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی وہاں بیٹھ کر باسکٹ کھولنے لگی تھی۔ کچھ چیزیں نینی نے رات میں بنالی تھیں، کچھ انہوں نے صبح اٹھ کر تیار کی تھیں باوجود اس کے منع کرنے کے کہ وہ لوگ کسی بھی ریسٹورنٹ میں کھا پی لیں گے۔ تنفس اکس کھولتے ہوئے وہ نینی کی خود سے محبت پر مسکرا رہی تھی۔ ایک باکس میں مشروم پاستا تھا، ایک میں بھاپ میں پکی چکن لیگز، ایک میں چیز سینڈوچز، ایک میں نینی کا خود بیک کیا فروٹ کیک اور براؤنیز۔ ساتھ میں جوس کے کین اور تھرموس میں چائے۔ اس نے پیپر پلیٹ سکندر کے ہاتھ میں پکڑائی تھی۔

"مزا آ گیا، یہ تو واقعی پکنک ہو گئی۔" سکندر اپنی پلیٹ میں پاستا ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

"یہاں کی زیادہ تر جگہیں heritage sites World (عالمی ورثہ) قرار دی جا چکی ہیں۔ اس لیے آج یہاں پینٹنگ بنانے اور اس طرح بیٹھ کر کھانے پینے کے لیے میں خاص طور پر اجازت نامہ لے کر آئی ہوں کہ کہیں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو جائے۔ یہاں آرٹسٹوں کی بہت قدر کی جاتی ہے، اس لیے مجھے صرف ایک دن نہیں بلکہ پورے ایک ہفتے کے لیے اجازت مل گئی ہے کہ یہاں جہاں دل چاہے، پینٹنگ بناؤں۔" اس نے اپنی پلیٹ میں چکن لیگ ڈالتے ہوئے سکندر کو کہا۔

"یہ جگہ اچھی کتنی لگ رہی ہے لیزا۔ کتنا سکون ہے یہاں۔"

"پتا ہے، ہم چلتے چلتے کتنی دور آ گئے ہیں؟ سمجھو ہم Villa d este سے باہر آ چکے ہیں۔ تب ہی یہاں ہمیں ٹورسٹ نظر نہیں آ رہے۔"

سکندر کی بات کے جواب میں وہ بولی۔ ساتھ ہی اس کی بھی پلیٹ میں چکن لیگ رکھا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں سب سمیٹ کر واپس اپنی پینٹنگ بنانے والی جگہ پر تھے۔ "اب تم بغیر رکے تین چار گھنٹے کام کرو۔ میں کوئی تھک وک نہیں رہا۔ اتنی جلدی جلدی بریک لیتے رہے تو تمہارا کام پورا نہیں ہو سکے گا۔"

وہ پلیٹ اور برش ہاتھ میں اٹھا رہی تھی تب سکندر اس سے بولا تھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

ان ہی کی طرح کا خاموشی اور سکون کا متلاشی ایک جوڑا وہاں سے گزرا۔ چلتے چلتے وہ دونوں اس کے پاس آ کر رک گئے تھے۔ وہ اس کی پینٹنگ کو شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ شوہر اٹالین میں اس سے اس کی پینٹنگ کی تعریف کر رہا تھا اور بیوی اسے اور اپنے میاں کو نظر انداز کیے بغور سامنے بیٹھے سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ دونوں میاں بیوی وہاں سے آگے بڑھ گئے تب سکندر نے اس سے پوچھا۔

"کیا فرما رہے تھے یہ صاحب؟"

"میرے آرٹ کو سراہ رہے تھے۔ ویسے ان کی مسز میری پینٹنگ کو نہیں بلکہ میرے ماڈل کو سراہ رہی تھیں۔"

وہ کہتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ سکندر جواباً "مدھم سا مسکرایا۔

"ایک اتنی حسین عورت اپنے میاں کی بغل میں کھڑی تمہیں سراہ رہی تھی، تم پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ کم از کم تھوڑا تو خوش ہو لو۔"

"میرے خوش ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مجھے پینٹ کرنے کے لیے بطور اپنا ماڈل مشہور و معروف مصورہ لیزا محمود نے منتخب کیا ہے۔ جو صرف اٹلی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور کی تعریف سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

وہ اس سے بات کرنے کے دوران بھی اپنی بیٹھنے کی پوزیشن اور اپنے چہرے کا رخ ویسے ہی رکھے ہوئے تھا جیسا پینٹنگ بنانے کے لیے اس نے سکندر کا کروایا تھا۔ اس بار بغیر کسی وقفے کے اس نے شام کے چار بجے تک کام کیا تھا۔ اب اس کی تصویر کے خدوخال واضح تھے۔ اس نے سکندر سے بریک لینے کے لیے کہا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

"مائی گاڈ لیزا! تم نے تو واقعی مجھے بہت خوب صورت پینٹ کیا ہے۔ سچ مچ یہ میں ہوں؟" وہ مزاح لیے انداز میں بول رہا تھا۔

"خوامخواہ مذاق مت اڑاؤ۔ تمہیں پتا ہے، تمہیں پینٹ کرنے کا کام میں بہت دل سے کر رہی ہوں اور اپنی اس تصویر سے میں بہت مطمئن ہوں ابھی تک۔ ان شاء اللہ ایگزیبیشن میں یہ میری سب سے بہترین تصویر ہو گی۔" وہ تصویر پر نظریں جمائے بول رہی تھی۔ اس نے برش سے دو ایک جگہ پھر اسٹروکس لگائے تھے۔ سکندر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور جو اس کی بہت اچھی قیمت دے گا۔ تم یہ اسے بیچ دو گی؟"

"میرا ایسا تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سکندر! میں اس پر بہت دل سے کام کر رہی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہے گا اسے بیچنے کے لیے۔" اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔

"پھر تم یہ مجھے بطور تحفہ دے دینا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"تمہیں تحفے میں دے دوں گی تو اپنے سولو شو میں کیا اسے نہیں رکھوں گی؟ اسے تو مجھے لازمی وہاں رکھنا ہے۔ تم آؤ گے میرے شو میں؟"

وہ دو ٹوک سے انداز میں تصویر دینے سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

"میں ___ تمہارا سولو شو تو اگلے ماہ ہے ناں؟ تب تک تو میں دوبارہ واپس جا چکا ہوں گا۔ اگر اٹلی میں ہوتا تو ضرور آ جاتا۔"

وہ معذرت خواہانہ سے انداز میں بولا۔ ہاں تب تک تو وہ جا چکا ہو گا۔ اسے کیوں یاد نہیں رہی تھی یہ بات کہ چند دنوں کے لیے ملا یہ شخص چند دنوں یا چند ہفتوں میں واپس چلا جائے گا۔ پتا نہیں اس کا دل یکدم ہی اداسیوں کی لپیٹ میں کیوں آ گیا تھا۔ وہ جواباً کچھ بول پائی تھی نہ اخلاقاً "مسکرا سکی تھی۔

"کیا ہوا؟" سکندر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، اس کی سوچوں سے یکسر لاعلم اور لاتعلق۔

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ بریک لی ہے تو جوس وغیرہ پی لیتے ہیں مگر یہ میرے ہاتھ تو دیکھو۔"

وہ تصاویر بناتے وقت جتنا کام برشز اور اپنی انگلیوں سے لیتی تھی اتنا ہی بے دریغ استعمال اپنے ہاتھوں

ی کیا کرتی تھی۔ اس کی دائیں ہاتھ کی انگلیاں مختلف
نوں سے سجی تھیں۔ وہ لوگ اتنی دور آچکے تھے
اں کوئی واش رومز وغیرہ نہیں تھے۔ سکندر نے
کٹ سے پانی کی بوتل نکالی تھی۔

"لاؤ میں تمہارے ہاتھ دھلوا دوں۔"

اردگرد کی جگہ خراب نہ ہو اس لیے وہ ایک بڑے
ے ویسٹ بن کے پاس آکر اس پر ہاتھ کرکے کھڑی
وئی تھی' سکندر نے بوتل سے پانی ڈال کر اس کے ہاتھ
دھلوا دیے تھے۔ جوس لیتے ہوئے انہوں نے کچھ دیر
وہاں چہل قدمی کی' پندرہ منٹ بعد وہ دونوں واپس اپنی
اپنی سابقہ پوزیشن پر آگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

سورج دیر سے غروب ہونے کے سبب انہیں شام
کا بھی کافی ٹائم روشنی میں مل گیا تھا۔ وہ اپنی تصویر کا
پچاس فیصد کام یہیں پر کرچکی تھی۔ سامان سمیٹ کر
ان دونوں نے واپسی کا راستہ اختیار کیا تو وہ دونوں وہاں
سے نکلنے والے چند آخری ٹورسٹس میں سے تھے۔
زیادہ تر سیاح شام ہوتے ہی وہاں سے لوٹ چکے تھے۔
وہ دونوں باہر نکل آئے۔ سیاحوں کی اکثریت چونکہ
لوٹ چکی تھی اس لیے اس وقت وہاں مکمل سناٹا تھا۔ وہ
اپنی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔

وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر سامان واپس رکھ رہی
تھی' اس کے پیچھے سکندر کھڑا تھا جس نے سارا سامان
پکڑ رکھا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے اسے چیزیں پکڑا رہا تھا
اور وہ چیزیں اندر رکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ
پر جھکی ہوئی تھی۔ تب ہی سکندر کے پاس ایک جپسی
(خانہ بدوش) لڑکا تیئیس' چوبیس سال کا سکندر سے
ٹکرایا تھا اور اب رک کر اس سے اٹالین میں معذرت
کررہا تھا۔ وہ چونکہ گاڑی کی طرف جھکی ہوئی تھی اس
لیے فوراً "اس لڑکے کو دیکھ نہیں سکی تھی ورنہ سکندر
کو خبردار کرتی کہ اس لڑکے سے ہوشیار رہے۔ پورے

یورپ میں اٹلی سے زیادہ ماہر جیب کترے کہیں نہیں ہوتے اور عموماً" یہ گروپ کی شکل میں ہوتے ہیں۔ واردات میں ایک یا دو افراد حصہ لیتے ہیں جبکہ بقیہ ساتھی آس پاس ہی کہیں ہوتے ہیں۔

سکندر انگریزی میں خوش اخلاقی سے اس لڑکے سے کہہ رہا تھا "کوئی بات نہیں" وہ اس وقت گاڑی کی پچھلی سیٹ پر باسکٹ رکھ کر سیدھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سکندر کو خبردار کرپاتی۔ پیچھے سے ایک اور جپسی لڑکا آیا اور اس نے جھپٹ کر اس کے کندھے پر سے اس کا شولڈر بیگ کھینچا۔ بے اختیار اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ سکندر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ بیگ لے کر وہ دونوں چور مخالف سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔

"سکندر! چھوڑ دو' رہنے دو پلیز۔"

اس نے چلا کر اسے روکنا چاہا تھا۔ مگر اس نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ خود بھی بھاگی تھی تاکہ اسے روک سکے۔ تب تک سکندر اس تیز رفتاری سے بھاگتے جپسی لڑکے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ بھاگنے میں اس لڑکے سے کہیں زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا تھا۔ وہ لڑکا مڑا تو سکندر نے اس کے منہ پر ایک بھرپور پنچ مارا تھا۔ سکندر کے زوردار پنچ سے وہ لڑکا سنبھل نہیں سکا تھا' سکندر نے اس سے بیگ چھین کر اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بیگ فوراً" اٹھالیا تھا۔

"سکندر!" وہ بے اختیار خوف کے عالم میں چلائی تھی جب اس نے اس جپسی لڑکے کو جیب سے چاقو نکالتے دیکھا۔ سکندر کے پنچ سے اس کے ہونٹوں سے خون نکل آیا تھا' وہ انتہائی تیز دھار چاقو بڑی مہارت سے تھامے سکندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا دوسری سمت بھاگا ساتھی بھی اسی وقت اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خنجر نما ایک چاقو تھا۔

"سکندر پلیز' انہیں بیگ واپس دے دو اور بھی انہیں [illegible] دے دو۔"

وہ [illegible] کانپتی چلائی تھی۔ اس نے فوراً" ہی اپنا بیگ واپس اس جپسی کی طرف اچھال دیا تھا۔ اس کا بیگ زمین پر ان لوگوں کے پیروں کے پاس جاکر گرا تھا۔

سکندر نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہ ہو' اس نے ایک جپسی کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر زور سے مروڑا تھا' ساتھ ہی اس کے پیٹ میں بہت زور سے لات ماری تھی۔ جپسی درد سے چلاتا زمین پر گرا تھا' چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے عین اسی وقت پیچھے سے سکندر پر چاقو سے وار کیا تھا۔ کہنی سے اوپر کی جگہ سکندر کے بازو میں چاقو لگا تھا۔

سکندر بڑی برق رفتاری سے فوراً" گھوما اور اس نے اسی طرح ایک زوردار لات اس دوسرے جپسی لڑکے کے بھی پیٹ پر ماری تھی۔ سکندر کے بازو سے خون نکلتا دیکھ کر وہ رو پڑی تھی۔

"سکندر پلیز' انہیں چھوڑ دو' پلیز' یہ جو مانگ رہے ہیں' انہیں دے دو۔"

سکندر کا اس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اسے خوف اور دہشت میں مبتلا کر گیا تھا۔

مگر سکندر کو جیسے اس کا چیخنا' روکنا اور رونا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جنون اور خون سا اترا ہوا تھا۔ اس کی چوٹ لگی ٹانگ جو ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی' نہ وہ اسے ان بدمعاشوں سے لڑنے سے روک رہی تھی نہ اس کے بازو سے بہتا خون۔ اسے سکندر نارمل نہیں لگ رہا تھا۔

وہ ایک ہی وقت میں ان دونوں سے مقابلہ کررہا تھا' ان دونوں پر وار کررہا تھا اور ان کے ہر وار سے بڑی مہارت سے خود کو یوں بچارہا تھا جیسے زندگی کے تمام برسوں میں یہی کام کرتا آیا ہو۔ سکندر اس پل ایک پڑھا لکھا لائر' ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا لیگل ایڈوائزر نہیں لگ رہا تھا بلکہ انہیں جپسیوں کی طرح سڑکوں پر پلنے بڑھنے والا ایک غنڈہ اور بدمعاش لگ رہا تھا۔

ان دونوں کے چاقو کب کے ان کے ہاتھوں نکل چکے تھے' اب وہ دونوں چاقو سکندر کے ہاتھوں

تھے۔ اس نے چاقو سے ان پر وار نہیں کیا تھا۔ وہ صرف ٹانگوں کا استعمال کرکے ہی ان دونوں کو نڈھال ہوکر زمین پر گر جانے پر مجبور کرچکا تھا۔

وہ دونوں زمین پر زخمی پڑے کراہ رہے تھے۔

"بس کرو سکندر! پلیز بس کرو۔" وہ روتے ہوئے اس کے پاس آئی، جو پے در پے ان دونوں کو لاتیں مار رہا تھا اور وہ دونوں تکلیف سے چلا رہے تھے۔ سکندر جیسے اب اس کی آواز پر چونکا تھا۔

"باسٹرڈ۔" اپنے ہونٹوں کے پاس سے خون صاف کرتے ہوئے سکندر نے انہیں گالی دی اور پھر ان دونوں کے پاس سے پیچھے ہٹا۔ یہ وہ سکندر شہریار نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی، یہ ایک دوسرا شخص تھا جس سے وہ ابھی ابھی متعارف ہوئی تھی۔ بے حد جنونی، طاقت ور اور غصے میں اپنی جان کی بھی پروا نہ کرنے والا۔ تکلیف اور درد سے چلاتے ہوئے وہ دونوں شدید زخمی جیسی سکندر کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے اندھا دھند بھاگے تھے۔

"بلڈی باسٹرڈ۔" سکندر نے انہیں بھاگتا دیکھ کر دوبارہ گالی دی تھی۔ چند سیکنڈ ان دونوں کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ اسے سکندر کی آنکھوں میں ابھی بھی جنون سا نظر آرہا تھا۔ اسے اس کی آنکھوں سے ڈر لگا تھا۔ بے اختیار اس نے اسے پکارا تھا۔

"سکندر!" وہ جیسے اتنی دیر کے بعد اب اس کی پکار سن پایا تھا۔ وہ واپس اپنے حواسوں میں آیا اور اس نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ اس نے لیزا کی آنکھوں سے گرتے آنسو اپنے زخمی ہاتھ سے صاف کیے تھے۔ اور اس کا پرس اسے اٹھا کر دیا۔

"یہ لو۔" اس کی نظریں سکندر کے چہرے پر نہیں تھیں، نہ ہی اپنے شولڈر بیگ پر، اس کی نظریں سکندر کے بازو سے بہتے خون پر تھیں۔ اس کی ٹی شرٹ کی آستین آدھی ہونے کے سبب بازو سے خون بہتا بالکل نگاہوں کے سامنے تھا۔

"سکندر! تمہارا ہاتھ...." وہ ابھی تک خوف کے حصار میں تھی، پورا جملہ بول نہیں پائی تھی۔

"ہاتھ.... اوہ ہاں.... تمہارے پاس کوئی کپڑا ہے؟" اس کے کہنے پر جیسے اسے اپنے ہاتھ کا دھیان آیا تھا وہ انتہائی لاپروائی سے اپنا خون بہتا دیکھ کر بولا۔ یوں جیسے اسے کوئی درد اور تکلیف ہو ہی نہ رہی ہو۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی سکندر! ان سے لڑنے کی؟ ایک بیگ ہی تھا ناں؟ لے جانے دیتے انہیں۔ چند سوینیرو تمہاری جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوسکتے۔" وہ غصے میں روتے ہوئے چلا اٹھی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں لیزا! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ کیوں بے کار میں روئے جارہی ہو۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں واپس بھی پہنچنا ہے۔" تحمل اور بردباری سے کہتا اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے گاڑی کے پاس لے آیا۔ وہ گاڑی کی اگلی نشست کا دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ سکندر کا اتنا پرسکون اور مطمئن سا انداز دیکھ کر وہ رونا بھول گئی تھی۔

"تم اس وقت کافی ڈسٹرب لگ رہی ہو، اگر مائنڈ نہ کرو تو میں ڈرائیونگ کرلوں؟"

وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر خود ہی آگے بڑھی تھی۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھ کر ڈیش بورڈ سے فرسٹ ایڈ باکس باہر نکال رہی تھی۔ سکندر برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کا بازو پکڑا۔ وہ سکندر کے بازو پر بینڈیج کرنا چاہتی تھی، خون کو مزید بہنے سے روکنا چاہتی تھی۔

"ابھی تو خون بہنا رک گیا ہے۔ راستے میں جہاں کہیں کوئی ہاسپٹل نظر آیا، ہم وہاں سے تمہارے ہاتھ کی پراپر بینڈیج کروالیں گے۔" وہ اس کے ہاتھ کی بینڈیج کرتے ہوئے بولی تھی۔

سکندر بے اختیار ہنسا تھا۔ اس کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا، جیسے اس نے کوئی بہت ہی بچکانہ بات کہہ دی تھی اور وہ اس پر اپنی ہنسی روک نہیں پایا تھا۔ اس نے غصے

سے سکندر کو دیکھا۔

"تمہارے لیے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دینا' موت سے کھیلنا مذاق ہے؟" سکندر جواباً" لب بھینچ کر ایک دم ہی خاموش ہو گیا تھا۔

اسے سکندر کی آنکھوں میں درد پھیلتا نظر آیا تھا۔ غصہ کرنا بھول کر وہ خود بھی بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اس نے سکندر کے ہاتھ کی بینڈیج خاموشی سے مکمل کر دی' پھر کاٹن پر دوا لگا کر سکندر کے ہونٹ کے پاس جہاں سے خون بہہ رہا تھا' اس پر رکھی اس جگہ پر ہاتھ سے ہلکا سا دباؤ ڈالا تاکہ خون بہنا رک جائے۔ سکندر نے بے اختیار اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟ تکلیف زیادہ ہو رہی ہے کیا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ اس نے جواباً" سر ہاں میں ہلایا تھا۔

"بس ایک دو منٹ کی تکلیف اور جلن ہے' برداشت کر لو۔"

وہ چند منٹ اس کے ہونٹ کے پاس یونہی ہاتھ سے دباؤ ڈال کر بیٹھی رہی۔ اس کا زخمی بازو بھی اس نے دوسرے ہاتھ میں قدرے اوپر کر کے پکڑا ہوا تھا تاکہ خون بہنا دوبارہ شروع نہ ہو جائے۔

"میری بینڈیج ہو گئی ہے' اب کیا ہم چلیں؟" وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا' لہجہ نرمی لیا ہوا اور دوستانہ سا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سر اثبات میں ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

"ویسے اگر تم مجھے ڈرائیونگ کرنے دیتیں تو اچھا تھا۔ تمہاری جتنی فاسٹ ڈرائیونگ تو نہیں کرتا مگر میں بھی تمہیں روما جلدی ہی پہنچا دیتا۔" وہ ہنس کر اس سے بولا۔ یوں جیسے کچھ دیر پہلے کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا' وہ اب بالکل نارمل اور کمپوزڈ سا بیٹھا تھا۔

وہ جواباً" چپ رہی تھی۔ سکندر نے راستے میں دو ایک بار خوشگوار موسم' وہاں کے مضافات کو موضوع گفتگو بنا کر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس گفتگو میں اس کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔

جو بات وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی وہ سکندر نے بتانی نہیں تھی اور باقی کسی موضوع پر گفتگو کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ان کا باقی سارا راستہ بالکل خاموشی سے کٹا تھا۔ اس نے گاڑی اس کے ہوٹل پہ لا کر روکی وہ فوراً" ہی گاڑی سے اتر گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی' وہ اندر جا رہا ہے مگر وہ گھوم کر اس کی طرف والی کھڑکی پہ آیا اور کھڑکی پر بازو ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

"پتا نہیں کیوں مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"میں ناراض نہیں ہوں سکندر! مگر تمہارے جذباتی پن پر مجھے غصہ ہے۔ ایک بیگ ہی تھا ناں میرا' اس کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا؟ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا یا پھر اگر ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوتے' وہ بھی وہاں آجاتے؟" وہ ناراض لہجے میں جھرجھری سی لے کر بولی تھی۔

"میں دراصل اپنی رومن آرٹسٹ دوست پر' جو مجھے پانی کے ساتھ طاقت کے سمبل کے طور پر دکھانا چاہتی ہے' یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی بہت بہادر ہوں۔"

وہ ہنس کر لاپروائی سے بولا۔ خود پر لاپروائی کا ملمع چڑھائے وہ اپنے اس جنونی عمل کی عجیب عجیب توجیہات پیش کر رہا تھا۔ وہ جواباً" سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری زندگی اتنی بے وقعت اور بے مول نہیں ہے سکندر! کسی اور کو فرق پڑے نہ پڑے لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔"

وہ بہت آہستہ آواز میں بولی تھی۔ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا سکندر یک دم ہی اس کی گاڑی کی کھڑکی سے ہٹا۔ یک دم ہی اس کا چہرہ سنجیدہ اور بے تاثر سا ہو گیا تھا' بہت سخت سا ہو گیا تھا۔

"چاؤ لیزا۔" اس نے فوراً" ہی اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اندر چلا گیا۔ وہ وہیں رکی اسے اندر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ کیا دکھ تھا اس شخص کو' آخر ایسا کیا [illegible] اسے خود سے' رشتوں سے' محبتوں سے' [illegible]

اس قدر متنفر کر چکا تھا؟

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ سکندر کو سوچ رہی تھی اور پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سکندر شہریار وہ نہیں جو پچھلے بہت سارے دنوں سے اسے روما میں مختلف جگہوں پر مل رہا ہے بلکہ اصل سکندر شہریار وہ ہے جو اسے Tivoli کی سڑک پر غنڈوں کے ساتھ انہی کی زبان میں بات کرتا نظر آیا تھا' جنونی سا غصہ اور پاگل پن لیا ہوا۔

☼ ☼ ☼
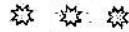
وہ گھر آتے ہی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے یا شاور لینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ ابھی تک اسی خوف ناک واقعہ کے حصار میں تھی۔ وہ مسلسل سکندر کے اس جنونی انداز کو سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے جسم سے بہتے خون کو اتنے سکون سے کس طرح دیکھ سکتا تھا؟ کیا وہ خود کو سزا دیا کرتا تھا؟ آج اس کے صرف ایک بیگ کی خاطر اس نے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالا تھا جبکہ بیگ تو وہ اس لڑکے سے فوراً" ہی حاصل کر چکا تھا۔ وہ ان دونوں خانہ بدوشوں کو چند منٹوں میں ڈھیر کر چکا تھا' پھر انہیں مار مار کر ادھ موا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کیسا جنون اور کیسی وحشت تھی جو اس پل اس پر سوار ہوئی تھی؟ آخر زندگی نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا تھا جو وہ خود کو' اپنی زندگی کو اتنا ارزاں اور بے مول سمجھنے لگا تھا؟

اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ سکندر کو یقین دلائے کہ اس کا وجود اس دنیا کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس کا ہونا اس زندگی کے لیے بہت قیمتی ہے' اس کی موجودگی لیزا محمود کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لیزا محمود کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ ایکسیڈنٹ کے بعد ہسپتال میں زخمی پڑا تھا تو لیزا محمود کا دل اس کے لیے پریشان تھا۔ وہ آج اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا تھا تو لیزا محمود کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا اگر اسے کچھ ہو جاتا تو پھر؟ اسے اپنے جسم سے بہتے خون سے کوئی تکلیف ہو رہی تھی یا نہیں' مگر لیزا محمود کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

وہ نیپی کو بار ہا جھٹلا چکی تھی۔ وہ سکندر کے پیچھے کیوں آئی ہے' اس کا جواب دیتے ہوئے وہ سکندر کو جھٹلا چکی تھی' وہ اپنے مختلف اعمال کی مختلف وجوہات تلاش کر کر کے خود کو مسلسل جھٹلاتی رہی تھی' مگر اس پل سکندر کی تکلیف پر روتے ہوئے وہ خود کو ہر گز جھٹلا نہیں پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سکندر کو فون کر کے بتائے میں پہلی بار پزیریا میں تمہارے پاس اس لیے آئی تھی کہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کہیں بہت اندر' بہت خوب صورت گھنٹیاں بجی تھیں۔

"جس سے مجھے محبت ہو گی' وہ جب میری زندگی میں آئے گا تو مجھے فوراً" پتا چل جائے گا' میرے دل میں اسے دیکھتے ہی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔"

اپنا پُر مزاح انداز میں کہا وہ جملہ یاد کر کے اس پل وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی۔ وہ اسے خوب صورت لگتا ہے اس لیے وہ اسے پینٹ کرنا چاہتی ہے' وہ اسے اچھا لگتا ہے اس لیے وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی ہے' کتنی وجوہات اور جواز وہ خود اپنے آپ کو سکندر کے ایکسیڈنٹ سے پہلے تک پیش کرتی رہی تھی اور اس کے ایکسیڈنٹ کے بعد جب وہ بھاگتی دوڑتی اس کے پاس ہسپتال پہنچی تھی اس کے بعد اس نے اپنے اندر سے ابھرتے ہر سوال کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے پاس ہسپتال میں مسلسل کیوں ہے؟ وہ اسے اپنے گھر لانے پر بضد کیوں ہے؟ اسے اس کی دوا اور خوراک کی اس قدر پروا کیوں ہے؟ وہ خود سے لاپروائی برتتا ہے تو اسے کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ وہ اس کے گھر سے جا رہا ہے تو اسے یہ فکر کیوں ہے کہ واپس جا کر وہ اپنا خیال ٹھیک سے رکھے گا بھی کہ نہیں؟ آج دل کو یہ بات یاد کر کے کیوں ناقابل بیان تکلیف پہنچی تھی کہ وہ چند دنوں یا چند ہفتوں میں واپس چلا جائے گا۔

وہ اسی ایک شخص کو سوچتے' روتے اور ہنستے ہوئے سوئی تھی اور صبح بیدار ہوتے ہی جو پہلا خیال اس کے دل میں آیا تھا وہ اسی کا تھا' جو پہلا نام لبوں سے نکلا تھا۔ وہ اسی کا تھا' جو پہلا چہرہ تصور میں آیا تھا وہ اسی کا تھا۔

چند دن پہلے اس نے نینی کو سکندر کی سب سے بڑی خامی اس کا پاکستانی ہونا بتا کر ان کی ہر سوچ کی نفی کر دی تھی اور آج اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ پاکستانی ہے یا دنیا کے کسی بھی اور ملک کا رہنے والا۔ وہ جو بھی ہے، وہ جیسا بھی ہے، وہ جس بھی جگہ سے ہے، بس بہت اہم ہے۔

وہ اپنی سوچوں اور اپنے جذبات کی شدت سے خود ہراساں سی ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اس وقت وہ سکندر کے سامنے گئی تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ایک پل میں جان جائے گا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اس کی خیریت پوچھنے کی شدید چاہ رکھنے کے باوجود اس سے اسے فون نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس کا چہرہ سامنے نہیں بھی ہو گا تب بھی اس کا لہجہ اسے سب کچھ بتا دے گا۔ اس کے دل کا ہر بھید اس پر کھول دے گا۔ وہ بغیر کچھ کھائے اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آ گئی اور سکندر کی تصویر مکمل کرنے لگی۔ جو تصویریں اس نے کیمرے سے کھینچی تھیں اسے ان کی طرف ایک نظر بھی دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آ رہی تھی۔ اس کے وہاں فوارے کے سامنے بیٹھے ہونے کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی، اس کی آنکھوں کے تاثر، اس کے لبوں کی مدھم سی مسکراہٹ، دیوار پر رکھے اس کے ہاتھ کی انگلیاں، یہ سب یاد رکھنا تو شاید بہت عام سی بات تھی اسے تو یہ تک یاد تھا کہ یوں بیٹھنے سے اس کی شرٹ اور پینٹ پر کہاں کہاں شکنیں پڑ رہی تھیں، ہوا سے اگر اس کے بال اڑ رہے تھے تو کیسے لگ رہے تھے، اسے ہر بات یاد تھی، اس منظر کی کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی، جسے پھر سے دیکھنے کے لیے اسے اپنے سامنے تصویریں رکھنی پڑتیں۔

"ناشتا کیے بغیر اوپر آ گئیں لیزا؟" نینی اوپر آئی تھیں۔ اس سے ناشتے کے بارے میں پوچھتے پوچھتے ان کی نظر سکندر کی پینٹنگ پر پڑ گئی۔ "بن گئی سکندر کی تصویر، کل رات تو تم آتے ہی سونے چلی گئیں تم سے بات ہی نہیں ہو سکی۔"

"جی نینی! بس وہ میں تھک گئی تھی۔" وہ جانتی تھی کہ نینی اس پل اسے اور سکندر کی تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان سے نگاہیں چرا کر جان بوجھ کر خود کو کام میں مصروف ظاہر کرنے لگی تھی۔

"ناشتا یہیں لا دیتی ہوں تمہیں۔" ایک پل اسے خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ ناشتا لانے کا کہتی نیچے اترنے لگیں۔

"تھینک یو نینی! اپنا بھی لے آئیے گا۔ بالکونی میں ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔" اس نے قدرے بلند آواز میں ان سے کہا تھا۔

✲ ✲ ✲

اس نے سکندر کو فون نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو سکندر کی تصویر میں مصروف کیے ہوئی تھی، مگر میز پر پڑے اپنے موبائل پر گھوم پھر کر اس کی نگاہیں بار بار جا رہی تھیں۔ کام پر دھیان رکھتے ہوئے بھی اس کا سارا دھیان فون کی طرف تھا۔ نیچے بھی فون کی بیل بج رہی تھی تو وہ چونک رہی تھی۔ اس کے کان فون کی گھنٹیوں پر لگے تھے۔

اگر اس نے اسے فون نہیں کیا تو سکندر کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اسے فون کر لے؟

وہ دل ہی دل میں سکندر سے خفا ہوئی۔ شام ہو گئی تھی اور اب وہ خود کو مزید روک نہیں پا رہی تھی۔ ایک بے اختیاری کیفیت میں بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے اس کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

"کیسی ہو مصورہ؟" وہ اس کی آواز سن کر خوش مزاجی سے بولا تھا۔

"تم کہاں ہو؟" اسے کیوں غصہ آ رہا ہے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، مگر اس کا لہجہ غصے سے بھرا تھا۔

"میرے ہاتھ میں موجود نقشے کے مطابق میں اس وقت Via del Corso پر ہوں۔ آفس سے نکلا سوچا اب تک Trevi Fountain نہیں دیکھا سو اراوے چہل قدمی کرتے ہوئے وہاں جا رہے ہیں۔" وہ اسی خوش مزاج انداز میں بولا تھا مسکرا ہوئے۔

"تم Trevi Fountain جا رہے ہو' اکیلے؟
تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟ کیا اس سے پہلے روما کی ہر جگہ میں نے تمہیں نہیں دکھائی جو آج تم نقشہ لے کر اکیلے نکلے ہو؟" وہ خفگی سے تلخ لہجے میں بولی۔

"مجھے لگا' کل میری رومن دوست مجھ سے خفا ہو گئی تھی اس لیے آج کہنے کی ہمت نہیں ہوئی ورنہ ظاہر ہے' میں تم سے ہی کہتا لے جانے کو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بالکل اسی انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس سے کیا کرتا تھا۔ ہاں اس کے لہجے میں در پردہ چھپی ایک حیرانی سی تھی جیسے وہ اس کی تلخی اور غصے کی وجہ سمجھ نہ پا رہا ہو۔

"اچھا تم جہاں ہو' وہیں ٹھہرو' میں آرہی ہوں۔ آس پاس کوئی کیفے یا بار ہے تو وہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرو میں بس دس' پندرہ منٹ میں وہاں پہنچتی ہوں۔"

تیز رفتاری سے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے حکمیہ انداز میں سکندر سے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ محض سات منٹ لگائے تھے اس نے شاور لینے اور تیار ہونے میں۔ اس نے گلابی اور کاسنی رنگوں کے امتزاج والی پرنٹڈ شرٹ کاسنی رنگ کے لوز ٹراؤزر کے ساتھ پہنی تھی۔ گیلے بالوں کو یونہی بکھرا چھوڑ کر سینڈلز پیروں میں ڈالتی وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر نیچے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی وہ اس جگہ پہنچی اور سکندر کو فون کیا تب سکندر نے اسے اس کیفے کا نام بتایا جہاں بیٹھا وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گاڑی اس کیفے تک لائی تو سکندر دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"گاڑی کسی جگہ پارک کر دو' میں اس وقت روما کی سڑکوں پر پیدل چلنا چاہتا ہوں۔"

وہ اس سے مسکرا کر بولا۔ اس نے گاڑی پارک کر دی۔ اب وہ دونوں پتھروں سے بنی اس کئی سو سال پرانی سڑک پر پیدل چل رہے تھے جو انہیں Fountain Trevi کی طرف لے کر جا رہی تھی۔

"تمہاری چوٹ کیسی ہے؟" اس کا اشارہ سکندر کے ہاتھ کی طرف تھا۔

"ٹھیک ہوں اور تمہاری ڈانٹ سے بچنے کے لیے میں نے ڈاکٹر سے برابر قسم کی بینڈیج کرا رکھی ہے اور پین کلرز بھی لے رہا ہوں۔" اس نے اپنا کوٹ اور ٹائی اس کی گاڑی میں اتار کر رکھ دیے تھے۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھولا ہوا تھا اور آستین کہنی سے ذرا نیچے تک فولڈ کر رکھی تھیں۔ وہ اسے اپنا ہاتھ دکھا کر مسکرا کر بتا رہا تھا۔ اس کی کریم کلر کی قمیص کی آستین کے اندر اسے اس کے بازو پر پٹی بندھی نظر آرہی تھی۔

"ہاں' میری باتوں کا جیسے تم پر بڑا اثر ہوتا ہے۔" وہ قدرے برا مان کر بولی تھی۔

چند سیکنڈ وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے تھے۔ اس خاموشی میں جب اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کا شور زیادہ تیز سنائی دینے لگا تب اس شور سے گھبرا کر اس نے اسے مخاطب کیا۔

"تم پیدل کیوں چلنا چاہ رہے تھے؟"

وہ سکندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے ایک چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر مارتا سڑک کی طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے سوال پر سکندر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"بس یونہی میرا دل چاہ رہا تھا۔ کل میرا یہاں آخری دن ہے' پرسوں صبح کی فلائٹ سے میں دوہا چلا جاؤں گا۔ نجانے پھر کبھی تمہارے روما کی ان سڑکوں پر چلنا نصیب ہو کہ نہ ہو' اس لیے میں نے سوچا آج لیزا کے روما کی سڑکوں پر پیدل چلا جائے۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ کل آخری دن؟ پرسوں صبح کی فلائٹ؟

"کل آخری دن؟ اس طرح' اتنی اچانک؟ تم نے تو کہا تھا تم یہاں دو' تین ہفتوں کے لیے آئے ہو؟"

اس کے دل میں یک دم ہی یاسیت اور اداسی اتر آئی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا وہ سکندر سے لڑے' پوچھے کہ وہ واپس جانے کی بات کیوں کر رہا ہے۔ مگر وہ ٹوٹے' شکستہ سے لہجے میں اگر کچھ کہہ پائی تھی تو محض یہ جملے۔ وہ اس کی کیفیات سے انجان مسکرا کر جواباً" بولا۔

"ہاں تو ٹھیک کہا تھا ناں مصورہ دو ہفتے ہو تو گئے مجھے یہاں پر اور میرا کام جس کے لیے میں یہاں آیا تھا' آج مکمل ہو گیا ہے۔ کل بس ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے' پھر میں فارغ۔"

وہ جیسے اپنی واپسی پر بہت خوش تھا۔ ہاں وہ خوش کیوں نہیں ہو نا وہ اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ روما اس کا گھر نہیں تھا۔ وہ کیوں بھول گئی تھی یہ بات کہ سکندر شہریار یہاں مہمان ہے' پردیسی ہے' اجنبی ہے۔ اس کا گھر' اس کا شہر' اس کی زندگی کہیں اور ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن یہاں سے چلے جانا ہے پھر کبھی بھی یہاں نہ آنے کے لیے۔

ایک دم ہی اس کا دل چاہا تھا وہ چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔ اس کے اندر آنسو جمع ہو رہے تھے وہ اگر اس پل کچھ بولتی تو یقیناً "رو پڑتی" اس لیے بجائے کچھ بولنے کے سر جھکا کر خاموشی سے چلنے لگی تھی۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔ خود کو رونے سے روک رہی تھی۔ خود کو سمجھاتے ہوئے وہ سکندر کو روما کی اس قدیم ترین سڑکوں میں سے ایک سڑک پر لے آئی تھی' جس پر Trevi Fountain موجود تھا۔

ان کی نگاہوں کے سامنے کچھ دور' تھوڑے فاصلے پر صرف اٹلی ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ترین Trevi Fountain نظر آ رہا تھا۔

"بہت شوق تھا مجھے Tvevi Fountain دیکھنے کا۔ تم اٹالین لوگ اسے De Trevi Fontana کہتے ہو ناں؟"

ٹریوی فاؤنٹین کے نزدیک جاتے ہوئے سکندر نے اس سے پوچھا تھا۔ ہمیشہ جہاں بھی وہ دونوں جاتے تھے وہاں کی تاریخ' وہاں کے آرکیٹیکچر کی تفصیلات وہ اسے بتایا کرتی تھی' چاہے سکندر دلچسپی سے سن بھی رہا ہو یا نہیں' مگر آج وہ خاموش تھی۔ سکندر کی بات کے جواب میں وہ سر ہلا کر بدقت مسکرائی تھی۔

"اپنے ٹین ایج کے دنوں میں' میں نے La Dolce Vita دیکھی تھی' تب سے ہی مجھے شوق تھا Trevi فاؤنٹین دیکھنے کا۔ مووی میں اسے اتنی خوبصورتی سے دکھایا تھا۔"

وہ پھر پھیکے سے انداز میں مسکرائی تھی۔ Trevi فاؤنٹین ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسے وہ اسے اپنے بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ اس سڑک پر اطراف میں کئی کئی سو سال پرانی تاریخی عمارتیں اسی طرح ایستادہ تھیں جیسا اس نے انہیں ہمیشہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ ہی کی طرح وہاں پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔

اس ہجوم میں گھس کر وہ دونوں بھی فاؤنٹین کے سامنے آ گئے تھے۔

"ایسا ہی دیکھا تھا میں نے اسے مووی میں' یہ آرکیٹیکٹس کا بنایا خوب صورت محل اس کے بیرونی منظر پر یہ پتھروں کو تراش کر مجسمہ سازوں کے بنائے گئے رومن گاڈ (Roman God) ۔ Neptune اور سمندری گھوڑوں کے مجسمے اور ان مجسموں اور پتھروں کے اوپر سے گرتا' بہت بلندی تک جاتا اور پھر نیچے اس خوب صورت بڑے سے تالاب میں گرتا یہ نیلگوں پانی۔" وہ دونوں اس بڑے سے تالاب کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بہت سے سیاح وہاں تالاب میں سکے اچھال رہے تھے۔

سکندر اس کی سوچوں سے انجان Trevi فاؤنٹین کی خوب صورتی کو سراہنے میں مصروف تھا۔ وہ محل' اس کے کولمبز' رومن گاڈ اور گھوڑوں کے مجسموں اور ان کے عین نیچے پانی کے بہت بڑے اور بہت گہرے تالاب کی دلکشی اور خوب صورتی کو جیسے مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ آج جب اپنے روما کی خوب صورتی اسے متاثر نہیں کر رہی تھی' تب پہلی مرتبہ وہ اس سے متاثر ہوتا نظر آ رہا تھا۔

سکندر اپنے موبائل سے فاؤنٹین کی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچنے لگا۔ اس نے تالاب میں سکے اچھالتے سیاحوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

"اگر Trevi Fountain میں Coins اچھالیں گے تو زندگی میں کبھی نہ کبھی روما دوبارہ ضرور آئیں گے' ہے ناں لیزا؟" ان لوگوں کے بالکل سا[illegible] ایک لڑکی تالاب میں سکہ اچھال رہی تھی اور اس[illegible]

بوائے فرینڈ سکہ اچھالتے وقت اس کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے چیخ کر اپنی گرل فرینڈ سے کہا تھا۔

"Make a wish" (کوئی خواہش کرو)

لڑکی کی فاؤنٹین کی طرف پیٹھ تھی' اس نے اپنے سیدھے ہاتھ میں سکہ پکڑ رکھا تھا وہ اسے اپنے کندھے سے اوپر لے جا کر بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے Pond میں اچھالنے لگی' ساتھ ہی اس نے جیسے آنکھیں بند کر کے بڑی شدت سے کوئی دعا مانگی پھر آنکھیں کھولیں اور سکہ پانی میں اچھال دیا' عین اس کے سکہ اچھالتے لمحے' اس کے بوائے فرینڈ نے اس کی ایک ساتھ تین' چار تصاویر کھینچی تھیں۔

"ہاں صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی روایتوں کے مطابق کہا تو یہی جاتا ہے کہ روما وزٹ کرنے والا کوئی بھی شخص اگر Trevi فاؤنٹین میں Coin اچھالے گا تو وہ زندگی میں کبھی نہ کبھی دوبارہ Eternal سٹی ضرور آئے گا۔" خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے سکندر کو مسکرا کر بتایا تھا۔

اسے سامنے دیوار پر تھوڑی خالی جگہ نظر آئی تو اس پر بیٹھ گئی۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر سکندر بھی اس کے ساتھ ہی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ پاؤں دائیں بائیں ہلاتی وہ خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سکندر کو اس کی اداسی کسی بھی قیمت پر پتا نہیں چلنی چاہیے۔ وہ سکندر پر سے نظریں ہٹائے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی بھرپور شعوری کوشش کرتے ہوئے فاؤنٹین میں سکے اچھالتے سیاحوں کو دیکھ رہی تھی۔

"صحیح طریقہ کیا یہی ہوتا ہے فاؤنٹین میں سکہ اچھالنے کا؟" سکندر نے ایک سیاح مرد کو فاؤنٹین میں سکہ اچھالتے دیکھ کر اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں' آپ کی پشت فاؤنٹین کی طرف ہونی چاہیے سکہ آپ کے سیدھے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور بغیر فاؤنٹین کی طرف سر گھما کر دیکھے آپ نے کندھے کے اوپر سے Coin پانی میں اچھالنا ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ اگر ایک سکہ اچھالیں گے تو دوبارہ روما آئیں گے اور اگر دو سکے اچھالیں گے تو دوبارہ روما بھی آئیں گے اور کسی رومن سے آپ کو محبت بھی ہو جائے گی اور اگر تین سکے اچھالیں گے تو جس سے آپ کو محبت ہو گی اس سے آپ کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

وہ سکندر کی طرف دیکھ کر ہنس کر بولی تھی۔

"تم یقین کرتی ہو اس بات پر؟" سکندر نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں' تم کرتے ہو؟"

"نہیں' بھئی بالکل بھی نہیں۔" وہ دونوں ہنس رہے تھے گویا فاؤنٹین میں سکے اچھالنا ان دونوں کے لیے ایک مذاق اور تفریح سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔

"اس تالاب میں اب تک کتنے سکے جمع ہو چکے ہوں گے۔ اٹالین گورنمنٹ ان کا کرتی کیا ہے؟" سکندر نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔ "روما کے غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں یہ پیسے۔ کم از کم بھی ہر دن یہاں تین ہزار یورو تو پانی میں جمع ہوتے ہی ہیں۔" اس نے مسکرا کر سکندر کو جواب دیا تھا۔

"اچھا تم یہاں میری جگہ رکھ کر بیٹھو' میں ابھی آیا۔" وہ یک دم ہی کچھ سوچ کر بولتا ہوا اس کے پاس سے اٹھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ کیا Coin اچھالنے؟" اس کے شرارت بھرے سوالیہ انداز کے جواب میں سکندر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"اتنا پاگل نہیں ہوا ابھی۔ کسی اور کام سے جا رہا ہوں۔ بس ابھی آیا۔ تم میری جگہ رکھنا۔"

ہنس کر بولتا وہ تیزی سے چلا گیا اور جس رفتار سے وہ گیا تھا۔ اسی رفتار سے چار پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو آئس کریم کونز تھیں۔

"گیلاٹو سینوریتا۔" اس نے کون اس کی طرف بڑھائی تھی۔

"اچھا تو تم یہ لینے گئے تھے؟" مسکرا کر کون ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

"ہاں' میں نے سوچا اتنے دنوں میں اٹلی کی کافی

مشہور جگہیں بھی دیکھ لیں' یہاں کے مزے دار کھانے بھی کھالیے' اگر نہیں کھائی تو ساری دنیا میں مشہور اٹالین آئس کریم نہیں کھائی۔"

"میں آرڈر کردیتی' تمہیں مشکل تو نہیں ہوئی؟"

"جناب! کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے مجھے؟ خاصا ذہین آدمی ہوں میں' گزارے لائق اٹالین لفظ سیکھ لیے ہیں میں نے۔" وہ آئسکریم کھاتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"اٹالین آئس کریم میں Fats بھی کم ہوتے ہیں اور اس کا ذائقہ بھی دوسری آئسکریمز کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھا ہوتا ہے۔"

وہ اتنے آرام سے اس سے مختلف موضوعات پر کس طرح بات کررہی ہے' اسے خود پر حیرت ہورہی تھی۔ وہ اندر سے بہت اداس تھی بہت پریشان تھی۔

"چلیں؟" وہ دونوں کون کھاچکے تب سکندر نے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا اور دیوار پر سے اٹھ گئی تھی۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے یک دم ہی پھر اس کا دل اداسیوں میں گھرنے لگا تھا۔ کیا وہ دونوں اس طرح پھر بھی ایک ساتھ یہاں Trevi فاؤنٹین کے سامنے بیٹھ پائیں گے؟ اس کا دل چاہا وہ سکندر سے کہے۔

"تم پانی میں سکہ اچھالو' تم چاہتے ہو یا نہیں' مگر میں چاہتی ہوں تم روما دوبارہ آؤ اور اب کی بار تم میری خاطر روما آؤ۔"

وہ اس کی کیفیات سے انجان وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے پیدل واپس جارہے تھے۔ سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے' وہ بہت مطمئن سا لگ رہا تھا۔

"تمہارا کل کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے آہستگی سے اس سے پوچھا۔

"بس آفس ہی جانا ہے اور تو کچھ خاص نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کل آفس میں ایک میٹنگ ہے دوپہر' دو تین بجے تک میٹنگ ختم ہوگی۔ اس کے بعد ہوٹل جاکر اپنی پیکنگ وغیرہ کروں گا۔ کل رات ایک' ڈیڑھ بجے ایئرپورٹ کے لیے نکلوں گا۔ صبح ساڑھے تین بجے کی میری فلائٹ ہے۔"

وہ اپنے جانے کی بات اتنے سکون سے کررہا تھا۔ ذرا سا افسوس' ذرا سا دکھ بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آرہا تھا' بلکہ وہ بہت مطمئن لگ رہا تھا' جیسے کہ واپس اپنے گھر جانے پر خوش ہو۔

"تم اتنے خوش کیسے ہوسکتے ہو سکندر شہریار! تم مجھ سے دور جانے پر' مجھ سے جدا ہونے پر اتنے خوش کیسے ہوسکتے ہو؟"

اس کا دل چاہا تھا وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھے۔ چند دنوں کے لیے ملا وہ شخص اتنی خوشی خوشی اس سے جدا ہونے کی بات کررہا تھا۔ کیا اتنے دنوں میں کبھی ایک پل کے لیے بھی اس نے اس کے لیے وہ نہیں سوچا تھا' جو وہ اس کے لیے سوچا کرتی تھی؟

"تم کل رات کا کھانا میرے گھر پر میرے اور نینی کے ساتھ کھاؤ۔" بے اختیار اس نے اسے دعوت دی' جیسے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ایک وجہ تلاش کی ہو۔

"ڈنر..... لیکن لیزا....." وہ شاید اس سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا' مگر اس نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی' اس نے بہت اصرار کرکے کہا تھا۔

"پلیز سکندر! انکار مت کرو' مجھے افسوس ہوگا۔ تمہاری پینٹنگ میں مکمل کرچکی ہوں' میں تمہیں وہ دکھانا چاہتی ہوں' تم کل آؤ گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔"

سکندر نے ایک پل کے لیے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا تھا' وہ اسے بہت گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"بہت دفعہ تمہارا اور تمہاری نینی کا مہمان بن چکا ہوں' بہت بار تمہارے گھر پر کھانا بھی کھاچکا ہوں۔ لیکن اگر تمہارا اصرار ہے مصورہ! تو میں کل پھر آجاؤں گا۔"

وہ یک دم ہی مسکرادی تھی۔ سکندر بھی اسے مسکراتے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"میں تمہیں کل شام میں تمہارے ہوٹل سے پک کرلوں گی۔"

وہ دونوں چلتے ہوئے وہاں تک آگئے تھے جہاں اس نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔

"نہیں، یہ غلط بات ہے، میری دعوت بھی کرو اور مجھے لینے بھی آؤ؟ میں آفس کی گاڑی سے آجاؤں گا، تمہارے گھر کا پتا مجھے یاد ہے سینوریتا۔" اپنے جملے کا آخری حصہ ادا کرتے وقت وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سکندر کو اس کے ہوٹل اتارنے کے بعد وہ اپنے فلیٹ واپس جارہی تھی تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ اس نے خود کو رونے سے روکا، خود کو سرزنش کی۔ وہ کل آتو رہا ہے، وہ کل اس سے مل تو رہا ہے، ابھی وہ جدا تو نہیں ہوگیا، کیا پتا کل وہ کچھ ایسا کہہ دے کہ پھر اس کا چلے جانا، بچھڑ جانا، لگے ہی نہیں۔ وہ سکندر کو اس کے ہوٹل چھوڑ دینے کے بعد سے ہی کل کی شام کا انتظار کرنے لگی تھی۔

کل کی شام اپنے ساتھ اس کے لیے بہت ساری خوشیاں لائے گی، اس کی محبت یک طرفہ نہیں ہے۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھی۔ سکندر نے اس کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی، اس نے اس کے لیے اپنا خون بہایا تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

کیسے مان لے کہ وہ سب فریب تھا؟ اس کے سچے اور بہت انمول جذبے اتنے بے وقعت نہیں ہوسکتے تھے کہ سکندر انہیں سمجھے بغیر، اس سے کچھ بھی کہے بغیر واپس چلا جاتا۔

کل وہ اس سے کچھ نہ کچھ من چاہا ضرور کہہ کر جائے گا۔

سکندر شہریار کوئی آس، کوئی امید، کوئی وعدہ اس کی جھولی میں ڈالے بغیر یہاں سے جا ہی نہیں سکتا۔

☆ ☆ ☆
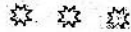
وہ ایک آس اور نراس میں گھری سکندر کی دعوت کی تیاری کررہی تھی، دل اچانک ہی اداسیوں میں گھرنے لگتا، پھر اچانک ہی پر امید سا ہو جاتا۔ [illegible] کے ساتھ مل کر وہ ایک بہت اچھی اور شان دار سی دعوت کا اہتمام کررہی تھی، جس میں پاکستانی کھانے بھی تھے اور اٹالین بھی۔ پاکستانی کھانے بنانے اسے نہیں آتے تھے مگر کھاتی شوق سے تھی۔

پاکستانی ڈشز نینی بنارہی تھیں۔ اٹالین ڈشز وہ تیار کررہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس نے گلدان میں تازہ پھول سجادیے تھے۔ میز پر نیپکنز، پلیٹس، چھری کانٹے سب کچھ سلیقے اور ترتیب سے رکھ دیا تھا۔ وہ خود بھی ٹخنوں تک آتا لمبا سیاہ اسکرٹ اور گلابی سادہ شرٹ پہن کر تیار ہوچکی تھی۔

بیل کی آواز سنتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ کیا پتا وہ۔ کیا پتا وہ آج اس سے وہ کہہ دے، جو وہ اس کے لبوں سے سننا چاہتی ہے۔ اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ سکندر کے لیے کھولتے ہوئے وہ جانتی تھی کہ اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا ہے۔

"چاؤ سینوریتا۔" جینز اور ٹی شرٹ پہنے مسکراتا ہوا وہ اس کے سامنے تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں خوب صورت پھولوں کا گلدستہ تھا اور دوسرے میں دو خوب صورت اور فینسی شاپنگ بیگز۔ ایک الگ سے شاپر اور بھی تھا۔

"چاؤ۔" وہ مسکراتے ہوئے سامنے سے ہٹی اور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

"یہ تمہارے لیے۔" وہ دروازہ بند کرکے مڑی تو سکندر نے پھول اور ایک شاپنگ بیگ اسے پکڑایا۔

"یہ کیا ہے؟"

"اپنی رومن دوست کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ۔" وہ مسکرا کر بولا۔ وہ پھولوں کی خوشبو سونگھنے لگی تھی۔ وہ دونوں لونگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ لیزا سکندر کے لائے تحفے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے لیے فائن آرٹس ـــــ پر ایک بہت مہنگی اور نایاب کتاب تحفے میں لایا تھا۔ بہت قیمتی لکڑی سے بنا ایک پورٹیبل ایزل کا سیٹ بھی تھا جس میں پینٹس برشز اور پلیٹ وغیرہ کو رکھنے کے لیے خوب صورت

خانے بنے ہوئے تھے۔ وہ عدد قیمتی پرفیومز تھے۔ ایک مہنگا سا بین کا سیٹ تھا اور ساتھ میں چاکلیٹس کا ایک ڈبہ تھا۔

"یہ ایک تحفہ ہے؟" وہ ابھی اس کے لائے تحفوں کو دیکھ رہی تھی کہ کچن سے نینی بھی وہیں آگئیں۔

"آگئے بیٹا؟"

"السلام علیکم۔" سکندر انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔" نینی نے دعا دیتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ آج کے اس ڈنر کی تیاری میں نینی نے اس کا ساتھ اتنی ہی خوشی سے دیا تھا جتنی خوش وہ تھی۔ اسے کئی بار شک سا ہوا تھا کہ شاید نینی اس کی کیفیات کو سمجھ رہی ہیں۔ انہوں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، مگر ڈنر کی تیاری انہوں نے جس جوش و خروش سے کی اور ابھی سکندر کو دیکھ کر جو خوشی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی، وہ اسے اس شک میں مبتلا کر رہا تھا کہ نینی کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہے اس کی سوچوں کا۔

دوسرا شاپنگ بیگ سکندر نے نینی کو دیا تھا۔ وہ ان کے لیے بھی پرفیوم اور گھر میں سجانے کے لیے چند ڈیکوریشن پیس لایا تھا۔ تیسرا شاپر جو سکندر نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس میں ناشپاتیاں تھیں۔ اسے اس کی پسند یاد رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اس کی پسند کا پھل لے کر آیا تھا۔

"خیر سے آج رات روانگی ہے بیٹا؟"

"جی آنٹی! صبح ہی ہو جائے گی۔" نینی نے تحفہ لیتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھے سکندر سے پوچھا۔

سکندر بڑے اخلاق سے انہیں جواب دے رہا تھا۔ جتنی دیر نینی اس سے بات کر رہی تھیں، وہ ان کی طرف متوجہ تھا، وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بہت سادہ اور عام سے انداز میں مسکرا کر بول رہا تھا۔ اسے نینی کے دیکھنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے اور سکندر کو صوفے پر ساتھ بیٹھا بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"نینی! آپ اور سکندر باتیں کریں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ صوفے پر سے اٹھنے لگی تھی۔

پتا نہیں کیوں اسے رونا آنے لگا تھا۔ اسے سامنے رکھے سکندر کے لائے تحفے الوداعی تحفے لگ رہے تھے۔ جیسے وہ اس سے بچھڑنے سے پہلے، اسے الوداع کہنے سے پہلے اپنی کچھ خوب صورت یادیں ان تحفوں کی صورت میں اس کے پاس چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں اسی طرح باتیں کر رہا تھا جس طرح کیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس کے بیٹھنے کا انداز وداع ہونے والا لگ رہا تھا۔

"تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کھانا میں لگاتی ہوں۔" نینی اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر واپس بٹھاتے ہوئے بولیں۔ اور کچن میں چلی گئیں۔

"کہاں کھو گئیں؟" اسے گم صم سا بیٹھا دیکھ کر سکندر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ زبردستی ہلکا سا مسکرائی۔

"چپ چپ سی لگ رہی ہو آج، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے جیسے ایک دوستانہ سی فکرمندی ظاہر کی تھی۔ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہیں پتا نہیں چل رہا کہ میں کیوں چپ ہوں؟ میں کیوں اداس ہوں؟" اس کا دل چاہا تھا وہ سکندر سے چیخ کر پوچھے، اسے جھنجھوڑے۔

"ہاں آج صبح سے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" وہ بول سکی تو مسکرا کر محض اتنا ہی۔

"تو سینوریتا! تمہیں اس ڈنر کو ملتوی کر دینا چاہیے تھا۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آرام کرتیں۔"

وہ اتنے اطمینان سے اسے یہ حل بتا رہا تھا کیا اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ آج یہاں سے چلا جائے گا۔

"صبح میں طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اب بالکل ٹھیک ہے، آؤ میں تمہیں تمہاری پینٹنگ دکھاؤں۔"

وہ یک دم ہی صوفے سے اٹھی تھی۔ سکندر اس کے پیچھے اٹھا۔ چکردار زینے پر چڑھ کر وہ دونوں اوپر آگئے تھے۔ وہ سکندر کی تصویر کی نوک پلک بھی سنوار چکی تھی' اب وہ ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ کسی اور حوالے سے بھی یہ پینٹنگ اس کے دل کے بہت قریب تھی' مگر ایک آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے بھی وہ جانتی تھی' یہ اس کی ایگزیبیشن میں رکھی جانے والی تصاویر میں سب سے بہترین اور بے مثال تصویر ہوگی۔ کام تو وہ ہر تصویر پر ہی دل سے کیا کرتی تھی' مگر یہاں شاید دل کی دھڑکنیں بھی اس تصویر کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔

''واؤ! گریٹ۔ کیا میں اتنا خوب صورت ہوں لیزا؟'' وہ تصویر کی تعریف کرتے کرتے شرارتی انداز میں بولا تھا۔

''نہیں' میں نے تمہیں خوب صورت پینٹ کیا ہے' اس لیے خوب صورت لگ رہے ہو۔'' وہ اس کی شرارت کا شرارت بھرے ہی انداز میں جواب دیتے ہوئے بولی تھی۔

''تم واقعی کمال کی آرٹسٹ ہو لیزا! صرف میں ہی نہیں بلکہ فاؤنٹین اور اس سے گرتا پانی سب کچھ جیسے زندہ ہو کر پھر سے سامنے آگیا ہے' جیسے میں کسی پینٹنگ کے سامنے نہیں بلکہ حقیقت میں Trevi میں اس فاؤنٹین کے سامنے بیٹھا خود کو دیکھ رہا ہوں۔''

وہ سچے دل سے اس کے آرٹ کی توصیف کر رہا تھا۔ اپنا آرٹ اس پل اسے بالکل بے معنی اور حقیر لگ رہا تھا۔ اپنی کوئی خوبی اس پل خوبی نہیں لگ رہی تھی۔ اگر وہ اتنی ہی اچھی ہوتی' اگر وہ اتنی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی تو کیا اسے اچھی نہ لگ جاتی؟ تب کیا وہ اسے پردیس میں ملی' چند روزہ ایک دوست سمجھ کر یوں الوداع کہہ پاتا؟

''لیزا' سکندر آجاؤ بیٹا کھانا لگ گیا ہے۔'' شاید اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں' جب زینے کے نیچے سے کھڑے ہو کر نینی نے انہیں آواز دی تھی۔ سکندر کی نگاہیں چونکہ اپنی تصویر پر تھیں' وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ نینی کی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔

''کیا تم نے میری آنکھوں کے وہ تمام تاثر پینٹ کر لیے جو کرنا چاہتی تھیں؟'' پینٹنگ سے نگاہیں اٹھا کر اس نے اس سے پوچھا۔

''میرے خیال سے تو کر لیے ہیں' خیر چھوڑو اسے' چلو نیچے چلتے ہیں' نینی کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر بولی تھی۔ سکندر نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''چلو۔'' وہ دونوں کھانا کھانے کے لیے نیچے آگئے تھے۔

''آپ لوگوں نے تو واقعی میری دعوت کر دی' اتنے زیادہ تکلف کی کوئی ضرورت تھی تو نہیں۔ میں خود کو یہاں مہمان سمجھ کر بالکل نہیں آیا تھا۔''

سکندر کھانے کی میز پر چنے انواع و اقسام کے کھانوں کو دیکھ کر بولا تھا۔ نینی اس کی خاطر تواضع بڑے دل سے کر رہی تھیں۔ انہوں نے تندوری چکن کا ایک پیس کاٹ کر اس کی پلیٹ میں رکھا۔

''ہم بھی تمہیں مہمان نہیں سمجھتے۔ دوبارہ جب بھی روما آؤ' اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ کر آنا۔'' نینی نے اس سے مسکرا کر کہا تھا۔ پر تکلف کھانے کے بعد نینی نے پوچھا۔

''اب کیا چلے گا کافی یا گرین ٹی؟'' وہ کھانے کے دوران زیادہ وقت خاموش رہی تھی' مگر اس کی خاموشی بھی زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی کہ نینی سکندر سے باتیں کر رہی تھیں' وہ صرف خاموشی سے مسکرا رہی تھی' جیسے ان دونوں کی گفتگو میں بھرپور دلچسپی لے رہی ہو۔

''کچھ بھی نہیں آنٹی! میں بس اب جاؤں گا۔ میری پیکنگ تھوڑی رہتی ہے۔ ایکچوئلی! آفس سے لیٹ آیا تھا' میری پیکنگ پوری نہیں ہو سکی۔''

سکندر' نینی کے استفسار پر مسکرا کر بولا تھا۔ وہ تینوں میز پر سے اٹھ گئے تھے۔

"اتنے مزے کا آپ نے مجھے کھانا کھلایا ہے کہ اب فلائٹ پر بھی کچھ نہیں لوں گا۔ کل دوپہر سے پہلے تو اب میرا کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہے گا۔"

وہ نینی سے خوش گوار اور با اخلاق سے انداز میں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

"جیتے رہو بیٹا۔ اللہ خیریت سے تمہیں تمہارے گھر پہنچائے۔" نینی نے پُرشفقت انداز میں اسے دعائیں دیں۔

"تم کیسے جاؤ گے سکندر! میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

اپارٹمنٹ کے دروازے تک نینی بھی ان دونوں کے ساتھ ہی آئی تھیں۔

"اس کی ضرورت نہیں لیزا۔ آج آفس کی گاڑی مجھے ملی ہوئی ہے۔ نیچے آفس کا ڈرائیور میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہی مجھے ایرپورٹ بھی چھوڑے گا۔"

وہ جیسے اسے پہلے ہی سے بتا رہا تھا کہ اس کی ایئرپورٹ روانگی کا بھی بندوبست ہو چکا ہے' مبادا وہ چلنے کو کہہ دے۔ نینی نے سکندر کو وہیں سے ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا' جبکہ وہ اس کے ساتھ نیچے جا رہی تھی۔

سکندر پُرسکون' مطمئن اور بہت خوش سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی سوچوں سے انجان اسے اپنے گھر' اپنے شہر اور اپنے ملک جانے کی جلدی تھی' خوشی تھی۔ وہ آنسوؤں کو اپنے دل پر گرتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ جو بہت پیارا ہو' اس سے بچھڑنا کیسا ہوتا ہے۔

وہ یہ درد پہلی بار تو نہیں سہہ رہی۔ زندگی یہ درد تو اسے پہلے بھی دے چکی ہے۔ اس سے اس کا پیارا گھر چھینا تھا' اس سے اس کی بہت پیاری بہن بچھڑی تھی۔ تقدیر نے اس کی زندگی میں بار بار یہ درد سہنا لکھا ہے۔

پھر وہ آج کیوں ٹوٹ رہی ہے؟ آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ اپنے حوصلوں کو مضبوط کر رہی تھی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں آ گئے جہاں سکندر کے آفس کی گاڑی کھڑی تھی۔

"اوکے۔ سینوریتا لیزا! میں چلوں؟" گاڑی کے پاس آ کر رکتے ہوئے وہ اس سے بولا۔

"جاؤ سینور سکندر۔" اس نے خود کو بہادری اور ہمت کے تمام بھولے ہوئے سبق یاد دلا کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

سکندر نے بڑی گرم جوشی اور خلوص سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"کیا میں تمہارا شکریہ ادا کروں؟" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"نہیں۔" وہ اندر ہی اندر رو رہی تھی' مگر اوپر سے بہادری مسکرا رہی تھی۔

"لیزا! تمہارا روما واقعی بہت خوب صورت ہے' بہت اچھا ہے' میں نے یہاں اپنی زندگی کے چند بہت ہی یادگار دن گزارے ہیں۔ روما کی ہسٹری' آرٹ' آرکیٹیکچر' فوڈ' موسم اور لیزا۔ سب بہت بہت اچھے ہیں۔"

وہ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لا کر کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک سکندر کے ہاتھ میں تھا۔

"میں نے Trevi میں Coin نہیں اچھالا تھا' پھر بھی میری خواہش ہے میں زندگی میں دوبارہ روما ضرور آؤں اور لیزا سے بھی ملوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں اس سے الوداعی جملے کہہ رہا تھا۔

"خیر سکہ نہیں بھی اچھالا' تب بھی کیا ہوا؟ تم قسمت پر بہت یقین رکھتی ہو' کیا پتا قسمت ہمیں پھر ملوا دے' کسی کام سے تم دوبارہ آ جاؤ یا کسی کام سے میرا روما یا لندن آنا ہو جائے اور یوں اتفاقیہ ہماری پھر ملاقات ہو جائے۔"

وہ ہنس کر بولا تھا۔

"بس یہی؟ تم اور کچھ بھی نہیں کہو گے؟ یوں ہی چلے جاؤ گے؟"

اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی تھی۔ وہ کمال ہمت سے مسکرا رہی تھی کہ اپنا بھرم اسے بہت عزیز تھا۔ جب اس پل میں اس کی محبت نہیں تھی تو کچھ کہہ کر اپنا بھرم، اپنی عزت گنوانا اسے ہرگز منظور نہ تھا۔

"اگر کبھی دوبارہ آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا پڑے گا۔" سکندر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"ہاں ضرور۔" اس نے مسکرا کر سر ہاں میں ہلایا تھا۔

وہ دوبارہ آکر اس سے کہاں ملے گی، کس پتے پر ملے گی، یہ بتانے کی زحمت گوارا کیے بغیر وہ اسے دوبارہ آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی تھی۔ سکندر گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ سکندر نے اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا تھا۔

"کیا یہ شخص اب مجھے زندگی بھر کہیں نظر نہیں آئے گا؟ کبھی نہیں ملے گا؟" وہ اسے ہاتھ ہلا کر جواباً خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی گاڑی کو اپنے اپارٹمنٹ سے نکلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

جیسے ہی سکندر کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوئی، آنکھوں میں لب سے رکے آنسو یک دم ہی بہہ نکلے۔ وہ اپنا کوئی بھی اتا پتا، نشان چھوڑے بغیر اس سے رخصت ہو گیا تھا، وہ اس سے اس انداز میں رخصت ہو کر گیا تھا جیسے اب زندگی بھر وہ دونوں شاید ہی کبھی ایک دوسرے سے دوبارہ مل پائیں گے اور وہ دوبارہ بھی اگر کبھی آئی تو اتفاقاً" آئے گی۔ وہ خود سے اس سے پھر ملنے کی کوئی چاہ نہیں رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆
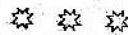
وہ شکستہ قدموں سے واپس اوپر آگئی تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اس وقت بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ بالکل گم صم، وہ جیسے ہاری ہوئی

بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ نینی اندر آئی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں نہیں دیکھا تھا۔

"چلا گیا سکندر؟" اس کے پاس بیٹھ کر انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

"جی۔" اس نے آنکھوں سے گرتے آنسو بڑی سرعت سے صاف کیے۔

"ابھی اوپر آتے ہوئے پتا نہیں کس چیز سے ٹھوکر لگ گئی' بڑی زور سے چوٹ لگی ہے نینی!" بھرائی آواز میں اس نے جیسے انہیں اپنے آنسوؤں کی توجیہہ دینا چاہی۔

"تم نے اس سے کچھ کیوں نہیں کہا لیزا؟ جو تمہارے دل میں تھا' ایک بار ہمت کرکے بول تو دیتیں بیٹا!"

نینی اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"نینی؟" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

"تمہیں نو مہینے اپنی کوکھ میں نہیں رکھا' تمہیں پیدا نہیں کیا' مگر پالا تو ماں بن کر ہی ہے لیزا! ماں ہوں تمہاری۔ کیا ماں اپنی بیٹی کے دل کا حال بھی نہیں جانے گی؟ میں تو یہ بات اس وقت بھی جانتی تھی جب تم کہتی تھیں سکندر کی سب سے بڑی disqualification (خرابی) اس کا پاکستان سے تعلق ہونا ہے۔ بڑی ہنسنے' کھیلنے اور دوستیاں رکھنے والی ہے میری بیٹی مگر پھر بھی میں نے اسے پہلے کبھی کسی انجان شخص کے لیے آدھی رات کو رونا سے نیپلز جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی چند روزہ ملے ہوئے کسی شخص کے ایکسیڈنٹ کے ہونے پر یوں ہلکان ہوتے نہ دیکھا تھا' اس کی خاطر اپنے دن' رات' اپنا سونا' جاگنا' آرام سب کچھ بھول جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے گھر لا کر ٹھہراتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو' اسے کوئی بات بری نہ لگ جائے' اس فکر میں مبتلا نہ دیکھا تھا۔"

وہ نینی کے نرم لہجے میں کہی باتیں سن کر یک دم ہی رو پڑی تھی۔

"جب سکندر یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور تم نے ساری رات اس کے پاس لونگ روم میں فلور کشن پر بیٹھ کر گزار دی تھی' اس صبح جب میں فجر کے لیے اٹھی۔ میں وضو کرکے باہر نکلی تو تمہیں فلور کشن پر بے آرامی سے بیٹھے' صوفے پر سکندر کے نزدیک سر ٹکا کر سوتے دیکھ کر میرے دل کو کامل یقین مل چکا تھا کہ تمہاری سکندر کے لیے توجہ اور التفات وقتی نہیں بلکہ بہت گہری ہے۔ تمہیں میرا اس سے یہ پوچھنا برا لگا تھا کہ میں نے اس کی شادی اور منگنی کی بات کیوں پوچھی ہے۔ مگر لیزا! میں نے وہ سوال تمہارے لیے' تمہاری ماں بن کر سکندر سے پوچھے تھے۔ تم اس سے محبت کررہی تھیں اور تمہیں اس کی ذاتی زندگی کی کوئی ایک بھی بات پتا نہیں تھی۔"

وہ بے اختیار نینی کے کندھے پر سر رکھ کر زاروقطار رو پڑی تھی۔

"ہاں' مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی نینی! وہ میرے لیے بہت اہم بن گیا تھا مگر جو میں نے اس کے لیے سوچا' وہ اس نے میرے لیے کبھی بھی نہیں سوچا۔ اگر سوچا ہوتا تو یوں خاموشی سے چلا نہ جاتا؟ بنا کچھ کہے؟" وہ نینی کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تو تم کہہ دیتیں لیزا! اس کے کچھ کہنے کا انتظار کیوں کرتی رہیں؟ تم بول دیتیں اپنے دل کی بات اس سے۔"

"اور اگر جواب میں وہ ہنس پڑتا' یہ کہہ دیتا کہ لیزا محمود! میں تمہیں اتنا امیچیور نہیں سمجھتا تھا کہ محض چند دنوں کی ملاقاتوں کو محبت سمجھنے لگوگی' ایک وقتی تعلق کو عمر بھر کا رشتہ سمجھنے لگوگی۔ پھر نینی میں کیا کہتی؟ میں تو اپنی ہی نظروں میں گر جاتی اور اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ اس نے مجھے ایک چند روزہ اور وقتی دوست سمجھا تھا' جس سے یہاں سے جا کر اس کا کوئی رابطہ رکھنے کا بھی ارادہ نہیں ہے؟"

وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"میں ہار گئی نینی! میں ہار گئی۔ محبت آپ کی لیزا کا نصیب نہیں۔ میرا گھر، ہیم اور اب سکندر۔ ایک ایک کر کے میں نے اپنی ہر محبت کھو دی ہے نینی!"

☼ ☼ ☼

اور زندگی میں پہلی بار اسے روما کی گلیاں اسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈنے وہ اکیلی کلوزیم گئی تھی۔ وہ وہاں اِدھر سے اُدھر اکیلی پھری تھی۔ اسے وہاں اپنے گرد اس کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

"رومن اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔ میں ایک رومن لڑکی کو جانتا ہوں اور وہ کافی اچھی ہے۔" وہ کلوزیم سے نزدیک اس ریسٹورنٹ میں آگئی تھی جہاں انہوں نے ساتھ بیٹھ کر لنچ کیا تھا۔

"مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہو رہی کہ جو لڑکی تازہ تازہ میری دوست بنی ہے۔ وہ ٹرک ڈرائیوروں والی اردو بولتی ہے۔" وہ ہر جگہ یہاں تک کہ وہ اکیلی نیپلز بھی دوبارہ چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کس چیز کی کھوج میں، کس چیز کی تلاش میں۔ مگر جو اس نے کھو دیا تھا، وہ اس کو کہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ دن بھر میں جتنی بار آئینہ دیکھتی۔ اس کے کانوں میں سرگوشی ہوتی۔

"Bella (خوبصورت)۔" وہ جتنی بار اپنے اسٹوڈیو میں جاتی، اس کی پینٹنگ پر نظر پڑتی، اسے اس کی آواز اپنے بالکل نزدیک سنائی دیتی۔

"اور تم مجھے پینٹ کب کرو گی؟" وہ اس پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے رو پڑتی۔ نہ گھر کے اندر نہ گھر سے باہر اسے کسی بھی جگہ چین نہیں مل رہا تھا۔

محبت کیا ایسی ہی دل دکھانے والی چیز ہوتی ہے؟
کیا اس کے لیے دنیا کے تمام شاعروں نے اس قدر خوبصورت شعر کہے ہیں؟
مصوروں نے لاجواب شاہکار تخلیق کیے ہیں، موسیقاروں نے بے مثال دھنیں بنائی ہیں اور ناول نگاروں نے روح کو چھو لینے والے جملے تحریر کیے ہیں؟
محبت خوشی کب ہے؟ محبت تو فقط آنسو ہے، جیسے ایک آہ، ایک بددعا ہے، جسے لگ جائے اس کے دل کا چین اور سکون زندگی بھر کے لیے چھین لیتی ہے۔

وہ چاہتی تھی۔ اس کا ضدی دل اس تلخ سچائی کو مان لے کہ سکندر شہریار اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ اسے دنیا کی بھیڑ میں اب دوبارہ کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ وہ اس سے دوبارہ ملنا چاہتا ہی نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جائے نماز پر تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کے سجدے طویل تھے اور دعائیں محض آنسو۔ وہ دعا مانگنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ اٹھاتیں۔ لبوں سے کوئی لفظ ادا نہ ہو پاتا، فقط آنسو ہوتے جو قطار در قطار بہے چلے جاتے۔ اگر شدت غم سے کبھی کوئی لفظ نکلتے بھی تھے تو صرف "اللہ" اور "میرا بچہ۔"

وہ کب یاد نہیں آتا تھا، وہ کب ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ کوئی اسے یاد نہ کرے، سب اسے بھول جائیں مگر وہ تو اپنے بیٹے کو نہیں بھول سکتیں۔ ماں کے لیے تو اس کا بیٹا اگر قتل بھی کر کے آجائے تب بھی اس کا بیٹا ہی رہتا ہے۔ اس کی یاد کی تڑپ انہیں راتوں کو گہری نیند سے جگا دیا کرتی تھی، اس کی یاد انہیں ہنستے ہنستے رلا دیا کرتی تھی۔

دن بھر میں نجانے کتنی مرتبہ اسے یاد کر کے سب سے چھپ کر رو دیا کرتی تھیں۔ نجانے دنیا کی بھیڑ میں کہاں بھٹک رہا تھا ان کا بچہ، ان کی جان، ان کا سکندر۔ کسی کسی لمحے ایسی تڑپتی تھی ان کی ممتا کہ دل چاہتا تھا گھر سے نکل جائیں، اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے، اسے کھوجنے۔ وہ مل جائے تو اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیں، اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیں، بالکل اس طرح جیسے اسے بچپن میں اپنی گود میں بھر لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"اللہ! میرے بچے کی حفاظت فرما۔ اسے اپنی امان میں رکھ۔"

روتے ہوئے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ ان کے لبوں سے ادا

ہو رہے تھے۔

وہ فون پر کہہ رہا تھا "میں ٹھیک ہوں' میں خوب گھوم پھر رہا ہوں' میں آفس کے بعد سارا ٹائم سیر و تفریح میں گزار تا ہوں۔"

مگر وہ ماں جانتی تھی کہ اس کا بیٹا جھوٹ بول رہا ہے' محض اس کا دل خوش کرنے کے لیے۔ وہ جس پل اپنے خوش اور مطمئن ہونے کی خبر انہیں دے رہا تھا' انہیں اس کی آواز تکلیف اور درد سے بھری لگ رہی تھی۔

اس روز ان کا دل بہت گھبرا رہا تھا تب ہی انہوں نے اسے فون کیا تھا ورنہ بہت جلدی جلدی ان کی سکندر سے فون پر بات نہیں ہوتی تھی کہ اس سے بات ہونے پر خود کو سنبھالنا' اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ہمیشہ ان کے لیے بے حد کٹھن ہوا کرتا تھا۔

وہ اٹلی میں تھا' اور اپنے آفس کے کام سے روم گیا ہوا تھا' مگر وہ وہاں ٹھیک نہیں تھا۔ یہ ان کی ممتا انہیں بتا رہی تھی۔ کچھ ہوا تھا ان کے بیٹے کو' اس کی آواز میں تکلیف وہ کیوں کر محسوس نہیں کر سکتی تھیں؟ لاکھ وہ اسے ہنسی اور خوشگواریت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا۔ کہیں چوٹ لگی تھی ان کے بیٹے کو یا وہ بیمار تھا۔ وہ روتے ہوئے بے آواز اس کی صحت' تندرستی' لمبی عمر اور خوشیوں کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اب ان کے سکندر کو بھی خوشیاں ملنی چاہیے تھیں۔

اور کتنی سزا کاٹے گا وہ؟ مقررہ مدت زندان میں گزارنے کے بعد تو بڑے سے بڑے مجرم بھی معاف کر دیے جاتے ہیں' ان کے بیٹے کی سزا کب ختم ہو گی؟

ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر جلدی سے آنسو صاف کیے۔ وہ جائے نماز لپیٹتے ہوئے اٹھی تھیں۔

"آجاؤ۔" انہوں نے مصنوعی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر زین اندر آیا۔

"السلام علیکم امو جان!" وہ مسکراتے ہوئے ان

"وعلیکم السلام!" پیار بھری نگاہوں سے انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو دیکھا۔ اب ان کے لبوں پر سچی مسکراہٹ تھی۔ جیسے چھوٹا بیٹا ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے' اسی طرح ان کا بڑا بیٹا کیوں نہیں رہتا؟

"جلدی واپس آ گئے بیٹا۔" دل میں درد سا جاگا تھا۔ زین یہاں ہے پر وہ کیوں نہیں؟ انہوں نے بیٹے کی پیشانی چومی۔

"جی امو جان! بس وہ علی کی طبیعت کا سن کر مجھ سے مزید رکا نہیں جا سکا۔"

اور آمنہ شہریار خان اپنے بیٹے کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ان کا بیٹا اپنے بیٹے کے موسمی نزلے زکام کا سن کر اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ بھاگا بھاگا سنگاپور سے واپس آ گیا تھا۔

ان کا' آمنہ شہریار خان کا بیٹا بھی تو بیمار تھا' ان کا بیٹا تو برسوں سے تنہا تھا' زین سے چار دن بیٹے کی جدائی برداشت نہیں ہوئی تھی۔ انہیں تو زمانے بیت گئے تھے اسے گلے سے لگائے ہوئے' اسے پیار کیے ہوئے' اسے جی بھر کر دیکھے ہوئے۔ ان کی خاموش نگاہوں میں اس پل ایک شکوہ در آیا تھا۔

"مل لیے علی سے؟" انہوں نے ایک گہری سانس لے کر موضوع تبدیل کیا۔

"جی' آتے ہی سب سے پہلے علی سے ملا ہوں اور پھر سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ پاپا کہاں ہیں؟" زین مسکرا کر بولا۔

"اسٹڈی میں ہیں۔" انہوں نے نماز کے لیے بندھا دوپٹہ کھولتے ہوئے اسے بتایا۔

"اچھا! میں پاپا سے بھی مل لوں۔" وہ ان کے چہرے کو پیار سے دیکھ کر کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا تھا۔

انہوں نے سرد آہ بھر کر زین کو جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک بیٹا نگاہوں کے سامنے ہے اور ایک نگاہوں سے اتنا دور' اتنا اوجھل' جیسے وہ کبھی ان کی زندگیوں کا حصہ تھا ہی نہیں؟

☼ ☼ ☼

وہ کھانے کی میز پر بھی خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کا شوہر' بیٹا' بہو' پوتا سب کھانے کی میز پر موجود ہیں۔ وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ ہیں' پھر آخر وہ خوش کیوں نہیں ہیں؟ اس لیے کہ اس میز پر وہ موجود نہیں ہے۔ وہ بھی یہاں بیٹھا ہوتا تو یہ منظر کتنا مکمل لگتا۔

ساری زندگی شوہر کی اطاعت گزاری کی تھی' خاموش سر جھکائے رہی تھیں' اس لیے اب بھی ان کی خاموشی کسی کو زیادہ محسوس نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ تو برسوں سے مہر بہ لب تھیں۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔

"دادی جان! پاپا میرے لیے اتنی بڑی اسپورٹس کار لائے ہیں۔" ان کے ڈھائی سال کے پوتے نے ماں کے ہاتھوں سے چاول کھاتے ہوئے بڑے جوش سے انہیں بتایا۔

وہ اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی تھیں۔ اب صرف ایک وہی تھا جسے دیکھ کر جس کی توتلی زبان میں اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر دل خوش ہوا کرتا تھا۔ تھا بھی وہ بلا کا ذہین۔ ڈھائی سال کی عمر میں چار سے پانچ سال کے بچے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنے دادا اور تایا کی ذہانت اس نے وراثت میں لے لی تھی۔

"واہ بھئی واہ۔ مزے آگئے میرے بیٹے کے۔" وہ ہنس کر بولی تھیں۔

"دادا جان! آپ دیکھیں گے میری اسپورٹس کار؟"

"اگر علی دکھائے گا تو ہم ضرور دیکھیں گے۔" بشیر یار خان کا سخت' بے لچک اور سرد انداز بھی پوتے کو دیکھ کر مسکراہٹوں میں بدل جایا کرتا تھا۔ وہ شوہر کو مسکرا کر پوتے سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ یوں مسکراتے ہوئے بھی دل کے اندر کہیں ماتم ہوا تھا' آنسو بہہ نکلنے کو بے قرار تھے۔ خوشی کے لمحوں میں بھی ان سے خوش ہوا نہیں جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆
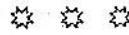
اپنی جس نمائش کی پرجوش تیاری وہ اس بار روما میں کر رہی تھی' اس کا سرے سے اس سے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے اپنی تصاویر' اپنی نمائش یہاں تک کہ اپنا آرٹ بھی سب کچھ بے معنی اور بے کار لگ رہا تھا۔ اگر اس کا سولو شو ناکام ہو گیا تو بھی کیا فرق پڑے گا؟ اور اگر کامیاب ہو گیا تب بھی زندگی میں کیا تبدیلی رونما ہو جائے گی؟ نہ کامیاب ہونے سے نہ ناکام ہونے سے' وہ تو اسے کسی بھی طرح نہیں ملنے والا تھا۔

کئی دنوں سے اس کی سیم سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ قنوطیت اور ڈپریشن اس پر ایسا طاری تھا کہ کچھ دنوں سے اس نے اپنا سیل سرے سے آف رکھا تھا۔ اس کے سیل پر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد سیم نے گھر کے نمبر پر کال کی تو وہ گھر پر موجود نہیں تھی۔ وہ سینڈرا کے ساتھ اوپیرا دیکھنے گئی ہوئی تھی اس خیال سے کہ شاید یونہی اس کا دل بہل جائے۔ وہ واپس آئی تو نینی سے اسے سیم کے فون کا پتا چلا تھا۔ اپنے ڈپریشن میں وہ سیم کو بھول ہی گئی تھی۔ سیم یقیناً" اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوگی۔ اس نے اسی وقت سیم کا نمبر ملایا تھا۔

"کہاں ہو لیزا؟ میں کتنا پریشان ہو رہی تھی تمہارے لیے۔ تمہارا سیل کیوں آف تھا۔؟"

اس کی آواز سنتے ہی وہ بے چینی سے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں سیم!" وہ مختصر لفظوں میں بس اتنا ہی کہہ پائی۔

بچپن سے اپنی ہر بات اس سے شیئر کرنے کی ایسی عادت تھی کہ اس وقت جب یہ سوچ بیٹھی تھی کہ اس بے کار قصے کا سیم سے ذکر نہیں کرے گی' خوامخواہ دور بیٹھی سیم اس کے لیے پریشان ہو جائے گی تب اس کی آواز سنتے ہی گلا رندھ گیا تھا۔

"لیزا کیا ہوا ہے سویٹ ہارٹ! تم رو رہی ہو؟" وہ بے قراری سے بولی۔

"سیم!" وہ بھرائی آواز میں بولی۔ "سیم مجھ سے پینٹ نہیں کیا جا رہا۔ میری ایگزیبیشن کا کیا ہوگا؟ اتنے کم دن رہ گئے ہیں۔"

اسے رونا کسی اور بات پر آ رہا تھا اور رو کسی اور چیز

نام لے کر رہی تھی۔

"دلز! ایسا ہوا ہے۔ تم رو کیوں رہی ہو؟ پچھلے کئی دنوں سے تم سے بات کر رہی تھی تو تم مجھے اتنی خوش لگ رہی تھیں۔ مجھ سے شیئر نہیں کر رہی تھیں، مگر تمہاری لہجے کی کھنک اور تمہاری بے وجہ ہنسی مجھے بتا رہی تھی کہ کچھ ایسا ہوا ہے تمہاری زندگی میں جو تمہیں خوش کر رہا ہے، پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی آگیا ہے میری بہن کی زندگی میں، کوئی ہے جو میری بہن کو اچھا لگنے لگا ہے۔"

"مگر میں اسے اچھی نہیں لگتی سیم۔" وہ رو پڑی اسے پتا تھا کہ وہ بچکانہ حرکت کر رہی ہے مگر بہن کے سامنے بھی نہ روتی تو پھر اور کہاں جا کر روتی؟ سیم جواباً" ایک پل کے لیے بالکل چپ ہو گئی تھی یوں جیسے سوچ رہی ہو کہ اس انکشاف پر خوش ہو یا بہن کے رونے پر دکھی؟

"دلز! وہ کون ہے؟" ایک پل کی خاموشی کے بعد اس نے بہت آہستہ آواز میں پوچھا۔

"وہ اپنے آفس کے کام سے یہاں آیا تھا۔ میں اس سے پہلی بار ملی تو میرا دل خود بخود ہی اس کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی مگر وہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ ان فیکٹ میں اب بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی مگر اسے بھولنا میرے لیے ناممکن ہے سیم۔ حالانکہ وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔"

اس کے تصور میں سکندر کا چہرہ آرہا تھا، مسکرا کر اس سے بات کرتا، کبھی اداس، کبھی قہقہہ لگا کر ہنستا۔ اس کے چہرے کو تصور میں دیکھتے وہ رونا بھول گئی تھی۔ وہ سکندر کے چہرے کو تصور میں دیکھتی سیم کو مزید بتا رہی تھی۔

"وہ لائر تھا اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔"

"وہ پاکستانی ہے؟" سیم اس کی بات کاٹ کر قدرے بے اختیاری سے بولی۔ جیسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں۔"

"اور تم ایک پاکستانی مرد کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہو لز؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو؟ میں پاپا کے خلاف کچھ کہنا چاہتی ہوں اور نہ ہی ہاشم کے خلاف۔ مگر لز! کیا ہم بہنوں نے اپنی زندگیوں میں اتنے پاکستانی مرد بھگت نہیں لیے کہ ہم یہ سمجھ سکیں۔ یہ لوگ فطرتاً" کس قدر خود غرض اور بے حس ہوتے ہیں؟"

سیم بہت دکھ اور بے یقینی سے بول رہی تھی۔ اسے جیسے اس سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

"سیم! میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی سیم! مجھے یاد ہے تمہاری شادی کے وقت میں نے کہا تھا، میں پاپا کو یہ خوشی کبھی نہیں دوں گی کہ ان کی خواہش کے مطابق کسی پاکستانی مرد سے شادی کرلوں۔ مجھے اپنی سب باتیں یاد ہیں سیم اگر محبت کر لینے سے وہ کوئی مجھے مل تو نہیں گیا نا؟ وہ تو مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر جا چکا۔ میری زندگی سے نکل چکا۔ پھر اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ پاکستانی تھا یا کسی اور ملک سے؟ یہ تو میں صرف تم سے شیئر کر رہی ہوں۔ پاپا کو تو یہ بات کبھی پتا بھی نہیں چلے گی۔"

ہاں محبت کر لینے سے وہ کون سا اسے مل گیا تھا، کون سا وہ اس سے محبت کرتا تھا، کون سا اس سے کوئی رابطہ رکھنے کی امید تھی جو وہ سیم کو سمجھانے اور اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتی کہ تمام پاکستانی مرد برے نہیں ہوتے۔

اگر ان بہنوں کا گھر اور سیم کی زندگی پاکستانی مردوں کی وجہ سے برباد ہوئی تھیں تب بھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ تمام پاکستانی مرد ہاشم اسد اور محمود خالد جیسے ہوتے ہیں۔ سیم کو قائل کرنا بے معنی تھا کہ جس کے لیے وہ اسے قائل کرنا چاہتی وہ تو کئی روز ہوئے زندگی ہی سے جا چکا تھا ہمیشہ کے لیے۔

"وہ میری زندگی سے جا چکا ہے سیم۔ وہ میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود کو بہت دور لے جا چکا ہے۔" گلوگیر لہجے میں بولتے ہوئے اس نے فون بند

کر دیا تھا۔ وہ فون بند کرنے کے بعد بہت اداس اور خاموش بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا لیزا؟ کیا کہہ رہی تھی سیم؟" نینی کچن کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھی اس کے پاس آئی تھیں۔

"وہ خفا ہو رہی تھی اس بات پر کہ میں نے کسی پاکستانی مرد سے یک طرفہ محبت بھی کیوں کی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"دماغ خراب ہے اس لڑکی کا۔"

"سیم اپنے لحاظ سے بالکل ٹھیک بات کہہ رہی تھی نینی! اگرچہ یہ محبت بالکل بے کار ہے، جس کے لیے یہ بحث ہو رہی ہے، وہ تو کب کا جا بھی چکا۔ پھر بھی سیم کی زندگی جس طرح برباد کی گئی ہے اس کے بعد وہ کیسے کسی پاکستانی مرد کو اچھا سمجھ سکتی ہے۔ وہ تو یہ چاہے گی کہ میں کسی پاکستانی کے پیچھے اس کی محبت میں یک طرفہ طور پر بھی مبتلا ہو کر، اداس ہو کر اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کروں۔" وہ اداس لہجے میں بولی تھی۔

"کیا برباد ہوئی ہے سیم کی زندگی لیزا؟ ماشاء اللہ پیسے میں کھیل رہی ہے۔ دولت، نوکر، چاکر، عیش و آرام، میاں عمر میں کچھ بڑا ہے تو کیا ہوا، اسے چاہتا تو ہے، اس کے ناز اٹھاتا ہے۔"

نینی یک دم ہی خفگی سے بولی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی ناپسندیدگی اور ناراضی جھلک رہی تھی جیسے لیزا کی بات سے اتفاق کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔

"کچھ بڑے نہیں، ہاشم اسد سیم سے پورے پندرہ سال بڑے ہیں نینی! ایک بیوی کو فارغ کر چکے ہیں، تین بچوں کے باپ ہیں۔ دولت سے خوشی نہیں ملتی نینی! سیم کی ان کے ساتھ کوئی مطابقت ہی نہیں ہے۔ کہاں سیم اور کہاں وہ شادی شدہ مرد۔ سیم لاکھ خود کو خوش ظاہر کرتی رہے، آپ چاہے یقین کر لیں اس کی جھوٹی ہنسی کا مگر میں اس کی بہن ہوں۔ میں جانتی ہوں اس نے پاپا کے لیے خود کو قربان کر دیا ہے، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ وہ ایک سمجھوتے کی زندگی گزار رہی ہے نینی!"

وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی تھی۔ نینی نے برا سا منہ بنا کر یوں خاموشی اختیار کی تھی جیسے اس کی کسی بھی بات سے اتفاق نہیں کرتیں۔

"خیر ہم اس موضوع پر بہت بار بات کر چکے ہیں چھوڑیں اس ٹاپک کو۔ یہ بتائیں مجھے کافی ملے گی؟"

اس معاملے میں اس کی اور نینی کی سوچ میں اتنا فرق تھا کہ ذرا سی دیر اور اس موضوع پر بات ہوتی اور ان دونوں ہی کا موڈ خراب ہو جاتا۔ وہ تسیم کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور نینی جو اس پر والہانہ چاہتیں نچھاور کیا کرتی تھیں، اس کے لیے بالکل ماں جیسی ممتا لٹایا کرتی تھیں، سیم کے لیے پتا نہیں کیوں ان کا دل اتنا ہی سخت ہو جایا کرتا تھا۔

بچپن میں جس طرح اس نے نینی کو پہلی ہی نظر میں اپنی آیا سے بڑھ کر اپنی ماں مان لیا تھا۔

سیم ایسا نہیں کر سکی تھی۔ اس نے بچپن میں نینی کو بہت تنگ کیا تھا۔ شاید لیزا بہت دبو سی بچی تھی، اس لیے نینی کی حفاظت میں آجانے پر خوش ہوئی تھی جبکہ سیم اس کے برخلاف شرارتی اور نٹ کھٹ تھی سو وہ نینی کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتی۔ وہ فرماں برداری سے نینی کے احکامات مان لیا کرتی تھی جبکہ سیم ان کے گھر کی Rebellious Princess (سرکش) تھی، نینی کے احکامات کو تو کیا خاطر میں لاتی — سیم الٹا ایسی حرکتیں کر جاتی کہ نینی کو اکثر و بیشتر خاصی سختی سے ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

سیم نے بچپن میں نینی کو بہت تنگ کیا تھا، انہیں محمود خالد سے بہت بار ڈانٹیں پڑوائی تھیں۔ ان بہنوں کا وہ بچپن کب کا گزر چکا تھا مگر نینی نے جیسے سیم کو اس کی شرارتوں اور حکم عدولیوں کے لیے کبھی معاف نہ کیا تھا۔ اسے نینی کے سیم سے اختلاف کی وجوہ چونکہ پتا تھیں اس لیے اس وقت بھی اس نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟" انہیں اس کے کھانے کی فکر ہوئی تھی۔

"جی نینی! سینڈرا کے ساتھ ہی کھا لیا۔ اب بس

آپ کافی پلا دیں۔" نینی سرہلاتی اس کے پاس اٹھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز صبح صبح ہی سیم کا فون آیا تھا۔ وہ جانتی تھی سیم اس کے لیے پریشان ہے' وہ اس کے لیے بہت فکر مند ہے۔

"کل سے تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہوں لز! تمہاری روتی ہوئی آواز نے مجھے رات میں ایک پل کے لیے بھی سونے نہیں دیا۔" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں سیم۔" وہ بیڈ پر لیٹی تھی' سیم کے فون سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"اگر ٹھیک ہو تو پھر مجھے میری بہن کی آواز ہمیشہ کی طرح ہنستی اور مسکراتی ہوئی کیوں نہیں لگ رہی ہے؟؟"

وہ جواباً" چپ رہی تھی۔

"لز! پلیز خود کو سنبھالو۔ جو جا چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ زندگی ختم نہیں ہوئی۔ دیکھنا تمہاری زندگی میں اتنی ساری خوشیاں اور اتنی ڈھیر ساری محبتیں آئیں گی کہ تم انہیں سمیٹتے سمیٹتے تھک جاؤ گی۔"

"میں خود کو سمجھا رہی ہوں سیم۔ مجھے تھوڑے دن لگیں گے مگر میں خود کو سمجھا لوں گی کہ وہ چند دنوں کے لیے مجھے ملا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ میں شاید زندگی میں اب کبھی دوبارہ اس سے مل بھی نہیں پاؤں گی۔ شاید وہ مجھے خواب میں ملا تھا۔ آنکھ کھلی ہے تو وہ کہیں نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی آگئی' وہ آہستہ آواز میں بہت دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"ہاں' تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا لز! اور تمہیں اپنے شو کی اسی طرح تیاری کرنی ہو گی' جس طرح پہلے کر رہی تھیں۔ تمہیں پتا ہے ناں لز! میں تمہارے آرٹسٹ ہونے پر کتنا فخر کرتی ہوں۔ میری بہن ایک کامیاب اور مشہور مصورہ ہے' میں ہر ایک کو فخریہ بتاتی ہوں۔ تم میری خاطر اپنی پینٹنگز کمپلیٹ کرو۔ میں چاہتی ہوں' تمہارا شو بہت کامیاب رہے۔ آرٹس کے نقاد تمہارے کام کو خوب سراہیں' آرٹس کے قدر دان تمہاری پینٹنگز خریدنے کے لیے بے قرار ہو جائیں' آرٹ گیلریز تمہارا کام اپنے پاس لگانے کے لیے تمہاری منتیں کریں' تمہیں تمہارا منہ مانگا معاوضہ دیں۔ میں تمہیں بہت کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں لز!"

بہن کی والہانہ محبت اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آئی تھی۔ اس نے سیم سے وعدہ کیا تھا وہ پھر سے اپنے شو کی تیاری شروع کرے گی۔ وہ کامیاب ہو گی' وہ سیم کو مایوس نہیں کرے گی۔ اس کے آرٹسٹ ہونے پر سیم نے ہمیشہ فخر کیا کہ وہ سیم ہی تھی جس کے ہمت دلانے اور حوصلہ بندھانے کے سبب وہ فائن آرٹس پڑھ پائی تھی' مصوری کو بطور پروفیشن اختیار کر پائی تھی ورنہ محمود خالد تو اسے اس کی خواہشات کے برخلاف بزنس ایڈمنسٹریشن کی طرف دھکیلنا چاہتے تھے۔
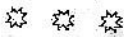
ناشتے کے فوراً" بعد وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

چیخ چیخ کر روتی ام مریم اور اسے اپنی گرفت میں جکڑے سکندر دونوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے قدم زمین میں یوں گڑ گئے تھے' جیسے وہ اب انہیں زندگی بھر کبھی اٹھا نہیں پائے گا۔

سکندر فوراً" ام مریم کے اوپر سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کے تمام بٹن آگے سے کھلے تھے۔ اس کی ناک اور ہونٹوں کے پاس سے خون بہہ رہا تھا' اس کے چہرے اور گردن پر ام مریم کے ناخنوں کے نشان تھے' جو اس نے خود کو بچاتے ہوئے مزاحمت کے دوران سکندر پر ڈالے تھے۔

ان کے خوبصورت لونگ روم میں رکھے کئی خوبصورت گلدان اور دیگر آرائشی اشیا یہاں وہاں ٹوٹی پڑی تھیں جیسے بھاگ کر خود کو سکندر کے شکنجے سے

بچاتی مریم ان چیزوں سے ٹکرائی تھی۔ روتی ہوئی' بالکل تباہ حال مریم نڈھال سی لڑکھڑائی ہوئی قالین پر سے اٹھی تھی۔ اس کے چہرے' بازوؤں اور گردن پر سکندر کی دست درازی اور اس کی ہوس کے نشان رقم تھے۔ جاتے وقت ام مریم کو جینز کے اوپر جس خوبصورت Top میں وہ دیکھ کر گیا تھا' اس کا وہ Top جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا' وہ نیم برہنہ حالت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کا شرم اور غیرت سے زمین میں گڑ جانے کو دل چاہا۔

ام مریم دوڑ کر آکر اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ وہ اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"مجھے اس درندے سے بچالو زین! یہ میری عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس سے بچالو۔ مجھے چھپالو زین! اس درندے سے۔"

"یو بچ۔" ہونٹوں سے خون صاف کرتے ہوئے سکندر نے ام مریم کو گالی دی تھی۔ وہ فوراً" ہی اس کے پاس آیا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا زین! یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ایک بدکردار لڑکی ہے زین۔"

سکندر کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کے پاؤں جنہیں وہ ہلا نہیں پا رہا تھا' ان میں ایک دم ہی جان آگئی تھی۔ اس نے اپنے گلے لگی ام مریم کو خود سے دور ہٹایا تھا اور قتل کردینے کے ارادے سے سکندر کی طرف بڑھا۔

روتی ہوئی ام مریم کے پاس اموجان آگئی تھیں۔ وہ جیسے شرم و غیرت سے گڑتی مریم کو مزید اس نیم برہنہ حالت میں دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی شال اتار کر مریم کے اوپر ڈال دی تھی۔ مریم یک دم ہی ان کے گلے لگ گئی تھی۔

"آنٹی۔" وہ اموجان کی شال میں لپٹی ان کے گلے لگ کر زارو قطار رو رہی تھی۔ شہریار خان اپنی جگہ بالکل تن کھڑے تھے۔ اس نے سکندر کے منہ پر کھینچ کر ایک تھپڑ مارا تھا۔

"زین! یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے' بکواس کر رہی ہے۔ یہ مکار لڑکی ڈرامہ کر رہی ہے۔" اتنی جرأت تھی ابھی بھی سکندر شہریار میں کہ اس کے سامنے کھڑا ہوسکے؟ اس کے کانوں میں مریم کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اسے وہ شال میں اپنی برہنگی چھپاتی نظر آرہی تھی۔ اگر اس وقت اس کے پاس ریوالور ہوتا وہ اس کی تمام گولیاں سکندر کے سینے میں اتار دیتا۔

اس نے دوسرا' تیسرا اور پھر چوتھا تھپڑ مارا تھا سکندر کے منہ پر۔ اس پر خون سوار تھا' وہ سکندر پر پل پڑا تھا۔ وہ اسے لاتیں' گھونسے' مکے مار رہا تھا۔

"بے غیرت انسان! ام مریم پر گندی نظر ڈالنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" سکندر خود کو اس سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ خود اس کے اوپر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایسی گھناؤنی حرکت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد وہ اس پر ہاتھ اٹھا بھی کیسے سکتا تھا؟ اموجان شرم' غیرت اور صدمے سے چور ام مریم کو سینے سے لگائے کھڑی تھیں جبکہ شہریار خان اپنے ولی عہد' اپنے شہزادے کا اصلی اور گھناؤنا روپ دیکھ کر بالکل گم صم اور ساکت کھڑے تھے۔

وہ سکندر کو بری طرح مار رہا تھا' وہ اس بے غیرت انسان کو لہولہان کرچکا تھا مگر اسے لہولہان کرنے کے بعد بھی اس کا جنون تھم نہیں رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سکندر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

"پاپا! زین کو سمجھائیں۔ اس سے کہیں میرا یقین کرے۔ یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے' مکاری کر رہی ہے۔ یہ بہت مکار' بہت خطرناک لڑکی ہے پاپا۔" وہ ذلیل شخص خود کو بچانے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سکندر کے منہ پر تھوک دے۔

"زین! بس کرو۔" شہریار خان جیسے یک دم ہی سکتے کی کیفیت سے باہر نکلے تھے۔ وہ ان کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا۔

"پاپا! میں آج یا تو اس کی جان لے لوں گا یا پھر جان دے دوں گا۔ میں اس ذلیل' بے غیرت کو زندہ

چھوڑوں گا۔"

وہ غصے اور جنون میں سکندر کو مارتا پاگل سا ہو رہا تھا۔

"پاپا! آپ زین کو سمجھائیں۔ یہ مجھے بالکل غلط سمجھ رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے پاپا۔ یہ سب اس ناگن کا مجھ سے انتقام ہے۔" سکندر نے پھر شہریار خان کو پکارا تھا۔ اس نے پھر ام مریم پر الزام تراشی کی کوشش کی تھی۔ شہریار خان ان دونوں کے قریب آ گئے تھے۔ وہ اسے اور سکندر کو چھڑا رہے تھے۔ چند منٹوں کی کوششوں کے بعد وہ اسے سکندر کے پاس سے ہٹا لینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ پھولی سانسوں اور نفرت بھری نگاہوں سے بری طرح زخمی ہوئے سکندر کو اب دور ہٹ کر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان اب شہریار خان کھڑے تھے۔

"پاپا زین کو سمجھائیں یہ لڑکی۔۔۔"

سکندر پھر ام مریم کے اوپر کوئی بہتان تراشی کرنا چاہتا تھا مگر شہریار خان کے زوردار تھپڑ نے اسے آگے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"پاپا؟" سکندر منہ پر ہاتھ رکھے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ شہریار خان سکندر کو شدید غصے میں دیکھ رہے تھے۔

"شرم آ رہی ہے مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔ یہ لڑکی تمہاری ہونے والی بھاوج ہے، تمہارے بھائی کی منگیتر ہے۔ کیا اسی لیے آج صبح اس رشتے کے خلاف بول رہے تھے کہ تم خود اپنے بھائی کی منگیتر پر غلیظ نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔" شہریار خان سکندر پر بہت زور سے دھاڑے تھے۔

"بے غیرت اور بدکردار میں نہیں یہ لڑکی ہے پاپا۔ مجھے کہتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ اس نے خود۔۔۔ اس نے خود۔۔۔ میرے پیچھے پڑی ہے۔

She tried to seduce me.

She is an adulteress Papa!"

ام مریم کے لیے سکندر کے ان گھٹیا ترین الفاظ پر اس کا دل چاہا وہ اس کو یہیں کھڑے کھڑے جان سے مار ڈالے۔ اس کی ہوس کا نشانہ بنی اپنی بے لباسی چھپاتی ام مریم امو جان کے گلے لگے لگے زار و قطار رو پڑی تھی۔ عزت بھی اسی کی خراب کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور بہتان بھی اسی پر باندھا جا رہا تھا۔

"آنٹی! میں آپ کے گھر پر جس دن سے سکندر سے ملی ہوں یہ مجھ سے کہہ رہا ہے میں زین سے منگنی توڑ دوں۔ میرے انکار پر اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ یہ مجھے زین کے تو کیا کسی کے بھی قابل نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہا کرتا تھا اس کا سگا بھائی اس کی منگیتر سے؟ اس کا دل چاہا تھا وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لے۔ اب زندگی میں کبھی رشتوں پر اعتبار کس طرح کر سکے گا وہ؟

"You bloody bitch میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پاپا! میں جان سے مار دوں گا اس ناگن کو۔" اپنی مکروہ اور گھناؤنی شکل سب پر عیاں ہوتی دیکھ کر بوکھلاتا سکندر غصے میں آپے سے باہر ہو کر فوراً ہی ام مریم کی طرف لپکا تھا۔ مگر شہریار خان نے اس کے سامنے آ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اور کتنا نیچے گرو گے سکندر؟" وہ اسے غیظ و غضب سے دیکھ رہے تھے۔

"پاپا! آپ اس مکار لڑکی کو سچا اور مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں؟ میں۔۔۔" کس قدر ڈھٹائی تھی اس بے غیرت انسان میں، اس کا گناہ سب لوگ دیکھ چکے ہیں یہ جاننے کے باوجود وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتے جا رہا تھا۔ مگر شہریار خان نے اسے آگے کچھ اور بولنے نہیں دیا تھا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہے ہو؟ ذرا حالت دیکھو اپنی بھی اور اس کی بھی۔ میرا سر ندامت سے جھکا دیا ہے سکندر! تم نے۔ میرا بیٹا اتنا عیاش اور بدکردار کیسے ہو سکتا ہے؟ اسے رشتوں کی عزت کا بھی پاس نہیں؟ یہ میرا وہ بیٹا ہے جس سے میں نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں؟ یہ میرا وہ بیٹا ہے جسے میرا جانشین بننا تھا، میرے بعد میری جگہ سنبھالنی تھی۔ یہ رشتوں کی دھجیاں اڑانے

والا؟"

"پاپا! آپ بھی زین کی طرح مجھ ہی کو قصوروار سمجھ رہے ہیں؟ پاپا آپ۔۔" خود کو مظلوم اور بے قصور ثابت کرنے کی مکاری کرتا وہ بدکردار شخص نجانے اور کیا کہنا چاہتا تھا مگر شہریار خان نے اسے اس کی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"مت کہو مجھے پاپا! تم آج سے یہ حق ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہو۔ اپنے نفس کا غلام اپنے ہی گھر کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے والا میرا بیٹا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

شہریار خان کی چیخ نے ان کے گھر کے درودیوار کو ہلا دیا تھا۔

"پاپا! آپ مجھ سے سچائی سنے بغیر مجھے کیسے مجرم قرار دے سکتے ہیں۔ میری بات تو آپ کو سننی چاہیے پاپا۔"

جھوٹ پر جھوٹ بولتا سکندر رہا نہیں شہریار خان سے کیا کیا کہہ رہا تھا اور شہریار خان جواب میں اسے کیا کہہ رہے تھے' اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اگر کچھ سنائی دے رہا تھا تو ام مریم کی سسکیاں' اگر کچھ دکھائی دے رہا تھا تو سیاہ شال میں اپنی برہنگی چھپاتی ام مریم جو امو جان کے گلے سے لگی ہوئی خوف سے ابھی تک کانپ رہی تھی۔ ام مریم کا سیاہ شال میں چھپا وجود دیکھ کر اس پر پھر خون سوار ہونے لگا تھا کہ یک دم ہی شہریار خان کے بہت زور سے چیخنے سے وہ چونک کر انہیں دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ سکندر کی کسی بات کے جواب میں بہت زور سے دھاڑ رہے تھے۔

"بس سکندر! بس۔ ایک Rapist میرا بیٹا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دیتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے گھر' اپنی دولت' اپنی جائیداد اور اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے پر بھی تمہیں میرے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد زندگی بھر مجھے اپنی منحوس شکل کبھی مت دکھانا۔" شہریار خان کا انداز بہت بے لچک اور فیصلہ کن تھا۔

"امو جان! آپ سمجھائیں پاپا کو۔ دیکھیں پاپا مجھے کیا کہہ رہے ہیں۔"

اس نے مظلومیت کے ڈرامے کرتے سکندر کو امو جان کو رو کر پکارتے سنا۔ وہ اب رو کر خود کو مظلوم اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ام مریم کو گلے لگائے امو جان خود بھی مسلسل رو رہی تھیں۔ شہریار خان سکندر کی طرف شدید غصے کے عالم میں بڑھے تھے۔ ان کی حاکمیت' ان کا اپنے فیصلے منوانا ان سب نے بہت دیکھا تھا مگر ان کا یہ جنون اور یہ غصہ وہ سب پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خون اور چہرے پر بہت سختی تھی۔

"سنا نہیں تم نے؟ میں تم سے یہاں سے دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہوں۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر سکندر کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ اسے لونگ روم سے باہر لے جا رہے تھے۔ بہت دیر سے چپ کھڑی امو جان نے یک دم ہی روتے ہوئے شہریار خان کو پکارا تھا۔

"شہریار! پلیز اس طرح مت کریں۔ وہ کہاں جائے گا۔"

شہریار خان نے غیظ و غضب سے انہیں دیکھا۔ ان کے غصے میں ایک جنونی سی کیفیت نمایاں تھی۔

"تم بیچ میں مت بولنا آمنہ۔ اگر تمہیں اس Adulterer سے زیادہ ہمدردی ہو رہی ہے تو میں تمہیں ابھی طلاق کے تین بول بول کر فارغ کرتا ہوں۔ تم بھی اس کے ساتھ ہی میرا گھر چھوڑ کر جا سکتی ہو۔ ایک زانی میرا بیٹا نہیں ہو سکتا اور اس کی حمایت کرنے والے سے بھی مجھے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ یہ گناہ تو میں اپنے باپ کا بھی معاف نہ کروں۔"

شہریار خان کا ایسا غصہ' ایسا جنون ان سب میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا غصہ دیکھ کر وہ بھی ساکت سا کھڑا تھا' ان کی دھاڑتی آواز سن کر امو جان کی اب مجال نہ تھی کہ کچھ بول پاتیں۔ وہ سکندر کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے لونگ روم سے باہر جا رہے تھے۔ وہ خاموش تماشائی کی طرح اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

امو جان نے کرب اور صدمے سے نڈھال

اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ زارو قطار رو رہی تھیں۔

ام مریم اسی طرح ان کے گلے سے لگی سسک رہی تھی۔ شہریار خان سکندر کو کھینچتے ہوئے لونگ روم سے باہر لے گئے تھے۔ وہ وہاں پر اسی طرح بت کی مانند ساکت کھڑا تھا۔ محض چند گھنٹوں کے اندر اس کی خوشیوں کا جہاں اجڑ چکا تھا۔ اس کا ہر خواب بکھر چکا تھا۔

وہ ام مریم سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا اپنا سگا بھائی اس کی عزت اور ناموس کی دھجیاں بکھیر گیا تھا۔ اسے باہر سے شہریار خان کے چلانے' سکندر کو گھر سے نکالنے اور سکندر کی منتوں اور اس کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے ایک نظر سسکتی ہوئی ام مریم اور آنکھیں بند کرکے پھوٹ پھوٹ کر روتی امو جان پر ڈالی تھیں۔ اس کے اندر ان دونوں میں سے کسی کو بھی چپ کرانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ نڈھال سے قدموں سے چلتا لونگ روم سے جانے لگا تھا۔ اسے اپنے گھر کا گیٹ بہت زور سے کھولے جانے اور پھر بند کیے جانے کی آوازیں آئی تھیں۔ ان کے گھر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس لیے ہر آواز اور ہر آہٹ واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

وحشت کے عالم میں وہ کمرے کی دیواروں سے سر مار مار کر رو رہا تھا' وہ زین شہریار زارو قطار رو رہا تھا۔ وہ اب ام مریم کا سامنا کیسے کرپائے گا؟ وہ اس سے کیا کہے گا' کیسے کہے گا؟ کیا وہ اس سے یہ کہہ پائے گا کہ جو کچھ بھی ہوا' اسے بھول جاؤ؟ اس کی زندگی کا پہلا خواب' پہلی امید اور پہلی محبت اس کے اپنے سگے بھائی نے کس طرح برباد کی تھی۔ کس طرح اس نے اس سے اس کی خوشیاں چھینی تھیں۔

اس پوری رات ان کے گھر پر موت کا سناٹا طاری رہا تھا۔ امو جان اپنے کمرے میں بند روتی رہی تھیں' شہریار خان نے خود کو اپنی اسٹڈی میں بند کرلیا تھا اور ام مریم' وہ اپنے کمرے میں تھی۔ یوں لگ رہا تھا' وہ تمام افراد ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کترا رہے ہیں۔

وہ تمام افراد ایک دوسرے سے نگاہیں ملانے سے ڈر رہے ہیں۔ باہر نئے سال کا جشن منایا جارہا تھا اور ان کے گھر میں رشتوں اور اعتبار کی موت کا سوگ منایا جارہا تھا۔ جاتا ہوا سال اس سے اس کی زندگی کی پہلی خوشی' پہلی ہنسی اور اس کی زندگی چھین کرلے گیا تھا۔

صبح ہوچکی تھی مگر اس میں سکت نہ تھی اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی' ام مریم کا سامنا کرنے کی۔ اپنے نام کی انگوٹھی اسے پہنا کر اس نے زندگی بھر کے لیے اس کی حفاظت اور خوشیوں کی ذمہ داری قبول کی تھی' اور وہ اپنے ہی گھر پر اسے تحفظ فراہم نہ کرسکا تھا۔ اس کی عزت اور آبرو کی رکھوالی نہ کرسکا تھا۔

وہ شاید پورا دن یوں ہی کمرے میں بیٹھے گزار دیتا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ام مریم اندر آگئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر اس نے شرم اور ندامت سے فوراً" ہی نظریں جھکالی تھیں۔ وہ اس سے کیا کہے؟ کیسے کہے؟ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آگئی اور اس کے برابر میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی بالکل خاموش تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے فرش کو گھور رہے تھے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے احساس ہوا کہ ام مریم رو رہی ہے۔ اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مریم۔" درد اور کرب کی شدت نے اسے مزید کچھ بولنے نہیں دیا تھا۔

"سکندر نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا زین؟ میں تو بالکل شفاف تھی' بالکل ان چھوئی تھی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم ابھی بھی شفاف ہو' تم مریم ہو۔ تم پاکیزہ ہو' تم شفاف ہو۔" اس نے تڑپ کر کہا تھا۔ "اس بدکردار شخص نے جو میرا بھائی تھا' مجھے کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا۔ میں تم سے کیسے معافی مانگوں مریم؟"

بولتے ہوئے اس کی نگاہیں پھر جھک گئی تھیں۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پر لیزا کی کال آگئی۔

"میں نے سوچا، تمہیں بتادوں میں گھر سے نکل گئی ہوں۔ دس منٹ میں تمہارے ہوٹل ہوں گی۔" اس نے بتایا تھا۔

"ہوٹل سے ذرا سا آگے چلی آنا۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اس سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں۔

"جب تم روم میں ہو تو رومیوں کی طرح رہو۔"

کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے تم رومنز کی طرح بار میں بیٹھ کر ناشتا کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔

"ویری انٹرسٹنگ۔" لیزا نے خوش ہو کر کہا۔

"میں نے خود اپنے لیے ناشتا آرڈر کیا، وہ بھی اٹالین میں۔ کیا تمہیں یقین آرہا ہے؟"

خود کو شاباشی دینے کے بعد جیسے اسے اب لیزا سے بھی اس کارنامے پر تعریف وصول کرنا تھی۔

"مکمل جملے نہیں بول سکا۔ مگر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں، میں نے بارٹینڈر کو اپنی بات سمجھا ہی دی۔" وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

"یہ تو واقعی قابل تعریف بات ہے۔ میں آپ کی اس ذہانت پر آپ سے بری طرح امپریس ہو گئی ہوں۔ سینور سکندر۔" لیزا جیسے اس کی بات کا لطف لیتے ہوئے ہنسی تھی۔

"اوکے۔ تم اپنا ناشتا ختم کرو، اتنی دیر میں، میں پہنچ رہی ہوں۔"

بہت سکون سے بیٹھ کر اس نے کافی اور ڈونٹ کو انجوائے کیا۔ اس کے بعد وہ بار کے دروازے سے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے لیزا کی گاڑی آتی دکھائی دی تو اس نے دور سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔ لیزا نے گاڑی اس کے پاس لا کر روکی تھی۔

اس نے براؤن سفاری پینٹ کے ساتھ گرین کلر کا ڈھیلا ڈھالا ٹاپ پہن رکھا تھا۔ بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسٹائلش لگ رہی تھی، رومن لگ رہی تھی، آج اس نے بھی اپنے حلیے پر ذرا زیادہ دھیان دیا تھا کہ آج لیزا نے اسے پینٹ کرنا تھا، ورنہ آج کون سا آفس جانا ہے، سوچ کر شاید اس نے شیو بھی نہیں کرنا تھا۔ لیزا اسے بغیر بیساکھی کے دیکھ کر کچھ حیرت اور کچھ غصے سے چلائی تھی۔

"تمہاری ــــــ بیساکھی کہاں ہے؟" وہ غصے اور فکر مندی سے گاڑی سے اتر آئی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"لیزا! میری چوٹ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے، پھر بے کار میں اسے لے کر چلنے کا کیا فائدہ تھا؟ اس سے مجھے الجھن ہی ہو رہی تھی۔"

وہ اس کے غصے اور خفگی سے ڈر کر قدرے مدافعانہ انداز میں بولا۔

"دکھاؤ ذرا مجھے اپنی چوٹ۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے، تمہاری چوٹ کتنی ٹھیک ہو گئی ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر پکی لڑاکا عورتوں والے انداز میں بولی۔

"اگر اس طرح سے لڑوگی، چیخو، چلاؤ گی تو میں پینٹنگ نہیں بنوا رہا۔" اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی دیکھ کر اس نے جھٹ دھمکی دی تھی۔

"ہوٹل چل کر لے لو سکندر پلیز۔ تمہیں چلنے پھرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔"

وہ اس بار نرمی سے اور دوستانہ انداز میں بولی تھی۔

"میں نہیں لے رہا۔ تم نے چلنا ہے تو ایسے ہی چلو۔ بہت نخرے اٹھالیے میں نے اپنی چوٹوں کے۔"

وہ لاپروائی سے بولتا گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لیزا باہر کھڑی اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔

"اب چلو بھی مصورہ! مجھے گھورنے کا شوق تو راستے میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔"

اسے خود احساس ہوا تھا کہ اس کے بولنے کا لاپروا

انداز اس کی ٹون اس کے الفاظ بہت حد تک لیزا جیسے تھے اتنے دنوں سے ہر روز اس کے ساتھ ملنے اور وقت گزارنے کے بعد وہ شاید کچھ کچھ اس کے جیسا ہوتا جارہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا ہارمانتی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔

"بہت ضدی ہو تم جو سوچ لیتے ہو کرتے وہی ہو' چاہے تمہیں جتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کرلی جائے" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ خفگی سے بولی۔

"پوری امید ہے مجھے تم ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گئے ہوگے اور میڈیسن لینا بھی چھوڑ دی ہوگی۔"

"یار یہ ایکسیڈنٹ ایکسیڈنٹ بہت ہوگیا ہے اب۔ میں بور ہوگیا ہوں اسی ایک ٹاپک سے۔ پلیز کوئی اور بات کرو۔"

لیزا نے اسے گھورا۔ وہ جواباً" چپ ہوگئی تھی۔ وہ اب خاموشی سے ڈرائیو کررہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے میں نے کتنی اٹالین سیکھ لی ہے؟"

اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اسے بولنے اور ہنسنے پر اکسا رہا تھا۔ لیزا نے صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔

"اب میں نے سوچنا بھی اٹالین میں شروع کردیا ہے۔ ابھی پارک کے پاس جب تم گاڑی لاکر روک رہی تھیں تب تمہیں دیکھتے کے ساتھ میں نے پتا ہے اٹالین میں کیا لفظ سوچا تھا؟"

لیزا نے زبان سے کہا "کیا سوچا تھا؟" اب بھی نہیں پوچھا تھا' صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"bella" وہ کوشش کرکے اٹالین لہجے میں بولا تھا۔ bella اٹالین میں خوب صورت اور حسین کو کہتے ہیں' اتنا تو وہ سیکھ ہی چکا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"بہت تیز ہو تم مسٹر سکندر! تمہیں پتا ہے لڑکیوں کو کس طرح خوش کیا جاسکتا ہے۔"

وہ جواباً" مسکرا دیا تھا۔

"خیر خوب صورت تو میں ہوں' یہ مجھے پتا ہے۔" فوراً" ہی مغرورانہ سے انداز میں بولی تھی۔

شکر تھا اس کی کوشش کامیاب رہی تھی' اب موضوع گفتگو اس کی چوٹیں' دوائیں اور بیساکھی نہیں رہی تھیں۔

"ہم Tivoli کیوں جارہے ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اس نے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی لیزا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوگیا ہے مسٹر سکندر! تمہاری پینٹنگ بنانے اور کس لیے؟" وہ جیسے اس کے سوال پر حیران ہوئی تھی۔

"وہ تو مجھے پتا ہے' میرا مطلب ہے Tivoli ہی کیوں جارہے ہیں' کہیں اور کیوں نہیں؟"

"سوال اچھا ہے۔" وہ اس کے سوال پر مسکرا کر بولی۔ ایک پل رک کر جیسے اس نے اپنی سوچوں کو یکجا کیا۔

"میرا دل چاہ رہا تھا میں Villa d este کے کسی خوب صورت سے فوارے کے سامنے تمہیں بٹھا کر وہاں تمہاری پینٹنگ بناؤں۔ میری پینٹنگ کا مرکز تم ہو اور تمہارے بیک گراؤنڈ میں سولہویں صدی کا کوئی بے مثال آرکیٹکچر رکھتا فوارہ اور اس سے گرتا پانی ہو۔ پانی میں جیسی گہرائی' جیسی طاقت اور جیسا اسرار ہوتا ہے مجھے وہی گہرائی' وہی طاقت اور وہی پراسراریت تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مجھے سوچنے ہی سے یہ منظر بہت انسپائر کرتا ہے' فیسی نیٹ کرتا ہے۔"

وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سچائی سے بول رہی تھی۔

"مجھے تمہاری آنکھوں میں اتنے سارے تاثر نظر آتے ہیں' اداسی' درد' کرب' طاقت' گہرائی' پراسراریت جیسے یہ آنکھیں اپنے اندر نہ جانے

راز چھپائے بیٹھی ہیں، میں پانی کو تمہاری آنکھوں کے ساتھ ایک سمبل کے طور پر دکھانا چاہتی ہوں۔ دونوں میں گہرائی، دونوں میں اسرار۔"

"اس طرح بولتے ہوئے تم پکی پکی مصورہ لگ رہی ہو۔ تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے میں مرعوب ہو رہا ہوں سینیورینا۔"

لیزا کی سنجیدگی کے جواب میں وہ ہنسا۔ لیزا نے اسے ان نظروں سے دیکھا تھا جیسے اس سے براہ راست کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر اس نے سکندر کی آنکھوں کا وہ تنبیہی تاثر فوراً "پڑھ لیا تھا کہ وہ اس سے اس کی ذات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھے۔ وہ چپ ہوگئی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے تھے۔

"تمہاری ننی کیسی ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اس نے گفتگو کے لیے موضوع تلاش کیا تھا۔

"ٹھیک ہیں، تمہیں دعا، پیار کہلوایا ہے انہوں نے اور یہ بھی کہا ہے کہ تم ہوٹل واپس جانے کے بعد سے ہمارے گھر آئے کیوں نہیں ہو اور ہمارا آج جانے کا مقصد گو کہ تمہاری پینٹنگ بنانا ہے، مگر ننی نے ہمیں اس میں پکنک کا مزا فراہم کرنے کے لیے بڑی زبردست پکنک باسکٹ تیار کرکے دی ہے۔ Tivoli میں جب لنچ کریں گے، تب تم دیکھنا ننی نے کتنی مزے مزے کی چیزیں ہمارے کھانے کے لیے تیار کرکے بھیجی ہیں۔"

اس نے سکندر کے کسی رویے کی وجہ سے کچھ محسوس کیا ہے، یہ تاثر دیے بغیر وہ مسکرا کر بولی۔ باتیں کرتے ہلکی آواز میں میوزک سنتے، لیزا کی فاسٹ ڈرائیونگ کے سبب وہ روم سے باہر اس خوب صورت اور پرفضا ہل ٹاؤن جلد پہنچ گئے تھے۔

پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب ٹائیولی کا موسم وہاں کی آب و ہوا روم سے زیادہ خوش گوار اور پرفضا تھی۔ یوں ہی تو نہیں ٹائیولی سولہویں صدی سے رومنوں کی پسندیدہ ریزورٹ رہی۔ رومن بادشاہوں کے محلات کے ساتھ بنائے گئے یہ گارڈنز پورے اٹلی میں سب سے خوب صورت اور سب سے منفرد گارڈن مانے جاتے تھے۔ ہنرمندی، کاری گری، مہارت، خوب صورتی اور حسن کا شاہکار آرکیٹیکٹس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت یہ باغات اور پانچ سو فوارے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا کرتے تھے۔ ان فواروں کی تخلیق میں سولہویں صدی کے آرکیٹیکٹس، سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں کی بے مثال مہارت اور ہنرمندی چھلکتی تھی۔ روم میں سیاحوں کے شور، ہنگامے، گہما گہمی اور رش سے دور یہ ایک خاموش اور پرفضا ہل ٹاؤن تھا۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر رہے تھے۔ لیزا گاڑی کی پچھلی سیٹ سے سامان نکالنے لگی۔ اس نے پکنک باسکٹ نکال کر اسے پکڑائی تھی۔ اب وہ اپنا کینوس، ایزل اور رنگ وغیرہ نکال رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔
زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں
یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی
سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد
اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں
سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔
ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں۔
آمنہ شہریار، سکندر کو فون کرتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔
سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ پورٹریٹ
بناتے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا
ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کی
دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے
نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا نسیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتاتی
ہے۔

چھٹی قسط

"تمہارا کوئی قصور نہیں ہے زین! تم مجھ سے معافی مت مانگو۔" مریم کی رندھی آواز اس نے سر جھکائے ہوئے ہی سنی۔ چند سیکنڈز کے لیے ان کے درمیان پھر خاموشی حائل ہوئی تھی۔

"میں آج واپس جا رہی ہوں زین!" مریم کے اس جملے نے اسے بے اختیار نظریں اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ مریم کے چہرے پر بکھرے آنسو دیکھ کر اس کا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ یہ آنسو اس لڑکی کو زین شہریار کے گھر پر، زین شہریار کے بھائی ہی نے دیے تھے، وہ کس منہ سے ان آنسوؤں کو صاف کر پاتا؟

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں مریم!" ایک پل اس کے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا۔

"نہیں زین! میں تمہارے ساتھ نہیں جا پاؤں گی۔" ام مریم کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

"کیوں مریم؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔ مریم نے دکھ بھری نظریں اس پر سے ہٹائی تھیں۔ وہ اپنی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتار رہی تھی۔

"تم میری پہلی اور آخری محبت ہو زین! میں ساری زندگی تم سے محبت کرتی رہوں گی مگر کل شام جو ہوا اس کے بعد اب میں خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتی کہ اس رشتے کو برقرار رکھ سکوں، اس گھرانے کی بہو بن سکوں۔ مجھے معاف کر دینا زین! مگر میں تمہارے ساتھ اپنے رشتے کو قائم نہیں رکھ سکوں گی۔" ام مریم دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے انگوٹھی بیڈ پر ان دونوں کے درمیان خالی جگہ پر رکھ دی تھی۔ وہ صدمے سے چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی وہ غلط نہیں کر رہی تھی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد کوئی عزت دار لڑکی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس فیملی کا حصہ بنے جہاں کوئی اس پر بری نظر رکھتا ہو۔

"مریم! مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے گھر میں تمہیں تحفظ نہ دے سکا، پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ بھرائی آواز میں بولا۔

"تم خود کو کوئی الزام مت دو زین!

...الی نہیں ہے۔ تم بہت اچھے ہو زین! میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"جب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے تو پھر مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو مریم؟ میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔ کیا اب کیمپس میں بھی اجنبیوں کی طرح ملا کرو گی؟"

دکھ اور صدمے سے اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔ ام مریم نے دکھ سے بھری ایک گہری سانس لی تھی۔ وہ اپنے گالوں پر بکھرے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"میں لاس اینجلس نہیں جا رہی۔ میں اپنے پاپا کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ میں ٹوٹ گئی ہوں زین! ابھی بہت عرصہ لگے گا مجھے خود کو سنبھالنے میں۔ میرے خواب بکھر گئے ہیں۔ پتا نہیں میں اپنی اسٹڈیز پھر سے کبھی شروع کر بھی پاؤں گی کہ نہیں۔"

وہ لاس اینجلس نہیں جا رہی تھی، وہ تو ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کی بات کر رہی تھی۔ خدایا وہ اسے کیسے روکے؟ کیا کہے؟

ام مریم اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ "آئی لو یو زین!" سرگوشی کی طرح اس کی یہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"مت جاؤ مریم! پلیز مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔"

وہ یک دم ہی اٹھا تھا اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ خود پر سے اختیار کھوتی ام مریم اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔

"زین! ہماری قسمت میں جدائی لکھی ہے۔ میں یہ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ تم میری خاطر اپنے ماں باپ اور بھائی کو چھوڑ دو اور میری مجبوری یہ ہے زین کہ میں اب تمہاری فیملی کا حصہ نہیں بن پاؤں گی۔ میں اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی جہاں میری عزت۔" وہ لب بھینچ کر چپ ہوئی۔

"پلیز مجھے مت روکو۔ پلیز مجھے مجبور مت کرو۔ ورنہ میں اس طرح ٹوٹوں گی کہ پھر زندگی بھر خود کو جوڑ نہیں پاؤں گی۔" وہ بھرائی آواز میں جیسے شدید تکلیف سے بول رہی تھی۔ وہ بالکل بے دم سا ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈز اس کے گلے لگ کر روتے رہنے کے بعد ام مریم اس سے الگ ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آنسو خشک کیے تھے، وہ جیسے کوشش کر کے خود کو مضبوط بنا رہی تھی۔ پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مضبوط تھا، اٹل تھا، فیصلہ کن تھا۔

"اگر تم بھی مجھ سے اسی طرح سچی محبت کرتے ہو زین! جس طرح میں تم سے کرتی ہوں تو مجھے مت روکو مجھے جانے دو، یہ فیصلہ آسان فیصلہ نہیں ہے زین! پلیز اس جدائی کو میرے لیے مزید کٹھن مت بناؤ۔"

وہ کرب سے اپنے لب کچلتی اسے اور خود کو جدائی کی سزا سنا رہی تھی۔

وہ درد اور غم سے نڈھال دکھتا رہ گیا تھا اور بے آواز آنسو بہاتی ام مریم اس کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس کی زندگی سے چلی گئی تھی۔ اپنے کمرے کی بالکونی سے اس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سخت سردی میں بالکونی میں کھڑا تھا۔ اسے وہاں اسی طرح ساکت کھڑے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کی پتھرائی ہوئی نظریں اپنے گیٹ پر اسی جگہ جمی تھیں جہاں سے باہر نکلتے اس نے ام مریم کو آخری بار دیکھا تھا۔

کل شام کے بعد سے اس نے اپنے ماں اور باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ کل شام سے امو جان اپنے کمرے میں اور شہریار خان اپنی اسٹڈی میں بند تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ام مریم نے ان دونوں سے جا کر جب اپنے جانے کا کہا ہو گا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کیا کہا ہو گا یا وہ دونوں بھی اس کی طرح کچھ بھی کہہ نہیں پائے ہوں گے؟

شاید سہ پہر ہو چلی تھی جب اس نے اپنے ملازم کو بھاگ کر آتے گیٹ کھولتے ہوئے دیکھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہونے والے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

وہ سکندر تھا۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لینے

کے بعد وہ پھر یہاں موجود تھا؟ ایسے ملازم اور سکندر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ملازم اسے وہیں رکنے کا کہہ کر اندر بھاگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شہریار خان کو بلانے گیا ہے۔ شاید انہوں نے ملازمین کو کوئی ہدایت کر رکھی تھی کہ سکندر کو گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ مگر کیا جو شہریار خان نے کل کہا تھا وہ آج بھی اس پر کاربند رہیں گے؟ یا آج اپنے چہیتے بیٹے کو ان بکھرے حالوں میں دیکھ کر ان کی پدرانہ شفقت جوش مارے گی اور وہ سکندر کے تمام گناہ معاف کر کے اسے پھر گلے سے لگالیں گے؟ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اس بے غیرت انسان کی ہمت کیسے ہوئی تھی پھر سے یہاں آنے کی؟ اسی کی وجہ سے ام مریم اس کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ ام مریم کو یہ یقین نہیں دلا سکا تھا کہ جس گھر میں وہ اور مریم رہیں گے۔ وہاں سکندر شہریار کا وجود تو کیا اس کا نام و نشان تک نہ ہو گا۔ مگر اپنے باپ سے وہ یہ یقین مانگنا چاہتا تھا۔

وہ بغیر کسی ڈر اور ہچکچاہٹ کے نیچے جا رہا تھا۔ اگر اس کا باپ سکندر کو گھر میں داخل ہونے دیتا ہے تو باپ سے دو بدو بات کرنے "ان سے یہ کہنے کہ سکندر کے لیے ان کا غصہ بس ایک دن کے لیے تھا؟ اتنی آسانی سے انہوں نے اپنے ولی عہد کو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر واپس گھر میں داخلے کی اجازت دے دی؟ ساری زندگی انہوں نے اس میں اور سکندر میں فرق رکھا ہے اور آج بھی رکھ رہے ہیں۔ اگر انہوں نے سکندر کو گھر واپس آنے دیا تو وہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ شہریار خان فیصلہ کر لیں کہ ان کے لیے ان کا کون سا بیٹا زیادہ اہم ہے۔ وہ جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا وہ جو گناہ گار ہے۔

وہ لونگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس سے پہلے شہریار خان وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ سکندر کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ وہ پیچھے ہی رک گیا تھا۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیا کل میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی؟" اس نے اپنے باپ کو چلاتے سنا۔

"میں بے گناہ ہوں بابا! اس لڑکی کا مجھ پر لگایا الزام جھوٹا ہے۔ وہ ایک بدکردار لڑکی ہے۔ وہ میرے پیچھے پڑی تھی۔ میں نے اس کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس بات کا اس نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ زین ایک گھٹیا لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرتے جا رہا تھا بابا۔"

"اب تو وہ چلی بھی گئی ہے سکندر شہریار! اب تو جھوٹ بولنا" اس معصوم پر بہتان باندھنا چھوڑ دو۔ وہ اپنی صفائی دینے یہاں رکی تک نہیں۔ اب کیوں لگا رہے ہو اس کے خلاف یہ گھٹیا الزام تراشی؟ بھائی ایسے ہوتے ہیں؟ مجھے تو بھائی کے نام سے" اس رشتے ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔" اس کے اندر سسکتی محبت شدت سے رو پڑی تھی۔ وہ شدید ترین نفرت کے عالم میں سکندر کو جھوٹ پر جھوٹ اور بکواس پر بکواس کرتے سن رہا تھا۔

"کہہ چکے تم؟" شہریار خان نے سخت اور بے لچک لہجے میں اس سے پوچھا۔

ان کے چہرے کی سختی سے اسے یہ اطمینان ملا تھا کہ وہ اپنے کل کے فیصلے پر قائم ہیں۔

"میرا فیصلہ آج بھی وہی ہے جو کل شام تھا۔ بہت امیدیں وابستہ کی تھیں میں نے تم سے' بہت خواب دیکھے تھے تمہارے لیے۔ مگر اپنی ہونے والی بھابھی کی عزت پر ہاتھ ڈال کر تم میری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر چکے ہو سکندر! میرے دل اور میرے گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں عاق کر چکا ہوں۔ اب تمہارا جہاں دل چاہتا ہے جاؤ۔ جتنی دل چاہتا ہے عیاشیاں کرو۔ مگر اپنے پیسے سے' اپنے بل بوتے پر۔ میں نے ساری زندگی اصولوں کی بات کی ہے اور میرے اصول یہ کہتے ہیں کہ میں ایک [illegible]pist رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والے کو اپنے گھر میں نہ دوں۔ میرے اصول' میری خاندانی عزت [illegible] مجھے اس بات کی قطعاً" اجازت نہیں دیتی کہ [illegible] جیسے بدکردار اور عیاش کو اپنے گھر کی دہلیز بھی پار [illegible] دوں۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو' ذرا سی بھی [illegible] میں باقی بچی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی منحوس [illegible]

بھی مت دکھانا۔"

شہریار خان حلق کے بل پوری قوت سے گرج رہے تھے۔ سکندر کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا باپ وہ کہہ رہا تھا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے ڈائننگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ بغیر گرم شال اور بغیر سلیپرز کے امو جان اندر سے بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھیں۔ شاید شہریار خان کے چلانے کی آواز انہیں کمرے تک سنائی دے گئی تھی۔ تڑپ کر روتی وہ اسے نظرانداز کر کے شہریار خان اور سکندر کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہ پیچھے اسی طرح الگ تھلگ کھڑا تھا۔

"سنا نہیں تم نے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے' نکل جاؤ میرے گھر سے۔" شہریار خان سکندر کو وہیں کھڑا دیکھ کر غصے سے دھاڑے تھے۔

"شہریار پلیز' ایسا مت کریں۔ سکندر کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔ پلیز میرے بچے کو گھر سے مت نکالیں۔"

امو جان نے روتے ہوئے التجا کی تھی شہریار خان سے۔ ماں کے آنسوؤں سے اسے تکلیف پہنچی تھی مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف ماں کے منہ سے نکلے سکندر کی حمایت لیے جملوں سے پہنچی تھی۔ جو غلط تھا' گناہ گار تھا' اس کی ماں اس کی طرف داری کر رہی تھی؟ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

شہریار خان نے انہیں غیض و غضب سے گھورا تھا "کوئی ضرورت نہیں ہے ایک زانی کے لیے رونے اور اس کی طرف داری کرنے کی۔ خبردار جو میرے گھر میں اس Rapist کے لیے ایک آنسو بھی بہایا گیا یا اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی بولا گیا۔"

انگلی اٹھا کر وہ سکندر کی طرف نفرت اور حقارت سے اشارہ کر رہے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کی اصول پسندی اچھی لگی تھی۔

"ٹھیک ہے' اس سے غلطی ہو گئی ہے شہریار' مگر ابھی بچہ ہے۔ آپ اس سے بات چیت بند کر دیں' اس

گی کریں۔ اسے ماریں پیٹیں ہر آسائش اور ہر سہولت اس سے واپس لے لیں مگر پلیز اسے یوں گھر سے نہ نکالیں۔" اموجان نے روتے ہوئے سکندر کو اپنے ساتھ لگایا تھا' وہ شہریار خان سے التجا کر رہی تھیں۔

"آمنہ! میں تمہاری بکواس بہت برداشت کر رہا ہوں۔ ہٹو اس بے غیرت کے پاس سے۔ کوئی تمغہ جیت کر نہیں لایا ہے یہ ہمارے لیے جو اسے گلے لگائے کھڑی ہو۔" شہریار خان ان کے اوپر دھاڑے تھے۔

"شہریار! ایسا مت کریں۔ پلیز اسے اندر آنے دیں۔"

"اب تم مجھے بتاؤ گی کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ بیوی ہو' بیوی بن کر اپنی اوقات میں رہو۔" شہریار خان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ شدید ترین اشتعال میں تھے۔

"بیوی کے ساتھ ماں بھی تو ہوں۔ میرا بچہ پتا نہیں کل سارا دن کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے۔ ذرا حالت دیکھیں اس کی شہریار! اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا تک نہیں ہے۔ پتا نہیں اس نے کل سے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟ پتا نہیں میرا بچہ کل رات ٹھنڈ میں کہاں سویا ہوگا؟ ابھی یہ بہت چھوٹا ہے شہریار۔ بیس سال اور گیارہ ماہ کی عمر اتنی سخت سزا دی جانے والی عمر تو نہیں ہوتی ہے۔ پلیز اسے اندر آنے دیں۔ اس کی غلطی معاف کر دیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

اموجان نے زار و قطار روتے ہوئے شہریار خان کے سامنے حقیقتاً اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"یہ اس گھر میں میرے جیتے جی واپس نہیں آئے گا۔ جب میں مر جاؤں' تب تم اسے شوق سے واپس بلا لینا۔" شہریار خان سخت اور بے لچک انداز میں بولے تھے۔ وہ غصے سے اموجان اور سکندر کو دیکھ رہے تھے۔

"کیسے باپ ہیں آپ شہریار! کیسے باپ ہیں آپ؟ اتنی سنگ دلی؟ اتنی سختی؟ کوئی اپنی اولاد کو اتنی سخت سزا بھی دیا کرتا ہے وہ بھی اتنی کم عمری میں؟ کم... کی اس ایک غلطی کو ایک بھول' ایک نادانی... معاف بھی تو کیا جا سکتا ہے۔"

اموجان روتے ہوئے شہریار خان سے لڑ... ان کی آواز قدرے بلند ہوگئی تھی' وہ سخت ... برہم نظر آ رہی تھیں۔

"آپ کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے... کیوں دے رہے ہیں؟ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا... بہت معصوم ہے۔ اپنے باپ کے گناہوں کی... میرے بیٹے کو مت دیں شہریار۔ جو آپ کے باپ... کیا۔"

"زبان بند کرو ذلیل عورت!" شہریار خان غصے... بالکل بے قابو ہوتے اموجان کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے اموجان کو ان کی بات پوری نہیں کرنے دی تھی' انہوں نے کھینچ کر ایک تھپڑ اموجان کے منہ پر مارا تھا۔ ان کے دونوں بیٹے وہاں موجود ہیں' اس بات کی پروا کیے بغیر انہوں نے بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ بالکل پاگل اور جنونی سے لگ رہے تھے۔

وہ اموجان کو دوسرا تھپڑ مارنے آگے بڑھے تھے مگر ان کے اور اموجان کے بیچ سکندر آ گیا تھا' وہ تھپڑ جو شہریار خان اموجان کو مارنے والے تھے سکندر کے منہ پر جا کر لگا تھا۔ غصے میں بپھرے شہریار خان نے سکندر کو غیظ و غضب سے دیکھا تھا۔

"اموجان کو کچھ مت کہیں بابا! پلیز میری ماں پر ہاتھ مت اٹھائیں۔ میں جا رہا ہوں یہاں سے۔"

اس نے دیکھا کہ سکندر کی آنکھوں میں آنسو تھے' وہ بھرائے لہجے میں یہ بات کہہ کر ماں اور باپ کے درمیان سے ہٹ گیا تھا۔

وہ سر جھکائے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ اموجان شہریار خان کا تھپڑ کھانے کے بعد بالکل ساکت کھڑی تھیں۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سکندر کو گیٹ سے جاتا دیکھ رہی تھیں۔ شہریار خان اموجان اور سکندر کو مارنے کے بعد بھی اسی طرح بپھرے ہوئے تھے۔ ... نے اپنے گھر میں بچپن سے باپ کی سخت مزاجی ...

...ایت دیکھی تھی۔ ماں کو سر جھکائے ان کے احکامات
...تعمیل کرتے دیکھا تھا مگر باپ کو کبھی ماں پر ہاتھ
...ٹھاتے یا گالی دیتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ ہمیشہ ایک سرد' حکمیہ نظر بیوی پر ڈالتے اور وہ
ان کے حکم کی تعمیل کر دیتیں۔ آج انہوں نے زندگی
میں پہلی بار امو جان پر ہاتھ اٹھایا تھا' انہیں گالی دی تھی
اس بے غیرت انسان کی وجہ سے۔ بھائی کی زندگی برباد
کردی' ماں کو ذلیل اور بے عزت کروادیا' باپ نے ماں
پر ہاتھ تک اٹھالیا۔ آخر یہ شخص چاہتا کیا تھا؟ کیا یہ
سکندر شہریار ان سب کو تباہ و برباد کرکے ہی ان کی جان
چھوڑے گا؟ باپ کے جاہ و جلال اور شدید ترین
اشتعال نے اس کے پیروں کو منجمد کردیا تھا' وہ تھپڑ
کھانے کے بعد روتی ہوئی ماں کو سہارا دینے ان کے
پاس جانے کی ہمت نہیں کرپا رہا تھا۔ بہت سہما ہوا وہ
اسی طرح پیچھے کھڑا تھا۔ امو جان اب بالکل خاموش
تھیں' بے آواز آنسو گر رہے تھے ان کی آنکھوں سے'
شہریار خان ان کے اوپر چنگھاڑ رہے تھے' بلند آواز میں
چلا رہے تھے۔

"آج تم نے میرے سامنے آواز اونچی کی ہے اور
میں نے برداشت کیا ہے۔ آج کے بعد میرے آگے
زبان کھولنے کی کوشش کی تو اسی وقت طلاق دے کر
گھر سے نکال دوں گا۔ اگر اس گھر میں میری بیوی کی
حیثیت سے رہنا چاہتی ہو تو اپنی اوقات پہچان کر رہو۔
اس گھر میں کیا ہوگا اور کون یہاں رہے گا' یہ فیصلہ میں
کروں گا۔ تمہارا کام میرے فیصلوں کی تعمیل کرنا ہے۔
اگر یہ کام مشکل لگ رہا ہے تو شوق سے اپنے باپ کے
گھر واپس چلی جاؤ۔ طلاق نامہ میں تمہیں وہیں بھجوا
دوں گا۔"

آخری جملے ادا کرتے وقت ان کا لہجہ بہت سرد اور
سخت ہوگیا تھا۔ امو جان منہ پر ہاتھ رکھے ایک ٹک
شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا بیٹا وہاں موجود ہے' اس
بات سے شہریار خان کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

اسے ایسا لگا تھا جیسے امو جان کا دادا جی کا نام لینا
شہریار خان کو اس قدر بھڑکا گیا تھا۔ دادا جی کا نام اس نے
ہمیشہ اپنے گھر میں اس طرح لیے جاتے سنا تھا جیسے وہ
کوئی آسمانی مخلوق تھے' شہریار خان ان دونوں بھائیوں کو
ان کے دادا کی غیر معمولی اچھائیاں اور خوبیاں ہمیشہ
بہت فخریہ انداز میں سنایا کرتے تھے پھر آج امو جان نے
دادا جی کے متعلق اس طرح کیوں کہا تھا اور شہریار خان
اس پر اس طرح کیوں بھڑکے تھے؟ وہ کچھ بھی سمجھ
نہیں پا رہا تھا۔

شہریار خان وہاں سے پیر پٹختے شدید غصے کے عالم
میں چلے گئے تھے۔ وہ بھی وہاں سے بالکل خاموشی سے
لوٹ گیا تھا۔ وہ ماں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا' انہیں
یہ بتا کر کہ ان کی تذلیل ہوتے ہوئے اس نے بھی
دیکھی ہے۔ اگرچہ کہ اس کی ماں اس بد فطرت اور
بد کردار کی حمایت میں بولتے ہوئے اس کے باپ کے
ہاتھوں بے عزت ہوئی تھی جس سے وہ مرتے دم تک
نفرت کرتا رہے گا مگر پھر بھی ماں کی اس تحقیر' اس بے
عزتی پر اسے شدید تکلیف ہوئی تھی' بہت رنج ہوا تھا۔

ماں پر ہاتھ اٹھاتے اور چلاتے وقت اسے اپنا باپ
ایک اعلا تعلیم یافتہ مرد نہیں بلکہ ایک جاہل آدمی لگا
تھا۔ بیوی کی تحقیر کرتا اپنا باپ اسے بہت گھٹیا آدمی لگا
تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگا تھا کہ اس کا باپ ہارورڈ کا
فارغ التحصیل ہے' وہاں سے گولڈ میڈلسٹ اور ورلڈ
بینک میں بہت اونچے مرتبے پر فائز شخص ہے۔ ایسا لگا
تھا' اس کا باپ ــــ ایک بہت ہی روایتی جاہل مرد
ہے' جو بیوی کو پیر کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

☆ ☆ ☆
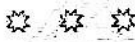
اور اس روز کے بعد اس نے اپنی ماں کو کبھی سکندر
کا نام لے کر اپنے باپ سے منت یا فریاد کرتے نہ دیکھا
تھا۔ ان دونوں کی اکیلے میں اس موضوع پر بات ہوئی
ہو تو ہوئی ہو' اس کے سامنے پھر کبھی نہیں ہوئی تھی۔
وہ ـــــــ اگلے ہی روز واپس لاس اینجلس چلا گیا
تھا۔ وہی کیمپس تھا' وہی وہاں کا ماحول' وہی دوست'
وہی سرگرمیاں مگر پھر بھی اب زین شہریار کے لیے نہ تو

کبھی کیلی فورنیا یونیورسٹی پہلے جیسی ہو سکتی تھی اور نہ ہی لاس اینجلس۔

کیمپس کے ہر گوشے میں ام مریم کی یادیں بکھری تھیں' لاس اینجلس کے چپے چپے پر اس کے ساتھ گزارے لمحوں کے نشان رقم تھے۔ اس کا کتنی بار دل چاہتا تھا' وہ اسے ڈھونڈے' اسے کھوجے' مگر پھر اس سے کیا وعدہ یاد آجاتا۔ وہ رک جاتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں بے چین ہو کر اسے یاد کرتا ہوا اٹھ بیٹھتا تھا۔ کیلی فورنیا سے انڈر گریجویٹ اسٹڈیز اس نے مکمل کرلیں تو شہریار خان نے لاء پڑھنے کے لیے اس کا داخلہ ہارورڈ لاء اسکول میں کروانا چاہا۔ جو کبھی اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا' وہ اب جب اس نے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیے تھے' پورا ہو گیا تھا۔

اس کا داخلہ ہارورڈ لاء اسکول میں ہو گیا تھا۔ اب خوشی کی باتوں پر بھی دل خوشی محسوس نہیں کرپاتا تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے لاس اینجلس سے اپنا سامان سمیٹ کر ہارورڈ لاء اسکول کی طرف گامزن ہو گیا تھا۔

لاس اینجلس میں رہ رہا تھا تو ام مریم کی یادوں کے حصار سے نکلنا بہت مشکل لگا کرتا تھا' جگہ بدلی' کیمپس بدلا' شہر بدلا تو کم از کم اتنا ضرور ہو گیا کہ وہ خود کو وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہو گیا۔

ام مریم کی یاد' اس کی محبت تو اس کے دل سے کبھی نکل ہی نہیں سکتی تھی مگر اب اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ زندگی کو پھر سے جینے لگا تھا۔ زندہ لوگوں کی طرح' اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح۔ پتا نہیں ام مریم کہاں تھی؟ وہ کیسی تھی؟ اس نے اپنی اسٹڈیز پھر سے شروع کی تھیں کہ نہیں؟ اگر وہ آج اس کی زندگی میں ہوتی تو اسے ہارورڈ لاء اسکول میں پڑھتا دیکھ کر کس قدر خوش ہوتی۔ ہارورڈ میں پڑھنے کے دوران وہ ہر چھٹیوں میں گھر آتا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی اور موت کی سی خاموشی رہا کرتی تھی اب اس کے گھر میں۔ اس کے باپ کا حاکمانہ مزاج ویسا ہی تھا جیسا وہ اپنے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کی ماں کی خاموشی ویسی ہی تھی جیسی شروع سے تھی۔ باپ کے سخت اور [illegible] سے اتنا یقین اسے ہو گیا تھا کہ وہ سکندر کو [illegible] نہیں کریں گے۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اس سے [illegible] چھیننے والے اس بدکردار شخص کو جو بھائی [illegible] ایک بدنما داغ تھا' کبھی بھی معافی نہیں ملنی [illegible] تھی۔

☼ ☼ ☼

وہاں اندھیرا بہت تھا۔ ہیبت ناک سناٹا بہت [illegible] اسے اس اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دم [illegible] رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ [illegible] اندھیری جگہ بڑی ہیبت ناک تھی جیسے کوئی غار' کوئی سرنگ' وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں ہلائے نہیں جا رہے تھے۔ وہ مدد کے لیے چلانے لگا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ کوئی تو آجائے اس کی مدد کے لیے۔ کہیں سے کوئی تو آجائے۔ اچانک ہی اس کے رونے اور چلانے کی آوازوں میں کسی کے قہقہوں کی آوازیں شامل ہو گئی تھیں۔ اس پر قہقہے لگا کر [illegible] وہ شخص اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس کی شکل بہت ڈراؤنی تھی۔ خوف کے مارے اس کی چیخیں نکل [illegible] تھیں۔ وہ شخص اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتا اس [illegible] قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔

"بچاؤ' بچاؤ۔ ہیلپ' ہیلپ۔ کوئی مجھے بچاؤ پلیز۔" وہ روتے ہوئے چلا چلا کر کسی کو مدد کے لیے پکار لگا تھا۔ مگر اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ [illegible] خوفناک شکل والا شخص اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ [illegible] وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس جیسی خوف [illegible] شکلوں والے تین آدمی اور بھی تھے۔

"پاپا! مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے ان لوگوں سے [illegible] لگ رہا ہے۔ پلیز پاپا! مجھے آکر بچالیں۔" [illegible] ہوئے باپ کو آوازیں دے رہا تھا۔

"ایک rapist میرا بیٹا۔ کبھی بھی نہیں [illegible] میرے گھر میں تم جیسے بدکردار اور بدفطرت [illegible] کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم میرے لیے مر [illegible]

اسے اس غار میں بہت دور اپنے پاپا نظر آئے تھے۔ نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اسے اس اندھیرے غار میں وہاں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ خوف کے مارے اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کرتا خود اپنے آپ کو ان خوفناک لوگوں کے شکنجے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یک دم ہی ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھتے اس کے باقی ساتھی بھی زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اس کی سانس گھٹ رہی تھی' اس کا دم گھٹ رہا تھا' اب نہ وہ چلا سکتا تھا' نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ وہ اپنے جسم سے خون بہتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا خون بہہ جائے گا۔ وہ مر جائے گا' وہ مر جائے گا۔

وہ پسینے میں شرابور تھا' وہ سوتے میں' بچاؤ' بچاؤ' چلا رہا تھا' اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو اور وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ یک دم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کئی سیکنڈ وہ آنکھیں کھولے بیڈ پر یوں لیٹا رہا جیسے اسے ابھی بھی یہ پتا نہ چلا ہو کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اسے جیسے اپنے کمرے کے اندھیرے سے شدید وحشت ہوئی تھی اس نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا۔ لیمپ روشن کرتے اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ گھٹن اور اندھیرے سے گھبرا کر وہ فوراً" بیڈ سے اٹھا تھا۔

اس نے اپنے کمرے کی تمام لائٹس آن کر دی تھیں۔ پردے ہٹا کر تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ اس وقت امریکہ کی کسی سڑک پر نہ ہی کسی کے گھر سے نکالا جا رہا تھا۔ وہ وہاں میں واقع اپنے فلیٹ میں تھا۔ کھینچ کھینچ کر سانس لیتے اس نے

گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ اس نے خود کو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔ اس کے نہ کہیں سے خون بہہ رہا تھا نہ کہیں چوٹ لگی تھی۔ پھر بھی اسے اپنے پورے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ نڈھال سے انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اپنے قدموں کو گھسیٹتا وہ کمرے سے نکلا تھا۔ وہ کچن میں آیا تھا۔ بغیر رکے اس نے چار گلاس پانی کے پیے تھے۔ اس کا واپس اپنے کمرے میں جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں جانے سے اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بہت تیز آواز میں ٹی وی آن کر لیا تھا۔

جس روز سے اٹلی سے آیا تھا' ایک رات بھی سو نہیں پایا تھا۔ اتنی راتوں تک نیند نہ آنے نے اسے بہت مضمحل کر دیا تھا' وہ اپنے دفتری کاموں کی انجام دہی میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔ تنگ آکر کل رات اس نے نیند لانے کے لیے ڈاکٹر کی تجویز کردہ گولیاں لے لی تھیں۔ وہ گولیاں نیند لائی تھیں مگر ہمیشہ کی طرح اس کے ڈراؤنے خواب بھی ساتھ لائی تھیں۔ اسے یہ گولیاں لیے اور یہ ڈراؤنا خواب دیکھے اتنے دن گزر گئے تھے کہ ایک خوش فہمی سی دل میں پیدا ہوئی تھی کہ شاید اس کے ان ڈراؤنے خوابوں نے آخر کار اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔

آخری بار اس نے یہ خواب روم میں تب دیکھا تھا جب خود کو خوش ہوتے اور ہنسنے پر سزا دینے کے لیے اس نے از خود یہ خواب دیکھنا چاہا تھا۔ کلوزیم سے واپس آنے کے بعد اپنے ہوٹل روم میں جاتے ہی اس نے یہی گولیاں لی تھیں اور خود کو سزا دینے کے لیے سونے لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ روم میں جب جب سویا قدرتی نیند سویا تھا اور یہ خواب تو یوں آنکھوں سے دور ہوا تھا جیسے اسے بارہ سالوں سے ڈرا ہی نہیں رہا تھا۔ پھر آج کیوں؟ پھر آج کیوں؟ ٹی وی کی تیز آواز بھی اس کے اندر کے سناٹوں کو توڑ نہیں پا رہی تھی۔

"کیا ہوا' تم سوئے نہیں؟" بہت فکرمند یہ آواز

اس کے عقب میں گونجی تھی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔

"تم چاہو تو میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہوں۔"

وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا' پھر بھی اس کے بالکل نزدیک یہ دل نشیں آوازیں گونج رہی تھی جیسے وہ یہیں بالکل پاس ہی بیٹھی تھی۔

"زندگی بہت خوب صورت ہے۔ خوشی کو' رنگوں کو اور زندگی کو اپنے اندر محسوس تو کر کے دیکھو۔"

صوفے پر وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ نرم لہجے میں بول رہی تھی۔

"خوش ہونے کے لیے وجہ ڈھونڈو گے تو کبھی خوش نہیں ہو سکو گے۔ میری زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ ہے جسے اگر میں ہر وقت سوچنا شروع کر دوں تو ایک لمحے کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی' مگر تم دیکھتے ہو میں کتنا خوش رہتی ہوں۔"

اس کا نرم لہجہ اتنا دل نشیں تھا کہ بے ساختہ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اسے وہ تصور میں فلور کشن اپنے صوفے کے پاس لا کر رکھتی نظر آ رہی تھی۔

"زندگی بہت خوب صورت ہے سکندر!" وہ صوفے پر لیٹا تھا اور اسے کارپٹ پر وہ اپنے صوفے سے بالکل نزدیک بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس کا نرمی' خلوص اور محبت لیا لہجہ اس کی تکلیف کو کم کر رہا تھا' کچھ دیر پہلے جس طرح وہ سانس گھٹتی محسوس کر رہا تھا۔ اب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں خود اس کی اپنی آواز گونجی تھی۔

"آج میں سینوریتا لیزا محمود اور ان کی پینٹنگز کو سوچتے ہوئے سوؤں گا۔" اسے اپنے ہاتھ کے اوپر اس کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر مرہم لگا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"اتنی خوب صورت چیزیں سوچو گے تب تو نیند بھی خوب پرسکون آئے گی اور خواب بھی بڑے حسین نظر آئیں گے۔"

وہ آنکھیں بند کیے کیے مسکرایا تھا۔ ... بھی نہیں آئی تھی مگر اس کی بے سکونی اور ... تھم گیا تھا۔ رات کا وہ خواب اپنے اثرات ... اس کے لیے پھر cervical pain لے ... صبح وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا ... گردن کے پچھلے حصے میں وہی مخصوص درد ... گردن سے اٹھتا بازوؤں تک پھیل جایا کرتا تھا ... سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس کے سر ... شدید درد ہو رہا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ ... پر وہ تحقیر بھری نظریں نہیں ڈال پایا تھا جو پچھلے بارہ سالوں سے ڈالتا آیا تھا۔

"تم مجھے بہت ہینڈسم لگتے ہو۔ اوپر سے تمہارا غرور اور خود پسندی بھی تم پر بہت جچتی ہے۔ مجھے تمہارا چہرہ خاص طور پر تمہاری آنکھیں بہت پرکشش لگتی ہیں۔"

وہ اپنے چہرے کے نقوش کو آئینے میں بغور دیکھتا رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے سینور سکندر! تم بہت ہینڈسم ہو۔ پتا نہیں مگر ہر بار تمہیں دیکھ کر اپالو کا خیال دل میں آتا ہے۔"

اپنے چہرے کے نقوش شیشے میں دیکھتے اسے آئینے میں وہ نظر آنے لگی تھی۔ لبوں پر شرارت بھری مسکان لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"bella۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکان آئی تھی۔ وہ آئینے میں اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ وہ عادتاً بغیر ناشتے کے گھر سے نکل رہا تھا۔ خود کو نظر انداز کرنے اور سزا دینے کی اپنی عادت کے پیش نظر۔

"دل نہیں چاہ رہا' پھر بھی تھوڑا سا کھالو۔" کچن کے پاس سے آتی اس آواز پر اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"منع مت کرنا۔ تم نے کھانا بہت کم کھایا تھا ...

آملیٹ کھاؤ۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنایا ہے۔"

تکلیف کی وجہ سے اس سے گردن نہیں گھمائی جا رہی تھی۔ وہ پورا کا پورا اکڑا ہوا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کے کچن میں کھڑی ہے۔ وہ وہاں نہیں تھی مگر وہ اسے وہاں محسوس ہو رہی تھی۔ فکر سے اسے دیکھتی، اس کی خاطر اپنا سکون اور آرام قربان کرتی ہوئی۔

"تمہاری زندگی نہ بے وقعت اور بے مول نہیں ہے سکندر! کسی اور کو فرق پڑے نہ پڑے لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔"

وہ جیسے کسی طاقت کے زیر اثر کھنچتا کچن میں آ گیا تھا۔ اس نے فریج سے دودھ نکالا تھا۔ کارن فلیکس کا ڈبہ اٹھایا تھا۔ پیالہ اور چمچ اپنے سامنے رکھا تھا۔ وہ اب گھر سے ناشتہ کر کے آفس جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے آفس میں تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کاموں میں گم۔ رات کا خواب اور اعصابی درد اس پر پھر حاوی ہو رہے تھے۔ اس نے اس سب سے پیچھا چھڑانے کے لیے خود کو کاموں میں غرق کر رکھا تھا۔ لنچ ٹائم کب کا گزر چکا تھا اور اسے بھوک کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تم نے لنچ کیا؟" وہ اسے اپنی میز کے سامنے رکھی خالی کرسی پر بیٹھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بے دم ہی شرمندہ سا ہوا تھا۔

"مگر وہ ضروری نام سکندر شہریار کی صحت اور اس کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔"

اس نے دیکھا وہ رنجیدہ نظر آ رہی تھی اس بات پر کہ وہ خود کو نظر انداز کیوں کیا کرتا ہے، اس بات پر کہ وہ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتا۔ وہ مسکراتی ہوئی اچھی لگا کرتی تھی، وہ زندگی سے بھرپور انداز میں کھلکھلاتی اچھی لگا کرتی تھی۔ اداسی اور رنج اس کے چہرے پر سج نہیں رہا تھا۔ محض اس کے چہرے پر مسکان دیکھنے کے لیے اس نے انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو اپنے لیے لنچ منگوانے کو کہا۔

اب تو وہ خوش تھی ناں، اب تو وہ اپنا خیال رکھ رہا ہے، اب تو وہ خوش ہے؟ اپنی ہنسی کی ایک جھلک اسے دکھلا کر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر سے غائب ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام میں جب وہ دفتر سے اٹھا تو اس کے درد کی شدت برقرار تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس درد سے نجات کے لیے اسے گھر جا کر ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا لینی پڑے گی۔ درد تو دوا سے چلا جائے گا مگر ساتھ نیند بھی لائے گا اور نیند اپنے ساتھ خواب۔ اب وہ لیزا کے روما میں نہیں تھا جہاں نظر آتے آتے اچانک ہی یہ خواب نظر آنا بند ہو گئے تھے۔ اتنے دنوں تک وہاں اس کی غیر موجودگی کے سبب اس کے کچن اور فریج میں بہت سی اشیائے خورد و نوش ختم ہو گئی تھیں۔ جب سے اٹلی سے واپس آیا تھا، گروسری کے لیے نہیں گیا تھا سوائے دودھ وغیرہ جیسی انتہائی ضروری چیزوں کے باقی یونہی کام چلا رہا تھا۔

آج دفتر سے اٹھنے کے بعد فلیٹ جانے سے قبل اس نے راستے میں گاڑی ایک گروسری اسٹور پر روکی۔

وہ اپنی ضرورت کے مطابق ٹرالی میں مختلف اشیا ڈالتا جا رہا تھا۔ فروٹ اور سبزیوں والے سیکشن کے پاس وہ آیا۔ وہ چند سبزیاں لینا چاہتا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ ناشتا اور لنچ اس کا اکثر و بیشتر نہیں ہوا کرتا تھا مگر خود کو زندہ اور چلتا پھرتا رکھنے کے لیے وہ رات کا کھانا اکثر کھا لیا کرتا تھا سوائے ان دنوں کے جب اس پر بدترین قنوطیت اور خود سے نفرت طاری ہوتی تھی۔ کبھی وہ ڈنر باہر کرتے ہوئے فلیٹ واپس آتا تھا اور کبھی فلیٹ آ کر خود اپنے لیے کھانا پکاتا تھا۔ برس ہا برس سے تنہا رہنے کے سبب وہ با آسانی اپنے لیے کھانا بنا لیا کرتا تھا۔

اسے کچن میں مہارت سے کام کرتا دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنا بچپن اور نوعمری کا دور ایسے گھر میں گزارا تھا جہاں اس کی ایک آواز پر کئی کئی نوکر دوڑے دوڑے چلے آتے تھے۔ اسے اٹھ کر پانی تک خود نہیں پینا پڑتا تھا۔ دیکھنے والے اسے ایک سیلف

میڈ انسان سمجھا کرتے تھے۔ ایک سیلف میڈ انسان جو اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر یہاں تک پہنچ پایا تھا۔

سبزیوں کی طرف جاتے جاتے اس کی پھلوں کی طرف نظر پڑی تھی۔ وہاں دیگر کئی تازہ پھلوں کے ساتھ ناشپاتیاں بھی رکھی تھیں۔ اس کا پھل لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اب وہ اپنی ٹرالی میں سبزیوں سے بھی پہلے ناشپاتیاں رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے بہت ساری ناشپاتیاں خریدی تھیں۔ اس کے ڈنر کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ وہ ناشپاتیوں کو ٹرالی میں رکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں ڈائننگ ٹیبل کچن ہی میں موجود تھی۔ واپس آکر نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ کچن میں آگیا تھا۔ اس نے پلیٹ بھر کر ناشپاتیاں اپنے لیے کاٹی تھیں۔ ان کے چوکور چوکور پیس۔ پلیٹ میں فورک لگا کر وہ میز پر بیٹھ گیا تھا۔

اسے کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا یہ پھل اتنے مزے کا ہوتا ہے۔ بچپن سے اسے اس پھل سے کوئی خاص رغبت نہیں رہی تھی، آج وہ اسے اتنے مزے کا لگ رہا تھا۔ اس نے ناشپاتیوں کو انجوائے کرتے ہوئے سوچا کہ کل وہ دفتر جا کر اپنی سیکریٹری سے کہے گا کہ جس طرح اس نے یہ یاد کر لیا ہے کہ اس کا باس بلیک کافی پسند کرتا ہے، اسی طرح اب لنچ میں روز ناشپاتیاں کھانا پسند کرے گا، یہ بھی یاد کرلے۔

وہ دوا لیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے لیے کافی بنا کر وہ لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔ غیر دلچسپی سے چینل تبدیل کرتے اس کے ہاتھ یک دم ہی ایک چینل پر آکر رکے تھے۔ روما کے اوپر ڈاکومینٹری آرہی تھی۔ وہاں کے تاریخی مقامات، ان کی تاریخی اہمیت۔ اس کی غیر دلچسپی فوراً ہی دلچسپی میں تبدیل ہوئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے کلوزیم فوریم ویٹی کن سٹی، اسپنش اسٹیپس کو دیکھ رہا تھا۔ ارے اب Trevi فاؤنٹین دکھا رہے ہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ الرٹ ہو کر بیٹھا۔ سیاحوں سے گھرا Trevi فاؤنٹین، سیاحوں کو وہاں پانی [illegible] اچھالتے دکھایا جا رہا تھا۔ ساتھ ٹی وی دیکھنے [illegible] ناظرین کو ان سکے اچھالنے کا پس منظر بھی بتایا جا رہا [illegible]

Legend has it you will
return to Rome if you
throw a coin into
the water

(کہا جاتا ہے آپ روم دوبارہ آنا چاہتے ہیں تو یہاں پانی میں سکے اچھالیں۔)

ٹی وی پر سے ابھرتی یہ آواز سن کر اس کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی۔

وہ پانی میں سکہ کیوں اچھال کر نہیں آیا تھا؟ وہ یقین کرتا تھا یا نہیں مگر اسے پانی میں سکہ اچھال دینا چاہیے تھا۔

I didn't toss a coin
into the fountaion but
i still want to go
back to Rome

(میں نے وہاں فوارے میں سکہ نہیں اچھالا لیکن میں روم واپس جانا چاہتا ہوں)

وہ خود کلامی کرتے ہوئے نجانے کس سے مخاطب تھا۔ وہ خود سے روم کبھی نہیں جائے گا، وہ وہاں نہیں جانا چاہتا مگر کچھ ایسا ہو تو سکتا ہے ناں کہ اسے پھر کسی دفتری کام سے وہاں بھیجا جائے۔ تب تو اسے خود سے لڑنا بھی نہیں پڑے گا کہ وہ روم میں اپنی زندگی سے خوش ہوتا کسے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ خود کو یا پھر اس لڑکی کو؟ وہ جس جگہ سے سب چھوڑ چھاڑ آیا تھا "بھاگ آیا تھا" وہ وہاں پھر جانا چاہتا تھا۔ کچھ ایسا [illegible] جائے کہ اس کے آفس والے اسے پھر سے روما [illegible] دیں۔ وہ La citta eterna پھر سے [illegible] تھا۔ خود سے وہ وہاں نہیں جا سکتا۔ خود سے [illegible] اس کے اندر سے ابھرتی آوازیں اس سے [illegible] اسی طرح جیسے Tivoli سے آنے کے [illegible]

اندر موجود بہت تلخ اور زندگی سے نفرت میں مبتلا شخص اس سے لڑا تھا۔

اس نے اس سے سوال کیا تھا کہ آخر کس حق سے وہ اپنی زندگی کی تاریکیوں، سیاہیوں اور ذلتوں میں اس لڑکی کو شامل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ جو سراپا محبت ہے، جو سراپا خوشی ہے، جو سراپا ہنسی ہے، جو سراپا زندگی ہے۔ یہ ہنسی، یہ خوشی اور یہ زندگی لیزا محمود کے پاس ہمیشہ رہنی چاہیے تھی۔ اپنے اندر سے ابھرتی ان آوازوں ہی کے سبب وہ اٹلی سے آنا "فانا" واپس آگیا تھا، اس لڑکی کی زندگی سے ایک دم ہی باہر نکل آیا تھا۔ اگر وہ خوشیاں بانٹنے والی اس بہت پیاری لڑکی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اسے اپنی زندگی کی بدنمائیوں اور تاریکیوں میں حصہ دار بنائے۔

ایک بچکانہ سی دعا تھی جو وہ کررہا تھا۔ اس کے آفس والے اسے زبردستی روم بھیج دیں۔ وہ منع بھی کرتا رہے تب بھی کسی بھی اہم کام کا کہہ کر اسے وہاں پر زبردستی بھیجا جائے۔ اس کی مرضی کے خلاف جبراً "حکم دے کر۔ تب تو اس کے اندر کوئی اس سے لڑ بھی نہیں سکے گا۔

وہ خود کو بے بس اور مجبور ظاہر کرتا کہے گا کہ یہ اس کی نوکری کی مجبوری ہے جو وہ اٹلی دوبارہ جارہا ہے۔

اس نے وہ ڈاکومنٹری پوری دیکھی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا، وہ اس شہر سے محبت میں مبتلا ہو گیا تھا، اسے روم سے محبت ہو گئی تھی، وہ اس شہر میں پھر جانا چاہتا تھا۔ جو جگہیں تب نہیں دیکھ پایا، اب دیکھنا چاہتا تھا۔ اکیلے نہیں کسی کے ساتھ۔ وہ ان تمام تاریخی جگہوں کی بہت ساری تصاویر کھینچنا چاہتا تھا۔ اکیلے نہیں کسی کے ساتھ، کسی اور کو بھی ہونا چاہیے تھا ان تصاویر میں اس کے ساتھ اسے ٹی وی پر steps spannesh پر دیکھتے ہوئے وہاں وہ اور لیزا بیٹھے نظر آرہے تھے۔

"نہیں، نہیں گھنٹی کوئی نہیں بجی تھی۔"

حلفیہ انداز میں بول کر بھی بیٹھ کر اسے یقین دلایا گیا تھا۔ وہ بے اختیار کھل کر ہنسا تھا، وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی ہے۔" اس لڑکی کی یاد ہی اتنی خوب صورت تھی کہ اسے اپنے اعصابی درد کا احساس تک نہیں رہا تھا۔ ڈاکومنٹری ختم ہوئی تو ٹی وی بند کرکے اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

نیند اسے ابھی آئی نہیں تھی۔ دوا لینے سے وہ کترا رہا تھا اور ویسے بھی درد اس وقت قابل برداشت محسوس ہورہا تھا۔ اپنے شوق اور دلچسپی سے کوئی مووی دیکھے اسے برسوں ہوچلے تھے۔ مگر اس وقت وہ اپنے لیپ ٹاپ پر Roman Holidays ڈاؤن لوڈ کررہا تھا۔

یہ مووی اس نے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ آج دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ وہ مووی دیکھ رہا تھا لیٹا ہوا۔ مووی میں روم کی مختلف جگہوں کو دیکھتے اسے ان جگہوں پر مووی کے مرکزی کردار نہیں بلکہ وہ خود اور لیزا چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

"خیر۔ خوب صورت تو میں ہوں۔"

ہاں۔ خوب صورت تو وہ بہت ہے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت ہے۔

"میں زیادہ تو نہیں بولتی۔ لگتا ہے تم نے کبھی کوئی باتونی لڑکی دیکھی نہیں ہے۔"

وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر مووی میں ان اداکاروں کو نہیں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے روم میں رات کے دو بج چلے تھے مووی دیکھتے دیکھتے کس وقت اس کی آنکھ لگی اسے پتا نہیں چلا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہوچکی تھی۔ وہ سو گیا، بغیر کسی دوا کے ..... اس نے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا۔ یہ اعجاز اس لڑکی کا تھا جو اپنی موجودگی سے تو اس کے پاس سے ان خوفناک خوابوں کو دور رہتا ہی گئی تھی۔ کل رات اپنے تصور سے بھی ان خوابوں کو اس کے پاس بھٹکنے تک نہ دیا۔

شاید اس لیے کہ کل رات اس نے وہ کوشش نہ کی

تھی جو اٹلی سے آنے کے بعد جان بوجھ کر، پوری شعوری کوشش کرکے کر رہا تھا۔ لیزا محمود کو بھول جانے کی کوشش۔ اسے بالکل بھی یاد نہ کرنے کی کوشش' اسے ذرا بھی نہ سوچنے کی کوشش۔ کل رات اس نے بڑے اہتمام سے 'بڑے دل سے 'بڑی محبت سے اسے یاد کیا تھا۔ وہ پاور واپس آنے کے بعد پہلی بار۔

گویہ ایک بے اختیاری کیفیت میں ہوا تھا مگر اس پل جب وہ خود کو بہت تروتازہ محسوس کرتا بیڈ سے اٹھ رہا تھا۔ تب اس نے خود سے کہا تھا اس میں کیا حرج ہے اگر وہ لیزا محمود کو یاد کرلے 'اس میں کیا حرج ہے اگر وہ اسے سوچ لے؟ اس سے کسی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔ اس لڑکی کو تو یہ پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ اسے یاد کیا کرتا ہے۔ وہ اس کی یادوں میں اپنے لیے سکون تلاش کرتا ہے 'وہ اسے تصور میں لاکر اپنے اندر کی تلخیوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آتو گیا ہے اس کی زندگی سے دور۔ وہ اب اس سے زندگی میں کبھی نہیں ملے گا۔ وہ لیزا کی زندگی اور اس کی خوشیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔ وہ صرف اس کی یادوں اور اس کے تصور سے زندگی کو اپنے لیے آسان بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کوئی قابل گرفت گناہ تو نہیں۔

اس نے اپنا موبائل اٹھا کر اس میں Trevi فاؤنٹین کی وہ تصویر کھولی تھی جس میں لیزا بھی موجود تھی۔ تب وہاں Trevi فاؤنٹین کی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچتے اس نے بظاہر یہ تصویر یوں کھینچی تھی جیسے اس جگہ کو کسی خاص انداز سے تصویر میں لانا چاہتا تھا۔ لیزا کو اس نے بتایا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

وہ تصویر تب اس نے خود سے بھی جھوٹ بولتے یوں کھینچی تھی جیسے لیزا کا سائڈ پوز اتفاقاً" اس تصویر میں آگیا تھا ورحقیقت تو وہ اس جگہ کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ مگر آج وہ جانتا تھا اور خود سے اعتراف بھی کر رہا تھا کہ یہ تصویر اس نے جان کر کھینچی تھی کہ وہ جانتا تھا اگلے روز اس نے روم سے واپس چلے جانا تھا' پھر اس نے لیزا محمود سے زندگی بھر نہیں ملنا تھا' کرچکا تھا تو کیا واپس جانے سے پہلے اس کی یادیں بھی یادوں اپنے ساتھ لے کر نہیں جائے گا۔ ... میں وہ اداس تھی۔ وہ اس طرح مسکرا ... جیسے ہر وقت مسکرایا کرتی تھی' اس طرح ... نہیں آرہی تھی جیسے ہمیشہ خوش رہا کرتی تھی۔ اس اداسی کا سبب وہ جانتا تھا۔ یہ اداسیاں اسے دی ... نے تھیں۔ مگر وہ ٹوٹا' بکھرا' ناکام انسان اسے ... ساتھ کی کوئی خوشی بھی تو نہیں دے سکتا تھا تو یہ ... اداسی دے دینا زیادہ بہتر لگا تھا اسے۔

وہ تو اتنی اچھی ہے 'اتنی پیاری ہے اسے اس کے شایان شان کوئی بہت کامیاب 'بہت باوقار اور اس سے بہت محبت کرنے والا شخص ملے گا' وہ اس سے اتنی محبت کرے گا کہ وہ اپنے روم میں چند دنوں کے لیے آئے اس ناکام انسان کو بھول ہی جائے گی۔ اس کی دعا تھی' بہت سچے دل سے مانگی دعا کہ لیزا اسے بھول جائے۔ اسے کسی اور سے محبت ہو جائے' کسی ایسے شخص سے جو اس بہت پیاری لڑکی کی بہت قدر کرے' اس سے بہت محبت کرے' سکندر شہریار کبھی اس کے خوابوں اور خیالوں تک میں نہ آئے ایسی محبت مل جائے اسے۔

"تم میرے لیے نہیں ہو' جانتا ہوں۔ مگر جسے تم ملو گی وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی ہوگا۔"

وہ اس کی تصویر سے بولا تھا۔ اس سے رخصت ہوتے پل کی اس کی ان بھیگی 'اداس آنکھوں کو یاد نہیں رکھنا چاہتا تھا جن میں بہت شکوے تھے' بہت شکایتیں تھیں۔ وہ رو دینے کو تھی وہ جانتا تھا۔ تب ہی تو وہ "آناً فاناً" وہاں سے بھاگا تھا۔ وہ کسی ایسے جذباتی لمحے کی زد میں آنے سے ڈرا تھا جن میں وہ اس لڑکی کے آنسوؤں یا اس کی محبتوں کے سبب کمزور پڑ جائے۔ اس کی ... لمحاتی کمزوری اس لڑکی کی زندگی کو کانٹوں پر گھسیٹ لے جائے گی۔

"لیزا کو ہمیشہ بہت خوش رہنا چاہیے۔" ...
Tivoli سے آنے کے بعد اس رات سوچا تھا ...

ہمیشہ خوش رہنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنا بدنما اور داغ دار وجود جلد از جلد اس سے بہت دور لے جائے۔ کہیں اس کی زندگی کی بدنمائیاں اور ذلتیں اس لڑکی کی زندگی سے بھی خوشیوں کو ختم نہ کردیں۔

محبت کس لمحہ ہوئی' وہ نہیں جانتا تھا' دن' وقت' موقع اسے پتا نہیں تھا۔ وہ تو بس لیزا کے روم میں اچانک ہی اس کے ساتھ مل کر رنگوں اور زندگی کو پھر سے محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور' دل کھول کر ہنسنے اور بے تحاشا بولنے والی لڑکی اپنی باتوں سے اسے ہنسایا کرتی تو ہنستے ہنستے وہ حیرت سے چپ سا ہو جاتا تھا۔ وہ لیزا کے ساتھ اس کے روم میں جیسے نئے سرے سے پیدا ہوا تھا' جیسے وہ نئے سرے سے زندہ ہوا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی اور وہ مبہوت اس کے چہرے کو دیکھا کرتا' وہ اٹالین لہجے میں اس کے ساتھ اردو میں باتیں کرتی تو اس کا دل چاہتا' وہ بولتی رہے اور وہ اسے تاحیات سنتا رہے۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس اسے ابھی بھی اپنے ہاتھوں اور لبوں پر یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ابھی ابھی وہ اس کے زخموں پر مرہم لگا کر گئی ہو۔

وہ کس طرح اس کی فکر کرتی تھی' وہ کس قدر اس کا خیال رکھتی تھی۔ Tivoli میں پہلی بار اس کے دل نے ضدی انداز میں مچل مچل کر کہنا تھا وہ چاہتا ہے یہ لڑکی ساری زندگی یونہی اس کی فکر کرے' یونہی اس کا خیال رکھے' وہ چاہے اسے مایوس کرے' چاہے اسے ناراض کرے مگر وہ لڑکی یونہی اپنی محبت اس پر نچھاور کرتی رہے۔

وہ اپنے اندر کی ان آوازوں' اس شور سے گھبرایا تھا۔ تائیوولی میں اس نے کیوں لیزا کے آنسو صاف کیے تھے۔ اس کا اس پل یہ دل کیوں چاہا تھا کہ وہ اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔ اس سے کہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں رو رہی ہو۔ میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف' کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہیں ہر نقصان سے بچالوں گا۔ اپنے اندر سے ابھرتے اس شور نے اسے اتنا ڈرایا تھا کہ اس رات ہوٹل جاتے ہی اس نے اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرائی تھی۔

وہ اگلے روز صبح ساڑھے چھ بجے آفس پہنچ گیا تھا۔ اس نے طے کرلیا تھا وہ آج اور کل کا پورا دن لگا کر اپنا باقی بچا تمام دفتری کام مکمل کرلے گا۔ اس نے قصداً" سارا دن لیزا کو فون نہیں کیا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنا وقت ادھر ادھر کہیں بھی گزارنے کے لیے وہ شام میں دفتر سے نکلا تھا جب لیزا کی کال آئی تھی۔ یک دم ہی اس کا دل چاہا تھا وہ روم کی گلیوں میں آخری بار اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔

اس نے اسی وقت کھڑے کھڑے Trevi فاؤنٹین جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آج اس سے آخری بار مل رہا تھا۔ خود کو بہت خوش' بہت لاپروا ظاہر کرکے اس نے اسے اپنی واپسی کا بتایا تھا۔ اس کی اداسی' اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر اس کا دل بہت دکھا تھا۔ مگر یہ دکھ اس دکھ سے بہت کم تھا جو لیزا کو اس کے اقرار محبت کے بعد اس سے ملتا۔ وہ اسے دے کیا سکتا ہے۔ ناکامیاں' مایوسیاں' تلخیاں' رسوائیاں' ذلتیں' وہ ایک زندہ لاش سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ وہ اسے اصرار کرکے اپنے گھر بلا رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے انکار نہیں کرپایا تھا۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری بار پھر اس کے بعد تو صرف خوابوں اور خیالوں میں ملنا تھا۔ وہ اس آخری دن بھی صبح سے شام تک آفس میں اپنے بقایا کام نمٹاتا رہا تھا۔ لیزا سے صرف ایک میٹنگ ہے کہہ کر اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا کہ واپسی کا یہ فیصلہ اس نے ایک دم اچانک اور آناً"فاناً" کیا ہے۔ وہ پاگل لڑکی اس سے اظہار محبت سننا چاہتی تھی۔ اس سے' سکندر شہریار سے' جس کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ اسے کیا دے سکتا تھا؟ اس کا وجود زخم زخم تھا' اس کی روح مرچکی تھی' ایک بے جان لاش کے ساتھ اس لڑکی کو کیا مل سکتا تھا؟ وہ خود اپنے آپ سے آخری لمحوں تک بہت ڈرتا رہا تھا۔

اس کی طرف جس طرح اس کا دل کھنچتا تھا۔ اسے بہت خوف آیا تھا اس لمحے سے کہ جس میں لیزا کے آنسوؤں سے یا اپنے دل کے ہاتھوں کمزور پڑ تا وہ اس سے کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ اظہار محبت نہیں بھی تو کوئی ایسی میٹھی دل نشین بات جو وہ اس سے سننا چاہتی تھی۔ جس میں کوئی وعدہ کوئی امید پنہاں نہ بھی ہو تب بھی وہ بات اس کا لیزا کی جانب التفات اور جھکاؤ ظاہر کرتی ہو' وہ اسے کبھی بھی نہیں بھول پائے گا یہ بتاتی ہو۔ اس کی زندگی کی سچائیاں اتنی کڑوی' اتنی بدصورت تھیں کہ ان میں وہ کسی اور کو حصے دار نہیں بنانا چاہتا تھا تو لیزا محمود کو کیسے بنا دیتا؟ لیزا محمود جس نے اسے زندگی کو پھر سے محسوس کرنا سکھایا تھا' لیزا محمود جس کے روما میں وہ اس کے ساتھ پھر سے خوش ہونا سیکھ کر آیا تھا' جس سے وہ پھر سے ہنسنا سیکھ کر آیا تھا۔

آج اس کی یادوں کے ساتھ سو کر جب وہ بیدار ہوا تھا تو اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے اندر زندگی کے لیے وہ نفرت نہیں جیسی وہ زندگی سے بارہ سالوں سے کرتا آیا ہے۔ جیسے اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ ایسا ہے جیسے سوچ کر چند لمحوں ہی کے لیے سہی مگر وہ خوش ہو سکتا ہے' مسکرا سکتا ہے۔

وہ اپنی سیکریٹری کو ایک کانٹریکٹ ٹائپ کرنے کے لیے دے رہا تھا۔ اس کی صبح عموماً" بہت جلدی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ روزانہ صبح 7 اور ساڑھے 7 کے درمیان آفس میں موجود ہوتا تھا۔ اس کی سیکریٹری اس کے اس معمول کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کر چکی تھی۔ وہ بھی صبح جلدی آنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

اس کے موبائل پر کال آ رہی تھی۔ سیکریٹری کو ہدایات دینے کے دوران اس نے موبائل کو دیکھا' یہ اس کے امریکن کولیگ نکولس کی کال تھی۔ دوبئی آنے سے قبل امریکہ میں جس لاء فرم میں وہ جاب کرتا تھا نکولس وہاں اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے سینئر وکیل تھا۔ جس وقت زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر کار وہ لاء کا امتحان پاس کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا

تب نکولس ایک کامیاب وکیل کے طور پر خود کو ... تھا۔ اپنا کیریئر بنا چکا تھا۔ وہ اس کا ہم عمر ہی تھا۔

وہ برے دنوں کا ایک اچھا ساتھی تھا۔ جس ... دوستی تو نہ تھی مگر ایک اپنائیت بھرا تعلق ضرور ... اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو نکولس۔"

"سکندر' کیسے ہو؟"

"فرسٹ کلاس۔ تم سناؤ؟"

زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔ ایک کیس کے سلسلے میں دوبئی آیا ہوں۔ یہاں سے آج مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے ابوظہبی جانا تھا۔ ایئرپورٹ پہنچنے میں مجھے دیر ہو گئی۔ میری فلائٹ مس ہو گئی۔ میٹنگ شام سات بجے ہے۔ فلائٹس پر اتنا رش ہے۔ اب اگلی جس فلائٹ میں مجھے سیٹ مل رہی ہے وہ ہے ہی شام ... بجے۔ اب میں کیا کروں؟"

نکولس بے چارہ اپنی پریشانی بتا رہا تھا مگر وہ بے اختیار مسکرا اٹھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا لی تھی۔

"کیا تم بھی میری طرح سو گئے تھے؟" وہ ہنس کر بولا تھا۔ نکولس اتنی پریشانی میں تھا کہ "میری طرح" اور "بھی" کے لفظوں پر دھیان دیے بغیر سنجیدگی سے بولا تھا۔

"نہیں سکندر! بس وہ یہاں کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔ میں ایئرپورٹ کے لیے دیر سے نکلا۔ اب ایئرپورٹ پہنچا ہوں تو لیٹ ہو چکا ہوں۔ تم مجھے مشورہ دو میں اب کیا کروں؟"

"بائے روڈ۔ تمہیں بائے روڈ جانا چاہیے اور اگر ڈرائیور مجھ جیسا ہوا تمہیں ستر میل فی گھنٹہ کی ... سے گاڑی دوڑا کر لے کر گیا تو تم اپنے مطلوبہ وقت سے پہلے ابوظہبی پہنچ جاؤ گے۔" وہ ہنس کر لیزا کا ... کا انداز اپنا کر بولا تھا۔

"تم وہیں ایئرپورٹ پر ہی رک کر میرا ... میں اپنے آفس سے نکل رہا ہوں۔"

فون بند کرکے وہ جلدی جلدی سیکریٹری کو اپنے جانے کا بتانے کے بعد دن بھر میں کیا کیا کام نمٹانے ہیں اس سے متعلق ہدایات دینے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼
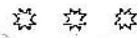
وہ نکولس کو اس کی میٹنگ کے لیے وقت پر پہنچانے اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا تھا۔

"تمہارا بہت شکریہ سکندر! میں دوہا فرسٹ ٹائم آیا ہوں اگر تم مدد نہ کرتے تو سچ میں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کروں۔" وہ ہائی وے پر ڈرائیو کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ہائی وے کے ــــ دونوں طرف صحرا تھا کہیں کہیں خانہ بدوش اور بدو اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلا نہیں اڑا رہا تھا۔ بالکل لیزا کی طرح۔

"تم بہت زیادہ تیز نہیں چلا رہے گاڑی؟" نکولس کو جیسے کسی ایکسیڈنٹ کا ڈر لاحق ہوا تھا وہ قدرے خائف سے انداز میں بولا تھا۔ اسے خوفزدہ دیکھ کر وہ ہنسا تھا۔

"میری یہ ڈرائیونگ ہی تمہیں ٹھیک وقت پر تمہاری منزل پر پہنچائے گی سینور نکولس۔" لیزا کا جملہ اس کے انداز میں بولنے میں اسے بہت مزا آیا تھا۔ گاڑی ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھی۔

"سینور۔" نکولس نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"حیران مت ہو۔ میں ابھی پندرہ دن پہلے اٹلی سے آیا ہوں۔ وہاں کے اثرات ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔

نکولس گردن ہلا کر مسکرایا تھا۔ اب چونکہ وہ اسے وقت پر پہنچانے خود جا رہا تھا۔ اس لیے نکولس قدرے مطمئن اور پرسکون تھا۔ اس نے سکندر کو بغور دیکھا تھا۔

"میں تمہیں آج پہلی بار ہنستے دیکھ رہا ہوں۔ جب ہم ساتھ کام کیا کرتے تھے تب میں اکثر سوچا کرتا تھا تم اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ اتنی چھوٹی عمر میں تم نے خود پر اتنی سنجیدگی کیوں طاری کر رکھی ہے۔ تم ہنستے مسکراتے ایسے نہیں ہو۔ مگر تم خود کو ... رکھتے تھے کہ میری ہمت نہیں ہوتی تھی تم ... بے تحاشا سنجیدگی کی وجہ پوچھ سکوں۔"

"ہاں بس شاید دوہا کی آب و ہوا مجھے راس ... ہے۔" اسے دوہا کی نہیں کہیں اور کی آب و ہوا راس آئی تھی اسے خوش رہنا دوہا نے نہیں روما کی لیزا نے سکھایا تھا۔ اس کے پاس سے ایک گاڑی اسے بہت ... اور خطرناک طریقے سے اوور ٹیک کرتے ہوئے گئی تھی۔ بے اختیار اس کے لبوں سے اس گاڑی کے ڈرائیور کے لیے گالی نکلی تھی۔

"الو کا پٹھا!" بولتے کے ساتھ ہی وہ خود اپنے آپ پر حیران ہوا تھا پھر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ نکولس حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کس بات پر ہنس رہے ہو مجھے بھی بتاؤ؟" ظاہر ہے وہ کیا بولا تھا نکولس سمجھ نہیں پایا تھا۔

"اپنی زبان میں گالی دینے کا مزا الگ ہوتا ہے نکولس! میں نے اس گاڑی والے کو اپنی زبان میں گالی دی تھی اور پہلی بار مجھے پتا چلا ہے کہ انگریزی میں گالی دینے میں وہ مزا نہیں آتا دل کو وہ تسلی اور تشفی نہیں ہوتی جو کسی کو اپنی زبان میں گالی دے کر ہوتی ہے۔"

نکولس بھی اس کے ساتھ ہنس پڑا تھا۔ وہ نکولس کے ساتھ مل کر قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کبھی اصلی اٹالین پزا کھایا ہے؟"

نکولس نے صحیح وقت پر پہنچ کر اپنی میٹنگ اٹینڈ کر لی تب اس کے بعد وہ دونوں ابوظہبی ہی میں ایک پزا آؤٹ لیٹ پر رات کا کھانا کھانے آ گئے۔ پزا کھاتے ہوئے اس نے نکولس سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت بار۔"

"نہیں۔ میرا مطلب کسی اٹالین کے ہاتھ کا بنا ... جو تم نے روما کے کسی Pizzeria میں بیٹھ کر کھایا ...؟" اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"نہیں۔ وہ تو نہیں کھایا۔ اب تک کبھی اٹلی ..."

کا موقع نہیں ملا۔" نکولس نے چھری کانٹے کی مدد سے بڑا کھاتے ہوئے کہا۔

"پھر میرا مشورہ ہے تم زندگی میں ایک بار روما ضرور جاؤ۔ وہاں کا فوڈ، مائی گاڈ۔۔۔ اور وہاں کی ہسٹری اور آرکیٹیکچر۔۔۔ جادو ہے اس شہر میں۔ تمہیں خود بخود ہی روما سے محبت ہو جائے گی۔ تمہارا دل چاہے گا، تم یہاں بار بار آؤ۔"

وہ ایک گہری سوچ میں گم ہو کر بولا تھا۔ یوں جیسے وہ اس وقت یہاں پر تھا ہی نہیں، وہ لیزا کے روما میں تھا، وہ وہاں کی کسی گلی میں پھر رہا تھا، اس کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے۔

"سب خیر تو ہے ناں سکندر! تم روم کی کچھ زیادہ ہی تعریفیں کر رہے ہو۔ کہیں کسی رومن لڑکی سے محبت تو نہیں ہو گئی تمہیں؟" نکولس نے مسکرا کر کہتے اسے اس کے خیالوں سے نکالا تھا۔ وہ زور سے ہنسا تھا۔

"نہیں بھئی۔ میں نے سنا ہے، جب کسی سے محبت ہوتی ہے دل میں، بہت زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میرے دل میں تو اب تک کوئی گھنٹی نہیں بجی ہے۔"

نکولس اس کے پر مزاح انداز میں بولے جملوں پر اس کے ساتھ مل کر ہنس پڑا تھا۔ یوں ہنستے ہوئے اس کا دل یک لخت ہی رنجیدہ ہونے لگا تھا۔ اس کا دل اداس ہونے لگا تھا۔

"جسے کھو دیا اسے یاد کر کے بھی کوئی مسکرا سکتا ہے؟"

اس کے دل نے اس سے شکوہ کیا۔

"ہاں کسی کی یاد اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے کہ اس کی یاد کے سہارے بھی مسکرایا جا سکتا ہے، خوش ہوا جا سکتا ہے۔ وہ کیوں نہ خوش ہو کر اسے یاد کرے، وہ کیوں نہ اس کی باتیں دہراتا ہوا مسکرائے۔ لیزا محمود اس کی زندگی کی سب سے خوب صورت، سب سے قیمتی یاد ہے۔ وہ یاد جسے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے ساتھ ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے زندگی میں کبھی ملنا نہیں چاہتا مگر اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ

وہ اسے کبھی بھولنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے، آخری پل، آخری سانس تک اسے یاد رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ یادیں بہت قیمتی ہیں، بہت انمول ہیں۔ وہ ان یادوں کو اپنی سب سے قیمتی متاع جان کر ساری عمر یونہی اس کی باتیں دہراتے ہوئے گزار دے گا۔

☆ ☆ ☆

محمود خالد لاؤنج میں داخل ہوئے تو وہاں عائشہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ وہ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی اپنے دفتر سے گھر لوٹے تھے۔

"فریش ہو گئے آپ؟ چائے بنواؤں؟"

"بالکل پلاؤ چائے۔ اگر خود بنا لو تو کیا ہی بات ہے۔ میں تب تک کلثوم کو فون کر لوں۔"

وہ عائشہ کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ پہلی شادی کی ناکامی کے بعد انہوں نے دوسری شادی ماں کے اصرار پر مجبور ہو کر بہت ڈرتے ڈرتے کی تھی۔ مگر عائشہ کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرنے کے بعد انہیں فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود اپنے لیے ایک اچھی بیوی اور اپنی بچیوں کے لیے اچھی ماں نہ چن پائے تھے مگر ان کی ماں نے ایک بہت سلجھی ہوئی، نرم مزاج اور وفاشعار عورت ان کی زندگی کی ساتھی بنا دی ہے۔ عائشہ کے ساتھ نے ان کی الجھی بکھری زندگی کو سنبھال لیا تھا۔ عائشہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان سے محبت کے سبب ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی بہت عزیز رکھتی تھیں۔

مریم یہاں آتی تو عائشہ اس کی اور ہاشم کی تواضع میں کوئی کمی نہ چھوڑا کرتی تھیں۔ عید، تہوار اور دوسرے موقعوں پر وہ مریم کو بیش قیمت تحائف اس طرح بھجوایا کرتی تھیں جیسے مائیں بیٹیوں کے سسرال بھیجا کرتی ہیں۔ وہ کلثوم سے بھی نزدیک ہونے کی کوشش کرتی تھیں مگر وہ باپ کو اپنے نزدیک نہ آنے دیتی تھی تو سوتیلی ماں کو کہنا آنے دیتی؟

"آج کلثوم کی سالگرہ ہے۔" عائشہ کی سوالیہ

[illegible]

"[illegible] جلدی سے فون کریں۔ میری طرف سے [illegible] اسے برتھ ڈے وش کیجئے گا۔"

کلثوم کے سرد اور فاصلہ لیے انداز سے محتاط ہو کر عائشہ نے خود اس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی عائشہ کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی، بالکل اسی طرح جیسے اس نے کبھی ان کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی۔ مگر اس کا سرد اور بے تاثر انداز ان کی طرح عائشہ کو بھی یہ باور کرا دیا کرتا تھا کہ وہ ان دونوں سے بات چیت نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے عائشہ اس سے گفتگو میں ہمیشہ محتاط رہی تھیں۔

"میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ فون ملانے لگانے تھے۔ عائشہ ان کے پاس سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھیں۔ انہوں نے کلثوم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ کال مل گئی تھی۔ کال ریسیو بھی کر لی گئی تھی۔

"السلام علیکم بابا۔" سپاٹ سے انداز میں اس نے انہیں سلام کیا تھا۔ وہ عادی ہو چلے تھے اس انداز کے، سو گرم جوشی اور مسکراتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہے میری آرٹسٹ بیٹی؟"

"میں ٹھیک ہوں بابا۔ آپ کیسے ہیں؟"

اس کے یہ چند مخصوص جملے جو وہ ان سے فون پر گفتگو کے دوران بولا کرتی تھی انہیں رٹ گئے تھے۔

کبھی تو اس سے ہٹ کر بھی کچھ بول دو جان بابا۔ مجھ سے جو شکایتیں ہیں تمہارے دل میں، انہیں زبان پر لاؤ۔ میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔ زیادتی تو کی ہے ناں، میں نے تمہارے ساتھ۔ زیادتی نہیں زیادتیاں۔" اس باپ نے خود ہی اپنی تصحیح کی تھی۔

"میں بہت خوش ہوں۔ آج میری بیٹی کی سالگرہ جو ہے۔" انہوں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ "کلثوم! میری دعا ہے بیٹا اللہ تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دے۔ خوشیوں اور محبتوں سے بھری ایک بہت طویل عمر میری بیٹی کا نصیب ہو۔"

ان کے لہجے میں ایک باپ [illegible] اور تڑپ موجود تھی مگر یہ شدت اور [illegible] تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔

"تھینکس بابا! آپ کو یاد رہی میری [illegible]"

اس کا جواب پھر وہی غیر جذباتی اور سپاٹ [illegible] احترام تو ہمیشہ شامل ہوا کرتا تھا مگر محبت [illegible] ہوتی تھی۔ اس نے ان کے لیے اپنے جذبات [illegible] ہوئے سرد کر لیا تھا۔ اس کا یہ سرد اور یہ سپاٹ انداز [illegible] زندگی کے پچھلے کئی برسوں سے سہ رہے تھے۔

وہ غلط نہیں تھی۔ کل جب وہ چھوٹی تھی اسے ان کی ضرورت تھی تب انہوں نے اس کو نظر انداز کیا تھا۔ ماں تو اپنی بیٹیوں کے لیے بری چنی ہی تھی باپ بھی اچھے نہ بن سکے تھے۔ پھر آج جب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، انہیں اس کی یاد ستاتی ہے تب وہ ان کے پاس کیوں آئے؟ جو کل انہوں نے اسے دیا تھا، وہ آج وہی تو انہیں لوٹا رہی ہے۔ وہ پانچ سالوں سے اس سے نہیں ملے تھے، اس لیے کہ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی۔ جیسے چاہے اپنی زندگی گزارتی۔ وہ ان کے پاس مستقل رہنے کے لیے تو کیا ملنے کے لیے بھی پاکستان آنے کو کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ وہ اس سے ملنے لندن جا سکتے تھے مگر نہیں جاتے تھے کیونکہ ان کی بیٹی نہیں چاہتی تھی وہ اس سے ملنے آئیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جب وہ پاکستان واپس آ رہے تھے تب انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے مگر اسی نے اس سرد اور سپاٹ سے انداز میں انہیں صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اب اپنے وطن، اپنی مٹی سے مزید دور رہنا نہیں چاہتے تھے سو بیوی کو لے کر پاکستان چلے آئے تھے۔ دل میں یہ شدید خواہش اور یہ امید رکھتے کہ ایک نہ ایک دن کلثوم بھی ان کے پاس پاکستان آ جائے گی۔

وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بہت [illegible] جاب، اپنا شاندار کیریئر ان کی خاطر چھوڑ دے [illegible] کی یہ خواہش ضرور تھی کہ کلثوم ان کے پاس [illegible]

اپنا گھر مان لے۔ وہ یہاں مستقل نہ رہے مگر چھٹیوں میں تو یہاں آجایا کرے بالکل اسی طرح جیسے لوگ چھٹیوں میں اپنے گھر جایا کرتے ہیں۔

ان کی یہ بیٹی بہت حساس' بہت نازک تھی۔ وہ ان سے بہت خفا تھی۔ اتنی خفا کہ انہیں یہ حق دینے کو بھی تیار نہ تھی کہ وہ اسے منا سکیں' اس کی سب شکایتیں دور کر سکیں' اسے گلے سے لگا کر پیار کر سکیں' اس سے معافی مانگ سکیں اپنی سب زیادتیوں کی۔ اسے یہ بتا سکیں کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس کی زندگی کے تیرہ سالوں تک انہوں نے اسے اس طرح نظر انداز کیا تھا کہ آج خواہش رکھنے پر بھی ان تیرہ سالوں کے فاصلوں کو مٹا نہیں سکتے تھے۔

ڈٹوریا سے لڑائی جھگڑوں نے انہیں اتنا تلخ اور اپنے گھر سے اتنا دور کر دیا تھا کہ انہیں یہ تک یاد نہ رہا تھا کہ وہ صرف گھر اور بیوی کو نہیں اپنی بیٹیوں کو بھی نظر انداز کر رہے ہیں۔ خاص طور پر کلثوم کو۔ جو زیادتیاں انہوں نے اپنی اس بچی کے ساتھ اس کے بچپن میں کی تھیں' وہ آج انہیں رلاتی تھیں۔ وہ ان کا ازالہ کرنا چاہتے تھے مگر کس طرح؟ وہ انہیں اپنے قریب آنے ہی نہیں دیتی۔

اس کی نسبت مریم کے ساتھ بچپن میں انہوں نے کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ ایک تو انہیں خود ہی مریم سے پیار زیادہ تھا' وہ دکھتی جو انہیں کی طرح تھی جبکہ کلثوم کے نقوش چونکہ اپنی اطالوی ماں جیسے تھے تو انہیں خود بخود ہی اس میں ڈٹوریا نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر دیا کرتے تھے دوسرے مریم کو ان کی توجہ اور پیار حاصل کرنا آتا تھا' وہ دفتر سے گھر آتے تو مریم ان کے گھر آتے ہی ان کے کمرے میں گھس آتی' ان کے کندھے پر لٹک جاتی' ضدیں اور فرمائشیں کرتی۔ اپنی ذہانت اور خود اعتمادی سے ان کا دل موہ لیا کرتی جبکہ ان کی وہ کم بولنے والی اور بہت جھجکنے والی چھوٹی بیٹی دور دور سے انہیں دیکھتی رہتی۔

وہ مریم کی طرح اعتماد سے ان کے کندھے پر جھول نہ پاتی تھی' ضدیں نہ کر پاتی تھی۔ اسے مریم کی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلانا نہیں آتا تھا اور وہ اتنے بے حس باپ تھے کہ خود سے اس کی موجودگی کا انہوں نے کبھی احساس ہی نہ کیا تھا۔

"عائشہ بھی تمہیں سالگرہ کی بہت مبارک باد دے رہی ہے بیٹا۔" ایک گہری سانس لے کر وہ بولے تھے۔

"انہیں میرا شکریہ کہہ دیں پاپا۔" وہ خود سے نہ ان کی بات کاٹ کر یہ کہتی تھی کہ لے کہیں کام سے جانا ہے نہ فون بند کرنے کے لیے کوئی اور جواز تلاش کرتی تھی مگر اس کا گفتگو کا سپاٹ انداز اتنا ٹو دا پوائنٹ ہوتا تھا کہ چند منٹوں بعد ہی وہ ہار مان جایا کرتے تھے۔ جو وہ پوچھ رہے ہیں' وہ مختصر جواب دے رہی ہے اور پھر چپ ہو جاتی ہے۔ گویا وہ اس گفتگو کے ختم ہو جانے کا تہذیب اور اخلاق کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔

"تمہاری ایگزیبیشن میں کم دن رہ گئے ہوں گے اب؟"

"جی پاپا۔ تھرسڈے کو شو کا پہلا دن ہے۔ میں ٹیونزڈے کو فلورنس چلی جاؤں گی۔"

"اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا! میری تمام دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میری بیٹی کامیاب ہوگی تو میں سمجھوں گا۔ میں کامیاب ہو گیا اور تمہارے ساتھ میں بھی کامیاب ہو تو رہا ہوتا ہوں۔ جہاں جہاں لیزا ہوتی ہے وہاں وہاں اس کے ساتھ محمود بھی تو ہوتا ہے۔ جب بھی کہیں کسی میگزین میں یا انٹرنیٹ پر تمہارا نام دیکھتا ہوں تو ایک سرخوشی سی طاری ہوتی ہے لیزا محمود پڑھ کر۔"

اس نے ان کے رکھے نام کو ترک کر کے اپنی ماں کا اپنے لیے رکھا نام اپنے لیے تیرہ سال کی عمر میں لندن جا کر اختیار کر لیا تھا۔ بغیر ان سے اجازت لیے۔ وہ بہت برہم ہوئے تھے' بہت خفا ہوئے تھے مگر وہ اسے روک نہیں پائے تھے کہ اس آزاد معاشرے اور مغربی سرزمین کو جہاں اولاد خود مختار ہوتی ہے۔ ان کی بیٹیوں نے اپنے لیے منتخب نہیں کیا تھا' انہوں نے ان کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

آج اس کی سالگرہ کے دن محض اسے خوش کرنے

کے لیے وہ اسے یہ جتا رہے تھے کہ اس کے عبرانی نام سے جو اس نے ان کی ضد میں اختیار کر رکھا ہے 'انہیں پیار ہے اور سچ بھی یہی تھا۔ وہ لیزا تھی یا کلثوم 'وہ انہیں بہت پیاری تھی 'ساری دنیا میں سب سے پیاری۔ انہوں نے اسے دعائیں دیتے ہوئے فون بند کیا تھا۔ وہ اب چپ چپ اور بہت اداس بیٹھے تھے۔

"ہو گئی بات؟" عائشہ چائے بنا کر لے آئی تھیں۔

"ہاں۔" انہوں نے دکھ سے بھری ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا ہوا محمود! سب خیریت تو ہے ناں؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔" عائشہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرائے۔

"کیا کوئی بات ہو گئی لیزا کے ساتھ؟ کچھ کہہ رہی تھی کیا وہ؟" وہ خود کو جس نام سے بلایا جانا پسند کیا کرتی تھی 'عائشہ نے بھی اسے شروع سے اسی نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔ وہ بلاوجہ مسائل کھڑے کرنے والی عورت نہ تھیں۔

وہ لندن میں جب بھی اس بات پر دکھی ہوتے تھے کہ ان کی بیٹی نے ان کے رکھے نام کو ترک کر کے ماں کے رکھے نام کو اختیار کر لیا ہے 'تب عائشہ انہیں سمجھایا کرتی تھیں کہ وہ خود کو جس نام سے کہلوایا جانا پسند کرتی ہے اسے حق حاصل ہے 'اس نام سے خود کو کہلوانے کا اور ویسے بھی لیزا نام مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لیزا کا یہ نام اس کی اطالوی اور کرسچن ماں نے رکھا تھا۔

"وہ کچھ کہتی ہی تو نہیں ہے عائشہ! سارا دکھ ہی اس بات کا ہے۔ وہ کچھ کہتی نہیں ہے۔" وہ اداسی سے بولے تھے۔ "وہ خود کو مجھ سے اتنا دور لے گئی ہے کہ اب میں لاکھ چاہوں اسے اپنے نزدیک نہیں کر پاتا۔ وہ مجھ سے ایک بار جھگڑا ہی کر لے 'میری زیادتیاں ہی مجھے گنوا دے۔ اس کا یہ سرد اور غیر جذباتی انداز دل کو بہت تکلیف دیتا ہے عائشہ!"

وہ دکھ سے بھرے لہجے میں بے بسی سے بول رہے تھے۔

"وہ کبھی نہ کبھی اسے آپ کی ... آئے گا محمود۔ لیزا دل کی بہت اچھی ... شفاف دل ہے اس کا۔ وہ ہمیشہ آپ ... رہ سکے گی۔" عائشہ نے نرم لہجے میں ... تھا' آہستگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ ... کے دل کا درد بانٹنا چاہا تھا۔

"ہاں۔ بہت سادہ اور شفاف دل ہے میری اس ... کا۔ اسی لیے ڈرتا ہوں عائشہ! اسی لیے بہت ڈرتا ہوں۔"

انہوں نے کرب سے لب بھینچے تھے۔ جو وہ اس پل سوچ رہے تھے وہ بیوی سے شیئر نہیں کر سکتے تھے وہ وہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ مگر وہ بات انہیں ڈراتی بہت تھی۔ کاش ان کے سب ڈر غلط ثابت ہو جائیں 'ان کی اس پیاری بیٹی کی زندگی میں سب کچھ بہت اچھا ہو جائے۔ ان کی ضد میں وہ خود کو مزید کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

☼ ☼ ☼

ہاشم ٹیرس پر کھڑا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ مریم ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔ وہ کئی بار اسے کال کر چکا تھا۔ وہ اس کا فون پک نہیں کر رہی تھی۔ کراچی کے حالات اکیلی لڑکی کے لیے اتنے بھی اچھے نہ تھے کہ رات گئے تک گھر سے باہر وقت گزار دیا جائے۔ اس نے چوکیدار کو گیٹ کھولتے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

مریم کو گاڑی اندر لاتے دیکھ کر جہاں اس نے سکون کا سانس لیا وہیں اتنی رات گئے تک اس کی گھر سے غیر موجودگی پر اس کا غصہ بھی پھر عود آیا۔ کافی دیر سے مریم کی فکر اور پریشانی میں وہ اپنے غصے کو بھول گیا تھا۔ اب جب وہ بحفاظت گھر پہنچ گئی تھی تب اس کا موڈ خراب ہوا۔

وہ ٹیرس سے اپنے کمرے میں آیا۔ چند ہی ... میں کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مریم اندر داخل ہوئی

تھی۔ اس کی بے تحاشا حسین اور کم عمر بیوی جس سے اسے عشق تھا۔ جس کے عشق میں، جسے اپنا بنانے کی چاہ میں اس نے اپنے بیوی بچوں تک کی پروا نہ کی تھی۔

"اب تک جاگ رہے ہو؟ سوئے نہیں؟" حیرت سے اسے دیکھتی وہ اپنا پرس صوفے پر اچھالتی بیڈ پر بیٹھ کر سینڈلز اتارنے لگی تھی۔

"تم کہاں تھیں مریم؟ یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا؟" اس نے خفگی و ناراضی سے اسے دیکھا۔

"واٹ ڈو یو مین کہاں تھی؟ میں نے صبح ہی تمہیں بتایا تھا۔ آج مجھے ایک چیریٹی شو میں جانا ہے۔"

مریم نے سینڈلز اتارتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"رات کے دو بجے تک؟" ہاشم برہمی سے بولا۔

"ہاں تو شو دیر سے شروع ہوا' میں کیا کرتی۔ کوئی تفریح نہیں کر رہی تھی میں۔ اس کنسرٹ کا سارا پیسہ کینسر کے مرض میں مبتلا غریب بچوں کو ڈونیٹ کیا جائے گا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری بیوی ایک سوشل ورکر ہے۔ سوسائٹی کے جو depeived اور پس ماندہ لوگ ہیں ان کی ویلفیئر کے لیے کام کر رہی ہے۔"

مریم اس سے زیادہ تیز لہجے میں بولی تھی' وہ اسے ناراضی سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں ایٹ لیسٹ مجھے انفارم تو کرنا چاہیے تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ اوپر سے میرا فون بھی ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ میں پریشان ہو رہا تھا مریم تمہارے لیے۔ اتنی دیر ہونی ہوتی ہے تو کم از کم ڈرائیور کے ساتھ جایا کرو۔ اکیلی لڑکی کے لیے اتنی رات کو ڈرائیو کرنا بالکل بھی محفوظ نہیں ہے۔"

مریم کی ٹون بدلتے دیکھ کر اس نے فوراً" ہی مدافعانہ انداز میں کہا تھا۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اس وقت میں کچھ لوگوں کے ساتھ ضروری بات چیت کر رہی تھی' اس کے بعد جب تمہاری کال آئی تو ڈنر چل رہا تھا' نیکسٹ ٹائم محتاط رہوں گی کہ جا ہے جس جس تقریب میں ہوں اور جس سے بھی بات کر رہی ہوں تمہاری کال فوراً [illegible] [illegible] dominate کرنے کے [illegible] صاحب کو اس سے تسکین ملتی ہے [illegible] dominance کو قبول کروں۔"

مریم نے سینڈلز ٹانگز والے فرش پر زور سے پٹخے تھے۔ وہ غصے میں وہاں سے فوراً" ہی اٹھی تھی۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا مریم! بس میں تمہارے لیے فکر مند ہو رہا تھا۔" اسے خفا ہوتا دیکھ کر وہ فوراً" وضاحتی انداز میں بولا تھا مگر مریم اس کی بات ان سنی کر کے لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔

وہ چپ چاپ سا ہو کر بیڈ پر آکر لیٹ گیا تھا۔ وہ ضدی تھی' وہ غصے کی تیز تھی مگر وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے ناراض کرنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سے چھوٹی بھی تو بہت ہے۔ کیا اس کی عمر میں وہ ضدی اور غصے کا تیز نہیں تھا؟

مریم کی بدتمیزی پر تھوڑی دیر کے لیے ہی کبیدہ خاطر ہوا ہو گا کہ اس کے دل نے اس سے پوچھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ ضدی اور غصے کا تیز تھا۔ اس نے خود کو فوراً" ہی پندرہ سال پیچھے لے جا کر سوچا تھا۔ اس نے شریک حیات بنانے کے لیے ایک شہزادی کا انتخاب کیا تھا۔ ایک غیر معمولی لڑکی کا انتخاب کیا تھا تو اس کے شایان شان اس کے ناز نخرے بھی تو اٹھانے تھے۔

ام مریم ہاشم کوئی عام سی لڑکی تو نہیں تھی یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی' وہ اس کی زندگی میں شامل تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا' تین بچوں کا باپ تھا۔ وہ اس کی سب ضدیں پوری کرتا تھا' وہ اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کرتا تھا۔ اللہ نے اسے بہت کچھ دے رکھا تھا' وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا' پیسے کی اس کے پاس فراوانی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ مریم کے منہ سے نکلی ہر خواہش پوری کرے اور وہ پوری کرتا بھی تھا۔ نہ محبت میں اور نہ ہی پیسے میں' وہ اس کے

لیے کسی بھی چیز میں کوئی کمی نہیں رکھتا تھا۔
اس کی شدید خواہش تھی کہ مریم اس کے بچے کی ماں بنے۔ وہ بیٹا ہو یا بیٹی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، بس وہ مریم کے جیسا ہو۔ اس کی اور مریم کی اولاد، اسے سوچ کر ہی اتنی خوشی ملتی تھی اس بات کو۔ مگر مریم ابھی اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی ابھی وہ اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ بچے کے بعد اس کا فگر خراب ہو جائے گا۔ اس کی لائف ڈسٹرب ہو جائے گی۔

جب وہ زیادہ اصرار کرتا تو وہ کہتی تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ اس کے پاس تو پہلے ہی تین تین بچے ہیں، جن کا وہ باقاعدگی سے خرچا بھی ان کی ماں کو بھیجا کرتا ہے۔ آخر ایک اور بچے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ اس ضدی لڑکی کو کیسے سمجھاتا، وہ بچہ ان کا ہوگا۔ اس کا اور مریم کا ہوگا۔ اس بچے کی بات ہی الگ ہوگی۔

آخری بار ان کی بچے کے موضوع پر بات ہوئی تو مریم نے کہا تھا، وہ تین سال بعد سوچے گی اس بارے میں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ کوئی اس کی عمر نہیں گزری جا رہی جو آنا" فانا" وہ ماں بننے کا فیصلہ کرلے یہ سوچ کر کہ اس کے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ چلو تین سالوں ہی کی تو بات ہے، اس نے خود کو مزید تین سال انتظار کرنے پر آمادہ کرلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی توقع کے مطابق صبح مریم اس سے خفا تھی۔ وہ ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ موجود ضرور تھی مگر اس سے بات بالکل بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کیے جوس کے گھونٹ لیتی ہوئی اخبار کی ہیڈ لائنز دیکھ رہی تھی۔

"اب یہ ڈائٹنگ بس بھی کردو مریم کچھ نہیں ہوا ہے تمہارے فگر کو۔ اتنی حسین اور اسمارٹ میری بیوی کو کسی ڈائٹنگ وائٹنگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

"یار! اب غصہ ختم بھی کردو۔ اوکے میری غلطی تھی، مجھے پتا ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح کے پروگرام میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے منانے والے انداز میں بولا۔

"ٹون دیکھی تھی تم نے اپنی؟" مریم نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اچھا ناں یار! آئم سوری۔ معافی مانگ تو رہا ہوں۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔"

"ساری زندگی مجھ سے اس طرح کسی نے تیز آواز میں بات نہیں کی ہے ہاشم! مجھے اونچی آواز میں بات سننے کی عادت نہیں ہے۔ تمہارے کل کے بی ہیویر سے میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔"

"آئم سوری یار۔ پلیز غصہ ختم کرو۔ چلو ویک اینڈ کا کوئی پروگرام رکھ لیتے ہیں۔"

وہ بڑے دل سے اسے منا رہا تھا۔ یہ ناز، یہ نخرے اس پر سجتے تھے اور وہ اس کے ناز، نخرے اٹھانے میں بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔

"کیسا پروگرام؟" شکر تھا، بڑی دیر کے بعد وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"دبئی چلتے ہیں۔ میں اس ویک اینڈ پر اپنی چہیتی مسز کو دبئی میں دل بھر کر شاپنگ کرانا چاہتا ہوں۔"

"بس دو دن کے لیے جائیں گے ہاشم! منڈے کو میری بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے۔ ایک نیا اسکول کھول رہے ہیں ہم لوگ کراچی کی ایک کچی آبادی میں۔ اس سلسلے میں سب ڈیٹیلز طے کی جانی ہیں۔"

وہ جانے کے لیے بھی تھوڑا نخرا دکھا کر ہی تیار ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر سر اثبات میں ہلا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا، وہ دبئی میں مریم کو اتنی مہنگی شاپنگ کرائے گا کہ اس کا دل خوش ہو جائے گا۔ جس چیز پر وہ ہاتھ رکھے گی وہ اسے دلائے گا۔

☼ ☼ ☼

"دادی جان یہ تون ہیں؟"
علی اپنی غیلیتھی اور توتلی زبان میں امو جان سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے ماں، باپ کو دادی جان اور دادا جان

بڑے بیٹھے لہجے میں بولا کرتا تھا' موڈ اچھا نہ بھی ہو تو بھی خود بخود ہی مسکراہٹ لبوں پر آجائے۔ مگر اس پل وہ البم میں جس تصویر کے اوپر ہاتھ رکھ کر یہ بات پوچھ رہا تھا' اسے دیکھ کر وہ بیٹے کی میٹھی آواز سن کر بھی مسکرا نہ سکا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ تمام افراد لاؤنج میں ساتھ بیٹھے تھے۔

نویرہ سب کے لیے کافی بنا کر لے آئی تھی۔ ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ شہریار خان ہلکی آواز میں کرنٹ افیئرز کا کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ بے تحاشا شرارتی اور ادھر ادھر مختلف چیزوں میں گھسنے کا شوقین علی نجانے کہاں سے ایک پرانی البم اٹھا لایا تھا۔

"دادا جان! آپ بھی دیکھیں۔" علی نے ٹی وی دیکھتے دادا کو متوجہ کیا۔ اپنے وقت کے بڑے رعب و دبدبے والے اس کے پاپا بھی علی کی کوئی بات نہیں ٹالا کرتے تھے۔

وہ زین شہریار جو باپ سے کبھی اپنی کوئی ضد نہ منوا سکا تھا' اپنے بیٹے کو منواتا دیکھ کر مسکرا دیا کرتا تھا۔

"دکھاؤ بھئی علی کون سی پکچرز ہیں۔" وہ فوراً" متوجہ ہوئے۔

"یہ والی۔" علی نے تصویروں پر انگلی رکھ کر بتایا۔ شہریار خان مسکرا دیے تھے۔ اموجان علی کے سوالوں کے جواب دے رہی تھیں۔ وہ پوچھتا جا رہا تھا' یہ کون ہے اور وہ کون ہے۔

"یہ تمہارے دادا جان ہیں' یہ میں ہوں' یہ تمہارے پاپا ہیں اور یہ۔"

وہ تصویر میں موجود اگلے فرد کا تعارف نہیں کرا پائی تھیں۔ یہ اس کے بچپن کے دنوں کی ایک گروپ فوٹو تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی بالکل چپ ہو گئی تھیں۔

اس نے ماں پر سے فوراً" ہی نظریں ہٹالی تھیں۔ ماں' ماں ہوتی' وہ اس کی بھی ماں تھی اور اس شخص کی بھی۔ جس طرح اس شخص کے لیے کبھی وہ اپنا دل نہیں بدل سکتا اسے معاف نہیں کر سکتا' ایسے ہی اس کی ماں بھی اپنا دل نہیں بدل سکتی۔ جب سے ماں اس شخص کی یاد میں بیمار پڑی تھیں' وہ ماں ... بہت سمجھنے لگا تھا۔ ماں اس سے ... ہے' وہ جانتا تھا۔ اگرچہ یہ فون ... تنہائی میں کی جاتی تھیں مگر اس کے ... علم میں تھیں۔

اس کی بیمار ماں اگر اس شخص سے ملنے کی ... اظہار کرتی تب بھی وہ ماں کی ممتا کو حق بجانب ... جب سے وہ بیمار پڑی تھیں شہریار خان نے اپنے ... اور بے لچک انداز کو تھوڑا سا تبدیل کر لیا تھا۔ رہ گیا وہ ... تو وہ تو اس شخص سے زندگی کے آخری لمحے تک نفرت کرتا رہے گا۔ وہ دعا کرے گا کبھی اس کی شکل دیکھنے کی نوبت نہ آئے مگر اس کی ماں اگر اس شخص سے بات کرنا اور ملنا چاہتی تھی تو یہ اس کا حق تھا۔

"دادی جان! یہ کون ہیں؟" اس کا ذہین بیٹا تصویر میں موجود چوتھے فرد کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس نے نظریں علی' اموجان اور اپنے باپ سے ہٹا کر ٹی وی کی جانب کر لی تھیں یوں جیسے نہ تو اس نے کچھ سنا تھا اور نہ کچھ دیکھا تھا۔

"یہ تمہارے پاپا کے بھائی ہیں علی!"

اموجان نے آہستگی سے کہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں بھائی کے لفظ پر۔ وہ بیمار ماں اور اپنے بہت معصوم اور چھوٹے سے بیٹے کا خیال کر کے چپ تھا۔

"پاپا کے بھائی ... دادی جان ان کا نام؟" اس نے ٹی وی کی آواز تیز کر دی تھی۔ وہ خود کو مکمل طور پر ٹی وی میں مگن ظاہر کر رہا تھا۔

"ان کا نام سکندر ہے۔" اس کے کانوں میں ماں کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ انہوں نے البم کا صفحہ جلدی سے یوں پلٹا تھا جیسے علی کے مزید کسی بھی ہر کانہ سوال کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

"علی! چلو' تمہارے سونے کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

نویرہ بڑی سمجھ دار لڑکی تھی۔ علی کی ... اٹکی دیکھ کر اس نے اسے وہاں سے اٹھا ...

"ماما! ابھی نہیں ناں۔" علی نے ...

"بچے دیر تک نہیں جاگتے علی! چلو شاباش ابھی ہمیں بہت اچھی اسٹوری بھی تو سننی ہے۔"

وہ علی کو گود میں اٹھا کر اس سے سونے سے پہلے اور سو کر اٹھنے کے بعد کیا کیا کریں گے والے اس کی پسند کے وعدے کرتی اسے وہاں سے لے جا رہی تھی۔ ماں کے خیال سے وہ ضبط کر رہا تھا مگر نویرہ نے اس کی فیلینگز کو سمجھ لیا تھا اور وہ علی کو ہی وہاں سے لے گئی تھی۔

اس نے قصداً" نظریں ٹی وی پر رکھیں۔ نہ ماں کی طرف دیکھا نہ باپ کی طرف۔ وہ وہاں مزید چند منٹ بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے ایک دم اٹھ جانے پر ماں کا دل رنجیدہ نہ ہو۔ اس شخص سے نفرت اپنی جگہ مگر بار بار ماں کا دل دکھایا جانا ضروری تو نہ تھا۔ بغیر ماں باپ کی طرف دیکھے بھی وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی ماں اپنے آنسو پی رہی ہو گی اور شہریار خان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر ہو گیا' ایسا کہ ان کے اندر کی کوئی ایک بھی سوچ پڑھی نہ جا سکے۔

یہاں اس کے گھر میں صرف شہریار خان ہی ایسے نہ تھے جو اپنی سوچیں اور اپنے جذبات اپنے ہی تک رکھتے تھے بلکہ آمنہ شہریار خان اور وہ خود بھی تو ایسا ہی کرتے تھے۔ اس شخص کے ان کی زندگیوں سے نکلنے کے بعد سے ان باقی بچے تین افراد کے مابین بھی ایک دیوار اور ایک کبھی نہ مٹنے والی خلیج پیدا ہو گئی تھی۔

وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی الگ دنیاؤں میں رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے دل کا حال چھپائے ہوئے' ایک دوسرے سے اپنے غم چھپائے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

وہ بیڈ پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نویرہ بیڈ پر اس کے برابر آکر لیٹی تھی۔

"علی سو گیا؟"

"ہاں۔" وہ جواباً" مسکرائی تھی۔

"ضد کر رہا تھا آج دادی جان کے پاس سوؤں گا۔ امو جان کے پاس لٹا کر آئی ہوں۔ نیند گہری ہو جائے تو یہاں لے آؤں گی۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس چیز سے ڈسٹرب ہوا ہے' اس لیے اس کی غیر معمولی خاموشی کی وجہ سے نہیں پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو بغور دیکھنے لگی۔

"آپ کے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں زین؟"

"اچھا۔" وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ "تمہیں تو میں پورا کا پورا ہی بہت خوب صورت لگتا ہوں۔" وہ محظوظ ہونے والے انداز میں بولا تھا۔

نویرہ ساڑھے تین سال قبل اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ شہریار خان کے ایک دوست کی بیٹی تھی مگر اس کا انتخاب امو جان نے کیا تھا اور اس کی شادی کے لیے اصرار امو جان اور شہریار خان دونوں ہی نے کیا تھا۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ اس کی شادی ہو جائے تاکہ ان کے گھر کا سناٹا دور ہو سکے۔

شادی کبھی نہ کبھی تو کرنی ہی تھی تو ماں کی خواہش پر کیوں نہیں' ماں کی پسند سے کیوں نہیں؟ اس نے اپنے لیے لڑکی کا انتخاب امو جان پر چھوڑ دیا تھا۔

نویرہ امو جان کی پسند تھی اور انہوں نے حقیقتاً" اس کے لیے ایک بہت ہی اچھی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ محبتوں سے گندھی' نرم خو اور سب کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ نویرہ اور پھر علی کے آجانے کے بعد ان کے گھر کا سناٹا ٹوٹ گیا تھا' یہاں پھر سے رونق آگئی تھی۔

نویرہ اس کے لیے بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی' اس کے والدین کے لیے بہت اچھی بہو اور اس کے بیٹے کی بہت اچھی ماں۔ بارہ سال قبل اس گھر لنے میں کیا طوفان آیا تھا' ایسی کون سی آندھی آئی تھی جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔ نویرہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ اور اس نے بھی بتایا نہیں تھا۔

وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس گھر میں سکندر شہریار کا

نام نہیں لیا جاتا' اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ سو ایک اچھی بیوی اور بہو ہونے کے ناتے' وہ اس پابندی کا احترام کرتی تھی۔

بہت حسین' محبت کرنے والی' وفا شعار بیوی' پیارا سا بیٹا' کامیاب کیریر اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو ایک کامیاب اور زندگی سے خوش شخص کے پاس ہونا چاہیے۔ بطور لائر اس کا کیریر شاندار تھا۔ اس کی لاء فرم اپنی بہت اچھی ریپوٹیشن بنا چکی تھی اور پاکستان کی نمایاں فرمز میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی فرم کے کراچی کے ساتھ ساتھ اسلام آباد' لاہور اور کوئٹہ میں بھی دفاتر تھے۔ یو کے اور چائنا میں بھی اس کی فرم کئی نمایاں فرمز کے ساتھ مل کر کئی اہم کیسز پر کام کر رہی تھی۔ شہریار خان ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے خاندانی بزنس کو سنبھال رہے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ کاروبار میں شامل ہونے کے بجائے اپنی لاء فرم اسٹیبلش کی تھی۔ شہریار خان اور امو جان اس سے پہلے ہی امریکہ سے پاکستان واپس آگئے تھے۔ وہ اپنی لاء کی ڈگری مکمل کر کے ان کے پاس پاکستان چلا آیا تھا۔ جہاں اس کے ماں' باپ رہنا چاہتے تھے وہ بھی وہیں رہنا چاہتا تھا۔

ساری زندگی امریکہ میں گزارنے کے باوجود امریکہ اس کے لیے اہم نہیں تھا۔ اس کے لیے اہم وہ جگہ تھی جہاں اس کے ماں باپ رہنا چاہتے تھے۔ وہ ایک کامیاب انسان تھا' اسے زندگی سے خوش ہونا چاہیے تھا مگر نجانے وہ پورے دل سے خوش کیوں نہیں ہو پاتا تھا۔

"آپ کو بھی میں خوب صورت لگتی ہوں یا نہیں لگتی؟" نورہ اسے خیالوں سے کھینچ کر لائی۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی نورہ کے ہاتھ میں تھا۔

"تم مجھے بہت خوب صورت لگتی ہو۔ لگتی کیا ہو تم ہو ہی بہت خوب صورت۔"

"بہت دنوں کے بعد میری تعریف کر رہے ہیں تو یہ بھی کہہ دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کافی عرصہ ہو گیا آپ کو یہ بات کہے ہوئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ نے آخری بار [illegible] پیدائش کے دن بولا تھا۔"

وہ شرارتی سے انداز میں بولی۔ وہ [illegible] پڑا۔

"ڈھائی سال گزر گئے' یہ تو بہت بڑی زیادتی [illegible] میری طرف سے اوکے تو مسز نورہ زین شہریار! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آئی لو یو۔"

وہ اس کی طرف جھک کر بولا وہ اس کے لیے بہت اہم تھی' اس کے بیٹے کی ماں تھی۔ وہ اس کی بہت پروا کرتا تھا۔ وہ پورا کا پورا نورہ کا تھا' سو فیصد اس کے ساتھ مخلص' وفادار مگر اپنے دل پر اس کی گرفت نہ تھی۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں آج بھی وہی لڑکی بسی تھی۔ جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔ جس نے اسے محبت کیا ہوتی ہے بتایا تھا۔

وہ ام مریم پتا نہیں آج کہاں ہو گی۔ کیسی ہو گی۔ اس نے شادی کی ہو گی یا نہیں' وہ خوش ہو گی اپنی زندگی میں کہ نہیں؟ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے یاد بھی نہیں کرتا تھا' وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا مگر بارہ سال بعد بھی وہ اسے بھلا نہیں سکا تھا۔ سچی محبت تو زندگی میں ایک بار ہوتی ہے' صرف ایک بار۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی' جیسی بھی زندگی گزار رہی تھی مگر اسے یقین تھا وہ اسے بھول نہیں پائی ہو گی' وہ اسے یاد کرتی ہو گی۔ جس طرح اس کے دل سے اس کی محبت نہیں نکل سکی' اس طرح اس کے دل سے بھی اس کی محبت نکل نہیں سکی ہو گی۔

☆ ☆ ☆
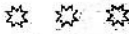
وہ ایک کلائنٹ کے ساتھ لنچ کر کے باہر نکلا تھا۔ آفیشل نوعیت کے اس لنچ میں پروفیشنل گفتگو ہی رہی تھی۔ کلائنٹ سے خوش اخلاقی سے مصافحہ کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کئی طرح کے دفتری کاموں میں اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ابھی آفس پہنچتے ہی اسے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ پھر اپنی سیکریٹری سے ایک اہم کانٹریکٹ ٹائپ کروانا تھا۔ ایک دو [illegible]

کمپنی کے ان کی کمپنی کے ساتھ Merger کا معاہدہ تھا جسے وہ ڈرافٹ کر کے اپنی میز پر چھوڑ آیا تھا۔ ان تمام آفیشل باتوں کو سوچتے ہوئے وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا جب اس کے نزدیک سے سرخی مائل براؤن بالوں والی ایک لڑکی گزری۔

"لیزا۔" بے اختیار اس کے لبوں سے مدھم آواز میں نکلا تھا۔ لڑکی اس کے نزدیک سے بہت تیزی سے گزرتی ہوئی گئی تھی وہ ٹھیک سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر وہ لیزا ہی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ لیزا تھی۔ اس کے بال سرخی مائل براؤن تھے، سلکی تھے، وہ لیزا تھی۔

وہ وہاں میں کیا کر رہی ہے؟ یہ وہ بعد میں اس سے پوچھے گا، پہلے اس سے مل تو لے۔

"لیزا!" اس نے اسے پکارا مگر تب تک وہ لڑکی بہت تیزی میں سامنے نظر آتے شاپنگ مال میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس کی پکار نہیں سنی تھی۔

وہ بے ساختہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ شاپنگ مال کے اندر داخل ہوا تو بلیک کلر کیپری پینٹ، ریڈ کلر کے اسٹائلش ٹاپ کے ساتھ پہنے وہ اسے ایسکیلیٹر پر اوپر جاتی نظر آئی۔ اتنی دور سے چلا کر آواز دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا ایسکیلیٹر پر چڑھا تھا۔ وہ مال کی پہلی منزل پر اترا تو وہ اسے سامنے ایک زنانہ ملبوسات کی شاپ میں داخل ہوتی نظر آئی۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار انتہائی تیز کر دی تھی۔

"ہائے لیزا!" وہ نیل پالش سے سجے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے ہینگر میں ٹنگے مختلف ملبوسات کو آگے پیچھے کر کے دیکھ رہی تھی جب اس کے قریب پہنچ کر وہ بولا۔ لڑکی نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ انگریزی میں بولی۔

اس پر شدید ترین مایوسی اور پھر شرمندگی کا حملہ ہوا۔ وہ تو کوئی اور تھی۔

"آئم سوری۔ میں آپ کو کوئی اور سمجھا تھا۔ آئم ایکسٹریملی سوری۔"

"اٹس اوکے۔" اخلاقاً ہلکا سا مسکرائی تھی جیسے اس کی غلط فہمی سمجھ گئی ہو۔

وہ لیسے دیکھتا اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔ وہ یورپین تھی، شاید اسپینش یا پھر اٹالین، بہت اسٹائلش انداز میں تیار تھی اس کے شانوں تک آتے سلکی بال سرخی مائل براؤن کلر کے ہی تھے۔ وہ سرخی مائل براؤن بالوں کو دیکھ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا کیا ہر یورپین لڑکی جس کے سلکی بال شانوں تک آتے ہوں گے، سرخی مائل براؤن کلر کے ہوں گے وہ اس کے پیچھے یونہی دوڑا دوڑا پہنچے گا؟

اپنی حماقت پر اسے غصہ آیا تھا۔ یہ ایک انتہائی احمقانہ اور بچگانہ حرکت تھی۔ وہ شاپنگ مال سے واپس نکل آیا تھا۔ مگر وہ لیزا کیوں نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

"چاؤ سینور سکندر۔" اس کے نزدیک سے آواز آئی۔ وہ اختیار گھوما۔

"لیزا۔" وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پچھلے کافی سارے دنوں سے اس کی باتوں اور اس کی یادوں کے ساتھ بہت خوش تھا مگر آج اس سرخی مائل براؤن بالوں والی یورپین لڑکی کو دیکھ کر وہ بہت بے چین اور بے قرار ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی لیزا کیوں نہیں تھی؟ وہ کوئی اور کیوں تھی؟ وہ لیزا بھی تو ہو سکتی تھی۔

جب لیزا محمود روم، لندن، فلورنس ہر جگہ گھوم پھر سکتی تھی۔ تو دوہا بھی تو آسکتی تھی۔

وہ لیزا کیوں نہیں تھی؟ لیزا محمود دوہا کیوں نہیں آئی تھی؟

باقی آئندہ شمارے میں

جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ رام ٹیں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

زین کی زندگی میں زین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پروپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بداخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم، زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ امو جان رو رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں، وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے، ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوہا چلا جاتا ہے لیزا کو ہر ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم، محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بدتمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوہا میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

ساتویں قسط

وہ بجھے دل سے فلورنس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فلورنس میں اپنی چار روزہ ایگزیبیشن کے بعد اسے لندن واپس چلے جانا تھا۔ اس کی چھٹیاں اب ختم ہو جانی تھیں پھر لندن میں واپس اس کی روٹین لائف شروع ہو جانا تھی۔ کالج، فلیٹ، پینٹنگز، مصروف زندگی، ٹف شیڈول۔ نینی اس کے واپس جانے پر ہمیشہ کی طرح بہت دل گرفتہ تھیں۔ چھٹیوں کے آغاز پر جب وہ یہاں آتی تھی تو وہ کھل جاتی تھیں، جیسے جیسے اس کی واپسی کے دن قریب آتے جاتے وہ چپ چپ سی رہنے لگتی تھیں۔ حالانکہ لندن جا کر بھی وہ ان سے فون پر روزانہ نہیں بھی تو ایک آدھ دن چھوڑ کر تو بات کرتی ہی تھی مگر وہ اسے پھر بھی یہاں مس کرتی تھیں۔ وہ پیکنگ میں اس کی مدد کر رہی تھیں۔

"لندن جا کر اپنا خیال رکھنا لیزا۔" اس کا سامان رکھتے رکھتے وہ اس سے بولی تھیں۔

"میں اپنا خیال رکھوں گی نینی۔" اس نے مسکرا کر

انہیں یقین دلایا۔ وہ جانتی تھی [illegible] چاہتی ہیں کہ وہ سکندر کو بھلا کر زندگی [illegible] شروع کرے۔ مگر ما کی تعطیلات [illegible] اور اجنبی کو پردیسی اور اجنبی ہی [illegible]۔ کاش بھلا دینا اتنا آسان ہوا کرتا۔

"میں اوپر سے اپنا سامان لے آؤں۔" مسکرا کر [illegible] کو اپنے بہت مضبوط ہونے کا یقین دلاتی وہ کمرے سے نکلی تھی۔ لونگ روم میں رکھے فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ وہ سیم تھی۔

"کیسی ہو لز؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنا سناؤ۔ کیا تم فلورنس آ رہی ہو؟" بہن کی آواز سن کر دل خوش ہوا تھا' وہ مسکرائی تھی۔

"لز میرا پورا ارادہ تھا فلورنس آنے کا۔ مگر ہاشم کے کزن کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے دبئی میں۔ میں ہاشم کے ساتھ وہ شادی اٹینڈ کرنے دبئی جا رہی ہوں۔ حالانکہ میں نے تین مہینوں سے ہاشم سے کہہ رکھا تھا کہ میں نے اگست میں اٹلی جانا ہے۔ لز کا سولو شو ہے وہ بھی فلورنس میں۔ اس وقت "ہاں ہاں چلی جانا" ہوتا رہتا تھا اور اب جب میں تمہارے پاس آنے کا سارا پروگرام بنا چکی تھی تو آرڈر دیا گیا میرے خاندان کی بہت قریبی اور اہم شادی ہے' ہمیں دبئی جانا ہے۔ سیدھا سیدھا حکم سنا دیا گیا۔ میں کیا چاہتی ہوں' میری کیا مرضی ہے' وہ تو اہم ہے ہی نہیں ناں۔ لز! میں تم سے سچ کہتی ہوں زندگی میں کبھی بھول کر بھی کسی پاکستانی مرد سے شادی مت کرنا۔ یہ بیوی کو ڈی گریڈ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ میں اپنی بہن کے پاس اتنی خوشی خوشی جانے کی کیوں تیاری کر رہی ہوں' میری ذرا سی خوشی برداشت نہیں ہوئی ہاشم سے' صرف مجھے تمہارے پاس جانے سے روکنے کے لیے دبئی جانے کا پروگرام آناً "فاناً" بنا لیا گیا۔"

سیم کا غصے سے بھرا لہجہ دکھ لیے ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس نہ آسکنے کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ سیم کا جب [illegible]

[illegible] خوش ہونے کے [illegible] لیزا کو ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ وہ آج تک اس سے بھی ملی نہیں تھی۔ بہن کی زندگی برباد کرنے والے اس شخص سے وہ ملنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

"کوئی بات نہیں سیم! تم آؤ یا نہیں آؤ' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو تمہاری دعائیں ہیں اور وہ میں جانتی ہوں ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔"

اس کا دل سیم کے اوپر ہونے والے اس جبر پر بہت دکھا تھا مگر وہ بظاہر مسکرا کر بولی تھی۔ جیسی بھی ہوئی تھی۔ اب سیم کی شادی ہو چکی تھی' سیم اپنی شادی کو نبھانا چاہتی تھی۔ جب وہ فیملی شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ سیم نے ہاشم کے ساتھ اپنے رشتے کو زندگی بھر کے لیے قبول کر لیا ہے۔ ہاشم تو پہلے ہی تین بچوں کا باپ تھا۔ اسے مزید بچوں کی کیا خواہش ہو سکتی تھی مگر سیم اس سے گفتگو کے دوران بارہا یہ ذکر کرتی تھی کہ وہ اب ماں بننا چاہتی ہے۔ مگر ہاشم مانتا نہیں ہے۔ وہ مزید بچے نہیں چاہتا۔

"ہاں دعائیں تو ہیں مگر لز! میری خواہش تھی میں بھی تمہارے ساتھ وہاں ہوتی۔ ہمارے اٹالیہ میں ہو رہی ہے اس بار تمہاری ایگزیبیشن۔"

سیم نے دکھ سے بھری ایک سانس لی پھر فوراً" ہی لہجے کو ہشاش بشاش بنا کر بولی۔

"خیر چھوڑو اس بات کو' تم مجھے یہ بتاؤ۔ تمہارا کام تو پورا ہو گیا ناں؟ جانے کی تیاری کر لی؟"

"میری سب پینٹنگز کمپلیٹ ہو گئی ہیں سیم! جانے کی تیاری بھی پوری ہے۔"

"مجھ سے فون پر کانٹیکٹ میں رہنا لز! میرا دل تمہاری ایگزیبیشن ہی میں لگا رہے گا۔"

"آف کورس سیم! یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے۔"

[illegible] کو محسوس کر رہے تھے۔
[illegible]

* * *

[illegible] میں تھا۔ رات کا وقت تھا۔ لنچ میں وہ [illegible] کھانے کے بعد اس نے ڈنر میں اپنے لیے پاستا بنایا تھا۔ کھانے کو ذائقہ محسوس کر کے کھانا اس نے عرصہ ہوا چھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی اب جب بھی کبھی اٹالین ڈشز اس کے سامنے آتیں چاہے وہ کسی پارٹی میں ہوتا یا کہیں کسی کے ساتھ لنچ یا ڈنر کر رہا ہوتا وہ انہیں ذائقہ محسوس کر کے کھاتا تھا۔ وہ انہیں کسی کو سوچتے کسی کو یاد کرتے ہوئے کھاتا تھا۔ کوئی تھا جسے اپنی اٹلی کی ہر شے سے بہت پیار تھا۔ وہ اس کے پیار کو یاد کر کے اٹالین فوڈ کھاتا تھا۔ وہ گروسری کے لیے گیا تو گروسری اسٹور پر خوب ڈھونڈ کر اور چھان پھٹک کر اس نے اپنے لیے اٹالین چیز خریدی تھی۔ زیتون بھی وہ اسپین سے امپورٹ کیے ہوئے نہیں بلکہ اٹلی سے امپورٹ کیے خرید کر لایا تھا۔ اٹالین پنیر اور زیتون شامل کر کے اس نے اپنے لیے پاستا تیار کیا تھا۔

وہ پلیٹ میں پاستا لیے لیونگ روم میں ہی آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پاستا کو انجوائے کر رہا تھا' ریموٹ سے اس نے ٹی وی بھی آن کر لیا تھا۔ ہسٹری چینل لگا تھا۔ وہاں اس وقت دنیا کی چند مشہور اور تاریخی اہمیت کی حامل آرٹ گیلریز کے اوپر ڈاکومنٹری آرہی تھی۔

وہ شوق اور دلچسپی سے اس پروگرام کو دیکھنے لگا تھا۔ ان مشہور گیلریز میں اب فلورنس کو دکھایا جا رہا تھا۔

وہاں کی مشہور آرٹ گیلریز کا ذکر ہو رہا تھا۔ اب اس میں اس مشہور آرٹ گیلری کو دکھایا جا رہا تھا جہاں لیونارڈو ڈاونچی سمیت کئی اور نامور مصوروں کا کام موجود تھا۔

"نیکسٹ منتھ فلورنس میں میری پینٹنگز کا سولو شو ہے۔" کھانا کھاتے اس کا ہاتھ رک گئے تھے۔

"ایگزیبیشن میں یہ میری سب سے بہترین پینٹنگ ہوگی۔"

اس کے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ یہاں بیٹھے بیٹھے ٹائیوولی کے باغات میں اسی فوارے کے سامنے پہنچ گیا تھا جہاں بیٹھا کر اس نے اس کی پینٹنگ بنائی تھی۔

"تم یہ مجھے بطور تحفہ دے دینا۔"

"وہ تمہیں تحفے میں دے دوں گی تو اپنے سولو شو میں کیا اسے نہیں رکھوں گی؟ اسے تو مجھے لازمی وہاں رکھنا ہے۔ تم آؤ گے میرے شو میں؟" اسے یاد تھا' یہ بات پوچھتے ہوئے وہ بڑی آس اور بڑی امید سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سولو شو۔ فلورنس میں اس کا سولو شو۔

یک دم ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے پلیٹ میز پر رکھی۔ سامنے والے دوسرے صوفے پر اس کا لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ ایک بے اختیاری کیفیت میں وہ اٹھا۔ اگست کی کس تاریخ کو تھا اس کا سولو شو' اس سے یہ پوچھنے کی اس نے کبھی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ کہیں اس کا شو ہو نہ چکا ہو۔ اسے اٹلی سے واپس آئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ کیا پتا لیزا کی ایگزیبیشن ہو بھی چکی ہو۔ کچھ دیر قبل اسے شدید بھوک لگ رہی تھی' وہ اپنا گرم گرم پاستا انجوائے کر رہا تھا اب سب کچھ بھلا کر اس نے لیپ ٹاپ گود میں رکھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اسے خود معلوم نہیں تھا۔ وہ فلورنس گوگل کی آرٹ گیلریز میں اس ماہ ہونے والے سولو شوز کو سرچ کرنے لگا تھا۔ ایک دوسرا پیج کھول کر اس نے لیزا محمود کا فلورنس میں سولو شو لکھ کر بھی گوگل پر سرچ کرنا شروع کیا تھا۔ بڑی عجیب سی احمقانہ حرکت تھی۔ وہ ایک فون کال کر کے بھی لیزا سے پوچھ سکتا تھا کہ تمہاری ایگزیبیشن ہو گئی کہ نہیں مگر وہ اسے گوگل پر سرچ کر رہا تھا۔ اسے بڑی خوشی اور بہت فخر کا احساس ہوا تھا یہ جان کر کہ وہ اتنی مشہور ہے کہ محض ایک سیکنڈ میں گوگل نے لیزا محمود کی بائیوگرافی سے لے کر اس کی گزشتہ اور آئندہ سال ہونے والی تمام نمائشوں

تک کی تفصیلات اسے فراہم کردی تھیں۔ فلورنس [illegible] کس آرٹ گیلری میں اور کب لیزا تھوری [illegible] نمائش ہونے والی تھی اسے پتا چل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

آرٹ اور آرکیٹکچر کے لیے مشہور اٹلی کے خوب صورت اور تاریخی شہر فلورنس میں وہ آچکی تھی۔ کل اس کے شو کی اوپننگ تھی۔ آج شو کی اوپننگ کے حوالے سے اس کی آرٹ گیلری کے منتظم کے ساتھ میٹنگ تھی۔

وہ میٹنگ کے لیے وہاں پہنچی تو اس کا بے حد پرجوش استقبال کیا گیا تھا۔ اب تو وہ ایک کامیاب آرٹسٹ کے طور پر اپنا نام بنا چکی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ فائن آرٹس میں گریجویشن کرکے کالج سے فارغ ہوئی تھی اور زیادہ تر گروپ ایگزیبیشن میں اس کا کام ڈسپلے ہوا تھا۔ تب اچھی آرٹ گیلریز تک رسائی اور اس فیلڈ میں قدم جمانے کے لیے پروفیشنل باریکیاں سیکھنے میں سیم نے اسے بہت مدد اور تعاون فراہم کیا تھا۔ سیم کی بدولت ہی ایسا ہو پایا تھا کہ ابتدا ہی سے اس کا کام اچھی آرٹ گیلریز کی زینت بنتا تھا اور ایک آرٹسٹ کے طور پر اس کی CV مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے منتظم کے ساتھ مل کر آرٹ گیلری کے اس ہال کا ایک تفصیلی دورہ کیا جہاں گیلری کے اسٹاف ممبرز منتظم کی دی ہدایات کے مطابق اس کی پینٹنگز کو دیواروں پر بڑے آرٹسٹک انداز میں آویزاں کررہے تھے۔ وہ اپنا کام کرچکی تھی اب یہ کام منتظم کا تھا کہ وہ اس کے کام کو کتنے خوب صورت انداز میں ڈسپلے کرے گا۔

وہاں کا تفصیلی جائزہ لینے اور مطمئن ہونے کے بعد وہ منتظم کے ساتھ اس کے آفس میں گئی تھی۔ جو واحد تصویر اس ایگزیبیشن میں فروخت نہیں کی جانی اس کے متعلق وہ منتظم کو بتا رہی تھی جب آرٹ گیلری کا ڈائریکٹر بھی اس سے ہائے ہیلو کرنے وہاں آگیا۔ ان

[illegible]
[illegible]
آرٹ [illegible]

خاص طور پر وہ بہت اور [illegible] کی توقع کررہا تھا۔ اس کے شو کی [illegible] سے کی جارہی تھی۔

ڈائریکٹر اور Curator ایک کامیاب شو کے لیے پرامید اور پریقین تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ خوشی کا اظہار کررہی تھی مگر اسے اپنے اندر وہ ایکسائٹمنٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی جو اپنی ایگزیبیشن سے قبل ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ اس بار کامیاب یا ناکامی اسے دونوں ہی سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ اس کے شو کا اوپننگ ڈے تھا۔ اس نے شیفون کے سفید رنگ کے ایوننگ گاؤن کے ساتھ امبرائیڈری کی ہوئی سفید ہی رنگ کی خوب صورت جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں سفید رنگ کے ہائی ہیل والے نازک سینڈلز تھے، موتیوں کا نیکلس اور ایئررنگز پہنے تھے، شانوں سے پیچھے آتے ریشمی بالوں کو

اس نے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ سلیقے سے ہوا میک اپ اس کے اٹالین نقوش کو اور نکھار رہا تھا۔ وہ بہت باوقار اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ شام چار بجے شو کی اوپننگ ہوئی تھی اور اس وقت سے ہی لوگوں کی خاصی تعداد آنا شروع ہو گئی تھی۔ چونکہ فلورنس بھی اٹلی کا روم ہی کی طرح کا وہ شہر ہے جہاں سیاح خاصی تعداد میں آتے ہیں سو اس کی ایگزیبیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں میں ان سیاحوں کی بھی کافی تعداد تھی جو آرٹ کے شائقین تھے۔

وہ اپنی ایک پینٹنگز کے بارے میں ایک برٹش کپل کے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی آرٹ کے شیدائی تھے اور اس پینٹنگز میں اس کے رنگوں کے انتخاب اور اس نے آئل کلرز ہی کیوں استعمال کیے جیسے سوالات پوچھ کر آرٹ میں اپنی نالج اور دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

وہ خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی تب ہی بے خیالی میں اس کی نگاہ سامنے اٹھی تھی۔

اسے بہت دور ہال کے داخلی دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوتا نظر آیا تھا۔ گرے سوٹ میں اپنی چھا جانے والی شخصیت کے ساتھ۔

نہیں وہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اس کا واہمہ ہے یہ کوئی اور شخص ہے۔ شاید اس نے اسے سوچنا اتنا شروع کر دیا ہے کہ اب اسے جاگتی آنکھوں سے بھی اسی کے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔

وہ معذرت کرتی اس برٹش کپل کے پاس سے ہٹی اس نے پھر سامنے دیکھا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، پھر کھولیں تاکہ اس خواب سے جاگ جائے مگر آنکھیں کھولنے پر بھی سامنے وہی آتا نظر آ رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ وہ بالکل ساکت کھڑی اسے اپنے نزدیک آتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ چکا تھا۔

"چاؤ Bella۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"سکندر!" حیرت اور بے یقینی کے سبب اس کے لبوں سے کچھ اور نہیں نکل سکا تھا۔

"دیکھو انقدیر نے ہمیں پھر ملا دیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ وہ حیرت سے گنگ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے بتایا تھا نا فلورنس میں تمہارا سولو شو ہو گا۔ میں نے سوچا۔ آ کر دیکھوں اپنے مشہور آرٹسٹ ہونے کا جو رعب جماتی ہو' اس میں کچھ سچائی بھی ہے یا صرف باتیں بناتی ہو۔"

وہ اب بھی چپ چاپ اس کے چہرے کو بے یقینی سے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے تو لگا تھا وہ اسے کھو چکی' وہ اس سے بچھڑ چکا' اب عمر بھر وہ اسے کبھی نہیں ملے گا۔ مگر زندگی اتنی بھی سنگ دل و کٹھور نہیں تھی۔

"کیا ہوا لیزا! کیا تم مجھے یہاں دیکھ کر خوش نہیں ہوئیں؟"

اس کی مسلسل خاموشی کو دیکھ کر سکندر نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

خوش؟ خوشی تو بہت چھوٹا' بہت معمولی سا لفظ تھا اس کی دلی کیفیات کا اظہار کرنے کے لیے۔

"خوشی کو تو ابھی میں نے محسوس کرنا شروع بھی نہیں کیا۔ ابھی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا۔ ایسا لگ رہا ہے' میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور تم یہاں نہیں ہو گے۔ پہلے مجھے یہ یقین آ جائے کہ تم حقیقت میں میرے سامنے ہو' پھر خوشی کو سوچوں گی۔"

وہ بے اختیار اپنے دل کی بات کہہ بیٹھی تھی۔ اسے اس پل خود پر' اپنی زندگی پر بے پناہ پیار آ رہا تھا۔ جسے کھو دیا تھا زندگی نے اسے پھر اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ ابھی اسی وقت نینی کو فون کرے' سیم کو فون کرے' ان دونوں کو بتائے کہ وہ اس وقت کیسا محسوس کر رہی ہے۔ سکندر شہریار اس کے سامنے کھڑا ہے' اس کے اتنے نزدیک کھڑا ہے کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتی ہے۔

خوشی اور بے یقینی نے گھل مل کر اس کی آنکھوں

میں آنسو جمع کر دیے تھے۔ وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔ یہاں اس وقت' اس جگہ کھڑے ہو کر وہ کوئی بھی جذباتی حرکت ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا گلا رندھ سا رہا تھا۔ وہ سکندر سے نارمل سے انداز میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ کوئی بھی ایسی بات جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہے۔ سکندر بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

ابھی وہ بولنے کے لئے کوئی مناسب سا جملہ ترتیب دے ہی رہی تھی کہ مقامی آرٹ اسکول کے کچھ نو آموز مصوروں کا ایک گروپ اس کے پاس آگیا۔ ان میں سے چند ایک کو تو صرف اس کا آٹوگراف چاہیے تھا جبکہ باقیوں کو کچھ پینٹنگز کے بارے میں اس سے چند سوالات کرنے تھے۔ اس نے پریشان سا ہو کر سکندر کو دیکھا۔

وہ یہاں سے ہٹی اور وہ چلا گیا تو پھر؟ اس بار وہ اسے کھو دینے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی اگزیبیشن' آرٹ گیلری اور یہاں آئے آرٹ کے قدردان' اسے یک دم ہی سب کچھ برا لگنے لگا۔ اپنے اور اس شخص کے بیچ حائل ہوتی دیوار لگنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پل اس کے چہرے پر الجھن اور پریشانی صاف پڑھی جا سکتی ہے۔ سکندر اسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر رسانیت سے بولا۔

"تم جاؤ لیزا!" وہ اس سے اردو میں مخاطب ہوا تھا۔ اس نے بھی جواب اردو ہی میں دیا تھا۔

"مگر تم ـــــ" وہ کسی بھی قیمت پر اس کے پاس سے جانا نہیں چاہتی تھی۔

ایک بار کھو کر وہ اسے پھر مل گیا' یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ اب کی بار کھو دیا تو کیا پتا پھر کبھی ملے بھی کہ نہ ملے۔

"تم اطمینان سے سب سے ملاقات چیت کرو۔ میں تمہاری پینٹنگز دیکھ رہا ہوں۔ میں یہیں ہوں۔" دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

وہ جیسے بادل نخواستہ اس کے پاس سے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
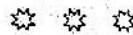
وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا لیزا کی تمام پینٹنگز دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ آرٹ اسکول کے نو آموز مصوروں کے گروپ سے گفتگو کے دوران بھی لیزا مڑ مڑ کر اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ اسے "ناٹ فار سیل" (فروخت کے لیے نہیں) کے ٹیگ کے ساتھ اپنی پینٹنگ نظر آئی تھی۔ وہ چلتا ہوا سیدھا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے اور لیزا نے اس پینٹنگ کے بننے کے دوران جو باتیں کی تھیں' اسے وہ سب یاد آرہی تھیں۔ اسے Tivoli یاد آرہا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہے نا تمہاری پینٹنگ؟" اسے پیچھے لیزا کا آکر کھڑا ہونا محسوس ہوا تھا۔

"ہاں بہت۔" وہ تصویر سے نظریں ہٹائے بولا۔

"چلو! کہیں باہر چلتے ہیں۔" وہ اس سے بولی تھی۔ اس بار اسے گردن گھما کر اسے دیکھنا پڑا تھا۔

"مگر ابھی اگزیبیشن کا ٹائم ختم نہیں ہوا۔" اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کیوریٹر کو انفارم کر دیتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔"

اس لڑکی کے لیے اپنی تصاویر کی نمائش' جس کی نجانے وہ کب سے تیاریاں کر رہی تھی' جس کے لیے اپنی نجانے کتنی راتوں کا سکون اور نیند اس نے قربان کی تھی' غیر اہم ہو چکی تھی۔ اگر کچھ اہم تھا تو سکندر شہریار۔

وہ چند لمحے ٹکٹکی باندھے لیزا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"یہ تمہارے شو کا اوپننگ ڈے ہے۔ بہت سے لوگ تم سے ملنے آرہے ہیں۔ تمہارا اس طرح اگزیبیشن سے چلے جانا مناسب نہیں۔ تم اطمینان سے یہاں سب سے ملو' سب کو وقت دو۔ ابھی تو اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں تمہاری پینٹنگ کو دیکھ رہا ہوں۔ اتنا بھی آرٹ کا ناقدرا نہیں۔ میں اپنی دوست لیزا محمود کے آرٹ کو دیکھنا اور سراہنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اگر آج کا شو ختم ہونے میں کچھ وقت باقی بچا تو میں

آرٹ گیلری کے کیفے میں جاکر بیٹھ جاؤں گا۔"

وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا فوراً "اس سے اختلاف کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں وہ پھر سے واپس نہ چلا جائے۔

"میں تم سے ملے بغیر، تم سے باتیں کیے بغیر، تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو، یہ سنے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ شو کا ٹائم ختم ہو تو تم کیفے میں آجانا۔"

اس بار جیسے لیزا کو اس کی سچائی کا یقین آگیا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ وہ اتنی ہی پیاری لگ رہی تھی جتنی ہمیشہ لگا کرتی تھی۔ وہ صرف اس کو ہی اتنی پیاری لگتی تھی یا ہر کسی کو یونہی اس لڑکی سے محبت ہو جاتی ہوگی، وہ جانتا نہیں تھا۔

"سی۔ سینور سکندر!" وہ مسکرا کر بولتی ہوئی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ بڑی تسلی سے لیزا کی ہر پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ لیزا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو کبھی کسی سے گفتگو کرتی نظر آتی تو کبھی کسی سے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں تھی۔ کبھی کسی کو آٹو گراف دیتی نظر آرہی تھی تو کبھی کسی کے ساتھ تصویر کھنچواتی، کبھی کسی کے سوالوں کے جواب دیتی ان کی نگاہیں ملتیں، وہ نگاہوں میں نرم سا تاثر لیے اسے دیکھ کر مسکراتا۔ جواباً "لیزا اسے یوں دیکھتی جیسے ابھی تک بے یقینی کا شکار تھی اس کی یہاں موجودگی پر۔

وہ لوگوں کی تعریفوں، ستائشوں کو سنتے رہنے سے زیادہ اس کے پاس آنے کے لیے بے چین نظر آرہی تھی۔ نو بجے شو کا ٹائم ختم ہونا تھا اور وہ صرف لیزا کی پریشانی اور الجھن کا خیال کر کے وہاں نو بجے تک رکا رہا تھا۔ وہ کئی بار گھوم پھر کر لیزا کی ہر پینٹنگ کو تقریباً "حفظ کر چکا تھا۔ اس نے لیزا سے کیفے میں جا کر بیٹھنے کی بات کی تھی اور لیزا نے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا مگر پھر بھی اسے لگا تھا اگر وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا تو وہ شو کے ختم ہونے کے وقت تک یہاں ٹھہر نہیں پائے گی۔ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئے گی۔ یہ لیزا محمود کا دن تھا۔ اس کی نجانے کتنے مہینوں کی محنت کا ثمر آج اسے مل رہا تھا، اس صورت میں کہ ایک بڑی تعداد میں لوگ اس کی تصاویر کو دیکھنے، اس کے آرٹ کو سراہنے کے لیے آرہے تھے۔

اس نے خود آرٹ گیلری کے کیوریٹر کو کسی سے بہت خوشی سے یہ کہتے سنا تھا کہ اس کی توقع سے بھی بڑھ کر لوگ نمائش دیکھنے آرہے ہیں۔ آرٹ کے نقاد، صحافی اور آرٹ کے قدر دان لیزا کو سراہ رہے تھے۔ لوگ اس کی پینٹنگز منہ مانگے دام پر خریدنے کو بے قرار تھے۔ وہ اس خاص دن اور خاص موقع کو لیزا کے لیے بہت خاص رہنے دینا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی، وہ اپنی کامیابی کو پوری طرح انجوائے کرے۔ اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر، اسے خوشی سے سرشار سا دیکھ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

اسے کئی بار لگا، جیسے وہ اپنے کامیاب سولو شو پر نہیں بلکہ سکندر شہریار کے اس شو میں آجانے پر خوش ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر نہیں، بلکہ اس کے آجانے پر خوش تھی۔ ادھر گھڑی نے نو بجائے، ادھر لیزا سب چھوڑ چھاڑ سیدھی اس کے پاس آگئی۔

"چلیں؟"

"تمہیں اگر کچھ دیر اور رکنا ہے تو رک جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کرلوں گا۔" وہ مسکرا کر رسانیت سے بولا۔

"نہیں۔ مجھے اور نہیں رکنا۔ ڈنر کے لیے میں کیوریٹر سے پہلے ہی معذرت کر چکی ہوں۔ میں انہیں کافی دیر پہلے بتا چکی ہوں کہ میرے ایک بہت خاص گیسٹ آئے ہیں، مجھے ڈنر ان کے ساتھ کرنا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی تھی۔

"چلو پھر۔" ان دونوں نے باہر جانے کے لیے ایک ساتھ قدم بڑھائے تھے۔ وہ دونوں آرٹ گیلری سے باہر نکل آئے تھے۔ فلورنس میں بھی اسے سیاح اسی طرح نظر آرہے تھے جیسے روم میں نظر آتے تھے۔ آرٹ گیلری کے آس پاس کئی تاریخی عمارتیں، چرچ اور قدیم و خوبصورت فاؤنٹین موجود تھے۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ تم بھی اگلے ماہ فلورنس آنے والے ہو۔"

اسے خود دو دن پہلے تک پتا نہیں تھا کہ وہ دوبارہ اٹلی آنے والا ہے۔ وہ ایک ریسٹورنٹ کے پاس آکر رک گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کے باہر بھی میزیں لگی تھیں' تاکہ جو لوگ اردگرد بکھری تاریخ اور فلورنس کی خوبصورتیوں کو سراہتے ہوئے کھانا کھانا چاہتے ہیں' وہ ایسا کر سکیں۔

"کیا خیال ہے' یہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں؟"

بجائے لیزا کے سوال کا جواب دینے کے' اس نے کھانے کی بات چھیڑی۔

لیزا نے خوشی خوشی مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے تھے۔ وہاں سے آس پاس کی تاریخی عمارتیں اور فوارے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔

"تمہارے شو کی اوپننگ تو بڑی کامیاب رہی ہے۔"

اسے لیزا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا چیز شوق سے کھاتی ہے۔ اس کی پسند کی ڈشز اسے ازبر تھیں اور وہ انہیں آرڈر کرچکا تھا۔

"ہاں۔" وہ شو کی کامیابی پر بس اتنا ہی خوش تھی کہ "ہاں" کہہ دینا اسے کافی لگا تھا۔ اس کی اصل دلچسپی اس بات میں تھی کہ سکندر شہریار یہاں کیسے آگیا ہے۔

"تم نے بتایا نہیں' تمہارا فلورنس آنا کیسے ہوا؟"

اور سکندر شہریار لیزا محمود کے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لیے خود اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا تھا کہ وہ آج یہاں فلورنس میں کیا کر رہا ہے؟

"کیا آفس کے کسی کام سے یہاں آئے ہو؟" اسے خاموش دیکھ کر لیزا نے مزید پوچھا۔ ان کے سامنے ان کا کھانا سرو کیا جاچکا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ لیزا سے جھوٹ بول دے کہ "ہاں' میں یہاں کسی میٹنگ یا کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوں" مگر زندگی میں جو اس کا واحد سچا رشتہ' ایک سچی محبت اسے اس وقت ملی تھی جب وہ زندگی اور محبت ہی سے ناامید ہو بیٹھا تھا' اس سے جھوٹ بولا جاسکتا تھا؟

کیا وہ لیزا محمود سے جھوٹ بول سکتا ہے؟
اس کی زندگی میں سچی ہنسی، سچی خوشی، سچی محبت بلکہ زندگی ہی کو واپس لانے والی اس لڑکی سے وہ مرتے دم تک جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیا وہ اس سے محض اس لیے جھوٹ بول دے کہ سچ بول کر خود کو اس پر عیاں نہیں کرنا چاہتا؟

"نہیں۔" وہ لیزا کے ساتھ اپنے رشتے کی سچائی اور خوبصورتی کو صرف خود کو عیاں کرنے کے خوف سے کم نہیں کر سکتا۔

"میں یہاں آفس کے کام سے نہیں آیا۔"
وہ آہستہ اور سنجیدگی سے بولا۔ ابھی ان دونوں نے کھانا کھانا شروع نہیں کیا تھا۔

"میں فلورنس خاص طور پر تمہاری وجہ سے آیا ہوں۔ تمہارا سولو شو دیکھنے اور تم سے ملنے۔ تمہیں مبارک باد دینے۔"
اس نے لیزا کے چہرے پر پہلے حیرانی پھر خوشی اور پھر خوشی سے سرشار مسکان بکھرتی دیکھی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"
"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں یہاں صرف اور صرف لیزا محمود سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے گوگل پر تمہارے اس شو کی جگہ اور تاریخ سرچ کی تھی۔ میں نے دو دن پہلے بالکل آنا" فانا" اور اچانک فلورنس آنے کا پروگرام بنایا ہے۔" وہ اس کی خوشی اور بے یقینی محسوس کر کے مسکرا کر بولا۔

"کیوں؟" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ ایک جادوئی سی قوت کے زیر اثر یہاں چلا آیا ہے۔ بغیر کسی ارادے اور کسی سوچ کے اس کا دل اسے یہاں اٹھا لایا تھا۔ اس کے دل نے اسے سوچنے اور سمجھنے کی مہلت تک نہیں دی تھی۔ اگر اس نے ذرا بھی سوچ سمجھ لیا ہوتا تو کیا آج یہاں لیزا محمود کے سامنے بیٹھا، اس مشکل سوال کا سامنا کر رہا ہوتا۔ وہ اس سے ملنے آیا ہے، مگر کیوں؟ کس لیے؟

وہ تو اس لڑکی سے زندگی بھر نہ ملنے کے ارادے باندھے بیٹھا تھا۔
لیزا کے خوشی سے سرشار چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے آپ سے الجھ رہا تھا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے لیزا سے دوبارہ نہیں ملنا چاہیے تھا۔ دوبارہ ملنے کا مطلب ہے اسے کوئی آس، کوئی امید دلانا، اسے اپنی محبت کا یقین دلانا۔ وہ لیزا کو اپنی وجہ سے کوئی بھی دکھ دینے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ اسے اپنا ساتھ اور اپنی محبت نہیں دے سکتا تو اسے یہ حق بھی نہیں کہ وہ اس کی زندگی میں بار بار آ کر ہلچل پیدا کرے۔

"تم آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔" اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اس نے گفتگو کا موضوع ہی تبدیل کر دیا۔
"وائٹ کلر تم پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔"
اس نے اپنی پلیٹ میں پاستا ڈالا، ساتھ ہی لیزا کے آگے بھی ڈش رکھی۔ لیزا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شروع کرو بھئی۔" اس نے خود ہی لیزا کی پلیٹ میں بھی پاستا ڈالا۔
اس نے کھانا شروع کر دیا تھا مگر وہ اسے دیکھ رہی تھی، اسی طرح سنجیدگی اور خاموشی سے۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے، وہ آنکھیں اس سے سوال کر رہی تھیں، اپنے ہر سوال کا جواب مانگ رہی تھیں۔

"تمہاری ممی کیسی ہیں؟"
وہ جان کر انجان بن رہا تھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں موجود سوالوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا یہاں سے بھاگ جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ آخر یہاں کیوں آیا ہے؟ اس کے دل نے یہ اسے کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔

"ٹھیک ہیں۔" لیزا نے اس کے کہنے پر کھانے کا ایک نوالہ لیا تھا۔ وہ سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ وہ اس کی نگاہوں میں چھپے سوالوں

نگاہیں چراتا کھانا کھانے میں یوں مگن تھا گویا آج اس وقت ان دونوں کے درمیان سب سے اہم بات ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ہی تھی۔

"تم آج ہی آئے ہو؟"

"ہاں! اور ایئرپورٹ سے سیدھا تمہارے پاس تمہاری ایگزیبیشن میں چلا آیا۔"

جو سوچ رہا تھا وہ اس سے بولا نہیں جاسکا تھا۔

"ہاں! آج ہی آیا ہوں اور کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔"

وہ لیزا کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"تمہاری ایگزیبیشن تو میں دیکھ آیا ہوں بہت اچھی جا رہی ہے۔ یہ بتاؤ سولو شو کے اتنے کامیاب آغاز پر کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"تم مجھ سے وہ کیوں نہیں کہتے سکندر! جو کہنا چاہتے ہو؟ جو میں تمہارے لبوں سے سننا چاہتی ہوں۔ تم اپنے سب کام، ساری مصروفیات چھوڑ کر میری خاطر دوبارہ سے فلورنس آسکتے ہو تو اپنے دل کی بات کیوں نہیں کہہ سکتے؟"

لیزا کی آنکھیں اس سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ وہ اس کے لبوں سے ایک اظہار سننے کی متمنی تھی۔

"میں نے اس ایک مہینے میں تمہیں بہت یاد کیا ہے سکندر!"

وہ چند لمحوں تک اس کے کچھ کہنے کی منتظر رہی۔ پھر جب دیکھا کہ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تب آہستگی سے بولی۔

"تم مجھے فون کر لیتیں۔ تمہارے پاس میرا سیل نمبر تو تھا۔"

"تم جس انداز سے مجھ سے گڈبائے کر کے آئے تھے کیا اس کے بعد میں ایسا کرسکتی تھی؟ تمہارا مجھ سے رخصت ہونے کا انداز مجھے واضح طور پر بتا گیا تھا کہ تم اس چند روزہ ملاقات کو عمر بھر کی دوستی میں تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔" وہ شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھ کر دھیمی آواز میں بولی۔

"میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں چاہتا، مجھے خود نہیں پتا۔ میں یہاں فلورنس میں کیا کر رہا ہوں، کیوں بیٹھا ہوں یہاں، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا۔"

وہ جیسے خود اپنے اوپر ہنسا تھا مگر اس ہنسی میں ایک بے بسی پنہاں تھی۔ لیزا اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔

"اپنے دل سے پوچھ لو، کیا پتا وہ تمہیں بتا دے۔" لیزا اس کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولی۔

وہ جواباً چپ رہا۔ وہ جیسے کچھ بھی کہتے ہوئے محتاط تھا۔ مبادا اس کے لبوں سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو اس پیاری لڑکی کو وعدے کی کسی ڈور سے باندھ دے۔ وہ اپنی زندگی کے اندھیروں میں اسے کیوں حصہ دار بنائے۔ وہ اگر اسے کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو اسے کوئی دکھ دینے کا بھی اسے کچھ حق نہیں۔

"چلو فلورنس کی سڑکوں پر گھومیں۔ تمہارے روما کی طرح یہاں بھی تو ہر گلی پر، سڑک پر ہسٹری بکھری پڑی ہے۔"

وہ کھانا چھوڑ کر یک دم ہی میز سے اٹھا تھا۔ بل ادا کرنے کے لیے اس نے ویٹر کو اشارے سے بلایا تھا۔ لیزا اسے دیکھتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

وہ دونوں آہستہ قدموں سے چلتے کیفے سے دور آگئے تھے۔ لیزا خاموش تھی۔ اس نے لیزا کے خاموش چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب خوشی نہیں، دکھ اور خاموشی تھی۔

"اتنی چپ کیوں ہو لیزا! پلیز کوئی بات کرو۔" لیزا نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا ضرور، بولی کچھ نہیں۔

"کیا میں نے یہاں آکر تمہیں دکھی کیا ہے؟ پتا ہے لیزا! تمہارا بہت بولنا اور بے تحاشا ہنسنا مجھے بہت پسند ہے۔"

لیزا چلتے چلتے یک دم ہی رک گئی تھی۔ وہ دونوں اس وقت فوارے کے بالکل نزدیک کھڑے تھے۔ لیزا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"جب تمہیں میں پسند ہوں، میری ہر بات بھی پسند

ہے تو پھر الجھن کیا ہے سکندر؟''

لیزا نے یک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال نہیں پایا۔

اس نے لیزا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں ایک فیصلہ کن سی کیفیت نظر آئی۔ اس کی آنکھیں ارادوں کی مضبوطی کے ساتھ یہ بتا رہی تھیں کہ اس بار وہ اسے اپنی زندگی سے نکلنے نہیں دے گی' اسے روک لے گی۔ اس نے ایک گہری سانس لی جس میں اک عمر کی تھکن شامل تھی۔

''میری زندگی میں الجھنیں ہی الجھنیں ہیں لیزا! میری زندگی' تمہاری زندگی جیسی خوشگوار اور ہموار نہیں ہے۔ تم مجھے نہیں جانتیں۔''

آہستگی سے بولتے ہوئے اس نے لیزا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور فوارے کے اطراف لگی بینچ پر نڈھال سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ لیزا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے زمین کو گھور رہا تھا۔ اس نے لیزا کا اپنے برابر بیٹھنا محسوس کیا تھا۔

''تمہیں جتنا جاننا میرے لیے ضروری تھا' میں تمہیں اتنا جانتی ہوں سکندر! میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ بیٹھا یہ شخص ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ یہ ساتھ ہو گا تو مجھے زندگی سے اپنے لیے اور کچھ بھی نہیں چاہیے ہو گا۔ یہ میری حفاظت کرے گا' یہ میری بہت پروا کرے گا' یہ مجھ سے بہت محبت کرے گا۔''

''اس کے بارے میں کچھ بھی جانے بنا اتنا بھروسا؟ اتنا بھروسا تو اس کے بہت اپنوں نے بھی اس پر نہ کیا تھا۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔

''تم مجھے اتنا اچھا مت سمجھو لیزا! میری سچائی وہ نہیں جو تمہیں دکھتی ہے۔ میں اتنا اچھا ہرگز نہیں' جتنا تم سمجھتی ہو۔ بہت سیاہ' بہت داغ دار ہے میرا وجود۔ میرے قریب آؤ گی تو میرے وجود کی سیاہی تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔''

اس نے اب بھی نظریں اٹھا کر لیزا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح زمین کو دیکھتا آہستہ آواز میں بولا تھا۔ [illegible] اس کے ہاتھ کو لیزا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ تھامتے تھامتے نہ جانے اسے کیا ہوا' اس نے اس کی ہتھیلی اپنی نگاہوں کے سامنے کر لی۔ وہ بغور اس کی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔

سخت کاموں اور بے تحاشا محنت اور مشقت نے اس کے ہاتھوں کو کسی راج مزدور' کسی پلمبر' کسی کارپینٹر کے ہاتھوں جیسا سخت اور کھردرا بنا دیا تھا۔ برسوں کی مشقتیں اس کے ہاتھوں سے واضح تھیں۔ لیزا نے شاید اس چیز کو پہلے بھی کبھی محسوس کر رکھا تھا' تب ہی بجائے کچھ پوچھنے کے اس نے آہستگی سے' بے حد نرمی سے اس کی ہتھیلی پر اپنی انگلیاں پھیری تھیں۔

''تمہیں زندگی نے بہت دکھ دیے ہیں نا سکندر! اسی لیے اب تم زندگی سے خفا ہو۔ تم خوش نہیں ہونا چاہتے' تم ہنسنا نہیں چاہتے۔ تم زندگی سے' خوشیوں سے منہ موڑ لینا چاہتے ہو؟'' اس نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''تم جانتی ہو اپنا کمال؟ تمہارے ساتھ تمہارے روما میں میں پورے بارہ سال بعد ہنسا تھا۔ مجھے رنگ اچھے لگنے لگے تھے۔ مجھے زندگی اچھی لگنے لگی تھی۔ میرا خوش ہونے کو جی چاہنے لگا تھا۔ تمہاری سنگت میں پورے بارہ سال بعد میں خوش ہوا تھا' ہنسا تھا۔ کوئی جادو ہے تم میں جو مجھے تمہارے پیچھے فلورنس تک کھینچ لایا ہے۔'' وہ کہے بنا رہ نہیں پایا۔

وہ اتنی نرمی سے اس کی سخت اور کھردری ہتھیلی پر اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی جیسے اس کے زخموں سے چور چور وجود کا ہر درد سمیٹ لینا چاہتی تھی۔

''جب تمہیں میرے ساتھ خوشی ملتی ہے تو پھر مشکل کیا ہے سکندر! پلیز میرے اور اپنے لیے زندگی کو مزید مشکل مت بناؤ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔''

''پلیز لیزا! اس طرح کی باتیں مت کرو۔ میں ایک تھکا ہوا اور ناکام انسان ہوں۔ میرے اندر زندگی کی امنگ ختم ہو چکی ہے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجھے تمہارے

پاس یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہاری پرسکون زندگی کو ڈسٹرب کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو دکھ بھی نہیں دینا چاہیے۔" وہ بہت تکلیف سے بول پا رہا تھا۔

"تم نے آج یہاں آکر مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے سکندر! میری محبت یک طرفہ نہیں، مجھے یہ اطمینان دیا ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے۔ وہ میری خاطر، میری محبت میں اپنے سب کام چھوڑ کر دوہا سے فلورنس آگیا ہے۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں اور تم کہتے ہو تم نے مجھے دکھ دیا ہے؟ تمہیں ڈسٹرب کیا ہے؟؟"

وہ لیزا کے منہ سے محبت کا لفظ سن کر پریشان ہو گیا۔

"اس لفظ کو ہمارے درمیان مت لاؤ لیزا! پھر جب میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا تو یہ لفظ کسی دوسرے شخص کا ساتھ قبول کرنا تمہارے لیے بہت مشکل بنا دے گا۔"

اس کا لہجہ ایک ہارے ہوئے، ناکام شخص کا لہجہ تھا۔ جو زندگی کے ہر محاذ پر پہلے ہی شکست تسلیم کر چکا تھا۔

"تم مجھے کیوں چھوڑ جاؤ گے؟" اس سے یہ سوال پوچھتے وقت لیزا کا لہجہ بھر آیا تھا۔

"اس لیے کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تم ہو نا۔ میرے لیے تمہارا ہونا ہی سب کچھ ہے۔"

وہ ایک پل اسے کھو دینے کے خوف سے پریشان لگنے لگتی تو اگلے پل یوں لگتا وہ پریقین ہے کہ وہ اسے روک لے گی۔ وہ اس لڑکی کی ان محبتوں کا حقدار نہیں کیسے سمجھائے اسے۔

"جذباتی باتیں مت کرو لیزا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو تم سوچ رہی ہو وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں قدرے خفگی سے بولا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" لیزا کا اس کی جھنجلاہٹ کے جواب میں پرسکون انداز تھا۔

"اس لیے کہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میرے ظاہری وجود اور میری موجودہ زندگی پر نہ جاؤ۔ میرا باطن داغ داغ ہے۔ میرا ماضی بڑا بھیانک ہے۔ برسوں ہوئے میری فیملی مجھے ڈس اون کر چکی ہے۔ سوائے میری ماں کے جو کبھی کبھی مجھ سے فون پر بات کر لیتی ہیں، میرے گھر کا کوئی فرد میری شکل دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ میں بیس سال کی عمر میں چار بلیک Gay امریکنز کے ہاتھوں sexually abuse کیا جا چکا ہوں۔ میں اندر سے اتنا کھوکھلا، اتنا داغ دار ہوں کہ میرے نزدیک آنے سے تمہاری اجلی شفاف صورت بھی بدنما ہو جائے گی۔"

وہ یک دم ہی جیسے پھٹ پڑا تھا۔ لیزا حیرت اور دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"سکندر!"

"ہاں! ولا بورگیس پر اس لڑکی کے لیے اتنے جنونی انداز میں، میں نے اس لیے ری ایکٹ کیا تھا کہ میں خود ایک rape victim ہوں۔ جب تمہیں یہ سب بتا ہی رہا ہوں تو یہ بھی بتا دوں اپنا وہ ایکسیڈنٹ میں نے خود کروایا تھا۔ میں خود ایک گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ اس لیے کہ میں مرجانا چاہتا تھا۔ یہ ذلت بھری زندگی جیتے جیتے میں تھک چکا ہوں۔"

وہ بہت زور سے چلایا تھا۔ آس پاس سے گزرتے چند لوگوں نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ اس کی زبان سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر چلانا تو سمجھ میں آرہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یہاں پتھروں سے سر مار مار کر رونا شروع کر دے۔ پھر کسی گاڑی کے آگے آجائے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ اپنے وجود سے گھن آرہی تھی۔ اس کا خود کو مٹا ڈالنے کو جی چاہ رہا تھا۔

وہ لیزا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا، یہاں سے اٹھ کر کہیں بہت دور بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ زندگی میں دوبارہ لیزا سے کبھی سامنا نہ ہو سکے۔

اپنی اتنی بھیانک سچائی آج تک اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ لیزا کو بتا کر اب وہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا تھا۔ نجانے یوں بالکل سن سا بیٹھے اسے کتنی دیر ہوئی ہوگی جب اسے یک دم ہی اپنی

ہتھیلی پر نمی کا احساس ہوا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر لیزا کو دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی ہتھیلی پر گر رہے تھے۔ اس نے لیزا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور یک دم ہی بینچ پر سے اٹھا بغیر لیزا کی طرف دیکھے وہ آہستگی سے بولا۔

"میں کل صبح تم سے مل کر واپس چلا جاؤں گا۔"

اسے خود اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔

"تم کہاں جا رہے ہو سکندر!"

وہ روتے روتے بینچ سے اٹھی تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر وہ اب یہاں مزید ایک پل نہیں رک سکتا تھا۔

"لیزا پلیز!میں اس وقت اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے کل بات کروں گا۔"

اپنی پامالی کے سارے دکھ اسے پھر سے یاد آنے لگے۔ وہ اس وقت کسی اور کا تو کیا' خود اپنا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عجیب سی ایک نفرت' غصہ اور وحشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ لیزا کو وہیں چھوڑ کر اپنے ہوٹل جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆
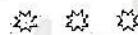
وہ اپنے ہوٹل روم میں تھا۔ خود کشی کرنے کا خیال اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ وہ کیوں زندہ ہے؟ اسے مر جانا چاہیے۔ اسے بارہ سال پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ ایک وحشت تھی' جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اسی نو عمر سکندر شہریار کی طرح جس سے اس کی شخصیت کی آن' بان اور وقار ایک لڑکی نے چھین لیا تھا۔ چند کالے امریکیوں نے چھین لیا تھا۔ اس کے اپنے خونی رشتوں نے چھین لیا تھا۔

ام مریم' وہ چار gay امریکنز' شہریار خان' زین شہریار۔ ان سب میں سکندر شہریار کا قاتل کون تھا؟

اسے تو آج ان سب میں سے کسی کا بھی خیال نہیں آتا تھا۔ کسی سے بھی نفرت محسوس نہیں ہوتی تھی اگر وہ کسی سے نفرت کرتا تھا تو اپنے آپ سے۔ اتنا ڈھیٹ بھی کوئی ہوتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی انسان جیا چلا جائے۔ وہ فلورنس کیوں آیا تھا' اسے لیزا کیوں اچھی لگتی تھی؟ اس کا لیزا سے پھر سے ملنے کو کیوں جی چاہا تھا۔؟ اس کا دل چاہا' وہ خود کو سزا دے۔ اسے نہ تو خوش ہونے کا کوئی حق حاصل ہے نہ ہنسنے کا اور نہ محبت کرنے کا۔ اپنے اس داغ دار وجود کو لے کر اسے برسوں پہلے مر جانا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

"اگر واقعی میرا خون ہو' ذرا بھی غیرت تم میں بچی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔"

"بے غیرت انسان! ام مریم پر گندی نظر ڈالنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟"

"مجھے اس درندے سے بچالو زین! یہ میری عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔"

"ام مریم کو ٹھکرانے کی ساری زندگی کوئی ہمت نہیں کر سکا ہے۔"

"Ray! leave the baby."

"It's my turn"

اپنے بال نوچتا وہ بارہ سال پہلے کے سکندر شہریار کی طرح ہی رو پڑا تھا۔ اس کے گرد آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ شور ہی شور تھا۔ وہ چار تھے اور وہ اکیلا تھا۔ وہ لحیم شحیم طاقت ور تھے اور وہ ان کے آگے بیس سال کا ایک کمزور اور بے بس لڑکا۔

"پلیز لیو می۔" وہ رو رو کر ان کی منت کر رہا تھا۔ وہ چاروں اس کی بے بسی پر قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔

وہ "پاپا' پاپا" پکار رہا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دیو قامت کالے امریکی قہقہے لگا کر اس پر ہنس رہے تھے۔

ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بے ہنگم انداز میں اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں۔ شراب کے گھونٹ لے کر وہ بوتل اچک کر دوسرے کو دے رہے تھے۔

اس نے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہا کہ اس کی طرف بڑھتے ایک کالے نے ایسا زوردار مکا اس کے منہ پر مارا کہ وہ اوندھے منہ سڑک پر گرا تھا۔ اس کی ناک اور دانتوں سے خون نکل آیا تھا۔ اس کالے نے اس کے بال مٹھی میں دبوچ کر اس کا سر زمین پر زور سے مارا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔

"پاپا! مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ پاپا! یہ مجھے مار ڈالیں گے۔ پاپا! مجھے بچالیں۔" وہ روتے ہوئے باپ کو پکار رہا تھا۔

"ایک Rapist میرا بیٹا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد زندگی بھر مجھے اپنی منحوس شکل مت دکھانا۔"

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے ہوٹل روم میں بیڈ پر لیٹا تھا اپنے اندر کی وحشتوں سے سکون پانے کے لیے اس نے پلز لے کر سونے کی کوشش کی تھی۔

بس آج کی رات، صرف آج کی رات۔ کل صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ وہ لیزا سے دوبارہ کبھی نہیں ملے گا۔ پلز کے سہارے بھی اسے کچھ ہی دیر کے لیے نیند آئی تھی۔

وہ آدھے گھنٹے بعد ہی روتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اپنے اوپر بچھو ہی سانپ کی طرح رینگتے ہاتھ محسوس ہو رہے تھے۔ وہ باتھ روم آگیا تھا۔ شاور سے پانی پوری رفتار سے بہہ رہا تھا اور وہ شاور کے نیچے کھڑا اپنے وجود پر لگی ہر غلاظت صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپنی تذلیل، اپنی عزت نفس کی پامالی اسے رلا رہی تھی۔ وہ پانی کے نیچے کھڑا پاگلوں کی طرح رو رہا تھا۔

"سکندر شہریار ریپسٹ نہیں، سکندر شہریار تو خود ایک ریپ وکٹم ہے۔"

اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ کر وہ اپنی عزت، اپنے مردانہ وقار کی پامالی پر چلا کر رو پڑا۔

☆ ☆ ☆

بارہ سال پہلے کی وہ شام پھر اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ صفائی کا کوئی بھی موقع دیے بغیر اس پر فرد جرم عائد کر دی گئی تھی۔ اسے دھکے مار کر اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ناقابل اعتبار اور گناہ گار قرار دیا جا چکا تھا۔

روتی ہوئی بس کی ماں کی مجال نہ تھی کہ بیٹے کی حمایت کر پاتی۔ نفرت سے لب سے دیکھتا ہوا اس کا بھائی اسے گھر سے نکلے جاتے دیکھ کر مطمئن تھا اور اسے دھکے مار کر گھر سے نکالتا ہوا اس کا باپ، اس کی کوئی بھی بات سننے کا روادار نہ تھا۔

وہ بدکردار تھی قابل اعتبار تھی، مگر وہ ان سب کا خون تھا ان کے لیے ناقابل اعتبار تھا۔ اس کا گناہ کیا تھا؟ شاید اس کا گناہ شہریار خان کا بیٹا ہونا، زین شہریار کا بھائی ہونا تھا، شاید اس کا گناہ اس گھر میں پیدا ہونا تھا۔

وہ گھر جہاں پر کچھ بھی نارمل نہ تھا۔ وہ گھر جہاں اس کے باپ کی انا ؤں کو چھوتی سخت مزاجی اور اصول پسندی تھی اور اس کی ماں کی خدمت گزاری اور خاموشی۔ ایسے اس گھر میں اس نے بچپن ہی سے بڑا عجیب و غریب ماحول دیکھا تھا۔

وہ ایک اونچے گھرانے، اونچے خاندان کا چشم و چراغ ہے، اس کی زندگی میں ہر چیز پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ اسے زندگی میں ہر وہ کام کرنا ہے جو اس کے پاپا اس سے کہیں۔ ہر وہ چیز حاصل کرنا ہے جو اس کے پاپا چاہتے ہیں۔ اسے ہوش سنبھالتے ہی اٹھتے بیٹھتے اس کے باپ نے یہ سمجھایا تھا۔

اس کے پیرنٹس کی اس سے توقعات بہت اونچی تھیں۔ کہیں کوئی کمی وہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ان کی توقعات کے مطابق خود کو ثابت کرنے میں کبھی کبھی تھکنے لگا تھا۔ وہ باپ کو خوش رکھنے کا ہر جتن کرتا تھا۔ جو وہ اس سے توقع رکھتے تھے۔ وہ اس معیار کی کارکردگی دکھاتا، جو وہ اسے حکم دیتے۔ مگر پھر بھی کہیں ذرا سی کمی اگر رہ جاتی تو وہ اس سے ناخوش ہو جاتے تھے۔

اسے کیا پہننا ہے، کیا کرنا ہے، کن لوگوں سے ملنا ہے، کن سے دوستی کرنا ہے، بڑے ہو کر کیا بننا ہے،

سب کچھ اس کے لیے شہریار خان نے سوچا تھا۔ اس کی پسند اور مرضی کا کہیں کوئی دخل نہ تھا۔ انہوں نے اسے بچپن میں بھی دوسرے بچوں کی طرح لاابالی' شرارتی اور لاپروا نہ رہنے دیا تھا۔

وہ شہریار خان کا بڑا بیٹا ہے۔ اسے شہریار خان کا نام اونچا کرنا ہے بچپن کا بے فکرا دور بھی اس نے ذمہ داریوں اور تفکرات کو خود پر مسلط کرکے گنوا دیا تھا۔ وہ نہ دوسرے بچوں کی طرح اپنی مرضی کے کھیل کھیل سکتا تھا' نہ اپنی مرضی سے سو اور جاگ سکتا تھا۔ جو کھیل پاپا کہیں گے' وہ صرف وہی کھیلے گا' وہ باپ سے ڈرتا تھا' وہ ناراض ہوتے تھے تو ان کی آنکھوں کی سختی اسے بہت ڈراتی تھی۔ وہ چیختے چلاتے نہیں تھے' ان کی سرد کاٹتی ہوئی نگاہیں ہی اسے سہمانے کے لیے کافی ہوا کرتی تھیں۔

دوسرے لوگوں کو شاید وہ باپ کا لاڈلا نظر آتا ہوگا کہ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے مگر وہ جانتا تھا' اس کی اموجان جانتی تھیں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ سکندر کی تعریفیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ وہ اپنی خوشی' اپنی مرضی اور اپنے بچپن سے دستبردار ہوکر باپ کی تابع داری کیا کرتا تھا۔ اپنے بچپن' اپنی نوعمری اور نوجوانی کے ہر کھیل کود' تفریح اور انجوائے منٹ کی قربانی دے کر وہ باپ کو خوش کرپایا تھا۔

زین پر باپ کی طرف سے اس طرح کے کوئی پریشر نہ تھے۔ اسے کبھی کبھی زین پر رشک آیا کرتا۔

پھر وہ یہ سوچ کر خوش ہوجاتا کہ چلو باپ کی جانب سے تمام پریشر اور سختی وہ خود جھیل کر زین کو اس پریشر سے بچا رہا ہے تو اچھا ہی ہے۔ ان دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک تو ہر وقت کے اس دباؤ سے خود کو بچالے۔ وہ بارہا محسوس کرتا کہ ان کے معیار پر پورا اترنے کے دباؤ سے آزاد ہوکر وہ زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔

کبھی وہ باپ کی نصیحتوں' دلوائی اور ان جیسا بننے کی باتیں سنتے سنتے تھکنے لگتا تو اسے اپنی ذہانت بری لگنے لگتی۔

کسی ایک آدھ بات میں نہیں' بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں اسے اپنے پاپا کا رویہ ابنارمل لگا کرتا تھا۔ وہ ایک انتہائی سخت مزاج' حاکمانہ طبیعت کے شخص تھے۔ ان کی حکم عدولی کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی اموجان ان کے آگے مؤدب' سر جھکائے رہا کرتی تھیں۔ اس کے پاپا اور اموجان کی شادی اگر نبھی تھی تو اس میں سارا کا سارا کمال اس کی اموجان کے صبر' برداشت اور خاموشی کا تھا۔ ان کی ماں' ان کے باپ کے آگے دبی دبی رہتی تھی اور وہ دونوں بھائی باپ سے اپنے اپنے طور پر خوف زدہ رہتے تھے۔

زین تو شہریار خان کے آگے کچھ بولتا ہی نہیں تھا۔ اس سے چونکہ وہ خود بہت زیادہ بات کرتے تھے' اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے تو وہ ان سے سر جھکا "جی پاپا' اچھا پاپا اور یس پاپا" بول لیا کرتا تھا۔

اس سب کے باوجود بہرحال اسے اپنے پاپا سے پیار تھا' اسے اپنی اموجان سے عشق تھا اور زین ... وہ تو اس کا پیارا سا چھوٹا سا بھائی تھا۔ اس میں تو اس کی جان تھی۔ وہ اس سے صرف دس ماہ چھوٹا تھا مگر اسے یوں لگتا جیسے وہ اس سے بہت چھوٹا ہے۔

اپنی ساری محبت' ساری چاہت اس کا زین پر نچھاور کردینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ اس کی بہت پروا کرتا تھا' بہت خیال رکھتا تھا' وہ اپنے سب کھلونے' اپنی ہر چیز زین کے ساتھ شیئر کرتا تھا' مگر اس کی محبتوں کا جواب زین نے ہمیشہ تلخی ہی سے دیا تھا۔

وہ کبھی بھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ آخر زین کو اس سے شکایت کیا تھی؟ وہ کیوں اتنا اکھڑا اکھڑا اور خفا رہتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے' وہ زین کے اس رویے کا عادی ہوتا چلا گیا۔

یہاں تک کہ زین کا اس کے ساتھ صرف لاتعلقی اور بے گانگی والا رشتہ ہی باقی رہ گیا۔ وہ جتنا زین سے قریب ہونے کے جتن کرتا وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا تھا۔

وہ لاشعور میں ابھرتی اس خوفناک بات کو کبھی شعور

کی سطح پر قصداً "نہیں لایا تھا کہ زین اس سے نفرت کرتا ہے۔ زین بس "مزاجاً" تلخ ہے۔ وہ بھلا اپنے اکلوتے بھائی سے نفرت کیوں کر سکتا ہے؟ وہ اسے ناپسند کیوں کر سکتا ہے؟

یونیورسٹی جا کر تو زین اس سے اتنا دور ہو گیا تھا کہ مہینوں بعد ہی اس کی شکل دیکھ پاتا تھا۔ وہ اسے لاس اینجلس فون کرتا تو وہ اس کی فون کال جیسے بحالت مجبوری سن لیتا، اکھڑے لہجے میں اس کے سوالوں کے جواب دیتا۔ چند منٹوں کی بات کے بعد ہی وہ اپنی کسی مصروفیت کا بہانا کر گفتگو ختم کر دیا کرتا۔

زین کا اکھڑا مزاج، اس کی بے گانگی دل کو چاہے جتنا بھی دکھاتی مگر وہ زین سے کبھی کچھ نہ کہا کرتا، نہ ہی کبھی زین کی بے گانگی کی ماں سے شکایت کیا کرتا۔ البتہ وہ دنوں اس رنج میں مبتلا رہتا کہ اس کا بھائی فون پر اس کی آواز سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ زین کے کسی بھی رویے کو نہ اس نے کبھی ماں سے ڈسکس کیا تھا نہ ہی باپ سے۔ وہ بھائی کے خلاف ماں، باپ سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

زین نے اپنے لیے کسی لڑکی کو پسند کر لیا ہے یہ بات امو جان سے پتا چلی تو اسے حقیقتاً "بھائی کے لیے بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیا پتا اب اس لڑکی کے آجانے کی وجہ سے اس کے بھائی کے مزاج کی تلخی اور کڑوا پن کم ہو جائے۔ زین نے اسے اس قابل نہیں سمجھا کہ اپنی زندگی میں آئی اس خوشگوار تبدیلی کو اس سے شیئر کرتا، اس بات پر دکھ محسوس کرنے کے بجائے وہ بھائی کی خوشی کا سوچ کر ہی خوش ہوئے جا رہا تھا۔

اسے زین اور ام مریم کے رشتے کی ساری تفصیلات امو جان سے پتا چلا کرتی تھیں۔ اس کی ہونے والی بھابھی کا نام ام مریم تھا۔ ابھی اس نے اسے دیکھا نہیں تھا مگر بغیر دیکھے بھی اسے یقین تھا، جسے اس کے بھائی نے چنا ہے، وہ بہت پیاری ہو گی۔

وہ دل و جان سے زین کی منگنی میں شرکت کرنا چاہتا تھا۔ مگر زین کے لیے اس کی شرکت ہرگز اہم نہیں تھی۔

اس نے زین سے فون پر بات کی۔ منگنی وہ تین دن آگے بڑھا لے، کی ضد کی، وہ بہت خوش تھا، مگر زین کے خشک اور سرد سے انکار نے اسے بالکل گم صم سا کر دیا تھا۔

زین کے لیے اس کا ہونا یا نہ ہونا بالکل بھی اہم نہیں تھا۔ بلکہ اسے زین کے لہجے کی بے مروتی سے یہ احساس ہوا تھا جیسے زین چاہتا ہے کہ وہ اس کی منگنی میں شریک نہ ہو۔

وہ کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا تو زین اور ام مریم کے لیے الگ الگ تحائف لایا۔ وہ بھائی سے بہت دنوں بعد مل رہا تھا۔ اپنی ہونے والی بھاوج سے بھی وہ پہلی بار مل رہا تھا۔ اس لیے بہت خوش تھا۔ اس کی فرمائش پر امو جان نے اسے زین کی منگنی کی تصاویر بھیجی تھیں اور ان میں اسے اپنی بھابھی بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے بھائی کو ایسی ہی پیاری سی لڑکی ملنی چاہیے تھی، مگر جب وہ اپنے گھر آیا تو زین اس سے اسی انداز میں ملا جیسے ہمیشہ ملا کرتا تھا، بے گانگی اور بے رخی والا انداز۔ اور ام مریم؟

وہ اس سے زندگی میں پہلی بار مل رہا تھا، وہ اس کے بھائی کی منگیتر اور ہونے والی بیوی ہے، اس کی بھابھی ہے، وہ اس سے اسی انداز میں ملا تھا جو اس رشتے کا تقاضا تھا مگر سب کے درمیان بیٹھے پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ام مریم اسے بہت غور سے دیکھے جا رہی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتا تو وہ نگاہیں ادھر ادھر کر لیتی، وہ نگاہیں ہٹاتا تو وہ پھر اسے دیکھنے لگتی۔ شاید وہ اس سے پہلی بار مل رہی تھی، اس لیے اسے اس طرح دیکھ رہی تھی۔

وہ اگلی صبح بھی گرم جوشی اور محبت سے ام مریم سے باتیں کر رہا تھا۔ زین کو زبردستی گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ام مریم اس کے ہارورڈ میں پڑھنے سے متاثر ہو رہی تھی، پتا نہیں کیوں، مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہو رہی تھی، مگر اس نے اس بات کو بہت مثبت انداز میں لیا تھا۔

اس نے تو اس بات پر بھی ہرگز کچھ نہیں سوچا تھا کہ ام مریم اپنی شخصیت کی خوبیاں، غیر معمولی ذہانت اور خود اعتمادی قصداً" اس کے سامنے نمایاں کیوں کررہی تھی۔ اگر اس کی چھٹی حس اسے کچھ بتا بھی رہی تھیں تو وہ اسے جان بوجھ کر اپنی سوچوں میں آنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ ام مریم کی خود پر غیر معمولی توجہ کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کررہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر اسے اپنا وہم سمجھ نہیں سکا تھا۔

اسی شام جب وہ سب ڈنر کرنے گئے تب ام مریم نے زین کے برابر بیٹھنے کے بجائے اس کے برابر والی کرسی بیٹھنے کے لیے منتخب کی تو کسی اور نے اس بات کو محسوس کیا ہو یا نہیں' اس نے ضرور محسوس کیا۔ ام مریم کھانے کے دوران زین کو نظر انداز کرکے سارا وقت اس کی جانب متوجہ رہی تھی۔ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی۔ ام مریم ایسا کیوں کررہی تھی۔ کیا اس سے یہ انجانے میں ہو رہا تھا' وہ سادہ اور نادان تھی یا وہ جان کر زین کے بجائے اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وجہ جو بھی تھی اس کے دل کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔

وہ قصداً" سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ ام مریم کے ساتھ اب بے تکلفانہ بات چیت نہیں کرے گا۔ تھوڑا سا نارمل انداز اپنالے گا۔ مگر اس ڈنر کے دوران بھی' اس ڈنر کے بعد بھی' گھر آکر بھی' اگلی صبح بھی ام مریم اپنے ہر انداز سے اسے یہ جتا رہی تھی کہ وہ اس کی جانب ملتفت ہے۔ وہ اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔

وہ بڑے خاص انداز سے اسے دیکھ کر مسکراتی۔ اسے یہ سگنل دے رہی تھی کہ وہ اسے پسند کررہی ہے اور وہ اس کی ان نگاہوں کو یوں نظر انداز کررہا تھا' جیسے ام مریم کی توجہ کے معنی سمجھ ہی نہ رہا ہو۔ شاید کم عمری کی وجہ سے ام مریم اس طرح کی حرکت کررہی تھی۔

اس نے اس کے ساتھ اپنا رویہ سرد اور خشک سا بنالیا تھا۔ وہ اپنے رویے سے اسے اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

یہ بات ایسی تھی کہ وہ اسے کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس سب کو ام مریم کی کم عمری نادانی اور بچپنا ہی سمجھ رہا تھا۔ اپنے رویے کو اس نے بے شک سرد اور خشک بنالیا تھا مگر وہ اسے کوئی بری لڑکی ہرگز نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر وہ لڑکی ہر اگلے لمحے اسے یہ بتا رہی تھی کہ وہ نادان نہیں ہے' وہ بچی نہیں ہے۔ وہ ڈرائی فروٹس کھاتا ٹی وی دیکھ رہا تھا تب زین کے سامنے اس کی موجودگی میں وہ اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ اس کی پلیٹ سے ڈرائی فروٹس کھاتے اور اس کے ہاتھ سے ریموٹ لیتے ام مریم نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ وہ بدلحاظی سے اسے جواب دیتا وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ اسی رات ان کے گھر ہونے والی پارٹی میں وہ بطور خاص اس کے پاس آئی تھی۔

"بہت ہینڈسم لگ رہے ہو تم سکندر! آج اس پوری پارٹی میں تمہارے جیسا کوئی ایک فرد بھی نہیں لگ رہا۔"

اسے اندر ہی اندر بہت دکھ بھی ہوا تھا اور ام مریم کے اوپر غصہ بھی آیا تھا۔ وہ پوری طرح سجی سنوری اس کی تعریف کرتی اسے اپنی جانب مائل کرنے کی کوئی چھپی کوشش نہیں کررہی تھی۔ وہ اپنی نگاہوں سے اسے پسندیدگی کا بڑا واضح پیغام دے رہی تھی۔

"تھینکس... ویسے مریم! میرا خیال ہے میں تم سے عمر میں زیادہ بڑا نہ سہی' مگر رشتے میں تو بڑا ہوں۔ تم مجھے سکندر بھائی بولا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔"

بغیر مسکرائے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں یہ تنبیہہ موجود تھی کہ ام مریم ان کے رشتوں کا احترام یاد رکھے۔

"اتنی حسین لڑکی تعریف کرے تو کیا یہ فضول سا جواب دیا کرتے ہیں؟" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"ہونے والی بھابھی تعریف کرے جو بالکل چھوٹی بہن جیسی لگتی ہو تو یہی جواب دیا جانا چاہیے۔"

وہ بات مکمل کرتے ہی وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ زین وہیں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور وہ لڑکی زین کی

آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔ اس روز اسے پہلی بار زین کے انتخاب پر افسوس ہوا تھا۔ وہ جو اپنی شخصیت کی تمام تر خوبیوں اور خصوصیات کا بھرپور استعمال کر کے زین کے بھائی کو اپنی جانب متوجہ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کیا کرے؟ وہ کس سے کہے یہ بات؟ کیسے کہے یہ بات؟ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ام مریم اور زین دونوں ہی کو نظر انداز کر کے پڑھائی اور امتحانات کا بہانہ بنا کر زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جلد از جلد بوسٹن واپس چلا جائے۔ مگر شہریار خان کی مرضی اور اجازت کے بغیر وہ واپس جا نہیں سکتا تھا۔ اور انہوں نے اس کے لیے یہی پروگرام طے کیا تھا کہ وہ چھٹیاں ختم ہونے تک یہیں پر رہے گا۔ ان چھٹیوں کے دوران شہریار خان اسے اپنے مختلف دوستوں اور واقف کاروں سے ملوانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اس کے عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے انتہائی ضروری تھا کہ اسے شہریار خان کے بااثر ملنے جلنے والوں میں باضابطہ اور باقاعدہ تعارف حاصل ہو سکے۔

سب پکنک پر جا رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گھر پر رک جائے مگر وہ اپنے نہ جانے کی کیا توجیہہ پیش کرتا؟ شہریار خان نے یہ پروگرام اپنے دونوں بیٹوں اور ہونے والی بہو کی خاطر ہی بنایا تھا۔ سب گھر سے نکل رہے تھے۔ بالکل آخری لمحوں میں اپنا کیمرا نہ ملنے کا بہانہ بنا کر ام مریم نے ایسی صورت حال پیدا کی کہ گھر سے نکلنے والے آخری دو افراد وہ دونوں رہ گئے تھے۔ وہ اس کا کیمرا ڈھونڈتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس لڑکی کا کیا ایک ڈراما ہے تاکہ وہ پکنک اسپاٹ تک سکندر کے ساتھ اس کی گاڑی میں جا سکے۔

اسے ام مریم کی خود پر توجہ سمجھ میں آ چکی تھی مگر ابھی تک اس لڑکی کے شاطرانہ دماغ تک وہ پہنچ نہیں پایا تھا۔ وہ اسے ایک نادان اور جذباتی لڑکی سمجھ رہا تھا' جو اس کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی۔ وہ

دونوں گاڑی میں ساتھ جا رہے تھے۔ وہ قصداً" سنجیدہ اور لیا دیا سا تھا۔

ام مریم اس سے ادھر ادھر کے عام موضوعات پر بات کر رہی تھی اور وہ سنجیدگی سے ایک بڑے بھائی کا سا انداز بنا تا اس کی باتوں کے جواب دے رہا تھا۔

"تمہاری معلومات کتنی زبردست ہیں سکندر! تمہارا مطالعہ کس قدر قابل رشک ہے۔ ہارورڈ میں پڑھ رہے ہو تو بالکل ٹھیک پڑھ رہے ہو۔ تم ڈیزرو کرتے ہو وہاں پڑھنا۔ بہت غیر معمولی ہو تم۔ تمہاری پرسنالٹی بہت کریزمٹک اور شاندار ہے۔" باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم ہی بولی تھی۔

"تھینکس مریم!" اس نے قصداً" طاری کیے بڑے پن کے ساتھ ہلکی مسکراہٹ چہرے پر لا کر اسے یوں جواب دیا جیسے اس کی تعریف میں چھپی کوئی بات اس نے محسوس نہیں کی ہے۔

"زین تمہارے جیسا غیر معمولی ذہین اور شاندار نہیں ہے۔ سچ بولوں تو مجھے تم دونوں سگے بھائی ہی نہیں لگتے ہو۔ کہاں تم' تمہاری اس قدر شاندار پرسنالٹی اور ذہانت' کہاں زین جیسا میڈیاکر (اوسط درجے کا) بندہ۔ اس میں تم جیسی کوئی ایک بھی بات نہیں ہے۔ تم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے آگے تو زین بالکل ہی معمولی سا لگتا ہے۔"

اسے مریم کا زین کی برائی کرنا بہت برا لگا تھا۔

"میرے بھائی کی برائی میرے منہ پر کرتے ہوئے تمہیں یہ سوچ لینا چاہیے مریم! کہ میں اپنے بھائی کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے خفا سی نگاہوں سے ام مریم کو دیکھا تھا۔

"میں برائی نہیں کر رہی۔ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ تم راہ چلتے کسی اجنبی شخص سے بھی زین کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے پوچھ لو کہ تم دونوں میں سے کون زیادہ اچھا لگتا ہے تو وہ بھی کہے گا جو میں کہہ رہی ہوں۔"

"زین بہت ذہین لڑکا ہے مریم! اس میں ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جو مجھ میں نہیں۔ تم خوش قسمت ہو جو

تمہیں زین کا ساتھ ملا ہے۔" اس کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

"ہاں، زین اچھا ہے، پر تم جیسا نہیں ہے۔ میں اگر تم سے پہلے مل چکی ہوتی تو زین میرا انتخاب کبھی نہ ہوتا۔ مجھے ایکسٹرا آرڈنری (غیر معمولی) ذہین اور لیڈر شپ کی صلاحیت رکھنے والے مرد پسند ہیں۔ خود مجھ میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ کاش! زین سے منگنی کرنے سے قبل میں تم سے مل لی ہوتی۔ تمہیں یہاں پہلی نظر دیکھ کر ہی میں دنگ رہ گئی تھی سکندر! تم ہو سو میرا آئیڈیل ہو۔ میرا آئیڈیل، جو مجھے لگتا تھا کہیں وجود نہیں رکھتا۔ تب ہی تو میں زین جیسے میڈیاکر کے ساتھ سمجھوتا کر بیٹھی تھی۔ تمہیں نہیں لگتا سکندر! میں اور تم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں؟ ہم میں بہت Campatibility (مطابقت) ہے۔"

وہ بہت دلنشین لہجے میں یہ باتیں کر رہی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور بیس اکیس سال کا لڑکا ہوتا تو اتنی حسین لڑکی کے لبوں سے اپنی تعریفیں سن کر خوشی سے ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا، جھوم جھوم جاتا مگر وہ سکندر شہریار۔۔۔ اتنا چیپ اور گھٹیا نہیں تھا۔ اسے ام مریم کی باتیں سن کر غصہ آگیا تھا۔ اس نے شدید غصے اور ناراضی سے ام مریم کو دیکھا تھا۔

"تمہیں اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہیے مریم! تم میرے بھائی کی منگیتر ہو، میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ پلیز رشتوں کا احترام کرنا سیکھو۔"

اس کا لہجہ تنبیہی تھا۔ اسے خود اپنے آپ میں بڑی شرم آرہی تھی، سوکھ بھی ہو رہا تھا کہ اس کے بھائی کی منگیتر اس سے کس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔ اسے کس طرح نثار ہو جانے، مر مٹنے والے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"ابھی میری زین سے شادی نہیں ہوئی ہے سکندر! صرف منگنی ہوئی ہے، جو توڑی بھی جا سکتی ہے۔ مجھ سے اگر ایک غلط فیصلہ ہو گیا ہے تو ابھی میں اسے ٹھیک کر سکتی ہوں۔ صرف ایک انگوٹھی ہی تو ہے، میں زین کو لوٹا دوں گی۔ تم زین کا مت سوچو سکندر! اپنا سوچو۔ مجھ جیسی لڑکی تمہیں دنیا میں کوئی اور نہیں ملے گی۔ اپنے دل سے پوچھو۔ کیا تمہارا دل میرا ساتھ نہیں چاہتا؟ کیا تمہارے دل کی یہ آرزو نہیں کہ تمہیں مجھ جیسی لڑکی کا ساتھ ملے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں سکندر! ہمارا ملنا بے شک بہت عجیب حالات میں ہوا ہے، تمہارے لیے یہ خاصی آکورڈ سی سچویشن ہے، میں تمہارے بھائی کی منگیتر ہوں، میں تمہاری الجھن سمجھ سکتی ہوں مگر پلیز! زین کا مت سوچو، لوگوں کا مت سوچو۔ اپنا سوچو۔ میں تمہاری خاطر آج اور ابھی زین سے منگنی توڑنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں سکندر! میں اپنی ساری زندگی تمہارے نام کر دینا چاہتی ہوں۔"

اس کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ کے اوپر ام مریم نے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے دھکیلا تھا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔ وہ تیز آواز میں چلایا تھا۔

"شٹ اپ ام مریم! جسٹ شٹ اپ۔ کس طرح کی لڑکی ہو تم؟ تمہارے اندر رشتوں کی کچھ عزت ہے کہ نہیں؟"

اپنا اشتعال قابو کرتا وہ شدید برہمی سے ام مریم کو دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ وہ بالکل خاموش رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنے غصے پر کچھ قابو پالیا تب انتہائی سخت لب و لہجے میں اس سے بولا۔

"اس طرح کی گھٹیا بات مجھ سے پھر مت کہنا مریم! تم سے میرا صرف اور صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ تمہارا زین کی منگیتر ہونا ہے۔ یہ گھٹیا باتیں کر کے میرے دل سے اپنی عزت ختم مت کرواؤ۔"

اتنے سخت لب و لہجے میں اسے ڈانٹنے کے بعد وہ سمجھ رہا تھا کہ ام مریم کی آج کے بعد دوبارہ ایسی بات کرنے کی جرأت نہیں ہوگی، مگر وہ غلط تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ شدت سے اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ وہ باتوں کے دوران سارا وقت اس کے آس پاس رہنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کا غصہ اور ناپسندیدگی اب اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ جانتا تھا، وہ

سب کے سامنے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے مریم کے ساتھ باتیں کرنے، کھیلنے، اٹھنے، بیٹھنے کسی بھی چیز میں قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

زین کو ام مریم پر نثار ہوتا دیکھ کر اسے زین پر بہت افسوس ہو رہا تھا، شدید رنج ہو رہا تھا۔ اس کا ایک بار نہیں کئی بار دل چاہا تھا وہ زین کو اکیلے میں اپنے پاس بلا کر یہ بات بتائے کہ جس لڑکی پر وہ دیوانہ وار اپنی چاہتیں اور محبتیں نثار کر رہا ہے وہ آج پکنک پر آتے ہوئے سارا راستہ زین کا مذاق اڑاتی آئی ہے۔ وہ زین سے کہنا چاہتا تھا کہ زین یہ لڑکی تمہاری چاہت اور محبت ڈیزرو نہیں کرتی۔ وہ لڑکی جھوٹی محبتیں جتا کر اس کے بھائی کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

وہ زین کو ام مریم کی ایک ایک بات بتا دینا چاہتا تھا۔ مگر کیا زین اس کی کوئی بات سنے گا؟ زین اس سے جتنا بے زار، بدگمان اور خفا رہتا تھا۔ یقیناً" وہ اس کی بات سننے سے پہلے ہی اکھڑ جاتا۔

وہ لڑکی زین کی آنکھوں کے سامنے اسے اپنی محبت سے بے وقوف بناتی اس کے بھائی سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ زین کو کسی بھی طرح یہ بات بتا دے۔ مگر زین کا اپنے ساتھ سرد اور خشک رویہ اسے کچھ کہنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ہمت کرتا، پھر زین کی نگاہوں کی بے گانگی اور نفرت دیکھتا تو ہمت ٹوٹ سی جاتی۔

اسے ام مریم بہت بری لگ رہی تھی۔ وہ سادہ اور نادان نہیں بہت چالاک لڑکی تھی۔ اسے زین کی معصومیت اور سادگی پر غصہ آرہا تھا۔ زین اس طرح اندھا اعتماد کیوں کرتا تھا اس لڑکی پر؟ زین کو اس لڑکی کے ارادوں کی خبر کیوں نہیں ہو رہی تھی؟ مگر زین تو ابھی چھوٹا تھا اس لڑکی نے تو اس کے پاپا تک کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ شہریار خان ام مریم کو اپنی ہونے والی بہو کے طور پر دل و جان سے قبول کر چکے تھے۔ وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔

اس نے دبے لفظوں میں انہیں ام مریم کے متعلق بتانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کی بات کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ نہ شہریار خان اور نہ ہی امو جان نے اس کی بات پر توجہ دی تھی۔ الٹا زین اس سے خفا ہو گیا تھا کہ اس نے مریم سے بد اخلاقی سے بات کی ہے۔

ذہانت سے کام نہ چلتا دیکھ کر ام مریم نے اسے راغب کرنے کے لیے اپنی خوبصورتی کو استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے قصداً" بہت تیار ہو کر آتی۔ اپنی بے تحاشا خوبصورتی اس پر ظاہر کرتی۔ اس طرح کہ کوئی کم عمر لڑکا تو کیا کوئی بڑی عمر کا مرد ہو تو وہ بھی بھٹک جائے" اس نے ام مریم کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔

اس نے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے پر جب زین اور ام مریم یہاں سے چلے جائیں گے تب

وہ اپنا جانا ایک دو دن بڑھا لے گا۔ اور کوشش کرکے یہ بات امو جان کو تو ضرور بتا کر جائے گا۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔ وہ صرف کھانے اور ناشتے کے لیے کمرے سے نکلا کرتا تھا۔ وہ اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ لڑکی اپنی کوششوں میں نہ تو تھک رہی تھی نہ ہی ہار مان رہی تھی۔

وہ تیس دسمبر کی رات تھی جب وہ اپنے کمرے میں تھا۔ وہ خود کو قصداً "پڑھائی" میں مصروف کیے ہوئے تھا۔ یہ اس کے علم میں تھا کہ شہریار خان اور امو جان کسی پارٹی میں گئے ہوئے ہیں، مگر زین کہاں چلا گیا تھا اسے پتا نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر کتاب لے کر بیٹھا تھا، تب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ام مریم تھی۔

اس سے پہلے تک وہ جو کچھ کرتی رہی تھی وہ اس پر حیران ہوا تھا، پریشان ہوا تھا، گھبرایا تھا، دکھ میں مبتلا ہوا تھا۔ مگر آج وہ جس طرح اس کے کمرے میں آئی تھی اسے دیکھ کر تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت قیامت کے روپ میں اس کے سامنے بڑی ادا سے کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی انتہائی مختصر سی نائٹی پہن رکھی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے، خوبصورت میک اپ کیا ہوا تھا۔ خوشبوؤں میں مہکتی وہ ایک زندہ قیامت بنی کسی بھی ذی ہوش مرد کی پارسائی کا کڑا امتحان بن سکتی تھی۔

اسے اس روپ میں دیکھ کر کوئی کتنا بھی پارسا ہو، بہک سکتا تھا۔ پہلا احساس شرم اور غیرت کا تھا جو اس کے اندر پیدا ہوا تھا اور اگلا شدید ترین اشتعال کا۔ وہ ایک دم ہی شدید غصے کے عالم میں بیڈ سے اٹھا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے مریم!" وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر تھیں۔

ام مریم اسے خود سے نظریں کتراتا دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس کے پاس آگئی تھی۔

"میری طرف دیکھنے سے کیوں ڈر رہے ہو سکندر! کیا اپنے بہک جانے کا ڈر ہے؟"

وہ اس کے بالکل نزدیک آگئی تھی۔ اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈالی تھیں۔ وہ اس کے اس قدر نزدیک تھی کہ وہ اس کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔

"ہٹو یہاں سے۔" اس نے اسے دھکیل کر خود سے دور ہٹانا چاہا تھا مگر وہ ہٹی نہیں تھی۔ وہ دعوت گناہ دیتی خود کو اس پر نچھاور کر رہی تھی۔

"فرشتہ بننے کی کوشش مت کرو سکندر! تم ایک لڑکے ہو، تمہارے سامنے ایک حسین لڑکی کھڑی ہے۔ جو تم پر مر مٹ چکی ہے۔ اپنا آپ تمہارے قدموں میں نچھاور کر چکی ہے۔ تم آج وہ کرو، جو تمہارا دل تم سے کہہ رہا ہے۔"

اس نے ایک زوردار طمانچہ اس بے غیرت لڑکی کے منہ پر مارا تھا۔ وہ جو اس کے گلے میں بانہیں ڈالے خود سپردگی کے عالم میں کھڑی تھی اس تھپڑ کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اوندھے منہ پیچھے گری تھی۔ اس نے ام مریم کے پاس زمین پر تھوکا تھا۔

"بہت گھٹیا، بہت پیچ لڑکی ہو تم۔ میں خود تو کیا اب میں زین کو بھی تم سے شادی نہیں کرنے دوں گا۔ ایسی بدکردار لڑکی میں اپنے بھائی کی زندگی میں کبھی نہیں آنے دوں گا۔"

ام مریم فرش پر سے واپس اٹھی تھی۔ وہ کسی ناگن کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ پھنکار رہی تھی۔

"ام مریم کو ٹھکرانے کی ساری زندگی کوئی ہمت نہیں کر سکا ہے سکندر شہریار! لوگ ام مریم کے پیچھے آتے ہیں۔ تم پہلے شخص تھے جس کے پیچھے ام مریم آئی تھی۔ جس پر ام مریم حقیقت میں مر مٹی تھی۔ مجھے تھپڑ مار کر تم نے اچھا نہیں کیا ہے سکندر۔ تم نے اپنے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا سکندر۔"

وہ نفرت سے پھنکارتی دھمکی آمیز لہجے میں اپنی بات پوری کرتے ہوئے اس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ شرم اور غیرت سے کتنی دیر تک مٹھیاں بھینچے کھڑا رہا تھا۔ وہ ہرگز ہرگز اس کے بھائی کے قابل نہیں

تھی۔ وہ فیصلہ کرچکا تھا' چاہے کچھ ہوجائے وہ زین کو اس بدکردار لڑکی سے شادی نہیں کرنے دے گا۔ وہ شہریار خان اور اپنی اموجان کو تو ساری بات بتا کرہی دم لے گا۔ مگر اگلی صبح ناشتے کی میز پر جب اس نے یہ بات شہریار خان اور اموجان کو بتانے کی کوشش کی تو مارے شرم اور غیرت کے بات مکمل طور پر اس کے لبوں سے ادا ہی نہیں ہوپائی۔

بہت کوشش کے باوجود وہ سچ بول نہیں پایا۔ اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ شرم اور غیرت نے اس کی نگاہوں کو جھکا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہریار خان جیسے ذہین شخص اس کے نامکمل جملوں ہی سے بات کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے مگر اس بدکردار چالاک لڑکی میں نجانے کیا جادو تھا کہ وہ جو لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر پہچان لیا کرتے تھے اس کے بتا دینے پر بھی بات کی سچائی اور سنگینی کو سمجھ نہ سکے۔

زین میں بچپنا اور معصومیت تھی' وہ اس لڑکی کی اصل فطرت کو نہیں جان پایا تھا مگر شہریار خان جیسے جہاں دیدہ شخص بھی اسے پہچان نہیں پائے تھے۔ وہ اور اموجان ام مریم کو ایک بہت اچھی' اعلا خاندان کی باکردار لڑکی سمجھتے تھے۔ وہ اس کی بات کو اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔

وہ جھنجلا کر ناشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ ناشتے کی میز پر اس کی کہی باتیں زین نے بھی سن لی ہیں۔ وہ ابھی اپنے کمرے میں بیٹھا الجھ ہی رہا تھا کہ سچائی کس طرح اپنے ماں' باپ تک پہنچائے کہ زین اس کے کمرے میں آگیا۔ وہ زین کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر خوشی سے اٹھا تھا کہ برسوں بعد زین نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زین اس سے لڑنے آیا ہے، مگر وہ اس کے پاس آیا تو تھا نا چاہے خفا ہو کر ہی سہی، مگر زین اس سے لڑنے یا خفا ہونے نہیں آیا تھا۔

وہ اس پر اپنی نفرت ظاہر کرنے آیا تھا۔ وہ زین کے زہر میں بجھے' نفرت میں ڈوبے لفظوں پر ساکت کھڑا تھا۔ زین اس سے خفا نہیں رہتا تھا' وہ اس سے بدگمان نہیں رہتا تھا' وہ ہزاجا' تلخ نہیں تھا' وہ اس سے نفرت کرتا تھا' شدید نفرت۔ وہ اسے اپنا دشمن سمجھتا تھا' اپنا سب سے بڑا دشمن۔ پہلی بار لاشعور سے نکل کر یہ بات اس کے شعور میں آکر اسے بتا رہی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی اس سے نفرت کرتا ہے' شدید ترین نفرت۔

وہ دکھ اور صدمے سے گنگ کھڑا تھا۔ زین اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی خوشیوں سے حسد کررہا ہے اس لیے ام مریم کے خلاف بول رہا ہے۔ اس نے زین کو سچائی بتانے کی کوشش کی تھی مگر جہاں نفرتوں کی ایسی دھند چھائی تھی وہاں زین اس کی کوئی بھی بات کیسے سمجھتا۔ وہ اس بدکردار اور مکار لڑکی کے سحر میں بری طرح گرفتار تھا۔

زین اپنی نفرت کا سارا زہر اگل کر اس کے کمرے سے جاچکا تھا۔ وہ کتنی دیر بالکل سن سا اپنی جگہ پر کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ خود کو اس کیفیت سے باہر نکال پایا تو مایوسیوں میں گھر کے اس نے سوچا کہ کیا وہ زین کی نفرت کے آگے ہتھیار ڈال رہا ہے' ہار مان رہا ہے؟ وہ اپنے بھائی کی زندگی تباہ ہونے دے رہا ہے؟

نہیں' وہ زین کی نفرتوں اور الزام تراشیوں سے ہار نہیں مانے گا۔

وہ آج ہی شہریار خان کو ساری بات بتائے گا۔ ایک ایک بات۔ ام مریم کی ساری سچائی۔ وہ شہریار خان کو ام مریم کا اصل چہرہ دکھا کرہی دم لے گا۔ وہ اپنے بھائی کی زندگی تباہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ زین کا ام مریم کے ساتھ رشتہ ختم کروا کرہی دم لے گا۔ وہ شہریار خان کو ام مریم کی حقیقت' اس کی گھناؤنی سچائی بتانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین' سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم' زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں امو جان رو' رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں' وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے' ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوبئی چلا جاتا ہے لیزا کو ہر ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم' محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے۔ ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوبئی میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوبئی آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے' اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

۸
آٹھویں قسط

شہریار خان کو تلاش کرتا وہ اسٹڈی میں آگیا تھا۔ وہ وہاں موجود تھے مگر تنہا نہیں تھے۔ ان کے تین چار خاص' ہم رتبہ دوست بیٹھے تھے۔ ان کے دوستوں سے سلام دعا کر کے وہ واپس پلٹ آیا تھا۔ وہ اب ان کے دوستوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

امو جان چونکہ زین اور ام مریم کے ساتھ لونگ روم میں تھیں' اس لیے امو جان کے پاس جانے کی تو وہ کوشش ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس گھٹیا لڑکی کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ پڑھائی کا بہانہ بنا کر وہ اپنے کمرے بند پڑا تھا۔

امو جان زین اور مریم کے ساتھ مستقل کیوں تھیں۔ یہ جاننے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ اب فیصلے کے تمام اختیار شہریار خان کے پاس تھے تو پھر یہ بات انہیں سے کی جانی چاہیے تھی۔ ان کے دوست سارا دن ان کے ساتھ گزار کر شام میں اس وقت گئے تھے، جب ان کے اپنے جرمن دوست کے ہاں پارٹی میں جانے کا وقت ہونے لگا تھا۔ وہ ان کے دوستوں کے چلے جانے کا سن کر فوراً" کمرے سے نکلا تھا۔ شہریار خان اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ سکندر نے انہیں پیچھے سے آواز دی تھی۔

"بابا!" شہریار خان نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"میں واپس آجاؤں، پھر رات میں بات کرلینا۔ یہ لوگ اتنی دیر سے اٹھے ہیں۔ میں پارٹی میں جانے کے لیے لیٹ ہوگیا ہوں۔"

کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے اور اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر شہریار خان اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

وہ مایوسی سے اپنے کمرے میں واپس آگیا تھا۔ اتنا تو اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سنے بغیر سوئیں گے نہیں۔

اسے پتا نہیں تھا کہ یہ چند گھنٹوں کا انتظار کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس کی بات اب مرتے دم تک نہیں سنی جائے گی۔ وہ آج کی پارٹی میں جانے کے لیے کل شام ہی منع کرچکا تھا۔ کل شام تک ام مریم کا اصلی اور گھناؤنا روپ اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔

اس کے علم میں یہی تھا کہ گھر کے تمام افراد پارٹی میں جاچکے ہیں اور وہ گھر پر اکیلا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بیماری کا ڈھونگ رچا کر وہ بدکردار لڑکی بھی گھر پر رکی ہوئی تھی۔ نئے سال کا جشن منانے کے لیے شہریار خان نے آج شام سے لے کر کل صبح تک کے لیے گھر کے تمام ملازمین کو بھی چھٹی دے رکھی تھی۔ اپنے حساب سے وہ گھر پر تنہا تھا۔ تب ہی جب اسے لونگ روم میں کچھ گرنے کی آواز آئی تو وہ بری طرح چونکا۔ وہ فوراً" اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آیا تھا۔

"تم؟" وہ ام مریم کو لونگ روم میں کھڑے دیکھ کر حیران بھی ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نفرت بھی ابھر آئی تھی۔ کل رات کی اس کی بے ہودہ حرکت کے بعد اب وہ اس لڑکی کے لیے سوائے حقارت اور نفرت کے کچھ بھی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔

ام مریم پرسکون اور مطمئن کھڑی تھی۔ سینٹر ٹیبل کے پاس کرسٹل کا گلدان ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ فوری طور پر یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ گلدان اسے متوجہ کرنے اور یہاں بلانے کے لیے ہی اٹھا کر زور سے پھینکا اور توڑا گیا تھا۔

وہاں چند اور بھی آرائشی اشیا فرش پر گری اور ٹوٹی پڑی تھیں۔ وہ ذرا سا بھی اس لڑکی کی نیت اور اس کے ارادوں کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ وہ وہاں ٹوٹی پڑی ان اشیا پر نہ تو دھیان دے سکا تھا اور نہ ہی ان کے گرائے جانے کی وجوہات سوچ پایا تھا کیونکہ مرمٹنے والی نظروں سے اسے دیکھتی ام مریم اس کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

"ہاں میں۔" وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے قمیص کا گریبان بڑی سہولت سے کھولا تھا۔ گردن سے بہت نیچے تک، پھر جینز کی جیب سے اس نے ایک بلیڈ نکالا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ادا سے اپنے ٹاپ پر کئی جگہ سے کٹ لگا رہی تھی، وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی خود سپردگی والے انداز میں بہک جانے پر آمادہ کرنے والے انداز میں۔

"کیا مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ بھی نہیں ہوتا سکندر!" وہ نشیلے لہجے میں بولتی اس کے بالکل نزدیک آگئی تھی۔

وہ اسے گناہ کی ترغیب دے رہی ہے۔ وہ سوچ سکا تھا تو بس اتنا ہی۔ وہ اس کے ارادوں کی بھنک بھی نہ پاسکا تھا۔

جن نظروں کو وہ مخمور، نشیلی اور دعوت گناہ دیتی نظریں سمجھ رہا تھا' ان میں چھپی انتقام کی آگ وہ پہچان ہی نہ سکا تھا۔ گھر' کلاس روم' لائبریری اور کتابوں سے نکل کر دنیا کو ابھی اس نے ٹھیک سے سمجھا نہیں تھا۔ وہ سادہ معصوم اور بے وقوف و نادان زیادہ تھا' یا وہ ناگن صفت لڑکی چالاک' مکار اور شاطر زیادہ تھی' جو اس کے گھر کے لونگ روم میں اپنی مرضی کا ماحول اور صورت حال پیدا کر رہی تھی۔

"جو تھوڑا بہت لباس تمہارے جسم پر باقی بچا ہے تم اسے بھی اتار کر پھینک دو۔ میں تب بھی تمہارے اوپر تھوکنا تک پسند نہیں کروں گا۔"

وہ نفرت اور حقارت سے اسے جواب دیتا وہاں سے واپس پلٹ جانا چاہتا تھا کہ ام مریم نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچ کر روک لیا۔

"اتنا غرور کس بات پر ہے تمہیں سکندر شہریار!"

یوں پوری طاقت سے گریبان کھینچے جانے سے اس کی قمیص کے کئی بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس کی قمیص کا گریبان پھٹ گیا تھا۔ وہ دھتکار کر اسے پیچھے ہٹانا چاہتا تھا کہ ام مریم نے زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔

وہ نوجوان لڑکا تھا' اس لڑکی کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور۔ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے جواب میں بھرپور طاقت کے ساتھ ام مریم کو دو تھپڑ مارے تھے۔ اس کی انگلیوں کے نشان اس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے۔ وہ فرش پر گری' مگر گرتے گرتے بھی اس نے سکندر کی آستین پوری قوت سے پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ اس حرکت کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا' اس لیے بے ڈھب طریقے سے ام مریم کے ساتھ وہ بھی فرش پر گر پڑا۔ اس بے ڈھنگ طریقے سے گرنے سے دونوں کو چوٹیں آئیں۔ مگر وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرانے لگی۔

"کیا ابھی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کر تمہیں کچھ نہیں ہو رہا سکندر!" اس کے کارپٹ سے اٹھنے سے قبل وہ اس کے اوپر تھی۔ سکندر نے اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے اوپر سے ہٹانا چاہا تھا۔ وہ اس ناگہانی صورت حال میں گاڑی کی آواز بھی نہیں سن سکا مگر گاڑی سے تحائف جس نے جان بوجھ کر گھر والوں کو واپس بلانے کے لیے نکالے تھے اور جو گھر والوں کی واپسی کی منتظر تھی اسے گاڑی کی آواز کیوں نہ آتی۔

وہ یکدم ہی مسکرائی تھی۔ اس نے مریم کے چہرے پر ایک چمک آتی دیکھی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑے مخمور انداز میں جھکی مگر ایک دم اس نے سکندر کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ اسے اشتعال دلانا چاہتی تھی اور وہ فوراً ہی اشتعال میں آگیا۔ اس نے بہت غصے سے مریم کو بال پکڑ کر دھکا دے کر ہٹایا تھا۔ ہٹتے ہٹتے بھی مریم نے پیر مار کر کارپٹ پر رکھا بڑا سا گلدان گرا دیا تھا جس کے گرنے سے بہت شور پیدا ہوا تھا۔ مریم نے اپنے ناخن اس کی گردن میں پیوست کر رکھے تھے۔ اپنے ایک ہاتھ سے وہ مریم کے ہاتھ اپنی گردن پر ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے بال پکڑ کر کھینچے تھے تاکہ وہ اس کی گردن پر سے اپنے ہاتھ ہٹا دے۔ ام مریم زہریلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اور پھر یکدم ہی اس نے "بچاؤ' بچاؤ" کی آوازیں نکالنی شروع کر دی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو حواس باختہ سا ہو کر اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

اور جب تک وہ سمجھ سکا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ زین' شہریار خان اور امو جان اندر آچکے تھے۔ اپنے رد کیے جانے' ٹھکرائے جانے کا بدلہ وہ اسے اس کے گھر والوں کی نظروں سے گرا کر لینا چاہتی تھی۔ اس بے غیرت لڑکی کی اپنی تو کوئی عزت تھی ہی نہیں' چنانچہ خود کو اس پستی میں اتار لینا اس کے لیے ذرا بھی دشوار نہ ہوا تھا۔

مریم روتے ہوئے زین کے گلے لگی اور اس پر اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا الزام لگا دیا' تب غصے سے بالکل سا

ہوتا وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ ام مریم کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ زین اسے شدید غصے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ زین کو غصے میں آتا دیکھ کر ام مریم پر اپنے شدید ترین اشتعال کو کنٹرول کرتے ہوئے اس نے زین کو سچائی بتانے کی کوشش کی۔

زین غصے اور جنون میں مبتلا اسے نجانے کیا کیا بول رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ غصے میں آپے سے باہر ہوتا وہ اسے جان سے مار ڈالنے کے درپے تھا۔ زین اس کی ایک بھی بات سننے کو آمادہ نہیں تھا۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی اس پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ وہ جواب میں اسے وضاحتیں دیتا خود کو صرف اس کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ زین سے کہیں زیادہ مضبوط جسامت اور طاقت کا مالک تھا۔ چاہتا تو چند منٹوں میں زین کو زیر کر سکتا تھا۔ مگر وہ چھوٹے بھائی کو چوٹ کیسے پہنچا سکتا تھا۔

ام مریم دھاڑیں مار مار کر روتی اس پر اپنی عزت برباد کرنے کا الزام لگا رہی تھی۔ اس کے کردار اور اس کی عزت پر داغ لگا رہی تھی۔

"زین! یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ بہت مکار، بہت خطرناک لڑکی ہے۔ طوائفوں کا بھی شاید کوئی کردار ہوتا ہوگا۔ یہ تو ان سے بھی زیادہ بدکردار ہے۔"

وہ زین کے خود پر اٹھتے مکوں اور گھونسوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا مسلسل اسے سچائی بتانا چاہ رہا تھا۔ مگر زین پر ایک جنون سوار تھا۔ وہ اسے اپنے ہی گھر کی عزت پر غلیظ نظریں رکھنے والا بدکردار شخص سمجھ رہا تھا۔ زین کی نفرتوں سے ہار مان کر اب وہ اپنے باپ اور ماں سے مدد کا طالب تھا۔

زین نفرت میں اندھا ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو اسے جانتے ہیں۔ اس کا بچپن، اس کی نوعمری اور اس کی نوجوانی سب ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ دونوں جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا ایسا نہیں۔ اس کے پاپا جتنے بھی سخت مزاج ہیں پر اس پر بہت فخر کرتے ہیں۔ اس نے ہمیشہ ان کا کہا مانا ہے، ان کی امیدوں پر پورا اترا ہے۔

اور اس کی اموجان، انہیں تو اس سے کس قدر محبت ہے۔ جان نچھاور کرتی ہیں وہ اس پر۔

اس نے امید سے ماں کی طرف دیکھا۔ زار و قطار روتی ہوئی اس ناگن کو سینے سے لگائے وہ بالکل خاموش تھیں۔ اس کی حمایت میں، زین کو اس پر ہاتھ اٹھانے سے روکنے کے لیے ان کے لبوں سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔

"میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ میرا سکندر ایسا کر سکتا ہے۔" وہ منتظر نظروں سے انہیں دیکھتا رہا مگر اس کی اموجان کے لب باہم پیوست رہے۔

"زین! بس کرو۔" اپنے پاپا کے لبوں سے یہ لفظ سنتے ہی وہ خوشی سے سرشار سا ہو گیا تھا۔ اس کے پاپا کو اس پر یقین ہے۔ وہ اس کا اعتبار کر رہے ہیں۔

مگر اس کی یہ خوشی پل بھر میں ہی باپ کے تھپڑ نے مٹا کر رکھ دی تھی۔ ان کے مارے گئے تھپڑ نے اس کے اندر ابلتے جوش، جنون اور غصے کو ایک پل میں سرد کر دیا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ساکت اور بے جان سا کھڑا باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والا تھا، وہ بھائی کی منگیتر پر غلیظ نظریں رکھنے والا تھا، وہ نفس کا غلام تھا، وہ گھر کی عزت تباہ کرنے والا تھا۔ وہ بالکل سُن سا کھڑا تھا۔

ام مریم مسلسل واویلا کر کر کے رو رہی تھی۔ اسے مکاری سے روتا دیکھ کر اس پر پھر جوش، جنون اور اشتعال سوار ہوا تھا۔ اس نے باپ کو بتانے کی کوشش کی تھی۔

"آنٹی! میں آپ کے گھر پر جس دن سے سکندر سے ملی ہوں، یہ اسی دن سے مجھ سے کہہ رہا ہے میں زین سے منگنی توڑ دوں۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ یہ مجھے زین کے تو کیا کسی کے بھی قابل نہیں چھوڑے گا۔"

طوائفوں کی خصلت رکھتی بظاہر وہ شریف لڑکی روتے ہوئے بولی تو وہ غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ شدید

ترین اشتعال میں اسے گالی دیتا وہ حقیقتاً "اسے قتل کر ڈالنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اور کتنا نیچے گروگے سکندر!" اس کے اور ام مریم کے درمیان اس کے پاپا آکر کھڑے ہوگئے تھے۔

"پاپا! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ اس مکار لڑکی کا یقین کریں گے اور میرا نہیں؟ آپ کو پتا ہے میں نے آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس سے آپ کا سر جھکے۔ پاپا! یہ لڑکی آج سے نہیں، جس دن سے میں گھر آیا ہوں، میرے پیچھے پڑی ہے۔ یہ کل رات بھی میرے کمرے میں جس حلیے میں آئی تھی۔ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں آج صبح سے آپ کو یہی بتانے کی کوشش کررہا ہوں۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اس لیے یہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔ یہ مجھے آپ لوگوں کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے پاپا!"

اب وہ غصے اور اشتعال میں نہیں، بے بسی اور خوف کے ساتھ اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں بول رہا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ کوئی اس کی بات سن رہا تھا، نہ یقین کررہا تھا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہے ہو۔ ذرا حالت دیکھو اپنی بھی اور اس کی بھی۔ میرا سر ندامت سے جھکا دیا ہے سکندر تم نے۔"

باپ کی بات سن کر اس نے نفرت سے ام مریم کی طرف دیکھا تھا، جو ہنوز امو جان کے گلے لگی رونے کا ڈراما کررہی تھی۔ اسے بے شک جیل ہوجائے، پھانسی کی سزا مل جائے مگر وہ اس لڑکی کو قتل کرڈالے گا۔

"پاپا! اس کی جس حالت کی طرف آپ اشارہ کررہے ہیں، یہ میں نے نہیں، اس نے خود کی ہے۔ اس لڑکی کے چیچ پن کی حد آپ سوچ بھی نہیں سکتے پاپا!"

باپ کی آنکھوں میں غصہ، ماں کی آنکھوں میں بے اعتباری اور بھائی کی آنکھوں میں نفرت دیکھ کر وہ چلاتے چلاتے ایک دم چپ ہوگیا تھا۔ اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔ اسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔

"مت کہو مجھے پاپا۔ تم آج سے یہ حق ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہو۔"

"پاپا آپ جس کی کہیں، میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ یہ لڑکی جھوٹی ہے۔ یہ ہمارے گھر کی خوشیوں کو آگ لگا دینا چاہتی ہے۔"

اس بار وہ رو پڑا تھا۔ مگر اس کے آنسو، اس کی فریاد، اس کی بے بسی، اس کی سچائی۔۔۔ نہ اس کے باپ پر اثر کررہی تھی نہ بھائی پر۔ اس کے پاپا اسے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا رہے تھے۔ وہ باپ کا انتہا پر جاتا ظالمانہ حکم سن کر ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی بات سنے بغیر اسے تختہ دار پر لٹکایا جارہا تھا۔

اس نے بے اختیار مدد کے لیے ماں کو پکارا تھا۔ اس کی اپنی ماں سے نگاہیں ملیں تو اسے یہ کرب ناک سچائی پتا چلی کہ وہ بھی اسے گناہ گار سمجھ رہی ہیں، مگر ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ بیٹے کی حمایت میں بولی تھیں۔ انہوں نے روتے ہوئے شہریار خان سے سکندر کے لیے رحم کی درخواست کی تھی۔ شہریار خان، امو جان کے اس کی حمایت پر مزید غصے میں آگئے تھے۔

انہوں نے اس کی امو جان کو اپنے بیٹوں اور اس پرائی لڑکی کے سامنے طلاق کی دھمکی دی تھی، انہوں نے اس کے لیے زانی کے الفاظ استعمال کیے۔ وہ اس پر نہیں، مگر ماں کی تذلیل پر رو پڑا تھا۔ اس بے حیا، بے غیرت لڑکی کے سامنے اس کے باپ نے اس کی ماں کو بے عزت کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے شہریار خان کے ساتھ کھنچتا لونگ روم سے باہر جانے لگا۔ ماں کی بند آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھتا، بھائی کی نفرت دیکھتا۔

شہریار خان اسے پورچ میں گھسیٹ کر گیٹ تک لے آئے تھے۔ وہاں آکر انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تھا۔ ان کی آنکھیں غصے اور جنون سے بھری ہوئی

تھیں۔ ان کے چہرے پر سختی اور فیصلہ کر لینے کے بعد والی اٹل کیفیت تھی۔ وہ گیٹ کھول کر کھڑے تھے۔

"تم میرے گھر سے جاسکتے ہو۔ میرے گھر اور میری زندگی میں تم جیسے ریپسٹ اور عیاش شخص کی کوئی جگہ نہیں ہے۔" کیا زین کی طرح پاپا بھی اس سے نفرت کرنے لگے؟ وہ ایک دم ہی رو پڑا تھا۔

"پاپا! میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ پاپا! میرا یقین کریں۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا باپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم جارہے ہو یا میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکالوں؟ جوانی کا جنون بہت سر چڑھ کر بول رہا ہے تو جاؤ' نکلو باہر۔ کرو عیاشیاں' مگر اپنے خرچے پر' خود پیسے کما کر۔ میرا پیسہ تم جیسے بدکردار کی عیاشیوں کے لیے نہیں ہے۔ وہ دوسرے باپ ہوتے ہوں گے جو غلط کاموں پر اپنے بیٹوں کی پشت پناہی کرتے ہوں گے۔ میں ان باپوں میں سے نہیں ہوں۔ میں آج کے بعد مرتے دم تک تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔ رشتوں کی دھجیاں اڑا کر سمجھ رہے ہو' میں تمہیں معاف کر دوں گا؟ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ آج کے بعد سمجھوں گا میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

وہ سہمی سہمی نظروں سے باپ کو خود پر گرجتے اور نفرت کا اظہار کرتے دیکھ رہا تھا۔ ہاں وہ کمزور تھا' وہ گھر سے باہر نکالے جانے سے بری طرح ڈر گیا تھا۔ وہ اس بات سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ وہ گھر سے نکالا جارہا تھا۔ دنیا کی بھیڑ میں دھکیلا جارہا ہے۔ شہریار خان نے اسے ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے باہر نکالا۔ فوراً" گیٹ بند کر دیا تھا۔

وہ اسی پھٹی ہوئی قمیص میں تھا بغیر سوئٹر' جیکٹ اور کسی بھی گرم چیز کے۔ باہر سخت ترین سردی میں۔ 31 دسمبر کی شام کی سخت ترین' جسم کو کاٹ ڈالنے والی ٹھنڈ میں باہر کھڑا وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ روتے ہوئے وہ گھر کے پاس بنے ایک پارک میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ دنیا سال نو کے جشن میں مصروف تھی اور وہ پارک میں تنہا تھا۔

وہ بری طرح رو رہا تھا۔ باپ کے ظلم پر' ماں کی بے بسی پر' بھائی کی نفرت پر' اپنی ذلت اور رسوائی پر۔ کیا عزت صرف عورت کی ہوتی ہے مرد کی نہیں؟ کیا اگر ایک لڑکا اور لڑکی تنہائی میں اس حال میں پائے جائیں کہ لڑکی بے لباس ہو تو یہ لازم ہے کہ اسے بے لباس لڑکے ہی نے کیا ہوگا؟ کیا لڑکی گناہ گار اور بدکردار نہیں ہو سکتی؟ وہ چار دن کی شناسا لڑکی اتنی قابل اعتبار لگی تھی اس کے والدین اور بھائی کو کہ اس کی زندگی کے صاف اور شفاف بیس سالوں کی ہر اچھائی پل بھر میں بھلا دی؟

کوئی ایک تو ہوتا جو یہ کہتا کہ سکندر رتم نہیں' یہ لڑکی بھی تو جھوٹی ہو سکتی ہے۔

نئے سال کی پہلی صبح طلوع ہوئی تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ صرف یہ چمکتی ہوئی صبح ہی نہیں بلکہ آئندہ زندگی کی کوئی بھی صبح کل شام کی سیاہیوں کو نہیں مٹا سکے گی۔

صبح سے دوپہر ہوئی۔ بھوک پیاس کا احساس نہیں تھا مگر ٹھنڈ ناقابل برداشت تھی۔ اسے اپنے پاپا سے بات کرنی چاہیے۔ کل شام وہ بہت غصے میں آ گئے تھے' آج وہ اس کی بات ضرور سنیں گے۔

اس کے پاپا بہت ذہین آدمی ہیں۔ جب وہ دلیل کے ساتھ بات کرے گا تو وہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ لونگ روم کا وہ سارا حشر اس بے حیا لڑکی نے کیا تھا۔ اس کا حلیہ' اس لڑکی کا حلیہ' لونگ روم میں ٹوٹی چیزیں اور پاپا کا عین اسی وقت گھر واپس آجانا' جب وہ ساری کڑیاں ملائیں گے تو ان جیسا ذہین شخص فوراً" سمجھ جائے گا کہ قصوروار سکندر نہیں' تم مریم ہے۔

وہ یکدم ہی گھر جانے کے لیے اٹھا اور سیدھا اندر جانا چاہتا تھا مگر اس کی خوش فہمیاں اسی لمحے کمزور پڑنے لگی تھیں جب ان کا ملازم اسے وہیں رکنے کی تاکید کرتا شہریار خان کو بلانے اندر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر ہی روک دیا گیا تھا۔ اندر داخلے کے

لیے اسے اجازت درکار تھی۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیا کل میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی؟"

وہ بھوکا پیاسا ہے' اسے ٹھنڈ لگ رہی ہے اس کے باپ کو اس پر ذرا سا بھی رحم نہیں آیا تھا' اس کی تمام تر خوش فہمیاں اپنی موت آپ مر گئی تھیں۔ ان کے پیچھے زین بھی لونگ روم کے دروازے کے پاس کھڑا اسے نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

"میرے دل اور میرے گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں عاق کر چکا ہوں۔ میرے اصول یہ کہتے ہیں کہ میں ایک ریپسٹ اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والے کو اپنے گھر میں جگہ نہ دوں۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو' ذرا سی بھی غیرت تم میں باقی بچی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی منحوس شکل کبھی مت دکھانا۔"

اس نے پیچھے کھڑے زین کے چہرے پر پھیلا اطمینان دیکھا پھر حلق کے بل چلاتے اپنے باپ کو۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں' ہوش و حواس میں کہہ رہے ہیں' کل اکتیس دسمبر کو اسے گھر سے بے دخل کرنے کا ان کا اعلان کوئی جذباتی یا وقتی فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اٹل فیصلہ تھا۔ سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے وہ اپنے ہر فیصلے پر قائم تھے۔

اسی پل اس کی امو جان باہر آگئی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ انہوں نے روتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا۔ وہ اس کی حمایت کر رہی تھیں' وہ اس کی طرف داری میں اس کے باپ سے لڑ پڑی تھیں' وہ اس کی طرف سے اس کے باپ سے معافی مانگ رہی تھیں۔

"اس سے غلطی ہو گئی ہے شہریار! مگر یہ ابھی بچہ ہے۔ آپ اس پر سختی کریں' اسے ماریں پیٹیں' ہر آسائش اور سہولت اس سے واپس لے لیں مگر پلیز اسے یوں گھر سے نہ نکالیں۔"

اور اس کا دل چاہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑے۔ ماں سمیت ساری کائنات میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اسے بے گناہ سمجھتا ہو۔ ماں کے حمایت لیے جملوں نے اس کی عزت' اس کے وقار' اس کے پندار کو مزید ٹھیس پہنچائی تھی۔ ماں اپنے گناہ گار بیٹے کے لیے رحم اور معافی کی درخواست کر رہی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر ماں کو اپنی حمایت میں باپ سے بولتے اور باپ کو جواباً "آگ بگولہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ امو جان زیادہ زور سے روتے ہوئے چیخ کر بولیں۔

"آپ کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں دے رہے ہیں؟ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہریار! جو آپ کے باپ نے کیا....."

اس کے پاپا نے آگے بڑھ گالی دیتے ہوئے اس کی امو جان کو تھپڑ مارا تھا۔ وہ بالکل سن سا رہ گیا تھا۔ کیا اس کے پاپا اس کی ماں پر ہاتھ اٹھا سکتے تھے؟

اس نے دیکھا وہ امو جان کو دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے' وہ اس بار یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ فوراً "آگے آگیا تھا۔ ماں کی طرف اٹھا وہ طمانچہ اس نے اپنے گال پر کھا لیا تھا۔ ماں کی یہ تذلیل اس لیے کی جا رہی تھی کہ وہ اس کی حمایت میں بولی تھیں۔ اگر اس کی موجودگی ماں کی ذلت کا باعث بن رہی ہے تو وہ خود کو ابھی اور اسی وقت یہاں سے کہیں دور لے جائے گا۔ اس کی ماں ان دونوں بھائیوں کے سامنے شوہر کے ہاتھوں ہوئی اس تذلیل پر گنگ کھڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کرب اور اذیت سے آنسو آگئے تھے۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"امو جان کو کچھ مت کہیں پاپا! پلیز میری ماں پر ہاتھ مت اٹھائیں۔ میں جا رہا ہوں یہاں سے۔"

وہ فوراً "ہی وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ اگر اس کا چلے جانا تمام مسائل کا حل ہے تو ٹھیک ہے' وہ چلا جاتا ہے۔ اس کا باپ اس کی ماں پر ہاتھ اٹھائے' اسے گالیاں دے یہ وہ ہرگز نہیں سہہ سکتا۔ وہ زین کی طرح نہیں کہ دبک کر کھڑا چپ چاپ تماشا دیکھتا رہے۔ ماں کو بے عزت ہوتا دیکھتا رہے۔ اگر اس کے چلے جانے سے ہی اس کے باپ کو سکون مل رہا ہے تو نکل جاتا ہے وہ ان لوگوں کی زندگیوں سے۔

وہ وقت دور نہیں جب اس کے پاپا کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گا۔ انہیں اس کی سچائی کا یقین آئے گا' وہ بہت شرمندہ ہوں گے' وہ اسے گھر واپس لانا چاہیں گے تب وہ گھر واپس نہیں آئے گا۔ وہ سکندر شہریار ہے۔ ہارورڈ میں زیر تعلیم۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کے چند بہت ہی قابل طالب علموں میں شامل۔ وہ اپنی زندگی آپ سنوارے گا' وہ اپنی دنیا آپ بنائے گا بغیر شہریار خان کی مدد کے۔ وہ اب اگر اسے بلائیں گے بھی' وہ تب بھی پلٹ کر ان کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کے اندر جوش مارتا نوجوان خون باغی ہو رہا تھا۔ وہ مساچوسٹس واپس چلا جائے گا۔ بوسٹن اور کیمبرج میں اس کے بہت سارے جاننے والے رہتے ہیں۔ فوری طور پر وہ اپنے کسی بھی جاننے والے' اپنے کسی بھی دوست کے ساتھ اس کا فلیٹ شیئر کر لے گا۔ جانے کے ساتھ ہی وہ کیمپس جا کر ڈین کے آفس میں ان سے بھی مل لے گا۔ وہ اپنی آگے کی تعلیم کے لیے اسکالر شپ کے لیے اپلائی کرے گا۔

وہ اپنے اساتذہ کا چہیتا اتنا لائق اسٹوڈنٹ ہے' کیوں نہیں اس کی یونیورسٹی اسے اسکالر شپ دے گی؟ وہ خیالوں ہی خیالوں میں خود کو ہارورڈ سے اپنی انڈر گریجویٹ ڈگری پوری کرتے دیکھ چکا تھا' ہارورڈ لاء اسکول سے خود کو ڈگری پاتا دیکھ چکا تھا' باپ کو خود کو منا کر گھر واپس بلاتا دیکھ چکا تھا' جب بھوک اور پیاس کے شدید احساس سے وہ سڑک کے کنارے چکر کھا کر گر گیا۔ چند لمحے اس کی آنکھوں کے آگے بالکل اندھیرا سا چھایا رہا تھا۔ اسے بغیر کچھ کھائے پیے دو دن ہو گئے تھے۔ وہ بھوک اور پیاس سے بالکل نڈھال تھا۔ اپنے ان پھٹے کپڑوں میں اسے سخت سردی لگ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے ٹھنڈ سے بخار چڑھ گیا ہے۔ اپنی زندگی کے بیس سال اس نے باپ کے گھر پر اتنے محفوظ گزارے تھے کہ اب سڑک پر لا کر پھینکا گیا تو اسے بھوک' پیاس اور ٹھنڈ سب کچھ برداشت کرنا اپنی ہمت اور برداشت سے بہت زیادہ لگا۔

وہ بوسٹن واپس جانے کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک وقت کا کھانا کھانے تک کے پیسے نہیں' حتیٰ کہ بوسٹن میں اپنے کسی دوست کو فون کر سکے' اتنے پیسے بھی نہیں ہیں۔ وہ وہاں کیسے جائے گا؟ اور ان پھٹے کپڑوں میں بھکاریوں کی طرح؟ جان پہچان کے لوگوں کے پاس جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اس کے نہیں' وہ شہریار خان' امو جان اور زین سب کے' ان کی ساری فیملی کے جاننے والے تھے۔ اصل بات کیا ہے یہ تو وہ اپنے قریبی دوستوں تک کو نہیں بتائے گا۔ اگر مجبوراً" بوسٹن جا کر کچھ بتانا ہی پڑا تو اتنا کہہ دے گا کہ وہ اپنے باپ کا گھر چھوڑ آیا ہے۔ اس کا ان کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گیا ہے۔

واشنگٹن میں کسی بھی جان پہچان والے کے پاس جا کر نہ وہ خود شرمندہ ہونا چاہتا تھا نہ اپنے پاپا کو کروانا چاہتا تھا۔

تمام دن چلتے چلتے وہ اس وقت شہر کے اس علاقے میں آگیا تھا جہاں کم آمدنی والے اور زیادہ تر سیاہ فام لوگ رہا کرتے تھے۔ کیسے لطف کی بات تھی' دنیا بھر میں طاقت کا مرکز سمجھے جانے والے اس شہر میں ایسی جگہیں بھی تھیں' جہاں غریب بھی تھے' بے روزگار بھی تھے' بے گھر بھی تھے۔ وہ سڑک کے کنارے جہاں بیٹھا تھا وہاں سامنے ہی ایک چرچ تھا۔ وہ وہاں ہر عمر کے افراد جاتا دیکھ رہا تھا جو اپنے حلیوں سے ضرورت مند لگ رہے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ساتھ لیے' بوڑھے مرد' عورتیں' جوان' نوجوان۔ اسے سمجھ آگیا تھا یہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ چرچ کی بلڈنگ اور اندر جاتے لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پتا نہیں تھا بھوک ایسی ظالم چیز ہوتی ہے' انسان سے وہ سب کچھ بھی کروا جاتی ہے' جو وہ عام حالات میں کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ کیا حرج ہے اگر وہ بھی۔۔۔ اگر وہ بھی اندر چلا جائے۔ اب اس سے اور بھوکا نہیں رہا جا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے خود کو اٹھنے اور چرچ میں جانے پر مجبور پایا۔

وہ خود سے بھی نظریں چراتا چرچ کے اس ڈائننگ

ہال میں آگیا تھا' جہاں ہر اتوار باقاعدگی سے بھوک اور افلاس کے شکار لوگوں کو دوپہر اور رات کا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ خدمت خلق کے طور پر' انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر۔ وہاں میزیں لگی ہوئی تھیں' ان کے اطراف کرسیاں موجود تھیں۔ بہت سے لوگ ان کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بھوک سے نڈھال تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہاں بہت سے رضاکار کام کر رہے تھے' چرچ کے ساتھ اس کار خیر میں بطور رضاکار شریک ایک شخص اس کے پاس آیا اور مسکرا کر اس کا کھانا اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سوپ' سینڈوچ اور کافی۔

خیرات کا کھانا دیکھ کر اسے رونا آگیا تھا۔ بہت ذلت اور بے عزتی محسوس کرتا وہ کھانے کے نوالے لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسے اپنا گھر' اپنے ماں' باپ' اپنی زندگی سب کچھ یاد آرہا تھا۔ ہارورڈ کا گریجویٹ بنتے بنتے وہ یہ کہاں آگیا تھا؟ نہیں ... اسے خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔ وہ ہمت نہیں ہارے گا۔ اسے فوری طور پر بوسٹن جانے کے لیے پیسے جمع کرنے ہی ہوں گے۔ ایک بار بوسٹن چلا گیا پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہاں اس کے بہت دوست ہیں اور پاپا سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے مدد لے گا۔

وہ ہارورڈ سے اپنی ڈگری پوری کرے گا۔ پھر وہ اس ناگن سے اپنا انتقام لے گا۔ وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ وہ اپنے کردار پر کالک ملنے والی' اسے اس کے والدین کی نظروں سے گرانے والی اس لڑکی کو جان سے مار ڈالے گا۔ اور ایک نہ ایک دن آئے گا جب اس کے پاپا اس کی بے گناہی تسلیم کرلیں گے۔ وہ اسے منانے اس کے پاس بوسٹن آئیں گے۔ تب وہ ان کے ساتھ نہیں آئے گا۔ وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ ان کے سہارے کے بغیر بھی خود کو سنبھال سکتا ہے۔

وہ جہاں بیٹھا تھا وہاں سے کچن نظر آرہا تھا۔ انسانی ہمدردی سے سرشار بہت رضاکار مرد اور عورتیں وہاں کام کرتے نظر آرہے تھے۔ اسے ایک رضاکار کی دوسرے رضاکار کے ساتھ ہونے والی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی میز کچن کی کھڑکی سے بہت نزدیک تھی۔ پیٹ میں غذا گئی تھی تو اب سب کچھ دکھائی بھی دے رہا تھا اور سنائی بھی۔ وہ دونوں رضاکار پیپر پلیٹس میں سینڈوچز تیار کر کے اپنے سامنے موجود میز پر رکھتے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک سائٹ انجینئر تھا۔ کوئی بلڈنگ بن رہی تھی' وہ اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ قدرے فکر مند لہجے میں یہ بتا رہا تھا کہ کل تلخ کلامی اور لڑائی ہو جانے پر اس کا کوئی اہم ورکر کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد آرکیٹکٹ اور کلائنٹ نے آکر سائٹ وزٹ کرنی تھی اور وہ فکر مند تھا کہ اس اہم ورکر کے چلے جانے سے کام کی رفتار پر فرق پڑے گا۔ اسے ایک تخفیتی اور جان لگا کر کام کرنے والے ورکر کی فوری ضرورت تھی۔ سکندر فوراً" اٹھ کر اس رضاکار کے پاس گیا۔ اس نے اس سے کام مانگا اور یقین دلایا تھا کہ وہ محنت کرے گا' سائٹ انجینئر سے اس کا پڑھا لکھا ہونا اور اچھے خاندان سے تعلق چھپا نہ رہ سکا تھا۔ اس نے اس سے یہی بات پوچھی بھی تھی۔

جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ اس نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ وہ بوسٹن میں اپنی انڈر گریجویٹ اسٹڈیز کر رہا ہے۔ کسی پریشانی کا شکار ہو جانے کے بعد اب اس کے پاس واپس بوسٹن جانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اسے پیسے درکار ہیں۔ سائٹ انجینئر اپنے اس ورکر کی جگہ اسے کام دینے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس شرط پر کہ وہ اس پورے ہفتہ اس کے ساتھ کام کرے۔ جتنا معاوضہ طے پایا تھا اس میں وہ واپس جانے کے کرائے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے ایک آدھ سستی سی پینٹ شرٹ بھی خرید سکتا تھا۔ کوشش کر کے کچھ پیسے بچا بھی سکتا تھا۔ اسے پیر سے لے کر ہفتے کی شام تک کنسٹرکشن سائٹ پر کام کرنا تھا۔ ہفتے کی شام اسے اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔ یہ اس سے سائٹ انجینئر نے وعدہ کیا تھا۔

وہ رات بھی اس نے سڑکوں پر اور ایک پارک میں سوتے جاگتے گزاری تھی۔ اگلی صبح وہ شہر کے مضافات

میں واقع اس کنسٹرکشن سائٹ پر آگیا تھا۔ وہاں ابھی آبادی کم تھی۔ یہ کم آبادی والا شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ جو ہیلتھی مور سے بہت قریب تھا۔ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے وہ سائٹ انجینئر کے کئی طرح سے کام آرہا تھا۔ کون سا کنسٹرکشن میٹریل کب آیا، کتنی مقدار میں آیا، کتنے کا خرید آگیا، وہ سائٹ انجینئر کو کمپیوٹر پر یہ سارا حساب کتاب، سارا کام بھی کر کے دے رہا تھا اور محنت مزدوری بھی کر رہا تھا۔ جہاں کہیں کسی ورکر کی کمی ہوتی اسے بلا لیا جاتا۔ بے تحاشا وزن اٹھانے اور سخت مشقت کا کام کرنے سے اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے تھے۔ مگر ایک دھن اور ایک جستجو سوار تھی اس کے اوپر۔ ابھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ دن بھر میں صرف لنچ کرتا جو کہ تمام مزدوروں کو سائٹ پر مفت فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کی پلاننگ یہ تھی کہ جانے کے کرائے کے علاوہ بھی اس کے پاس کچھ پیسے بچ جائیں۔

اس نے سائٹ انجینئر سے درخواست کی کہ اسے سائٹ پر ہی سونے کی اجازت دے دی جائے۔ سائٹ انجینئر اسے اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہاں ورکرز کو اس بات کی اجازت نہیں تھی۔ مگر اس نے جب اپنی مجبوری بتا کر بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ مان گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کون سا وہاں مستقل ورکر تھا۔ صرف ایک ہفتہ ہی کی تو بات تھی۔

سائٹ انجینئر یوں بھی اس سے خوش تھا۔ وہ ایک اکیلا لڑکا کئی ورکرز کے حصے کا کام اسے کر کے دے رہا تھا۔ وہ صبح سے شام گئے تک کنسٹرکشن سائٹ پر جو جو کام اس کے سپرد کیے جاتے کیے جاتا تھا۔ کام شروع کرنے والا سب سے پہلا ورکر وہ ہوتا تھا اور کام ختم کرنے والا سب سے آخری ورکر بھی وہی ہوتا تھا۔ وہ دن گن گن کر ہفتے کے دن انتظار کر رہا تھا جب اسے اس کی محنت کی کمائی ملنی تھی۔ سب کے چلے جانے کے بعد وہ رات میں بلڈنگ سائٹ میں ہی ایک طرف اونچی نیچی زمین پر لیٹ کر سو جاتا تھا۔

کنسٹرکشن سائٹ غیر آباد علاقہ میں تھی۔ وہاں دن میں بھی لوگوں کی زیادہ آمدورفت نہیں رہا کرتی تھی۔ اردگرد کا علاقہ قدرے ویران ہی تھا۔ رات میں تو بالکل ہی سناٹا ہو جاتا تھا۔ اندھیرا، خاموشی اور ویرانی۔ مگر اس پر دن بھر کی بے تحاشا محنت مشقت کی تھکن ایسی طاری ہوتی تھی کہ نہ اسے سناٹے اور اندھیرے سے خوف آتا تھا اور نہ ہی اونچی نیچی زمین پر لیٹ کر تکلیف اور بے آرامی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ ہفتے کا دن تھا جب سائٹ انجینئر شام ڈھلے کام ختم کر کے جانے سے قبل وعدے کے مطابق اسے اس کا طے کردہ معاوضہ دے کر گیا تھا۔ اس کے اضافی کام کرنے سے خوش ہو کر اس نے اسے کچھ پیسے الگ سے بھی دیے تھے۔ اپنی محنت کے پیسے اپنے ہاتھوں میں لیے، وہ کتنے دنوں بعد خوش ہوا تھا، مسکرایا تھا۔ اس وقت رات ہو چلی تھی۔ وہ کل صبح سب سے پہلے اپنے لیے نئی پینٹ شرٹ خریدے گا اور پھر بوسٹن جانے کے لیے ٹکٹ۔

وہ اپنے شہر واپس چلا جائے گا۔ کنسٹرکشن سائٹ کی اونچی نیچی زمین پر لیٹا وہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ بس آج کی رات اور ہے۔ کل وہ اپنے دوستوں اور جاننے پہچاننے والوں کے بیچ اپنے شہر میں ہو گا۔ ویسے تو اسے پورا یقین تھا اسے اسکالرشپ مل جائے گی لیکن اگر اس سب میں کچھ وقت لگا یا تھوڑی مشکل ہوئی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ یہ سمسٹر چھوڑ دے گا۔ اور اس دوران وہ چھوٹی چھوٹی جاب کر کے پیسے جمع کر لے گا۔

وہ لیٹا سوچ رہا تھا، اپنے ہاتھوں کے زخم دیکھ رہا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ بھوک سے دھیان ہٹا رہا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ ناشتے اور رات کے کھانے کو چھوڑ کر صرف دوپہر کا کھا رہا تھا۔ پر اب تو اس کے پاس پیسے ہیں۔ مین روڈ پر جو اسٹور ہے، وہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ وہ وہاں سے جا کر اپنے لیے ایک سینڈوچ یا چند کوکیز تو خرید سکتا ہے۔ پیسے آگئے تھے اس لیے بھوک کا زیادہ احساس تھا۔ اسے لگا کہ خالی پیٹ نیند نہیں آئے گی تب وہ وہاں سے اٹھا۔ وہ سائٹ سے باہر نکلا ہی تھا جب اسے سڑک پر سامنے

سے چار سیاہ فام امریکی آتے نظر آئے۔ شراب کی بوتلیں ہاتھ میں لیے۔ نشے میں دھت۔ زور زور سے گاتے اور ایک دوسرے سے بے ہنگم ہنسی مذاق کرتے۔ ان میں سے ایک نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اور ہنس کر اپنے باقی ساتھیوں کو بھی متوجہ کیا۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے وہاں سے گزر جانا چاہتا تھا مگر وہ چاروں اس کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے' لمبے چوڑے' مضبوط جسامت والے۔

اپنی کمائی رقم کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا' باقی سارے پینٹ کی جیب میں۔ اس نے ان کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹ پر دیکھ لی تھیں۔ وہ اپنی اتنی محنت کی کمائی انہیں لوٹنے نہیں دے گا۔ اس نے وہاں سے اندھا دھند بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ چار تھے اور وہ اکیلا۔ وہ مضبوط جسامت والے سیاہ فام مرد تھے اور وہ بیس سال کا کمزور سا لڑکا جس کی دنیا گھر اور کیمپس تک محدود رہی تھی۔

ان چاروں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

وہ رو رو کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ بری طرح اسے مارتے ہوئے انہوں نے اس سے اس کے سارے پیسے چھین لیے تھے۔ وہ رو رو کر فریاد کر رہا تھا کہ یہ پیسے اس نے بڑی محنت' کڑی مشقت کے بعد کمائے ہیں۔ اسے ان پیسوں کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنے پیسے چھن جانے پر زارو قطار رو رہا تھا۔ مگر ان سیاہ فاموں کا مقصد صرف اس کی رقم لوٹ لینے پر پورا نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے ایک اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے' شراب پی رہے تھے۔ وہ ان سے اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب وہاں سے ایک قدم ہلنے کی بھی اس میں سکت نہ تھی مگر ان کی آنکھوں میں شیطانی چمک دیکھ کر اس نے خوف سے چیخ مارتے ہوئے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

اس کی طرف بڑھتے ایک سیاہ فام نے ایک زوردار مکا اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ اوندھے منہ سڑک پر گرا پھر اس نے اس کے بال مٹھی میں دبوچ کر اس کا سر زمین پر زور سے مارا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔

"پاپا! مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے بچالیں۔"

وہ چلا چلا کر باپ کو پکار رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کو قابو میں کر لیا تھا۔ اب اس کی چیخیں' اس کی فریادیں اس کے اندر ہی دم توڑ رہی تھیں۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ اسے بچانے کے لیے اس کا بہت طاقت ور' بہت بااثر باپ نہیں آیا تھا۔ اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ صبح ہونے پر اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر وہ چاروں وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ وہ جس بری طرح مارا پیٹا اور زخمی کیا گیا تھا' جتنی مقدار میں اس کا خون بہہ گیا تھا۔ اگر وہ کچھ دیر اور اس سڑک پر پڑا رہتا تو شاید وہیں اس سڑک پر ہی مر گیا ہوتا۔ پتا نہیں کون تھا' جو اسے اسپتال لے آیا تھا' جس نے اس کی جان بچالی تھی۔

اپنی جان بچانے والے اس شخص سے اسے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔ ذلت بھری یہ زندگی گزارنے کے لیے آخر اسے زندہ کیوں رہنے دیا گیا تھا؟ ہوش آنے پر اس نے خود کو پٹیوں میں جکڑا اسپتال میں پایا تھا۔ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے اسے ہمدردی سے دیکھا تھا۔ اس نے اس سے اس کے گھر اور گھر والوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے فون مانگا تھا۔ وہ اپنے گھر پر فون کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے سینے پر سر رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ وہ کس طرح پامال کیا گیا ہے' وہ یہ صرف اپنے باپ ہی سے کہہ سکتا تھا۔ اس کا جسم نہیں' اس کی روح روند ڈالی گئی تھی۔ اس نے اپنے گھر پر فون کیا تھا۔ فون شہر یار خان نے اٹھایا تھا۔ وہ ان کی آواز سن کر اسی طرح رو پڑا تھا۔ جیسے میلے میں کھو جانے والا بچہ واپس ماں' باپ کو پا کر رو پڑتا ہے۔

"ہیلو پاپا!" اس نے روتے ہوئے انہیں پکارا تھا۔

"کیوں فون کیا ہے تم نے یہاں؟" ان کا سخت

لب ولہجہ ویسا ہی تھا۔ بے لچک' غیر جذباتی اور سرد سا تاثر لیے۔

"پاپا! کل رات۔۔۔ پاپا کل رات میرے ساتھ۔"

روتے ہوئے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اپنے مضبوط باپ کی پناہوں میں چلا جانا چاہتا تھا۔ نہیں ہے وہ کمزور لڑکا اتنا مضبوط کہ دنیا کی ٹھوکروں کا مقابلہ کر سکے۔

"پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پاپا مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا پاپا۔ پلیز۔ مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے گھر آنا ہے' مجھے آپ کے پاس آنا ہے۔ پلیز میرے پاس آجائیں پاپا!" اس نے زار و قطار روتے ہوئے ان سے التجا کی تھی۔

"میرے گھر میں تم جیسے بد کردار اور بد فطرت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ آئندہ یہاں فون مت کرنا۔ تم میرے لیے مر چکے ہو۔ میں تمہیں رو چکا ہوں۔"

اس کے باپ نے سخت لب ولہجے میں یہ بات کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔ فون بند ہونے کی تیز آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یک لخت ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رک گئے تھے۔

وہ واقعی مر چکا تھا اور مردے رویا نہیں کرتے۔

وہ کئی دن اسپتال میں رہنے کے بعد پھر سڑک پر آگیا تھا۔ بوسٹن' میساچوسٹس' ہارورڈ' بیچلرز' لاء' دوست' گھر' زندگی۔۔۔ اس کے لیے ہر چیز بے معنی ہو چکی تھی۔ وہ جسمانی طور پر نہیں' روحانی طور پر مر چکا تھا۔ اب نہ اسے ام مریم کا خیال آتا تھا' نہ اس سے انتقام لینے کے منصوبے اس کے ذہن میں آتے تھے۔

اس رات کی وہ بے بسی' وہ خوف' وہ ذلت اسے راتوں کو سونے نہیں دیتی تھی۔ سوجاتا تھا تو ڈراؤنے خوابوں کی صورت وہ اسے اٹھا کر بٹھا دیا کرتی تھی۔ اسے سوتے میں ہر بار ایسا لگتا اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس کا دم گھونٹا جا رہا تھا۔ اسے سانس لینا دشوار لگنے لگتا۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟"

"میں ہی کیوں اس کا شکار بنا؟" وہ راتوں کو چلا چلا کر رو رو کر اللہ سے پوچھتا۔ اس نے خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر لیا تھا۔ وہ پہلٹی مور آگیا تھا۔

کئی بار اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے پاپا یقیناً" ٹھیک کہتے تھے' وہ واقعی بے غیرت تھا۔ اس ذلت بھری زندگی کو جینے کے لیے تیار تھا وہ موت سے ڈرتا تھا۔ خود کو نہ گولی مار پایا' نہ اپنے پیٹ میں خنجر اتار پایا اور نہ کسی اونچائی سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر پایا تھا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس ذلت بھری زندگی میں اسے جو بھی کام ملتا وہ کر لیتا تھا۔ کبھی وہ کسی بار یا نائٹ کلب میں کام کرنے لگتا' کبھی کہیں کسی کنسٹرکشن سائٹ پر جا کر محنت مزدوری کر لیتا' کبھی بھوک لگی ہوتی تو کسی امیر شخص کے کتوں کو نہلانے دھلانے کی نوکری تک کر لیا کرتا تھا۔ وہ کسی بنجارے' کسی جپسی کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ دنیا کی ٹھوکروں نے اسے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔ اب وہ گھر کی آرام دہ فضاؤں میں رہنے اور ہارورڈ میں پڑھنے والا اسکندر شہریار نہیں تھا۔ اب وہ ایک اسٹریٹ اسمارٹ' بنجارہ اور جپسی تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھی بہت مضبوط ہو چکا تھا۔

اس رات کے بعد کبھی کسی کی مجال نہ ہوئی تھی اس کے نزدیک بھی پھٹک سکتا۔ ایک بار وہ نائٹ کلب سے اپنی ڈیوٹی ختم ہونے پر علی الصبح واپس جا رہا تھا' جب سڑک پر دو کالے امریکیوں نے اسے لوٹنے کی کوشش کی۔ تب اس پر ایسا جنون سوار ہوا تھا' ایسی غیر معمولی طاقت اچانک اس کے اندر آگئی تھی کہ اس نے انہیں مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ دونوں اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگے مگر وہ انہیں جان سے مار ڈالنے کے درپے تھا' مگر پھر انہیں زخموں سے چور چور کر کے چھوڑ دیا۔

وہ رات اس کی زندگی سے کبھی نہیں نکل سکتی تھی۔ اس رات کے بعد اگلی صبح وہ خود سے بھی اور دنیا سے بھی پہلے سے بھی زیادہ نفرت میں مبتلا ہو کر دنیا کی بھیڑ میں شامل ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ان دنوں ایک بار میں نوکری کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کو شراب پیش کیا کرتا تھا۔ اپنا کام ایمان داری سے کرتا۔ کام سے ہٹ کر کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی سختی اور کرختی دیکھ کر کسی کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی اس سے فالتو بات کرنے کی۔ بار کا پچپن سالہ امریکن مالک بل اسے اس کی ایمان داری کی وجہ سے پسند کیا کرتا تھا۔ مہینے کے آخر میں جب بل سب کی تنخواہوں کا حساب کتاب کر رہا ہوتا تب سکندر سے اس کام میں مدد لے لیا کرتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ جہاں دیدہ شخص یہ سمجھ چکا تھا کہ وہ پڑھا لکھا اور کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں کام کرتے باقی ویٹرز اور بارٹینڈرز کی طرح معمولی پڑھا لکھا اور معمولی خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔

وہ حساب کتاب میں بل کی مدد کر دیا کرتا تھا' کمپیوٹر پر اس کا کام کر کے دے دیا کرتا تھا۔ اس نے خود کہہ کر اپنی ڈیوٹی دوپہر تین سے رات تین تک رکھوائی ہوئی تھی۔ راتوں کو سونا وہ ویسے ہی نہیں چاہتا تھا' سو بار بند ہونے کے ٹائم تک' جو کہ صبح کے تین بجے تک کا تھا' وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیا کرتا تھا۔ اکثر وہاں سے بار بند کر کے نکلتے صبح کے چار بج جایا کرتے تھے۔

ایک رات بار بند ہو جانے کے بعد بل باہر نکل کر اپنی گاڑی کے پاس جا رہا تھا تب اسلحے سے لیس ایک شخص اسے لوٹنے آگیا تھا۔ سکندر چند منٹ قبل ہی بار سے نکلا تھا۔ وہ سڑک پر ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا۔ صبح کے چار بجے شور اور بل کے چیخنے کی آوازیں اسے صاف سنائی دے گئی تھیں۔ وہ فوراً" واپس پلٹا۔

اسے بل سے نہ کوئی محبت تھی نہ انسیت اور نہ ہی ہمدردی مگر خود پر گزری اس سیاہ اور بدترین رات کے بعد اس کے اندر یہ جنون اور وحشیانہ پن آگیا تھا کہ اب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کہیں پر بھی اور کسی پر بھی کوئی ظلم اور زیادتی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پاس گن تھی اور سکندر تنہا۔ سکندر کی ٹانگ اور بازو پر گولیاں لگی تھیں' مگر اس نے اس زخمی حالت میں بھی اس کا ریوالور چھین کر اس کا بٹ اس شخص کے سر پر اس قوت سے مارا تھا کہ وہ چیختا ہوا زمین پر گر پڑا تھا۔

وحشت اور جنون بھرے انداز میں اس نے اسے لاتیں اور گھونسے مارے۔ اس کے بازو اور ٹانگ پر سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بل کی جان بچائی تھی اور اسے لٹنے سے بھی بچالیا تھا۔

بل اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے سکندر کی تنخواہ کئی گنا بڑھا کر اسے یہ اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی تھی کہ اب اگر کوئی بار میں زیادہ شراب پی لینے کے بعد غل غپاڑہ کرنے کی کوشش کرے یا کوئی شراب پی لینے کے بعد بل ادا نہ کر رہا ہو تو وہ ایسے غنڈے بدمعاشوں سے نمٹے۔ خودکشی کرنے جیسے بے شک وہ ڈرتا تھا مگر جان کی تو اسے اپنی کوئی پروا تھی ہی نہیں' سو وہ غنڈوں اور بدمعاشوں سے نمٹنے کا کام بخوبی کر رہا تھا۔ کوئی زیادہ شراب پی کر نشے میں بدہوش ہو کر کسی ویٹرس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کرتا تو سکندر کو بلایا جاتا' وہ اسے اٹھا کر بار سے باہر پھینک دیتا۔

کسی کی زیادہ پی لینے کے بعد اپنے ہی ساتھیوں سے بار میں بیٹھے بیٹھے گالم گلوچ اور ہاتھاپائی شروع ہو جاتی تو وہ ان سب کو دھکے مار کر بار سے باہر نکال دیتا۔ وہ ہر طرح کے شرابیوں' اچکوں' غنڈوں' بدمعاشوں سے با آسانی اور بخوبی نمٹ لیتا تھا۔

بل جس کی بیوی مر چکی تھی اور بیٹا اسے چھوڑ کر کہیں اور رہتا تھا' وقت گزرنے کے ساتھ وہ سکندر کی پروا کرنے لگا تھا مگر اسے اب کسی کے بھی پیار اور محبت کی ضرورت نہیں تھی۔ رشتے' پیار' محبت' چاہت بھرے لفظ اب اس کے لیے کھوکھلے اور بے معنی تھے۔ یہ تمام لفظ بس لفظ ہی تھے' اس کی نگاہوں میں ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ مگر پھر بھی وہ جانتا تھا کہ بل آہستہ آہستہ اس سے پیار کرنے لگا تھا۔

وہ اپنی جان بچاتے اور اپنا بار سنبھالتے اس بہادر اور نڈر لڑکے میں اپنا بیٹا دیکھنے لگا تھا۔ اس احساس کے

پیش نظر ایک روز بل نے اس سے کہا کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے۔ اس نے حیران ہو کر بل کو دیکھا تھا۔

"تم نہ بھی بتاؤ تب بھی میں جانتا ہوں تم کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتے ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو۔ تعلیم کسی وجہ سے پوری نہیں کر سکے ہو۔"

بل اسے پیار سے دیکھ کر بولا تھا۔ فیملی کے لفظ پر وہ چونکا' پھر ہنس پڑا تھا۔ وہ کیا جانے اس شخص کو کہ وہ کس کا بیٹا ہے' کتنے بڑے آدمی کا۔ آج اپنی وہ پچھلی زندگی' وہ بڑا باپ' وہ اونچا خاندان' وہ اعلا اسٹیٹس اسے خود ایک مذاق لگ رہا تھا۔ شہریار خان کا بیٹا جسے وہ ہارورڈ میں پڑھا رہے تھے' جسے اپنا شاندار کیریر شروع کرنا تھا' آج میمفس کے ایک چھوٹے سے بار میں' لوگوں کو شراب پیش کرتا ہے ——— شراب پی کر پیسے نہ دینے والوں سے اپنے بار کے مالک کو پیسے وصول کر کے دیتا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہنگامہ کرنے والوں کو مار پیٹ کر دھکے مار کر بار سے نکالا کرتا ہے۔

زندگی کے کڑوے سچ اسے رلا نہیں رہے تھے بلکہ ہنسا رہے تھے۔ ہارورڈ کا لا گریجویٹ بنتے بنتے وہ ایک بارٹینڈر بن گیا تھا۔ اسے خود پر ہنسی آئی تھی۔ بل اسے قائل کر رہا تھا۔ اس کا بہت مخلص خیر خواہ بن کر اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔

"مجھے تم اپنے بیٹے کی طرح پیارے ہو گئے ہو۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا سکندر! کہ تم ساری زندگی میرے بار پر کام کرتے گزار دو۔"

وہ بل کو یہ سمجھا نہیں سکتا تھا کہ وہ تو زندہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو اس اندھیری رات واشنگٹن کے مضافات میں بلڈنگ سائٹ کے پاس' اس سڑک پر کب کا مر چکا ہے۔ اسے مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔

اس کی اس مردوں کی سی زندگی پر دو راتیں اپنی پوری ہولناکی اور پوری سیاہی کے ساتھ چھائی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک رات وہ تھی' جب واشنگٹن کے ایک بڑے سے گھر سے اسے ریجیکٹ قرار دے کر اور دھکے مار کر نکالا گیا تھا اور دوسری وہ رات تھی' جب اس کی عزت نفس' اس کا وقار' اس کی شخصیت کی آن بان اس سے چھین لی گئی تھی' اسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔

بل کو وہ دیکھنے میں بڑا مضبوط نظر آتا ہے؟ کیا بل کو پتا ہے کہ وہ آج بھی راتوں کو ان دو راتوں کے خوف اور دہشت کا شکار ہو کر ڈراؤنے خواب دیکھ کر چیخیں مار کر اٹھ بیٹھتا ہے؟

"میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا بل! میری زندگی جیسے گزر رہی ہے' میں اسے ایسے ہی گزار دینا چاہتا ہوں۔"

وہ قطعیت سے بولا تھا مگر بل اسے اس کی زندگی برباد کرتے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ اسے پیار سے سمجھاتا رہتا تھا۔

بل اسے زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ خواہش کے باوجود' کوشش کے باوجود کبھی اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تک نہیں دیکھ پاتا تھا۔ وہ سکندر کو اپنا بیٹا کہتا تھا مگر اسے لگتا تھا سکندر کو اس کے بیٹا کہنے یا نہ کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

مگر مسلسل کوشش کرتے رہنے سے بل اسے اس بات پر راضی کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر لے۔

"خود کو اس قابل تو بنا لو سکندر! کہ جن لوگوں نے تمہاری زندگی تباہ کی ہے' تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے' کبھی دوبارہ ان سے سامنا ہو تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں کہ تم ان کے لاکھ چاہنے پر بھی تباہ نہیں ہوئے' تمہاری زندگی برباد نہیں ہوئی۔"

اسے نہ کسی بچھڑے سے ملنے کا کوئی شوق تھا' نہ کسی بچھڑے پر کچھ ثابت کرنے کا۔ مگر جب وہ زندہ بھی تھا' زندہ لوگوں کی طرح نوکری بھی کرتا تھا' کھاتا پیتا بھی تھا تو واقعی یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ وہ ساری زندگی کسی بار یا نائٹ کلب میں کام کر کے گزارے گا۔ اس نے میمفس کے ہی ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ دن میں پڑھتا تھا۔ پھر کالج سے سیدھا دن میں ہی وہ بار

آجاتا تھا اور پھر رات گئے بار بند ہونے کے وقت تک وہاں کام کیا کرتا تھا۔ ہارورڈ کے بعد یہ کالج یوں لگتا تھا' جیسے وہ آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا گیا تھا۔ مگر وہ اس جگہ کا ہارورڈ کے ساتھ مقابلہ و موازنہ نہیں کرتا تھا۔

بار میں آج بھی اس کی وہی جاب تھی' بل اب اس پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔ بار کے تقریباً" تمام معاملات اب وہی دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنی تعلیمی زندگی میں تین سال پیچھے ہو گیا تھا۔ اگر پڑھائی میں یہ وقفہ نہ آیا ہوتا تو وہ آج لاء کے بھی دوسرے سال میں ہوتا۔

بل اب بیمار رہنے لگا تھا۔ بار کو اب سکندر ہی سنبھال رہا تھا۔ ادھر اس کا بیچلرز مکمل ہوا' ادھر بل کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا بیچلرز پورا ہوتے بل نے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی اس کامیابی پر بہت خوش ہوا تھا۔ بل کا بیٹا جو اسے چھوڑ کر کہیں اور رہتا تھا۔ اس کے انتقال کے فوراً" بعد ہی آگیا تھا۔ بار کا مالک اب وہ تھا' سارا انتظام اس نے سنبھال لیا تھا۔ وہ سکندر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہ شک رہتا تھا کہ سکندر بار پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے خاموشی سے بار چھوڑ دیا تھا۔ مگر بل کے ساتھ اتنے سال رہنے سے یہ ہوا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی پہلے کی طرح برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی گریجویٹ ڈگری پوری کر چکا تھا اور اب کہیں بہتر ملازمت کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد ہی اسے ایک لاء فرم میں جاب مل گئی تھی۔ اسے فرم کے ایک سینئر وکیل کے سیکریٹری کی جاب مل گئی تھی۔

اب وہ تعلیم یافتہ اور بہت ذہین اور قابل لوگوں کے درمیان رہتا تھا اور ان ذہین اور قابل لوگوں کے درمیان اس کی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت بہت عرصہ چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اپنے باس کے لیگل ڈاکومنٹس ٹائپ کرتے' کلائنٹس کے ساتھ اس کی میٹنگز کا شیڈول بناتے وہ مختلف کیسوں کی لیگل ریسرچ میں اپنی فرم کے اس سینئر قانون داں کو' جس کو عنقریب فرم کا ایک پارٹنر بن جانا تھا' مدد دینے لگا تھا۔ بلکہ ان سے کہیں زیادہ بہتر ریسرچ کر کے اسے لیگل ڈاکومنٹس ڈرافٹ کر کے دینے لگا تھا۔ جاب کرنے کے ساتھ اس نے میمفس کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لے کر لاء پڑھنا بھی شروع کر دیا۔

اس کی ذہانت' قابلیت اور فرم کے لیے اس کی اہمیت کے سبب اسے دوران ملازمت تعلیم حاصل کرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی اور فرم کی طرف سے اس کی فیس کی ادائیگی میں بھی اسے تعاون فراہم کیا گیا تھا۔ وہ صبح سے دوپہر تک کیمپس میں ہوتا تھا اور پھر دوپہر سے رات گئے تک فرم میں موجود رہا کرتا تھا۔

اس نے اپنی لاء کی ڈگری کا پہلا سال مکمل کیا تو اسے ترقی دے کر لیگل سیکریٹری سے پیرالیگل بنا دیا گیا تھا مگر ابھی وہ کسی بھی کورٹ میں اور جج کے سامنے اپنی فرم کی طرف سے بطور وکیل پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ چار سال قبل جب وہ لاء پڑھ رہا تھا اور بطور پیرالیگل اسی فرم میں کام کر رہا تھا' تب شہریار خان نے اسے اس کی ماں کی بیماری کے سبب ڈھونڈ کر فون کیا تھا۔

اس کی جدائی کے دکھ نے اس کی ماں کے وجود کو کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ انہوں نے آٹھ سال سے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا۔ چپ چاپ یہ درد سہتے سہتے آخر وہ ایک روز ہمت ہار گئی تھیں۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ بیماری ابتدائی اسٹیج پر ہی پتا چل گئی تھی۔ علاج بھی ممکن تھا اور ڈاکٹر ان کے صحت یاب ہو جانے کے بارے میں بھی پر امید تھے۔ ان کا فوری طور پر آپریشن کر دیا گیا تھا جو کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر پھر بھی ان کی حالت سنبھل نہیں رہی تھی۔ تب یقیناً" آمنہ کے سرجن کے مشورے پر ہی شہریار خان نے اس سے رابطہ کیا تھا۔

انہوں نے اسے کیسے ڈھونڈا' وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاس ایک دن اچانک اس کے دفتر میں ان کی کال آئی تھی۔

"تمہاری ماں بہت بیمار ہے۔ تمہیں یاد کر رہی ہے۔"

بس یہ جملہ انہوں نے اس سے کہا تھا۔ وہ آ رہا ہے یا نہیں 'یہ بھی کنفرم نہیں کیا تھا۔ وہ ماں کی بیماری کی اطلاع پاتے ہی ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چار سال قبل وہ اپنی زندگی میں آج کی طرح سیٹل نہیں تھا۔ ایمرجنسی میں پاکستان جانے کے لیے اسے نکولس سے ادھار مانگنا پڑا تھا۔ تب نکولس اس کی فرم میں وکیل تھا اور وہ وہاں ایک پیرالیگل 'مگر نکولس اسے برابری کے درجے پر رکھتا تھا۔ باپ کے فون سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ اب اس کی فیملی پاکستان میں رہتی ہے۔

وہ کراچی پہنچتے ہی سیدھا ہسپتال اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ اس کی شکل نہ دیکھنی پڑے یہ سوچ کر اس کا بھائی جتنی دیر وہ ہسپتال میں رہا 'ہسپتال نہیں آیا تھا اور باپ ہسپتال ہی میں کہیں موجود ضرور تھا 'پر اس کی شکل دیکھنا اس نے بھی گوارا نہ کیا تھا۔ اگر وہ دونوں اس سے مل لیتے۔ اسے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کی ماں جن کی حالت بہت نازک تھی 'جو کسی کے بھی پکارنے پر پندرہ دنوں سے آنکھیں نہیں کھول رہی تھیں 'اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر روتی رہی تھیں۔

وہ ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھیں اس لیے وہ ان کے پاس جھکا ہوا تھا۔ کبھی وہ اس کا چہرہ چومتیں 'کبھی اس کے ہاتھوں پر پیار کرتیں۔ وہ زارو قطار روتے ہوئے اسے والہانہ چومے جا رہی تھیں۔

وہ ماں سے بہت پیار 'بہت عزت 'بہت احترام سے ملا تھا۔ انہوں نے اسے جنم دیا تھا 'پالا پوسا تھا۔ مگر آج وہ خود کو ان کے قریب محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔

آمنہ روتے ہوئے کبھی اسے حسرت سے دیکھتیں 'کبھی پیار سے 'کبھی دکھ سے 'کبھی ندامت سے۔ اس نے ماں سے کوئی گلہ 'کوئی شکوہ 'کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کے پچھلے آٹھ سالوں میں کچھ برا ہوا ہی نہیں تھا۔

"امو جان! آپ ٹھیک ہو جائیں پلیز۔" اس نے ان سے پیار سے کہا تھا۔

"میں تمہیں دیکھتے ہی ٹھیک ہو گئی ہوں بیٹا! پتا ہے میں نے اللہ سے دعا مانگی تھی 'جب تک میں اپنے سکندر سے مل نہ لوں۔ مجھے موت نہ دینا پروردگار۔ سکندر! میرے بچے 'مجھ سے اب دور مت جانا۔"

وہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے بولی تھیں اور اس رات اس نے اپنی بیمار ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ ان سے نہیں کھوئے گا۔ غالباً" وفا شعار اور مہر بہ لب اطاعت گزار بیوی کو موت کے دہانے سے واپس پلٹتے دیکھ کر شہریار خان کا دل بھی تھوڑا نرم ہو گیا تھا 'تب ہی ہسپتال سے واپس آجانے کے بعد جب آمنہ نے اس کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیے رکھا تو شہریار خان نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

اس ایک رات وہ ہسپتال میں ماں کے پاس رہا تھا اور وہ پھر سے جی اٹھی تھیں۔

اگلے روز وہ ہسپتال ہی سے واپس چلا گیا تھا۔ اس ایک رات کے بعد پھر وہ دوبارہ کبھی پاکستان نہیں گیا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کا اپنی ماں سے فون پر رابطہ رہنے لگا تھا۔ مختصر سی گفتگو۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود نہ کہہ پانے والی گفتگو۔ آمنہ نے کئی بار اس کے ماضی کے سالوں کے متعلق پوچھا تھا۔ مگر وہ اس موضوع پر کچھ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب ماں سے بھی اپنے اندر کی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ گلے 'شکوے 'شکایتیں 'ناراضیاں 'روٹھنا 'منانا 'خفا ہونا.... اس کے لیے یہ سب کچھ اپنے معنی و مطلب کھو چکا تھا۔

اس دوران میں مفس میں اسی فرم میں پیرالیگل کی جاب کرتے اگلے پونے دو سالوں میں وہ اپنی لاء کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ ہارورڈ سے نہیں 'ایک عام سی یونیورسٹی سے 'کسی اعزاز اور میڈل کے ساتھ نہیں 'عام سے انداز میں۔ اس کی زندگی کا آزمائشوں اور سختیوں سے بھرا وقت آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا تھا۔ بار اور نائٹ کلب میں لوگوں کو شراب پیش کرنے والا وہ دوبارہ معاشرے میں باعزت بن گیا تھا۔

دو سال قبل اسے دوہا میں اس ملٹی نیشنل کمپنی میں لیگل ایڈوائزر کی اپنی موجودہ اور کافی اچھی جاب مل

گئی تھی۔ اس کی زندگی میں عزت اور رتبہ واپس آگیا تھا۔ وہ 'وہ نہ بن سکا تھا' جو اس کے لیے کبھی کسی نے خواب دیکھے تھے' جو وہ خود بننا چاہتا تھا اور جو کچھ بننے کی اس میں اہلیت اور قابلیت تھی۔ کبھی اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو آفاق چھو سکتا ہے' اس میں اتنی بے مثال ذہانت اور ایسی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں کہ وہ نئے جہان اور نئی دنیا میں دریافت کر سکتا ہے۔

مگر وہ آج بھی زندہ لاش ہی کی طرح اپنے وجود کو گھسیٹتا تھا۔ اس کے لیے زندگی اپنی کشش کھو چکی تھی وہ نوکری بھی کرتا تھا' لوگوں سے ملتا بھی تھا۔ وہ زندہ لوگوں جیسے تمام کام کرتا تھا مگر بغیر زندگی کی امنگ کے۔ اس کے سامنے نہ کوئی مقصد تھا نہ منزل۔

کبھی کوئی پوچھتا کہ اگلے دس سالوں بعد وہ زندگی میں خود کو کہاں دیکھتا ہے تو وہ دل میں سوچا کرتا کہ وہ اگلے دس سالوں بعد زندہ ہی نہیں ہونا چاہتا تو کچھ اور کیا سوچے۔ وہ مستقبل کی کسی 'پلاننگ' آنے والے کل کی کسی امید کے بغیر جیسے زندگی کو گھسیٹ رہا تھا۔ اب بھی اس کا خودکشی کرنے کو جی چاہتا تھا مگر بارہ سال بعد بھی وہ اتنا ہی بزدل تھا۔

ہارورڈ میں پڑھتا' اپنی قابلیت اور صلاحیتوں سے دنیا کو فتح کر لینے کے خواب دیکھتا وہ سکندر کہیں کھو چکا تھا۔ بارہ سال بعد بھی وہ دو راتیں اسے آج بھی ڈراؤنے خوابوں کی صورت سوتے سے جگا دیا کرتی تھیں' اسے اعصابی درد اور بے خوابی میں مبتلا کیے رکھتی تھیں۔ اسے خود سے' زندگی سے اور دنیا سے نفرت میں مبتلا کیے رکھتی تھیں۔ وہ ان خوابوں سے بارہ سال بعد بھی اتنا ہی ڈرتا تھا جتنا روز اول ڈرا تھا۔ اسے یقین تھا اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہے گی اور پھر ایک دن یونہی تنہا تمام درد سہتے سہتے ختم بھی ہو جائے گی۔

مگر اسے پتا نہیں تھا اس زندگی میں اسے لیزا محمود بھی ملے گی۔ اس زندگی میں ابھی اسے زندگی بھی ملے گی۔ جب نہ اسے ہنسی کی کوئی ضرورت رہی تھی' نہ خوشی کی' نہ محبت کی اور نہ ہی زندگی کی' تب اس کی زندگی میں ہنسی' خوشی' محبت اور زندگی بن کر وہ چلی آئی تھی۔

بارہ سال بعد ایسا لگا تھا جیسے وہ زندہ ہے۔ بارہ سال بعد اس کا خواب دیکھنے کو دل چاہا تھا۔ خوش ہونے کو دل چاہا تھا۔ بارہ سال بعد اس لڑکی نے اسے اس کے ان خوف ناک خوابوں کے حصار سے باہر نکالا تھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے دل کی سنتا' اس کے پیچھے پیچھے فلورنس چلا آیا تھا۔ اس نے لیزا کو اپنے بارے میں وہ بتا دیا تھا' جو وہ مرتے دم تک کبھی کسی کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ساری رات وحشت کے عالم میں جاگتا رہا تھا۔ صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ صبح ہوگی تو وہ لیزا سے ملے بغیر ہی یہاں سے چلا جائے گا اور پھر وہ اس سے زندگی بھر نہیں ملے گا۔ کل رات اپنی جو بھیانک سچائی اس نے لیزا کو بتائی ہے' اس کے بعد اب وہ اس کا سامنا کیسے کر سکتا ہے؟

صبح سویرے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل کے عملے کا ایک فرد وہاں کھڑا تھا۔

"یہ آپ کے لیے بھجوایا گیا ہے۔"

اس نے سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ اور ایک سلیقے سے پیک ہوا گفٹ اس کی طرف بڑھایا۔ حیران ہوتے اس نے وہ چیزیں اس سے لے لیں۔ پھولوں کے ساتھ کوئی کارڈ منسلک نہ تھا۔ اس نے گفٹ پر چڑھا پیپر کھولا اس میں سے نکلنے والی چیز کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ جاپانی سیمورائی کا ایک منی ایچر مجسمہ تھا۔ جنگی لباس میں' چہرے پر طاقت کا تاثر اور ہاتھوں میں مضبوطی سے تلوار تھامے سیمورائی۔

گفٹ باکس میں سیمورائی کے مجسمہ کے ساتھ ایک کارڈ بھی رکھا تھا جو ہاتھ سے بنایا ہوا تھا' کسی ماہر آرٹسٹ کے ہاتھوں کا بنایا ہوا۔ کارڈ پر سیمورائی کی تلوار کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پینٹ کیا گیا تھا۔

ساتھ ہی اوپر خوب صورت انداز میں نمایاں حروف میں لکھا تھا۔

"You are stronger than a samurai"

(تم سیمورائی سے زیادہ طاقت ور ہو۔)

اس نے کارڈ کھولا۔ اندر اسے مخاطب کرکے لکھا گیا تھا۔

"سینور سکندر!

سیمورائی وہ بہادر مرد تھے۔ جو نہ موت سے ڈرتے تھے نہ زندگی کے دوسرے امتحانات سے۔ وہ آن، بان اور عزت پر جان دے دینے والے تھے اور آج بھی طاقت، ہمت، بہادری اور دلیری کا سمبل سمجھے جاتے ہیں، مگر میرے لیے سیمورائی سے بھی زیادہ بہادر اور باہمت تم ہو سکندر!

کل رات کے بعد سے میرے دل میں تمہاری عزت اور تمہاری محبت اور بڑھ گئی ہے۔ جو زندگی کے اتنے کٹھن حالات سے گزرنے کے بعد بھی خود کو سنبھال لے، تمام بدترین حالات کا تنہا جواں مردی سے سامنا کرلے، اس سے بڑھ کر بہادر اور کون ہو سکتا ہے؟

تم ایک بہادر مرد ہو سکندر! اور مجھے بہادر مرد بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نیچے تمہارے ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔

لیزا۔"

وہ فوراً" بیڈ سے کھڑا ہوا تھا۔ کارڈ اور مجسمہ وہیں رکھا۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی البتہ اپنی رات بھر کی جاگی ہوئی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے ضرور مارے اور انتہائی تیز رفتاری سے نیچے آیا۔

لیزا اسے سامنے ہی ایک میز پر بیٹھی نظر آگئی تھی۔ لیزا کے سامنے میز پر ناشتے کے تمام لوازمات سجے تھے۔ گویا وہ ناشتا منگوا کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ جواب میں بالکل بے اختیاری کیفیت میں وہ بھی مسکرایا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر رات کا کوئی درد، کوئی تکلیف، کوئی خواب، کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کو کیا کہے، جو ہر بار اس کے چہرے پر ہنسی اور دل میں خوشی لانے کا باعث بنتی ہے۔

"یہ سیمورائی کا لقب تم نے مجھے کب دیا؟"

"نتائیوولی میں۔ جب تم نے فلمی ہیروز کی طرح ان جیسیوں سے دھواں دھار لڑائی کی تھی۔ دل تو میں تم پر بہت پہلے ہی ہار چکی تھی، مگر سچ کہوں تو اس روز میرے دل نے کہا تھا مجھے اسی بہادر مرد کے ساتھ اپنی تمام عمر گزارنی ہے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے اطمینان اور سکون سے بولی تھی۔ وہ قصداً" لیزا کے جملے کا آخری حصہ نظرانداز کرکے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں؟"

"گوگل پر سرچ کیا تھا۔" وہ ہنس کر اسے چھیڑنے والے انداز میں بولی۔ اس کی کل کی بات کا حوالہ دے رہی تھی۔

"میں تمہاری طرح مشہور شخصیت تو نہیں جو گوگل پر سرچ کرنے سے مل جاؤں۔"

وہ جواباً" ہنسا۔ لیزا لبوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے چپ ہوا۔ اس نے لیزا پر سے نظریں ہٹائیں اور پل بھر کے توقف کے بعد اس نے اسے مخاطب کیا۔

"لیزا میں......" وہ جو کہنا چاہ رہا تھا، شاید وہ سمجھ گئی تھی تب ہی اس نے اس کے ہاتھوں پر فوراً" اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسے مزید کچھ کہنے سے روکنے کے لیے۔

"جو باتیں تمہارے دل کو اتنی تکلیف دیتی ہیں تم انہیں مجھ سے بھی مت دہراؤ سکندر! تم نے کل جو کچھ مجھے بتایا۔ وہ نہ بھی بتاتے تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جان لینے کے بعد بھی کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سوائے اس کے کہ میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ گئی ہے۔ بہت اوپری اور مصنوعی بات لگے گی مگر میں کہوں کہ تمہاری زندگی کے دکھوں پر میرا دل رو رہا

ہے۔ میں کل رات بہت روئی ہوں سکندر!"

اس نے نظریں اٹھا کر لیزا کو دیکھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرتی نظر آئی۔ وہ لڑکی اس کے دکھوں پر رو رہی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے رکی' پھر اس نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"سکندر! وہ جو بہت بھیانک تھا' وہ ماضی تھا اور وہ گزر چکا ہے۔ ماضی کو کہیں دفن کرکے تم آج کی بات کرو۔ آج کی' میری اور اپنی' ہمارے آج کی' ہمارے آنے والے کل کی۔" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

اب یہ کہنا بے کار تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ اس کا لیزا کے پیچھے فلورنس چلے آنا ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اس لڑکی سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں لیزا! مگر جو تم چاہتی ہو' وہ ممکن نہیں۔" وہ اسے دکھ سے دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

"کیوں؟ کیوں ممکن نہیں ہے سکندر!"

"میری زندگی ایک نارمل شخص کی زندگی نہیں ہے لیزا! میں اس ابنارمل زندگی اور تنہائی کا عادی ہوچکا ہوں۔ میں اب اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا۔ میں میرڈ لائف یا فیملی لائف کو انجوائے کرنے والا آدمی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چاہے جتنی بھی محبت کرتے ہوں مگر میرا ساتھ تمہیں دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں دے گا۔"

"میں بھی پانچ سالوں سے اکیلی اپنی فیملی کے بغیر رہ رہی ہوں سکندر! اپنے پاپا سے میرے بہت اختلافات ہیں۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کے ساتھ پاکستان میں رہوں۔ میں اپنے پاپا کو ناراض کرکے لندن میں رہتی ہوں۔ وہ پاکستان میں اپنی دوسری وائف کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری ممی' میرے پاپا سے طلاق کے بعد تین شادیاں مزید کرچکی ہیں الکحل کی زیادتی نے انہیں کئی بیماریوں میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ آئے دن ہسپتال میں داخل ہوجاتی ہیں۔ نارمل فیملی لائف تو کبھی میں نے بھی نہیں گزاری۔ پھر بھی میں تمہاری طرح یہ تو نہیں کہہ رہی کہ میں کبھی کوشش بھی نہیں کروں گی۔ ہم دونوں اپنی اپنی زندگی کی کمزوریوں' خامیوں' کمیوں اور غیر معمولی پن کے ساتھ بھی تو زندگی گزار سکتے ہیں سکندر!" وہ مضبوط لہجے میں بولتی جیسے اسے قائل کرلینا چاہتی تھی۔

"اچھا ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی ناشتا کرلیں' ٹھنڈا ہورہا ہے۔" وہ جیسے اپنا دامن بچا کر بولا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ وہ رشتوں کا ایسا ڈسا ہوا تھا کہ اب ایک نیا رشتہ بنانا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

وہ اس جذباتی کیفیت میں ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جو کل کو لیزا کی پرسکون زندگی میں دکھ ہی دکھ لے آئے۔ وہ خود کو نہیں' لیزا کو دکھوں سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ زندگی میں اتنی چوٹیں اور اتنے زخم کھاچکا تھا کہ اب کوئی نیا زخم' کوئی نئی چوٹ اسے زیادہ تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھی۔ مگر سچی ہنسی ہنسنے والی اس لڑکی کو' جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتا تھا' دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو تک گوارا نہیں کرسکتا تھا جبکہ اس کے ساتھ نے اس لڑکی کو آنسوؤں کے سوا کچھ دینا نہیں تھا۔ وہ اپنے ٹوٹے گھر اور بکھری فیملی کی بات کررہی تھی۔ اسے سکندر سے مماثل قرار دے رہی تھی وہ اسے کیسے بتائے کہ اس کی زندگی اور سکندر شہریار کی ذلت' رسوائی اور شکست سے بھری زندگی میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی مماثلت کبھی ہو بھی۔ وہ ہیرا تھی' وہ کوئلہ تھا۔ کیمیکل کمپوزیشن ایک سی' مگر پھر بھی بہت فرق تھا۔ ہیرا جس تن پر سج جائے اس کی قدر بڑھادے اور کوئلہ جس ہاتھ میں جائے اسے بھی سیاہ اور داغ دار بنادے۔ وہ اس اجلی' شفاف اور پیاری لڑکی کی زندگی پر اپنی زندگی کی نحوستوں کا کبھی سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا۔

لیزا شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں کو قصداً" نظر انداز کرکے ناشتے کے لوازمات پر نگاہیں دوڑانے لگا۔

"واؤ' میرا فیوریٹ مشرومز والا آملیٹ اور اٹالین کیک۔" اس نے اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈالا۔ "تم بھی

شروع کرو ناں۔"

وہ چھری اور کانٹے کی مدد سے آملیٹ کھانے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین رول بھی کھا رہا تھا۔ اس نے لیزا کی پلیٹ میں بھی آملیٹ ڈالا تھا۔

"بیلا! اس طرح اداس بیٹھی تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہو۔ پلیز ناشتا کرو۔ میں ابھی کہیں نہیں گیا ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ ہم اس ٹاپک پر ناشتے کے بعد بھی بات کر سکتے ہیں۔"

لیزا نے جیسے محض اس کا ساتھ دینے کے لیے آملیٹ کھانا شروع کیا تھا' اداسی اور خاموشی کے ساتھ۔ سکندر بھرپور انداز میں ناشتا کر رہا تھا۔ اپنے اندر اس وقت ہوتی ٹوٹ پھوٹ' شکست و ریخت' وہ لیزا پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ اس لڑکی کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے' اس لڑکی کو ابھی اسی وقت اپنا لے۔ اسے خود سے کبھی ایک پل کے لیے بھی دور نہ ہونے دے۔ مگر وہ خود غرض نہیں تھا۔ وہ دوسرے لوگوں اور رشتوں کے ساتھ کبھی خود غرض نہ رہا تھا تو اس لڑکی سے محبت کے رشتے میں کیونکر خود غرض ہو سکتا تھا؟

وہ دونوں ناشتا کر چکے تھے۔ وہ بھرپور انداز میں جبکہ لیزا اداسی کے ساتھ' اس سے شکوہ اور ناراضی لیے۔

"میری فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔ کیا تم مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے چلو گی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں گڈ بائی کہنے؟" بے بسی اور غصہ بھرا تھا اس کے سوال میں۔

"گڈ بائی کیوں؟ اب ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہا کریں گے۔ تمہارے ساتھ ساری زندگی دوستی کا تعلق تو میں چاہتا ہوں لیزا! میں چاہتا ہوں' دل کھول کر ہنسنے اور بہت بولنے والی لیزا محمود زندگی بھر میری دوست رہے۔"

"کیا ہم زندگی کے ساتھی نہیں بن سکتے؟"

"نہیں' تب ہم دوست نہیں رہ سکیں گے۔ میرا ساتھ تمہیں اتنے دکھ دے گا کہ تم میری شکل' میرے نام تک سے نفرت کرنے لگو گی۔" وہ یک دم ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم صاف کیوں نہیں کہتے سکندر شہریار! کہ تم رشتے بناتے ہوئے ڈرتے ہو۔ کہیں تمہیں پھر کوئی نئی چوٹ نہ لگ جائے' اس خوف سے تم نئے رشتے جوڑنا ہی نہیں چاہتے۔" وہ یک لخت ہی غصے سے بولی۔

"ہاں' ڈرتا ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں رشتے جوڑنے سے۔ رشتے نبھانے کی اہلیت گنوا چکا ہوں۔ مگر مجھے یہ خوف اپنے لیے نہیں' تمہارے لیے ہے۔ لیزا! میں خود کو نہیں' تمہیں دکھوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری بات سچ لگے یا جھوٹ' بزدلی لگے یا کم ہمتی' مگر میں تم سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے پہلے تو میں مر جانا پسند کروں گا۔"

اس نے بات لیزا ہی کے انداز میں غصے سے شروع کی تھی مگر آخر میں آ کر اس کی آواز جذبات کی شدت سے مدھم ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور بے بسی جھلکنے لگی تھی۔ لیزا چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا' اس نے جیسے خود کو کمپوز کیا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے ایئر پورٹ جانے کے لیے تیار ہونا ہے۔ میری فلائٹ میں کم وقت رہ گیا ہے۔"

وہ اسے اسی طرح بیٹھا چھوڑ کر لفٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے لیزا سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں بیٹھے گی یا چلی جائے گی۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں ایئر پورٹ پر تھے۔ وہ ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ سارا راستہ وہ دونوں خاموش رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک لفظ تک کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔

وہ اسے خفا کر کے جاتے ہوئے بہت اداس تھا' اسے لیزا کی آنکھوں میں خفگی' اداسی اور آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ فلائٹ کا ٹائم ہو رہا تھا۔ اس نے لیزا کو دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھول ہی رہا تھا کہ

لیزا بھرائی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی۔

"مجھے گڈ بائی مت کہنا سکندر! پچھلی بار میں مضبوط رہی تھی مگر آج رو پڑوں گی۔ تم مجھے ٹھکرا کر جا رہے ہو تو خاموشی سے چلے جاؤ۔ مجھے تمہارے پر تکلف الوداعی جملوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے بے اختیار لیزا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور نرمی سے بولا۔

"مجھ سے خفا مت ہو لیزا! تم نہیں جانتیں مگر میں جانتا ہوں اپنے اندر اتری تنہائیاں اور ویرانیاں۔ تم میرے ساتھ کبھی خوش نہیں رہو گی۔"

"میں تمہارے بغیر بھی تو خوش نہیں رہوں گی۔" وہ بولتے ہوئے رو پڑی تھی۔

وہ اس لڑکی کو دکھ دینے اور رلانے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی وجہ سے روتا دیکھ کر اس کا دل تڑپ رہا تھا۔

"میں تمہارے بغیر کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی سکندر! تمہارے ساتھ اگر میں دکھی بھی رہی ناں تب بھی تمہیں الزام نہیں دوں گی۔ پلیز مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ۔"

"کیوں خود کو کانٹوں پر گھسیٹ رہی ہو؟ اپنی اچھی بھلی پر سکون زندگی کو کیوں ایک کڑے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہو؟ تمہیں میرے ساتھ میں کانٹوں بھرے راستے کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

وہ اس کے سامنے کھڑی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ اس لڑکی کے آنسوؤں سے ہارنے لگا تھا۔ نہیں دیکھ سکتا' وہ اسے روتا ہوا۔ اب اس کے انکار میں شدت نہیں رہی تھی۔ ایک ہار مان لینے والی کیفیت آگئی تھی وہ جیسے اس لڑکی کے آگے ہتھیار ڈالنے لگا تھا۔

"چار دن نہیں گزریں گے تمہیں میرے ساتھ زندگی شروع کیے اور تم اپنے فیصلے پر پچھتانے لگو گی۔"

"یہ میری زندگی ہے ناں سکندر! میں اس کے ساتھ جو بھی کروں میری مرضی۔ میں پچھتاؤں گی یا دکھی ہوں گی' تمہیں اس سے کیا پرابلم ہے؟ اگر تمہیں لگتا ہے' میں تمہارا ساتھ مانگ کر اپنی زندگی اجاڑ رہی ہوں تو اجاڑ لینے دو مجھے میری زندگی۔ ایسی آباد زندگی جس میں سکندر شہریار میرے ساتھ نہ ہو' میرے لیے سب سے اجاڑ اور سب سے ویران ہو گی۔ پلیز سکندر! مجھے اپنا ساتھ دے دو۔"

وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے لفظوں میں ضد بھی تھی اور محبت کی شدت بھی۔ اور وہ ہار گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی محبت کی شدت کے سامنے پسپا ہو چکا تھا۔

"ٹھیک ہے لیزا! تمہاری ضد اور تمہاری خوشی کے آگے میں سرینڈر کرتا ہوں۔ میں ہار مان رہا ہوں لیزا محمود! بولو کب شادی کرنی ہے؟"

لیزا نے روتے روتے ناراضی سے اسے گھورا تھا۔

"ایسے پرپوز کرتے ہیں کسی خوب صورت لڑکی کو؟ جس سے محبت بھی ہو؟ اتنے فضول اور غیر رومانٹک انداز میں۔ گویا مجھ پر احسان کیا جا رہا ہو۔"

دھوپ چھاؤں کا بڑا دلکش منظر تھا۔ وہ بولتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

"دیکھا میں نے کہا تھا ناں تم میرے ساتھ پچھتاؤ گی۔ دیکھ لو' میں کتنا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھ سے اس نئے رشتے کے پہلے لمحے ہی میں تمہیں مجھ سے شکایت ہو گئی۔ ابھی بھی وقت ہے' سوچ لو۔"

وہ لیزا کو شریر نگاہوں سے دیکھتا ہوا چھیڑ رہا تھا۔ وہ بے اختیار جھینپ گئی۔ رخساروں سے رگڑ رگڑ کر فوراً" اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔

"اچھا اچھا اب زیادہ فضول بولنے کی نہیں ہو رہی۔ یہ بتاؤ! ہم شادی کب کر رہے ہیں؟" وہ اپنی خفت مٹانے کو رعب سے بولی۔

"میں تمہارے آگے ہتھیار ڈال چکا ہوں۔ جب تم کہو' جہاں تم کہو' ہم وہاں شادی کر لیں گے۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

ایک لمحے میں ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ اسے استحقاق بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نے بے اختیار بہت مضبوطی سے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں پہلے سیم، نینی اور پاپا کو اپنے شادی کے فیصلے کا بتا دوں، پھر ہم شادی کی جگہ طے کرلیں گے۔ میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت سیم کی ہے۔ اسے میری شادی میں لازمی شریک ہونا چاہیے۔ میں ذرا اس سے یہ معلوم کرلوں کہ وہ کب آسکتی ہے، پھر تاریخ اور جگہ طے کرلیں گے۔ میری طرف سے دو مہمان ہوں گے سیم اور نینی۔ پاپا اگر آنا چاہیں گے تو آجائیں، مجھے ان کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اور یہ شادی ہوگی کہاں؟ لندن میں، روما میں یا دوہا میں؟"

"لندن، دوہا، روما کوئی بھی جگہ ہو، میرے لیے تو ہر جگہ ہی ٹھیک ہے۔" وہ اپنی خوشی چھپائے بنا فوراً" بولی تھی۔

"پھر میرا خیال ہے، روما ٹھیک رہے گا۔ رومن لڑکی سے شادی اس کے روما میں ہی کی جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔" وہ اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتا ہوا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"صرف مناسب نہیں، بلکہ بڑا رومانٹک بھی رہے گا۔ ہم اپنا ہنی مون بھی روما میں ہی منائیں گے۔" وہ جیسے کھڑے کھڑے سارے پلان بنا رہی تھی۔

"ہنی مون؟ سینوریتا لیزا! ان فضولیات کی تم مجھ سے امید مت رکھنا، تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں میں ذرا بھی رومانٹک نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے تم سے نکاح کے فوراً" بعد میں تمہیں گھر پر چھوڑ کر اپنے آفس چلا جاؤں یا آفس کا کچھ کام نکال کر بیٹھ جاؤں۔"

وہ جیسے اسے ڈرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرارتی مسکان بکھری تھی۔ جیسے ابھی بھی اسے اس کے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب بھی وقت ہے، تم سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے سینور سکندر! میں تم ہی سے شادی کروں گی۔ وقت کے ساتھ ہر کسی میں تبدیلی آجاتی ہے اور پھر محبت میں بہت طاقت ہے، یہ سب کچھ بدل کر رکھ سکتی ہے۔" وہ سکندر کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بے حد سنجیدگی سے بولی۔

"یعنی تم میرے لیے خود کو بدل لوگی؟ اپنی رومانٹک سوچوں اور خواہشات کی میری خاطر قربانی دے دوگی؟"

"نہیں، تم میرے لیے خود کو بدل لوگے سکندر شہریار! ہماری شادی شدہ زندگی میں اگر کوئی تبدیلی ہوگا تو وہ تم ہوگے۔"

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اس کی فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر لیزا بھی مسکرائی تھی۔

"مائی برائڈ ٹوبی! آپ بہت رومانٹک ہیں اور خواب بہت دیکھتی ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے لیزا کی آنکھوں میں اپنا ہی عکس نظر آرہا تھا۔

"میں تمہیں بھی خواب دیکھنا سکھا دوں گی مائی گروم ٹوبی!" وہ اس کی سی ٹون میں بولی تھی۔

"چلوں میں؟" وہ اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتا ہوا بولا۔ لیزا نے جواباً" سر ہلایا۔

"سنڈے کو میری ایگزیبیشن کا آخری دن ہے۔ میں بھی پیر کو لندن واپس چلی جاؤں گی۔ تم میرے پاس لندن آؤ گے؟"

"تم جہاں کہوگی، میں وہاں آؤں گا۔"

"اب کی بار ملوگے تو میرے لیے رنگ لے کر آنا۔ ایسے کوئی پرپوز کرتا ہے بغیر رنگ کے؟"

"میں لے کر آؤں گا پرامس۔" وہ مسکرا کر بولا تھا اور اسے پتا تھا۔ دوہا جاتے ہی وہ سب سے پہلا کام اس کے لیے انگوٹھی خریدنے ہی کا کرے گا۔

☼ ☼ ☼

اس بار اس کے دور جانے پر وہ بالکل بھی اداس نہ تھی۔ اس بار یہ زمینی فاصلہ جو ان کے بیچ حائل ہوا تھا، وقتی تھا۔ سکندر کو ایرپورٹ چھوڑنے کے بعد اگلا کام اس نے سیم کو فون کرنے کا کیا تھا۔

"سیم، سیم، سیم! میں بہت خوش ہوں سیم!" اس

کے فون اٹھاتے ہی اس نے کہا تھا۔
"اور میں تمہاری خوشی سے بھرپور آواز سن کر بہت خوش ہوں لز۔"
"وجہ گیس کرو میری خوشی کی؟"
"تمہارا شو تمہاری امیدوں سے زیادہ کامیاب ہو گیا ہے' ہے نا؟" اس نے سیم کی مسکراتی آواز سنی۔
"جی نہیں' اس سے بھی بڑی بات ہے۔ بہت بڑی بات ہے سیم!" اس نے پل بھر کا ڈرامائی سا وقفہ دیا پھر خوشی سے کھنکتی آواز میں بولی۔
"میں شادی کر رہی ہوں سیم!"
"واقعی لز؟ کس سے؟ کون ہے وہ؟"
"وہی جو مجھے روما میں ملا تھا' پھر بچھڑ گیا تھا۔ وہ مجھے پھر مل گیا ہے سیم! اب کی بار کبھی بھی نہ بچھڑنے کے لیے۔ جس طرح میں اس سے محبت کرنے لگی تھی' وہ بھی کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے تلاش کرتا یہاں فلورنس تک آ گیا تھا۔ کتنی رومانٹک بات ہے ناں یہ سیم!"
وہ خوشی سے کھلکھلا رہی تھی۔ اسے جواب میں دوسری طرف مکمل خاموشی سنائی دی تھی۔
"سیم! کیا ہوا؟ تم چپ کیوں ہو گئیں؟"
"لز! میں کیا بولوں؟ تم ایک پاکستانی مرد سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر کے اس قدر خوش ہو رہی ہو۔ میں کیا بولوں؟"
سیم کی بہت سنجیدہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اپنی بے تحاشا خوشی میں سیم کی اس درجہ سنجیدگی نے اسے بھی پل بھر میں ہی بالکل سنجیدہ کر دیا تھا۔
"وہ جو ہے' جیسا ہے' جس ملک سے ہے' میں اس سے محبت کرتی ہوں سیم! میں اس کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔"
"جب تم فیصلہ کر ہی چکی ہو تو اب میں کیا کہوں؟"
سیم کا لہجہ بہت سنجیدہ اور بہت دکھ بھرا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی اور سیم چاہتے ہوئے بھی اسے اس فیصلے سے روک نہیں پا رہی تھی۔
"تم نے پاپا کو بتایا اس بارے میں؟" چند سیکنڈز کی خاموشی کے بعد سیم نے اس سے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔
سیم اتنی سنجیدہ تھی جیسے اس نے اسے اپنی موت کی اطلاع دے دی ہو۔
"ابھی نہیں بتایا۔ میں یہ خوشی سب سے پہلے تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی سیم!"
وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اس کے لہجے میں ایک شکوہ بھی چھپا تھا' بہن کے لیے کہ وہ اس کی زندگی کی اس اتنی بڑی خوشی کے موقع پر پاکستانی مردوں سے متعلق وہ قصہ کیوں شروع کر بیٹھی تھی۔
"لز! میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم ان پاکستانی مردوں کو نہیں جانتی ہو۔ محبت سب کچھ نہیں ہوتی لز پلیز سمجھو۔" سیم اس کی اداسی اور خفگی محسوس کر کے' بہت پیار سے بولی تھی۔
"سیم! میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرے لیے یہ محبت ہی سب کچھ ہے۔"
وہ رندھے لہجے میں بولی تھی۔ سیم کی سنجیدگی نے اسے اداس کر دیا تھا۔ سیم سے اسے جتنا پیار تھا اس کی خواہش تھی کہ سیم اس کی زندگی کی اس خوشی میں پورے دل سے خوش ہو۔ وہ سیم کو خفا کر کے اگر شادی کر لیتی تو بہت اداس رہتی۔ وہ سیم کو خفا کرنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔
"پلیز سیم! کیا تم میری خاطر اس رشتے پر خوش نہیں ہو سکتیں؟ اگر تم خوش نہیں ہوئیں' تم میری شادی پر نہ ہوئیں تو میں پورے دل سے خوش نہیں ہو پاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی تھی۔
"کس نے کہا' میں نہیں آؤں گی۔ میں صرف تمہیں سمجھا رہی تھی لز! لیکن اگر تم اس رشتے پر خوش ہو' یہیں شادی کرنا چاہتی ہو تو میں بھی خوش ہوں۔ میری گڑیا سی بہن دلہن بنے گی تو کیا میں اس کے پاس نہیں ہوں گی؟ یہ بتاؤ کب کر رہے ہو تم دونوں شادی؟"
اس کی اداسی اور آنسو محسوس کر کے سیم فوراً" ہی

محبت بھرے لہجے میں بولی تھی۔
"میں تمہیں ایک، دو دن میں فون کر کے بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا لز کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔"
"میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں سیم!"
سیم کی محبت کے جواب میں وہ بھی بہت والہانہ پن سے بولی تھی۔ وہ فون رکھ کر چپ چاپ بیٹھی تھی۔
سیم جب سکندر سے ملے گی تو اسے اندازہ ہو گا کہ تمام پاکستانی مرد برے نہیں ہوتے۔ اگر ان کے پاپا اور ہاشم برے ثابت ہوئے ہیں تو یہ کوئی فارمولا تو نہیں کہ تمام پاکستانی مرد برے ہی ہوں گے۔ وہ سیم کی اس سوچ کو تبدیل کر دینا چاہتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا، سیم کو سکندر بہت پسند آئے گا۔ وہ تھا ہی اتنا اچھا۔ وہ کسی کو بھی ناپسند ہو ہی نہیں سکتا تھا۔
دوسری کال وہ نینی کو کر رہی تھی۔ وہ نینی کے گلے لگ کر سکندر کو کھو دینے پر اتنا روئی تھی، آج انہیں بتانا چاہتی تھی کہ جسے اس نے کھو دیا تھا۔ وہ اسے پھر مل گیا ہے۔
"نینی! میں اور سکندر شادی کر رہے ہیں۔" سلام کے بعد اس نے اگلی بات انہیں یہی بتائی تھی۔ نینی خوش بھی ہو رہی تھیں اور بہت حیران بھی۔ اسے آرٹ گیلری اپنے شو میں پہنچنا تھا، اس لیے مختصر لفظوں میں اس نے جلدی جلدی نینی کو ساری بات بتائی تھی۔

☆ ☆ ☆
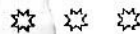
رات وہ اپنے فلیٹ میں تھا۔ وہی فلیٹ، وہی الجھی بکھری زندگی، وہی فلیٹ میں تنہائی اور خاموشی مگر پھر بھی اسے ہر طرف رونق ہی رونق محسوس ہو رہی تھی۔ کل رات اس کا جی چاہا تھا وہ روتا ہوا، اپنے بال نوچتا جنگلوں سے نکل جائے اور آج وہ بے وجہ مسکرائے جا رہا تھا۔ اسے زندگی اچھی لگ رہی تھی، اسے اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے وہی منی ایچر مجسمہ رکھے ہوئے بیٹھا تھا، جو آج صبح لیزا نے اسے دیا تھا۔ اس کا بنایا کارڈ بھی اس نے اپنے سامنے کھول کر رکھا ہوا تھا۔
وہ ان چیزوں کو دیکھتا لیزا کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ پاس رکھا موبائل بجا تھا۔ لیزا کال کر رہی تھی۔ اس نے لپک کر فوراً فون اٹھایا تھا۔
"لیزا۔" اتنے حق کے ساتھ اس کا نام لینا کتنا اچھا لگ رہا تھا، کس قدر دل نشیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
"کیا کر رہے تھے؟"
"سونے جا رہا تھا۔" وہ اسے چڑانے کو بولا تھا۔
"تم مجھ سے بات کیے بغیر سو جاتے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اتنی توفیق تو تمہیں ہوئی نہیں کہ ایک فون کال ہی اپنی خیریت بتانے کی کر دیتے اور ابھی بھی مجھ سے بات کیے بغیر سونے جا رہے تھے۔" وہ لڑنے والے انداز میں بولی تھی۔
"شکایت نمبر دو، چودہ گھنٹوں میں اب تک تمہیں مجھ سے دو شکایتیں ہو چکی ہیں سینوریتا!" وہ ہنس کر بولا۔

"مجھے ایک دن میں ایک ہزار شکایتیں ہوں گی مگر میں تمہارا پیچھا تب بھی نہیں چھوڑوں گی۔ ان فیکٹ مجھ سے چھٹکارا اب تمہیں زندگی بھر نہیں ملے گا۔" وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی۔
"ٹھیک ہے، مت چھوڑنا میرا پیچھا مگر ابھی تو مجھے سونے دو۔ چھٹیاں تمہاری ہیں۔ یہاں رات خاصی ہو چکی ہے اور میں نے صبح آفس جانا ہے۔" وہ اس سے بات کرتا ہوا صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر پیہم مسکراہٹ تھی۔ سچی مسکراہٹ... اس پل اسے دنیا کی کوئی چیز بری نہیں لگ رہی تھی۔ اسے زندگی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا زندہ رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کا خدا سے اپنی لمبی عمر کی دعا مانگنے کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ ابھی ملی تھی، ابھی ابھی۔ وہ اس کے ساتھ ایک بہت طویل عمر گزارنا چاہتا تھا۔
"بڑے بدتمیز اور بے مروت ہو تم سکندر شہریار!" وہ اس کی سونے والی بات کے جواب میں مصنوعی خفگی

سے بولی تھی۔

"شکایت نمبر تین۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ وہ جواباً" چڑچڑے انداز میں فوراً" بولی تھی۔

"سو جاؤ نان رومانٹک انسان!" وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ اس بار اسے لیزا کی بھی ہنسی سنائی دی تھی۔

"کچھ اچھی بات ہی بول دو۔ جسے سوچ کر میں ساری رات خوش ہوتی رہوں۔"

"بیلا! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ گو تمہارے معیار کے مطابق رومانٹک نہیں ہوں۔ جیسا تم توقع رکھتی ہو اس طرح کا اظہار محبت شاید میں کبھی بھی نہ کر پاؤں مگر میرے دل میں ہر طرف تم ہی تم ہو۔ پلیز جلدی سے آجاؤ میری زندگی میں۔ میں تمہارے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں' میں تمہارے ساتھ خوش ہونا چاہتا ہوں' میں تمہارے ساتھ زندگی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ آنکھیں بند کر کے اس سے بول رہا تھا۔ اپنے دل کی تمام تر سچائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ۔

"تم صبح مجھے فون کرو گی؟" اس نے آنکھیں بند کیے کیے آہستگی سے پوچھا تھا۔ وہ اپنی صبح بھی اسی کی آواز سن کر کرنا چاہ رہا تھا۔

"ہر بار میں فون کیوں کروں۔ تم فون کرنا۔"

"نہیں پلیز' تم کرنا لیزا! میں چاہتا ہوں صبح میری آنکھ تمہاری آواز سن کر کھلے۔" وہ بہت آہستہ آواز میں بولا تھا۔ اس بار جیسے اس کے چہرے پر موجود اور دل میں چھپے تمام جذبات اس تک پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی سے بولی تھی۔

"میں صبح تمہیں فون کروں گی سکندر!"

"میرا دل چاہ رہا ہے' تم اس وقت میرے پاس ہوتیں۔ میں تم سے کہتا' مجھے اپنے پاس چھپا لو۔ مجھے اپنے پاس لٹا کر بہت گہری نیند سلا دو۔ میں برسوں سے سویا نہیں ہوں۔"

وہ اس کی اتنی اپنی تھی کہ اپنا آپ اس پر عیاں کرتے ہوئے اسے کوئی شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔

"میں تمہارے سارے دکھ سمیٹ لوں گی سکندر!"

وہ آنکھیں بند کیے اس کی نرم آواز سن رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ لیزا کے شانے پر سر رکھ کر اپنے اندر کے برسوں سے جمے سب آنسو بہا ڈالے۔ اپنا ہر غم اس سے کہہ دے۔ اسے بتائے کہ دنیا نے' لوگوں نے' رشتوں نے اسے کتنے دکھ دیے ہیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار، سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم، زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ امو جان رو، رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں، وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے، ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوہا چلا جاتا ہے لیزا کو ہر ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم، محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوہا میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوہا آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے، اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

۹
نویں قسط

وہ اس کی آواز سن کر سویا تھا، وہ اس کی آواز سن کر ہی اٹھا۔

بہت گہری، بہت پرسکون نیند سو رہا تھا، وہ جب اس کے موبائل پر لیزا کی کال آئی تھی۔ وہ ٹھیک اس کے بتائے ہوئے ٹائم پر اسے جگا رہی تھی۔ ایک دو گھنٹیوں کے بعد وہ جاگا تھا۔

"اٹھ جائیے سینور سکندر!" اس کے نیند میں ڈوبے ہیلو کے جواب میں وہ مسکرا کر بولی۔

وہ اس کی آواز سنتے ہی بالکل خوش باش اور چست ہو گیا۔ یوں جیسے نیند سے جاگنے کے ساتھ ہی اسے دن بھر کے لیے بھرپور توانائی مل گئی ہو۔

"میں جاگ گیا ہوں سینوریتا!"

"تمہیں نیند آئی؟" وہ جانتا تھا لیزا اس کے نیند نہ آنے کے مرض کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سے یہ بات پوچھ رہی ہے۔ اسے لیزا کا اپنی فکر کرنا اور محبت سے بھرا انداز ہمیشہ سے بھی بڑھ کر اچھا لگا۔

"ہاں مجھے نیند آئی۔ بہت پرسکون اور بہت گہری نیند۔"

"ضرور تم نے مجھے سوچا ہوگا' اسی لیے پرسکون نیند سوئے ہو۔" وہ اس کے لہجے میں شامل شرارت پر مسکراتا ہوا بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں میں تمہیں سوچتے ہوئے سویا تھا اور اب میں تمہیں سوچتے ہوئے ہی اپنے دن کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ اب تم کوئی اچھی بات کہو مجھ سے۔"

"اچھی بات؟" لیزا حیرانی سے بولی گویا اس کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔

"ہاں اچھی بات کوئی ایسی بات جسے سوچ کر میں سارا دن خوش ہوتا رہوں۔"

اس نے لیزا کا رات والا جملہ اسی کے انداز میں دہرایا تھا۔ لائن کے دوسری جانب سے اسے لیزا کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں سکندر!"

"کتنی؟ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو لیزا!"

وہ اسے بہت چاہتی ہے وہ جانتا تھا' پھر بھی اس وقت وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ وہ بھی چاہا جاتا ہے۔ بے حد اور بے حساب۔

"تم سوچ بھی نہیں سکتے اتنی... میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"تم میرے لیے پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روما جانا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ بغیر ایک پل کی ہچکچاہٹ کے فوراً بولی۔

"اگر تم میری خاطر یہ دو چیزیں چھوڑ سکتی ہو تو اس کا مطلب ہے تم مجھ سے واقعی بہت محبت کرتی ہو۔" وہ مسکرا کر شریر سے انداز میں بولا۔

"تمہیں میری محبت کا یقین ہونا چاہیے سکندر شہریار!"

"مجھے تمہاری محبت کا یقین ہے لیزا! میری بہت تنہا اور بہت بکھری ہوئی زندگی میں واحد خوشی' واحد روشنی تم ہو۔ میری زندگی میں زندگی ہی تم ہو۔"

بولتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد دھیما ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے میں جذبات کی شدت تھی۔ جواب میں چند سیکنڈز کے لیے لیزا بالکل خاموش رہی۔

"بس اب تم گزری ہوئی باتوں کو مت سوچا کرو۔ اچھی اچھی باتیں سوچا کرو' میرے اور اپنے بارے میں جو زندگی ہم ایک ساتھ گزاریں گے اس کے بارے میں۔"

لیزا کی نرم لہجے میں سمجھائی ان باتوں کو سنتا ہوا وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔ اسے آفس کے لیے دیر ہو رہی تھی اس لیے اسے خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کیا۔ جلدی جلدی نہا کر آفس کے لیے تیار ہونے کے بعد وہ کچن میں آیا تاکہ ناشتا کر سکے۔ وہ کھڑکی سے باہر نظر آتے صبح کے منظر ہی کی طرح خود کو بہت فریش اور تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

کیا وہ یہاں آئے گی؟ کیا وہ اس کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرے گی؟ وہ کچن اور کچن سے باہر نظر آتے اپنے فلیٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں بسی اس لڑکی کے ساتھ تمام وعدے کر لینے کے باوجود اس سے تمام عہد محبت و وفا سن لینے کے باوجود بھی وہ اس کے ساتھ کے خواب دیکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

اس کے اندر ایک خوف تھا۔ جو لیزا اس سے کہہ

رہی ہے اور جو وہ اس کے کہنے پر مان بھی گیا ہے' وہ ہو نہیں پائے گا۔ وہ اور لیزا ایک نہیں ہو پائیں گے۔ لیزا اس کی زندگی میں نہیں آئے گی۔ کہیں نہ کہیں سے اس کی زندگی کی نحوست اسے پھر اپنے گھیرے میں لے لے گی۔ وہ اس لڑکی کو کھو دے گا۔ جب تک اس کی محبت قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا' جب تک اسے اپنی محبت دینے سے انکار کر رہا تھا تب تک ضدی دل کو اس نے سنبھالا ہوا تھا مگر اب اسے اپنی زندگی میں لیزا محمود چاہیے تھی۔

اگر زندگی نے اس بار اس کے ساتھ کچھ برا کیا' اگر لیزا اسے نہ ملی تو اب کی بار وہ ایسا ٹوٹ کر بکھرے گا کہ پھر لیزا بھی اسے سمیٹ نہیں پائے گی۔ کیا زندگی تمام عمر سکندر شہریار پر صرف سنگ ہی برسائے گی؟ کبھی کوئی پھول' کوئی خوشی' کوئی ہنسی اس کے حصے میں نہیں آئے گی؟ وہ لیزا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ لڑتے ہوئے زندگی کو بتا رہا تھا کہ اس بار اس سے اس کے خواب اور محبت چھیننے کی کوشش نہ کرے۔ زندگی لیزا محمود کو اس سے چھیننے کی کوشش نہ کرے۔

☼ ☼ ☼

آج ہفتے کا دن تھا' اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ مگر کچھ ضروری کام کی وجہ سے اسے آفس آنا پڑا تھا۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے متعلق اپنا قانونی نقطہ نظر ڈرافٹ کر رہا تھا اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ پر مرکوز تھیں' اس کی انگلیاں تیز رفتاری سے حروف ٹائپ کر رہی تھیں۔ مگر اس کا دل مسلسل اسے وہموں اور اندیشوں میں مبتلا کر کے مضمحل کر رہا تھا۔ اس کی منفی سوچیں اس پر حاوی ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا موبائل بجا تھا۔

"لیزا!" وہ اس کی آواز سن کر آج تک کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا منفی سوچوں کے ان لمحوں میں۔

"کیا کر رہے تھے؟" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

"تمہیں یاد کر رہا تھا۔"

"جھوٹ۔ مجھے یاد کر رہے ہوتے تو مجھے فون کرتے۔"

اس نے فوراً" اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ جواب میں اسے یہ نہیں بتا پایا کہ وہ کس طرح کی منفی سوچوں میں گھرا اسے سوچ رہا تھا۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ مجھے تم سے یہ پوچھنا تھا' تم نے ہماری شادی کے بارے میں کیا سوچا؟"

"کیا سوچا' مطلب؟" وہ غائب دماغی سے بولا۔

"تم شادی پر کس کلر کا سوٹ پہنو گے اس بارے میں۔" وہ اس کی غیر حاضر دماغی پر چڑ کر بولی۔ وہ جواب میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"میرا خیال ہے بلیک کلر کا۔ بلیک کلر مجھ پر جچتا ہے۔ اور تم؟"

یک دم ہی اس کا موڈ تبدیل ہو کر خوشگوار ہو گیا۔ امیدیں خواب اور آرزوئیں سب پھر دل میں جاگ اٹھیں۔ اسے لیزا کے ساتھ غیر سنجیدہ انداز میں گفتگو کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

"جو تم مجھے خرید کر دو گے میں وہی پہنوں گی۔ تمہیں میں پاکستانی دلہن کے روپ میں اچھی لگوں گی یا ویسٹرن دلہن کے روپ میں؟"

"تم ہر روپ میں اچھی لگو گی۔ تم پر ہر رنگ' ہر لباس بجتا ہے۔"

"ڈپلومیٹ جواب نہیں' اپنی پسند بتاؤ۔" وہ رعب ڈالنے والے انداز میں بولی۔

"پاکستانی دلہن۔ سرخ لباس میں۔"

وہ بے اختیار اپنی پسند بتا گیا۔ بغیر کسی شعوری کوشش کے یک دم ہی اس کے ذہن میں سرخ رنگ کا خوب صورت جوڑا پہنے' دلہن بنی لیزا کا تصور ابھر آیا تھا۔ یہ خوابوں میں رہنا اس نے کب سے شروع کر دیا؟ وہ خود اپنے تصور پر حیران ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر تم مجھے ریڈ کلر کا پاکستانی برائیڈل ڈریس دلانا۔"

"میں تمہیں ریڈ کلر کا برائیڈل ڈریس ضرور دلاؤں گا۔ ویسے تم اصل میں پوچھ کیا رہی تھیں؟" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے لیزا کی اصل بات کی طرف آیا۔

"میں بس یہی پوچھ رہی تھی تم نے کچھ پلان کیا ہماری شادی کے بارے میں؟ یعنی ہم شادی کب کر رہے ہیں اور کہاں؟"

"تم نے اپنی بہن اور نینی سے بات کرلی؟"

"ہاں اور وہ دونوں میری شادی سے بہت خوش ہیں۔ نینی تو بہت ہی ایکسائیٹڈ ہیں۔ ان دونوں نے مجھ سے کہا ہے میں انہیں جب اور جہاں آنے کو کہوں گی وہ دونوں میری شادی میں شرکت کے لیے وہاں آجائیں گی۔ پاپا کو ابھی میں نے نہیں بتایا۔ میں سوچ رہی تھی پہلے ہم ڈیٹ اور جگہ طے کرلیں پھر ہی انہیں بتاؤں گی۔"

ان دونوں ہی کی زندگیاں ابنارمل تھیں۔ جس طرح وہ تمام خونی رشتوں کے ہوتے ہوئے تنہا تھا۔ اسی طرح لیزا بھی باپ کے ہوتے ہوئے اپنی شادی میں اس کی شرکت یا عدم شرکت سے بے نیاز تھی۔ وہ لیزا کی اس کے پاپا سے ناراضی سے باخبر تھا اس لیے جواباً سنجیدگی سے بولا۔

"لیزا! اس وقت میں آفس میں ہوں۔ ہم اس ٹاپک پر رات میں تفصیل سے بات کرلیں؟ تب ہی ہم دونوں مل کر ساری چیزیں طے کرلیں گے۔"

"اوکے سینور سکندر۔" اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کردیا۔

وہ فون بند کرنے کے بعد دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

وہ پھر اپنا کام کرنے لگا تھا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب اس کے لبوں پر ایک مدھم سی زندگی کی امنگ سے بھری مسکراہٹ تھی اور اس کے دل میں خوشیاں، خواب اور آرزوئیں پھر سے شور مچاتے اسے زندگی کے خوب صورت ہونے کا یقین دلا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆
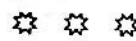
انہیں آفس سے آئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ شاور لے کر آنے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر ریموٹ سے چینل تبدیل کر کر کے مختلف پروگرام دیکھ رہے تھے۔

عائشہ کچن میں ان کے لیے چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس تیار کر رہی تھیں۔ وہ آفس میں زیادہ ہیوی لنچ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے بہت ہوا تو تھوڑی سی سلاد یا دہی لے لی ورنہ وہ بھی نہیں۔ سو عائشہ ان کی دفتر سے واپسی پر چائے کے ساتھ ہلکے پھلکے اسنیکس کا اہتمام رکھا کرتی تھیں۔

انہیں باہر کسی کے بولنے اور باتیں کرنے کی آواز آئی۔ مریم آئی تھی۔ بہت دور سے جب ابھی آواز واضح بھی نہیں ہوئی تھی، وہ اس کی آواز پہچان گئے تھے۔

"السلام علیکم پاپا۔" وہ اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔" ٹی وی کی آواز ہلکی کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا اور وہ پیار اور شفقت سے مسکرائے۔ مریم ان کے پاس آئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ان کے گال پر پیار کیا۔ باپ کی فطری محبت سے ان کا دل یک دم ہی بھر آتا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کا ماتھا چوما تھا۔

"ٹھیک ہو بیٹا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں پاپا۔" وہ ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"آفس سے گھر واپس جا رہی تھی، میں نے سوچا کافی دن ہوگئے آپ سے ملے ہوئے، اس لیے آگئی۔ آپ تو میرے گھر آتے ہی نہیں ہیں۔" مریم نے مسکرا کر کہتے ہوئے ان سے شکوہ کیا۔ وہ کوشش کے باوجود اس کے گھر جا نہیں پاتے تھے۔ کبھی مجبوراً جانا پڑ جاتا تو دونوں ان کا دل پریشان رہتا تھا۔ انہیں مریم کے گھر میں کسی کی سسکیاں اور آہیں سنائی دیتی تھیں۔

"والدین کو بیٹیوں کے گھر زیادہ نہیں جانا

چاہیے۔" وہ کوشش کر کے مسکرائے۔
"پاپا! یہ آپ کس زمانے کی دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔"
مریم نے منہ بنایا پھر یک دم ہی جیسے کچھ خیال آنے پر ان سے بولی۔
"آپ کے پاس لیزا کا فون آیا؟"
"نہیں..... کیوں؟ وہ ٹھیک تو ہے ناں؟" یک دم ہی ان کا دل گھبرایا تھا۔ "خدا خیر کرے۔ ان کی کلثوم بالکل خیریت سے ہو۔"
"وہ بالکل ٹھیک ہے پاپا۔"
انہیں محسوس ہوا' مریم ان کے چہرے کو بہت بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"وہ شادی کر رہی ہے خدا جانے کس کے ساتھ۔ میں سمجھی اس نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔" مریم نے سنجیدگی سے کہا۔
ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ "شادی؟"
"جی' آپ سے اجازت نہیں لی تھی' کم از کم آپ کو انفارم تو کر دیتی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا بھی تھا کہ وہ آپ کو بتائے' آپ سے پرمیشن لے' بلکہ پہلے آپ سے اس لڑکے کو ملوائے جس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ مگر میرے سمجھانے کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔"
مریم کے لہجے میں تاسف اور رنج تھا جیسے لیزا کی خود سری اور من مانی سے دکھی ہو رہی تھی۔
ان کے چہرے پر یک دم ہی سختی سی آ گئی۔ "تم جانتی ہو اس لڑکے کو؟" وہ سخت نگاہوں سے مریم کو دیکھ رہے تھے۔
"نہیں۔ خدا جانے کون ہے' کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے' کس ملک کا رہنے والا ہے۔ پتا نہیں مسلمان ہے بھی کہ نہیں۔ میں بالکل بھی نہیں جانتی کہ وہ کس سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ میں اسے اتنا سمجھا رہی تھی کہ کم از کم پاپا کو تو......"
"میں کلثوم سے بات کر کے پتا کر لوں گا کہ کون لڑکا ہے۔ تم زیادہ فکر مت کرو۔"
مریم کا تاسف اور پریشانی بھرا جملہ انہوں نے بے حد سختی سے کاٹا۔ ان کے سخت لہجے میں یہ تنبیہہ شامل تھی کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جانتے تھے' ان کے سخت انداز اور بات کے دم ہی کاٹ دینے پر مریم کا موڈ آف ہو گیا ہے' مگر انہوں نے اس کے برا ماننے کی پروا نہیں کی۔ تب ہی عائشہ ہاتھ میں ٹرے لیے وہاں آئی تھیں۔
"ارے مریم آئی ہوئی ہے۔" وہ مریم کو دیکھ کر خوشگوار انداز میں مسکرائیں۔
"السلام علیکم ممی۔" مریم عائشہ کو دیکھتے ہی صوفے سے اٹھی اور ان سے گلے ملی۔ عائشہ نے اس سے ماں کی طرح ہی پیار کیا تھا۔ مریم انہیں ممی کہا کرتی تھی اور عائشہ جو ماں بن نہ سکی تھیں' انہیں اس کا ممی کہنا بے حد اچھا لگتا تھا۔
"کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد آئیں؟" عائشہ کے آتے ہی ماحول میں پیدا ہوا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ اب لاؤنج کا ماحول بے حد خوشگوار تھا۔
عائشہ مریم کو اسی طرح اہمیت دے رہی تھیں جیسے میکے آئی شادی شدہ بیٹی کو دی جاتی ہے۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران وہ زیادہ وقت خاموش رہے تھے۔ جہاں کہیں عائشہ یا مریم انہیں بولنے پر اکساتیں۔ وہ تب ہی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سا جملہ بول دیتے۔ وہ اس وقت بہت ڈسٹرب تھے۔ کلثوم کے شادی کر لینے کے فیصلے پر نہیں۔ وہ کسی اور بات سے پریشان تھے۔

☼ ☼ ☼

مریم گھر واپس آ چکی تھی۔ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ آتے ہی وہ بے وجہ ملازمین پر چیخی چلائی تھی۔ ہاشم آج صبح ہی دفتری کام سے چائنا گیا تھا۔ دو' تین روز بعد اس کی واپسی متوقع تھی۔ شکر تھا وہ گھر پر نہیں تھا ورنہ اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ نکالنے کو وہ اس سے بھی لڑ پڑتی۔
پاپا اس سے اتنی دور کیوں ہو گئے تھے۔ اس کے پاپا

آخر اس سے اتنی دور کیوں ہو گئے تھے؟ وہ تو ان کی سب سے لاڈلی تھی' اس میں تو ان کی جان تھی' وہ تو ان کی ام مریم تھی۔ پھر آج وہ اتنی دور کیوں محسوس ہوئے تھے؟ چودہ سال کی عمر میں جب اس سے اس کے بابا چھنے تھے تب وہ دھاڑیں مار مار کر اکیلے میں روئی تھی۔ ہاں وہ اکیلے میں روئی تھی۔

وہ بہت بہادر لڑکی تھی' وہ ام مریم تھی' وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں روئی تھی۔ کوئی دوسرا شخص اس کی ایسی کمزوری بھی نہ تھا کہ وہ اس کے لیے کبھی روتی مگر اپنے باپ سے جدا ہونے پر وہ چلا چلا کر روئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے بابا کی جان تھی' کیونکہ وہ اپنے بابا کی سب سے بڑی کمزوری تھی کیونکہ وہ بابا کی زندگی تھی۔ بابا نے زندگی میں صرف اور صرف اس سے پیار کیا تھا۔ وہ اپنے بابا پر جان دیتی تھی۔ مگر چودہ سال کی عمر میں جب بابا اس سے چھنے تب وہ دوری ایسی دوری ثابت ہوئی کہ آنے والے برسوں میں لاکھ کوششیں کر لینے کے باوجود وہ پھر ان کے اس طرح قریب نہ ہو پائی جیسے بچپن سے لے کر چودہ سال کی عمر تک رہی تھی۔

زمینی فاصلے نے اسے بابا کے دل سے بھی دور کر دیا تھا۔ وہ اس سے بہت دور ہو گئے تھے۔ پتا نہیں آج وہ اس سے پیار کرتے بھی تھے کہ نہیں؟ وہ آج کتنی مختصر اور کتنی کم بات کیا کرتے تھے اس سے۔ عائشہ کے گفتگو میں شریک ہونے پر چاہے وہ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جایا کرتی تھی' مگر اپنے بابا کی مسلسل خاموشی اسے بہت بری طرح چبھتی تھی' اس کے دل کو دکھاتی تھی۔ پھر اسے اپنا گھر' اپنا شوہر اور اپنی عیش و آرام اور خوشیوں سے بھری زندگی سب کچھ زہر لگتا تھا۔ ہر چیز کو آگ لگا دینے کو دل چاہتا تھا۔

ہاشم سے اسے محبت نہیں تھی' مگر وہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ وہ اسے جان دینے کی حد تک چاہتا تھا۔ ہاشم کی حد سے بڑھی محبت اسے فخر اور غرور میں مبتلا کیا کرتی تھی۔ اگرچہ کسی چیز کی کمی نہ تھی ہاشم میں' مگر ہاشم اسد وہ نہ تھا جس پر ام مریم مر مٹ جاتی۔ وہ ہاشم سے محبت نہیں کرتی تھی' مگر اس سے شادی اسے تاحیات نبھانی تھی' اپنے بابا کا دل خوش کرنے کے لیے۔ اس نے محبت زندگی میں صرف ایک بار کی تھی' صرف ایک بار۔ سکندر شہریار سے۔ نجانے ایسا کیا تھا اس شخص میں' جو وہ بارہ سالوں بعد بھی اس کے حصار سے نکل نہیں سکی تھی۔

وہ نہ اس شخصیت کی محبت اپنے دل سے نکال پائی تھی اور نہ اس کے خود کو ٹھکرانے کی اذیت اور ذلت کبھی بھول پائی تھی۔ اس نے زندگی میں صرف دو ہی لوگوں سے سچی محبت کی تھی' ہمیشہ پر اس کا خود کو مٹا دینے کو جی چاہتا تھا۔ ایک سکندر شہریار اور دوسرے محمود خالد اس کے بابا' سکندر سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لینے کے باوجود نہ اس کی محبت دل سے ختم ہوئی تھی نہ ہی وہ اسے کبھی بھول پائی تھی۔

تیرہ سال قبل محمود خالد نے اسے اس کی خواہش پر امریکا پڑھنے کے لیے بھجوایا تھا۔ وہ میلان میں دوران تعلیم جس طرح ہر سال باپ کے پاس لندن جایا کرتی تھی' اسی طرح محض ان کا دل خوش کرنے کے لیے ہر سال پاکستان اپنی دادی کے پاس بھی جایا کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کے بابا کا دل اس سے خوش رہے۔ وہ شکل صورت اور ذہانت میں تھی بھی ان پر اور ان کا دل خوش کرنے کے لیے پڑھتی بھی بہت لگن کے ساتھ رہی تھی۔

اس نے امریکا پڑھنے کے لیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو محمود خالد نے اسے پڑھنے کے لیے امریکا بھجوا دیا تھا۔ باپ کا دل خوش کرنے کے لیے اس نے اپلائی ہی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں کیا تھا۔ تاکہ وہاں لاس اینجلس میں وہ اپنے چچا کے پاس رہ سکے۔

اس کے بابا کو یہ یقین ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق مشرقی اور پاکستانی رسم و رواج کو پسند کرتی ہے۔ اس نے ماں کے رکھے نام سمانتا کو نہیں' باپ کے رکھے نام ام مریم کو چنا تھا۔ جب بابا سے اس قدر پیار تھا تو ان کے رکھے نام سے کیوں نہ ہوتا؟

بہت سے لوگ اس کے ساتھ اور اس کی محبت کے متمنی و خواہاں رہا کرتے تھے۔ اس نے ہمیشہ مردوں کو

بھنورے کی طرح اپنے گرد منڈلاتے دیکھا تھا۔ وہ سب اس کے لیے وقتی تفریح یا پھر اپنی انا کی تسکین کا سامان رہے تھے۔ سچی محبت تو پتا نہیں اسے کبھی کسی سے ہوئی بھی تھی یا نہیں۔ مگر اتنا طے تھا کہ وہ شادی کسی پاکستانی لڑکے سے کرے گی۔

اس کے پاپا اپنے ملک سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹیاں پاکستانی لڑکوں سے شادی کریں تو وہ اپنے پاپا کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔ یونیورسٹی میں دوران تعلیم اسے زین شہریار ملا تو لگا اس کی تلاش ختم ہو گئی۔ وہ بے وقوفی کی حد تک اس پر فدا ہو چکا تھا۔ اس کے ہلکے سے اشارے کی دیر تھی' وہ کھنچا کھنچا اس کے پیچھے چلا آیا۔

زین کی محبت قبول کرنے کا فیصلہ اس کے دل کا نہیں' دماغ کا فیصلہ تھا۔ وہ ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا' بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا' دولت' جائیداد' روپیہ' اثر ورسوخ کسی چیز کی اس کی فیملی کے پاس کمی نہ تھی۔

جو کچھ اس نے اپنے باپ کے پاس پایا تھا' وہ سب کچھ زین کے ساتھ بھی اسے اسی طرح ملنا تھا۔ پھر زین کی شکل صورت' پرسنالٹی بھی اچھی تھی' وہ اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا' اس کا مستقبل بہت شان دار تھا اور وہ احمق لڑکا اس سے بے تحاشا محبت بھی کرتا تھا۔

زین بری چوائس نہ تھا۔ جب اس نے زین کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا تب اس وقت کے لحاظ سے وہ اس کا بہترین فیصلہ تھا۔ مگر کاش وہ زین سے ملنے سے پہلے سکندر سے مل لی ہوتی۔ کہاں احساس کمتری کا مارا زین شہریار اور کہاں دنیا فتح کر لینے کی طاقت رکھتا سکندر شہریار۔ زین تو اس کے پاسنگ بھی نہ تھا۔

سکندر کو ایک نظر دیکھتے ہی اسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا تھا۔ پچھتاوا ہوا تھا۔ باپ کے دل کو خوش کر لینے کے لیے جو اس نے زین کو بہتر آپشن سمجھتے ہوئے ایک سمجھوتا کیا تھا۔

سکندر کو دیکھتے ہی اپنے اس غلط فیصلے پر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تو وہی تھا جو اس کے لیے بنایا گیا تھا' جو ہو بہو اس کے جیسا تھا۔ جو اس کی طرح آسمان چھو سکتا تھا' جو اسی کی طرح اپنی قابلیت اور ذہانت کے بل پر کچھ بھی حاصل کر سکتا تھا۔ کتنا پر اعتماد تھا وہ۔ زین کی طرح کا کوئی احساس کمتری اس کے اندر نہ تھا۔ ام مریم اور سکندر شہریار' وہ دونوں غیر معمولی صلاحیتیں اور ذہانت رکھتے لوگ ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے۔

زین کیا سوچے گا اور اس کے دل پر کیا گزرے گی اس کی اسے مطلق پروا نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے محبت ہوئی تھی اور وہ زین شہریار جیسے عام سے لڑکے کے جذبات واحساسات کو مجروح کرنے کے ڈر سے اس محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔

کبھی ایسا ہوا ہی نہ تھا کہ اس نے کسی پر نگاہ ڈالی ہو اور وہ کھنچا کھنچا اس کے پاس چلا نہ آیا ہو۔ مگر مغرور وخود پسند سکندر شہریار نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس نے اس کی تذلیل کی اور ام مریم ان لوگوں میں سے نہ تھی جو اپنی تذلیل چپ چاپ برداشت کر لیتے ہوں۔ محبت اپنی جگہ' مگر اپنے ٹھکرائے جانے اور ذلیل وبے عزت کیے جانے کا بدلہ تو اسے سکندر شہریار سے لینا ہی تھا۔

اس وقت اس پر انتقام اس طرح حاوی ہوا تھا کہ اسے لگا تھا سکندر کی محبت اس کے گال پر پڑنے والے اس کے تھپڑ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ہے۔ وہ ذلیل ہوا تھا' وہ رسوا ہوا تھا' وہ بے عزت ہوا تھا' وہ اپنے گھر سے دھکے مار مار کر نکال دیا گیا تھا' اس کے دل کو تسکین پہنچی تھی۔ اسے ٹھکرانے کی کم سے کم سزا بھی سکندر شہریار کو یہی ملنی چاہیے تھی۔ جب وہ ذلیل وبے عزت کر کے اپنے گھر سے نکال دیا گیا تھا تب اس نے بھی فوراً ہی اس گھر سے رخصت ہونے کی تیاری کی تھی۔

جب تک سکندر سے نہ ملی تھی۔ زین کا ساتھ قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ مگر اب زین جیسے عام سے لڑکے کا ساتھ قبول کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے سکندر شہریار چاہیے تھا یا پھر اس جیسا کوئی دوسرا۔ منگنی کی انگوٹھی زین کو لوٹاتے ہوئے اس احمق اور بے وقوف لڑکے کے ساتھ تھوڑا سا محبت کا ڈراما کرنا ضروری تھا۔

اس نے آنسو بہاتے ہوئے وہ ڈراما اتنے بھرپور انداز میں کیا تھا کہ زین کو یہ یقین آجائے کہ وہ مجبور، دل گرفتہ ہو کر اسے چھوڑ کے جا رہی ہے۔

وہ اس کے گھر سے باہر نکل کر اپنی جذباتی اداکاری اور زین کی محبت اور دکھ بھری باتوں پر ہنسی تھی۔ وہ احمق تو واقعی اس سے جدا ہوتے وقت رو دینے کو تھا۔ وہ بخوبی اس سے پیچھا چھڑا آئی تھی۔

وہ لاس اینجلس واپس جاتی تو زین نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا تھا اسی لیے وہ لاس اینجلس سے اپنا سارا سامان سمیٹ کر اپنے پاپا کے پاس لندن آگئی۔ محمود خالد تو اس کی منگنی میں شریک ہوئے تھے، زین کے ساتھ اس کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہوا تھا مگر لیزا اور عائشہ بھی اس کی منگنی سے واقف تھیں۔

وہ وہاں زین کے بھائی کا ذکر لائی تھی۔ وہ کس طرح کا بدکردار لڑکا تھا اور کس طرح اس نے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی اور زین نے بجائے اپنے بھائی کو قصوروار ٹھہرانے کے اسے ہی الزام دیا تھا۔ زین اور اس کی فیملی اس قابل نہ تھی کہ وہ وہاں رشتہ قائم رکھ پاتی۔ وہ اسی وقت زین کے منہ پر منگنی کی انگوٹھی پھینک آئی تھی۔ وہ اس لیے لاس اینجلس اسی وقت چھوڑ آئی تھی، وہ اسی لیے اب وہاں اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھنا چاہتی تھی کہ وہاں کیمپس میں اس کا زین سے آمنا سامنا ہوا کرے گا اور وہ اس جیسے پنچ لڑکے کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔

وہ جانتی تھی اس کے پاپا، لیزا اور عائشہ سب کو اس کی باتوں کا یقین آچکا ہے اور رہ گئے زین کے گھر والے تو سکندر کی اس گھٹیا حرکت کے بعد ان میں سے کسی کی بھی کبھی ہمت نہیں ہوگی کہ اس کے پاپا کو فون کر کے یہ پوچھ سکیں کہ ام مریم، زین سے منگنی کیوں توڑ آئی ہے۔

اس نے واپس اٹلی جانے اور اپنی ادھوری تعلیم وہیں مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماں کو چھوڑے تو اسے عرصہ ہو گیا تھا۔ اسے نہ اپنی ماں سے محبت تھی نہ ہمدردی نہ انسیت۔ اسے ان سے نفرت تھی۔ وہ محبت تو صرف اپنے پاپا سے کرتی تھی۔ مگر اب وہ لندن ان کے پاس بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ برسوں سے آزاد زندگی، اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ باپ کے ساتھ رہنا اور خود کو پابندیوں میں جکڑ لینا اس کے لیے دشوار تھا۔

اس نے باپ پر اپنا جو بہت مشرقی ہونے کا تاثر قائم کر رکھا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان سے دور رہے۔

وہ چاہتی تھی۔ اس کے پاپا ہمیشہ یہی سمجھتے رہیں کہ ان کی بیٹی مشرقی روایات کی پاس دار اور بہت نیک اور پارسا ہے۔ وہ اپنی اٹالین ماں پر نہیں، بلکہ اپنے مسلمان اور پاکستانی باپ پر گئی ہے۔ اٹلی واپس آکر اس نے وہیں تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں ملازمت بھی کر لی تھی۔

جب تک محمود خالد لندن میں رہے تھے، وہ ان سے ملنے سال میں دو بار لندن جاتی تھی جب وہ پاکستان شفٹ ہو گئے تب وہ ان سے ملنے وہاں گئی۔ وہاں اسے ہاشم ملا تھا اور ہاشم اسد پہلی ملاقات ہی میں اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔

اس کے دل ہار بیٹھنے میں نیا کچھ بھی نہ تھا۔ کب مردوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا، کب اس کی ایک نگاہ التفات کے لیے ذہین سے ذہین مردوں نے احمقانہ حرکتیں نہ کی تھیں جو وہ ہاشم کے خود پر فدا ہو جانے پر چونک جاتی۔ ساری زندگی اسے چاہا ہی گیا تھا، اسے سراہا ہی گیا تھا۔ سوائے اس ایک شخص سکندر شہریار کے، پارسا سے پارسا مرد بھی اسے ایک نگاہ دیکھ کر اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیا کرتا تھا۔

ہاشم سے مل کر اسے سکندر بہت یاد آیا۔ وہ اتنے برسوں بعد بھی کبھی اسے بھول نہیں پائی تھی۔ اور نہ اس کے ٹھکرانے کی اذیت کبھی کم ہو پائی تھی۔ اس نے زندگی میں دو مردوں سے محبت کی تھی، والہانہ اور شدید محبت، جان سے بڑھ کر محبت۔ ایک اس کے پاپا اور دوسرا سکندر شہریار اور یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ دونوں ہی اس سے چھن گئے تھے۔ اس کے پاپا اس سے چودہ سال کی عمر میں چھن گئے تھے پھر وہ ساری عمر

ان کے پیچھے ہی بھاگتی رہی تھی اور سکندر شہریار اسے ٹھکرا کر اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ سکندر شہریار تو اسے عمر بھر اب کبھی ملنا نہیں تھا مگر اسے اب اپنے پاپا واپس چاہیے تھے۔

اپنے پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے اسے کسی پاکستانی مرد سے شادی کرنی تھی اور پاپا کے قریب رہنے کے لیے پاکستان ہی میں شادی کرنی تھی تو ہاشم اسد ہی کیوں نہیں؟ وہ بہت امیر تھا۔ دولت' جائیداد کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں تو اس کے بینک اکاؤنٹ اور پراپرٹی تھی۔ اس کا کاروبار شان دار تھا اور پرسنالٹی بہت باوقار۔ وہ ایک خوب صورت اور وجیہہ مرد تھا۔

وہ زین کی طرح کا احساس کمتری کا مارا شخص بھی نہ تھا۔ وہ پراعتماد تھا' وہ بے حد ہینڈسم تھا' وہ بہت ذہین تھا' دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بہت شاطر' تیز اور چالاک تھا مگر اس کی محبت میں ڈوب کر وہ اپنی ساری چالاکی اور تیزی بھول کر اس کا غلام سا بن جاتا تھا۔

اس کا واحد نیگیٹو پوائنٹ اس کا شادی شدہ ہونا تھا تو اس نے شادی سے پہلے یہ شرط رکھ دی تھی کہ ہاشم اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اپنے بچوں کی خاطر اس نے اسے کہیں اور دوسرا گھر لے کر دے دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کا خرچا بھیجا کرتا تھا۔ اس عورت اور اس کے بچوں کو عیش و آرام والی زندگی گزارنے کے لیے ہر ماہ پیسے مل تو رہے تھے۔ کافی تھا یہ اس عورت اور اس کے بچوں کے لیے۔

محمود خالد کی کاروباری حوالے سے ہاشم سے دوستی اور واقفیت پہلے سے تھی مگر ظاہر ہے وہ اس کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔

اس نے ہاشم کے ساتھ اپنا افیئر محمود خالد اور عائشہ سے اس وقت تک چھپائے رکھا تھا جب تک ہاشم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نہ نکال دیا۔ ہاشم کے اس کی بیوی کو طلاق دے دینے کے بعد بھی انہوں نے ایک' ڈیڑھ ماہ انتظار کیا تھا۔ ہاشم تو اس کی ہر بات مانتا تھا تو وہ اس انتظار کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ ہاشم اس کے کہنے پر محمود خالد سے یہ جھوٹ بولنے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی بہت لڑاکا اور بدزبان عورت تھی۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی نہ تھی۔ وہ پھر بھی یہ رشتہ نبھا رہا تھا۔ مگر اس کی بیوی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ طلاق اس نے خود مانگی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے مطالبے پر اسے طلاق دینے پر مجبور ہوا ہے۔

اکیلے میں مریم نے عائشہ کو یہ تک کہہ دیا تھا کہ ہاشم کی بیوی کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ہاشم ہی کے کسی دوست کے ساتھ افیئر چلا رہی تھی۔ اسے یقین تھا' عائشہ یہ بات محمود خالد تک ضرور پہنچائیں گی۔ اس کے پاپا کے اوپر کبھی اس کا کوئی برا امپریشن نہیں پڑنا چاہیے۔ انہیں ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے تھا کہ ان کی مریم واقعی مریم ہے اور ہاشم کے اپنی بیوی کو طلاق دینے کی وجہ اس کی بدکرداری اور بدفطرتی ہے۔ ہاشم نے محمود خالد سے اس کا رشتہ مانگا تو اس کی رضامندی پا کر انہوں نے اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ جب انہوں نے اس سے ہاشم کے رشتے کے متعلق پوچھا تب وہ بہت سچے دل سے ان سے بولی تھی۔

"پاپا! میں شادی کرنا چاہتی ہوں' اس لیے کہ میں آپ کے قریب رہنا چاہتی ہوں۔ ہاشم سے شادی کر لوں گی تو آپ کے پاس کراچی ہی میں رہوں گی۔ ساری زندگی آپ سے دور رہی ہوں پاپا! اب آپ کے نزدیک رہنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ صرف لیزا کا حق تھا کہ وہ آپ کے ساتھ رہے اور مجھ سے چودہ سال کی عمر میں آپ چھن جائیں؟"

☆ ☆ ☆

یہ ورکنگ ڈے تو تھا نہیں سو وہ آفس سے اپنے کام نمٹا کر جلدی اٹھ گیا۔ اسے فلیٹ جانے سے قبل ایک ضروری کام کرنا تھا جو کل وہ کر نہیں پایا تھا۔ اسے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدنی تھی۔ اب جب بھی اس سے ملتا تھا اس نے سب سے پہلے اس کی انگلی میں اپنے نام

کی انگوٹھی پسند آئی تھی۔ وہ ڈھائی گھنٹے لگا کر اور کئی دکانوں میں دیکھنے کے بعد وہ ایک خوب صورت انگوٹھی لیزا کے لیے پسند کر پایا تھا۔ اسے وہ انگوٹھی خریدتے ہوئے بے تحاشا خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسا احساس جواب تک کی زندگی میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا موڈ ہنوز خراب تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور چہرے پر گہری سوچ۔ چائے پیتے ہوئے اس نے لیزا کا نمبر ملایا۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر پرسکون سے انداز میں بیٹھی تھی۔ اپنے شاندار کمرے میں جہاں ہر چیز ڈیزائنر تھی، قیمتی ترین تھی اور اس کے ذوق اور مرضی کے مطابق تھی، وہاں اس کئی لاکھ روپے کے ڈیزائنر بیڈ پر بیٹھی وہ کوئی ملکہ ہی لگ رہی تھی جو شاہانہ انداز میں اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہی ہو۔ لیزا نے اس کا نام دیکھتے ہی پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی تھی۔

"کیسی ہو لز؟" اس نے مسکرا کر پیار سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں، ابھی ایگزیبیشن ہی میں ہوں۔ آج تو کل سے بھی زیادہ لوگ آئے ہیں۔" اس نے لیزا کی خوشی سے کھلکھلاتی آواز سنی۔

"واؤ دیٹس گریٹ، مزا آرہا ہے؟"

"ہاں، مزا بھی آرہا ہے اور تھوڑا تھک بھی گئی ہوں۔"

"چلو اب تم لندن جا کر اکٹھا آرام کرنا۔ یہ بتاؤ، پاپا سے تمہاری بات ہوئی؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی میں نے پاپا کو فون نہیں کیا۔ کیوں؟؟" اس نے لیزا کا حیرانی بھرا انداز محسوس کیا۔

"آج میں نے بتا دی ہے پاپا کو تمہاری شادی کی بات۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پھر؟ کیا بولے وہ؟"

"خوش ہوئے بہت۔ آخر کو پاپا جو چاہتے تھے، انہوں نے ہم دونوں سے وہی کروالیا۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز آیا تھا۔ "انہوں نے مجھے پریشرائز کر کے ہاشم سے شادی پر مجبور کیا تھا اور تم تو خود ہی اپنی خوشی اور مرضی سے انہیں ان کی مرضی کا کلام کر کے دے رہی ہو۔ ایسی Satisfaction تھی پاپا کے چہرے پر کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ ساری زندگی انہوں نے اور ممی نے اپنی مرضی کی زندگی گزاری، ہمیں نظر انداز کیے رکھا اور جب ہماری زندگیوں کے اس سب سے بڑے فیصلے کا وقت آیا تو میں نے اور تم نے پاپا کو وہی کر کے دیا جو وہ ہم سے چاہتے تھے۔"

اس کے لہجے میں ایک چھپی ہوئی ناراضی اور برہمی تھی اور اس کے لہجے کی یہ برہمی لیزا نے محسوس کر لی تھی۔

"سیم پلیز، اس طرح تو مت بولو۔ مجھے پتا ہے۔ تم میرے شادی کے فیصلے سے خوش نہیں ہو مگر۔۔۔" وہ اسے منانے والے لہجے میں بول رہی تھی اس نے لیزا کی بات کاٹ دی۔

"میں تمہارے شادی کرنے پر نہیں، جس سے تم شادی کرنے جا رہی ہو اس پر فکر مند ہوں۔ تمہاری شادی کی مجھ سے زیادہ اور کس کو خوشی ہو سکتی ہے لز! مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ جو میرے ساتھ ہوا، جو میرے ساتھ ہو رہا ہے، وہ تمہارے ساتھ نہیں ہونا چاہیے لز اپنی زندگی کی بربادی میں سہہ گئی مگر تمہیں۔۔۔ کوئی دکھ پہنچا تو میں۔۔۔ نہیں پاؤں گی۔" اس کا لہجہ بے حد جذباتی اور محبت بھرا تھا۔

"تم میرے لیے بالکل بھی پریشان مت ہو سیم۔ سکندر بہت اچھا ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس سے ملو گی تو کہو گی میں نے تم سے اس کی کم تعریفیں کی تھیں۔" لزا نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو لز۔ اللہ کرے وہ تم سے بہت محبت کرے اور تم ہمیشہ خوش رہو۔" لیزا سے یہ دعائیہ جملے بولتے اور اسے اپنا بہت خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے اس نے فون بند کیا۔

ابھی اس نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کے موبائل

پر ہاشم کی کال آگئی۔ اس کے چہرے پر بے زاری آگئی تھی۔ وہ یہ چند دن ہاشم کے بغیر کراچی میں سکون سے گزارنا چاہتی تھی آج کل ویسے ہی اس کا موڈ خراب چل رہا تھا۔ ایسے میں ہاشم کے چاؤ چونچلے اسے زہر لگ رہے تھے۔ "ہیلو۔"

"کیا حال ہے میری جان کا؟" ہاشم کا لہجہ سراپا محبت تھا' جان نچھاور کرتا' اس پر فدا ہوتا۔

"ٹھیک نہیں ہوں۔" وہ بے زاری اور غصے سے بولی۔

"کیا ہوا؟ میری حسین بیوی کا موڈ کس نے خراب کردیا؟"

"یہ تمہارے گھر کے نوکر۔ مجال ہے کوئی کام ڈھنگ سے کریں۔"

وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔ وہ اس گھر کی ملکہ تھی اور ہاشم اس کا تابعدار اور غلام۔ وہ اس کی غلامی کرتا' اس پر دل و جان سے نثار ہوتا تو اس کی انا کو بڑی تسکین پہنچتی تھی۔ اس کا مغرور انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ جو محبتیں اور چاہتیں ہاشم اسے دے رہا ہے وہ اس کا حق ہے۔

یہ ام مریم کا حق تھا کہ اسے چاہا جائے' اسے ساری زندگی چاہا جاتا رہے۔ ہاشم کی آواز سنتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس وقت اسے اپنی انا کی یہ تسکین ہی درکار تھی۔ اس کا شوہر اس کا غلام ہے' اس پر جان نچھاور کرتا ہے' وہ اس کی خاطر کچھ بھی کرسکتا ہے اسے یہ یقین دہانی پھر درکار تھی۔

ہاشم اب اسے منانے اور اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے اس کی خاطر کیا کیا کچھ کرے گا' وہ جانتی تھی۔ وہ بظاہر منہ بنائے ہاشم کے محبت میں ڈوبے جملے سن رہی تھی۔ وہ اس کے کسی وعدے' کسی عہد' کسی بات سے خوش نہیں ہو رہی تھی اور وہ اسے خوش کرنے کے لیے پتا نہیں مزید کیا کیا وعدے کر رہا تھا اور اندر اس کی زخمی انا کو ہاشم کی غلامی اور تابعداری سے بہت تسکین مل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
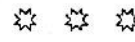
شام ڈھل رہی تھی جب وہ لیزا کے لیے انگوٹھی خرید لینے کے بعد اپنے فلیٹ واپس آیا۔ وہ راستے بھر یہی سوچتا ہوا آیا تھا کہ اسے آمنہ کو کال کرنی چاہیے۔ اسے اپنی زندگی کے اس انتہائی اہم فیصلے سے اپنی ماں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ وہ کہہ نہیں پائی تھیں' مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی اموجان اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا اور خوشگوار دیکھنا چاہتی ہیں' وہ جانتا تھا وہ دل سے چاہتی ہیں کہ اب وہ شادی کرلے۔ اسے ماں سے بات کرنے سے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ اس کے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں گی۔ وہ گھر کے لینڈ لائن نمبر پر کال نہیں کرتا تھا۔ وہ آمنہ کے موبائل پر انہیں کال کرتا تھا۔

"سکندر! کیسے ہو بیٹا؟" وہ ہمیشہ کی طرح فون پر اس کی آواز سنتے ہی خوشی سے سرشار ہوئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں اموجان۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے بیٹا! پتا ہے' آج میں تمہیں بہت یاد کررہی تھی۔"

اور وہ جانتا تھا کہ ماں صرف آج نہیں' بلکہ ہر پل اور ہر گھڑی اس کو یاد کیا کرتی ہیں۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ایک پل ان کے درمیان خاموشی رہی تھی۔

"اموجان! میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں شادی کررہا ہوں۔" اس کی سنجیدگی سے بتائی اس بات کے جواب میں آمنہ کی خوشی بڑی والہانہ اور بے ساختہ تھی۔

"واقعی؟ تم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟" انہیں جیسے مارے خوشی کے یقین نہیں آرہا تھا۔

"جی اموجان۔" وہ ان کی خوشی کو محسوس کررہا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں سکندر! تم میری خوشی کا اندازہ نہیں لگاسکتے۔ مجھے بتاؤ ناں بیٹا! کیسی ہے میری ہونے والی بہو؟"

اسے ماں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مارے خوشی کے رو پڑی ہیں۔ شاید انہیں لگتا تھا' وہ ساری زندگی یونہی تنہا گزار دے گا۔

"امو جان! اس کا نام لیزا ہے۔ مجھے روما میں ملی تھی۔ اس کے پاپا پاکستانی اور ممی اٹالین ہیں۔ وہ ایک مشہور آرٹسٹ ہے۔ پینٹنگز بناتی ہے۔ لندن کے ایک کالج میں آرٹ پڑھاتی بھی ہے۔"

وہ انہیں لیزا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ لیزا کا نام لیتے ہوئے، اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے اندر خوشی اور امنگ پیدا ہوتی محسوس کر رہا تھا۔

"دیکھنے میں کیسی ہے؟ میرے بہت ہینڈسم بیٹے کے ساتھ جچے گی ناں؟" وہ جیسے روتے روتے ہنسی تھیں۔ ہنستے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ بھی جواباً ہنسا۔

"وہ بہت خوب صورت ہے امو جان! میں آپ کے موبائل پر اس کی تصویر Send کروں گا، آپ دیکھ لیجیے گا۔"

"بس تصویر send کرو گے؟ مجھے اس سے ملواؤ گے نہیں؟"

انہوں نے رنج اور کرب میں گھر کر سوال کیا تھا۔ اس سوال میں ان کے آنسو اور سسکیاں شامل تھیں۔

"امو جان!" وہ کیا کہے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"سکندر! میں اپنی ہونے والی بہو کو دیکھنا چاہتی ہوں میں تمہاری دلہن کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے ایک بار تو آکر مل جاؤ بیٹا۔ میری بہو کو تو مجھ سے ملا دو۔ میں تمہیں اس کے ساتھ خوش اور مسکراتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کمپیوٹر یا موبائل پر نہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے، اپنے بے حد نزدیک۔" وہ روتے ہوئے جیسے اس سے التجا کر رہی تھیں۔

"امو جان! آپ پلیز، اس طرح مت روئیں۔ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ وہ ماں کے دل کو کیسے تسلی دے۔ ایسا کیا کرے کہ ماں مسکرا دے، خوش ہو جائے۔

"تم گھر پر نہیں آنا چاہتے ناں، مت آؤ۔ مگر تم کراچی تو آؤ۔ تم کراچی آکر جہاں کہو گے، میں خود تم سے اور اپنی بہو سے وہاں آکر مل لوں گی۔ میں تم دونوں کو گلے لگا کر پیار کرنا چاہتی ہوں، دعائیں دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں تمہاری ہونے والی دلہن کے ساتھ جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"امو جان آپ.....!" وہ ماں کے آنسوؤں سے ایسا بے بس سا ہو رہا تھا کہ صاف انکار کرنے کی جرأت خود میں نہیں پا رہا تھا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ پر رحم نہیں آتا بیٹا؟ میں نے بارہ سالوں سے تمہیں اپنے سینے سے نہیں لگایا۔ میں تمہیں جی بھر کر دیکھنے اور پیار کرنے کو ترس رہی ہوں میری جان، ایک بار تو آکر ماں سے مل لو بیٹا۔ کیا میرے مرنے پر ہی آؤ گے، میری زندگی میں نہیں؟" وہ بلک بلک کر یوں رو پڑی تھیں جیسے تمام حوصلے اور ہمت ہار بیٹھی ہوں۔

"خدانخواستہ امو جان! پلیز ایسی باتیں مت کریں۔ ٹھیک ہے جیسی آپ کی خوشی میں ویسا ہی کروں گا۔ میں پاکستان آرہا ہوں آپ کی بہو کو آپ سے ملوانے۔"

اس کا دل ماں کی آہوں اور آنسوؤں سے ایسا بے چین ہوا کہ وہ ان سے آنے کا وعدہ کیے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"واقعی؟ تم سچ کہہ رہے ہو سکندر؟ مجھے بہلا تو نہیں رہے؟" وہ خوشی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں بولیں۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں امو جان۔" مسکرا کر انہیں یقین دلاتے دلاتے وہ یک دم ہی رکا تھا۔ وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا تھا، بے حد سنجیدہ۔

"مگر میری آپ سے ایک ریکویسٹ ہے امو جان! میں آپ سے ملنے کراچی آؤں گا تو آپ مجھے گھر آنے کے لیے مجبور نہیں کریں گی۔ آپ کو انکار کرتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہو گی امو جان! مگر میں وہاں نہیں آسکتا۔"

وہ ماں کے جذبات کے آگے ہار مان گیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"مجھے پتا ہے بیٹا! میں یہ بات جانتی ہوں۔ میں تمہیں ایسی کسی بات کے لیے کبھی مجبور نہیں کروں گی۔ جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔"

وہ جانتا تھا' ماں اس پل اس سے ملنے کے لیے خوش ہوتے ہوتے کچھ یاد آجانے پر پھر اداس ہو گئی تھیں۔ جیسے چند لمحوں کے لیے بھولی یہ بات کہ خوشیاں ان کے اور ان کے اس بہادر بیٹے کے لیے نہیں ہیں' انہیں یک دم ہی پھر یاد آگئی تھی۔ ماں سے بہت جلد ملنے کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کیا۔ وہ بہت دیر تک ایک ہی جگہ 'ایک ہی زاویے سے بیٹھا ماں کو سوچتا رہا تھا۔ ان کے آنسو اپنے دل پر گرتے محسوس کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو پاسکا تب اسے یہ یاد آیا کہ اس نے ماں سے پاکستان ان کے پاس آنے کا وعدہ کیا ہے اور اس وعدے کے ساتھ ہی اسے لیزا کا خیال آیا۔ وہ اس سے پوچھے بنا اموجان سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔ فلورنس سے لیزا کو لندن جانا ہے۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں' اسے اپنا کالج دوبارہ جوائن کرنا ہے۔ پتا نہیں' پاکستان جانا اس کے لیے ممکن ہو بھی سکے گا کہ نہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ لیزا کے اپنے پاپا کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے ان کے بلانے پر بھی پاکستان نہیں گئی ہے۔ تو کیا اب اس کے کہنے پر وہ وہاں جانے کے لیے راضی ہو جائے گی؟ اگر لیزا نے اس کے ساتھ پاکستان چلنے سے انکار کر دیا پھر؟

وہ عجیب سی الجھن اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسی لیے بجائے فوراً" ہی اسے فون کرنے کے وہ کچن میں آگیا۔ وقتی طور پر اس پریشانی سے خود کو بچانے کے لیے وہ اپنے لیے کھانا بنانے لگا تھا۔

اسے ماں سے وعدہ کرنے سے پہلے لیزا سے تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب اگر اس نے انکار کر دیا تو وہ اموجان کو کیا جواب دے گا؟ وہ بے دلی سے فریزر میں سے فروزن چکن کبابوں کا پیکٹ نکال رہا تھا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر لیزا کی کال آئی تھی۔ اس نے میز پر سے فوراً" موبائل اٹھایا۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس نے لیزا کی کھنکتی ہوئی آواز سنی۔

"کھانا بنا رہا ہوں اپنے لیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا بنا رہے ہو؟"

"فی الحال گروسری شاپ سے خرید کر لایا کبابوں کا پیکٹ کھول رہا ہوں۔ بریڈ یا رول کے ساتھ انہیں کھالوں گا۔ ویسے میں ککنگ کر لیتا ہوں۔" وہ پیکٹ کھولتے ہوئے بولا۔

"چلو یہ اچھا ہے تم ککنگ کر لیتے ہو' بعد میں ہمیں سہولت رہے گی۔" وہ اپنے اسی ہنستے مسکراتے موڈ میں تھی۔

"ہاں! بڑی آسانی رہے گی۔ تم پینٹنگز بناتی رہا کرنا اور میں آفس سے آکر تمہارے اور اپنے لیے ڈنر تیار کر لیا کروں گا۔"

لیزا کے لہجے کا ساتھ دیتے ہوئے اس نے گویا اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا! زیادہ دل مت جلاؤ اپنا۔ میں بہت اچھی مشرقی بیوی بنوں گی تمہاری۔ نینی بڑا اچھا نقشہ کھینچتی ہیں پاکستانی بیویوں کا۔ میں تمہاری فرماں بردار ٹائپ پاکستانی بیوی بنوں گی۔ خوب خدمت کروں گی تمہاری۔"

وہ ساری الجھن بھلا کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ لیزا کا انداز تھا ہی اتنا دلچسپ سا۔

"تم یقیناً" بہت اچھی بیوی ثابت ہو گی' مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں۔ دعا کرو' میں تمہارے لیے ویسا ثابت ہو سکوں جیسا تم نے مجھے سمجھا ہے۔ کاش میں تمہیں کبھی مایوس نہ کروں۔"

ہنستے ہنستے وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی' جیسے اس کے دل میں یہ خدشہ ہو کہ وہ بحیثیت شوہر لیزا کی امیدوں پر پورا نہیں اتر پائے گا۔

"خدا کے لیے سکندر! اب پھر وہی فضول باتیں مت شروع کر دینا کہ میں اپنے اس جذباتی فیصلے پر پچھتاؤں گی اور یہ کہ مجھے تم سے شادی کے فیصلے پر ایک بار پھر غور و فکر کر لینا چاہیے۔"

لیزا نے جیسے بری طرح چڑ کر باقاعدہ اس کی منت کی۔ وہ جواباً" خاموش رہا۔ وہ پیکٹ کھول کر یونہی میز کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد لیزا اس سے پوچھنے لگی۔

"تم نے کیا سوچا؟ ہم شادی کب اور کہاں کر رہے ہیں؟"

"لیزا! میری اموجان....." وہ ایک پل کے لیے ہچکچا کر چپ ہوا۔

لیزا کی محبت کا یقین ہونے کے باوجود وہ اپنے اندر گھری مایوسیوں کے سبب فوراً" بول نہیں پایا تھا۔ نجانے کیسا یہ احساس اس کے اندر سرایت کر چکا تھا کہ وہ ان چاہا اور Un wanted ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی کبھی کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس لائق ہی نہیں ہے۔

"وہ بہت بیمار رہتی ہیں۔ وہ کینسر پیشنٹ رہ چکی ہیں۔ گو ان کی بیماری کا ابتدائی اسٹیج پر ہی علاج کیا جا چکا ہے، مگر وہ ابھی بھی میڈیسنز پر رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے۔ میں تمہیں ان سے ملوانے پاکستان لے کر آؤں۔ وہ اتنی بیمار رہتی ہیں لیزا! میں انہیں انکار نہیں کر پایا۔"

"سکندر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تم کس انداز میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟" اس نے لیزا کی ناراضی بھری آواز سنی۔

"تمہاری اپنے پاپا کی ساتھ ناراضی ہے ناں لیزا! تم ان کی وجہ سے پاکستان نہیں جانا چاہتیں۔ میں اس وجہ سے....."

اس کا وضاحتی جملہ لیزا نے فوراً" قدرے خفگی سے کاٹ دیا۔ "حد کرتے ہو تم سکندر! تمہاری اموجان اتنی بیمار ہیں، تمہیں ان سے ملنے ضرور جانا چاہیے۔ میری پاپا سے ناراضی ہے، مگر اتنی بھی نہیں کہ میں تمہاری اموجان کے بلانے پر پاکستان نہ جا سکوں۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں سکندر!"

وہ لڑکی سرتاپا اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس کی محبت کے احساس میں گھرا خوشی سے سرشار سا کھڑا تھا۔

"تھینکس لیزا! تم نے میری پریشانی دور کر دی۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر اموجان سے یہ وعدہ کر بیٹھا تھا کہ ان کی ہونے والی بہو کو ان سے ملوانے پاکستان لاؤں گا۔ فون رکھنے کے بعد مجھے تمہارا خیال آیا کہ پتا نہیں، تم پاکستان جانا چاہو گی بھی یا نہیں۔"

"آج برداشت کر لیے ہیں میں نے تمہارے یہ فارمل جملے۔ آئندہ نہیں کروں گی۔ میں تمہاری کوئی کولیگ ہوں جسے تم اس قدر پر تکلف تھینکس بولو گے؟ تم مجھے آج فون کر کے کہتے لیزا! کسی بھی طرح کل کی فلائیٹ سے وہاں آجاؤ، پرسوں ہم نے کراچی جانا ہے۔ میں تم سے بغیر کچھ پوچھے چل پڑتی۔ تمہارے سپرد میں نے اپنی پوری زندگی کر دی ہے سکندر!"

وہ کچھ خفگی اور کچھ اپنائیت سے بولی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی ہے 'وہ جانتا تھا۔ وہ اس سے والہانہ محبت کرتی ہے اس کے دل کو معلوم تھا۔

"دعا کرو لیزا! میں تمہاری اس محبت کی قدر کر پاؤں۔ پتا نہیں کیوں ایک ڈر سا ہے میرے اندر۔ کچھ برا ہو جانے کا۔ جب تک تمہیں سمجھا رہا تھا اس رشتے کے لیے منع کر رہا تھا تب تک خود کو بھی سمجھا لیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ مگر اب تمہارے لیے میرا دل ضدی بچے کا سا ہو رہا ہے۔ اب مجھے میری زندگی میں لیزا محمود چاہیے۔ چاہے میں شادی کے بعد اسے مایوس کروں گا، خفا کروں گا یا وہ مجھ سے شادی کر کے پچھتائے گی، مگر اب وہ مجھے میری زندگی میں ہر حال میں چاہیے۔"

وہ خود کو 'اپنے دل 'اپنی سوچوں 'اپنے اندیشوں کو اس پر اس طرح عیاں کر رہا تھا جیسے خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

"تم مجھے نہ خفا کرو گے نہ مایوس۔ تم مجھے بہت پیار کرو گے 'میں جانتی ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ 'تمہارا ڈنر تیار ہو گیا؟"

لیزا کے پوچھنے پر اسے کبابوں کا دھیان آیا۔.....

"نہیں، ابھی نہیں ہوا۔" وہ مائیکرو ویو کی طرف آیا۔

"بس پھر اب تم جلدی سے کھانا تیار کرو سکون سے کھانا کھاؤ۔ مزے دار سی کافی پیو اور ریلیکس کرو۔ ہم کل صبح بات کرکے پاکستان جانے کا پروگرام فائنل کرلیں گے۔"

"کل صبح نہیں، آج رات۔ تم مجھ سے رات میں سونے سے پہلے بات کرنا پلیز۔"

"ٹھیک ہے، مگر ایک شرط پر۔"

"بولو۔"

"تم مجھے Bella (بیلا) کہو۔ تم یہ کہتے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

لیزا کی مسکراتی آواز سن کر وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"Bella! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔"

"دل خوش کردیا آپ نے سینئور سکندر! میں نے جو مانگا، آپ نے مجھے اس سے بھی بڑھ کر خوب صورت بات بول دی۔"

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہوٹل روم میں تھی اور اپنے پاپا کو فون ملا رہی تھی۔ سکندر سے بات کرنے کے بعد اب جب کہ یہ طے ہوچکا تھا کہ وہ دونوں پاکستان جارہے ہیں تو اسے سب کچھ اپنے پاپا کو بھی بتانا تھا۔ اس نے واپس لندن جانے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ کل اس کی اگزیبیشن کا آخری دن تھا اور اس نے کل رات ہی واپس روم چلے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہاں سے دوہا اور پھر کراچی جانے کی تمام تیاری ہو جانے کے بعد اس کو پہلی فلائیٹ سے سکندر کے پاس دوہا چلے جانا تھا۔ لندن تو ویسے بھی اس کو اب سب کچھ وائنڈ اپ کرنے ہی جانا تھا۔ ظاہر ہے اپنی جاب اس کو صحیح طریقے سے نوٹس پیریڈ پورا کرنے کے بعد چھوڑنی تھی اور لندن میں اپنے فلیٹ اور دیگر تمام معاملات کو نمٹانا تھا۔ اپنے دوستوں اور کولیگز سے اچھی طرح مل کر انہیں الوداع کہنا تھا اور اس سب میں اسے کچھ وقت تو لگنا تھا۔

ابھی وہ سکندر کے ساتھ پاکستان ہو آئے پھر لندن چلی جائے گی۔ فی الحال اس نے لندن اپنے کالج کے ڈین کو فون کرکے اپنی چھٹیاں بڑھوالی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے ان کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی تھی کہ وہ شادی کررہی ہے اور جب واپس کالج جوائن کرے گی تو استعفے کے ساتھ اپنا نوٹس پیریڈ پورا کرنے کے لیے کرے گی۔

اس کے ذہن میں مسلسل سکندر کی باتیں گونج رہی تھیں، اس کا دکھ بھرا لہجہ گونج رہا تھا۔ آخر کتنا مایوس کیا تھا اسے لوگوں اور رشتوں نے، جو وہ رشتوں سے اس قدر ڈرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا تھا مگر وہ اس طرح سے ڈرا ہوا تھا جیسے اسے خوف ہو کہ جس طرح باقی تمام لوگوں اور رشتوں نے اسے دکھ دیے تھے، دھوکا دیا تھا ایسے ہی وہ بھی کرے گی۔

محمود خالد کی کال مل گئی تھی۔ اس نے سکندر سے دھیان ہٹا کر اپنے پاپا پر دھیان مرکوز کیا۔ وہ اس کی کال ریسیو کرچکے تھے۔

"میں ابھی تم ہی کو یاد کررہا تھا بیٹا۔ سوچ رہا تھا تمہیں فون کروں۔ آج مریم آئی تھی۔ بتایا اس نے مجھے تمہارے شادی کے Decision (فیصلہ) کے بارے میں۔"

ان کے لہجے میں اس بات کی ذرا سی بھی ناراضی یا خفگی شامل نہیں تھی کہ اس نے اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ان کے مشورے کے بغیر کیسے کرلیا۔ ان کے لہجے میں ایک فکر شامل تھی مگر ناراضی ہرگز نہیں تھی۔

"میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے پاپا!"

جو بھی تھا وہ اس کے باپ تھے، اسے دل میں تھوڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ جو انہوں نے کیا۔ وہ ان کا فعل تھا۔ جو وہ کررہی ہے، وہ اس کا ظرف ہے۔

"وہ کون ہے کلثوم؟ مجھے کچھ بتاؤ اس کے بارے میں؟"

کیا وہ اس سے یہ سننا چاہ رہے تھے کہ وہ پاکستانی آدمی

سے شادی کر رہی ہے یا نہیں یا حقیقت میں اس کی فکر اور محبت میں یہ سوال کیا تھا؟

"وہ لائر ہے پاپا! دوہا میں رہتا ہے۔ ایک ملٹی نیشنل میں لیگل ایڈوائزر ہے۔" سکندر کے مسلمان اور پاکستانی ہونے کا بتائے بغیر اس نے انہیں بتایا۔

"عادت کا کیسا ہے؟ میری حساس اور نازک بیٹی کا خیال تو رکھے گا ناں؟" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس کے ساتھ پاکستان آرہی ہوں پاپا۔ آپ اس سے خود مل لیجیے گا۔" وہ سنجیدگی سے اور بہت رسمی سے انداز میں بولی مگر جواب میں ان کی خوشی والہانہ ' بے ساختہ اور بہت سچی تھی۔

"تم پاکستان آرہی ہو کلثوم؟" وہ اسے کلثوم کہتے تھے ' یہ ان کی ضد تھی۔ جو نام انہوں نے اس کا رکھا چاہے وہ اسے قبول نہیں کرتی' مگر وہ اسے اس سے پکاریں گے۔ سیم کے ساتھ انہوں نے ہر معاملے میں زبردستی کی تھی۔ اس کے پسندیدہ نام سمانتا کے بجائے ہر جگہ اس کا نام ام مریم لکھوایا تھا مگر اس پر وہ اپنی مرضی مسلط نہیں کر پائے تھے۔ تو زبانی اسے کلثوم پکار کر لیزا نام سے نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔

سکندر کا تعلق پاکستان سے تھا تو کیا ہوا' وہ یہ شادی کر تو اپنی مرضی سے رہی ہے۔

اس نے سیم کی طرح پاپا کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کی زندگی کے تمام فیصلے خود کرتے پھریں۔ وہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔

"جی! میں پاکستان آرہی ہوں پاپا۔۔۔ سکندر کے پیرنٹس کراچی میں رہتے ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں' اس لیے میں سکندر کے ساتھ شاید اگلے ہفتے تک کراچی آجاؤں۔"

اس کے اندر تلخی ابھری تو اس نے فوراً" ہی باپ کو یہ جواب دیا گویا در پردہ انہیں یہ جتانا چاہا کہ وہ سکندر کو ان سے ملوانے پاکستان نہیں لا رہی بلکہ سکندر کی فیملی سے ملنے اس کی خاطر پاکستان آرہی ہے۔ مگر محمود خالد نے جیسے اس سے کبھی بھی خفا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ بجائے اس کی بات محسوس کرنے کے' برا ماننے کے' بہت شوق اور خوشی سے پوچھنے لگے۔

"سکندر نام ہے اس کا؟"

"جی!" وہ ان کے لہجے میں شامل محبت پہ پل بھر کے لیے شرمندہ ہو کر بالکل چپ ہو گئی تھی۔ انھوں نے سکندر کا نام بے حد محبت سے لیا تھا۔ جیسے جوان کی بیٹی کو اچھا لگا تھا انہیں وہ بغیر ملے ہی اچھا لگ گیا تھا۔

"اب یہ ایک ہفتہ کیسے گزرے گا بیٹا! میں تو آج سے ہی دن کیا گھنٹے گننے شروع کر دوں گا تم سے اور سکندر سے ملنے کے لیے۔"

ان کا لہجہ باپ کی شفقت اور محبت سے لبریز تھا۔ وہ جواب میں خاموش رہی تھی۔ کیا وہ سکندر کے پاکستانی اور مسلمان ہونے پر خوش ہو رہے تھے یا اس لیے خوش تھے کہ وہ خوش تھی؟

"تم سے ایک بات کہوں کلثوم؟" وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچا کر چپ ہوئے۔

"جی پاپا؟"

"مجھے پتا ہے بیٹا! تم میں اور مریم میں بہت پیار ہے۔ تم کراچی آکر غالباً" اس کے پاس رکنا چاہو گی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا مگر میرا مشورہ ہے تم یہاں آکر میرے پاس رکو۔ باپ کا گھر ہوتے ہوئے تم بہن بہنوئی کے پاس ٹھہرو گی تو تمہارے ہونے والے سسرالی کیا سوچیں گے؟"

ان کا لہجہ التجائیہ سا تھا۔ جیسے وہ شدت سے چاہتے تھے کہ وہ سیم کے پاس نہیں' ان کے پاس ٹھہرے' مگر اس کی ضد سے ڈر کر نرمی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔

وہ باپ کے التجائیہ لہجے پر شرمسار سی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے یہ سوچا نہیں تھا کہ وہ کراچی جا کر کہاں ٹھہرے گی یا شاید اندر ہی اندر یہ طے تھا کہ اسے سیم کے پاس ٹھہرنا ہے' اس لیے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اگر اس کے پاپا کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان کے پاس ٹھہرے تو ٹھیک ہے۔ سکندر بھی تو اپنے گھر والوں سے ناراضی کے باوجود اپنی

ماں سے ملنے جا رہا ہے تو کیا وہ چند دنوں کے لیے باپ کا دل خوش کرنے کو ان کے پاس نہیں رک سکتی۔ آگے کون سا اسے ان کے پاس کراچی میں رہنا ہے۔ چند دن گزار کر تو وہ اور سکندر واپس آجائیں گے۔

"ٹھیک ہے پاپا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"جیتی رہو جانِ پاپا! دل خوش کر دیا تم نے اپنے آنے کا بتا کر۔ بس اب جلدی سے آجاؤ۔ میں تمہاری اور سکندر کی راہ دیکھ رہا ہوں۔" ان کا لہجہ محبت اور چاہت سے بھرپور تو تھا ہی مگر نجانے کیوں اسے رندھا ہوا سا بھی لگا۔

کیا اس کے پاپا رو رہے تھے؟ نہیں، مرد تو نہیں رویا کرتے اور اس کے پاپا تو ایک انتہائی سخت، سرد مزاج اور غیر جذباتی سے آدمی ہیں، وہ بھلا کیوں روئیں گے؟

انہیں خدا حافظ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ بیڈ پر بالکل چپ چاپ اور گم صم سی لیٹی تھی۔ اس کے کانوں میں باپ کا رندھا لہجہ ابھی بھی گونج رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

نویرہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں صوفے پر آمنہ بیٹھی نظر آئیں۔ کسی گہری سوچ میں گم۔ گہری سوچ میں گم اور اداس تو وہ ہر وقت رہا کرتی تھیں اس وقت مختلف بات یہ تھی کہ وہ اداس نہیں تھیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھیں اور ان کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

نویرہ ان کی مسکراہٹ کو بغور دیکھتی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

انہوں نے نویرہ کا آنا اور اپنے پاس بیٹھ جانا محسوس ہی نہ کیا تھا۔ وہ اس وقت یہاں تھیں کب؟ وہ اس وقت اپنے سکندر کے پاس تھیں۔ وہ اسے اور اپنی ہونے والی بہو کو سوچ رہی تھیں۔ اپنے سکندر کی دلہن کو سوچ رہی تھیں۔ جو ان کے بیٹے کو پیاری تھی انہیں تو وہ بغیر ملے، بغیر دیکھے ہی بہت پیاری ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے امو جان؟" نویرہ نے مسکرا کر پیار سے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے خیالوں سے چونک کر نویرہ کو دیکھا۔ "کیا ہوا بیٹا؟"

"میں یہ پوچھ رہی تھی امو جان کہ آپ کچھ کھوئی کھوئی لگ رہی ہیں اور کسی بات پر بہت خوش بھی ہیں۔" نویرہ نے مسکرا کر ان سے پوچھا۔

"بات خوشی ہی کی پتا چلی ہے ناں۔ کل میری سکندر سے بات ہوئی تھی۔ وہ شادی کر رہا ہے۔"

وہ جیسے اس اتنی بڑی خوشی کو شیئر کیے بغیر رہ نہیں سکی تھیں۔ اسی وقت لاؤنج کے دروازے پر شہریار خان آئے تھے۔ وہ باہر لان میں علی کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اب کھیل ختم کر کے انہوں نے اندر کا رخ کیا تھا۔ نویرہ اور آمنہ نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں کی ان کی طرف پشت تھی۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" نویرہ نے آمنہ کی بات پر بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں بہت خوشی کی بات ہے۔ زندگی میں خوشیوں پر اب میرے سکندر سے زیادہ اور کسی کا حق نہیں۔ میں نے سکندر سے کہا ہے، وہ میری ہونے والی بہو کو لے کر کراچی مجھ سے ملوانے لائے۔ جسے میرے بیٹے نے زندگی کی ساتھی کے طور پر چنا ہے، میں اسے جی بھر کر دیکھوں گی، پیار کروں گی اور اس سے یہ بھی کہوں گی کہ میرے بیٹے نے زندگی میں بڑی سختیاں کاٹی ہیں، بڑی آزمائشیں برداشت کی ہیں۔ اب تم اسے اتنا پیار دو کہ وہ۔۔۔"

بولتے ہوئے آمنہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں، وہ بھرائے لہجے میں بول رہی تھیں، آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ ابھی ان کا جملہ پورا ہو بھی نہیں پایا تھا کہ شہریار خان کے پیچھے بھاگتا دوڑتا علی بھی اندر داخل ہوا۔ الٹی کر کے کیپ لگائے، ہاتھ میں چھوٹا سا بیٹ اور بال پکڑے۔

"ماما! میں نے دادا جان کو ہرا دیا۔" علی بھاگتا ہوا ان لوگوں کے پاس آ رہا تھا۔ نویرہ اور آمنہ نے فوراً ہی گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ان دونوں ہی

کی نگاہیں علی پر نہیں، شہریار خان پر جا کر ٹھہری تھیں۔
آمنہ کے لب یک دم ہی یوں پیوست ہوئے تھے جیسے وہ کوئی چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہوں۔ سکندر کی بات کرنا تو کیا وہ شہریار خان اور زین کے سامنے کبھی بھولے سے اس کا نام تک نہیں لیا کرتی تھیں۔ کجا کہ آج وہ سکندر کی بات کرتے، اسے یاد کر کے آنسو بہاتے دیکھ لی گئی تھیں۔ وہ فوراً" ہی گھبرا کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھیں۔

"دادی جان رو رہی ہیں؟؟" علی ان کے پاس حیران پریشان سا آیا۔

"نہیں میری جان۔" انہوں نے علی کو گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ نویرہ نے قدرے گھبرائی ہوئی ایک نظر آمنہ کو اور پھر سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑے شہریار خان کو دیکھا۔

"آیئے ناں پاپا! علی نے کتنا تھکایا آپ کو؟"
اس نے فوراً" ہی صورت حال کو سنبھال کر اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ شہریار صوفے پر ان لوگوں کے نزدیک آگئے تھے۔

"تھکن و کن نہیں ہوئی۔ ہم دادا پوتے نے خوب انجوائے کیا ہے۔ آج تو دادا نے علی کو ہرایا بھی ہے۔"
صوفے پر بیٹھتے ہوئے شہریار خان گویا علی کو چھیڑ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر لمحہ بھر پہلے کی کسی بات کا کوئی تاثر موجود نہیں تھا۔ وہ پر سکون اور کمپوزڈ تھے، جیسے ہمیشہ ہوا کرتے تھے۔ علی فوراً" ناراضی سے انہیں دیکھتا بولا۔

"جی نہیں! دادا جان ہارے ہیں میں جیتا ہوں۔"
آمنہ علی اور شہریار خان کی نوک جھونک پر پھیکے سے انداز میں مسکرائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"لیزا پاکستان آرہی ہے۔ یہ تو بہت خوشی کی بات بتائی آپ نے۔"
کھانے کی میز پر وہ اور عائشہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے عائشہ کو لیزا کے شادی کے فیصلے اور پاکستان آنے کا بتایا تھا۔

"ہاں الحمد اللہ۔ میرا دل بڑا مطمئن ہے۔ ابھی ملا نہیں ہوں اس لڑکے سے مگر چونکہ یہ کلثوم کا اپنا اکیلی کا فیصلہ ہے، اس لیے مجھے یقین ہے اس نے کسی غلط شخص کا انتخاب نہیں کیا ہو گا۔ اگر کسی کے influence (اثر) میں آکر اس نے یہ فیصلہ کیا ہوتا تو میں یقیناً" پریشان ہوتا۔ میں کلثوم کے لیے بہت فکر مند بھی اسی لیے رہتا تھا کہ مجھ سے ناراضی اور میری ضد میں آکر جس طرح وہ پچھلے پانچ سالوں سے لندن میں اکیلی رہ کر خود کو نقصان پہنچا رہی تھی، کہیں میری ضد میں وہ کسی غلط جگہ شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔"

وہ خاصے مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔ مگر ان کے چہرے پر ابھی بھی کسی بات کی ٹینشن تھی۔ عائشہ ان سے محبت کرتی تھیں، وہ ایک اچھی شریک حیات اور ان کے دکھ درد کی ساتھی تھیں، مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں جو وہ عائشہ سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عائشہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر کہنے کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب کر رہے تھے۔
انہوں نے سر جھکا کر اپنی پلیٹ میں چاول ڈالے اور چند نوالے چاولوں کے کھائے بھی تھے۔ یہ چند لمحے سوچنے کے لیے لینے کے بعد انہوں نے عائشہ کو دیکھا۔

"تمہاری مریم سے بات ہو تو اسے کلثوم کے پاکستان آنے کا مت بتانا۔" ان کا انداز سنجیدہ تھا۔
"کیوں؟" عائشہ نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔
"اچھا ہے ناں، کلثوم اچانک آکر اسے سرپرائز دے گی۔" انہوں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔
عائشہ جواباً" مسکرائی تھیں۔ "ٹھیک ہے میں نہیں بتاؤں گی۔ مگر ان دونوں بہنوں میں پیار اور دوستی اس قدر ہے، دیکھ لیجیے گا لیزا خود اسے بتا دے گی۔"
"ہاں! کلثوم، مریم سے بہت محبت کرتی ہے۔"
انہوں نے ایک تھکی ہوئی سی سانس لے کر گلاس میں

اپنے لیے پانی ڈالا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس کا سولو شو کامیابی سے ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ فلورنس سے واپسی کی تیاری کر رہی تھی۔ اپنا سامان پیک کرتے ہوئے اس نے سیم کا نمبر ملایا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ لندن نہیں جا رہی واپس روم جا رہی ہے۔ کیونکہ اگلے ہفتے کسی روز وہ پاکستان آ رہی ہے۔ سیم نے اس کی کال ریسیو کی تو ہائے ہیلو کے بعد اس نے اسے اگلی بات یہی بتائی تھی۔

"کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں پاکستان آنے کی لز؟ شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو روم یا دوہا کہیں بھی شادی رکھ لو۔ تم جہاں کہو گی میں تمہاری شادی اٹینڈ کرنے وہاں آجاؤں گی۔" وہ فوراً" ہی سنجیدگی اور محبت سے بولی۔

"میرا آنا ضروری ہے سیم۔"

"میرا مشورہ ہے تم یہاں نہ آؤ۔ تمہیں پاپا کی نیچر کا پتا ہے ناں؟ محض اس ضد میں کہ تم ان کی نہیں اپنی مرضی سے شادی کر رہی ہو وہ تمہاری شادی رکوانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو وہ اپنی منوانے کے عادی ہیں اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ چاہے ان کے ایسا کرنے سے ان کی بیٹیوں کی زندگی برباد ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔"

سیم بہت جذباتی انداز میں بول رہی تھی اس کے لہجے میں اس کی محبت اور فکر شامل تھی۔ وہ سیم کی خود سے محبت پر مسکرائی۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا سیم! میری پاپا سے بات ہوئی ہے وہ میری شادی کی بات سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور اگر وہ خوش نہ بھی ہوتے تو مجھے تب بھی پاکستان آنا ہی تھا۔ سکندر کی فیملی پاکستان میں ہے۔ وہ مجھے اپنی ماں سے ملوانا چاہتا ہے۔ ان سے ملنے تو مجھے کراچی آنا ہی ہے۔"

اس کی رسانیت سے کی بات کے جواب میں سیم یکدم ہی غصے اور ناراضی سے بولی۔

"جب تم طے کر چکی ہو تو ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آتا ہے کرو۔ وہ چند دنوں سے ملنے والا شخص مجھ سے زیادہ اہم ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں پاپا کچھ الٹا سیدھا کریں تمہاری شادی یہاں نہ ہونے دیں تو روتی ہوئی میرے پاس مت آنا۔" سیم نے بات پوری کرتے ہی اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

سیم بہت تلخ اور غصیلے لہجے میں بولی تھی اس کی آواز اونچی تھی۔ سیم کے غصے اور اس کی تلخی کا اس نے برا نہیں مانا تھا۔ وہ جانتی تھی سیم اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور اس کی اس بے تحاشا محبت ہی میں اس کی فکر میں مبتلا ہو کر وہ اس پر چلائی تھی ناراض ہوئی تھی۔ کوئی بات نہیں وہ کراچی جا کر سیم کو منا لے گی۔ منا کیا لے گی اس کی شکل دیکھتے ہی سیم اپنی ساری ناراضی خود ہی بھول جائے گی۔

✡ ✡ ✡

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ لیزا کو لینے ایئرپورٹ آیا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس دوہا آئی تھی یہاں سے ان دونوں نے مل کر کراچی جانا تھا۔ وہ اسے سامنے سے اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ پورے ایک ہفتے بعد پھر اس کے سامنے تھی۔

"Signorina Buon giorne"۔

وہ اسے دیکھ کر شریر سے انداز میں بولا۔ وہ بلیک لوز سا بلاؤز آف وائٹ لینن پینٹ کے ساتھ پہنے تھی۔ حسین تو وہ تھی اب اپنی بھی لگا کرتی تھی۔

"Buon giorno"۔

شکر تم اٹالین بھولے نہیں۔"

"جتنی آئی تھی وہ یاد رکھی ہوئی ہے باقی تم مجھے سکھا دینا۔"

وہ ٹرالی اس کے ہاتھ سے لے کر خود چلاتا ہوا اپنی گاڑی تک آ گیا تھا۔ اس نے لیزا کا چھوٹے سائز کا سوٹ کیس گاڑی کی ڈگی میں رکھا۔ وہ تو پاکستان کا صرف دو یا تین دن کا پروگرام بنانا چاہتا تھا مگر لیزا نے اس

سے کہا تھا کہ جب وہ اپنی بیمار ماں کا دل خوش کرنے کے لیے پاکستان جا ہی رہا ہے تو اسے وہاں چند دن تو ٹھہرنا چاہیے 'تاکہ وہ اچھی طرح اس سے مل سکیں۔ لیزا بھی کراچی میں اپنی بہن سے ملنے کے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھی۔

وہ پہلی بار پاکستان جا رہی تھی۔ وہ پانچ سالوں بعد اپنے بابا سے ملنے والی تھی اور کافی مہینوں بعد اپنی بہن سے ملنے والی تھی' سو وہ بھی وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا چاہتی تھی۔ یوں لیزا کے کہنے پر انہوں نے ایک ہفتے کراچی میں رکنے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہوں نے کراچی ساتھ جانا تھا اور وہاں سے دوہا ساتھ واپس آنا تھا۔

ان کے قیام کی مدت اگر لیزا نے طے کی تھی تو آج کس فلائیٹ سے لیزا دوہا آئے گی اور کس فلائیٹ سے وہ دونوں کراچی جائیں گے' یہ اس نے طے کیا تھا۔ وہ آج لیزا کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر اس کا دل چاہا تھا' آج جتنا ہو سکتا ہے وہ لیزا کے ساتھ وقت گزار لے۔

اس نے لیزا سے کہا تھا' آج صبح سویرے جو سب سے پہلی فلائیٹ اسے دوہا پہنچائے وہ اس سے آجائے۔ یوں اس وقت جبکہ صبح پانچ بجے تھے' لیزا اس کے سامنے تھی۔ آج رات گئے کراچی جانے والی جس آخری فلائیٹ میں انہیں سیٹیں مل سکی تھیں' وہ اس سے کراچی جا رہے تھے۔ یوں آج صبح پانچ بجے سے رات گئے تک ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہترین وقت گزارنے کے لیے ان کے پاس کئی گھنٹے موجود تھے۔

کراچی پہنچ کر پتا نہیں وہ ایک دوسرے سے کتنا مل پائیں گے' کتنا وقت ساتھ گزار پائیں گے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ خوب صورت سی ڈبیا نکالی جس میں لیزا کے لیے خریدی انگوٹھی موجود تھی۔

"اوہ' تم نے رنگ خرید لی سکندر۔" اس نے ڈبیا کھول کر اس کے سامنے کی تو وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں! کیسی ہے؟"

"بہت خوب صورت۔ پہنا تو دو۔"

اس نے جھٹ اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی کہ وہ رنگ خریدنے والی بات بھولا نہیں تھا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈال دی تھی۔

لیزا مسکراتے ہوئے انگوٹھی سے سجے اپنے ہاتھ کو ہر ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہے ناں میرے ہاتھ میں؟"

"ہاں بہت۔" اس نے پیار سے لیزا کو دیکھا۔

"چلیں؟" اس کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ خود بھی مسکرا رہا تھا۔

لیزا نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "چلو۔"

وہ اسے لے کر اپنے فلیٹ آگیا تھا۔ راستے بھر وہ اسے اپنی ایگزیبیشن کی باتیں بتاتی رہی تھی یا پھر اپنی بہن کا ذکر کرتی رہی تھی جس سے ملنے کے لیے وہ بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ نینی نے اسے دعا پیار کہلوایا تھا جو اسے لیزا نے راستے میں پہنچا دیا تھا انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ ان دونوں کی شادی میں ضرور شریک ہوں گی۔

وہ چابی لگا کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ لیزا اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے یک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا فلیٹ لیزا کے شایان شان نہیں۔ اس کا دل ایک دم ہی بجھ سا گیا۔ اسے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔

"آؤ۔" لیزا نے اس کے ساتھ اندر قدم رکھا۔

"تمہارے روم والے فلیٹ کے مقابلے میں میرا فلیٹ چھوٹا ہے۔ مجھے پتا ہے' تم اسے دیکھ کر مایوس ہو رہی ہو گی۔ میں شادی سے پہلے کہیں اور اس سے بڑا فلیٹ لے لوں گا۔" اس کے لہجے میں افسردگی در آئی تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔ اس کے فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم تھا جو وہ عموماً" لیونگ روم کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی کچن اور ایک بیڈ روم تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں سکندر؟ تمہارا فلیٹ بہت

اچھا ہے۔ میرے لیے ہر وہ جگہ خوب صورت ہے جہاں تم میرے ساتھ ہو۔"

وہ جیسے قدرے بڑا مان کر بولی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"لیزا! میں اپنی الجھی بکھری زندگی کی وجہ سے پریشان سا ہو جاتا ہوں کہ کہیں تمہیں مایوس نہ کر دوں۔ یقین کرو، میری جاب اور سیلری بہت اچھی ہے۔ میں اچھی سے اچھی جگہ بھی افورڈ کر سکتا ہوں۔ بس میں نے کبھی اپنے فلیٹ کو گھر سمجھا ہی نہیں، کبھی گھر سمجھ کر اسے سجانے سنوارنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، مگر اب دل چاہنے لگا ہے زندگی کو ترتیب دینے کا، ایک بہت بڑا بہت خوب صورت سا گھر ہو جہاں ہم دونوں رہیں۔ میں تمہارے لیے دنیا کی ہر نعمت اکٹھی کر لینا چاہتا ہوں۔"

وہ رک رک کر یوں بول رہا تھا جیسے اسے خوف ہو، اندیشہ ہو کہ جو وہ سوچ رہا ہے، وہ کبھی ہو نہیں سکے گا۔ لیزا اور وہ کبھی ساتھ زندگی گزار نہیں پائیں گے۔ لیزا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"تم خواب دیکھنے سے ڈرنا چھوڑ دو سکندر۔ تمہارے سارے ڈر غلط ثابت ہوں گے۔ اس بار تمہاری زندگی میں کچھ برا نہیں ہو گا۔"

وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ جو وہ اس سے کہہ نہیں پایا تھا، وہ اسے بھی سمجھ چکی تھی۔ وہ اسے زندگی میں سب کچھ اچھا ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔

"مجھے تھوڑا وقت دینا لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چلا ہوں۔ زندگی کے ہنگاموں اور رونقوں سے میں نے خود کو سالوں سے دور کر رکھا ہے۔ تم خوش رہنے اور ہنسنے ہنسانے والی لڑکی ہو۔ میں تمہاری پسند کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا، بس تم مجھ سے مایوس مت ہو جانا۔ مجھے تھوڑی رعایت، تھوڑی گنجائش دیتی رہنا۔" وہ اپنے ہاتھ پر رکھے لیزا کے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے دبا کر بولا۔

"تم جو ہو جیسے ہو، مجھے بہت پسند ہو اور اس بات کا یقین کر لو سکندر! میں نہ تم سے کبھی مایوس ہوں گی، نہ تمہارا ساتھ چھوڑوں گی، نہ تم سے محبت کبھی میرے دل میں کم ہو گی۔"

وہ مضبوط لہجے میں اسے اپنی محبت اور وفاؤں کا یقین دلا رہی تھی۔ وہ کچھ پل یونہی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا تم مجھے اپنے گھر لا کر یونہی سڑا میں کھڑا کیے رکھو گے؟ ایک تو پہلے اپنی ایگزیبیشن، اس کے بعد فلورنس سے روم بھاگ دوڑ اور اس کے بعد جلدی جلدی پیکنگ وغیرہ کرنے میں میں اتنا تھک گئی ہوں۔ اوپر سے تم نے صبح سویرے وہاں پہنچنے کی ہدایت کر کے میری کل رات کی نیند اور آرام خراب کروایا۔"

وہ اپنے مخصوص زندہ دلی سے بھرپور انداز میں بولتی اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلا رہی تھی۔

"اوہ آئم سو سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تم واقعی تھک گئی ہو گی۔ آؤ۔"

وہ فوراً" شرمندہ سا ہوتا اس کا سوٹ کیس پکڑے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ لیزا اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔

"تم شاور لے لو، فریش ہو جاؤ۔ پھر تھوڑی دیر سو جاؤ۔" اس نے اس کا سوٹ کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ لیزا نے سر نفی میں ہلایا۔

"سونا وونا نہیں رہی میں۔ تمہارے ساتھ ناشتا کرنے کے لالچ میں، میں نے فلائیٹ پر کچھ بھی نہیں لیا۔ مجھے ناشتا کرواؤ اچھا سا۔ اس کے بعد مجھے روما گھماؤ۔"

بولتے بولتے وہ پل بھر کے لیے رکی پھر اسے کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"تم نے آفس تو نہیں جانا ناں؟"

"نہیں بھئی۔ تمہیں پورا دن اپنے ساتھ گزارنے کے لیے یہاں بلاؤں گا اور خود آفس جا کر بیٹھ جاؤں گا؟ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں آج سے ہی چھٹی پر ہوں۔ میں نے فی الحال ایک ہفتے کی چھٹی لی ہے۔ آگے شادی کے لیے ہم جو بھی پلان کرتے ہیں، مگر اس

حساب سے مزید چھٹیاں لے لوں گا۔"
وہ اس کے رعب دار سے انداز پر ہنس کر بولا۔
"تمہارا کوئی بھروسا نہیں ہے ناں۔ اس لیے پوچھ رہی تھی۔"
وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ وہ لیزا کے لیے ذرا اہتمام سے ناشتے کی تیاری کرنا چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
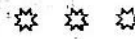
نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ خود ہی اس کے فلیٹ میں گھومتی کچن میں آگئی تھی۔ جہاں میز پر ناشتے کے کچھ لوازمات سجائے جاچکے تھے اور کچھ وہ ابھی تیار کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں مائیکرو ویو ٹوسٹر اور برتنوں کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ہنستی ہوئی اندر آگئی۔
"اتنا اہتمام بھی مت کرو میرے لیے۔" اس نے ٹوسٹر سے ٹوسٹ نکال کر پاس رکھی پلیٹ میں رکھے اور وہ پلیٹ فوراً" ہی میز پر پہنچائی تھی۔ سکندر بڑی مہارت سے آملیٹ بنا رہا تھا۔ پہلے اس نے پین میں پھینٹے ہوئے انڈے ڈالے۔ دو ایک سیکنڈ بعد اس پر مشرومز اور پنیر ڈالا تھا اور پھر بڑے ماہرانہ انداز میں اسے جلدی جلدی رول کر رہا تھا۔
"تم ساسیجز کھاتی ہو؟"
"میں سب کچھ کھاتی ہوں۔" وہ میز پر رکھی پھلوں کی خوب صورت سی ٹوکری کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس میں صرف ایک ہی پھل تھا۔ ناشپاتیاں۔ ٹوکری پوری لبالب بھری ہوئی تھی ناشپاتیوں سے۔ اس نے پلیٹ میں آملیٹ نکالتے سکندر کو مسکرا کر دیکھا۔ اسے یہ پھل کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ وہ یہ ناشپاتیاں کس کے لیے خرید کر لایا تھا وہ جانتی تھی۔
"تم ناشپاتیاں میرے لیے لائے تھے؟" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ آملیٹ کی پلیٹ میز پر رکھتا سکندر بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
"ہاں..... صرف ناشپاتیاں نہیں بلکہ یہ فروٹ باسکٹ بھی میں نے کل شام ہی خریدی ہے۔ اب بے ڈھنگے پن سے پھل یونہی شاپر میں پڑے چھوڑ دیتا تو تم میرے پھوہڑپن پر افسوس کرتیں۔"
وہ ہنس کر بولا جیسے اپنی کل فروٹ باسکٹ خریدنے والی حرکت کو ابھی تک انجوائے کر رہا ہو۔ وہ سکندر کے میزبانوں کی طرح پر اخلاق دعوت دینے سے قبل ہی ناشتا شروع کرچکی تھی۔
"کیا تم میری پسند ناپسند ہمیشہ اسی طرح یاد رکھو گے؟" آملیٹ اور ساسیجز کھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔
"پتا نہیں۔" وہ یک دم ہی سنجیدہ ہوا پھر وہ اداسی سے بولا۔
"میں تمہاری امیدوں پر پورا اترنا چاہتا ہوں لیزا۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر پتا نہیں میں تمہیں خوش رکھ بھی پاؤں گا یا نہیں؟ میں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں لیزا! اب تمہارے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ ہم شادی کرنے جارہے ہیں۔ تم اس وقت میری پہنائی ہوئی رنگ پہنے میرے سامنے بیٹھی ہو مگر میں اس وقت پھر یہی بات کہوں گا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔۔۔ تم مجھ سے بہت بہتر شخص ڈ کرتی تھیں۔"
اس کے چہرے پر اداسی تھی جیسے اپنے آپ سے مایوسی تھی۔ لیزا نے یک دم ہی اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔
"میں اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہوں کیونکہ سکندر شہریار مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس جیسے اچھے شخص کو ڈھونڈ نہیں کرتی مگر وہ پھر بھی مجھے مل رہا ہے تو یہ میری خوش قسمتی ہی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے کیونکہ ہمارا رشتہ محبت اور سچائی پر قائم ہوا ہے۔"
اس نے دیکھا سکندر کے چہرے کی مایوسی فوراً" ہی مسکراہٹ میں تبدیل ہوئی تھی۔ اور پھر فوراً" ہی سنجیدگی اور سچائی میں۔
"پلیز مجھے کبھی چھوڑنا نہیں۔ مجھے سب نے چھوڑ

دیا تھا۔ مجھے رشتوں نے اور زندگی نے صرف نفرتیں دی ہیں۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا، اگر تم مجھ سے دور ہو ئیں تو میں زندہ کس طرح رہ پاؤں گا؟"

اور وہ جانتی تھی کہ سکندر شہریار آسانی سے لوگوں پر کھل جانے والا شخص نہیں تھا۔ اپنے اندر جھانکنے کی وہ کسی کو اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ اگر وہ اسے اپنے اندر جھانکنے دے رہا تھا، اپنے دکھ اور اپنی کمزوریاں اس سے شیئر کر رہا تھا تو وہ اسے اپنی زندگی میں سب سے اہم رتبے پر لے جا کر بٹھا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے دل اور اپنی روح تک رسائی دے رہا تھا۔

"جنہوں نے تمہیں نفرتیں دیں، جنہوں نے تمہیں چھوڑ دیا، وہ بدنصیب لوگ تھے سکندر! یہ تمہاری نہیں، ان کی بدنصیبی ہے کہ وہ تمہیں چاہ نہ سکے۔ تم سے تو صرف محبت کی جا سکتی ہے سکندر۔"

سکندر کا دکھ، اس کا کرب محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی، اس کی آواز بھر آ گئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے بالکل خاموش اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"تم مجھ سے پوچھو گی نہیں لیزا کہ میرے گھر والوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تھا؟ انہوں نے مجھے نفرت سے کیوں دھتکار دیا تھا؟"

وہ چند لمحوں کے بعد آہستگی سے بولا۔ اس کے چہرے پر تلخی ابھر آئی تھی۔

"نہیں، میں تم سے یہ سب نہیں پوچھنا چاہتی اس لیے کہ میں وہ سب جاننا ضروری نہیں سمجھتی۔" اس کے نرم لہجے میں کہی بات جیسے سکندر کو یک دم ہی مزید تلخ کر گئی تھی۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا تھا بہت منتشر ہو کر۔

"پوچھنا چاہیے تمہیں مجھ سے۔ پوچھنا چاہیے تمہیں مجھ سے کہ آخر میرے اپنے سگے باپ نے مجھے اپنے گھر سے دھکے مار کر کیوں نکال دیا تھا، میرا سگا بھائی مجھ سے اس حد تک نفرت کیوں کرتا تھا کہ اگر میرے مرنے کی اطلاع آتی تو اس پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہ ہوتا؟"

"سکندر پلیز، تم خود کو کیوں اذیت دے رہے ہو؟"

وہ گھبرا کر بولی۔
سکندر کی تلخی اور اس کا خود پر غصہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔ سکندر نے خالی خالی نگاہوں سے اسے بغور دیکھا۔

"میں بیس سال کا تھا لیزا، میں اس وقت صرف بیس سال کا تھا۔ کیا کوئی باپ اپنے بیس سال کے کم عمر بیٹے کے ساتھ ایسا ظلم کر سکتا ہے؟ کیا کوئی بھائی اپنے بھائی کو تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے؟ یہ تھے میرے خونی رشتے۔ یہ تھے میرے خونی رشتے۔"

بولتے بولتے سکندر کی آواز بالکل مدھم ہو گئی تھی وہ سر جھکا کر میز کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ بہت دکھ، بہت کرب سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے زخم زخم وجود پر کس طرح مرہم رکھے کہ وہ ماضی کی ہر تلخ یاد کو بھول جائے؟

"یہ جو آج میں تمہیں ایک باعزت انسان نظر آتا ہوں ملٹی نیشنل میں معزز سی جاب کرتا۔ میں یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں، اگر تمہیں بتاؤں تو شاید تم میری سخت جانی پر حیران رہ جاؤ گی۔ گرے سے گرا اور گھٹیا سے گھٹیا وہ کون سا ایسا کام ہے جو اپنے Survival (بقا) کے لیے میں نے نہیں کیا تھا۔ میں نے نائٹ کلبز اور بارز میں لوگوں کو شراب پیش کی ہے، میں نے لوگوں کے جانوروں، ان کے کتوں کی دیکھ بھال کی ہے، میں نے کنسٹرکشن سائٹ پر محنت مزدوری کی ہے۔ میں سڑکوں، فٹ پاتھوں اور پارک کی بینچوں تک پر سویا ہوں۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے میں کئی کئی دن بھوکا رہا ہوں، کوئی بھی مجھے ایک وقت کا کھانا کھانے کے لیے پیسے دے گا، اس کے لیے میں نیچ سے نیچ کام کرنے تک کے لیے تیار رہا ہوں۔ اس ملٹی نیشنل کمپنی میں لیگل ایڈوائزر کی پوسٹ تک پہنچتے پہنچتے میں نے زندگی میں کتنی ذلتیں برداشت کی ہیں، تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

وہ اسی طرح میز کو گھورتا آہستہ آواز میں کرب سے کہہ رہا تھا۔

"اسی لیے تو میں تمہیں ایک بہادر انسان کہتی ہوں

سکندر! تم بہت بہادر ہو' زندگی کی ٹھوکروں سے تم نے ہار نہیں مانی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو تباہ و برباد کرچکا ہوتا۔ مگر تم نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بتادیا کہ تم ہار ماننے والے نہیں ہو۔ تم بدترین حالات کا سامنا کرلو گے مگر خود کو برباد نہیں ہونے دو گے۔ تم نے ناممکن ترین اور مشکل ترین حالات میں اپنی ایجوکیشن مکمل کی لائر بنے' تم بہت بہادر ہو سکندر۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ مجھے تم سے محبت ہونے پر فخر ہے۔ تم میری زندگی میں شامل ہونے جارہے ہو مجھے تمہارے اس ساتھ پر فخر ہے۔"

سکندر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں نرمی اور چاہت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر بغیر کچھ بولے پھیکے سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"خود کو اتنا دکھ مت دیا کرو سکندر۔" وہ رسانیت سے بولی۔ "چائے پیو اور تھوڑا سا ناشتا بھی کرو۔ بہت کرلیں ہم نے یہ دل دکھانے والی باتیں۔" وہ اس کے لیے کپ میں چائے ڈالنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ لیزا کو ساتھ لے کر وہاں کے ایک بڑے سے شاپنگ مال آیا تھا۔ اس نے لیزا کے اصرار پر تھوڑا بہت ناشتا کرلیا تھا۔ ماضی کو دہرا کر' اسے یاد کرکے اس پر عجیب سی اداسی اور قنوطیت طاری تھی۔ ناشتے کی میز لیزا نے سمیٹی تھی' اس نے جھوٹے برتن ڈش واشر میں ڈالے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا تھا۔ لیزا اس کے بعد ایک بار پھر اس کے پاس میز پر آکر بیٹھی تھی۔

"جو باتیں سوچنے اور دہرانے سے تمہیں اتنی تکلیف ہوتی ہے سکندر! تم انہیں مجھ سے بھی مت کہا کرو۔ کبھی جب ہماری شادی کو بہت عرصہ گزرچکا ہوگا۔ میرا ساتھ تمہارے اندر کی تلخیاں کچھ کم کرچکا ہوگا' تم خواب دیکھنے سے ڈرنا چھوڑ چکے ہوگے' تمہارے اندر سے یہ اندیشہ بھی ختم ہوگیا ہوگا کہ باقی سب لوگوں کی طرح میں بھی تمہیں چھوڑ جاؤں گی' تم

اس روز مجھے خود پر گزری ایک ایک بات بتانا۔"

اور وہ اس لڑکی کے خود پر یقین اور محبت کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کے موڈ پر چھائی پژمردگی اور اداسی دور کرنے کے لیے لیزا نے فوراً" ہی یہ شور مچایا تھا کہ اسے گھمانے لے کر چلے اور یہ کہ اسے یہاں پر شاپنگ بھی کرائے۔ یہاں زیادہ تر شاپنگ مالز صبح دس بجے یا اس کے کچھ بعد کھلا کرتے تھے۔ اس بیچ جو تھوڑا وقت تھا۔ وہ اس میں لیزا کو دوہا کی مختلف خوب صورت سڑکیں اور روڈز پر گھماتا رہا تھا۔ کئی جگہ وہ ٹریفک جام میں بھی پھنسے تھے۔ گویا صبح صبح یہ ان کی لانگ ڈرائیو تھی۔

وہ ابھی بھی اداس تھا' وہ دل سے خوش ہونے سے ڈر رہا تھا مگر وہ لیزا سے اپنی یہ کیفیت چھپا رہا تھا۔ وہ بظاہر ڈرائیو کرتے اس کی باتوں پر یوں مسکرا رہا تھا جیسے بہت خوش ہو' جیسے کوئی خوف کوئی اندیشہ اس کے دل کو پریشان نہ کررہا ہو۔

اب وہ دونوں اس جدید اور بے حد خوب صورت پُرآسائش شاپنگ مال میں تھے جہاں اچھی سے اچھی اور مہنگی سے مہنگی ہر شے موجود تھی۔ لیزا کو ایک شاپ پر اپنے لیے ایک ہینڈ بیگ پسند آگیا۔ وہ اسے خریدنے لگی۔

"پتا ہے مجھے' تمہارے پاس بہت پیسے ہیں۔ مہربانی کرکے یہ والٹ اندر رکھ لو۔"

اسے پیمنٹ کرنے کے لیے والٹ نکالتا دیکھ کر وہ قدرے رعب سے بولا۔ اس نے خود اس کی پیمنٹ کی تھی۔

"میری شاپنگ کی پیمنٹ تم کرو گے؟" وہ دونوں بیگ خرید کر شاپ سے باہر نکلے تو لیزا نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"یہ تو بہت فائدے کی بات ہے۔ اب تو میں دل بھر کر اور خوب مہنگی شاپنگ کروں گی۔" وہ کسی نوعمر لڑکی کی طرح خوشی اور ایکسائٹمنٹ کا اظہار کرتے ہوئے

بولی۔

وہ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ لیزا کے لیے وہ بیگ خریدنا اسے اچھا لگا تھا' اس کا موڈ خوشگوار ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"یہاں چلیں؟" ایکسلیٹر پر چڑھ کر وہ دونوں اگلی منزل پر آئے تو وہاں ایک گفٹ شاپ دیکھ کر لیزا اس سے بولی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ دونوں اس شاپ میں آ گئے تھے۔ وہ ایک طرف مختلف ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہا تھا اور لیزا دوسری طرف کچھ اور دیکھ رہی تھی۔

"سکندر! یہ دیکھو' یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔" وہ بہت ایکسائیٹڈ سی اس کے پاس آئی۔ اس نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں قیمتی لکڑی سے بنی ایک خوب صورت اور بڑی سی چابی تھی جسے الماری یا میز پر سجایا جا سکتا تھا۔ اس پر سنہری حروف میں کندہ الفاظ پڑھ کر وہ ہنسے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

Only you hold the key

to my heart

"یہ؟ تم یہ میرے لیے خریدو گی؟" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"ہاں یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔

Key to my heart اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" وہ اس کے قہقہہ لگا کر ہنسنے پر قدرے برا مان کر بولی۔

"پتا ہے ٹین ایجڈ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو اس طرح کے بچکانہ تحفے دیتے ہیں۔" وہ ہنوز ہنس رہا تھا۔

"اب اگر ٹین ایج میں مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی تو کیا میرے دل میں کوئی ارمان ہی نہیں ہوں گے؟ کیا اٹھائیس سال کی عمر میں' میں اپنے ٹین ایج والے شوق پورے نہیں کر سکتی؟" وہ بہت سنجیدہ تھی اس چابی کو خریدنے کے لیے۔

"کرو' ضرور کرو۔ میں نے کب روکا ہے۔"

مگر میں یہ تمہارے لیے لے رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں' تم اسے اپنے کمرے میں اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سجاؤ۔ جس طرح تم نے وہاں سمورائی کا مجسمہ اور میرا بنایا کارڈ سجا کر رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ

You are the only one

the key who hold

to my heart

(تم وہ واحد آدمی ہو جس کے پاس میرے دل کی چابی ہے۔)" وہ بے حد سنجیدگی سے بولی تھی۔

"لے لو بیلا! میں اسے بہت سنبھال کر اور سجا کر رکھوں گا۔"

اسے ابھی بھی ہنسی آ رہی تھی۔ اس طرح کا نوعمر لڑکے لڑکیوں والا تحفہ خریدے جانے پر مگر اس نے لیزا کو سنجیدہ دیکھ کر اسے خریدنے کو کہا تھا۔ وہاں بہت سے تحفے ایسے بھی تھے جنہیں خریدنے سے پہلے لوگ Personalised کروا رہے تھے اپنے نام یا تصاویر ان میں چسپاں یا کندہ کروا کر۔

"ہم ان مگ کو پرسنلائزڈ کروائیں؟"

ابھی وہ لیزا کی چابی والی حرکت ہی پر محظوظ ہو رہا تھا کہ وہ سامنے رکھے مختلف رنگوں اور ڈیزائنز کے مگوں کو دیکھ کر بولی۔

"کیا لکھوانا چاہتی ہو تم مگ پر؟" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ وہ صبح ناشتے کے دوران ماضی کو یاد کرتے ہوئے کتنے ڈپریشن میں چلا گیا تھا۔ کتنا مایوس اور کتنا اداس ہو گیا تھا۔ اب اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ لیزا کے ساتھ ان بچکانہ سی چیزوں کو لیتا خوش ہو رہا تھا' اسے اچھا لگ رہا تھا جیسے لیزا سولہ سال کی دوشیزہ تھی اور وہ سترہ سال کا نوعمر لڑکا۔

"مسٹر اینڈ مسز سکندر۔" لیزا نے مگ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے "فوراً" ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسے اس پر کیا لکھوانا ہے۔ اس نے دو مگ اٹھا لیے تھے۔ اب وہ کاؤنٹر پر کھڑی سیلز مین سے انہیں مسٹر اینڈ مسز سکندر کندہ کاری کر کے لکھنے کو بول رہی تھی۔ جتنی دیر سیلز مین نے مگوں پر کندہ کاری کی' وہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ سیلز مین مگوں پر نام کندہ کر چکا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"
لیزا مگ ہاتھ میں لے کر اس سے پوچھنے لگی۔
"مجھے یقین نہیں آرہا' میں آرٹ کی اتنی قد آور شخصیت سے شادی کرنے جارہا ہوں۔ لگ تو ایسا رہا ہے 'میری شادی کسی سولہ' سترہ سال کی بچی سے ہونے والی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ ڈیکوریشن پیس کے لیے لیزا نے پے کیا تھا اور مگوں کا اس نے۔ شاپنگ بیگ ہاتھ میں لیے وہ دونوں شاپ سے باہر نکلے تب وہ لیزا سے بولا۔
"کبھی کبھی انسان کو بچہ بننا چاہیے۔ بچوں جیسی حرکتیں بھی کرنی چاہئیں۔ اب جو تم ہر وقت ساٹھ' ستر سال کے بزرگ بنے رہتے ہو ئیں تو اس پر کچھ نہیں کہتی۔ تو تم کیا میری خاطر تھوڑی دیر کے لیے میرے بچپنے کو انجوائے نہیں کرسکتے؟"
وہ لیزا کو ساتھ لیے شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں آگیا۔ وہاں فوڈ کورٹ کے ساتھ بچوں کے لیے Playing ایریا بھی تھا اور ان ڈور آئس اسکیٹنگ کی سہولت بھی۔
"مجھے تمہارا بچپنا بہت اچھا لگ رہا ہے لیزا... ! ان فیکٹ مجھے بہت مزا آرہا ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔
لیزا بھی جواباً" مسکرائی تھی۔
"کیا کھاؤ گی؟"
"کچھ بھی کھلا دو۔"
"برگر کھاؤ گی یا پھر ٹیمپورا یا پھر سوشی؟" وہ دونوں فوڈ کورٹ میں مختلف مشہور ہوٹلز اور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹس کے کاؤنٹرز کے سامنے سے گزر رہے تھے۔
"میرا خیال ہے سوشی اور ٹمپورا ٹھیک ہے۔"
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں وہاں ایک میز پر اپنا اپنا کھانا لے کر بیٹھ گئے تھے۔
"تمہارے پاس کوئی پاکستانی ڈریس نہیں ہوگا ناں؟" ٹیمپورا کھاتے ہوئے اس نے لیزا سے پوچھا۔
"نہیں' کیوں؟" پوچھتے پوچھتے جیسے اسے از خود ہی سمجھ میں آگیا تھا کہ سکندر اسے اپنی ماں سے ملوانے پاکستانی لباس میں لے جانا چاہتا ہے۔

"ہم ابھی خرید لیں گے کھانے کے بعد۔ یہاں ہوں گی ناں پاکستانی اور انڈین بوتیکس؟" اس نے سکندر سے پوچھا۔ اس نے جواباً" اثبات میں سر ہلایا۔
"تمہاری اموجان کیسی ہیں' میرا مطلب ہے دیکھنے اور عادت میں۔" وہ اسے اپنی ماں سے ملوانے پاکستان لے جارہا تھا تو اس کا دل چاہا' وہ سکندر سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھے۔
"بہت حسین' بہت خوب صورت۔ تم انہیں دیکھو گی تو وہ تمہیں بھی بہت اچھی لگیں گی۔ آہستہ آواز میں اتنی نرمی سے بولتی ہیں وہ۔ میں نے انہیں کبھی چیختے چلاتے اور غصے میں نہیں دیکھا۔ پتا ہے وہ ڈاکٹر ہیں۔ مگر اپنے گھر اور بچوں کے لیے انہوں نے اپنی ڈگری کی قربانی دے دی' کبھی میڈیکل پریکٹس نہیں کی۔"
ماں کے بارے میں بولتے ہوئے اس کے چہرے پر از خود ہی نرمی اور محبت بکھر گئی تھی۔ وہ بہت جذباتی سا ہو کر بول رہا تھا۔
"تم انہیں اموجان کہتے ہو ناں؟"
"ہاں۔" بولتے ہوئے وہ مسکرایا۔ "بچپن میں میں نے ہی انہیں اس نام سے بلانا شروع کیا تھا۔ اموجان بچپن میں ہمیں بہت کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ کبھی کتابوں میں سے پڑھ کر' کبھی خود ان کی بچپن میں سنی کہانیاں ایک بار انہوں نے ایک کہانی سنائی تھی جس میں بچہ' اپنی ماں کو اموجان کہتا تھا اور اس میں ماں کا کردار مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تب شاید میں چار یا پانچ سال کا تھا۔ تب خود بخود ہی میں نے انہیں ممی کہنا چھوڑ کر اموجان بلانا شروع کردیا تھا اور میری دیکھا دیکھی ......"
بے دھیانی میں بولتا بولتا وہ یک لخت ہی خاموش ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی آگئی تھی۔
"بہت خوب صورت نام ہے اموجان۔" لیزا نے فوراً" ہی مسکرا کر کہتے ہوئے یوں ظاہر کیا جیسے اس کا بولتے بولتے چپ ہو جانا اور وہ بے سوچے سمجھے کیا بولنے جارہا تھا' سمجھا ہی نہ ہو۔ وہ پھیکے سے انداز میں

مسکرایا۔ یہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی وہ بہت کوشش کر کے اپنے چہرے پر لاپایا تھا۔

"اور کچھ بتاؤ ناں اپنی اموجان کے بارے میں 'میں انہیں اچھی لگوں گی ناں؟"

"تم انہیں بہت اچھی لگو گی۔ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔ تم تو ہو ہی بہت خوب صورت' لیکن اگر میں نے کوئی عام سی لڑکی بھی اپنے لیے پسند کی ہوتی۔ وہ اسے بھی پسند کرتیں' کیونکہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔" لیزا اس کی بات پر مسکرائی تھی۔

"تمہاری باتوں سے مجھے لگ رہا ہے 'تمہاری امو جان بہت اچھی ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے 'میں ان سے جلدی سے ملوں۔"

"میرا بھی دل چاہ رہا ہے۔ پتا ہے میں اس سے پہلے ان سے چار سال قبل ملا تھا۔ تب وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں۔ ان کی سرجری ہوئی تھی۔ اس پوری رات میں ان کے ساتھ رہا تھا۔ اس روز میں پورے آٹھ سالوں بعد ان سے ملا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں میرا ان سے کسی بھی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے یاد کر کر کے اتنی بیمار پڑ گئی تھیں۔ ان کی صحت ابھی بھی زیادہ ٹھیک نہیں رہتی۔"

اس کے لہجے میں ماں کی محبت اور ان کی صحت کی فکر شامل تھی۔

"کیا خدانخواستہ کینسر؟" لیزا نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں! اس کا الحمدللہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر دو تین مہینے بعد اس حوالے سے ان کے ٹیسٹ وغیرہ اور ڈاکٹر کے پاس تفصیلی چیک اپ ہو جاتا ہے۔ اس طرف سے اطمینان ہے۔ مگر ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ کبھی بلڈ پریشر' کبھی شوگر' کبھی کولیسٹرول کبھی کچھ اور' کچھ نہ کچھ صحت کا مسئلہ انہیں مسلسل رہتا ہے۔ اپنی صحت کے متعلق وہ مجھے زیادہ بتاتی نہیں ہیں' مگر مجھے پتا ہے' وہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ میں نے انہیں چار سالوں سے دیکھا نہیں ہے لیزا۔" لیزا نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔

"فکر مت کرو۔ وہ بالکل ٹھیک ہوں گی اور تمہارے آنے کا جان کر بہت خوش ہوں گی۔ تم ان سے ملو گے تو ان کی طبیعت اپنے آپ بہتر ہو جائے گی۔"

لیزا مسکرا کر اسے یقین دلا رہی تھی۔ اس نے جواباً" مسکرا کر سر ہاں میں ہلایا تھا۔

فوڈ کورٹ سے اٹھ کر وہ دونوں اسی مال میں موجود ایک بوتیک میں آگئے تھے۔ وہاں انڈین اور پاکستانی ملبوسات موجود تھے۔ پسند لیزا نے کیا تھا۔ دلوایا اس نے تھا۔ کڑھائی کی ہوئی پنک کلر کی خوب گھیر والی فراک' چوڑی دار پاجامے اور دوپٹے کے ساتھ۔ اس نے اس کے علاوہ بھی لیزا کو کافی کچھ دلوایا تھا۔

"تمہارے بہت پیسے خرچ ہو گئے ناں؟"

دل بھر کر شاپنگ کرنے کے بعد جب وہ دونوں مال سے باہر نکل رہے تھے تب وہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔ وہ اس کی اس مصنوعی معصومیت پر مسکرایا۔

"پتا ہے لیزا! تمہارے لیے کچھ خرید کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار خود سے وابستہ کسی رشتے کے لیے کچھ خرید رہا ہوں۔ مجھے اپنے اندر بڑی نئی سی خوشی اور زندگی کی امنگ محسوس ہو رہی ہے۔"

اس سے دل کی باتیں کہنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب جو وہ سوچتا تھا' جو محسوس کرتا تھا' بے جھجک اس سے شیئر کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اسی بوتیک سے اپنی اموجان کے لیے بھی ایک قیمتی جوڑا خریدا تھا۔ پسند لیزا کی تھی۔

اب لیزا کو دوہا کا سی سائڈ دیکھنا تھا۔ ڈھیر ساری شاپنگ کر کے وہ دونوں فارغ ہوئے تو سہ پہر کا اختتام اور شام کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔

وہ اسے لے کر Corniche پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ وہاں حسب معمول جاگنگ ٹریک پر لوگ جاگنگ کر رہے تھے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرنے کے لیے بنائی گئی خوب صورت روش پر لوگوں کی ایک

بڑی تعداد چہل قدمی کرتی نظر آرہی تھی۔ پام کے درختوں کی چھاؤں میں بینچوں پر بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کثیرالمنزلہ اور جدت کی حامل عمارتوں کا منظر بھی بہت خوب صورت نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں وہاں چہل قدمی کرنے لگے۔

"ہم نے ایک بات ابھی تک طے نہیں کی۔" آہستہ قدموں سے چلتے اس نے لیزا سے کہا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟"

"تمہاری جاب۔ تمہاری جاب کا کیا ہوگا؟ میں نے تم سے پوچھے بغیر از خود یہ فرض کرلیا کہ تم لندن چھوڑ کر روما آجاؤ گی۔"

"ہاں تو ٹھیک سوچا تم نے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو کیا تم اپنی جاب چھوڑ دو گی؟ تمہاری جاب بہت اچھی ہے لیزا۔"

"مگر جس سے میں شادی کررہی ہوں وہ بھی تو بہت اچھا ہے۔" وہ اسی کی ٹون میں فوراً بولی تھی۔

"جاب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے سینور سکندر! میں ایک کامیاب آرٹسٹ ہوں۔ شادی کے بعد گھر سے اور تم سے بچ جانے والے ٹائم میں پینٹنگز بنایا کروں گی' اپنی ایگزیبشنز کی تیاریاں کیا کروں گی اور اگر مجھے لگا کہ مجھے گھر پر بوریت ہورہی ہے' ٹائم نہیں گزرتا تو میں یہاں روما میں کسی آرٹ اسکول یا کالج میں جاب کرلوں گی۔"

"مگر تمہیں اپنی لندن میں جاب بہت پسند ہے۔ تم صرف اپنی اس بہترین جاب کی وجہ سے لندن چھوڑ کر روما میں سیٹل نہیں ہوتیں' صرف سال کے دو مہینے روما میں گزارتی ہو۔ اگر روما سے اتنی محبت کے باوجود تم لندن میں اپنی جاب چھوڑ کر روما میں سیٹل نہیں ہوئیں تو کیا یہ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی کہ تم میری خاطر اپنی بہت اچھی جاب چھوڑ دو؟"

وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں سینور سکندر! کہ تمہاری خاطر کچھ بھی کرسکتی ہوں' تمہاری خاطر کچھ بھی اپنا سکتی ہوں' تمہاری خاطر کچھ بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

وہ بہت شدت اور سچائی سے بولی۔ اس کا لفظ لفظ اس کے دل میں چھپی اس کی محبت کا شدتوں سے اظہار کررہا تھا۔ ایک پل اس کی طرف دیکھتے رہنے اور اس کی والہانہ محبت کو محسوس کرنے کے بعد یک دم ہی اس کا دل شرارت پر آمادہ ہوا۔ جیسے یک دم ہی بہت خوش ہو کر دل شریر ہوا تھا۔

"تم میرے لیے کیا کیا چھوڑ سکتی ہو؟"

"کچھ بھی۔"

"تم میرے لیے پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روما جانا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ پچھلی بار ہی کی طرح شرارتی انداز میں سوالات دہرا رہا تھا اور وہ رٹے رٹائے انداز میں بغیر سوچے فوراً "ہاں" کہہ رہی تھی۔

"اگر تم میری خاطر یہ دو چیزیں چھوڑ سکتی ہو تو اس کا مطلب ہے تم سچے دل سے مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا۔ لیزا بھی جواباً "ہنسی تھی۔

☆ ☆ ☆

آمنہ زیورات کے ڈبے اور ایک خوب صورت صندوقچی نما جیولری باکس' جس میں ان کے پرانے زیورات رکھے تھے' نکال کر بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ ڈبوں میں قدرے نئے ڈیزائن کے ان کے زیورات جبکہ صندوقچی میں ان کے خاندانی زیورات تھے۔ کل برسوں بعد ان کا سکندر ان سے ملنے آرہا تھا' ان کی ہونے والی بہو کو ان سے ملوانے کے لیے۔ وہ کل اپنے بیٹے اور اپنی ہونے والی بہو سے ملیں گی۔ وہ اپنی بہو کو اپنے زیورات میں سے کوئی زیور دینا چاہتی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں۔ بیٹے سے ملنے کی خوشی نے ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ لبوں پر خوشی سے بھری مسکراہٹ لیے مختلف زیورات دیکھ رہی تھیں۔

انہوں نے وہ جڑاؤ کنگن اٹھائے جو انہیں منہ دکھائی میں شہریار خان نے دیے تھے اور اس سے پہلے شہریار خان کے والد نے ان کی والدہ کو۔ یہ ان کے خاندانی اور بہت قیمتی کنگن تھے۔ یہ انہوں نے نویرہ کو نہیں دیے تھے۔ یہ انہوں نے اپنے سکندر کی دلہن کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ وہ اپنی ہونے والی بہو کو اپنی یہ بہت خاص اور اہم چیز دینا چاہتی تھیں۔ اپنے اس بیٹے کو وہ بہت کچھ نہیں دے سکی تھیں جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ کنگن کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا ایک جڑاؤ ہار اور کئی لڑیوں والی وزنی مالا بھی سکندر کی بیوی کو دینے کے لیے اچھی لگ رہی تھی۔

وہ زیورات دیکھنے میں مگن تھیں، تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ شہریار خان اندر آئے تھے۔ وہ اسٹڈی میں تھے۔ وہ آج دفتر سے گھر جلدی آگئے تھے۔ آنے کے بعد سے وہ اسٹڈی میں تھے۔ انہوں نے کافی بھی وہیں منگوائی تھی۔ وہ اسٹڈی میں مطالعے میں مصروف ہیں یہی سوچ کر آمنہ یوں زیورات بکھیر کر بیٹھ گئی تھیں۔

شہریار خان کو اندر آتے دیکھ کر ان کا چہرہ فوراً" سنجیدہ ہو گیا۔ انہوں نے قدرے محتاط سے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ چاہیے تھا آپ کو؟"

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے جواب دے کر بیڈ پر اپنی سونے کی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔

وہ سنجیدگی سے سر جھکا کر زیورات واپس صندوقچی میں رکھنے لگیں۔ اپنے جذبات، اپنی سوچیں شوہر سے شیئر کرنے والا ان کا تعلق ہی نہیں تھا۔ شوہر سے دکھ سکھ کہنے والا ان کا رشتہ ہی نہیں تھا۔ ساری زندگی شوہر نے فیصلے سنائے تھے، انہوں نے سر جھکا کر تعمیل کی تھی۔ سوال کرنے یا وجہ پوچھنے کی کبھی جرأت ہی نہیں کی تھی۔

شہریار خان جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہی ہیں، وہ جانتے تھے کہ کل سکندر آنے والا ہے، مگر وہ شوہر کے مزاج کو سمجھتی تھیں۔ جانتی تھیں وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی کہے بغیر یا تو ٹی وی دیکھنے لگیں گے یا پھر آرام کرنے لیٹ جائیں گے۔ سینے میں جیسے ایک دل نہیں، پتھر تھا شہریار خان کے۔

شہریار خان بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ بیڈ پر ٹیک لگا کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے تھے۔

"یہ زیور سکندر کی بیوی کے لیے نکال رہی ہو؟"

شہریار خان سنجیدگی سے ان سے مخاطب ہوئے تھے۔ سکندر کا نام اور یہ جملہ ان کے لبوں سے سن کر آمنہ نے بے طرح چونک کر شدید حیرت کے عالم میں انہیں دیکھا۔ وہ زیور واپس رکھنا بھول گئی تھیں۔ مارے حیرت کے وہ جواب میں فوراً" کچھ بول بھی نہیں پائیں۔ ایک دو سیکنڈ بعد انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم جیولر کو بلا کر کچھ نئے زیورات خرید تیں اسے دینے کے لیے؟"

"یہ سکندر کی دادی، پڑدادی، نانی اور میرے زیورات ہیں۔ مجھے لگا اس چیز سے وہ زیادہ خوش ہو گا۔"

وہ ابھی تک حیرت کے عالم میں تھیں۔ شہریار خان انتہائی سنجیدگی سے اپنے مخصوص نپے تلے اور غیر جذباتی انداز میں گفتگو کر رہے تھے مگر آمنہ تو ان کے لبوں سے سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کا ذکر سن کر ہی شاک میں تھیں۔ شہریار خان نے ان کی توجیہہ پر سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، یہ زیور بھی دے دینا۔ مگر کل میں جیولر کو بھی فون کر دوں گا۔ کچھ نئے زیور بھی خرید دو اس کی بیوی کے لیے۔"

شہریار خان پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے نہ ٹی وی کھولا تھا اور نہ ہی آرام کرنے لیٹے تھے۔ انہیں اندازہ ہوا، وہ ان سے مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔

"آمنہ! میں تم سے کل کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو

دیکھا۔

"تم نے سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کو ملنے کے لیے کراچی بلایا ہے' تم ان دونوں سے ملنا چاہتی ہو۔ ٹھیک ہے' یہ بہت اچھی بات ہے مگر میری رائے میں یہ قطعاً" مناسب نہیں ہو گا کہ تم ان دونوں سے ملنے ان کے ہوٹل جاؤ یا کہیں اور باہر ملو۔ وہ نئی لڑکی جو فارنر بھی ہے' کیا سوچے گی ہمارے خاندان کے بارے میں؟ تم ان دونوں کو گھر پر بلاؤ۔ دوپہر کا یا رات کا کھانا کھائیں وہ دونوں ہمارے گھر پر۔"

تو بیٹے کی محبت نے دل میں جوش نہیں مارا تھا خاندانی آن بان نے دل کو بے چین کیا تھا۔ پل بھر کے لیے جو دل خوش فہم ہوا تھا کہ شاید برسوں بعد لوٹنے والے بیٹے کے لیے باپ کا دل گداز ہو گیا ہے "فوراً" ہی وہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ انہوں نے افسوس بھری نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔ اگر اللہ کسی کے دل سے نرمی اور محبت نکال دے تو انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسے شہریار خان۔ دل چاہا تھا انہیں جھنجھوڑیں' پوچھیں کہ کیا دل نام کی کوئی چیز ان کے سینے میں موجود بھی ہے؟ بیٹے کی زندگی برباد کر دی اور آخر میں فکر رہی تو اپنی جھوٹی آن' بان اور شان کی!

"وہ گھر نہیں آئے گا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آنے پر اس شرط پر راضی ہوا ہے کہ میں اسے گھر نہیں بلاؤں گی۔"

وہ نظریں جھکا کر بظاہر زیورات کو ڈبوں میں رکھتے محتاط لہجے میں بولی تھیں۔ ایک دو سیکنڈ شہریار خان کا جواب سنائی نہ دیا تو انہوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔

"ٹھیک ہے تو یوں کر لیتے ہیں' ان دونوں کو کل ہمارے فارم ہاؤس پر بلا لو۔ میں' تم' نویرہ اور علی وہاں جائیں گے۔ زین نہ جانا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ میں غلام احمد سے کہہ دیتا ہوں' وہ کسی اچھے ہوٹل کو کھانے کا آرڈر کر دے گا۔ تم کھانے میں جو بھی ڈشز رکھوانا چاہتی ہو یا باربی کیو وغیرہ کروانا چاہتی ہو' وہ سب غلام احمد کو بتا دینا۔ اس لڑکی پر ہمارے خاندان کا اچھا تاثر پڑنا چاہیے۔ اسے پتا چلنا چاہیے کہ وہ کس بڑے خاندان کی بہو بننے جا رہی ہے۔"

شہریار خان کا مغرور' دوٹوک انداز آمنہ کے دل میں کئی چبھتے ہوئے سوال اٹھا رہا تھا۔ وہ پوچھنے کی جرأت نہ رکھتی تھیں ورنہ ضرور پوچھتیں' طنزیہ لہجے میں۔ "اپنے بیٹے کو گھر سے بے دخل کر کے' اسے سڑک پر لے جا کر کھڑا کر کے آج انہیں اچانک وہ اپنے خاندان کا حصہ لگنے لگا ہے؟ صرف اس اٹالین لڑکی اور اس کی فیملی کے سامنے اپنی آن' بان اور خاندانی شوکت جتانے کو۔ وہ لڑکی سکندر کی ماں سے کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں مل کر کہیں ان کے خاندان کو کوئی معمولی خاندان نہ سمجھ بیٹھے۔

بیٹے کی زندگی تباہ و برباد کر کے بھی کچھ اہم رہا تو خاندان؟ اس کی ایک غلطی کی اسے اتنی کڑی سزا دے ڈالی؟ اس کی زندگی اندھیروں میں دھکیل دی۔ اسے برباد کر دیا۔ ان سے' آمنہ شہریار خان سے ان کا بیٹا چھین لیا۔ ماں کی گود اجاڑ دی۔ اور آج بھی چہرے پر کوئی پچھتاوا' کوئی دکھ نہیں؟ فکر ہے تو اپنے خاندانی جاہ و جلال کی؟"

"ٹھیک ہے' میں اس سے کہہ دوں گی۔"

کہیں ان کے چہرے پر بکھرے سوال اور شکایتیں وہ پڑھ نہ لیں' اس خوف سے وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولی تھیں۔

✡ ✡ ✡

شام ڈھل چکی تھی جب وہ دونوں سارا دن گھوم پھر کر اس کے فلیٹ لوٹے تھے۔

"میں نے ابھی تک اپنی پیکنگ نہیں کی ہے۔ تم چاہو تو تھوڑی دیر ریسٹ کر لو۔ میں پیکنگ کر لوں؟" واپس آنے کے بعد وہ اس سے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے' تم پیکنگ کرو۔ میں ہم دونوں کے لیے مزے دار سی کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

باہر گھومنے پھرنے میں وہ دونوں وقتاً" فوقتاً" اتنا کچھ

کھا چکے تھے کہ اب ان دونوں میں سے کسی کا بھی ڈنر کا ارادہ نہیں تھا۔ واپس آتے ہی لیزا نے شاپنگ بیگ میں سے دونوں مگ اور چابی نکالی تھی۔ اس نے خود ہی وہ چابی اس کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر سجا دی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ہنسا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی لے کر کمرے میں آئی تو کافی ان ہی مگوں میں تھی جن پر مسٹر اینڈ مسز سکندر لکھا ہوا تھا۔ اس نے بیڈ پر سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ وہ اس میں اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ اس نے کراچی میں ہوٹل میں روم کی بکنگ بھی یہیں سے کروالی تھی۔ لیزا کا اسے پتا تھا کہ وہ اپنے بابا کے گھر پر ٹھہرے گی۔

"سیم آئے گی مجھے ایرپورٹ لینے۔ یہاں آتے ہوئے میں نے اسے فون کرکے اپنی فلائیٹ اور کراچی پہنچنے کا وقت بتا دیا تھا۔" وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کافی پینے کے لیے اس نے بھی تھوڑی دیر کے لیے پیکنگ کا کام روک دیا تھا۔ وہ لیزا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو اپنی بہن کے ذکر پر جگمگا اٹھا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے موبائل پر کال آرہی تھی۔ یہ اس کی امو جان کی کال تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔ اسے ماں سے ملنے کی بہت خوشی تھی مگر ساتھ ساتھ دکھ اور ذلت بھرے کچھ احساسات بھی تھے۔ وہ ماں کے گلے لگنا چاہتا تھا۔ ایک ماں ہی تھی جس نے اس سے محبت کرنا کبھی نہیں چھوڑی تھی۔ ان کا دل اپنے گناہ گار بیٹے کے لیے وسیع تھا۔ وہ بیٹے کا گناہ کب کا معاف کر چکی تھیں۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ پوری دنیا میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہہ دیتا کہ سکندر نے وہ گناہ نہیں کیا تھا۔ اسے بھروسا اور اعتماد ماں کے پاس بھی نہ مل سکا تھا مگر یہ کیا کم تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھیں، اسے دل و جان سے چاہتی تھیں، اس کے انتظار میں دن گن گن کر گزار رہی تھیں، وہ اس کی واپسی کی راہ تک رہی تھیں۔

"کل کس وقت پہنچ رہے ہو بیٹا؟"

"صبح سویرے ان شاء اللہ۔"

"کس فلائیٹ سے آرہے ہو؟"

ان کے لہجے میں اس سے ملنے کی تڑپ تھی، بے قراری تھی۔ وہ ان کی بے قراری کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے انہیں اپنی فلائیٹ اور کراچی پہنچنے کا وقت بتا دیا تھا۔

"یہ چند گھنٹے کیسے گزریں گے سکندر؟ مجھے تو ایک ایک پل صدیوں کے برابر لگ رہا ہے۔ تم تھوڑے دن کراچی میں رکو گے تو ناں؟ ایسا تو نہیں ہوگا کہ کل آئے اور پرسوں واپسی؟"

وہ بہت بے چین ہو کر بولی تھیں۔ جیسے برسوں سے بچھڑے بیٹے کو دیکھنے، اسے چھونے اسے پیار کرنے کو ان کی ماممتا بری طرح تڑپ رہی ہو۔

"جی امو جان! میں تھوڑے دن رکوں گا کراچی میں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے تشکر بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی لیزا کو دیکھا تھا لیزا کے کہنے پر اس نے ایک ہفتے کا پروگرام بنایا تھا۔ ورنہ شاید اس وقت انہیں یہ بتا کر کہ وہ محض دو یا تین دنوں کے لیے آرہا ہے۔ وہ ماں کے دکھے ہوئے دل کو مزید دکھانے کا باعث بنتا۔ لیزا مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھ سے بہت ساری دیر کے لیے ملو گے ناں؟ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں بیٹا! تمہیں جی بھر کر دیکھنا ہے۔"

ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ بولتے بولتے ایک دم یوں چپ ہوئی تھیں جیسے خود کو رونے سے روک رہی ہوں۔

"میں آپ سے بہت ساری دیر کے لیے ملوں گا امو جان۔ جب تک کراچی میں ہوں گا ہم روز ملیں گے اور بہت ساری باتیں کریں گے۔"

وہ ماں کا کرب محسوس کرتے ہوئے رسانیت سے بولا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین' سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار' سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم' زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں امو جان رو' رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں' وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے' ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوبئی چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم' محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوبئی میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوبئی آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے' اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

ام مریم ہاشم کی بیوی کو طلاق دلوا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر بڑی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔

سکندر نے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدی۔ لیزا' خالد محمود کو اور سکندر امو جان کو اپنی شادی کے فیصلے سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ امو جان سکندر سے ملنے پر اصرار کرتی ہیں۔ وہ وعدہ کر لیتا ہے۔ لیزا کی ایگزیبیشن ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دوبئی میں پورا دن سکندر کے ساتھ گزارتی ہے۔ سکندر اس کو شاپنگ کرواتا ہے۔ دوبئی سے وہ کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔ شہریار خان آمنہ بیگم سے لیزا کے لیے زیورات خریدنے کو کہتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

۱۰
دسویں قسط

"کراچی سے واپس آکر ہم فوراً" شادی کرلیں گے۔ میں اب تمہیں لندن یا روم واپس نہیں جانے دوں گا۔"

وہ دونوں ایرپورٹ جانے کے لیے فلیٹ سے نکل رہے تھے تب وہ لیزا کا ہاتھ تھام کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی شدت تھی۔

"دیکھا میری محبت کا اثر۔ تم بھی رومانٹک ہوتے جارہے ہو۔" وہ ہنس کر بولی۔

"تمہارے جیسا رومانٹک میں ابھی بھی نہیں ہوا۔ پرسنلائزڈ مگ یا "کی ٹو مائی ہارٹ والا..." وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"یعنی میں یہ سمجھوں کہ تم ہماری شادی والے دن آفس جاؤ گے اور مجھے ہنی مون پر بھی نہیں لے کر جاؤ گے؟" اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورا۔

"ہوسکتا ہے 'ایسا ہی ہو۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولا۔

"کرکے تو دیکھو تم ایسا۔ حشر کردوں گی میں تمہارا۔"

"ہونے والے شوہر کی کیا ریسپیکٹ کی جارہی ہے 'جان اللہ..." وہ اس کی دھمکی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆ ☆ ☆

اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ تمام دن اس سے اس موضوع پر کسی نے بات نہیں کی تھی 'پھر بھی وہ جانتا تھا کل صبح سکندر' اموجان سے ملنے کراچی آرہا ہے۔ اس نے آج شہریار خان کو نوریہ سے گفتگو کرتے بھی سنا تھا جو وہ کل سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کی فارم ہاؤس پر دعوت کے انتظامات کے حوالے سے کررہے تھے۔

شہریار خان کو اموجان کی بیماری نے انہیں اس حد تک توڑ دیا تھا کہ وہ ان کا دل خوش کرنے کے لیے سکندر کی شکل دیکھنے کو راضی ہوگئے تھے؟

جو بھی ہو 'کم از کم وہ سکندر کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور بچے کے بھی وہاں جانے پر اعتراض تھا مگر آج بھی ان کے گھر میں حکم شہریار خان ہی کا چلتا تھا۔ اگر وہ ان کے حکم کے خلاف جاکر اپنی بیوی اور بچے کو روک لیتا تو یقیناً "شہریار خان سخت غصے اور برہمی کا اظہار کرتے اور اموجان 'جو برسوں بعد اتنی خوش نظر آرہی تھیں' ان کی خوشی دکھ اور آنسوؤں میں بدل جاتی۔ لہٰذا نوریہ اور علی کے کل شہریار خان اور اموجان کے ساتھ فارم ہاؤس جانے پر اس نے خاموشی اور بے نیازی والا رویہ اختیار کرلیا۔

بہت کڑوی سچائی تھی یہ مگر تھی سچائی 'اسے ماننی پڑ رہی تھی کہ اس نے پورے بارہ سال بعد اپنی اموجان کو اتنا خوش دیکھا تھا۔ اتنا خوش وہ اس کے ہارورڈ سے لاء پاس کرلینے پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی شادی پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ علی کی پیدائش پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سبب یہ خوشی تھی 'اس سے اسے جتنی بھی نفرت تھی مگر اپنی ماں کی ہنسی اور ان کی خوشی اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہ ماں کے دل کی یہ خوشی اور چہرے کی یہ ہنسی سدا قائم دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی اور بچے کو ماں باپ کی خاطر سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے ملنے دے سکے 'اتنی وسعت وہ کوشش کرکے اپنے اندر پیدا کرچکا تھا۔

سکندر کو نفرت سے سوچتے ہوئے آج پھر اسے ام مریم بری طرح یاد آرہی تھی۔ کہاں ہوگی وہ؟ سکندر شہریار صرف اس کا نہیں' وہ ام مریم کا بھی مجرم تھا۔ اس کے تصور میں بار بار بارہ سال پہلے کا وہ دن آرہا تھا' جب ام مریم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی تھی۔

جس کے سبب وہ اس سے جدا ہوئی وہ شخص آنے والی صبح واپس آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں جہاز میں ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاز میں بیٹھتے ہی سکندر بالکل گم صم اور چپ چپ سا ہوگیا تھا۔ وہ اسے ڈسٹرب نہیں کررہی تھی۔ وہ جانتی تھی 'سکندر اس وقت اپنی اموجان کو سوچ رہا ہے۔ وہ آج برسوں

بعد ان سے ملنے والا ہے۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہو گی۔ چار سال قبل وہ ان کی شدید بیماری میں ان سے ملا تھا۔ آج وہ نجانے کتنے سارے احساسات ایک ساتھ اپنے دل میں پیدا ہوتے محسوس کر رہا ہو گا۔ اسے اپنا تلخ اور غم سے بھرا ماضی بھی شدت سے یاد آ رہا ہو گا۔ سکندر کو شاید اس وقت خاموشی درکار تھی سوا سے خاموشی فراہم کر کے وہ خود سیم کو سوچنے لگی تھی۔

سیم اس سے خفا تھی۔ اس نے روم سے دوبارہ روانہ ہونے سے قبل اسے کال کر کے اپنی کراچی آمد کا ٹائم بتایا تھا۔ اس نے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ فون بھی فوراً" ہی بند کر دیا تھا۔ محمود خالد نے یہ جاننے کے لیے وہ کب اور کس فلائٹ سے کراچی پہنچ رہی ہے' فون کیا تو اس نے ٹائم نہیں بتایا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ ابھی اس نے سیٹ بک نہیں کروائی ہے۔ خواہش تھی اسے ایئرپورٹ پر لینے صرف اور صرف سیم آئے۔

سیم سے ایئرپورٹ پر مل کر پھر وہ محمود خالد کے گھر چلی جائے گی۔

اس روز فون پر وہ محمود خالد کی جذباتی باتوں کے حصار میں آ گئی تھی۔ بعد میں روم جا کر جب اس نے سوچا تو اسے لگا' سیم ٹھیک کہتی ہے ان کے پاپا کو ان بہنوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے آتے ہیں۔ اس سے جذباتی انداز میں باتیں کر کے اسے اس بات کے لیے آمادہ کروا لیا کہ وہ کراچی آ کر ان کے پاس ٹھہرے۔ وہ ان کے گھر پر ٹھہرے گی ضرور مگر اپنی زندگی کے کسی بھی معاملے میں انہیں آج بھی ایک لفظ نہیں کہنے دے گی۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ساری رات ایک پل کے لیے بھی انہوں نے پلکیں تک نہیں جھپکیں۔

"اس وقت سکندر ہوائی جہاز میں ہو گا۔۔۔ اور اس کے ساتھ لیزا بھی ہو گی۔" انہوں نے زیر لب بہت پیار سے یہ نام لیا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ فجر میں ابھی وقت تھا۔ سوچا' تہجد کی نماز ہی ادا کر لی جائے۔ وہ بغیر کوئی آہٹ' کوئی شور پیدا کیے بیڈ سے خاموشی سے کھڑی ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا آمنہ! نیند نہیں آ رہی کیا؟"

شہریار خان کی آواز پر وہ چونک کر مڑیں۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔

"جی۔" وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکیں کہ روز غم انہیں سونے نہیں دیتے تھے' آج خوشی میں انہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔ آج ان کی عید کا دن ہے۔ ان ماں بیٹے نے جو بن باس کاٹا ہے' آج اس کے ختم ہونے کا دن ہے۔

مختصر سا جی کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف جانے لگی تھیں' جب شہریار خان کی آواز نے انہیں روک لیا۔

"سکندر کس وقت پہنچ رہا ہے؟"

"پون گھنٹہ باقی ہے۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولیں۔

"کیا ایئرپورٹ جانا چاہتی ہو اس سے ملنے؟" آمنہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت سے شہریار خان کو دیکھ رہی تھیں۔

"جی' کیا میں چلی جاؤں؟" انہوں نے محتاط سے لہجے میں اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چلی جاؤ۔ مگر اتنی صبح سویرے تمہارا ڈرائیور کے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔" شہریار خان سنجیدگی سے بولتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

وہ بے تحاشا حیران ہوئی تھیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ اور شہریار خان ایئرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکل چکے تھے۔ شہریار خان گاڑی چلا رہے تھے۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے وہ دونوں ایئرپورٹ جلدی پہنچ گئے تھے۔

"سکندر سے آج شام پانچ' ساڑھے پانچ بجے فارم ہاؤس آنے کا کہہ دینا۔" ایئرپورٹ پہنچ کر وہ ان سے بولے۔

"جی۔ آپ بھی آ رہے ہیں کیا؟" آمنہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ شہریار خان نے گاڑی پارکنگ میں لے جا کر روکی۔

"نہیں ہم مل آؤ۔ میں تمہارا یہیں انتظار کر رہا ہوں۔"

ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ ارد گرد اندھیرے کے سبب وہ شہریار خان کے تاثرات ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ وہ سنجیدہ تو تھے مگر سنجیدگی کے ساتھ کچھ اور بھی تھا ان کے لہجے میں۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں۔ سر ہلا کر خوشی سے سرشار وہ گاڑی سے اتر گئیں۔ سامنے ہی انٹرنیشنل ارائیول نظر آ رہا تھا۔ بس کسی بھی لمحے ان کا سکندر ان کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگ رہی تھیں۔

"یا اللہ! مجھے خیریت سے میرے سکندر سے ملا دے۔" سامنے سے مسافر ٹرالیاں چلاتے باہر نکلتے نظر آ رہے تھے۔

وہ جو سامنے سے اس طرف آتا نظر آ رہا ہے۔ وہ ان کا سکندر ہی ہے۔ خوب صورت 'وجیہہ' بھرپور توانا مرد ان کا بیٹا۔ ان کا دل فخر اور خوشی سے بھر گیا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ نظر کی دعا پڑھ کر دور سے اس پر دم کی۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اس کے ساتھ چلتی لڑکی کو انہوں نے ابھی تک توجہ سے دیکھا نہیں تھا۔ ان کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ خوشی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

سکندر ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ ان کا بیٹا ان سے ملنے ان کے پاس آ چکا ہے۔ ایک پل انہیں خوشی سنبھالنے میں لگا تھا۔

اگلے پل وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سکندر نے اموجان کو دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی اس نے انہیں آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے والہانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ٹرالی لیزا کے پاس چھوڑ کر خود تیز قدم اٹھا کر ان تک پہنچا۔

"السلام علیکم اموجان۔" آمنہ نے بہت تڑپ کر اسے اپنے گلے سے لگایا تھا۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے مجھے میرے بچے سے ملوا دیا۔" وہ اسے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے گلے لگے ان کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ان کا مضبوط اور توانا بیٹا اپنی بیمار اور غم سے نڈھال ماں کو سہارا دیے کھڑا تھا۔ اس نے لیزا کا اپنے اور اموجان کے پاس آ کر کھڑا ہونا محسوس کیا تھا۔

"بس اموجان! اس طرح مت روئیں۔ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

اس نے پیار سے ان کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا۔ ماں کے آنسوؤں سے اس کا شانہ بھیگ چکا تھا۔ وہ ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا۔

"میں آ تو گیا ہوں آپ کے پاس۔ اب آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اس نے پیار سے ماں کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں بیٹا! یہ شکر گزاری کے آنسو ہیں۔" آمنہ نے والہانہ انداز میں اس کا ماتھا چوما۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔

"اموجان! آپ لیزا سے تو ملی نہیں۔" اس نے مسکرا کر اپنے ساتھ کھڑی لیزا کی جانب اشارہ کیا۔ آمنہ نے اب پہلی بار لیزا کو توجہ سے دیکھا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی!" لیزا نے فوراً" انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" لیزا کا سلام اگر ہچکچاہٹ اور تکلف لیے ہوا تھا تو آمنہ کا جواب اتنی ہی بے تکلفی اور والہانہ پیار لیے ہوا تھا۔ انہوں نے لیزا کو بھی اسی طرح گلے لگایا تھا۔ وہ خاموش کھڑا ماں کو لیزا کو گلے لگاتے اور پھر اس کا ماتھا چومتے دیکھ رہا تھا۔

"آنٹی نہیں' ماں ہوں تمہاری' جیسے سکندر کی

ہوں۔ مجھے امو جان بولو گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔" وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں لیزا کے چہرے کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

"جی امو جان۔" لیزا کی ہچکچاہٹ اور تکلف آمنہ کی والہانہ محبت کے آگے مسکراہٹ اور اپنائیت میں چند لمحوں میں بدل گئی تھی۔

"سکندر! میری بہو بہت پیاری ہے۔" لیزا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ لیزا کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی، وہ اس کی ماں کو یونہی اچھی لگتی کہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔

"آپ کس کے ساتھ آئی ہیں امو جان؟" اسے یک دم ہی خیال آیا۔

"تمہارے پاپا کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" آمنہ آہستگی سے بولیں۔ تمہارے پاپا کے الفاظ اسے بہت عجیب سے لگے تھے، درحقیقت اسے برے لگے تھے مگر برسوں بعد ماں سے ملنے پر وہ خوشی کے موقع پر کوئی بدمزگی والی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اب چلوں۔" اس کے چہرے کو پیار سے تکتے ہوئے وہ بولیں۔ انہوں نے پھر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ جانے کی بات کر رہی تھیں اور اس کے ہاتھ تھام کر کھڑی تھیں۔ جیسے ڈر تھا اگر اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پھر کہیں کھو جائے گا۔

"جی امو جان! آپ اب گھر جا کر آرام کیجیے۔ تھوڑا دن نکل آئے پھر ہم دوبارہ ملیں گے۔ کہیں ساتھ بیٹھ کر خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" اس نے دیکھا آمنہ اس کی بات سن کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔ ایک پل کی سوچ کے بعد انہوں نے سکندر کے بجائے لیزا کو مخاطب کیا۔

"لیزا بیٹا! تمہاری اور سکندر کی آج شام میری طرف سے دعوت ہے ہمارے فارم ہاؤس پر۔ شہر کی حدود سے ذرا باہر نکل کر ہے ہمارا فارم ہاؤس۔ اس لیے گھر سے تھوڑا جلدی نکل جانا۔ یہ وہاں کا ایڈریس ہے۔"

انہوں نے پرس سے ایک تہہ کی ہوئی چٹ نکال کر لیزا کے ہاتھ میں پکڑائی۔

"امو جان! دعوت وغیرہ کو رہنے دیں۔ میں اور لیزا اس کے بغیر ہی آپ سے مل لیں گے۔" وہ واضح اور صاف لفظوں میں منع نہیں کر پایا تھا۔

فارم ہاؤس پر کون دے رہا تھا۔۔۔ دعوت؟ وہاں پر کس کس نے موجود ہونا تھا۔۔۔ وہ سب جانتا تھا مگر وہ نہ کسی سے ملنا چاہتا تھا، نہ کسی کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں تم سے نہیں اپنی بہو سے بات کر رہی ہوں۔" آمنہ نے فوراً ہی اسے سخت انداز میں ڈانٹ کر چپ کروا دیا تھا۔

اب انہوں نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر بہت پیار سے لیزا کے ہاتھ تھامے تھے۔

"تمہاری سنتا ہے یہ؟"

"جی!" لیزا ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ کر جس پر واضح لفظوں میں کسی بھی دعوت اور فارم ہاؤس پر جانے سے انکار لکھا تھا۔ آمنہ سے قدرے ہچکچا کر بولی۔ وہ جیسے الجھن میں آگئی تھی کہ ماں کی سنے یا بیٹے کی طرف دیکھے۔

"تو پھر آج شام اسے ساتھ لے کر ہمارے فارم ہاؤس آجانا۔ میں تم دونوں کا شدت سے انتظار کروں گی۔" وہ بڑی امید سے لیزا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں اور سکندر آج شام آپ کے پاس ضرور آئیں گے امو جان!" لیزا نے بے اختیار انہیں یقین دلایا۔

"وعدہ کر رہی ہو ناں؟"

"میں آپ سے وعدہ کر رہی ہوں امو جان۔"

"مجھے مایوس مت کرنا۔ برسوں بعد مجھے کوئی خوشی ملی ہے۔ اس خوشی کو مایوسی میں مت بدلنا۔ میں بہت شدت سے منتظر رہوں گی تم دونوں کی۔"

"امو جان! ہم دونوں آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔" لیزا پر یقین لہجے میں محبت سے بولی۔

"جیتی رہو بیٹا! اللہ تمہارے وجود سے میرے بیٹے کے گھر کو سدا سجائے رکھے۔ تم دونوں کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔"

وہ ایک بار پھر والہانہ انداز میں لیزا کو پیار کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں نمی لیے وہ التجا کرتی نظروں سے سکندر کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے بے اختیار اسے پھر گلے لگالیا تھا۔

ان کی پُرنم سی آنکھیں بے آواز اس سے مخاطب تھیں۔ نہ ماں ایک لفظ بولی تھی' نہ جواب میں اس نے کچھ کہا تھا۔ بس نگاہیں نگاہوں سے مخاطب تھیں۔ اپنا درد اور کرب ایک دوسرے کو بتا رہی تھیں۔

"میں چلتی ہوں۔" چند سیکنڈز بعد خود پر قابو پا کر وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔

وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ لیزا انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ واپس پلٹ گئی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت تھا۔ لیزا اس کے ساتھ کھڑی خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

"آئم سوری سکندر! میں جانتی ہوں تم اموجان کی دعوت ایکسیپٹ نہیں کرنا چاہتے تھے مگر وہ جس طرح کہہ رہی تھیں' انہیں انکار کرنے کے لیے پتھر کا دل چاہیے تھا۔ وہ بہت دکھی ہیں سکندر! ان کا دل خوش کرنے کے لیے یہاں تک آگئے ہو تو اب وہ جہاں بلا رہی ہیں' صرف ان کا دل خوش کرنے کے لیے وہاں بھی چلو۔ اگر ہم نہیں گئے تو ان کا دل بہت دکھے گا۔ ہم نہیں گئے تو وہ کتنا روئیں گی۔"

لیزا نے اس سے آہستگی اور نرمی سے کہا۔ وہ پھیکے سے انداز میں سرہلا کر مسکرادیا۔

"ہم شام میں چل رہے ہیں ناں؟" لیزا نے امید سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ ایک تھکی ہوئی لمبی سانس لے کر بولا۔

"وسیم نہیں آئی تمہیں لینے؟ تم نے کہا تھا وہ تمہیں لینے آنے والی ہے۔" اس نے یک دم ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"ہاں پتا نہیں کیوں ابھی تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔" لیزا نے ارد گرد ہر طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔

"تم فون کرلو۔" لیزا سرہاں میں ہلا کر فوراً" ہی اپنی بہن کو فون ملانے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" کئی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی جب لیزا کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا' تب اس نے پوچھا۔

"بیل جا رہی ہے۔ مگر سیم کال ریسیو نہیں کر رہی۔ اس کے لینڈ لائن نمبر پر بھی کال ریسیو نہیں ہو رہی۔" اس نے دیکھا لیزا کے چہرے پر مایوسی آگئی تھی۔

"ہو سکتا ہے اس کی آنکھ نہ کھلی ہو۔" اس نے لیزا کو تسلی دینی چاہی۔

"میرے آنے پر اس کی آنکھ نہ کھلی ہو؟ تمہیں پتا ہے سکندر! سیم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار پاکستان آئی ہوں۔ میرا آنا سیم کے لیے اتنا معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا کہ وہ سوتی رہ جائے۔" وہ قدرے خفگی سے بولی۔

"لیکن اب تم اس طرح یہاں کھڑی تو نہیں رہ سکتیں ناں۔ چلو میں ہوٹل جاتے ہوئے پہلے تمہیں تمہارے پاپا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ وہاں جا کر تم پتا کرلینا کہ سیم تمہیں لینے کیوں نہیں پہنچ سکی۔"

سکندر رسانیت سے بولا۔ لیزا نے جواباً" سراثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا' لیزا کے چہرے پر مایوسی سی پھیل گئی ہے۔ وہ اپنی بہن کے ایئرپورٹ نہ آنے پر دکھی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سکندر نے کیب کرلی تھی۔ اس نے پہلے اسے اس کے پاپا کے گھر ڈراپ کیا' وہ خود اپنے ہوٹل چلا گیا۔

چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھولا۔ وہی اسے لاؤنج تک چھوڑ کر بھی چلا گیا اور اسی نے انٹر کام پر محمود خاور کو اس کی آمد کی اطلاع دی تھی کہ اتنی صبح ابھی وہاں نہ گھر کا کوئی فرد موجود تھا نہ ہی کوئی ملازم۔

"میری بیٹی آئی ہے۔" محمود خالد اور ان کے پیچھے عائشہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پاس آرہے

تھے۔ وہ ان دونوں کو آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ باپ کے گھر آئی تھی مگر دل میں ایسا لگ نہیں رہا تھا کہ اپنے باپ کے گھر ہے۔

محمود خالد کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری تھی۔ اس کے پاس آتے ہی انہوں نے محبت سے اسے گلے لگالیا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں اپنے آنے کا؟ میں تمہیں ایرپورٹ لینے آتا۔"

اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ جواباً چپ رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنی آمد کا فون پر نہ بتانے کی کیا توجیح دے۔ باپ کی بے تحاشا خوشی اسے مصنوعی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے ان کی آنکھوں میں نمی نظر آرہی تھی۔ اسے ہلکی سی ندامت ہوئی۔

"خیر تم آگئیں کلثوم! میرے لیے تو یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ آج کتنے سالوں بعد میں اپنی بیٹی کو دیکھ رہا ہوں۔" انہوں نے جیسے اس کی ندامت محسوس کر لی تھی۔ اس لیے فوراً" ہی مسکرا کر خوشی سے بھرپور انداز میں بولے۔ عائشہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کیسی ہیں آنٹی؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پتا ہے، محمود بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کل رات بھی دیر تک مجھ سے تمہاری ہی باتیں کرتے رہے۔ صبح صبح اچانک پہنچ کر تم نے ہمیں بڑا زبردست سرپرائز دیا ہے۔"

اس کے دل میں جاگا ندامت کا احساس محمود خالد اور عائشہ دونوں نے فوراً" ہی دور کر دیا تھا۔

"عائشہ! ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں کلثوم کو اس کا کمرا دکھا دوں۔" محمود خالد اس کا ہاتھ تھام کر بولے عائشہ نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آؤ بیٹا!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"تمہارا سامان میں ابھی کمرے میں رکھوا دوں گا۔"

وہ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے بولے۔ فون پر بات کرتے ہوئے جذبات کو سرد کر لینا، سرد و سپاٹ انداز اختیار کر لینا مختلف بات تھی۔ آمنے سامنے ان کی والہانہ چاہت کے اظہار کے سامنے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنا سرد انداز کس طرح برقرار رکھے؟

"جب میں نے یہ گھر خریدا تھا۔ تب ہی یہ کمرا تمہارے لیے منتخب کر کے اسے تمہارے لیے سجا لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا، میری آرٹسٹ بیٹی کے لیے یہی کمرا ہونا چاہیے۔ یہ دیکھو! یہاں کھڑکی سے باہر ہمارے لان کا کتنا خوب صورت منظر نظر آرہا ہے۔"

اس سے بولتے ہوئے انہوں نے کھڑکی پر سے پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکیاں کھلتے ہی لان کا سر سبز اور خوب صورت منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ لان میں لگے خوب صورت پھول، پودے، درخت، گھاس اور سب سے بڑھ کر لان کے بیچوں بیچ بنے فوارے سے گرتا پانی، بہت خوب صورت منظر تھا۔ مگر وہ اس منظر کو نہیں، وہ اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

"خوب صورت لگ رہا ہے نا یہاں سے لان کا ویو۔" محمود خالد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"جی!" باپ سے باتیں کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا ان سے کیا کہے۔

"ایک چیز اور بھی ہے تمہارے لیے۔ دکھاؤں؟" وہ مسکرا کر بولے، انداز میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

"جی پاپا! دکھائیے۔"

"تم ابھی تھکی ہاری گھر پہنچی ہو۔ سوچ رہی ہو گی پاپا بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں، مگر میرا دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں تمہارے کمرے کے ساتھ ساتھ تمہارا اسٹوڈیو بھی دکھاؤں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑکی کے پاس سے ہٹے تھے۔ اس کے کمرے کی دائیں دیوار میں ایک خوب صورت دروازہ تھا۔ محمود خالد نے اس دروازے کو کھولا اور اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے تھے۔

اب وہ جس کمرے میں تھے، وہ اس کے بیڈ روم

سے بھی کچھ بڑا کمرا تھا۔ اس کا فرش لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ وہاں میز بھی تھی، صوفے بھی تھے، راکنگ چیئر بھی تھی۔ بک شیلف بھی تھا۔ مختلف طرح کے ایزل بھی تھے، رنگ بھی تھے۔ پینٹنگ بنانے سے متعلق اشیا میز پر سلیقے سے رکھی تھیں۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ بک شیلف میں مصوری اور آرٹ سے متعلق قیمتی کتابوں کا کلیکشن بھی تھا۔

"یہاں کا انٹیریر میں نے ایک آرکیٹکٹ سے کروایا تھا۔ مجھے خود تو پینٹنگ کی اے بی سی بھی نہیں آتی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا آرٹسٹ لوگوں کے اسٹوڈیوز کیسے ہوتے ہیں۔ اب جب تک تم یہاں ہو، پینٹنگ کرنے کا دل چاہے تو یہیں آکر کام کرنا۔"

ان کے چہرے پر یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اسے یہاں پر کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے آرٹسٹ بننے کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے کے بعد اس کے آرٹسٹ ہونے پر اتنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ وہ چپ چاپ تو کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔

"بہت خوب صورت اسٹوڈیو ہے۔ تھینکس پاپا!"

"تمہیں پسند آگیا۔ میری محنت وصول ہو گئی۔ پانچ سال سے میں منتظر تھا کہ تم آؤ اور اپنا یہ اسٹوڈیو دیکھو۔"

ان کا انداز اسے شرمندہ کروانے والا یا یہ جتانے والا ہرگز نہیں تھا کہ وہ باپ سے ضد باندھ کر ان کے لاکھ بلانے پر بھی پچھلے پانچ سالوں میں کبھی ایک بار بھی ان سے نہیں ملی تھی۔ وہ بس جیسے اسے ایک بات بتا رہے تھے۔ شرمندہ وہ خود ہی ہو رہی تھی۔ اسے شرمندگی کیوں ہو رہی تھی؟

"میں تمہارے آنے سے بہت خوش ہوں کلثوم! اب شادی کے بعد بھی میرے پاس کراچی آتی جاتی رہنا۔ تمہاری تو ہونے والی سسرال بھی کراچی ہی میں ہے۔"

وہ محبت بھرے انداز میں اس سے بولے تھے۔ وہ جواباً سوائے سر اثبات میں ہلانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم مجھے سکندر سے کب ملوا رہی ہو؟" کمرا اور اسٹوڈیو دیکھنے کے بعد وہ شاور لینے چلی گئی تھی۔ نہا کر فریش ہونے کے بعد نیچے آئی تو ناشتے کی میز پر محمود خالد اور عائشہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سکندر کا نام یاد رکھے جانے اور اس کا نام اتنی محبت سے لیے جانے پر حیران ہوئی تھی۔

وہ سکندر کو باپ سے ملوانے پاکستان نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کی ماں سے ملنے پاکستان آئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ساری سوچیں آرہی تھیں۔

وہ سکندر سے محبت میں نہیں ملنا چاہتے۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی رکوانے کے لیے کچھ پلان کر رہے ہیں۔ سیم کے ساتھ بھی تو انہوں نے یہی کیا تھا۔ یہ محبت صرف ایک دکھاوا ہے۔ مگر دکھاوا ہے تو اتنی سچی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔

"آج شام مجھے اس کے پیرنٹس سے ملنے جانا ہے۔ وہ مجھے پک کرنے آئے گا۔ میں اس سے کہوں گی، وہ تھوڑا جلدی آجائے۔ پھر آپ اس سے مل لیجیے گا۔"

اس کے ذہن میں جو بھی سوچیں آرہی تھیں مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی باپ کو کوئی تلخ جواب نہیں دے پائی۔

"میں تمہارے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں بیٹا! مجھے یقین ہے تم نے ایک اچھے لڑکے کا انتخاب کیا ہو گا۔" وہ اس سے پیار سے بولے تھے۔ عائشہ ان دونوں کے آگے چائے رکھ رہی تھیں۔

"محمود بہت خوش ہیں تمہاری شادی کا سن کر۔ بلکہ ہم دونوں یہ ڈسکس کر رہے تھے کہ سکندر کی فیملی بھی اگر کراچی ہی میں ہے تو پھر تم دونوں یہیں پر ہی شادی کر لو ناں۔" عائشہ اس سے بولی تھیں۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ سکندر کے اپنی فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ کچھ اختلافات ہیں

اس کے اپنے والد اور بھائی کے ساتھ۔ وہ یہاں صرف اپنی والدہ سے ملنے آیا ہے۔" وہ جواباً" سنجیدگی سے بولی۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ تم بس مجھے سکندر سے ملوا دو تمہاری شادی جہاں پر بھی ہوگی میں اور عائشہ وہاں ضرور آئیں گے۔ میری بیٹی باپ کے ہوتے ہوئے باپ کی دعاؤں کے بغیر تو رخصت ہرگز نہیں ہوگی۔"

اس کی سنجیدگی اور دو ٹوک سے انداز کے جواب میں محمود خالد پیار اور نرمی سے بولے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پہنچ گئیں تم؟" ناشتے کے بعد کمرے میں آکر اس نے سیم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ اس بار اس کی کال ریسیو کرلی گئی تھی۔ وہ تلخ سے لہجے میں اس سے بولی تھی۔

"تم مجھے لینے ایرپورٹ کیوں نہیں آئیں سیم؟" وہ جانتی تھی اس کی سکندر سے شادی اور پاکستان آنے کی بات پر سیم اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ اس نے غصے میں پچھلی دونوں بار اس کی فون کالز بند کردی تھیں۔

وہ جانتی تھی سیم اس کی محبت میں اس پر خفا ہوتی تھی، اسے اس کی ہر وقت فکر جو بہت رہتی تھی۔ اسے یقین تھا اس کے آنے پر وہ رک نہیں پائے گی، اپنی ساری ناراضی بھلا کر وہ بھاگی بھاگی اس کے پاس ایرپورٹ چلی آئے گی۔ چاہے ابھی لاکھ ناراضی ظاہر کررہی ہے۔ مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ سیم اس سے واقعی بڑی سنجیدگی سے خفا تھی۔

"اس لیے کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ مجھے تم پر بہت غصہ ہے لز۔" وہ خفگی سے بولی۔

"سیم پلیز! مجھ سے خفا مت ہو۔"

"تمہاری بے وقوفی پر خفا بھی نہ ہوں؟ تم پاپا کو جانتی نہیں ہو لز۔ تم ابھی تک بہت سادہ ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے وہ کیا کچھ کرسکتے ہیں تمہارے ساتھ۔"

وہ سیم کی بات پر چپ ہو گئی تھی۔ وہ نہ باپ کی حمایت میں کچھ کہہ پائی تھی نہ مخالفت میں۔

"اب پاکستان آہی چکی ہو تو کم از کم پاپا کے گھر پر تو مت رہو۔ میرے گھر آجاؤ۔ میں ڈرائیور کو بھیجوں کیا؟"

سیم کے لہجے کی خفگی اور ناراضی اب پھر اس کی فکر اور محبت میں بدل چکی تھی۔

"میں پاپا کے ڈرائیور کے ساتھ تمہارے گھر آجاؤں گی سیم! مگر ابھی نہیں۔ آج دوپہر مجھے سکندر کو پاپا سے ملوانا ہے اور پھر شام میں مجھے خود سکندر کی فیملی سے ملنے جانا ہے۔ میں کل آجاؤں گی۔"

وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر محتاط سے انداز میں بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔" سیم ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ٹھیک ہے لز! میں تم سے پھر بات کروں گی۔ بائے۔"

سیم نے سنجیدہ ہی انداز میں فوراً" فون بند کردیا تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بیٹھ کر سوچنے لگی تھی کہ آج سکندر کی فیملی سے ملنے اور سکندر کو محمود خالد سے ملوانے کے بعد وہ سیم کے گھر ہی چلی جائے۔ کراچی آنے سے قبل اس نے سیم کے گھر پر نہ رکنے کے حوالے سے باپ سے کیا وعدہ کیا تھا، سیم کی آواز سنتے ہی اسے بھول گیا تھا۔

شاید اسے سیم کے گھر جانے سے منع کرنا اس کے پاپا کی کوئی سازش ہی تھی۔ ان دونوں بہنوں کو یہاں پر ایک دوسرے سے دور رکھوانے کے لیے تاکہ جب وہ اس کی اور سکندر کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کریں تب سیم اس کی مدد نہ کرسکے۔

وہ کل صبح ہی سیم کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے سوچا سازش، پلاننگ، دھوکا اور جھوٹی محبت سے اسے گھٹن ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

محمود خالد کی خواہش تھی کہ سکندر آج ان لوگوں کے ساتھ لنچ کرے مگر اس نے خود سکندر کو لنچ کی دعوت نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی سکندر اس کے پاپا سے بہت زیادہ دیر کے لیے ملے۔ اس سے فون

کر کے اس نے بس یہ کہا تھا' وہ اسے پک کرنے تھوڑا پہلے آجائے تاکہ اس کے پاپا سے بھی مل سکے۔ اس نے محمود خالد کو یہ بتایا تھا کہ سکندر یہاں پر لنچ نہیں کرے گا' وہ کچھ دیر سے آئے گا کیونکہ وہ بہت بزی ہے تو انہوں نے عائشہ سے چائے کے ساتھ بھرپور قسم کے ریفریشمنٹ کا کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے ہونے والے داماد کے پہلی بار گھر آنے پر بہت پرجوش تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کی اموجان کی خوشی سے چہکتی آواز آج اسے برسوں بعد سنائی دے رہی ہے۔ مگر۔۔ وہ اس سب سے لاتعلقی اختیار کیے کمرے میں میز کے آگے لیپ ٹاپ رکھ کر بیٹھا تھا۔

''غلام احمد! گاڑی میں مٹھائیاں رکھوادی تھیں؟''

اس کے کان میں پھر اپنی اموجان کی خوشی سے کھنکتی آواز آئی تھی۔ اس نے خود کو پہلے سے بھی زیادہ لاتعلق بنالیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہے۔

''کیا کر رہے ہیں؟'' نوریہ کمرے میں آئی تھی۔ سب لوگ گھر سے جلدی نکل رہے تھے۔ غالباً'' اس کی اموجان دعوت کا سارا انتظام اپنی نگرانی میں کروانا چاہتی تھیں۔ گاڑیوں میں سامان رکھوایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد سب کو تیار ہو کر گھر سے نکل جانا تھا۔ نوریہ اس کے پاس صوفے ہی پر بیٹھ گئی تھی۔

''آفس کا کام تھا تھوڑا۔'' وہ سر اٹھائے بغیر لاپروائی سے بولا۔

نوریہ نے آج صبح اس سے اموجان اور پاپا کے ساتھ فارم ہاؤس جانے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے بغیر کوئی لمبی بات کیے صرف ایک ہاں کہہ کر اسے اور علی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔

''تمہیں کوئی کام ہے؟'' اس نے سر اٹھا کر نوریہ سے سنجیدگی سے پوچھا۔

''آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' وہ بہت سوچ کر محتاط سے انداز میں بولی۔

وہ اپنے پاپا کی طرح کا حاکمانہ مزاج رکھنے والا سخت گیر شوہر نہیں تھا کہ نوریہ کو اس سے بات کرنے کے لیے پہلے اجازت لینی پڑے' لفظ سوچنے پڑیں۔ ان دونوں کا تو بڑا ہی دوستانہ اور پیار بھرا تعلق تھا' جس میں ایک دوسرے کے لیے عزت بھی تھی اور محبت بھی۔ پھر آج نوریہ کو کیا ہوا تھا؟ وہ قدرے خائف سی نگاہوں سے اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟

''کہو نوریہ!''

وہ کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکا تھا' جب دل ماضی کی بھول بھلیوں میں پھر سے کھویا ہوا تھا تو لبوں پر مسکراہٹ کہاں سے آتی۔

''زین پلیز! مجھ سے خفا مت ہوئیے گا۔ میری بات ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔''

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''بارہ سال پہلے آپ کے گھر میں کیا ہوا تھا' میں نہیں جانتی مگر جو کچھ بھی ہوا تھا اور چاہے وہ جتنا بھی برا ہوا تھا مگر اسے گزرے بارہ سال گزر چکے ہیں زین! اتنے سالوں میں دنیا بدل گئی ہے' زندگی بدل گئی ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو نوریہ!'' اس بار اس کا لہجہ تھوڑا سخت تھا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب آپ بھی خود کو تھوڑا تبدیل کیجیے۔ اپنے دل میں وسعت پیدا کیجیے۔ صلہ رحمی اللہ کو پسند ہے۔ کیا اللہ ہمارے بڑے بڑے گناہوں کو معاف نہیں کر دیتا۔۔ تو ہم اس کے بندے اس کی پسندیدہ ترین صفت کو کیوں نہیں اپنا سکتے؟''

وہ نرم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ وہ یک دم ہی غصے سے لیپ ٹاپ بند کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور غصہ آگیا تھا۔ وہ خاموش صرف اس لیے تھا کہ وہ اس موضوع پر نوریہ سے ایک لفظ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

''آپ کو پتا ہے زین! پاپا نے آج کی یہ دعوت کیوں رکھی ہے؟'' اسے خاموش دیکھ کر نوریہ نے پوچھا۔

''اموجان کی وجہ سے۔ اموجان سکندر بھائی کے آنے پر بہت خوش ہیں۔ پاپا نے کل جب مجھے فارم ہاؤس کی دعوت کا بتایا تھا' تب انہوں نے کہا تھا کہ

انھوں نے برسوں بعد انہیں اس طرح خوش دیکھا ہے اور وہ انہیں پوری طرح خوش ہونے کا موقع دینا چاہتے ہیں' اسی لیے انھوں نے سکندر بھائی اور ان کی ہونے والی بیوی کی دعوت رکھی ہے۔ پاپا آپ سے کم تو خفا نہیں سکندر بھائی سے۔ جب وہ اموجان کی خوشی اور ان کی صحت کے لیے اپنا غصہ اور ناراضی پس پشت ڈال سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں۔ وہ بارہ سال بعد اپنے سب گھر والوں کو ایک ساتھ 'ایک ہی جگہ پر موجود دیکھیں گی۔ یہ خوشی ان کی صحت پر کتنا اچھا اثر ڈالے گی زین!"

سن لینے کے باوجود وہ نوریہ کی باتیں نہ سننے کا سا تاثر دیتا کمرے سے جانے لگا تھا۔

"زین! میری بات کا جواب تو دے دیں۔" نوریہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ نوریہ کو جواب دیے بغیر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے سامنے اموجان نظر آئی تھیں۔ ان کا ہاتھ یوں اٹھا ہوا تھا گویا وہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دینے والی تھیں۔

پل بھر کے لیے اس کی اپنی ماں سے نگاہیں ملی تھیں۔ ان نگاہوں میں شکوہ تھا۔ اس پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد آمنہ پیچھے کھڑی نوریہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"نوریہ! میں تم سے یہ کہنے آئی تھی بیٹا! تیار ہو جاؤ۔ علی کو بھی تیار کردو۔ آدھے گھنٹے بعد ہمیں نکلنا ہے۔"

برسوں بعد اس نے اپنی ماں کو دل سے تیار ہوا دیکھا تھا۔ انھوں نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ جیولری بھی پہن رکھی تھی اور ہونٹوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل بھی تھا۔ وہ برسوں بعد اتنی خوب صورت اور خوش لگ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے اموجان!" نوریہ ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ آمنہ وہاں سے واپس پلٹنے لگی تھیں۔ صرف ایک پل' بس ایک پل کے لیے اس کی نظریں اپنی ماں کی نظروں سے پھر ٹکرائی تھیں۔ وہ ہل کر رہ گیا تھا۔ وہ نظریں اس سے خاموش شکوہ کر رہی تھیں۔ ان

نظروں میں درد تھا' نمی' تھی شکایت تھی' وہ اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہیں' یہ بے بسی تھی۔ وہ اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا آمنہ وہاں سے جا چکی تھیں۔

"دیکھی آپ نے اموجان کے چہرے کی خوشی؟ آج اس خوشی کو مکمل ہونے دیں زین! آج اس خوشی میں غم کا ہلکا سا بھی عکس نہ پڑنے دیں۔"

اس نے اپنے ساتھ کھڑی نوریہ کی آواز سنی۔ وہ گردن گھما کر نوریہ کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ ماں سے نظر ملنے کے لمحے کے حصار میں تھا۔

"ہم خود بھی والدین ہیں زین! ذرا سوچیں اگر علی چند دنوں کے لیے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو ہماری کیا حالت ہو گی؟ اموجان آج بارہ سالوں بعد اپنے جدا ہوئے بیٹے سے ملنے والی ہیں۔ آپ ان کی خوشی میں دکھ کا یہ احساس شامل نہ ہونے دیں کہ برسوں بعد ایک کھویا بیٹا واپس ملا ہے تو دوسرا بیٹا ساتھ نہیں۔ ان کے بیمار اور کمزور وجود کو آج پوری طرح خوش ہو لینے دیں۔ اپنی ساری فیملی کو اکٹھا دیکھنے کی خوشی انہیں حاصل کر لینے دیں زین!"

آخر میں آکر نوریہ کا لہجہ التجائیہ سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"تم تیار ہو جاؤ نوریہ! تم لوگوں کو دیر ہو جائے گی۔" بغیر اسے دیکھے وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس کے جواب نے نوریہ کے چہرے پر گہری مایوسی پھیلا دی تھی۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ وہی گلابی فراک پہن کر تیار ہو چکی تھی جو سکندر نے اسے دوہا سے دلوائی تھی۔ سکندر تین بجے ان کے گھر آیا تھا۔ محمود خالد نے اس کی آمد کی اہمیت اور خصوصیت چوکیدار کو بتا رکھی تھی۔ اسی لیے جیسے ہی وہ آیا چوکیدار نے اسی لمحے انہیں اطلاع دی۔ اس سے بھی پہلے محمود خالد صوفے پر سے اٹھے تھے۔ وہ سکندر کے استقبال کے لیے گیٹ تک جا رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آئی تھی۔

سکندر کو کراچی کے راستوں کا علم نہیں تھا۔ اس لیے اس نے رینٹ پر گاڑی بمعہ ڈرائیور لے رکھی تھی۔ ڈرائیور باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلی تو محمود خالد گرم جوشی سے سکندر سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آرام سے پہنچ گئے بیٹا! گھر ڈھونڈنے میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"میں صبح لیزا کو ڈراپ کرنے یہاں آیا تھا۔"

سکندر مہذب انداز اور سنجیدگی سے بولا۔ اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے اس لباس میں بہت پیاری لگ رہی ہے پل بھر کے لیے اس کی اٹھی ان نگاہوں نے اسے بتا دیا تھا۔ سکندر نے اپنی نگاہیں فوراً ہی اس پر سے ہٹا کر اس کے پاپا پر مرکوز کر دی تھیں۔

محمود خالد سکندر کو گھر کے اندر لے کر جا رہے تھے۔ ان دونوں کو چار بجے گھر سے نکل جانا تھا۔ سکندر یہاں صرف ایک گھنٹے کے لیے آیا تھا اور یہ بات وہ پہلے ہی باپ کو قدرے بے مروتی سے بتا چکی تھی۔

سکندر کو جلدی آنے اور اس کے گھر پر لنچ کرنے پر قطعاً اعتراض نہ تھا۔ مگر وہ ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے اور سکندر کے رشتے کے بیچ اپنے باپ کی کسی سازش کو نہیں آنے دے گی۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ عائشہ بھی وہاں آ گئی تھیں۔ وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے سکندر سے مل رہے تھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کراچی کا موسم' عرب ممالک کے معاشی حالات' ابتدا ان موضوعات سے ہوئی تھی۔

سکندر اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں نپی تلی گفتگو کر رہا تھا۔ وہ صرف اس کے ساتھ بے تکلف ہوا کرتا تھا۔ باقی سب کے ساتھ وہ جیسا سنجیدہ نظر آتا تھا ویسا ہی محمود خالد کے ساتھ بھی تھا۔

ان کی ملازمہ نے عائشہ کی نگرانی میں چائے کے ساتھ گھر کے بنے کافی سارے لوازمات وہاں سجا دیے تھے۔ ٹرالی اور میز انواع و اقسام کی ڈشز سے بھری تھی لگ رہا تھا' یہ پہلی بار گھر آنے والے داماد کا شاندار اور گرم جوشی سے بھرپور استقبال ہے۔ عائشہ بڑی محبت اور اپنائیت سے سکندر کو مختلف ڈشز پیش کر رہی تھیں۔ وہ خود بالکل چپ بیٹھی اپنے باپ اور ان کی مسز کو اپنے ہونے والے داماد کی آؤ بھگت کرتے دیکھ رہی تھی۔

"بیٹا! یہ کباب تو چکھو۔ تمہاری آنٹی بہت مزے کے بناتی ہیں۔" محمود خالد اصرار کرتے ہوئے سکندر کی پلیٹ میں خود کباب ڈال رہے تھے۔

"لیزا! تم بھی کچھ لے لو۔" عائشہ پیار سے اس سے بولی تھیں۔

"میں لے رہی ہوں آنٹی!" وہ دونوں نہ زیادہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے' نہ ایک دوسرے سے کوئی بات کر رہے تھے۔ سکندر سنجیدگی و شائستگی سے محمود خالد اور عائشہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے کیک کا ایک چھوٹا سا پیس کاٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔

محمود خالد' سکندر سے اس کی جاب کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ بظاہر سرسری سا انداز جیسے گفتگو برائے گفتگو کے طور پر اس کے پروفیشن اور کیریر کے متعلق بات کر رہے ہوں۔ مگر درحقیقت وہ سکندر کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے اندازے قائم کر رہے تھے۔

سکندر سنجیدگی سے نپے تلے انداز میں انہیں اپنی جاب وغیرہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ چائے پینے کے دوران سکندر نے دو مرتبہ گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔

"پاپا! میرا خیال ہے اب ہمیں نکلنا چاہیے۔ سکندر کی امو جان ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ کافی دیر کے بعد کچھ بولی تھی۔

"ہاں بالکل۔ تم لوگ نکلو۔ راستے میں ٹریفک بھی ہو گا۔"

وہ دونوں جانے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ محمود خالد کا سکندر کو رخصت کرنے کا انداز استقبال کرنے والے انداز سے بھی زیادہ گرم جوشی والا تھا۔ گویا بیٹی کا انتخاب انہیں پسند آ گیا تھا۔

"بہت خوشی ہوئی مجھے تم سے مل کر سکندر!"

مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر وہ بولے۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر اچھا لگا۔"

وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ جیسے وہ اس کی نینی کو نینی نہیں کہہ پاتا تھا' اسی طرح اس کے پاپا کو نہ تو انکل کہہ پایا تھا اور نہ ہی پاپا۔

"بہت پیاری ہے میری یہ بیٹی۔ تھوڑی سی ضدی اور جذباتی ہے مگر اس کا دل بہت خوب صورت اور آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے' اس نے تم جیسے باوقار اور خوب صورت شخص کا انتخاب کیا ہے۔ اللہ تم دونوں کو سدا خوش رکھے۔"

انہوں نے مصافحہ کرنے کے بعد بھی سکندر کا ہاتھ فوراً" نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے بولے تھے۔ ان کے لہجے میں سکندر کے لیے والہانہ محبت اور شفقت شامل تھی۔ اس نے حیران ہو کر باپ کو دیکھا تھا۔

کہاں تھی وہ ضدی اور جذباتی؟ اس کے پاپا نے اس کے لیے یہ الفاظ کیوں کہے؟ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ ایسی کون سی ضد کر دی تھی اس نے باپ سے اور ایسا کون سا جذباتی پن ظاہر کیا تھا۔ جس کا وہ حوالہ دے رہے تھے۔

"تم اپنی والدہ کو یہاں لاؤ بیٹا! ہم سب ساتھ مل کر ڈنر کریں گے۔" عائشہ' سکندر سے محبت سے بولی تھیں۔ سکندر کی فیملی کا ذکر نہ کرکے جیسے انہوں نے یہ احتیاط رکھی تھی۔ انہیں لیزا کی بات یاد تھی کہ سکندر کے اپنی فیملی کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہیں۔

"جی ضرور۔" وہ بظاہر جواباً" مسکرا کر ہی بولا تھا۔

محمود خالد اور عائشہ چاہے نہ جانتے ہوں مگر وہ جانتی تھی سکندر کا ایسا کوئی ارادہ ہے' نہ ہی کبھی ہو گا۔ وہ صرف موقع کی نزاکت کا خیال کرکے اس بارے میں ہامی بھر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سب "فارم ہاؤس" آچکے تھے۔ شہر کے مضافات میں یہ "فارم ہاؤس" تھا۔ وہ شہریار خان گھر سے ملازمین لائے تھے' جو یہاں سے وہاں بھاگتے دوڑتے تمام کام انجام دے رہے تھے۔

آمنہ جیسے ایک دم ہی بالکل تندرست اور صحت مند ہو گئی تھیں۔ وہ ملازمین کو مختلف ہدایات دیتی ادھر ادھر جا رہی تھیں۔ باہر کھلی جگہ پر باربی کیو کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ خوشی آمنہ کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھی۔ نویرہ ان کی خوشی میں ان کا ساتھ دیتی نوکروں سے ان کی مرضی کے مطابق کام کروا رہی تھی۔

گارڈن میں جہاں پر ڈنر ہونا تھا' وہاں کی آرائش' سجاوٹ نویرہ نے کروائی تھی۔ شہریار خان' علی کو سوئمنگ سکھا رہے تھے۔ ان کے سب گھر والے یہاں ان کے سالوں بعد لوٹنے والے بیٹے اور اس کی ہونے والی بیوی کا استقبال کرنے کو موجود تھے سوائے زین کے۔ وہ جانتی تھیں زین نہیں آئے گا۔ پھر بھی دل کی خواہش تھی کہ کاش آج وہ بھی یہاں آجاتا۔ کیا صرف آج چند گھنٹوں ہی کے لیے وہ اپنی ضد اور غصہ بھلا کر ماں کے دل کو خوشی نہیں دے سکتا تھا تاکہ وہ اپنے تمام گھر والوں کو اکٹھا ایک ہی جگہ پر دیکھ سکیں۔

وہ گارڈن میں ڈنر کے لیے اتنے خوب صورت انداز میں میز اور کرسیاں وغیرہ لگوانے پر نویرہ کو سراہ رہی تھیں' جب انہوں نے سامنے سے زین کو آتے دیکھا۔ سفید شلوار قمیص میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ چلتا وہ ان دونوں کی طرف آرہا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

"نویرہ! یہ زین آرہا ہے ناں؟"

"جی امو جان!" نویرہ نے بھی بے حد خوش ہو کر زین کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آتے زین کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"کیا تم نے کہا تھا زین سے آنے کے لیے؟" زین کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نویرہ سے پوچھا۔

"کہا تو تھا۔ لیکن مجھے لگتا ہے زین میرے کہنے سے نہیں' بلکہ آپ کے کچھ بھی نہ کہنے کی وجہ سے آگئے ہیں۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آپ کی آنکھیں جو ان

سے اتنا کچھ کہہ رہی تھیں۔ زین آپ سے پیار بھی تو بہت کرتے ہیں اموجان!"
انہوں نے بے ساختہ اپنے برابر کھڑی نویرہ کو دیکھا تھا۔
"میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تھیں مگر ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"دعا کرو بیٹا! میری محبت ان دونوں کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ اب تو اس کے سوا اور کوئی خواہش نہیں کہ کچھ ایسا ہو جائے ان دونوں بھائیوں کے دل پھر سے مل جائیں۔ ان کے دلوں سے سب رنجشیں اور ناراضیاں دور ہو جائیں۔ میں اپنے دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ ایک ہی چھت تلے دیکھ سکوں۔ ہم سب پہلے کی طرح پھر ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگیں۔"
"ان شاء اللہ ایسا ضرور ہو گا اموجان! بارہ سال تقدیر نے آپ کی آزمائش کی ہے۔ اب بس سب اچھا ہو گا۔"
زین ان دونوں کے بالکل نزدیک آ چکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے آنکھیں یوں صاف کی تھیں جیسے آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا۔
"علی کہاں ہے؟" زین ان دونوں کے قریب آ گیا تو جیسے اسے سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا بات کرے۔
"وہ پاپا کے ساتھ سوئمنگ کر رہا ہے۔" نویرہ مسکرا کر بولی۔ زین بے حد سنجیدہ تھا۔ جیسے بحالت مجبوری یہاں آ تو گیا تھا مگر دل سے خوش نہیں تھا۔
"اچھا ہوا زین تم بھی آ گئے۔" آمنہ آہستگی سے بولی تھیں۔
"آپ کی وجہ سے آیا ہوں اموجان!" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا وہ سکندر کے لیے آج بھی وہی محسوس کرتا ہے جو بارہ سال پہلے کرتا تھا۔ آمنہ اور نویرہ چپ کھڑی رہ گئی تھیں۔ زین وہاں سے اندر چلا گیا

☆ ☆ ☆

وہ اور سکندر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سکندر کے پاپا کے فارم ہاؤس جا رہے تھے۔
"تم نے میری تعریف نہیں کی۔" لیزا نے اس سے شکوہ کیا۔
"تعریف کس بات کی؟" وہ مسکراہٹ لبوں پر روکتا سنجیدگی سے بولا۔
"کسی بھی بات کی نہیں۔" چڑ کر جواب دیتے اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا تھا۔
"بیلا! تم ہمیشہ ہی حسین لگتی ہو۔" اس نے اپنے نزدیک سکندر کی سرگوشی سنی۔ گردن گھما کر اس نے اسے دیکھا۔
"ہمیشہ پاکستانی ڈریس تو نہیں پہنا ہوتا۔ آج میں نے فرسٹ ٹائم پہنا ہے تمہارے لیے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ سکندر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔
"کیا میری نظروں نے تمہاری تعریف نہیں کی تھی؟"
"کی تھی مگر زبان بھی تو کرے۔" اس بار وہ مسکرائی تھی۔
"زبان سے تمہاری تعریف کرنے کے لیے تو مجھے شاعر ہونا پڑے گا۔ کیونکہ عام سی تعریف تو تمہاری کی نہیں جا سکتی۔ تمہاری تعریف تو بہت خاص لفظوں اور خاص انداز میں ہونی چاہیے۔" وہ ہنس پڑی تھی۔
"باتیں بنانی تمہیں خوب آتی ہیں۔ تمہیں پتا ہے' لڑکیوں کا دل کیسے خوش کیا جاتا ہے۔"
"لڑکیوں کا نہیں' صرف ایک لڑکی کا۔ اپنی بیلا کا۔" آہستگی سے بولتے ہوئے سکندر نے گاڑی کی سیٹ پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ سکندر کی بات پر خوش ہو کر بے ساختہ مسکرائی تھی۔ چند لمحے وہ دونوں خاموش رہے تھے۔
"تمہارے پاپا مجھے اچھے لگے لیزا! سچ بولوں تو تم سے سن کر میں نے ان کا جو امیج بنایا تھا' وہ اس سے بہت مختلف ہیں۔"
اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت سنجیدگی اور

سچے دل سے اس کے بابا کی تعریف کر رہا تھا۔

وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے سکندر!" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ تلخ ہوئی تھی۔ اپنی اور سیم کی زندگی کی بہت ساری محرومیاں یاد آگئی تھیں۔

"لیکن وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے ان کے ہر ہر انداز میں تمہارے لیے والہانہ محبت محسوس کی ہے۔ وہ مجھ سے بھی اس لیے اتنی محبت سے مل رہے تھے کہ میں ان کی بیٹی کی پسند' اس کا انتخاب ہوں۔"
سکندر بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بول رہا تھا۔

"آج انہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے مگر کل جب مجھے ان کی محبت کی ضرورت تھی تب وہ کہاں تھے؟ تم اس بات کو رہنے دو سکندر! تم نہیں جانتے انہوں نے سیم کو کتنے دکھ پہنچائے ہیں۔" وہ ماضی کی تلخیوں میں گم ہو گئی تھی۔

"اوکے! ہم اس ٹاپک کو رہنے دیتے ہیں۔ تم سیم کا ذکر کر رہی ہو۔ یہ بتاؤ' وہ آج ایئرپورٹ کیوں نہیں آئی تھی؟"

اس کا موڈ خراب نہ ہو اس خیال سے سکندر نے فوراً" ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

سیم آج اسے لینے کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کو وجہ نہیں بتا سکتی تھی۔ جس سہولت سے اس نے اپنے پاپا کے متعلق منفی باتیں سکندر سے کرلی تھیں' سیم کے بارے میں نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سکندر کو یہ کیسے بتا دیتی کہ سیم ان دونوں کی شادی پر خوش نہیں ہے اور ناراضی کے اظہار کے طور پر ایئرپورٹ نہیں آئی تھی۔ اگر وہ ایسا کچھ کہتی تو شاید سکندر کے دل میں یہ بات رہ جاتی۔ پھر جب وہ سیم سے ملتا تو یہی سوچ کر ملتا کہ لیزا کی بہن اسے سخت ناپسند کرتی ہے اور پھر شاید جواب میں سکندر بھی سیم کو ناپسند کرتا۔

سکندر اور سیم' اس کی زندگی کے اہم ترین لوگ' ان دونوں کو ایک دوسرے کو پسند کرنا چاہیے تھا' ایک دوسرے کا دوست ہونا چاہیے تھا' ایک دوسرے کے ساتھ ان کا بہت اچھا' بہت خوشگوار اور دوستانہ تعلق ہونا چاہیے تھا۔ یہ وہ بول نہیں سکتی تھی اور جھوٹ بول کر اپنے اور سکندر کے رشتے کی سچائی اور خوب صورتی کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے مناسب یہی لگا کہ وہ اس سوال کو نہ سننے کا تاثر دے کر نظر انداز کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

"تم آج بہت سالوں بعد اپنے گھر والوں سے ملو گے ناں؟" اس نے سکندر کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں پورے بارہ سال بعد۔" وہ آہستگی سے بولا۔ اس نے لیزا کے جواب نہ دینے کو محسوس نہیں کیا تھا۔

"تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"پتا نہیں لیزا! میرے اندر کوئی فیلنگز ہی نہیں ہیں اس وقت۔ ایسا لگ رہا ہے سب کچھ مشینی سے انداز میں ہو رہا ہے بغیر کسی بھی اور طرح کی فیلنگز کے۔ میں نے اپنی بیمار ماں کے دل کو خوشی دینی ہے اس کے سوا میرے دل میں کوئی احساسات نہیں ہیں۔"

وہ پھر سے اپنے اندر جھانکنے لگا تھا۔ وہ سکندر کے درد اور اس کے کرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ جنہوں نے اسے دھتکار دیا تھا' اس کی تذلیل کی تھی' اس سے بارہ سال پہلے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا' وہ آج صرف اپنی ماں کی خاطر ان سب کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ وہ سکندر کے ساتھ گاڑی سے اتری۔ اسے بالکل سامنے سکندر کی امو جان' ایک پیاری سی لڑکی اور ایک بچے کے ساتھ اپنے اور سکندر کے استقبال کے لیے کھڑی نظر آئیں۔

ان تینوں سے بہت دور گارڈن میں درختوں کے پاس اسے ایک باوقار سے شخص بھی نظر آ رہے تھے۔ بہت فاصلہ تھا' شکل واضح نہیں تھی۔ صرف کھڑے ہونے کا شاندار اور باوقار انداز بتا چل رہا تھا۔ پس منظر میں کھڑے وہ شخص کیا سکندر کے بابا تھے؟ سکندر کی تو

شاید اس طرف نگاہ بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ گاڑی سے اترتے ہی سیدھا اپنی ماں کی طرف بڑھا تھا۔

اس کی اموجان بھی تڑپ کر اس کے نزدیک آئی تھیں۔ انہوں نے بالکل صبح والے ہی انداز میں سکندر کو پھر گلے سے لگالیا تھا۔ وہ کبھی اس کا ماتھا چوم رہی تھیں، کبھی اس کے ہاتھ۔ وہ جیسے ابھی تک اسی خوف کے حصار میں تھیں کہ ان کا بیٹا ان سے پھر نہ بچھڑ جائے۔

"ہائے لیزا۔" اس نے سکندر اور اس کی اموجان سے نگاہیں ہٹا کر اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پر خلوص، دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

"ہائے۔" وہ جواباً احتیاط سے مسکرائی تھی۔

سکندر کا اپنی اموجان کے سوا باقی تمام افراد کے ساتھ کیا رویہ ہونا تھا اسے اسی لحاظ سے یہاں باقی افراد کے ساتھ گفت و شنید کرنی تھی۔ اس نے نورینہ کا بڑھا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میں نوریہ ہوں۔ اموجان کی چھوٹی بہو اور بہت جلد آپ کی دیورانی بن جاؤں گی۔ یہ میرا بیٹا ہے علی۔ علی! سلام کرو لیزا آنٹی کو۔"

اس نے اپنے ساتھ کھڑے بچے سے کہا۔ اسے شاید سمجھایا گیا تھا کہ اس نے مہمانوں کے سامنے زیادہ شرارتیں نہیں کرنی۔ اس لیے وہ بڑا سعادت مند سا بنا کھڑا تھا مگر اس کی آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی تھیں۔ یقیناً" وہ بہت شریر بچہ تھا۔

"اگر میرے مرنے کی اطلاع آئی تو اس پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہ ہوتا۔"

اسے بے اختیار سکندر کی کل صبح کی بات یاد آئی۔ تو یہ سکندر کے بھائی کی بیوی اور اس کا بیٹا تھا۔

سکندر ابھی تک روتی ہوئی آمنہ کو سنبھال رہا تھا۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر پھر جذبات پر قابو نہیں رکھ پائی تھیں۔

"السلام علیکم لیزا آنٹی۔" علی نے ماں کے حکم پر فوراً" اسے سلام کیا تھا اور بالکل بڑوں والے انداز میں مصافحے کے لیے سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اسے وہ گول مٹول سا شرارتی بچہ بہت پیارا لگا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے ساختہ اس نے جھک کر اس کے گال پر پیار کیا تھا۔

"وعلیکم السلام علی۔"

"اصولاً" تو علی کو آپ کو تائی امی یا بڑی ماما بلانا چاہیے۔ مگر اتنی ینگ سی لڑکی کو اتنے بھاری بھرکم ناموں سے پکارنا اچھا تو نہیں لگے گا۔ میرا خیال ہے لیزا آنٹی ہی فی الحال ٹھیک ہے۔"

نوریہ اس سے ہنس کر بولی۔ اگر سکندر کو اس کے پاپا اچھے لگے تھے تو اسے بھی ابھی تک سکندر کے گھر کا کوئی فرد برا نہیں لگا تھا۔ خوش اخلاق، ملنسار، محبت کرنے والا، وہ چاہے سکندر کی اموجان ہوں یا نوریہ یا پھر یہ کیوٹ سا بچہ۔ وہ ان سب سے مل کر یہی تین لفظ سوچ رہی تھی جبکہ وہ سکندر سے سننے کے بعد اس کی فیملی کے متعلق بہت مختلف رائے لے کر آئی تھی۔ وہ جواباً" مسکرائی تھی۔ تب تک آمنہ اور سکندر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

"لیزا ابھی کیا سوچ رہی ہو گی۔ میں نے اپنی بیٹی کو پیار بھی نہیں کیا۔ ماشاء اللہ اس پاکستانی لباس میں کتنی خوب صورت لگ رہی ہے میری بہو۔" آمنہ اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگی تھیں۔ نوریہ اب سکندر سے مخاطب تھی۔

"السلام علیکم سکندر بھائی!"

"وعلیکم السلام۔" وہ آمنہ کے اس کی خیر و عافیت کے متعلق سوالوں کے جواب دے رہی تھی، پھر بھی اس کا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ نوریہ نے سکندر کو بھی اتنی ہی گرم جوشی اور دوستانہ انداز و اپنائیت سے سلام کیا تھا جس طرح اس سے ہائے ہیلو کی تھی۔ مگر سکندر کا جواب سنجیدہ تھا اور ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ جیسے کسی اجنبی ___ کے سلام کا جواب دے دیا جاتا ہے۔

"سکندر بھائی! میں آپ کی بھابھی ہوں اور یہ شریر بچہ آپ کا بھتیجا ہے۔" نوریہ مسکرا کر سکندر کو بتا رہی

تھی۔ سکندر سنجیدہ اور سپاٹ چہرے کے ساتھ نویرہ اور علی کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم سکندر پاپا۔" علی کو جیسے ماں نے سب پہلے سے سمجھا رکھا تھا۔ وہ بڑے مزے دار سے انداز میں بولتا سکندر کی بھی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ سکندر نے علی کی طرف جھک کر اس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ مگر نہ تو وہ بچے کی معصوم سی حرکت پر مسکرایا تھا نہ ہی اس نے اسے چھونے یا پیار کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس فیملی میں شامل ہونے جا رہی تھی مگر ابھی وہ ایک اجنبی کی طرح تمام افراد کے عمل اور ردعمل دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ آمنہ کو علی کا سکندر کو "سکندر پاپا" کہنا بہت اچھا لگا تھا انہوں نے بے اختیار بہت پیار سے اپنی بہو کو دیکھا تھا۔ گویا یہ نام بیٹے کو نویرہ آج ہی سکھا کر لائی تھی۔

سکندر یہاں آتے ہی اسے اتنا ہی سنجیدہ نظر آنے لگا تھا' جتنا روم میں ملاقات کے ابتدائی دنوں میں لگا تھا۔ چہرے پر سرد اور سپاٹ تاثرات اور اجنبیت لیا دیا فارمل سا ایک ایسا انداز کہ کوئی بھی اس سے ضرورت سے زیادہ بات کرنے سے احتراز برتے۔

وہ اس وقت اس پر اپنا آپ کھول دینے والا' اپنی کمزوریاں بتا دینے والا سکندر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سنجیدہ اور سپاٹ تھیں۔ ان میں کسی بھی طرح کے کوئی جذبات نہیں تھے۔

"ہمارے گھر میں علی کی شرارتوں سے سارا وقت رونق رہتی ہے۔" آمنہ مسکرا کر اسے اور سکندر کو بتانے لگیں۔

"امو جان! کیا آپ سکندر بھائی اور لیزا کو یہیں کھڑا رکھیں گی؟"

نویرہ نے آمنہ کو مخاطب کیا۔ سکندر کا سنجیدہ اور فاصلہ لیا انداز محسوس کر کے نویرہ قدرے محتاط سی ہو گئی تھی۔

"ارے ہاں۔ چلو بیٹا آؤ۔ چل کر بیٹھتے ہیں۔" آگے چلنے کی بات پر اس نے ایک دم پھر درختوں کی طرف دیکھا۔ اب اسے وہاں پر کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔

وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے مصنوعی جھیل کے پاس گارڈن میں آ گئے۔ جہاں آرام دہ کرسیاں ڈلی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں میں سے ایک پر سکندر کے پاپا بیٹھے تھے۔ جس شخص کو ابھی اس نے بہت دور سے دیکھا تھا' کیا وہ یہی تھے؟

کسی تعارف سے پہلے ہی اسے پتا تھا وہ سکندر کے پاپا ہیں۔ باپ اور بیٹے میں مماثلت جو اس قدر تھی۔ سکندر اپنے باپ کی جوانی تھا۔ شہریار خان' سکندر کا بڑھاپا تھے۔ بلا کی مشابہت تھی باپ بیٹے میں۔ شہریار خان ان لوگوں کو آتا دیکھ کر فوراً" کرسی سے اٹھے تھے۔ جیسے مہمانوں کی آمد کے موقع پر کھڑا ہوا جاتا ہے۔ اس نے بے اختیار سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ پل بھر کے لیے اسے سکندر کے چہرے پر ایک درد بھرا تاثر نظر آیا' جیسے ماضی کا وہ تلخ لمحہ یاد آ گیا ہو جب بیس سال کی عمر میں اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگلے پل وہ پھر سے اپنے چہرے کے تاثرات کو سرد اور سپاٹ بنا چکا تھا۔

اس نے آمنہ اور نویرہ کے چہروں پر یہ تاثر دیکھا' جیسے وہ دونوں بھی نہیں جانتی تھیں کہ شہریار خان سکندر سے کس انداز میں ملیں گے۔ کرسی سے اٹھنے کے بعد وہ سکندر ہی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"السلام علیکم۔" سکندر نے دور کھڑے کھڑے غیر جذباتی اور سپاٹ سے انداز میں انہیں بغیر پاپا پکارے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر!"

وہ اس کے نزدیک آئے تھے۔ گلے لگنا تو بہت بڑی بات ہے۔ وہاں تو ہاتھ بھی نہیں ملایا گیا تھا۔ سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگا تھا' جیسے شہریار خان سکندر کو گلے لگانا چاہتے تھے۔

وہ اسے بہت حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس

کے قریب جانا چاہتے تھے مگر قریب جانے سے ڈر بھی رہے تھے۔

ماحول میں ایک عجیب سا کھنچاؤ، تکلف اور اجنبیت پھیل گئی تھی۔ آمنہ بیگم، سکندر اور شہریار خان دونوں کو محتاط سے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ ماحول میں پھیلی اجنبیت، تکلف اور خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ ان دونوں سے بولیں۔

"بیٹھو بیٹا الیزا تم بھی بیٹھو بیٹا" آمنہ کے کہتے ہی وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

علی بجائے ان سب کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کے گھاس پر بھاگ دوڑ کرنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا، وہاں سب تھے سوائے سکندر کے بھائی کے۔ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں بھیج کر کیا وہ خود آیا ہی نہیں تھا؟ سکندر سنجیدگی اور خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔

باپ اور نوبرہ کے سامنے وہ ماں کے ساتھ بھی فارمل سا ہو گیا تھا۔ جیسے ماں کے ساتھ چاہت، محبت اور جذبات کا والہانہ اظہار وہ ان لوگوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈز کا تکلیف دہ سناٹا حائل رہا تھا ان چاروں کے بیچ۔ نوبرہ بھی محتاط سی ہو کر چپ بیٹھی تھی۔ آمنہ نجانے کس پریشانی اور خوف میں تھیں۔ وہ ایک پل خاموش بیٹھے گھاس کی طرف دیکھتے سکندر کو دیکھتیں، دوسرے پل سنجیدہ بیٹھے شہریار خان کی طرف۔ پھر جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے آمنہ ہی نے لیزا کو مخاطب کیا۔

"پاکستان پہلی مرتبہ آئی ہو لیزا!"

"جی اموجان!" اس نے آمنہ کو مسکرا کر جواب دیا۔

اسے پہلی مرتبہ شہریار خان کی نظریں خود پر محسوس ہوئیں۔ اتنی دیر میں انہوں نے یا تو سکندر کو دیکھا تھا یا پھر بھاگتے دوڑتے علی کو۔ باقی سب سے وہ قدرے لاتعلق تھے۔ اس پر تو جیسے ابھی تک انہوں نے دھیان بھی نہ دیا تھا۔ سکندر اور شہریار خان دونوں خاموش تھے۔ ان کی خاموشی بے حد بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار خان نے خاموشی توڑنے میں پہل کی تھی مگر ان کی مخاطب وہ تھی۔

"کیا کرتی ہیں بیٹا آپ؟"

ان کا لہجہ شائستہ اور سنجیدہ تھا۔ نگاہوں میں اس کے لیے نرمی اور عزت تھی۔

"میں لندن کے ایک کالج میں لینڈ اسکیپ اور اسٹل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ آرٹسٹ ہوں، پینٹنگز بناتی ہوں۔" وہ ان کا مشاہدہ کرنے میں ایسی مگن تھی کہ اس سوال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھی۔ ان کی شخصیت کے رعب سے متاثر ہو کر اس نے اپنا کچھ نامکمل سا تعارف کروایا۔

"آپ لندن میں رہتی ہیں؟" وہ اسے آپ کر کے مخاطب کر رہے تھے، مخاطب کرنے کے انداز میں آمنہ جیسی محبت یا والہانہ پن نہیں تھا مگر اسے شائستگی، نرمی اور اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

سکندر اس کی اپنے پاپا سے گفتگو سے لاتعلقی ظاہر کرتا آہستہ آواز میں اپنے برابر بیٹھی آمنہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ گویا اسے اپنے باپ کی لیزا سے گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"جی انکل!"

"اور آپ کے پیرنٹس؟"

"میرے پیرنٹس کی ڈائی وورس ہو چکی ہے۔ میرے فادر پاکستان میں رہتے ہیں اور مدر اٹلی میں۔"

وہ سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ اسے دو، ایک بار شک ہوا کہ شہریار خان اس سے گفتگو کے دوران گاہے گاہے سکندر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جب اس کی نگاہیں آمنہ پر ہوتی ہیں، تب وہ جیسے چپکے سے اسے دیکھتے ہیں۔

"سکندر بتا رہا تھا۔ لیزا بہت مشہور آرٹسٹ ہے۔ ابھی ایک، دو ہفتے پہلے فلورنس میں اس کا سولو شو بڑا کامیاب گیا ہے۔"

سکندر سے گفتگو چھوڑ کر آمنہ نے فوراً" شہریار خان کو بتایا۔ گویا وہ اتنی دیر سے بظاہر سکندر سے باتیں کر رہی تھیں مگر ان کا دھیان ادھر بھی تھا۔ اسے سکندر کی اموجان کے اس انداز پر پیار آیا۔ نہ اس نے

شہریار خان کے سامنے اوچھے پن سے اپنی اور اپنی فیملی کی شان و اعلا رتبہ بتایا تھا نہ پینٹنگ کے حوالے سے اپنی شہرت کا ذکر کیا تھا۔ مگر آمنہ جیسے چاہتی تھیں کہ ان کی ہونے والی بہو کی ہر خوبی سب کو پتا چلے۔

"ویری گڈ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" شہریار خان ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کیا پینٹ کرتی ہو لیزا؟"

اس بار انہوں نے اسے تم کہہ کے مخاطب کیا۔ جیسے تکلف اور اجنبیت کو درمیان سے ہٹا دیا ہو۔ وہ جواباً شائستگی، احترام اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پینٹنگ میں اپنے خاص موضوعات انہیں بتانے لگی۔

سکندر ان دونوں سے لاتعلق اسی طرح ماں سے محو گفتگو تھا۔ علی بھاگتا ہوا نویرہ کے پاس آیا تھا۔

"ماما! فش دکھائیں۔" اس کی فرمائش پر نویرہ کرسی سے اٹھی۔

"آؤ لیزا! تم بھی ہمارے ساتھ آجاؤ۔"

اس نے فوراً سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی الجھن کا شکار تھی کہ یہاں اگر کوئی اس کے ساتھ اپنائیت اور محبت سے پیش آئے تو اسے جواباً کیا کرنا چاہیے۔ سکندر نے اسے نہیں دیکھا تھا، اگرچہ وہ اس کا اپنی طرف دیکھنا محسوس کر چکا تھا۔ گویا اس کی مرضی تھی۔ اس نے جانا ہے تو جائے، نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے۔ وہ نویرہ کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆
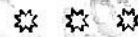
وہ یہاں آکر اتنی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا کہ وہ لیزا کو گائیڈ بھی نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ ماضی کو یاد کرنا، خود پر گزری قیامتوں کو سوچنا، اسے خود پر ترس کھانا لگ رہا تھا، مگر پھر بھی یہاں آکر پتا نہیں کیا کیا بھولا بسرا پھر یاد آنے لگا تھا۔ وہ تینوں اب پھر خاموش تھے۔

"ماشاء اللہ لیزا بہت پیاری ہے سکندر! تم سے سن کر جیسا میں سوچ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔"

وہ باپ بیٹا آپس میں مخاطب نہ ہوئے تھے۔ وہ باپ بیٹا نہیں جیسے دو اجنبی تھے، جنہیں ایک ہی جگہ لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے بیچ خاموشی اور فاصلہ تھا..... وہ بجائے انہیں یا آمنہ کو دیکھنے کے، لاتعلق سا بیٹھا سامنے لیزا کو جھیل کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں کی چھوٹی بہو اور پوتا بھی کھڑے تھے۔

"تم J.S انٹرنیشنل میں جاب کر رہے ہو؟"

اس نے شہریار خان کا سوال سنا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں صرف اجنبیت اور فاصلہ تھا۔ شہریار خان کی نگاہوں میں کیا تھا، اس نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"جی۔" بارہ سال پہلے اسے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ انہیں پاپا نہ کہے۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کا اس گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا وہ نہ انہیں پاپا کہہ رہا تھا نہ ماں کے سوا یہاں کسی کو اپنا سمجھ رہا تھا۔

"بہت اچھی کمپنی ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔" شہریار خان اس سے سنجیدگی سے بولے تھے۔

آگے بڑھنے کے مواقع؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر تلخی پیدا ہوتی تھی۔ کیا آگے بڑھنے کے راستے اس کے لیے بند نہیں کر دیے گئے تھے؟ کیا اسے ذلت بھری کھائی میں دھکیل نہیں دیا گیا تھا؟ کیا اس کا پندار، اس کا وقار، اس کی شخصیت کی آن بان اس سے چھین نہیں لی گئی تھی؟ کیا اسے یہ نہیں بتا دیا گیا تھا کہ وہ ان سب کے لیے مر چکا ہے، کیا اسے رسوائیاں اور ذلتیں نہیں بخش دی گئی تھیں؟

کم از کم ان لبوں پر اس کی ترقی اور آگے بڑھنے کی بات بجتی نہیں تھی۔ ان لبوں سے تو اس کی تباہی و بربادی ہی کی باتیں اچھی لگا کرتی تھیں۔ اس سے اظہار نفرت اور اعلان لاتعلقی ہی سجا کرتا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر کسی بھی طرح کے جذبات کو آنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو مکمل طور پر سپاٹ، سرد اور غیر جذباتی کر رکھا تھا۔

✲ ✲ ✲

علی پانی کے پاس جھک کر کھڑا رنگ برنگی مچھلیوں کو خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس کھڑی تھیں۔

"سکندر بھائی کی پسند لاجواب ہے۔ میں نے جب سے اموجان سے سنا تھا سکندر بھائی کی ہونے والی بیوی اٹالین ہے تصور ہی تصور میں تمہارا ایک خاکہ بنایا تھا۔ اٹالین مرد اور عورتیں بہت خوب صورت ہوتے ہیں ناں۔"

نویرہ بے تکلفی سے اس سے بولی تھی۔ وہ عمر میں شاید اس سے ایک' دو سال چھوٹی تھی مگر بے تکلفی سے اسے تم کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تعریف پر مسکرائی۔

"تھینکس۔"

"تم اردو کیسے بول لیتی ہو؟ ہم تو سمجھ رہے تھے ہمیں تم سے انگلش میں بات کرنی پڑے گی۔"

"میں مکمل اٹالین نہیں ہوں۔ میرے پاپا پاکستانی ہیں۔"

"ہاں یہ تو مجھے پتا ہے۔ اموجان نے بتایا تھا۔ مگر تم دیکھنے میں بالکل اٹالین لگتی ہو۔ اگر اردو نہ بولو اور یہ پاکستانی ڈریس نہ پہنا ہو تو تم مکمل اٹالین لگتی ہو۔"

یہاں سکندر نہیں تھا' اس لیے وہ جواباً" کھل کر مسکرائی۔ وہ یہاں سکندر کے حوالے سے ان لوگوں سے مل رہی تھی مگر اس سے خود سے بے تحاشا خوش اخلاقی' گرم جوشی اور محبت سے ملتی اس لڑکی سے رکھائی نہیں برتی جا رہی تھی۔

"سب یہی کہتے ہیں۔ ایکچوئلی میں شکل صورت میں اپنی ممی پر ہوں۔ تم میری بہن سے ملو تو وہ تمہیں بالکل پاکستانی لگے گی۔ وہ شکل و صورت میں میرے پاپا پر ہے۔"

نویرہ نے جواباً" مسکرا کر سر ہلایا تھا۔ "تم سکندر بھائی سے کہاں ملیں؟"

"روم میں۔"

"روم میں؟ واؤ! سو رومانٹک۔ اتنی رومانٹک جگہ پر مل کر تو یہ رشتہ بننا ہی تھا۔ کیا سکندر بھائی نے ٹریوی میں تین کوائنز (سکے) اچھالے تھے؟" نویرہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ جواباً" کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"تین کوائنز نہیں اچھالے تھے پھر بھی ہماری شادی ہو رہی ہے۔"

نویرہ بھی زور سے ہنسی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی دور کرسیوں پر بیٹھے شہریار خان' آمنہ اور سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر نپے تلے سنجیدہ سے انداز میں آمنہ سے باتیں کر رہا تھا۔ سکندر اور شہریار خان کے بیچ وہ کرسی خالی تھی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ شہریار خان بظاہر وہاں بیٹھے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ مگر ان کی نگاہیں مسلسل سکندر پر تھیں۔ اسے شہریار خان کی شخصیت بڑی الجھی ہوئی سی لگی۔ وہ خود کو ظاہر کچھ اور کر رہے تھے' ان کے اندر کچھ اور تھا۔ وہ بظاہر فخر و غرور سے سرہانے بیٹھے تھے' ان کی شخصیت باوقار اور بارعب نظر آ رہی تھی۔ مگر اسے ان کی آنکھوں میں مسلسل ایک بے چینی اور ایک اضطراب نظر آ رہا تھا۔ جو سطح پر نظر آ رہا تھا شاید گہرائی میں وہ نہیں تھا۔ شاید وہ اندر سے بہت مختلف انسان تھے۔ اسی وقت کسی ملازم نے آکر آمنہ سے کچھ کہا تھا۔ آمنہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کو آواز دی تھی۔

"نویرہ۔ لیزا بیٹا! آجاؤ تم لوگ کھانا لگ گیا ہے۔"

چونکہ رات زیادہ ہونے سے قبل ان لوگوں کو واپس بھی پہنچنا تھا اس لیے کھانا جلدی لگا لیا گیا تھا۔

"آجاؤ لیزا!" نویرہ اپنائیت سے اس سے بولی۔ علی بھاگتا ہوا وہاں جا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے وہاں آگئی تھیں۔ آمنہ' شہریار خان اور سکندر بھی کرسیوں پر سے اٹھ چکے تھے۔

"زین کہاں ہے؟ بلاؤ اسے بھی۔" آمنہ نے نویرہ سے کہا۔

"جی اموجان! میں بلا کر لاتی ہوں۔" اس نے فوراً سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر کا چہرہ ہنوز بے تاثر تھا۔ گویا زین کے آنے یا نہ آنے سے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نویرہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
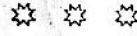
فارم ہاؤس کے روز گارڈن میں ڈنر کے لیے میز اور کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ چاروں اطراف کئی رنگوں اور قسموں کے گلاب نظر آرہے تھے۔ ان کے دلکش رنگ اور بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر اور خوشگوار بنا رہی تھی۔

گارڈن کی تمام لائٹس آن کردی گئی تھیں۔ اگرچہ ابھی مغرب کا ہی وقت تھا اور اندھیرا پھیلا نہیں تھا۔ مگر وہ جگہ گولڈن لائٹس سے جگمگا دی گئی تھی۔ گارڈن سے اس پار' قدرے فاصلے پر باربی کیو ہو رہا تھا اور گرم گرم نان بھی وہیں لگ رہے تھے۔

وہ سب لوگ کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ ملازمین نے بڑی پھرتی اور مستعدی سے میز پر گرم گرم نان اور باربی کیو ڈشز لاکر سرو کرنا شروع کی تھیں۔ اسی وقت اس نے نویرہ کو ایک ہینڈسم شخص کے ساتھ اس طرف آتا دیکھا۔ سکندر سے مشابہت نہ تھی' پھر بھی نویرہ کے ساتھ اسے آتا دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ سکندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ ہینڈسم تھا مگر سکندر جتنا نہیں۔ اس کی شخصیت سکندر جیسی شان دار نہیں تھی۔

سکندر اپنے پاپا پر تھا اور اس کا بھائی اموجان پر۔ اسے وہ نویرہ کے ساتھ چلتا اس کی دوستانہ فطرت کے بالکل برعکس لگ رہا تھا۔ بے تحاشا سنجیدہ چہرہ اور ایسا انداز جیسے اسے یہاں جبراً "لایا" گیا ہے۔ وہ میز تک آگیا تھا۔ لیزا نے سکندر کی طرف دیکھا۔

وہ زین کو نظرانداز کرکے اپنے موبائل پر آیا کوئی میسج دیکھنے لگا تھا۔ زین نے بھی میز پر بیٹھے تمام لوگوں کی طرف دیکھا تھا سوائے سکندر کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نظرانداز کر رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" زین بطور خاص کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر سلام کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میز پر بیٹھے جس فرد کا دل چاہے' یہ سمجھ لے کہ اس نے اسے سلام کیا ہے۔

وہ سکندر کے برابر بیٹھی تھی اور سکندر کے دائیں جانب آمنہ بیٹھی تھیں۔ زین سامنے والی کرسی پر نویرہ کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ علی شہریار خان کے برابر بیٹھا تھا۔ اسے ان دونوں بھائیوں کے چہروں پر تناؤ اور سختی نظر آئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

باقی تمام افراد ماحول کی اس ٹینشن کو بظاہر نظرانداز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر درحقیقت وہ سب اس تناؤ کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

"لیزا! تم ٹھیک سے لو بیٹا!" اس نے شہریار خان کی آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ نجانے کیوں اسے ان کی نگاہوں میں ایک باپ کی بے بسی نظر آئی۔

نویرہ میاں کا موڈ دیکھ کر اس وقت بالکل خاموش تھی۔ آمنہ اور شہریار خان ماحول کی گمبھیرتا اور تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ہاں لیزا! لو بیٹا۔" آمنہ بھی فوراً بولیں۔

"میں لے رہی ہوں۔" وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ سکندر نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد ڈال رکھا تھا۔ وہ پلیٹ میں کانٹا ادھر ادھر گھما کر بے رغبتی سے کھا رہا تھا۔ یہ سلاد بھی جیسے اس نے مروتاً" اور مجبوراً" کھا لیا تھا۔ شہریار خان نے ملازم کو آواز دے کر بلایا تھا۔ ملازم دوڑا دوڑا فوراً" وہاں آیا تھا۔

"وہ مٹن سجی اور لے کر آؤ' بالکل گرم اور اچھی بنی ہوئی۔"

ملازم ان کا حکم سنتے ہی فوراً" واپس پلٹا تھا۔ اب وہ اس سے مخاطب تھے۔

"تمہارے اٹالین کھانوں کی طرح ہمارے پاکستانی کھانوں میں بھی تمہیں بہت ورائٹی ملے گی۔"

زین سب سے لاتعلق سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا۔ کسی کی بھی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ زین کو تہذیب سے بغور دیکھ کر پتا نہیں کیوں بار بار اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟ لیکن کب؟ کہاں؟ اسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا۔

"جی انکل! مجھے پتا ہے پاکستانی کھانے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔"

ملازم مٹن بجی خوب صورت ڈش میں رکھ کر لے آیا تھا۔ شہریار خان نے خود اس کا ایک پیس کاٹ کر اس کی پلیٹ میں رکھا تھا۔

"یہ ٹرائی کرو تمہیں اچھی لگے گی۔ سکندر کی پلیٹ میں بھی ڈالو۔"

انہوں نے ڈش اس کی اور سکندر کی طرف بڑھائی تھی۔ اس نے محسوس کیا آمنہ اور نوریہ شہریار خان کو حیرت سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یوں دیکھ رہی تھیں گویا وہ اپنے مزاج سے ہٹ کر کچھ کام کر رہے تھے۔

"تمہیں دوں سکندر؟" اس نے آہستگی سے اس سے پوچھا۔

اس نے سنجیدگی سے نفی میں سرہلا دیا تھا۔ اس نے شہریار خان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اور سکندر ہی کو دیکھ رہے تھے۔

سکندر کا انکار میں ہلتا سر انہوں نے دیکھا تھا۔ اسے ایک بار پھر شہریار خان کے چہرے پر غم اور بے بسی نظر آئی تھی۔

زین ہر چیز کھا رہا تھا۔ اس طرح جیسے یہاں صرف اور صرف کھانا کھانے ہی کے لیے آکر بیٹھا تھا۔ سب کھانا کھا چکے تب کھانے کی میز سے سب سے پہلے اٹھنے والا زین تھا۔

"تم کہاں چلے؟" شہریار خان نے اس سے پوچھا۔

"سر میں تھوڑا درد ہے پاپا! کمرے میں ریسٹ کروں گا۔" سنجیدگی سے بولتا وہ فوراً" وہاں سے جانے کے لیے مڑا تھا' بغیر ان دونوں کو خدا حافظ کہے۔ جیسے وہ سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے مخاطب ہونا تو درکنار ان کی شکلیں تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

اسے زین اچھا نہیں لگا تھا۔ جو بھی ناراضی تھی مگر اس کا بھائی پورے بارہ سال بعد اس کے سامنے آیا تھا۔ کیا وہ مروتا" بھی بھائی کے ساتھ سلام دعا نہیں کر سکتا تھا؟ سکندر کا دکھ اس نے پھر نئے سرے سے محسوس کیا تھا۔ ظلم بھی اسی کے ساتھ ہوا تھا اور مجرموں جیسا سلوک بھی اسی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ بجائے اس پر ہوئے ظلم پر شرمندہ ہونے کے وہ تو ابھی تک اس کے خلاف دل میں نفرت لے کر بیٹھا تھا۔

وہ سب بھی میز پر سے اٹھ گئے تھے۔ زین اندر جا چکا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔" سکندر سنجیدگی سے آمنہ سے بولا۔

"سب ساتھ کافی پی لیتے ہیں۔ پھر چلے جانا۔" شہریار خان نرم لہجے میں سکندر سے بولے۔

"دیر ہو جائے گی۔ لیزا کے پاپا گھر پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ جواباً" سنجیدگی ہی سے بولا تھا دو ٹوک سے انداز میں۔ گویا یہاں مزید نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔

اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر شہریار خان نے نوریہ کو کچھ اشارہ کیا تھا۔ وہ فوراً" وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ سب آہستہ قدموں سے چلتے روز گارڈن سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ لوگ واپس وہیں آگئے تھے' جہاں پر یہاں آنے کے بعد بیٹھے تھے۔ جھیل کے نزدیک والی جگہ۔

نوریہ تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جیولری باکس تھا۔ نوریہ نے وہ جیولری باکس آمنہ کو لا کر پکڑایا تھا۔ باکس کا سائز بتا رہا تھا اس میں سونے کی چوڑیاں یا کنگن ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ کیا اسے کوئی تحفہ یہاں سے لینا تھا یا نہیں لینا تھا؟

"بہت اچھی لگی ہو تم مجھے۔ اللہ تمہیں اور سکندر کو ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ تمہارے دل یونہی محبت سے ملے رہیں۔" آمنہ نے دعائیں دیتے ہوئے وہ

باکس لیزا کی طرف بڑھایا تھا۔
"یہ چھوٹا سا تحفہ تمہارے لیے۔ میری طرف سے۔"
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ سکندر ان سے بولا۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے اموجان! کسی بھی تحفے سے زیادہ قیمتی ہمارے لیے آپ کی دعائیں ہیں۔ آپ بس ہمیں اپنی دعائیں دیں۔"
اس کا لہجہ عزت اور احترام لیے مہذب سا تھا مگر اس کی نگاہوں میں سختی اور انکار تھا۔ وہ یہاں سے کچھ نہیں لے گا۔ نہ اپنے لیے نہ اپنی بیوی کے لیے۔
"پھر بھی بیٹا! میری خوشی تھی۔ میری بہو پہلی بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔"
آمنہ کا لہجہ مرجھا سا گیا تھا۔ مگر اس وقت سکندر نے ماں کے لہجے میں شامل دکھ کو، ان کی آنکھوں میں در آئی نم کو نظر انداز کر دیا تھا۔
"تو آپ نے اسے اتنی ڈھیر ساری دعائیں دی تو ہیں دنیا کا قیمتی سے قیمتی تحفہ آپ کی دعاؤں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔"
وہ خاموش تماشائی کی طرح ماں اور بیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے شہریار خان کو آمنہ کی طرف اشارہ کرتے دیکھا کہ وہ سکندر سے مزید اصرار نہ کریں۔ جیسے وہ سمجھ گئے تھے۔ سکندر سے کتنا بھی اصرار کر لیا جائے وہ یہاں سے ایک کنکر یا پتا تک لے جانے کا روادار نہ ہو گا۔
اس نے صرف آمنہ ہی کے نہیں شہریار خان کے چہرے پر بھی مایوسی پھیلتی دیکھی۔ اس کی طرح نویرہ بھی اس سچویشن میں بالکل خاموش تھی۔ آمنہ شوہر کا اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔
"اچھا بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی تھیں۔
واپسی میں نویرہ اور آمنہ کے ساتھ شہریار خان بھی انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ آمنہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

"ابھی ہو ناں تم دونوں یہاں پر؟"
"جی اموجان!" وہ مسکرا کر بولی۔
وہ سکندر کو اس کے ہر رویے کے لیے سو فیصد حق پر سمجھ رہی تھی مگر پھر بھی اس پل اسے اس کے ماں باپ سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بہت دکھی لگے تھے۔
آمنہ اب سکندر سے مل رہی تھیں۔ اسے پھر گلے لگا رہی تھیں۔
"کل مجھ سے ملو گے ناں؟" سکندر نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا جیسے باقی سب کے سامنے، وہ ماں سے بھی فاصلے پر چلا گیا تھا۔
"اللہ حافظ۔" اسے محسوس ہوا تھا کہ آمنہ کے ملنے کے بعد شہریار خان سکندر کی طرف بڑھے تھے۔ مگر ان کے بڑھنے سے پہلے سکندر سب کو اللہ حافظ کہتا گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔
"اللہ حافظ انکل!" اس نے انہیں الوداع کہا تھا۔ انہوں نے بزرگانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔
"خوش رہو بیٹا!" اس نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو اسے ان کی نظروں میں دکھ اور بے بسی نظر آئی تھی۔ نویرہ سے بھی خوشگوار انداز میں گلے مل کر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔
ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ تینوں افراد وہیں کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ نویرہ اور آمنہ ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ شہریار خان سنجیدہ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی دکھ اور بے بسی نظر آ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

واپسی میں سارا راستہ سکندر بالکل خاموش تھا۔ اسے وہ بہت تنہا بہت دکھی اور بہت اداس لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا تلخ ترین ماضی کسی آسیب کی طرح پھر اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"اداس ہو؟"

"ہاں۔" وہ ایک گہری' دکھ بھری سانس لے کر بولا۔

"میرے ہوتے ہوئے اداس کیوں ہو رہے ہو سکندر! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ چاہے ساری دنیا تمہارے خلاف ہو جائے میں تب بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

وہ مضبوط لہجے میں اس سے بولی۔ سکندر کے اداس چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ آئی تھی۔

"لیزا! تمہاری یہ محبت' تمہارا یہ ساتھ ہی اب میرے لیے زندگی گزارنے کی وجہ ہے۔ تم ساتھ ہو تو میں خود کو زندہ محسوس کر رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو زندگی ہے لیزا۔"

وہ سکندر کے ہر لفظ میں سچائی پا رہی تھی۔ وہ اس شخص کا ساتھ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک نبھائے گی۔ جنہوں نے اسے دکھ دیا' اسے چھوڑ دیا' وہ ان لوگوں کی طرح کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ وہ اسے اب کبھی محبت اور رشتوں سے بے اعتبار نہ ہونے دے گی۔

☼ ☼ ☼

سکندر اسے محمود خالد کے گھر ڈراپ کر کے اپنے ہوٹل چلا گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو لاؤنج میں محمود خالد اور عائشہ کے ساتھ سیم اور ہاشم بھی بیٹھے نظر آئے۔

سیم کے ساتھ ساتھ ہاشم بھی اسے دیکھتے ہی صوفے سے کھڑا ہوا تھا۔ اپنی بہن کی زندگی اجاڑنے والے اس شخص سے اسے نفرت تھی پھر بھی وہ مصلحتاً اس سے مسکرا کر ملی تھی۔

"اتنا قریبی رشتہ اور ہم اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں لیزا۔" ہاشم اس سے مسکرا کر بولا۔

"مریم جب بھی لندن یا روم تم سے ملنے جاتی تھی میں اس سے کہتا بھی تھا کہ میں بھی چلتا ہوں۔ اپنی اکلوتی سالی صاحبہ سے ایک بار ملاقات کا شرف تو حاصل ہو جائے۔ مگر مریم مجھے منع کر دیتی تھی۔ اب پوچھو اس سے' یہ مجھے تم سے کیوں نہیں ملواتی تھی؟"

وہ دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں بولا تھا۔

"ایسے ہی بول رہا ہے ہاشم۔ خود کے پاس ٹائم ہوتا نہیں ہے بزنس ٹرپس سے ہٹ کر کہیں جانے کا۔" سیم جواب دیتے ہوئے اس سے گلے ملنے لگی تھی۔

"کتنی دیر سے آئی ہوئی ہوں تم سے ملنے کے لیے۔ تم پتا نہیں کہاں گھومتی پھر رہی ہو۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں سیم۔ میں سکندر کے گھر والوں سے ملنے گئی تھی۔"

ہاشم صوفے پر واپس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اور محمود خالد ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیم کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

ہاشم کی تصویر اس نے بے شک دیکھ رکھی تھی۔ مگر آمنے سامنے اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ خاصا ہینڈسم اور باوقار مرد لگ رہا تھا۔

"کیسی رہی تمہاری اپنے سسرال میں دعوت؟" سیم بغور اس کے پاکستانی لباس اور تیاری کو دیکھ رہی تھی۔

"اچھی رہی۔" سب کے سامنے وہ محتاط ہو کر بول رہی تھی۔ اکیلے وہ دونوں بہنیں ہوتیں تو وہ طویل تبصرہ کرتی سیم سے سکندر کے گھر والوں کے متعلق۔

"یہ تم نے پاکستانی ڈریس کب سے پہننے شروع کر دیے۔"

سیم اس سے ہنس کر بولی۔ اس کا انداز قدرے مذاق اڑانے والا تھا۔ وہ اپنی تیاری کے متعلق پچی رہتی تھی۔

"کیوں کیا اچھا نہیں لگ رہا مجھ پر یہ ڈریس؟" کیا سکندر' اس کی امو جان' پاپا اور عائشہ نے اس کا دل رکھنے کو اس کی جھوٹی تعریف کی تھی۔ کیا واقعی یہ لباس اس پر اچھا نہیں لگ رہا تھا؟ سیم کہہ رہی تھی تو ایسا ہی

ہو گا۔ سیم اسے کبھی کچھ غلط مشورہ نہیں دیتی۔
"تم جس طرح کے کپڑے پہنتی ہو' اس میں زیادہ پیاری لگتی ہو۔" سیم اس سے پیار سے بولی تھی۔
"مگر مجھے تو کلثوم اس لباس میں زیادہ پیاری لگ رہی ہے۔ اس کے ساس سسر کو بھی اچھا لگا ہو گا کہ وہ ان سے ملنے پاکستانی لباس پہن کر آئی ہے۔"
محمود خالد سنجیدہ لب و لہجے میں سیم سے بولے تھے۔ ان کا انداز ایک نامحسوس سی سختی لیے ہوئے تھا۔ وہ حیران ہو کر اپنے پاپا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی ملازمہ چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ کیک اور بادام کا حلوہ بھی تھا۔ محمود خالد فوراً" داماد کی مہمان نوازی کرنے لگے تھے۔ وہ اسے اصرار کر کے حلوہ لینے کو کہہ رہے تھے۔
"بڑی خاص جگہ کا حلوہ ہے ہاشم! چکھ کر دیکھو۔ تمہیں ضرور پسند آئے گا۔" وہ ہاشم کی پلیٹ میں خود حلوہ ڈال رہے تھے۔
بیٹی کے ساتھ تلخ لہجہ اور داماد کی آؤ بھگت؟ اسے اپنے پاپا کا انداز سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ سیم کو بھی محمود خالد کا انداز برا لگا تھا مگر وہ میاں کی موجودگی کے سبب زبردستی مسکرا رہی تھی۔
"چلو اچھا ہے لزا! تم پاکستانی ڈریس پہن پہن کر اپنے پاکستانی میاں کو خوش کرنا۔"
"مریم! میاں تو تمہارا ابھی پاکستانی ہے۔" ہاشم حلوہ کھاتے ہوئے اس سے ہنس کر بولا۔ عائشہ سب کو چائے سرو کرنے کے لیے اٹھنے لگی تھیں۔
"آپ بیٹھیں ممی! میں دے دیتی ہوں۔" سیم نے انہیں پیار سے منع کیا تھا۔ وہ خود سب کو چائے سرو کرنے لگی تھی۔
"میری بات الگ ہے ہاشم! لیزا تو بڑی پکی تھی اس معاملے میں کہ کسی پاکستانی سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ پاکستانی مردوں سے سخت نفرت کرتی ہے لزا۔"
اسے سیم کے جملے میں کوئی بھی بات بری یا قابل اعتراض نہیں لگی تھی مگر اس نے محمود خالد کے چہرے پر پھر سختی اور غصہ آتے دیکھا تھا۔ وہ غصے کو دبا رہے تھے۔ انہیں سیم کی بات بری لگی تھی۔ وہ بظاہر مسکرا کر سیم سے بولے تھے۔
"انسان کی سوچ اور خیالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے مریم! میں آج سکندر سے ملا ہوں۔ مجھے وہ بہت پسند آیا ہے۔ میں کلثوم کے فیصلے سے بہت مطمئن ہوں۔"
ان کی مسکراہٹ کے باوجود اسے ان کی آنکھوں میں سختی نظر آتی تھی۔ ان کے لہجے اور آنکھوں میں سیم کے لیے ایک نامحسوس سی سختی اور تنبیہہ تھی۔ بظاہر کچھ محسوس نہ ہو مگر سننے والا محسوس کر جائے کہ کہیں کوئی رنجش ہے دلوں میں۔ سیم پر ظلم کر کے کیا اب بھی پاپا اس سے ناراض تھے؟ ناراض سیم کو ہونا چاہیے تھا مگر ناراض وہ تھے؟
بیٹی کے مقابلے میں ان کا داماد سے بات کرنے کا انداز بہت محبت بھرا تھا جیسے ہاشم انہیں بے حد پسند ہو۔ اسے تھوڑی سی دیر ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے پاپا سیم سے ناخوش تھے' اس سے خفا تھے۔ پتا نہیں ہاشم اور عائشہ کو یہ بات پتا تھی یا نہیں پتا تھی۔
جب وہ چند لمحوں میں ان کے لہجے کی سختی محسوس کر گئی ہے تو کیا ہاشم اور عائشہ نہیں کرتے ہوں گے؟ پہلے سیم کی شادی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف کروا دی' صرف اپنے کاروباری فائدے کے لیے اور اب اس سے خفا بھی ہیں۔ اس کی نگاہوں میں باپ کی ایک برائی اور بڑھی تھی۔
"پھر کب ملوا رہی ہو تم مجھے سکندر سے؟" سیم نے محمود خالد کی بات پر کچھ خاص دھیان دیے بغیر اس سے پوچھا۔
"جب تم کہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ وہ کھانا کھا کر آئی تھی۔ اس لیے صرف چائے پی رہی تھی۔
"بس پھر کل بلا لو سکندر کو ہمارے گھر لنچ یا ڈنر پہ۔ تمہیں تو میں ابھی اپنے ساتھ لے کر جا ہی رہی ہوں بس اب تم تین' چار دن میرے پاس بھی رہو۔ کیوں ہاشم! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟" سیم نے لاڈ رکھنے والے انداز میں اسے مخاطب کیا اور پھر اپ

شوہر کو بھی شامل گفتگو کرنا چاہا۔
"ہاں بالکل۔ چلو لیزا! ہمارے ساتھ۔ اب کچھ ہمیں بھی مہمان نوازی کا موقع ملنا چاہیے۔" ہاشم مسکرا کر پہلے سیم اور پھر اس سے بولا۔
"کیوں انکل! ہم لیزا کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں؟" ہاشم نے محمود خالد سے پوچھا۔
"پاپا کو کیا اعتراض ہو گا۔ بس لز تم جلدی سے اپنا بیگ پیک کرو۔ تم ابھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔" سیم نے مسکرا کر حق رکھنے والے انداز میں کہا۔
وہ سیم کے ساتھ جانے کے لیے بخوشی تیار تھی۔ قبل اس کے کہ وہ ہامی بھرتی محمود خالد فوراً بولے۔
"ہاشم بیٹا! کلثوم ابھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا پائے گی۔ دراصل کل میں اور عائشہ اسے اس کی شادی کی شاپنگ کرانے لے جا رہے ہیں۔ کپڑے، زیور وغیرہ۔ ابھی تو کلثوم ہے ناں یہاں۔ شادی کی شاپنگ پوری ہو جائے پھر آ جائے گی یہ تم لوگوں کے پاس۔"
محمود خالد مسکرا کر داماد سے بولے۔ سیم کو وضاحت دینے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس داماد کو صاف انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔
کون سی شاپنگ؟ کیسی شاپنگ؟ اس کا ہرگز ہرگز کوئی پروگرام نہیں بنا تھا اپنے باپ یا عائشہ کے ساتھ کل یا ابھی بھی شادی کی شاپنگ کرنے کا۔ مگر اب بیچ محفل میں وہ باپ کی بات کو جھوٹا قرار دے سکتی تھی اور نہ ہی انکار کر کے انہیں شرمندہ کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔
"اچھا یہ بات ہے تو ٹھیک ہے، پھر ہم کل کے لیے اصرار نہیں کرتے۔ مگر لیزا! شاپنگ ختم کرتے ہی تم نے ہمارے پاس آنا ہے۔ چند دن ہمارے ساتھ بھی رہو۔"
ہاشم اس سے مسکرا کر بڑے بھائی کے سے انداز میں بولا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ سیم کا موڈ آف ہو گیا ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ سیم کو ان کے پاپا کے جھوٹ کی سمجھ آ گئی ہے۔ وہ جانتی ہے۔ شاپنگ کی بات محض ایک جھوٹ ہے، اسے سیم کے گھر پر جانے سے روکنے کے لیے۔
کیا واقعی اس کے پاپا اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے؟
کیا وہ اپنی سازش کامیاب کروانے کے لیے سیم کو اس سے دور رکھ رہے تھے تاکہ سیم اس کی کوئی مدد نہ کر سکے؟
ہاشم کا ابھی مزید بیٹھنے کا موڈ تھا مگر سیم ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھی تھی۔
"میرا خیال ہے ہاشم! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ پاپا جلدی سو جاتے ہیں۔ ان کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔"
"ارے ایک آدھ دن دیر سویر چلتی ہے۔ تم لوگ بیٹھو۔ مزا آ رہا ہے سب ساتھ بیٹھے ہیں۔" عائشہ مسکرا کر سیم سے فوراً بولیں۔
"نہیں ممی! میں پھر آؤں گی۔"
اسے سیم جھنجلائی ہوئی اور خفا لگ رہی تھی۔ وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

☼ ☼ ☼

سیم اور ہاشم کے چلے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔ اسے اپنے پاپا کا سیم کے ساتھ سخت انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
"بیٹا! میں اندر آ جاؤں؟" محمود خالد نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر اس سے پوچھا۔
"جی پاپا! آئیے پلیز۔" وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ محمود خالد اندر آ گئے تھے۔ وہ بے تحاشا سنجیدہ تھے۔ وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔
"سوئیں نہیں ابھی تک؟"
"جی بس سونے لگی تھی۔" وہ انہیں قدرے حیرت سے دیکھ کر بولی۔

جب وہ چھوٹی تھی اس کے باپ کے پاس اس سے بات کرنے کی فرصت تھی نہ وقت اب ـــــــ جب وہ بڑی ہو گئی تب ان کے پاس اس کے لیے وقت اور فرصت دونوں آ گئے مگر اب وہ چھوٹی سی لیزا کہاں سے آتی؟ وہ ان سے ہمیشہ بہت دور رہی تھی۔ باپ بیٹی نے کبھی ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے سے دل کی بات نہ کی تھی۔ اس لیے اس وقت وہ انہیں بہت حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

"تم سے تھوڑی دیر بات کرلوں؟ آج میرا دل چاہ رہا ہے تم سے دل کی باتیں کرنے کو۔"

انہوں نے رسانیت سے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ انہیں تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں کلثوم! تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں۔ مجھے خود اپنے آپ سے بھی بہت شکایتیں ہیں بیٹا!"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"میں تم بہنوں کے لیے ایک اچھی ماں نہ لاسکا۔ میں نے ایک بری عورت سے شادی کی۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ پھر جب میں نے اپنی اس غلطی کو ٹھیک کرنا چاہا تب شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری اس غلطی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں تم نے بہت سفر کیا اور مریم ـــــ"

وہ نسیم کا ذکر کر کے کچھ بولتے بولتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر درد اور کرب ابھر آیا تھا۔ پچھتاوے ان کی آنکھوں سے جھانک رہے تھے۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔" وہ اسے کچھ بتاتے بتاتے چپ ہو گئے تھے۔

"ماضی میں جو ہو چکا وہ ہو چکا کلثوم! ہم میں سے کوئی بھی اب اسے تبدیل نہیں کرسکتا۔ میں چاہتا ہوں تمہارے دل میں میرے لیے جتنی بھی ناراضیاں ہیں تم ان سب کو دل سے نکال کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم میری بہت پیاری بیٹی ہو۔ تم نے شادی کے لیے ایک اچھے شخص کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے سکندر بہت پسند آیا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سچائی اور تمہارے لیے محبت دیکھی ہے۔ وہ جو میرے دل میں ایک خوف سا تھا ناں کلثوم! کہ کہیں صرف میری ضد میں کسی کے کہنے میں آکر تم کسی غلط آدمی کا انتخاب نہ کرلو۔ الحمدللہ دور ہو گیا ہے۔ میرا دل تمہارے مستقبل کے حوالے سے مطمئن ہو گیا ہے بیٹا!"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ گلا رندھ گیا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار یوں اپنے جذبات کا اس سے اظہار کر رہے تھے۔

"پاپا!" باپ کی آنکھوں کی نمی اور لہجے میں شامل جذبات کی شدت اس کی آنکھوں میں بھی نمی لے آئی تھی۔

"پاپا!" اس کی آنکھیں یک دم ہی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ باپ کے اتنے نزدیک بیٹھ کر ان کی آنکھوں میں نمی دیکھتے ہوئے وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ محمود خالد نے یک دم ہی اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔

"کلثوم! مجھے معاف کردو بیٹا! میری سب غلطیوں کے لیے مجھے معاف کردو۔ میری غلطیوں کی سزا میں اب خود کو مزید کوئی نقصان مت پہنچانا بیٹا!"

وہ روتے ہوئے اس سے کہہ رہے تھے۔ وہ باپ کے سینے پر سر رکھے بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ بچپن کی محرومیاں، بچپن کے دکھ نجانے اسے کیا کیا رلا رہا تھا۔

"میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں کلثوم! میری جان، میری زندگی ہو تم۔ میں تمہیں کبھی کسی دکھ، کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرے ہوتے ہوئے تم پانچ سال سے تنہا رہ رہی ہو، میرا دل کٹتا تھا بیٹا! تمہاری اس تنہائی اور اکیلے پن پر۔"

باپ سے اپنی کوئی ناراضی، کوئی گلہ، کوئی شکوہ اس پل اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ محمود خالد روتے ہوئے اس سے بول رہے تھے۔

"تمہارا دل شفاف ہے بیٹا! اس لیے تم سب کو اپنا

طرح سمجھتی ہو۔ مگر میری جان! دنیا تمہاری طرح سچی اور شفاف نہیں ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔ لوگوں کو سمجھنا سیکھو۔ دلوں میں چھپی نفرتیں اور محبت لیے چہروں کے پیچھے چھپے اصلی اور بد صورت چہرے پہچاننا سیکھو۔"

انہوں نے اس کا سر اپنے سینے پر سے ہٹایا تھا۔ اب وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کیں۔ خود کو سنبھالا' وہ اسی طرح بے آواز روئے جا رہی تھی۔ برسوں کے جمع کیے اشک تھے انہیں نجانے کتنی دیر تک بہتے رہنا تھا۔ مگر اسے اپنے باپ کی کوئی بھی نصیحت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے آنسو صاف کرنے کے بعد اب وہ اپنے پوروں پر اس کے آنسو چن رہے تھے۔

"تم سے ایک بات کہوں' مانو گی؟"

"جی پاپا!" اس نے آنسو بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے یکدم ہی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

"تم مریم کے گھر مت جانا بیٹا!"

"کیوں پاپا!" وہ بے طرح حیران ہوئی تھی۔

"بس میں تم سے کہہ رہا ہوں اس لیے۔ اگر میری محبت کا یقین کرتی ہو تو مریم کے گھر ہرگز مت جانا۔ جب تک پاکستان میں ہو' میرے ہی پاس رہو۔"

وہ اس کے ماتھے پر پیار کر رہے تھے۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اگرچہ وہ ان کے ایسا کہنے کی وجہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔ اب تم سو جاؤ۔"

وہ اس کے پاس سے اٹھنے لگے تھے۔ یکدم ہی اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"پاپا! آئی لو یو۔"

محمود خالد بے ساختہ مسکرائے تھے۔ خوشی سے بھری' طمانیت لیے مسکراہٹ۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"جان پاپا! پاپا بھی تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

وہ اسے بہت محبت' بہت شفقت سے دیکھ رہے تھے

☼ ☼ ☼

وہ اپنی اسٹڈی میں راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے۔ جب ظالم اپنے مظالم کا حساب کرنے بیٹھتا ہے تو نیند آنکھوں سے یونہی دور ہو جاتی ہے جیسے ان کی آنکھوں سے۔ چند گھنٹے پہلے وہ اپنے اس بیٹے سے مل کر آئے تھے جس کی زندگی اجاڑ ڈالنے کے وہ ذمہ دار تھے۔ جس سے اس کی شخصیت کی آن بان' اس کی انا اور وقار سب کچھ چھین لینے کے وہ مجرم تھے۔

جو کسی کو جان سے مارے اسے پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے مگر جو کسی کی روح کا قتل کرے' اس کے لیے کیا سزا ہوتی ہے؟

باپ تو اولاد کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں بیچ ڈالتا ہے۔ اولاد کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنی زندگی رہن رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ کیسے باپ ہیں؟ آخر وہ کیسے باپ ہیں؟ انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر دی۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ بالکل ٹھیک کر کے گیا ہے وہ آج ان کے ساتھ۔

اس نے انہیں پاپا کہہ کر مخاطب کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس نے ان کے گھر کا کھانا کھانا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو ان کا دیا تحفہ بھی قبول نہیں کرنے دیا۔ جیولر کو گھر پر بلا کر انہوں نے آمنہ کے ساتھ بیٹھ کر خود لیزا کو دینے کے لیے سونے کے چار کنگن خریدے تھے۔ آمنہ انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں اور وہ ان کی حیرت نظر انداز کیے رہے تھے۔

ٹھیک کیا سکندر نے ان کا تحفہ ان کے منہ پر مار کر چلا گیا۔ ان کا تو یہ منہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے تحفہ قبول کرنے پر اصرار ہی کر پاتے۔ آج ان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ سکندر سے اعتراف جرم ہی کر پاتے۔ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ پاتے۔

اس سے یہ کہہ پاتے کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے

ان- اپنے ہر ظلم پر بہت شرمندہ ہیں- وہ بالکل دور سے اسے ایرپورٹ پر چھپ کر کھڑے دیکھتے رہے تھے وہ دور کھڑے اسے کیزا کے ساتھ فارم ہاؤس میں آتا دیکھتے رہے تھے- کتنا خوبرو جوان ہو گیا تھا ان کا بیٹا- بھرپور' توانا' طاقت ور مرد-

اتنی اخلاقی جرأت ان میں نہ تھی کہ اسے اپنے سینے سے لگا سکتے- انہیں لگتا تھا وہ دھکیل کر انہیں خود سے دور ہٹا دے گا-

آمنہ ان کی آج کی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ رہی تھیں کہ انہوں نے سکندر اور ان کی ہونے والی بیوی کو اپنی خاندانی شان و شوکت بتانے کے لیے فارم ہاؤس پر مدعو کیا تھا- زین بھی یقیناً" یہی سمجھتا ہے اور سکندر بھی یہی سمجھا ہو گا اور وہ تینوں ایسا کیوں نہ سمجھیں؟ ساری زندگی انہوں نے خود کو جیسا ثابت کر کے دکھایا ہے' وہ سب انہیں ویسا ہی تو سمجھ رہے ہیں- رعونت اور غرور میں ڈوبے' خود پسندی میں مبتلا' اپنے اونچے خاندان پر فخر اور زعم کا شکار' ساری دنیا کو اپنے جوتے کی نوک پر سمجھنے والے شہریار خان..... ان کے بیوی اور بچے اگر آج انہیں ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں- اپنے اندر کی کمزوریاں اور خامیاں چھپائے رکھنے کو انہوں نے خود کو ساری زندگی لوگوں کے سامنے ظاہر ہی اسی طرح کیا تھا- ان کے بچے یہاں تک کہ ان کی بیوی بھی نہیں جانتیں کہ وہ دیوانگی کی حد تک سخت مزاج اور اصول پسند کیوں ہیں- انہوں نے بیوی اور بچوں کو اتنے سخت ماحول میں کیوں رکھا' جہاں صرف ان کا حکم چلتا تھا اور بیوی اور بچوں کی رعایا جیسی حیثیت تھی- وہ حکم دیں گے' بیوی تعمیل کرے گی- بیوی کو نہ بولنے کی اجازت تھی نہ اس کی کوئی رائے نہ پسند نہ مرضی-

بڑا بیٹا جوان سے اور ان کے باپ سے غیر معمولی حد تک مشابہت رکھتا تھا اور جو ان کے اور ان کے باپ کی طرح غیر معمولی ذہین تھا- اسے انہوں نے ہمیشہ اسی خوف اور آزمائش میں مبتلا کیے رکھا کہ وہ ان کے طے کردہ معیار پر پورا اترتا رہے- وہ اس کے لیے سب کچھ طے کرتے رہیں گے- وہ سر جھکا کر ان کی فرمائشیں پوری کرتا رہے- ان کے معیار کے مطابق خود کو ثابت کرتا رہے-

چھوٹا بیٹا جو نہ شکل و صورت میں ان پر ہے نہ ذہانت میں- اس پر انہوں نے کبھی وقت برباد ہی نہیں کیا تھا- ابتدا ہی میں نظر آگیا تھا' وہ ان کے اور ان کے باپ کی طرح غیر معمولی شخصیت اور ذہانت نہیں رکھتا-

بیوی اور بچوں کے لیے پیسہ بہت تھا' عیش و آرام بہت تھا- مگر انہیں ان کے سامنے سر اٹھانے کی اجازت نہ تھی- خود پسندی اور مغروریت کے ساتھ اپنے اعلا حسب نسب پر فخر کرنے کا احساس انہوں نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کے اندر انڈیلا تھا- وہ کسی کو بھی اپنی برابری کا نہیں سمجھتے تھے- کسی اور کو تو کیا' انہوں نے بیوی تک کو بھی اپنے دل کے اندر جھانکنے کی اجازت نہیں دی تھی-

جس خاندانی جاہ و حشمت اور فیملی بیک گراؤنڈ پر وہ فخر کرتے نظر آتے ہیں- اندر سے انہیں اس پر فخر نہیں' شرمندگی ہے' غصہ ہے' نفرت ہے- انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں کو ان کے دادا جی کی شان و شوکت' ذہانت اور قابلیت کے قصے سنائے تھے- اپنے باپ کو اپنے بچوں کے سامنے ایک آئیڈیل اور پرفیکٹ انسان کے طور پر پیش کیا تھا-

کون جان سکتا تھا کہ اپنے اسی آئیڈیل اور پرفیکٹ باپ سے وہ انتہا کی حد تک نفرت کرتے تھے-

وہ اپنے باپ کو نہ کل معاف کر پائے تھے' نہ آج معاف کرنے کا ظرف ان میں پیدا ہو سکا تھا-

ان کے اس سخت اور کھردرے مزاج کا ذمہ دار کوئی اور نہیں' ان کا اپنا سگا باپ تھا-

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ کو بہت سخت مزاج انسان پایا تھا۔ وہ حاکمانہ طبیعت کے حامل تھے۔ بیوی' بچوں پر رعب رکھنے والے شہریار خان اپنے بابا کے اکلوتے بیٹے تھے مگر ان کی کبھی مجال نہ ہوئی تھی کہ باپ سے بے تکلف بات چیت کر سکیں۔ باپ تک اپنی ہر خواہش اور فرمائش پہنچانے کے لیے وہ تینوں ماں کا سہارا لیتے تھے۔

ان کی امی جی جو ان کے بابا کے آگے جھکی جھکی' کسی کنیز کی طرح رہا کرتی تھیں۔ انہیں تو ایسا لگتا تھا' امی جی بھی بابا سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ بہت محتاط ہو کر' ان کا موڈ دیکھ کر' ایک ایک لفظ ناپ تول کر وہ ان سے بات کرتی تھیں۔ پتا نہیں بابا کسی سے خوش ہو کر' ہنس کر' بے تکلفی سے بات کرتے بھی تھے کہ نہیں۔ کم از کم بیوی بچوں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی خوشگوار انداز میں مسکرا کر باتیں نہیں کی تھیں۔ ہمیشہ حکم ہی صادر کیے تھے۔ ہمیشہ اپنے فرمان منواتے ہی تھے۔ خاندانی جاہ و جلال' روپیہ' پیسہ' عالیشان گھر' گاڑیاں گھر میں سب کچھ تھا مگر وہاں ان کی امی جی اور ان بھائی بہنوں کو چوں کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

ان کے کیمبرج سے پڑھ کر آئے بابا کا رویہ بیوی کے ساتھ ادنیٰ غلاموں والا ہوتا تھا۔ ان کے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ وہاں ان کی دادی بھی تھیں' چچا اور چچی بھی تھے اور ان دونوں کا چند ماہ کا بیٹا بھی تھا۔

چچی اس گھر میں بیاہ کر نئی آئی تھیں۔ وہ خاصی شوخ و چنچل تھیں' وہ بے تحاشا خوب صورت تھیں۔ شہریار خان کی پانچ سال کی بہن صفیہ کو وہ کبھی کسی فلمی اداکارہ جیسی لگتیں اور کبھی کسی فلمی اداکارہ سے بھی زیادہ حسین۔ اندرون سندھ ان کی زمینیں بھی تھیں اور فیکٹریاں بھی' جن کے تمام معاملات چچا سنبھالا کرتے تھے۔ سو انہیں ہر ہفتے شہر سے باہر جانا ہوتا تھا کبھی ایک دن کے لیے' کبھی دو' تین دنوں کے لیے۔ اِدھر کراچی میں تمام کاروباری معاملات ان کے بابا دیکھا کرتے تھے۔

دادی بہت ضعیف اور بیمار تھیں۔ جب سے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے بغیر کسی ملازمہ کی مدد اور وہیل چیئر کے باہر نہیں نکل سکتی تھیں سو ان کا زیادہ وقت کمرے ہی میں گزرا کرتا تھا۔ ان کے بابا اور چچا آتے جاتے ماں کی خیر و عافیت دریافت کیا کرتے تھے۔

شہریار خان اس گھر کے سب سے بڑے بچے تھے۔ تب وہ آٹھ سال کے تھے۔ ان کی بہنیں صفیہ اور دریہ پانچ اور چار سال کی تھیں اور چچا کا بیٹا آٹھ' نو ماہ کا تھا۔ انہوں نے اپنے بابا کو کام کی بات کے علاوہ کبھی چچی سے کوئی زیادہ بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ چچا سے بھی وہ عمر میں خاصے بڑے تھے تو ان پر بھی بڑے بھائیوں والا رعب رکھا کرتے تھے۔ دادا ابا کے انتقال اور دادی کی معذوری کے بعد اب ان کے بابا ہی عملی طور پر اس گھر کے سربراہ تھے۔

ایک رات انہیں نیند نہیں آرہی تھی۔ رات کا ایک' ڈیڑھ بج رہا تھا۔ وہ پانی پینے کے لیے کمرے سے باہر نکلے تب ہی انہوں نے بابا کو اپنے کمرے سے نکلتے اور دبے پاؤں چل کر چچا کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ فوراً" ستون کے پیچھے ہو گئے تھے۔ بابا کا انداز تھا ہی ایسا' چوروں جیسا۔ وہ ہر طرف چوکنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

چچا کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر بھی بابا نے مڑ کر چاروں طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔ کہیں پر بھی کوئی نہیں ہے' یہ اطمینان کر لینے کے بعد وہ اندر چلے گئے تھے۔ چچا تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے پھر بابا اتنی رات کو ان کے کمرے میں کیوں گئے تھے؟

ان کے دل کو بے چینی اور بے سکونی ہو رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں بغیر کچھ آواز پیدا کیے چل رہے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے اور سناٹے سے ڈرے بغیر گھر کے رہائشی حصے سے باہر بیک یارڈ میں نکل آئے تھے۔ جہاں چچا کے کمرے کی بیک تھی۔ انہوں نے وہاں پنجوں کے بل خود کو اونچا کر کے کھڑکی سے اندر جھانکا۔

کمرے میں موجود لوگوں کو شاید اتنی رات گئے بیک یارڈ میں کسی کی موجودگی کی توقع نہیں ہو گی سو کھڑکی پر

پردے گرانے بھول گئے ہوں گے یا پھر شاید نفس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی ہوگی۔

اندر کا منظر دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ چچا، چچی کا بیٹا کاٹ میں بے خبر سو رہا تھا اور اس کے بابا اور چچی بیڈ پر ایک دوسرے کی بانہوں میں بالکل مدہوش پڑے تھے۔ انتہائی شرمناک حالت میں۔ مدہوشی میں جو باتیں وہ دونوں ایک دوسرے سے کر رہے تھے انہیں سن کر ان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

"میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں وقار! جہاں زیب تو آپ کے پاسنگ بھی نہیں۔"

"مگر اس کی قسمت دیکھو، اسے تم جیسی حسین لڑکی مل گئی اور مجھے وہ جاہل گنوار عورت۔ جہاں زیب بہت لکی ہے۔"

"مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں وقار! میں آپ کی ہوں۔"

"اور جو راتیں اس کے ساتھ گزارتی ہو وہ؟"

"وہ تو مجبوری ہے وقار۔ دل سے تو مجھے صرف آپ کے نزدیک رہنا اچھا لگتا ہے۔"

"اب کی بار میں نے ایسا کاموں میں الجھا کر بھیجا ہے اس الو کو۔ پانچ دن سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ یہ پانچ راتیں ہماری ہوں گی۔ میری اور تمہاری۔" مخمور لہجے میں بولتے بابا، چچی کے اور بھی نزدیک ہو گئے تھے۔

آٹھ سال کے بچے کو گناہ، زنا اور بدکاری کے الفاظ نہیں پتا تھے، رشتوں کا تقدس بھی ابھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر پھر بھی انہیں یہ سب بہت غلط، بہت برا لگا تھا۔ انہیں اپنے بابا بہت برے لگے تھے۔

وہ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ کبھی ان کا دل چاہتا، وہ جا کر امی جی کو اٹھا دیں۔ انہیں سب کچھ بتا دیں کبھی دل چاہتا، بابا اور چچی کو جان سے مار دیں۔ انہیں یہ تو سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہفتے کے جتنے دن چچا دوسرے شہر میں ہوتے تھے ان تمام دنوں کی راتیں بابا، چچی کے کمرے میں ان کے ساتھ گزارتے تھے۔ جیسے تیسے انہوں نے صبح ہونے کا انتظار کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ بھاگ کر امی جی کے کمرے میں آئے تھے۔ مگر وہ امی جی کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا وہ ساری رات روتی رہی تھیں۔

وہ اپنی جگہ بالکل سن ہو کر کھڑے رہ گئے تھے۔ وہ ماں کو لاعلم سمجھ کر انہیں بابا اور چچی کے تعلق کے بارے میں بتانے آئے تھے مگر وہاں تو ان کی ماں کی روتی ہوئی ویران بنجر آنکھیں اور اجاڑ وجود یہ داستان سنا رہا تھا کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں۔

ان کی امی جی سب جانتی تھیں اور چپ تھیں۔ امی جی چپ کیوں تھیں، وہ دادی سے کہتیں، وہ نانا، نانی سے بابا کی شکایت کرتیں۔ وہ ماں کی خاموشی پر بہت الجھے تھے۔

رات بابا کو چچی کی بانہوں میں دیکھ کر ان کا دل چاہا تھا۔ وہ ان کے پیٹ میں چاقو اتار دیں۔ بابا سے ایسی شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔ مگر صبح جب بابا سے سامنا ہوا تو کچھ کرنا تو درکنار وہ تو نفرت بھری نگاہوں سے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ تک نہ سکے تھے۔ بابا کی دہشت اور ہیبت اتنی تھی۔ وہ روزانہ کی طرح ان کے آگے سر جھکا کر ہی بیٹھے رہے تھے۔ بابا سے تو کیا وہ خوف کے مارے کسی اور سے بھی کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ اگر بابا کو پتا چل گیا کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہے تو بابا تو ان کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔

وہ اس روز اپنے کمرے میں بالکل اکیلے سب سے چھپ کر بہت روئے تھے۔ اپنی کمزوری اور بزدلی پر، اپنی ماں کی بے بسی اور خاموشی پر اور اپنے باپ کے ظلم پر۔ وہ چپ رہے تھے۔

پھر وہ چپ ہوتے چلے گئے۔

جیسے جیسے ان میں سمجھ داری آنے لگی، انہیں یہ بھی پتا چلنے لگا کہ ان کی امی جی، بابا اور چچی کے اس ناجائز رشتے کے بارے میں جانتی ہیں۔

وہ جس رات بابا کو چچی کے کمرے میں جاتا دیکھتے اس کی صبح ماں کی رو رو کر سوجی ہوئی آنکھیں دیکھا

کرتے۔ امی جی بابا سے خوف زدہ تھیں۔ بابا انہیں اپنے گھر سے نکال دیں گے 'انہیں نانا' نانی کے گھر بھیج دیں گے انہیں طلاق دے دیں گے۔

وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھیں' ختم ہو رہی تھیں۔ خوف کے سبب ان میں باپ کے آگے سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی مگر دل میں ان کے لیے نفرت ہی نفرت اور غصہ ہی غصہ تھا۔

بابا کے چچی کے ساتھ ناجائز تعلقات ختم نہ ہوئے تھے۔ ہاں! غم میں گھلتی' ظلم' جبر اور زیادتی کو خاموشی سے چپ چاپ سہتی سہتی ان کی امی جی ایک روز ضرور ختم ہو گئی تھیں۔

باپ کی اس منافقانہ دہری شخصیت اور گھناؤنے عمل نے ان کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

بیوی کے ساتھ سخت رویہ' بچوں کے ساتھ حاکمانہ انداز۔ آمنہ ان کی ماں کی طرح صابر تھیں۔ ان کے سخت رویے اور مطلق العنانی کو سر جھکا کر قبول کر گئی تھیں اور بچے اسی طرح کمزور تھے جیسے کل اپنے بچپن میں وہ کمزور تھے۔

سدا اس دنیا میں کس نے رہنا ہوتا ہے۔ اپنے تمام گھناؤنے اعمال اور ظلم و زیادتی ساتھ لیے ان کے بابا' ان کی امی جی کے انتقال کے برسوں بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اپنے اندر کا احساس کمتری اور شرم ناک بچپن چھپانے کے لیے انہوں نے بیوی اور بچوں کے سامنے ہمیشہ اپنے بابا کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ آخر ان کے بدکار بابا تھے تو ایک بے تحاشا ذہین اور خوب صورت مرد۔ وہ اپنے بابا پر تھے اور سکندر ان دونوں پر۔ وہ سکندر کو اپنے جیسا اور اپنے بابا جیسا کامیاب انسان بننے کی نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود بھی تھیں۔ وہ بن سکتا تھا ان دونوں جیسا۔

اپنی تمام توجہ سکندر پر مرکوز کر کے وہ زین کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں' انہوں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا۔ ان کے رویے نے زین کو سکندر سے مقابلہ بازی اور حسد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ انہوں نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ زین اور سکندر کے بیچ بھائیوں جیسی بے تکلفی اور دوستی نہیں بلکہ سرد مہری اور بہت فاصلہ ہے' انہوں نے اس بات کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ بیوی' بچوں کے احساسات کو وہ سوچا ہی کب کرتے تھے۔

بارہ سال قبل 31 دسمبر کی اس شام کو جب نیو ایر پارٹی میں جاتے جاتے وہ گھر واپس آئے تھے تب اپنے گھر کا وہ منظر دیکھ کر وہ غصے سے پاگل سے ہو گئے تھے۔ ان کا بیٹا اپنی ہونے والی بھاوج کے ساتھ؟

انہیں اس پل سکندر کی شکل میں اپنا باپ نظر آیا تھا' ام مریم کی رونے کی آوازوں میں اپنی ماں کے گھٹ گھٹ کر رونے کی آواز سنائی دی تھی۔ کل وہ کمزور تھے۔ باپ سے ڈرتے تھے۔ ان کے آگے کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکے تھے۔ ماں کی حمایت میں اٹھ نہ سکے تھے' باپ کو اس گھناؤنے عمل اور ظلم سے روک نہ سکے تھے۔ مگر آج وہ کمزور نہیں۔ آج وہ طاقت ور ہیں۔ آج وہ حاکم ہیں۔ باپ کے خلاف ان کے اندر جتنا بھی ابال اور غصہ تھا وہ سب باہر نکل آیا تھا۔

انہیں اپنی ماں کے آنسوؤں اور دکھوں کا حساب لینا تھا اس بدکار شخص سے۔ وہ ام مریم کی آہوں اور سسکیوں میں مسلسل اپنی ماں کی آہیں سن رہے تھے۔ ایک جنون' ایک پاگل پن سا ان پر سوار تھا۔ ضد اور جنون ان سے ان کے ہوش اور سوچ سمجھ چھین کر لے گیا تھا۔ وہ سکندر کو نہیں بلکہ اپنے بدکردار باپ کو اپنی زندگی سے باہر نکال رہے ہیں۔ رشتوں کی دھجیاں اڑانے والا ان کا بدکردار بیٹا صرف شکل و صورت اور ذہانت ہی میں اپنے دادا پر نہیں گیا تھا' وہ عادتیں اور خصلتیں بھی دادا کی سی لے کر پیدا ہوا تھا۔ بدکردار' نفس کا غلام' اپنے ہی گھر کی عزت پر نظر رکھنے والا۔

سکندر کے ساتھ انہوں نے وقار خان کو' اپنے بابا کو بھی اس گھر سے دھکے مار مار کر نکال دیا تھا۔ انہیں اپنے فیصلے پر نہ افسوس ہوا تھا نہ پچھتاوا۔ برسوں سے ان کے

سینے میں لگی آگ آج بجھی تھی۔ آج وہ چپ نہ رہے تھے۔ آج انہوں نے غلط کو غلط کہا تھا۔ مجرم کو مجرم کہا تھا۔ زانی کو زانی کہا تھا۔

زین خاموش تھا۔ ام مریم ان کے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی اور آمنہ مسلسل رو رہی تھیں۔ وہ بار بار ان سے التجائیں کر رہی تھیں کہ وہ سکندر کو گھر واپس لے آئیں۔ وہ آمنہ پر بہت زور سے چلائے تھے۔ ان کے گھر میں موت کا سا سناٹا اور ویرانی تھی۔ سکندر پھر گھر آیا تھا۔

"میں بے گناہ ہوں پاپا! اس لڑکی کا مجھ پر لگایا ہر الزام جھوٹا ہے۔"

کل وہ بوکھلا کر، گھبرا کر، پریشان ہو کر، رو کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ آج مضبوط لہجے میں۔ مگر وہ اس کی بات نہ کل سننے پر راضی تھے نہ آج۔ انہیں محبت تو دور اس پر رحم تک نہیں آیا تھا اس پل۔ وہ ابھی صرف بیس سال کا ہے، بہت چھوٹا ہے۔ وہ کہاں جائے گا، کیا کرے گا، کیسے زندہ رہے گا، انہیں ان میں سے کسی بھی بات کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جو پیسہ وہ آرام سے، بے دریغ خرچ کرتا ہے، وہ کمایا کس طرح جاتا ہے؟ وہ سخت لہجے میں اسے اپنے گھر اور زندگی سے نکل جانے کا حکم دے رہے تھے۔

انہیں پتا تھا، وہاں زین بھی کھڑا ہے۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ زین چاہتا ہے، وہ سکندر کو پھر گھر سے نکال دیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ زین کی خاموشی میں بہت سے احتجاج وہ سن رہے تھے۔

"آپ نے ہمیشہ اس میں اور مجھ میں فرق رکھا اور اب بھی رکھ رہے ہیں؟ یہ گناہ اگر میں نے کیا ہوتا تو کبھی معاف نہ کیا جاتا۔ مگر آپ کے قابل اور لائق بیٹے نے کیا ہے تو اسے معافی مل جائے گی۔"

انہوں نے اس پل بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کے سخت اور حاکمانہ رویوں کا اثر ان کے بچوں پر کس قدر منفی انداز میں پڑا ہے۔ زین کو ہر وقت سکندر کی مثالیں دے دے کر اور پھر اسے نظرانداز کر کے انہوں نے ان دونوں بھائیوں کے بیچ کس قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے سوچا تھا تو یہ کہ زین کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اسے بتا دیں کہ اپنے باپ کی خصلت پر پیدا ہوئے سکندر شہریار کو وہ مرتے دم تک معاف نہیں کریں گے۔

روتی ہوئی آمنہ وہاں آئیں، سکندر کی حمایت میں بولیں تو انہوں نے غصے سے انہیں جھڑک دیا تھا۔ انہیں آمنہ کی باتوں پر سخت غصہ آ رہا تھا مگر وہ برداشت سے کام لیتے رہتے اگر آمنہ ان کے بابا کا نام بیچ میں نہ لاتیں۔

"کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں دے رہے ہیں؟ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہریار۔"

آمنہ کے الفاظ انہیں آپے سے باہر کر گئے تھے۔ آمنہ کو ان کے بابا کے بارے میں کیسے پتا چل گیا؟ اس راز کا تو ان کے، ان کی امی جی اور چچی کے سوا کوئی گواہ تک نہ تھا۔ پھر آمنہ کو کیسے؟ وہ طیش میں آ کر تمیز اور تہذیب سب کچھ بھول گئے تھے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار آمنہ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا اور انہیں گالی بھی دی تھی۔ سکندر نے انہیں آمنہ کے منہ پر دوسرا تھپڑ نہیں مارنے دیا تھا۔ وہ تھپڑ اس نے اپنے گال پر کھا لیا تھا۔

وہ ایک دم ہی اپنی صفائی میں مزید کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے جانے لگا تھا۔ نکلنے سے قبل اس نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی اور سکندر کی نگاہیں ملی تھیں۔ سکندر کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وہ مظلوم ہے، وہ بے گناہ ہے۔ اس پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔ مگر وہ اس وقت اپنے آپ میں کب تھے؟ آمنہ کے منہ سے باپ کا طعنہ، باپ کی گالی انہیں بالکل آپے سے باہر کیے ہوئی تھی۔

ان کے گھر میں جیسے کسی کی موت ہو گئی تھی۔ آمنہ ہر وقت روتی رہتی تھیں۔

"کون مر گیا ہے اس گھر میں؟ کس کا ماتم مناتی رہتی ہو ہر وقت؟"

چند دن برداشت کرنے کے بعد انہوں نے آمنہ کو

بہت سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ آمنہ نے ان کے خوف سے ان کے سامنے رونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان سے چھپ چھپ کر تنہائی میں رونے لگی تھیں۔ آمنہ کی خاموش خالی اور ویران آنکھیں ہر لمحے ان سے التجا کرتی تھیں کہ سکندر کو واپس بلالیں۔ اسے ڈھونڈ کر واپس گھر لے آئیں۔ ان پر آمنہ کی ان التجا کرتی' رحم کی بھیک مانگتی نگاہوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

پھر اس روز جب سکندر کو ان کے گھر سے گئے آٹھ یا دس دن ہی ہوئے تھے۔ اس کا فون آیا۔ ایک انجان نمبر سے۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف کے عالم میں بول رہا تھا۔ جیسے زخمی ہو' اسے چوٹ لگی ہوئی ہو' اسے بولنے میں دشواری کا سامنا ہو۔

''پاپا! کل رات...... پاپا! کل رات میرے ساتھ۔''

وہ روتے ہوئے پتا نہیں انہیں کیا بتانا چاہتا تھا۔ مگر وہ تو اس کی آواز سنتے ہی غصے سے پاگل ہونے لگے تھے۔ تھا وہ بد کردار اپنے دادا کی طرح عیاش اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والا۔ اسی قابل کہ دنیا کی ٹھوکروں میں پڑا رہے۔ وہ روتے ہوئے ان کی منت کر رہا تھا۔

''پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پاپا! مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا پاپا۔ پلیز مجھے بچالیں۔''

وہ زارو قطار روتے ہوئے تکلیف سے کراہ بھی رہا تھا۔ کیا اسے چوٹ لگی تھی؟ کیا وہ زخمی تھا؟ وہ کہاں تھا؟

ان کے اندر ایک باپ بہت بے چین اور مضطرب ہوا تھا۔ مگر نہیں۔ آج اس باپ کو کمزور نہیں پڑنا۔ اگر یہ باپ کمزور پڑا تو وقار خان جیت جائے گا' ان کی ماں ہار جائے گی۔ وقار خان ساری زندگی گناہ کر کے بھی عزت دار بنا رہا تھا اور ان کی ماں مظلوم ہو کر بھی خاموش دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ آج وقار خان کو ہارنا تھا۔ ان کی امی جی کو جیتنا تھا۔ یہ تو یوم حساب تھا۔ یہ تو سزا اور جزا کا دن تھا۔

''میرے گھر میں تم جیسے بد کردار اور بد فطرت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم میرے لیے مر چکے ہو۔ میں تمہیں رو چکا ہوں۔''

اور وقار خان ہار گیا تھا' امی جی جیت گئی تھیں۔ سزا جیت گئی تھی۔ انصاف جیت گیا تھا۔ گناہ اور گناہ گار ہار گئے تھے۔ مظلوم جیت گئے تھے۔

مگر ایک باپ ہار گیا تھا۔

ان کے اندر وہ باپ رو رہا تھا۔ جس نے آج کئی دنوں بعد اپنے بیٹے کی آواز سنی تھی اس حال میں کہ ان کا بیٹا زخمی تھا' شاید وہ بیمار تھا' شاید اسے چوٹ لگی تھی۔ نجانے وہ کس مشکل میں تھا۔ اسے کہاں چوٹ لگی تھی۔ وہ کس طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ان کا آسائشوں میں پلا وہ بیٹا باہر دنیا کی سختیاں نجانے کس طرح سہہ رہا تھا' نجانے دنیا نے' لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا جو وہ یوں رو پڑا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے دل کو پتھر بنالیا تھا۔ سکندر کی اس فون کال کا ذکر انہوں نے آمنہ سے کرنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے اس فون کال کو بالکل بھلا چکے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود انہوں نے پالٹی موور سے کی جانے والی اس کال کا وہ فون نمبر اپنے پاس محفوظ رکھا تھا جس سے سکندر نے انہیں کال کی تھی۔ نجانے کیوں؟

دن پر دن گزر رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر سکندر کے لیے بے چین ہوا کرتے تھے مگر خود سے بھی یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ آمنہ کی مجال نہ تھی کہ سکندر کا نام لے سکیں' اسے یاد کر کے ایک آنسو بھی بہا سکیں۔ کہاں سے دل لائے تھے وہ یہ سب کرنے کے لیے؟ مگر جب وہ سب کر رہے تھے تو لگتا تھا وہ حق پر ہیں' وہ اصول کی بات کر رہے ہیں۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل رہے تھے۔ جو خواب انہوں نے سکندر کے لیے دیکھے تھے انہیں زین پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہارورڈ سے لاء کر رہا تھا۔

اور سکندر؟ وہ کہاں تھا؟ وہ ان کے لیے مر چکا تھا۔ آمنہ بیمار رہنے لگی تھیں' انہیں پروا نہیں تھی۔ ان کے گھر میں موت کا سناٹا رہنے لگا تھا۔ انہیں پروا نہ تھی۔ ان کی ریٹائرمنٹ ہو گئی تھی۔ وہ آمنہ کو ساتھ لے کر پاکستان واپس آگئے تھے۔ ان کے بابا کی وفات کے بعد چچا نے فیکٹریوں اور ملوں کے معاملات کو سنبھالا تھا مگر

چند سال ہوئے ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا تو اب ان ہی کو ان سب کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

وہ گزشتہ چند سالوں سے امریکہ میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سال میں دو سے تین چکر لگا رہے تھے تاکہ خاندانی بزنس کی ساکھ متاثر نہ ہو۔

خاندان 'عزت' نام 'مرتبہ' بہت اہم تھیں یہ تمام چیزیں ان کے لیے۔ بظاہر کسی کو بھی لگتا نہیں تھا کہ وہ کبھی سکندر کو سوچتے بھی ہوں گے۔ مگر وہ اسے سوچتے تھے۔ خود سے بھی چھپا کر۔ وہ دن میں جتنے بھی مضبوط نظر آتے تھے مگر رات میں وہ سو نہیں پاتے تھے۔

سکندر کہاں تھا؟ پانچ سال بیت چکے تھے اسے ان سب کی زندگیوں سے نکلے۔ آخر وہ اب کہاں تھا؟ ایک روز جب دل کی بے کلی بہت ہی بڑھی تب انہوں نے پانچ سالوں سے اپنے پاس محفوظ وہ فون نمبر نکالا تھا۔ انہوں نے اس نمبر پر کال کی تھی۔ وہ بالٹی مور کے ایک ہسپتال کا نمبر تھا۔

وہ ایک ہسپتال کا نمبر تھا؟ وہ کانپ گئے تھے۔

"پاپا کل رات۔۔۔ پاپا کل رات میرے ساتھ۔۔۔"

ان کے کانوں میں اس کی تکلیف سے کراہتی اور زار و قطار روتی ہوئی آواز گونجی تھی۔ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ کل رات؟ کوئی حادثہ؟ کوئی کار ایکسیڈنٹ؟ کیا؟ آخر کیا؟ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں نہا گئے تھے۔ وہ رو پڑے تھے۔ وہ پانچ سال بعد رو پڑے تھے۔

"پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پاپا! مجھے آکر لے جائیں۔"

اس کی روتی' فریاد کرتی آواز' اس کی آہیں ان کا دل دہلا رہی تھیں۔ کسی غیر کو بھی اس طرح التجا کیے جانے پر رحم آجاتا مگر سکندر بدنصیب تھا۔ اس کے سگے باپ کو اس پر رحم نہیں آیا تھا۔ اس روز انہیں نہ اپنی ماں یاد آئی تھی نہ باپ۔ اس روز انہیں صرف اور صرف سکندر یاد آیا تھا۔ باپ کو ہرانے کی دیوانگی اور جنون میں انہوں نے اپنا بیٹا ہار دیا تھا۔ اپنا سکندر ہار دیا تھا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ پانچ سالوں کے بعد اب باپ کو ہرا دینے کا کوئی احساس ان پر حاوی نہ ہوتا تھا۔

مری ہوئی ماں کے آنسو بھی یاد نہ آتے تھے۔ اگر کچھ حاوی ہوتا تھا تو پچھتاوے' فکر' اندیشے' غم' دکھ' آنسو' آہیں اگر کچھ یاد آتا تھا تو اپنا بیٹا۔ پانچ سال پہلے بھی یہ پتا چل سکتا تھا کہ سکندر کسی ہسپتال سے فون کر رہا تھا مگر تب تو باپ کو ہرانے کا جنون ان کے سر پر سوار تھا۔ تب اسے ڈھونڈنا کتنا آسان تھا۔ مگر اب سالوں کے بعد؟ اب اتنی بڑی دنیا میں وہ اسے کہاں ڈھونڈیں؟

دیوانگی کے عالم میں انہوں نے سکندر کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا۔ آمنہ سے کسی کانفرنس کا عذر تراش کر وہ امریکہ آگئے تھے۔ زین تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان دنوں دوستوں کے ساتھ یورپ گھومنے گیا ہوا تھا۔ امریکہ آتے ہی وہ سیدھے بالٹی مور کے اسی ہسپتال پہنچے تھے جہاں سے وہ سکندر کی تلاش شروع کرنا چاہتے تھے۔

وہ ورلڈ بینک میں اتنی اونچی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ آج بھی ان کے بہت تعلقات اور بہت اثر و رسوخ تھا۔ سو ہسپتال کے عملے کو انہیں ان کی مطلوبہ معلومات کا ریکارڈ ڈھونڈ کر دینے میں اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے دن' تاریخ اور وقت بتایا تھا۔ کیا سکندر شہریار نام کا کوئی پیشنٹ (مریض) یہاں داخل تھا؟ وہ کس مرض میں مبتلا تھا؟ اس کا کس نوعیت کا علاج کیا جا رہا تھا یہاں پر؟

کمپیوٹر پر کھٹ کھٹ اس لڑکی کے ہاتھ چل رہے تھے۔ وہ پانچ سال پرانا ریکارڈ نکال چکی تھی۔ جنوری کے مہینے کی انہیں تاریخوں کا جو وہ بتا رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی کہ ہاں سکندر شہریار نام کا ایک پیشنٹ یہاں داخل کیا گیا تھا۔ وہ یہاں ایک ہفتے تک زیر علاج رہا تھا۔

"کیا اس کا کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ؟" انہوں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

پیشہ ورانہ نوعیت کے غیر جذباتی سے انداز میں کمپیوٹر کی طرف دیکھتی وہ لڑکی بتا رہی تھی کہ سکندر شہریار Gang rape کا نشانہ بنا تھا۔ وہ بہت بری طرح زخمی تھا جب یہاں داخل کیا گیا تھا۔ اس کی کمر'

گردن اور بازوؤں پر شدید چوٹیں آئی تھیں' اس کی پسلیاں متاثر ہوئی تھیں' ایک آنکھ بھی متاثر ہوئی تھی بینائی بچ گئی تھی۔ اس کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ وہ اگر دیوار کا سہارا نہ لیتے تو نیچے گر پڑتے۔

"پاپا پلیز۔ مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے بچالیں۔" اس انجان لڑکی کے سامنے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

انہیں خود پتا نہیں تھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ وہ لڑکی انہیں ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ چند سیکنڈ بالکل خاموش رہنے کے بعد انہوں نے شکستہ لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

"وہ کس تاریخ کو یہاں سے ڈسچارج ہوا تھا؟" لڑکی نے انہیں تاریخ بتادی تھی۔

"وہ یہاں سے کہاں گیا تھا؟" لڑکی نے معذرت کرنے والے انداز میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"اسے یہاں لے کر کون آیا تھا؟" لڑکی کے پاس ان کے اس سوال کا بھی جواب نہیں تھا اور ان کے ان سوالوں کے جواب صرف ہسپتال کے عملے کے پاس ہی نہیں بلکہ کسی کے بھی پاس نہیں تھے۔

انہوں نے پاگلوں کی طرح جنونی انداز میں' دیوانگی کے ساتھ سکندر کی تلاش شروع کی تھی۔ وہ بوسٹن آ گئے تھے۔ بوسٹن میں' کیمبرج میں' ہارورڈ میں انہوں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی جہاں سکندر کو نہ ڈھونڈا ہو۔ انہوں نے سکندر کے دوستوں' کلاس فیلوز' اساتذہ اور کیمپس میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں اور فون کالز کر کر کے سکندر کے بارے میں پوچھا تھا۔

اس کے کلاس فیلوز' اس کے دوست تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی اپنی عملی زندگی کا آغاز کرچکے تھے اب کوئی کہیں رہتا تھا کوئی کہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو تو ڈھونڈنا بھی ایک مرحلہ رہا تھا۔ لیکن انہوں نے انہیں کسی نہ کسی طرح ڈھونڈا تھا۔ مگر جواب ہر ایک کے پاس سے یہی مل رہا تھا کہ اس نے سکندر کو پانچ سالوں سے نہیں دیکھا۔ سب یہی بتا رہے تھے انہوں نے سکندر کو پانچ سالوں سے نہیں دیکھا۔

وہ کرسمس کی ان چھٹیوں کے بعد کبھی واپس نہیں آیا تھا نہ بوسٹن' نہ کیمبرج اور نہ ہی کیمپس۔ ہارورڈ گریجویٹ ڈائریکٹری میں نہ تو سکندر کے اپنے بیچ میں نہ ہی اس کے بعد کے کسی بیچ میں اس کا کوئی نام و نشان ملا تھا۔

وہ جتنا ڈھونڈ سکتے تھے انہوں نے ڈھونڈا تھا۔ مگر سکندر کا پتا کہیں نہ چلا تھا۔ وہ امریکہ تھا' کئی ریاستوں پر مشتمل ایک بہت بڑا ملک۔ وہ بغیر کسی اتے پتے کے اتنے بڑے ملک میں اسے کیسے تلاش کرتے اب؟ وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو نوچ نوچ کر بری طرح روئے تھے۔ ناکام اور مایوس وہ پاکستان لوٹ آئے تھے۔ واپس آنے کے بعد ان میں آمنہ سے نگاہیں ملانے کا حوصلہ نہ تھا۔ کیا کہیں وہ آمنہ سے کہ اپنے بیٹے کو اس کی ایک غلطی کی کتنی کڑی سزا دی انہوں نے۔ معاف بھی تو کی جا سکتی تھی سکندر کی وہ ایک غلطی۔

انہیں ہر پل' ہر گھڑی سکندر کا خیال آتا۔ وہ اپنے تمام اثر و رسوخ استعمال کر کے ابھی بھی اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر جیسے جیسے اس کی تلاش میں ناکامی ہو رہی تھی ویسے ویسے یہ خوفناک خیال دل میں ابھر رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سکندر زندہ ہی نہیں؟ یہ خوفناک خیال دل میں آتا تو وہ بلک بلک کر رو پڑتے۔

"نہیں خدایا! میرے گناہ کی اتنی کڑی سزا مجھے مت دینا۔ وہ مجھے زندگی بھر اب کبھی نہ ملے مگر مجھے صرف اتنا پتا چل جائے کہ وہ زندہ ہے۔"

انہوں نے سکندر کو تلاش کرنے کے لیے انٹرنیٹ کے استعمال میں مہارت حاصل کی تھی۔ یہ آج سے تقریباً" ساڑھے چار سال قبل کی بات تھی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس' دوسری ویب سائٹس وہ ہر جگہ اسے تلاش کررہے تھے مگر وہاں بھی وہ اسے ڈھونڈ نہیں پارہے تھے۔

آمنہ کی صحت دن بدن گرتی چلی جارہی تھی۔ پیہم کوششوں کے بعد انٹرنیٹ ہی کے ذریعے انہیں میمفس کے اس لاء اسکول کا پتا چلا تھا جہاں کے enrolled اسٹوڈنٹس میں سکندر شہریار ولد شہریار

خان کا نام بھی شامل تھا۔ یہ بھی ان کی خوش نصیبی ہی تھی ورنہ اتنے بڑے ملک کے بہت سارے لاء اسکولز میں اسے ڈھونڈنا مشکل ہی تھا۔ انہیں سکندر پر فخر بھی ہوا تھا اور خود اپنے آپ کو مار ڈالنے کو بھی جی چاہا تھا۔ اپنے ذہین اور قابل بیٹے کو انہوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

خدائی کا دعوا نہیں کیا تھا مگر خود کو سمجھ خدا ہی بیٹھے تھے۔ خود سے وابستہ افراد کی زندگیوں کے بارے میں فیصلے سناتے' جزا و سزا نافذ کرتے انہوں نے کس طرح سکندر اور اس کی ماں پر ظلم کیا تھا۔ وہ فوراً" امریکہ جانے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ انہیں سکندر کے پاس میمفس جانا تھا۔

ان کے اس بیٹے نے بہت دکھ اٹھائے تھے۔ وہ اسے گلے لگا کر پیار کرنا چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے ہو گئی تھی اس سے کم عمری میں ایک بھول' ایک غلطی۔ وہ اس کی ہر غلطی' ہر بھول معاف کر چکے ہیں۔ اپنی اس ایک غلطی کی بہت سخت سزا کاٹ چکا ہے ان کا بیٹا۔

کاتب تقدیر اس لمحہ ان کی سچائی سے لاعلمی پر تلخی سے مسکرایا ہوگا۔

"تو چلو آؤ شہریار خاں! اب تم سچائی بھی جان ہی لو۔ وہ سچائی جو تمہیں زندہ درگور کر دے گی۔ وہ سچائی جو تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لے گی۔ تم اعلا ظرف بن کر آٹھ سالوں بعد اسے معاف کرنے چلے ہو؟"

تقدیر نے ان پر ہنستے ہوئے وہ سچ لا کر ان کے سامنے کھڑا کیا تھا۔ جس نے ان کے حواس گم کر دیے تھے۔ یہ بدترین سچائی تقدیر نے انہیں اس صورت بتائی کہ ام مریم کو ایک روز لا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔

تقریباً" ساڑھے چار سال قبل اس روز کیا ہوا تھا؟

☼ ☼ ☼

وہ امریکہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میمفس اپنے سکندر کے پاس۔ اسے معاف کر دینے کے لیے۔ اسے گلے لگانے کے لیے۔ جب اس روز انہیں اپنے ایک اطالوی دوست سے ملنے کے لیے کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں آنا پڑا۔

یونیورسٹی کے دنوں کا دوست تھا۔ سالوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کراچی میں قیام مختصر تھا۔ اسے اسی رات اپنی بیٹی کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جانا تھا کہ وہ باپ بیٹی یہاں کوہ پیمائی کے لیے آئے تھے۔ ہوٹل میں وہ اپنے دوست اور اس کی بیٹی کے ساتھ چلتے ہوئے ان کے suite کی طرف جا رہے تھے جب انہوں نے لفٹ سے نکلتی ایک بے پناہ خوب صورت لڑکی اور اس کے ساتھ ہاشم اسد کو دیکھا۔

ہاشم اسد کے ساتھ ان کی براہ راست کوئی دوستی اور راہ و رسم نہ تھی۔ مگر کراچی کے کاروباری حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ ایک ہائی پروفائل شخص جس سے ملنا اور تعلق رکھنا لوگ باعث فخر سمجھا کرتے تھے۔ چند ایک بار وہ کاروباری نوعیت کے ڈنرز' پارٹیز اور کانفرنسوں میں اس سے مل چکے تھے' گفتگو کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے' ہاشم اسد شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔

وہ ہاشم کو اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایک اور کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر اس قدر نہ چونکتے اگر وہ اس لڑکی کو پہچانتے نہ ہوتے۔ ساڑھے سات سال طویل عرصہ تھا مگر اتنا طویل بھی نہیں کہ وہ ام مریم کو پہچان نہ پاتے۔ جبکہ اس میں کچھ خاص تبدیلی بھی نہ آئی تھی۔ وہ ویسی ہی سلم' اسمارٹ' حسین اور نازک سی تھی جیسی ساڑھے سات سال قبل تھی۔

ام مریم اور ہاشم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے' کسی رومانٹک کپل کی طرح ایک دوسرے میں گم اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ام مریم کو ہاشم کے ساتھ دیکھ کر چونکے تھے اس لیے کہ وہ ایک پارٹی میں ہاشم کی بیوی سے بھی مل چکے تھے۔ وہ ام مریم کا لباس دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔

وہ جس ام مریم کو جانتے تھے' وہ بے شک جینز اور

لانگ اسکرٹس پہنا کرتی تھی مگر جسم کی نمائش اس کے کسی بھی انداز سے ظاہر نہ ہوتی تھی جبکہ اس وقت اس نے ریڈ کلر کی شیفون کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز کے ساتھ۔ اس کے بازو' اس کا گلا' اس کی پوری کمر سب کچھ ساڑھی کے باریک پلو سے جھلک رہا تھا ام مریم اور ہاشم Suite کے دروازے کے سامنے رک چکے تھے۔ ہاشم دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ ابھی ورطہ حیرت ہی میں تھے کہ ان کے اطالوی دوست کی بیٹی ام مریم کو دیکھ کر بے ساختہ حیرت سے بولی۔

"اوہ! سیم یہاں؟" ام مریم اور ہاشم اپنے سوٹ کے اندر جا چکے تھے۔

"سیم؟" انہوں نے حیرت سے اپنے دوست کی بیٹی کو دیکھا۔

"ہاں یہ سیم ہے انکل۔ سمانتا میری کلاس فیلو۔ میلان میں میرے ساتھ اسکول میں ہوتی تھی۔ ہم ہوسٹل میں روم میٹ بھی تھے۔ آپ جانتے ہیں کیا اسے؟" وہ تینوں سوٹ میں داخل ہو گئے تھے۔

"ہاں! امریکہ میں اس سے ملا تھا چند سال پہلے۔ یہ وہاں پڑھنے آئی ہوئی تھی۔ مگر اس کا نام ام مریم ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی' یہ تمہاری کلاس فیلو نہیں ہوگی۔" وہ اب بھی بے یقین تھے۔

"ہم نے ہائی اسکول تک ایک ساتھ میلان میں پڑھا ہے انکل! میں اسے پہچاننے میں غلطی کر ہی نہیں سکتی۔ بلکہ جب یہ امریکہ سے اپنی اسٹڈیز پوری کیے بغیر اٹلی واپس آگئی تھی تب بھی میں اس سے تین چار مرتبہ ملی ہوں۔ اس کے بابا پاکستانی ہیں ناں۔ اس لیے ڈاکومینٹس وغیرہ میں اس کا نام ام مریم ہی ہے مگر ہم دوست اسے سیم ہی کہتے تھے۔"

ان کے دوست کی بیٹی کچھ سوچ کر اور یاد کر کے ہنسی تھی۔ وہ اب اپنے باپ کو اپنی اس پرانی دوست کے بارے میں بتانے لگی تھی جسے وہ سیم کہہ رہی تھی اور جسے وہ ام مریم کے نام سے جانتے تھے۔ وہ باپ بیٹی اٹالین تھے اور ان کے ہاں بیٹی کا باپ سے ایسی باتیں کرنا قطعاً" معیوب نہ تھا۔

"پتا ہے ڈیڈ! سیم کا اپنے اسٹیپ فادر (سوتیلے باپ) کے ساتھ بڑا زوردار افیئر تھا۔ اس کے پیرنٹس کی ڈائی ورس (طلاق) ہو گئی تھی۔ سیم اپنی ممی اور اسٹیپ فادر کے ساتھ میلان میں رہتی تھی۔ وہ فرینچ تھے اور بہت مشہور فیشن ڈیزائنر تھے۔ پیسہ بھی ان کے پاس بے تحاشا تھا۔ سیم ان سے خوب قیمتی قیمتی تحفے لیتی تھی اور اسکول میں ہم دوستوں کو دکھا دکھا کر ہمارے دل جلایا کرتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے اس چالیس سال کے مرد کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

اتنی حسین اور کم عمر لڑکی کے آگے اس کے سوتیلے باپ کو پھر سیم کی ممی میں کیا چارم نظر آسکتا تھا۔ سیم کی وجہ سے اس کی ممی کی شادی شدہ زندگی خراب ہو گئی تھی۔ سولہ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں سیم پریگننٹ تک ہو گئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ چاہتا تھا کہ سیم ابارشن نہ کروائے کہ آخر ان دونوں نے شادی تو کرنی ہی ہے۔ سیم نے اپنے سوتیلے باپ کو الو بناتے بناتے اس سے شادی کے وعدے تک کر رکھے تھے۔ وہ سیم کے ساتھ بہت سنجیدہ تھا اور سیم ہم دوستوں کے ساتھ اسکول میں بیٹھ کر اپنے سوتیلے باپ کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

وہ کہتی تھی کہ اسے اپنی ماں سے شدید نفرت ہے۔ اس کی ماں کی وجہ سے اس کے ماں باپ کی طلاق ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بدلہ لینے کے لیے' اسے نیچا دکھانے کے لیے اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ افیئر چلا رہی تھی اور پھر اس افیئر کے نتیجے میں اسے بے تحاشا قیمتی تحفے' آسائشیں اور بے حساب پیسہ ملتا ہے مگر اس سب کے باوجود اس کا اس تعلق کو لمبا کھینچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

ہم سب دوستوں کی نالج میں تھی یہ بات کہ اپنے سوتیلے باپ کی لاکھ منت سماجت کے باوجود بھی سیم ابارشن کروا آئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ اس بات پر بہت ناراض ہوا تھا۔ وہ سیم سے فوراً" شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سیم کی ممی کو فوراً" طلاق دینا چاہتا تھا۔

جب سیم نے دیکھا کہ اس کا سوتیلا باپ زیادہ ہی اس کے گلے پڑ رہا ہے تب ایک رات اس نے شور مچا کر سارے محلے کو اکٹھا کر کے اپنے سوتیلے باپ پر ریپ کا الزام لگا کر اس سے جان چھڑالی تھی۔ تب پھر سیم ہوسٹل آگئی تھی۔ میرے ساتھ وہاں وہ ہوتی تھی۔ ہم روم میٹ تھے۔

سیم کی ممی کو اس کی وجہ سے طلاق ہوگئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ واقعی اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے عشق میں پاگل ہوتا اس کے پیچھے آتا اور سیم اسے دھتکار دیتی۔ بڑی تیز اور خطرناک لڑکی تھی سیم۔ اسے مردوں کو اپنے پیچھے لگانا اور اپنا دیوانہ بنانا آتا تھا۔

جب تک یہ اٹلی میں تھی 'میرا اس سے کبھی کبھار رابطہ ہو جایا کرتا تھا پھر شاید یہ پاکستان آگئی تھی۔ آج بہت عرصے بعد نظر آئی ہے۔ اور لگتا ہے آج تک مردوں کو اپنے پیچھے دیوانہ بنائے پھر رہی ہے۔ ابھی جو ساتھ میں تھا شاید اس کا کوئی نیا شکار ہے۔"

ان کے دوست کی بیٹی ہنس کر بولی تھی۔ ان کا دوست جواب میں کیا بولا تھا' وہ کچھ بھی سن نہیں پائے تھے۔ ان کے کانوں میں تو اپنے بیٹے کی چلا چلا کر سچائی بتاتی آواز گونج رہی تھی۔

"میں بے گناہ ہوں پاپا' یہ لڑکی جھوٹی ہے۔"

"پاپا! میرا یقین کریں۔"

"وہ ایک بد کردار لڑکی ہے۔ زین ایک بیچ لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا پاپا۔"

وہ اپنی صفائی دے رہا تھا۔ مگر کون سنتا اس کی وہ سچائی؟ غصے میں اندھے ہو کر انہیں اپنے بیٹے کی کوئی آواز سنائی کب دی تھی؟ پر آج اس کی کہی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔

اس نے آخری وقت تک خود پر لگائے ہر الزام کو جھوٹا کہا تھا۔ عدالت ہی لگائی تھی تو جائے وقوعہ پر ثبوت' گواہ اور نشان دیکھتے۔ وہ ثبوت اور نشان کسی جبر کی کہانی سنا رہے تھے یا کسی بد ترین منصوبے کا راز فاش کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ام مریم اپنے ٹھکرائے جانے کا اس سے بدلہ لے رہی ہے۔ وہ اس صبح ڈھکے چھپے لفظوں میں اس لڑکی کی برائی ان سے بیان کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اور اس شام جب وہ پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہونا چاہتے تھے وہ تب بھی ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کتنا پریشان لگ رہا تھا۔ لگتا تھا اسے کوئی بہت ضروری اور سنجیدہ بات انہیں بتانی ہے۔ اس لڑکی کی مکاری' اپنے بیٹے کی معصومیت سب واضح تھا۔

سب کچھ بارہ سال پہلے بھی واضح تھا۔ مگر جو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہو جائیں' کان رکھتے ہوئے بھی بہرے ہو جائیں' ان کو سچ نہ نظر آتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔

وہ اس روز دیواروں سے سر مار مار کر روئے تھے۔ دنیا کے کسی باپ نے اپنی اولاد پر ایسا ظلم نہ کیا ہوگا جو انہوں نے اپنے بیٹے پر کیا تھا۔ اس پر ایک ایسے گناہ کا الزام لگایا جو اس سے سرزد ہی نہ ہوا تھا اور پھر ان کے اس ظلم کے نتیجے میں ان کے بیٹے کو اسی سفاکی کا نشانہ بنا دیا گیا جس کا انہوں نے اس پر الزام لگایا تھا۔ rape Gang انہیں بالٹی مور کے ہسپتال کی ملازم اس لڑکی کے الفاظ پھر یاد آئے تھے۔

وہ اب سکندر کا سامنا کیسے کریں۔ اس سے اس کی زندگی' اس کی عزت' آبرو' وقار سب کچھ چھین لینے کے بعد اب وہ اس کے سامنے کس طرح جائیں؟ وہ اسے معاف کرنے اور گلے لگانے جا رہے تھے تب جانا بہت آسان لگ رہا تھا۔ مگر اب؟ اس سے اس کا سب کچھ چھین لینے کے بعد وہ کس منہ سے اس کے سامنے جائیں' اس سے معافی مانگیں اور کیا وہ انہیں معاف کر دے گا؟ وہ انہیں مرتے دم تک معاف نہیں کرے گا۔

وہ جانتے تھے۔ وہ ان ہی کا بیٹا ہے۔ وہ اب رو رو کر بھی فریاد کریں' گڑگڑائیں وہ تب بھی اب کبھی پلٹ کر ان کی دنیا میں واپس نہیں آئے گا۔ غیرت' عزت اور وقار پر جان دینے والے صرف وہی تو نہیں' ان کا غیرت مند بیٹا بھی تو ان ہی کا خون ہے۔

انہوں نے اس سے کہا تم میرے لیے مر چکے ہو تو

اس نے خود کو ان لوگوں کے لیے واقعی مار ہی ڈالا۔ اس پر جو بھی گزری، جن بھی آزمائشوں کو اس نے سہا مگر پلٹ کر پھر ان کے در پر نہ آیا۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں، وہ اب واپس کبھی بھی نہیں آئے گا۔ جب مشکلوں کے دور میں نہیں آیا تو اب جب کہ لاء پڑھ رہا ہے۔ عنقریب تعلیم مکمل کر لے گا، ایک اچھی جگہ ملازمت بھی کر رہا ہے۔ اب کیوں ان کے پاس واپس آئے گا؟

وہ جانتے تھے سکندر ضد، انا اور آن بان میں ان ہی کے اوپر ہے۔ وہ اب مرتے دم تک ان کے گھر کی دہلیز تک پار نہیں کرے گا۔ ام مریم کی سچائی سامنے آنے کے بعد ان کی ساری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ سکندر کا سامنا کرنے کی جرأت وہ اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ وہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

ان دنوں ان کا "حقیقتاً" کئی بار خود کو جان سے مار ڈالنے کو جی چاہا تھا۔ بیٹے پر ایسا ظلم توڑ چکے تھے جس کا اب مداوا بھی ممکن نہ تھا۔ کہاں سے لا کر دیں گے وہ اسے اس کی زندگی کے کھوئے آٹھ سال۔

آٹھ سالوں میں اس کی زندگی میں سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا۔ کیا وہ اسے اس کی شخصیت کا وقار لوٹا سکتے ہیں؟ کیا وہ دوبارہ بیس سال کا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دوبارہ ہارورڈ میں جا سکتا ہے؟ کیا وہ وہاں سے لاء پاس کر سکتا ہے؟ کیا وہ کرسمس کی چھٹیاں واپس آ سکتی ہیں؟ کیا ان چھٹیوں کے بعد وہ دوبارہ اپنے کیمپس جا سکتا ہے؟ کیا وہ گھناؤنا داغ اپنے بیٹے کے وجود پر سے مٹا سکتے ہیں؟ ان کے ظلم معمولی نہیں کہ معاف کر دیے جائیں۔

اور آمنہ، اس ماں کو وہ کیا کہیں جو بیٹے کی جدائی کا درد چپ چاپ سہتے سہتے بالکل بستر سے ہی لگ گئی ہے۔

ام مریم اور ہاشم سے ان کے سامنا کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا جب آمنہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ خاصی بیمار تھیں۔ وہ ان کے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔ شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس ان کا علاج ہو رہا تھا۔ بہترین ہسپتال میں ان کے تمام ٹیسٹ کروائے گئے تھے اور پھر ان ہی دنوں ان ٹیسٹ کی رپورٹوں نے یہ بتایا کہ آمنہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہیں۔

ان کے مظالم کی فہرست طویل تھی، ان کے گناہوں کی داستان بڑی سفاک تھی۔ شاید معافی اور توبہ کے در ان کے لیے بند ہونے کو تھے۔

"یا اللہ! آمنہ کو صحت دے دے، اسے زندگی دے دے۔ میں اسے سکندر سے ملا سکوں۔"

انہوں نے آمنہ کے علاج میں خود کو، اپنے آرام سکون، سب کو بھلا دیا تھا۔ کامیاب آپریشن کے بعد بھی آمنہ کی حالت سنبھل نہ رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر نہ جانتا ہو مگر وہ جانتے تھے اس ماں کو کیا چاہیے تھا۔ اس کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس نہ تھی۔ ان سے کسی نے بھی نہیں کہا تھا کہ وہ سکندر کو بلائیں۔ انہوں نے از خود اسے فون کیا تھا۔ اب نہ سکندر سے معافی مانگنے کا منہ تھا نہ اس کی ماں سے۔ مگر اپنے گناہوں میں سے ایک گناہ تو کم کر سکتے ہیں۔ کم از کم وہ اس بیمار ماں کو اس کے بچھڑے بیٹے سے ملوا تو سکتے ہیں۔

فون پر اس کی آواز سنتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ زیادہ کچھ بولتے تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے۔ اسی لیے انہوں نے مختصر سی بات کر کے فون "فوراً" بند کر دیا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ کئی گھنٹے روتے رہے تھے اور پھر سکندر ماں سے ملنے پاکستان آ گیا تھا۔

وہ اس کا سامنا کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ مگر وہ اسے چھپ کر دیکھنے سے خود کو روک نہ پائے تھے۔ رات میں جب نرس دوبار آمنہ کے کمرے میں گئی تب بھی انہوں نے کمرے کے کھلے دروازے سے خود کو چھپا کر اندر جھانکا تھا۔

اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔ وہ کتنا بدل چکا تھا۔ وہ ان سے اتنے فاصلے پر چلا گیا تھا کہ وہ اسے پکارتے تو وہ ان کی پکار نہ سنتا۔

وہ جانتے تھے۔ وہ ان کا غیرت مند بیٹا ہے۔ اب وہ لاکھ چاہیں، ہزار معافیاں مانگ لیں وہ تب بھی خود کو ان

کی زندگی میں کبھی شامل نہ کرے گا۔ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے کہیں بہت شاندار ملازمت دلوانے کی کوشش کریں گے تو وہ ایسی ملازمت کو ٹھوکر مار کر چلا جائے گا۔

انہیں خوف لاحق ہوا تھا کہ اگر وہ سکندر سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے' اس سے ملیں گے' اس کے پاس جائیں گے تو شخص ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ خود کو پھر دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دے گا۔ ان کے خاموشی اختیار کیے رہنے سے اتنا تو ہے ناں کہ اب سکندر اور آمنہ کا رابطہ رہتا ہے۔ انہیں آمنہ کے ذریعے یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ سکندر خیریت سے ہے' اچھی جگہ پر ملازمت کر رہا ہے' باعزت زندگی گزار رہا ہے۔ اگر اب کی بار انہوں نے اسے کھو دیا تو پتا نہیں پھر کبھی ڈھونڈ بھی پائیں گے یا نہیں۔

وہ بالکل چپ ہو گئے تھے۔ اب اندر ہی اندر گھلنے اور ختم ہونے کی باری ان کی تھی۔ مگر ان کی سزا یہی تھی' ان کی سزا یہی ہونی چاہیے تھی کہ سکندر سے معافی مانگنا تو دور وہ جیتے جی کبھی اس کے سامنے بھی نہ جا سکیں۔ زمین پر خدائی کا دعوا کرنے والے ان جیسے فرعون صفت لوگوں پر توبہ اور معافی کے دریونہی بند ہو جانے چاہئیں۔

کبھی خود کسی کو اعلا ظرف ہو کر معافی دی تھی جو اب اپنے لیے وسعت قلبی اور ہمدردی چاہتے۔ ان کے بیٹے نے زندگی بھر انہیں معاف نہیں کرنا تھا۔ اس نے زندگی بھر ان سے نفرت کرنی تھی اور یہی شہریار خان کی سزا تھی۔

آمنہ' سکندر کے ساتھ رابطہ میں رہنے پر جو ان کی جانب سے غصہ اور مخالفت کی امید کر رہی تھیں' اس خاموشی پر حیران رہ گئیں۔ وہ آمنہ کی حیرانی پر اکیلے میں بہت روئے تھے۔ ان کی بیوی انہیں ویسا ہی تو سمجھ رہی ہے جیسے وہ ہیں جیسے وہ خود کو ساری زندگی ثابت کرتے آئے ہیں۔ سکندر نے لاء کی تعلیم پوری کر لی' اسے دوہا میں بہترین ملازمت اپنے بل بوتے پر مل گئی۔

آمنہ کے ذریعے انہیں سکندر کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں پتا چل رہا تھا۔ ان کا وہ بیٹا جس میں دنیا تسخیر کر لینے کی صلاحیتیں تھیں۔ اپنی ان صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے کیریر اور پروفیشن میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ کس کی وجہ سے؟ اپنے ابنارمل باپ کی وجہ سے۔ ہاں وہ ایک ابنارمل شخص تھے۔ کبھی کسی نے انہیں یہ لفظ نہیں کہا مگر وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک ابنارمل شخص ہیں اور ان کی ابنارمیلٹی کا نشانہ ان کی بیوی' زین اور سب سے بڑھ کر سکندر رہا ہے۔

سکندر شادی کر رہا ہے اور آمنہ اسے اس کی ہونے والی بیوی کے ساتھ ملنے کے لیے پاکستان بلا چکی ہیں۔

یہ خبر برسوں بعد انہیں ملنے والی سب سے بڑی خوش خبری تھی۔ بیٹے سے معافی مانگنے کا تو اب بھی حوصلہ نہیں تھا ان میں' مگر ان کی خواہش تھی اس سے اس کی زندگی کی ہر خوشی چھین لینے کے بعد اب اس سب سے بڑی خوشی کے حصول میں وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوں۔ ان کے دل میں چھپا ارمان جسے وہ ابھی تک زبان پر لا نہ سکے تھے یہ تھا کہ سکندر کی شادی وہ خود کریں اور بہت دھوم دھام سے اور عالیشان طریقے سے کریں۔

آج فارم ہاؤس کی دعوت انہوں نے اس جانب پہلا قدم اٹھانے کے لیے رکھی تھی۔ وہ جانتے تھے سکندر ان کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا تو انہوں نے فارم ہاؤس کا انتخاب کر لیا تھا۔

وہ چاہتے تھے سکندر کی شادی پورے روایتی مشرقی جوش و خروش کے ساتھ ہو۔ وہ خود سکندر کے لیے لیزا کا ہاتھ مانگنے اس کے باپ کے پاس جائیں۔ وہ بیٹے کی شادی پر اپنے گھر پر چراغاں کریں۔ خود کارڈز تقسیم کریں جس میں ولیمہ کی دعوت ان کی اور آمنہ کی طرف سے دی گئی ہو۔ اس ولیمہ کی دعوت کے میزبان وہ اور آمنہ ہوں اور اس میں وہ اپنے ہر ملنے والے ہر دوست اور تمام عزیزوں کو مدعو کریں۔

فجر کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں۔ آج پھر وہ تمام رات جاگتے رہے تھے۔ آج پھر وہ ساری رات سکندر

کے ساتھ رہے تھے۔ کاش ان میں اتنی جرأت آسکے کہ وہ اپنے بیٹے سے معافی مانگ سکیں۔ وہ اس سے اعتراف جرم تو کرلیں۔ اپنے سینے پر سے اس بوجھ کی شدت کچھ تو کم کرلیں۔ وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر سے اٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ سمندر کے کنارے تنہا بیٹھا تھا۔ وہ ساری رات سمندر کے کنارے بیٹھا رہا تھا۔ لیزا کو اس کے پاپا کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ اپنے ہوٹل نہیں گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ وہ اسے سی سائڈ لے جائے۔ وہاں پہنچ کر اس نے ڈرائیور کو بھی واپس بھیج دیا تھا کہ اس کا یہاں سے اتنی جلدی واپس کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا دل بہت اداس اور کرب میں مبتلا تھا۔ شہریار خان اور زین سے بارہ سالوں بعد ملنا ایسا معمولی واقعہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں اے سی آن کر کے پرسکون نیند سو جاتا۔ آج ماں کی خاطر اسے کس کس سے ملنا پڑ گیا تھا۔ کس کس کو دیکھنا پڑ گیا تھا۔

وہ لوگ جن کو وہ جیتے جی دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جن کے لیے وہ مر چکا تھا ان کے لیے وہ مرا ہوا ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جلد از جلد پاکستان سے واپس چلا جائے۔ اپنی دنیا میں، اپنی زندگی میں۔ بہت دیر تک وہ ساحل پر ننگے پاؤں چلا تھا۔ بہت دیر تک وہ ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر سمندر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا تھا۔ بس یہ چند دن جلدی سے گزر جائیں اور وہ اور لیزا یہاں سے واپس چلے جائیں۔ واپس جاتے ہی وہ دونوں شادی کرلیں۔

وہ ماضی کو کہیں بہت دور، بہت پیچھے چھوڑ کر لیزا کے ساتھ جلد از جلد نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس کا جیب میں پڑا موبائل نجانے کب سے بجے جا رہا تھا۔ اس کا دھیان ہی نہ تھا اس پر۔

ایک اونچی لہر آکر گھٹنوں سے اوپر تک اسے بھگو گئی تب وہ چونک کر اپنے خیالوں سے نکلا۔ تب اسے موبائل پر آتی کال کا احساس ہوا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ لیزا اسے کال کر رہی تھی۔ وہ لڑکی واقعی اس سے سچی محبت کرتی تھی۔ ابھی اس نے اسے سچے دل سے یاد کیا ہی تھا اور اس کی کال آگئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو۔"

"تم کہاں ہو سکندر؟" لیزا کی آواز میں پریشانی سی تھی۔

"میں..... کیوں کیا ہوا؟"

"میں ساری رات تمہیں فون کرتی رہی ہوں۔ تم کال ریسیو نہیں کر رہے تھے تو مجھے اتنی پریشانی ہوئی۔ میں نے پریشان ہو کر تمہارے ہوٹل فون کیا۔ تم سے بات کرنی چاہی تو پتا چلا تم اپنے روم میں نہیں ہو۔" اس نے اپنے سامنے بپھرے سمندر کو دیکھا، دور افق پر طلوع ہوتے سورج کو دیکھا۔ صبح ہو گئی؟ پوری رات گزر گئی؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"تم کیوں فون کر رہی تھیں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"آج تم میرے ہر سوال کے جواب میں سوال کیوں کر رہے ہو سکندر؟ میں تمہارے لیے فکر مند تھی، اس لیے تمہیں فون کر رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا، تم اتنے سالوں بعد اپنی فیملی سے ملے ہو یقیناً" ڈسٹرب ہو گے۔ دکھی ہو گے۔ میں تم سے بات کر کے تمہاری اداسی اور دکھ کم کرنا چاہتی تھی۔" وہ اس کے جواب نہ دینے پر قدرے خفگی سے بولی۔

"تم بہت محبت کرتی ہو مجھ سے لیزا؟" جانتا تھا پھر بھی اس وقت وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ وہ چاہا جاتا ہے۔ بے حد اور بے حساب۔

"ہاں!" وہ اس کے سوال پر حیران ہوئے بغیر فوراً" بولی۔

"کتنی؟"

"تم سوچ بھی نہیں سکتے اتنی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پھر بھی کتنی؟" اب اس کے لبوں پر مدھم سی

مسکراہٹ تھی۔ سمندر، ہوا، صبح، طلوع ہوتا سورج اسے سب اچھے لگ رہے تھے۔ کیونکہ لیزا محمود اس وقت اس کے ساتھ تھی۔

"اتنی کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روما چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"ابھی ساحل پر آسکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ روانی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتے دیتے اس آخری سوال پر ہاں بولتے ہوئے چونکی

"تم سی سائڈ پر ہو؟"

"ہاں! کیا تم ابھی آرہی ہو میرے پاس؟ ابھی صبح کے چھ بھی نہیں بجے ہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا جو پونے چھ بجا رہی تھی۔

"میں آرہی ہوں سینیور سکندر۔"

اور وہ واقعی اپنے بابا کے ڈرائیور کے ساتھ آدھے گھنٹے بعد اس کے پاس آگئی تھی۔

وہ دونوں دیوار پر چڑھ کر ساتھ بیٹھ گئے تھے۔

"کیوں بلایا تم نے مجھے اس وقت یہاں پر؟" وہ ہوا سے منہ پر آتے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کر رہی تھی۔

"بس میرا دل چاہ رہا تھا تمہیں اس وقت دیکھنے کو۔ بہت تنہا محسوس کر رہا تھا خود کو۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"تم تنہا نہیں ہو سکندر۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" لیزا نے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"بیلا! جلدی سے آجاؤ میری زندگی میں۔ میں بہت تنہا ہوں۔" وہ اداسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نماز پڑھ کر کافی دیر سے واپس آئے تھے۔ آمنہ لان میں بیٹھی تھیں۔ سر پر نماز کے انداز میں دوپٹہ لیے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ اپنے روزانہ کے معمولات کے وظائف پڑھ رہی تھیں۔ نڈھال سے قدموں سے چلتے ہوئے وہ ان کے پاس آگئے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے، نظریں گھاس پر جما رکھی تھیں۔

"آپ رات بھر سوئے نہیں؟ ساری رات اسٹڈی میں گزار دی؟"

"ہاں! بس وہ نیند نہیں آرہی تھی۔" انہوں نے نگاہیں اٹھا کر آمنہ کو دیکھا۔

"آمنہ! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" کہاں سے لفظ لائیں، کہاں سے؟ کیسے بات شروع کریں؟ وہ مضطرب ہو کر آمنہ کو دیکھ رہے تھے۔

"جی کہیے؟" وہ انہیں قدرے تعجب سے اور کچھ فکر مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ایک سخت مزاج اور سنگ دل شخص سمجھتی ہو۔ میں نے خود کو ہمیشہ ثابت بھی ایسا ہی کیا ہے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے۔

وہ سکندر کی دھوم دھام سے شادی خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے اور یہ بات وہ آمنہ سے کہنا چاہتے تھے۔ کہ صرف وہی تھیں جو شاید سکندر کو اس بات کے لیے آمادہ کر سکتی تھیں سو تمام تر ہمتیں جمع کر کے بات تو انہیں کرنی تھی آمنہ سے۔

"آپ یہ کس طرح کی بات کر رہے ہیں شہریار؟ میں خدانخواستہ آپ کے لیے برا کیوں سوچوں گی؟" وہ اسی فرماں برداری اور عاجزی سے بولیں جس سے ساری زندگی ان سے بات کرتی آئی تھیں۔ وہ بیوی کے تابعدار اور عاجزی بھرے انداز پر زخمی سی ہنسی ہنسے۔

"میں ان بدترین لوگوں میں شامل ہوں جن کی عزت ان کے خوف کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے دلوں میں کبھی اپنی محبت پیدا نہ کر سکا۔ وہ عمر بھر خوف میں مبتلا رہ کر میری تعظیم و تکریم کرتے رہے۔"

آمنہ دم بخود بالکل ساکت انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"آمنہ! کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ سچ بولنا۔

بالکل سچ؟" ان کی شریک حیات نے بے اختیار گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکائی تھیں۔

یہ کس طرح کا سوال ہے شہریار؟ آپ میرے شوہر ہیں' میرے بچوں کے باپ ہیں۔" انہیں جواب کا منتظر دیکھ کر نگاہیں کتراتے کتراتے ہی وہ آہستگی سے بولیں۔

بے اختیار ایک زخمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی تھی۔ حاصل زیست ہے کیا شہریار خان؟ کوئی ایک بھی رشتہ ایسا نہیں جس کے دل میں اپنی محبت پیدا کروا سکے ہو؟

"نہیں کرتیں تم مجھ سے محبت آمنہ! اور ٹھیک کرتی ہو۔ کیوں کرو گی تم مجھ جیسے ظالم شخص سے محبت؛ میں نے تم پر کتنا بڑا ظلم توڑا تھا۔ تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا تھا۔ تمہیں اس کی شکل دیکھنے' اس کی آواز سننے تک سے ترسا دیا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی' آواز بھرا گئی تھی۔ بیوی کے آگے بھی اپنا دل نہ کھولیں تو آخر کہاں کھولیں گے؟ آمنہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر انہیں تعجب سے دیکھا تھا۔ ان کی بھی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جیسے خود پر ٹوٹا ہر ستم پھر سے یاد آگیا تھا۔

"ایک بار تو ان آنسوؤں کو میرے کندھے پر سر رکھ کر بہا لو آمنہ! میرے خوف سے چھپ چھپ کر روتی رہی ہو' آج میرے سامنے رو لو۔ مجھ سے لڑو۔ مجھے جو جی میں آتا ہے کہو' مجھے میرے باپ کی گالی دو۔ شاید میرے دل میں جلتی ندامت کی آگ کچھ دیر کو کم ہو سکے۔"

بولتے بولتے وہ خود رو پڑے تھے اور انہیں روتا دیکھ کر آمنہ بھی خود کو روک نہ پائی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔

"جب تم بابا کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو تو پھر یہ بھی سمجھ لو' مجھے اتنی رعایت دے دو کہ میرے ایسا ہونے کا سبب وہ تھے۔"

"میں جانتی ہوں شہریار۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"صفیہ آپا نے۔" آمنہ کا جواب انہیں پورا کا پورا ہلا گیا تھا۔

تو باپ کے گناہ کے صرف وہ نہیں' ان کی بہنیں بھی گواہ تھیں؟ وہ تینوں بھائی بہن یہ بات جانتے تھے مگر کبھی زبان پر ایک دوسرے کے سامنے بھی نہ لائے تھے؟

"ہماری شادی کے شروع دن سے آپ کا بے تحاشا سخت رویہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں آپ کو خوش کرنے کے لاکھ جتن کرتی مگر آپ پھر بھی خفا ہی لگتے تھے۔ سکندر پیدا ہو گیا' زین پیدا ہو گیا مگر آپ کے رویے کی سختی میں کمی نہ آئی۔ تب ایک روز ہمت ہار کر میں صفیہ آپا کے سامنے رو پڑی تھی۔ مجھے لگتا تھا' آپ مجھے پسند ہی نہیں کرتے۔ شاید آپ کی مجھ سے زبردستی شادی کروائی گئی ہے۔ تب صفیہ آپا نے آپ بھائی بہنوں کے بچپن کی تمام باتیں مجھے بتائی تھیں۔ آپ کے ماضی کو جاننے کے بعد' آپ کی سخت مزاجی کی وجہ سمجھنے کے بعد آپ کے ساتھ زندگی گزارنا کچھ آسان ہوا تھا شہریار! ورنہ میں تو شادی کے ابتدائی سالوں ہی میں ہار مان جاتی۔"

آمنہ آہستگی سے بول رہی تھیں۔ 33 سال' 33 سال اس عورت نے ان جیسے ظالم انسان کے ساتھ گزار دیے تھے۔

"بہت صبر اور بہت برداشت دی ہے اللہ نے تمہیں آمنہ! تم نے مجھ جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزار دی۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا تو پتھروں پر چلنے کے مترادف تھا۔"

شہریار خان نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھامے تھے۔ آمنہ جواباً چپ رہی تھیں۔ چند سیکنڈ وہ دونوں ہی خاموش رہے تھے۔

"اس گھر پر چھایا موت کا سا سناٹا اور دکھوں کے سائے سب میرے لائے ہوئے ہیں آمنہ! میں اپنے عمر بھر کے گناہوں کے کفارے' ان کے ازالے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی بھر تم نے

میرے ہر ناجائز حکم کو سر جھکا کر مانا ہے۔ آج تم سے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک درخواست کر رہا ہوں۔ اسے اپنے گناہ گار شوہر کی التجا سمجھ کر مان لو۔ میں سکندر کی شادی خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا ہوں' ہمارے اسی گھر سے۔ میں چاہتا ہوں لیزا کے والد سے اس کا ہاتھ مانگنے سکندر کے والدین جائیں۔ سکندر کی شادی میں اور تم' ہم دونوں مل کر کریں۔ خوب دھوم دھام سے۔ بہت شاندار انداز میں۔"

انہوں نے حقیقتاً" اپنے دونوں ہاتھ آمنہ کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ آج اس ماں کے پاؤں پکڑ کر بھی بیٹھنا پڑ جاتا' وہ بیٹھ جاتے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ پلیز ایسے مت کریں۔" ان کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولتے ہوئے آمنہ زارو قطار رو پڑی تھیں۔

"آمنہ! سکندر کی زندگی برباد کر دی میں نے۔ وہ وقت واپس نہیں لا سکتا۔ مگر آج جب وہ نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے تو میں چاہتا ہوں' اس کی زندگی کی اس خوشی کو اس کے لیے بھرپور اور یادگار بنا دوں۔ بولو آمنہ! تم اس کام میں میرا ساتھ دو گی؟ میری مدد کرو گی؟" انہوں نے روتے ہوئے بیوی سے پوچھا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں شہریار! میں آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ ان کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھیں۔

انہوں نے آمنہ کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے اپنی اس ہم سفر کے ساتھ نرمی' چاہت اور محبت کا اس انداز میں اظہار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں ساحل پر بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ ساحل سے نزدیک ایک عام سے ہوٹل میں بیٹھ کر ان دونوں نے حلوہ پوری کا ناشتہ کیا تھا۔

"میں نے ہمیشہ نینی کے ہاتھ کی بنی حلوہ پوری کھائی ہے۔ مگر گھر کی بنی حلوہ پوری میں اور اس میں بہت فرق ہے یہ زیادہ مزے کی ہے۔" لیزا حلوہ پوری کا مزا لیتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے چائے بھی دودھ پتی منگوائی تھی۔ آج بالکل دیسی ہو جانے کو جی کر رہا تھا۔

اس ڈھابے نما ہوٹل پر بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے لیزا نے یہ طے کیا تھا کہ وہ آج شادی کی شاپنگ کریں گے۔ اس کا موڈ ساحل پر بیٹھے بیٹھے لیزا سے باتیں کرنے کے دوران ہی خوشگوار ہو چکا تھا۔ وہ ماضی کی تمام تلخ یادوں سے نکل کر اپنے اس حال میں لوٹ آیا تھا جہاں لیزا محمود اس کے ساتھ تھی۔ اس پر اپنی والہانہ چاہت لٹاتی ہوئی۔ وہ جو اس سے کہہ رہی تھی وہ کر رہا تھا۔ پروگرام وہ بنا رہی تھی۔ عمل وہ کر رہا تھا۔

"بہت Dominating بیوی ثابت ہو گی تم۔" وہ تھوڑا سا انکار کرنے کے بعد لیزا کی شاپنگ کی فرمائش مانتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ضرورت بھی مجھ ہی جیسی کی ہے سینور سکندر! جو تمہارے اس ہر وقت لٹکے ہوئے منہ اور زندگی سے بیزار انداز کو ہنستا مسکراتا بنا سکتی ہو۔" وہ ہنس کر بولی تھی۔

وہ خود برسوں بعد پاکستان آیا تھا اس لیے اچھے عروسی ملبوسات اور شادی بیاہ کے کپڑے وغیرہ کہاں مل سکتے ہیں' یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ان دونوں نے وہیں ڈھابے پر بیٹھے بیٹھے موبائل پر انٹرنیٹ کے ذریعے سرچ کیا تھا۔

"تم مجھے ڈیپ ریڈ کلر کا برائیڈل ڈریس دلواؤ۔ میں تمہاری مرضی کے مطابق بالکل پاکستانی دلہن بننا چاہتی ہوں۔"

وہ دونوں لیزا کے پاپا کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ لیزا اپنے پاپا کو فون کر کے بتا چکی تھی کہ وہ سکندر کے ساتھ ہے۔ تفصیلی ناشتہ کرتے کرتے انہیں ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

ڈرائیور کو لیزا نے بتایا کہ کہاں جانا ہے تو اس نے ان دونوں ہی کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی تو کوئی بازار' کوئی دکانیں' کوئی مارکیٹس' کوئی شاپنگ مالز نہیں کھلے ہوں گے۔ بارہ سے ایک بجے کے درمیان یہاں

شاپنگ سینٹرز کھلتے ہیں۔ وہ دونوں جن ملکوں سے آئے تھے وہاں صبح کا آغاز فجر ہی ہو جایا کرتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ جس ملک میں دن کا آغاز آدھا دن گزار دینے کے بعد ہوتا ہے وہ ترقی کس طرح کر پائے گا؟

☼ ☼ ☼

ہاشم کسی میٹنگ کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا' اس لیے آج اسے آفس نہیں جانا تھا۔ اس کی واپسی کل صبح ہونی تھی۔ وہ آج کچھ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ وہ شاور لے کر نیچے آیا تو مریم کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ اخبار پڑھ رہی تھی۔

"تم آفس نہیں گئیں؟"

"ہاں! موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر سے جاؤں گی۔"

ہاشم اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے نیلے رنگ کی جینز کے ساتھ پنک کلر کی لانگ شرٹ پہن رکھی تھی۔ بالکل سادہ لباس' بال کیچو میں لپٹے نہ میک اپ نہ جیولری۔ پھر بھی اس سادہ انداز میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ ہاشم اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" مریم نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں۔ بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

اس نے نخوت سے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس وقت اس کا موڈ خراب تھا اور فی الحال اسے اپنی تعریفیں بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

"کیا ہوا سوئٹ ہارٹ! موڈ کیوں خراب ہے؟ کل رات جب سے ہم تمہارے پاپا کے ہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ تمہارا موڈ خراب ہے۔"

کل رات محمود خالد کے ہاں سے واپس آتے ہی مریم سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اس کا موڈ تھا وہ دونوں تھوڑی دیر جاگتے' باتیں کرتے مگر مریم نے نیند آنے کا کہہ کر سونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"کیا لیزا کے ساتھ نہ آنے پر اپ سیٹ ہو؟" وہ نرم نگاہوں اور محبت سے اپنی کم عمر اور حسین بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

"میں اس کے نہ آنے سے کیوں اپ سیٹ ہوں گی؟ ساری زندگی اس نے کبھی پاپا کی نہیں سنی۔ میری کوئی بات وہ کیسے مان لے گی۔ پتا نہیں کس کو اٹھا کر لے آئی ہے شادی کرنے کے لیے۔ پاپا اس کی شادی کے فیصلے سے بالکل بھی خوش نہیں ہیں۔" مریم برا مان کر فوراً بولی تھی۔

"مگر مجھے تو وہ بہت خوش لگ رہے تھے۔ اتنی خوشی خوشی وہ لیزا کو شادی کی شاپنگ کرانے کی بات کر رہے تھے۔" مریم نے اس کو خفگی سے دیکھا تھا۔

"صرف تمہارے سامنے اپنی عزت رکھنے کے لیے ہاشم! اب داماد کے سامنے کیا وہ یہ بتاتے کہ وہ اپنی خود سر بیٹی کے شادی کے فیصلے سے ناخوش ہیں؟"

"شادی اپنی مرضی سے کرنا خود سری تو نہیں ہے مریم! تم نے بھی تو مجھ سے اپنی مرضی سے شادی کی تھی؟" وہ قدرے صاف گوئی سے بولا۔

"مگر پاپا کو ناراض کر کے نہیں۔ ان کی اجازت سے' ان کی مرضی سے۔ اور یہ لیزا۔ تمہیں پتا ہے صرف اپنی ضد کی وجہ سے وہ پورے پانچ سالوں سے پاپا سے ملی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ہماری شادی تک پر نہیں آئی تھی۔ پاپا اس کی ضد اور خود سری سے اتنا ڈرتے ہیں کہ اب ڈر کے مارے ہر معاملے میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔" سچی بات یہ تھی کہ اسے مریم کی بہن ہنس مکھ اور پیاری لگی تھی۔ جیسا مریم اسے بتایا کرتی تھی وہ ویسی خود سر اور بد تمیز لگی تو نہیں تھی۔

"لیکن مجھے تو ایسا لگ رہا تھا' انکل لیزا سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا۔ لیزا تم سے زیادہ ان کی لاڈلی ہے۔" مریم کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔

"یہ لاڈ اور محبت نہیں ہاشم! پاپا محض لیزا کی خود سری اور ضد سے خوف زدہ ہیں۔ پاپا کی سب سے زیادہ لاڈلی' سب سے زیادہ چہیتی ہمیشہ میں رہی ہوں۔ پاپا دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔"

مریم ایک دم ہی بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ بہت زیادہ غصے میں آ گئی تھی۔ ہاشم جانتا تھا' مریم اپنے باپ سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ وہ یہ سننے کو ہرگز تیار نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کے پاپا اس سے زیادہ کسی اور سے پیار کرتے ہیں۔

"اور تم دنیا میں سب سے زیادہ کس سے پیار کرتی ہو؟" اس نے مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں پوچھا۔ وہ نزدیک بیٹھی لگ اتنی پیاری رہی تھی کہ اس وقت کسی اور کی باتیں کرتے رہنے کو دل نہیں چاہا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا۔ اس وقت وہ اور مریم اپنی باتیں کریں بہت ہو گئیں مریم کے پاپا اور بہن کی باتیں۔

"پاپا سے۔" وہ اس کی شرارت سمجھ چکی تھی پھر بھی سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں! ان سے تو کرتی ہو۔ مگر ان کے علاوہ اور کون ہے جس سے تمہیں بہت محبت ہے۔ جس کے بغیر تم رہ نہیں سکتیں؟"

"ہاشم اسد نام کا ایک بندہ ہے۔" اس بار وہ کہتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔

"سیریسلی یہی نام ہے اس شخص کا؟" وہ ہنس کر بولا۔

"جی ہاں یہی نام ہے۔ میں نے پاپا کے بعد صرف تم سے محبت کی ہے ہاشم۔" مریم نے اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا تھا۔ وہ اس کے اس اظہار اور والہانہ انداز پر فدا ہی تو ہو گیا تھا۔

"مجھے بہت فخر کا احساس ہوتا ہے مریم! کہ تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد میں ہوں۔ اٹالین ماں کی تربیت اور ساری زندگی یورپ میں گزارنے کے باوجود تم اندر سے کتنی مشرقی رہیں۔ تمہاری زندگی میں پہلی بار کوئی آیا تو میں۔ بہت سوں نے تمہیں چاہا ہو گا' تمہیں پسند کیا ہو گا مگر جسے تم نے چاہا' جسے تم نے اپنے نزدیک آنے دیا' وہ میں ہوں۔ شادی سے پہلے میں تم سے لاکھ بار اصرار کرتا تھا تب تم میرے ساتھ وقت گزارنے پر راضی ہوتی تھیں اور میرے ساتھ ہوتے ہوئے بعض مرتبہ تم کیسی چپ سی بھی ہو جاتی تھیں جیسے میری ضد پر میرے ساتھ آ تو گئی ہو مگر اس طرح آنے کو غلط بھی سمجھتی ہو۔"

ہاشم جھک کر بہت پیار' بہت چاہت سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔

مریم جو واقعی اپنے نام کی طرح مریم تھی۔ بہت ماڈرن ہونے کے باوجود اندر سے بہت روایتی جو اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ اسے زندگی میں صرف ایک ہی بار کسی کا ہو جانا ہے مکمل طور پر۔ وہ جیسے زندگی کے گزرے سالوں میں ملنے والے سب لوگوں کو ٹھکراتی صرف اسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ جس کی دیوانی ایک دنیا تھی' جسے نہ جانے کون کون چاہتا تھا وہ اسے چاہتی تھی۔ اسے صرف ہاشم اسد نے چھوا تھا۔ صرف اور صرف ہاشم اسد نے۔ وہ مریم کے لیے بڑا پوزیسو تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں راستے میں تھے جب اس کے پاس آمنہ کی کال آئی۔

"السلام علیکم اموجان۔" لیزا اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ مسکراہٹ چہرے پر لیے ماں سے بات کر رہا تھا۔ دوسری طرف آمنہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"کہاں ہو بیٹا اس وقت؟ میرا تم سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"اموجان! میں اور لیزا شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ شاپنگ کے بعد میں آپ سے ......" وہ فوراً" ہی شاپنگ کے بعد آج دن یا شام کا کوئی وقت اور جگہ ماں سے ملنے کے لیے طے کر رہا تھا مگر آمنہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"کس جگہ جا رہے ہو شاپنگ کے لیے؟ میں بھی وہیں آ رہی ہوں۔" وہ ان کی موجودگی چاہتا بھی ہے یا نہیں' یہ پوچھے بنا انہوں نے فوراً" اس سے کہا۔

"اموجان! آپ ......" وہ نجانے کیا کہنا چاہتا تھا مگر آمنہ اس کی بات سنے بغیر فوراً" بولیں۔

"شادی کی شاپنگ کے لیے جا رہے ہو ناں تم دونوں؟"

"جی۔"

"بس پھر میں بھی وہیں آ رہی ہوں۔ تم مجھے جگہ بتاؤ۔"

آمنہ کے اٹل اور فیصلہ کن انداز کے سامنے وہ چپ ہو گیا تھا۔ اس نے انہیں جگہ بتادی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ لیزا اور آمنہ تینوں شاپنگ کے لیے ساتھ تھے۔ لیزا اور آمنہ مل کر کپڑے پسند کر رہی تھیں۔ اس کا کام فقط پے منٹ کرنا تھا۔ شادی کے دن کا جوڑا لیزا نے آمنہ سے کہا تھا کہ وہ پسند کریں۔ اسے لیزا پر فخر کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی ماں کو خوشی دینے کے لیے اپنی زندگی کے سب سے اہم دن پر پہنے جانے والا اہم ترین جوڑا انہیں پسند کرنے کو کہہ رہی تھی جسے وہ خود اپنی مرضی اور پسند سے خریدنے کے لیے بے حد پرجوش تھی۔

"تم پر تو ہر رنگ سجتا ہے لیزا۔ تم بتاؤ بیٹا! شادی کے دن کس رنگ کا جوڑا پہننا چاہتی ہو؟" خوشی سے سرشار آمنہ نے لیزا سے پوچھا۔

"ڈیپ ریڈ۔ (گہرا سرخ) لیزا نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

پھر آمنہ ہی نے شادی کے دن کے گہرے سرخ رنگ کا خوب بھاری کام والا غرارہ لیزا کے لیے پسند کیا تھا۔ آمنہ نے ایک اور بھاری کام سے مزین سی گرین شرارہ ان کے ولیمہ کے دن کے لیے پسند کر لیا تھا۔ وہ ماں کو روک نہیں سکا تھا۔ اس کا بڑی سادگی سے شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ کوئی دھام دھام اور رنگ برنگی تقریبات اسے نہیں چاہیے تھیں جو اس طرح کے جوڑوں کا ڈھیر لگایا جاتا۔

بہرحال وہ ماں کو کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی خودداری اور غیرت مندی کو اس کی ماں سمجھتی ہیں تب ہی انہوں نے لیزا کے لیے اپنے پیسوں سے کچھ بھی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جیسے جانتی تھیں وہ اپنی ہونے والی بیوی کے لیے خریدی جانے والی اشیاء میں اپنے باپ کا ایک پیسہ شامل کیا جانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ وہ بس پسند کرتی جا رہی تھیں بل وہ پے کر رہا تھا۔

"امو جان! آپ اپنے لیے بھی کچھ لیں۔"

وہ آہستگی سے ماں سے بولا۔ آمنہ نے بغیر کسی پس و پیش کے فوراً ہی اپنے لیے ایک خوب صورت ساڑھی پسند کی تھی۔

"میرے بیٹے نے مجھے دلوائی ہے۔ اسے میں تمہاری شادی پر پہنوں گی سکندر۔"

وہ مسکرا کر خوش ہو کر اس سے بولی تھیں۔ کیا آمنہ ان دونوں کی شادی پر وہ ہایا اٹلی آنے کا پروگرام بنا رہی تھیں؟

وہ آج لیزا کے ساتھ بات کر کے شادی کی جگہ اور دن طے کر لینا چاہتا تھا۔ اسے ماں کی بات پر قدرے حیرت سی ہوئی تھی۔ ڈھیر سارے شاپنگ بیگز اٹھائے وہ لوگ شاپنگ مال سے باہر نکلے تو سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

"لنچ ساتھ کر لیتے ہیں کہیں۔ کیا خیال ہے تم دونوں کا؟" آمنہ ان دونوں سے مخاطب تھیں۔

پہلی بار ماں کو کہیں کھانا کھلانے لے جا رہا تھا' اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ وہ انہیں کسی بہت اچھے ریسٹورنٹ لے جائے۔

"آپ آرڈر کریں امو جان۔"

اس خوب صورت ریسٹورنٹ میں وہ تینوں ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ آج کل کی طرح اس کی ماں کی آنکھیں بات بات پر بھیگ نہیں رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ جیسے آج اچانک ہی انہیں کوئی ان ہونی اور بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔

وہ خاصی پرجوش سی رہی تھیں شاپنگ کے دوران بھی۔ کہیں بھی ایک پل کے لیے بھی وہ جذباتی ہو کر روئی نہیں تھیں۔ وہ بہت خوشی خوشی مینو میں سے دیکھ کر ویٹر کو اپنی پسند کی ڈشز آرڈر کر رہی تھیں۔

"تمہیں ککنگ آتی ہے لیزا؟" وہ ماں اور لیزا کی گفتگو کے بیچ خاموش تھا۔ ان کا لنچ سرو کیا جا چکا تھا۔ وہ

خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا جبکہ آمنہ لیزا سے باتیں کر رہی تھیں۔

"جی امو جان! آتی ہے۔"

"سکندر کو اٹالین اور پاکستانی کھانے بہت پسند ہیں۔" بارہ سال پہلے اس نے آخری بار ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھایا تھا۔ انہیں اس کی پسند ناپسند سب یاد تھی۔ جس طرح اسے یہ یاد تھا کہ ماں کے ہاتھ کی پکی دال بھی کس قدر مزے کی ہوا کرتی تھی۔

"اٹالین تو میں بہت اچھا بنا لیتی ہوں۔ پاکستانی سیکھ لوں گی۔"

لیزا کے سعادت مندانہ جواب پر آمنہ کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ہنس پڑا تھا۔ آمنہ نے بے اختیار بیٹے کے ہنستے ہوئے چہرے کو بہت پیار سے دیکھا۔ جیسے دل ہی دل میں دعا کر رہی ہوں کہ ان کے بیٹے کے لبوں پر اب یہ ہنسی سدا رہے۔

"تم دونوں نے شادی کے بارے میں کیا ڈیسائڈ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے دن، جگہ وغیرہ۔ تمہارے والد اس بارے میں کیا کہتے ہیں لیزا؟" آمنہ لیزا سے مخاطب تھیں۔

"ابھی کچھ بھی ڈیسائڈ نہیں کیا امو جان۔ پاپا کو سکندر بہت پسند آیا ہے۔ ہم دونوں جو بھی ڈیسائڈ کریں گے، پاپا اس پر راضی ہوں گے۔"

اسے پتا نہیں کیوں اپنی ماں کی گفتگو کا انداز کچھ مختلف لگا۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھیں، جیسے وہ کچھ پلان کر چکنے کے بعد اس وقت ان دونوں کے ساتھ موجود تھیں اور یہ تمام گفتگو کر رہی تھیں اور قصداً" لیزا سے کر رہی تھیں اس سے نہیں۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں، یہ وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔

"میں تمہارے والد سے ملنا چاہتی ہوں لیزا۔" یک دم ہی آمنہ نے لیزا سے کہا۔

وہ تو جو چونکا تھا سو چونکا تھا مگر لیزا بھی انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"ویسے تو تمہارے والد سکندر سے مل چکے ہیں اور اسے پسند بھی کر چکے ہیں۔ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ مگر میری خواہش ہے میں تمہارے گھر سکندر کا باقاعدہ رشتہ لے کر آؤں۔ وہ جو ہمارا روایتی مشرقی انداز ہے، اس کے مطابق میں ان سے تمہارا رشتہ مانگوں۔ یہ میری بہت بڑی خواہش ہے۔ اگر تم دونوں مجھے اس کی اجازت دو تو یہ میرے لیے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔"

وہ لیزا سے مخاطب تھیں اس سے نہیں۔

اسے اپنی ماں کی ذہانت پر رشک آیا۔ پہلے فارم ہاؤس کی دعوت اور اب رشتہ لانے کی بات۔ دونوں بار وہ جانتی تھیں کہ اگر اس سے یہ بات کہی گئی تو وہ صاف انکار کر دے گا۔ سو انہوں نے بات کرنے کے لیے لیزا کا انتخاب کیا تھا اور بات ایسے موقعوں پر کی تھی جب وہ تینوں ساتھ تھے۔

لیزا، سکندر کی ناپسندیدگی اور انکار سمجھنے کے باوجود بھی ظاہر تھا، اس کی ماں کو صاف منع کس طرح کر سکتی تھی اور وہ خود اپنی ہونے والی بیوی کے سامنے اپنی ماں کی بات رد کر کے انہیں شرمندہ کس طرح کروا سکتا تھا؟

اس کی امو جان نے دونوں بار بہت تاک کر اور درست موقع پر دونوں باتیں کی تھیں۔ وہ فارم ہاؤس کی دعوت رد نہیں کر پایا تھا اور اب اس وقت بھی بالکل چپ تھا۔ لیزا کشمکش میں مبتلا ایک نظر اسے اور ایک نظر آمنہ کو دیکھ رہی تھی۔ آمنہ اس کے جواب کی منتظر تھیں، ان کے چہرے پہ حسرتیں اور امیدیں تھیں، ایک التجا سی تھی ان دونوں سے۔

"بتاؤ بیٹا! میں آجاؤں تمہارے گھر؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" انہوں نے رسانیت سے اپنا سوال پھر دہرایا تھا۔

"آپ آجائیں امو جان! جب آپ کا دل چاہے۔" لیزا کے لیے ہاں اور نہ دونوں کرنا مشکل تھے اور دونوں مشکلوں میں سے اس نے ہاں کرنے والی مشکل کا انتخاب کیا تھا۔

وہ اس کی ماں کو انکار کر کے شرمندہ نہیں کر سکتی تھی۔ آمنہ کو ہاں کہنے کے بعد لیزا نے معذرت طلب

نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو "میں کیا کرتی۔ تمہاری ماں کو کس طرح انکار کرتی؟"

دل میں وہ ماں کی اس خواہش پر جتنی بھی کوفت اور ناپسندیدگی محسوس کر رہا تھا پر منہ پر تو وہ بھی لیزا کے سامنے ماں کو اس بات کے لیے منع نہیں کر پایا تھا۔ آمنہ یک دم ہی خوشی سے یوں مسکرائی تھیں' یوں سرشار سی ہوئی تھیں گویا کوئی بہت بڑی اور ناممکن نظر آنے والی خوشی پالی ہو۔ انہوں نے بے اختیار لیزا کے ہاتھ کے اوپر گرم جوشی سے اپنے ہاتھ رکھے تھے۔

"بہت شکریہ لیزا! تمہارے گھر سکندر کا رشتہ لا کر میں اپنی بہت بڑی خوشی پوری کروں گی۔ میں کل تمہارے گھر آؤں گی۔"

"امو جان! آپ لنچ یا ڈنر ہمارے ساتھ کیجیے گا۔" لیزا نے مسکرا کر کہا۔ بغیر کسی تکلف کے آمنہ فوراً" بولیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ میں کل لنچ پر تمہارے گھر آؤں گی۔ بس میں اور سکندر ہوں گے۔" آمنہ بے تحاشا خوش تھیں۔ جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

لیزا کن انکھیوں سے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی اور معذرت تھی۔

"آئم سوری سکندر! تم ناراض ہو گئے ہو ناں؟" لنچ کرنے کے بعد آمنہ اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ گھر واپس چلی گئی تھیں جبکہ وہ دونوں لیزا کے پاپا کی گاڑی میں واپس جا رہے تھے۔ لیزا معذرت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جواباً" چپ رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔ تم اس بات کو کبھی پسند نہیں کر سکتے۔ مگر میں تمہاری امو جان کو کیسے انکار کرتی؟" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ہار مان لینے والی' تھکی تھکی سی مسکراہٹ۔

"مجھے پتا ہے لیزا! تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی تمہارے پاپا کو انکار کرنے سے ہچکچاتا۔ امو جان کو بھی یہ بات پتا تھی تب ہی وہ آج ہم دونوں سے ملی تھیں۔ وہ گھر سے سب کچھ طے کر کے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آج دراصل تم سے بات ہی یہ کرنی تھی اور وہ بھی میرے سامنے۔"

اس کے چہرے پر اداسی بھری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"تمہیں غصہ آ رہا ہے سکندر؟ تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ ہے ناں؟" لیزا فکر اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"غصہ نہیں آ رہا لیزا' موڈ بھی ٹھیک ہے۔ بس یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ امو جان کی ایک اور خوشی اگر میری وجہ سے پوری ہو رہی ہے تو ٹھیک ہے۔ چلو ایسا ہی سہی۔"

لیزا سر اثبات میں ہلاتی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بے چینی سے آمنہ کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنی' وہ کمرے میں بیٹھے نہ رہ سکے۔

وہ فوراً" لاؤنج میں آ گئے۔ ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیا جواب دیا ہو گا سکندر نے؟ کہیں انکار نہ کر دیا ہو جیسے کل کنگن لینے سے انکار کیا تھا۔ مگر وہ انکار اس نے ماں کو نہیں' انہیں کیا تھا۔ ماں سے تو وہ بہت پیار کرتا ہے۔ وہ اپنی بیمار ماں کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اتنا تو انہیں یقین تھا۔ خدا کرے آمنہ خوشی کی خبر لائی ہوں۔ آمنہ اندر داخل ہوئی تھیں اور ان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر ہی انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ کامیاب لوٹی ہیں۔ وہ بے اختیار ان کے نزدیک گئے تھے۔

"سکندر مان گیا؟"

"ہاں! دل سے مانا ہے یا نہیں۔ مگر زبان سے اس نے مجھے منع نہیں کہا ہے۔ میں کل لنچ پر جا رہی ہوں لیزا کے گھر۔"

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا تھا۔

"تھینک یو آمنہ! بس اب اللہ جلدی سے یہ خوشی دکھادے کہ ہم دونوں مل کر سکندر کی شادی کریں۔"

زندگی میں پہلی بار وہ میاں بیوی کی طرح، دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے دل کی باتیں شیئر کر رہے تھے۔ پہلی بار کوئی خواب تھا جو وہ دونوں مل کر ایک ہی جتنی امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار کوئی دعا تھی جو وہ دونوں ایک ہی شدت سے مانگ رہے تھے۔

"آمین۔"

"بس اب تم کل لیزا کے والد سے شادی کی تاریخ لے کر آنا۔ میں چاہتا ہوں مہندی، شادی، ولیمہ سکندر کی شادی کی ہر تقریب یادگار ہو۔ لوگ سالہا سال اس شادی کو یاد رکھیں۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا شہریار!"

وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کر رہے تھے انہیں لاؤنج کے دروازے پر کھڑے زین کے نہ تو آنے کا پتا چلا تھا نہ وہاں رکنے کا اور نہ ہی وہاں سے چلے جانے کا۔

☆ ☆ ☆

وہ اسٹڈی میں تھے۔ وہ شادی کے ڈیزائنر کارڈز کے کچھ ڈیزائن گھر منگوانا چاہتے تھے۔ اسی کے لیے وہ چند ایک فون کالز کر رہے تھے جب زین اسٹڈی میں ان کے پاس آیا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا، وہ ان سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہے ورنہ انہیں فون پر بات کرتا دیکھ کر وہ لوٹ جاتا۔

"آپ کل صبح تک بھجوا دیں۔ مجھے سیمپلز۔" انہوں نے فون پر گفتگو مختصر کی تھی "ٹھیک ہے بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔"

"کیا ہوا زین؟" فون بند کرتے ہوئے انہوں نے زین سے پوچھا۔ زین کے چہرے پر ناراضی تھی۔

"یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے پاپا؟"

"کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے تعجب سے زین کے غصے بھرے چہرے کو دیکھا۔

"سکندر کی شادی کی تیاریاں۔ آپ اموجان کی خاطر اس سے مل لیے ٹھیک کیا۔ مگر اس کی شادی کی اس طرح تیاریاں۔ دس از ٹو مچ۔ اگر یہاں اس گھر میں وہ آیا، اس کی شادی یہاں پر ہوئی تو اتنے دنوں کے لیے میں اپنے بیوی، بچے کو لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔" انہوں نے غصے سے بولتے زین کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

"تمہیں جہاں جانا ہے چلے جاؤ زین! مگر سکندر کی شادی میں اور آمنہ مل کر ہی کریں گے۔ یہ گھر صرف تمہارا نہیں، سکندر کا بھی ہے۔ بلکہ اس گھر پر، مجھ پر، آمنہ پر، ہماری ہر چیز پر سکندر کا حق تم سے زیادہ ہے۔ ملا کیا میرے اس بیٹے کو مجھ سے؟ سوائے دکھوں اور تکلیفوں کے؟"

انہوں نے سخت لہجے میں جواب دینا شروع کیا تھا مگر جملے کے آخر تک آتے آتے ان کا لہجہ دکھوں اور پچھتاووں سے بھر گیا تھا۔

"اسے جو ملا، وہ اسی لائق تھا۔" زین نفرت سے بولا۔

"اچھا؟" زین کے نفرت بھرے انداز پر وہ تسلی سے مسکرائے تھے۔ زین نے اس بار جیسے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔ جیسے ان کا انداز سمجھ نہ پایا ہو۔

"بے خبری بہت بڑی نعمت ہے زین! جس بھائی سے آج بھی دل میں نفرت لیے بیٹھے ہو، اگر میں تمہیں سچائی بتا دوں تو زندگی بھر خود اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا پاؤ گے۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائے تھے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ زین ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہنوز سکندر کے لیے نفرت تھی۔ بھائی کی بھائی سے اس درجہ نفرت کی بنیاد کہاں رکھی گئی تھی؟ کس نے رکھوائی تھی یہ بنیاد؟ زین کی آنکھوں میں سکندر کے لیے نفرت دیکھتے ہوئے ان کا دل چاہا وہ چیخیں مار مار کر روئیں، خود کو اپنے وجود کو مٹا ڈالیں۔

"میں ساڑھے چار سالوں سے ایک احساس گناہ، شرم اور ندامت کو ساتھ لیے زندگی گزار رہا ہوں زین!

تمہیں اس ندامت اور گناہ کے احساس سے بچانا چاہتا تھا۔ ورنہ ساڑھے چار سال پہلے ہی تمہیں ساری سچائی بتادیتا اور شاید تمہیں نہ بتانا میری غلطی تھی۔ مجھے اس بد کردار لڑکی کی حقیقت تمہیں ضرور بتادینی چاہیے تھی جسے تم نے بارہ سال پہلے اپنی شریک حیات بنانے کے لیے چنا تھا۔ پھر کل فارم ہاؤس پر تم بھائی کے لیے چہرے پر نفرت لیے کھانے کی میز پر اس کے سامنے نہ بیٹھتے۔ تم اسے دیکھتے ہی اس کے سامنے معافی مانگنے کے لیے ہاتھ جوڑ دیتے۔ رو رو کر اپنے اس بھائی سے معافی مانگتے جس سے کل تم نے سلام دعا کرنی تک گوارا نہ کی تھی۔"

وہ زین کی طرف دیکھ رہے تھے جو حیرت زدہ سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ان کی کوئی بھی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔

"کیا جانتے ہو تم امِ مریم کے بارے میں زین؟ ابھی میں تمہیں اس کی سچائی بتادوں تو تم شرم سے خود اپنے آپ سے نظریں نہ ملا پاؤ گے کہ اس بدکردار لڑکی سے تم شادی کے خواہش مند تھے۔ اس کے رچائے ڈرامے کا یقین کرکے تم نے اپنے بڑے بھائی پر ہاتھ اٹھایا تھا' اس کو گالیاں دی تھیں؟ اس سے زندگی بھر کے لیے قطع تعلق کرلیا تھا اور آج تک اسی لڑکی کے دکھائے اس جھوٹ کو سچ مان کر اپنے بھائی کی شکل تک سے نفرت کرتے ہو۔"

بولتے ہوئے جذبات کی شدت میں آکران کی آواز بلند ہوگئی تھی۔ وہ زین کو غصے سے دیکھ رہے تھے۔ زین اب بالکل چپ تھا۔

"سکندر' امِ مریم کے بارے میں بالکل سچ کہتا تھا زین! وہ لڑکی طوائفوں سے بھی بدتر تھی۔ جب وہ تمہیں لاس اینجلس میں ملی تھی تو نہ کنواری تھی نہ باکردار نہ حیادار دوشیزہ جو تم نے اسے سمجھا تھا' میں نے اور آمنہ نے اسے سمجھا تھا۔ وہ تمہیں کیا مجھ جیسے دنیا دیکھے' ذہین اور تجربہ کار آدمی تک کو بے وقوف بنا گئی تھی۔ اتنی چالاک اور مکار تھی وہ۔"

جذبات کی شدت ان پر غالب تھی۔ بولتے ہوئے

انہیں سانس لینے کو' جذبات کو قابو کرنے کو پل بھر کو رکنا پڑا تھا۔ زین بالکل ساکت کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ام مریم کا بدکاری سے بھرا ماضی مجھے کسی اور نے نہیں' اس کی ایک پرانی سہیلی نے بتایا تھا۔ ام مریم اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرکے ساڑھے سولہ سال کی عمر میں پریگننٹ تک ہو چکی تھی' اپنا بچہ ضائع بھی کرا چکی تھی اور اس افیئر کے نتیجے میں اپنی ماں کو طلاق بھی دلوا چکی تھی۔ یہ اس کا وہ افیئر ہے جو میں جانتا ہوں۔ تم سے ملنے سے قبل اس کے اور کس کس سے تعلق رہے ہوں گے' وہ میں نہیں جانتا۔ مگر اب جس امیر بزنس مین سے شادی کرکے وہ کراچی ہی میں رہ رہی ہے' اس سے نکاح کرنے سے قبل اس کے ساتھ ہوٹلوں میں جا جا کر راتیں گزارا کرتی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس بات کا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ہاشم اسد کے ساتھ ہوٹل کے روم میں بانہوں میں بانہیں ڈال کر جاتے دیکھا ہے۔ اس کے عشق میں پاگل ہو کر ہاشم اسد نے اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا۔ اپنی بیوی اور تین بچوں کو چھوڑ دیا۔ میری باتوں کی تصدیق چاہتے ہو تو جا کر اس مظلوم عورت سے' ہاشم اسد کی پہلی بیوی سے اس ناگن کی سچائی جان لو۔ اپنی سگی ماں کا گھر ام مریم نے اجاڑا' تین بچوں کے باپ کا گھر اس نے خراب کروایا۔ ہمارے گھر کی خوشیاں اس نے اجاڑیں۔ یہ تین گھر تو وہ ہو گئے جن کا مجھے پتا ہے' مزید نجانے کتنے گھر اور کتنے لوگوں کو اس ڈائن نے تباہ و برباد کیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا۔"

غصے کی شدت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کی آواز بلند تھی۔ زین جیسے سب کچھ کہنا سننا بھول گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں حیرت' بے یقینی اور سکتہ لیے ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم سے منگنی کروانے کے بعد اس کا سکندر پر دل آ گیا تھا۔ وہ تو تھی ہی ہیچ۔ سکندر کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ مگر میرے غیرت مند اور باکردار بیٹے کو رشتوں کی حرمت کا پاس تھا۔ اس نے ام مریم کی پیش قدمی کو ٹھکرایا' اسے رد کیا تو ریجیکٹ کیے جانے کا انتقام لینے کے لیے اس نے وہ سارا سین کری ایٹ کیا تھا۔ اس ہوشیاری کے ساتھ کہ اس پر سچ کا گمان ہو۔ یاد کرو زین! جب تم سکندر پر ہاتھ اٹھا رہے تھے تب وہ چلا چلا کر تم سے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ تمہیں اور مجھے ام مریم کی سچائی بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہم جو اس کے سب سے زیادہ اپنے تھے ہمارے لیے سکندر سے زیادہ قابل اعتبار وہ بدکردار لڑکی ٹھہری تھی جسے ہم سے ملے فقط کچھ ہی عرصہ ہوا تھا جس کا ماضی بھی ہم نہیں جانتے تھے۔"

شہریار خان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ ان کی آواز رندھ گئی تھی۔

"ساڑھے چار سالوں سے گناہ کے بوجھ تلے دبا زندگی گزار رہا ہوں میں۔ زین! وہ میرا بے قصور اور معصوم بیٹا بغیر کسی خطا کے عمر بھر سزا کاٹتا رہا ہے۔ میں تو آج اس سے معافی مانگنے کے بھی قابل نہیں پا تا خود کو!"

وہ آج صبح آمنہ کے سامنے روئے تھے اور اب زین کے سامنے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ بیٹے کی بربادی' اس کی پامالی پر ان کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ زین کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ مردہ انداز میں پلٹا تھا۔

وہ عجیب شکستہ قدموں سے چلتا اسٹڈی سے جا رہا تھا۔ لگتا تھا کسی بھی پل گر پڑے گا۔ ابھی تو انہوں نے زین کو وہ سب سے بڑی بات نہیں بتائی جس کے واقف صرف وہ' سکندر اور اللہ ہے۔ زین کی نفرتوں اور ان کے پاگل پن نے گھر سے نکالے جانے کے بعد سکندر کو کس حال تک پہنچا دیا تھا۔ اس کا مردانہ وقار' اس کی عزت و آبرو کس طرح پامال کی گئی تھی۔ بتا دیں تو زین شاید خود کو جان سے ہی مار ڈالے۔

یہ انتہائی حد تک تکلیف دیتی اور رلاتی سچائی وہ نہ تو کبھی آمنہ کو بتانا چاہتے تھے نہ زین کو۔ اپنے سکندر کی عزت اور اس کا وقار انہیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیارا تھا۔ وہ اسٹڈی میں اکیلے بیٹھے سکندر کے اس دکھ پر اس کے وقار کی پامالی پر پھر سے رو پڑے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

قسط ۱۲

وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے خود پتا نہیں تھا' وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ تھا بھی کہ نہیں۔ کیا وہ زندہ تھا؟ کیا وہ سانس لے رہا تھا؟ کیا یہ سب کچھ سننے اور جاننے کے بعد بھی وہ زندہ تھا؟ اس کے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ بہت سی آوازیں۔ کسی کی خود کو پیار سے پکارتی بلاتی صدائیں۔

"تم نے میرے ساتھ کھیلنا کیوں چھوڑ دیا ہے زین؟"

"آؤ زین! ہم ساتھ مل کر کھیلتے ہیں۔"

"میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں زین۔"

"میری اسپورٹس کار تم لے لو زین۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے کھیلے گا تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔"

اس نے خود کو بیک ویو مرر میں دیکھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا' وہ رو رہا تھا۔ زین شہریار' سکندر شہریار کے لیے رو رہا تھا؟ اس کے لیے' جس کے لبوں کی ہنسی اور اس کی ہر خوشی اس سے کبھی اس نے چھین لینی چاہی تھی اور پھر چھین بھی لی تھی۔ وہ جیسے کسی گہری کھائی میں گرتا چلا جا رہا تھا۔

بے خبری واقعی بہت بڑی نعمت تھی۔ اس سے نفرت کرتے ہوئے زندگی کے بارہ سال کس سہولت سے گزار دیے تھے۔ آج سب جان لینے کے بعد بارہ منٹ گزارنے مشکل ہو گئے تھے۔

"شکر! تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین؟ بھائی الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں تو کیا ایک دوسرے سے فون پر بھی بات نہیں کرتے۔"

"مجھ سے جھوٹی محبت جتانے کے بجائے وہ کہو جو تمہارے دل میں ہے۔ ایک انتہائی حسین اور غیر معمولی ذہین لڑکی کا ساتھ تجھے کیوں مل رہا ہے۔ اسی بات کی تکلیف ہے ناں تمہیں؟"

اس کی پیار بھری صدائیں تھیں اور جواب میں اس کی اپنی نفرت سے پھنکارتی' زہریلی آواز۔ جیسے ایک فلم نگاہوں کے سامنے چل رہی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کا بچپن' لڑکپن' نوجوانی۔ سکندر کی اس سے محبت اور جواب میں اس کی اس سے نفرت۔ بے تحاشا نفرت۔ سگے بھائی سے کوئی اتنی نفرت بھی کر سکتا ہے؟ اتنی نفرت۔ اتنا حسد۔ اتنی دشمنی۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

نجانے کون سی شاہراہ تھی' کون سی سڑک۔ جس کے کنارے گاڑی کھڑی کر کے وہ اسٹیرنگ پر سر ٹکا کر زار و قطار رو رہا تھا۔ باپ نے اسے صرف سکندر ہی کے بارے میں نہیں بلکہ ام مریم کے بارے میں بھی بہت کڑوی اور تلخ سچائیاں بتائی تھیں۔

وہ لڑکی جسے اس نے بے حد اور بے حساب چاہا تھا' جس کی محبت وہ آج تک اپنے دل سے نکال نہیں پایا تھا۔ اسے بھی ابھی بتایا گیا تھا کہ مریم کی وہ محبت جھوٹ تھی' دھوکا تھی' مکاری تھی۔ بہت کرب ناک تھی یہ سچائی مگر اسے ام مریم کی خود سے بے وفائی اور جھوٹ اس پل نہ یاد آ رہے تھے۔ نہ رلا رہے تھے اگر کچھ یاد آ رہا تھا تو سکندر۔ اگر کچھ رلا رہا تھا تو اس کی تباہی اور بربادی۔ سکندر اس کا اپنا' اس کا سگا بھائی۔ وہ بھائی جس کی زندگی اس کی نفرت اور دشمنی نے اجاڑ دی تھی۔ اس کا وہ بے مثال اور شاندار بھائی جس میں دنیا تسخیر کر لینے کی صلاحیتیں تھیں' اس کی حسد اور نفرت کا شکار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا؟

سکندر سے حسد؟ ہاں ہاں حسد۔ آج تو یان لے وہ یہ سچائی کہ سکندر سے اسے کوئی شکایت نہ تھی سوائے حسد کے۔ سکندر نے اس کا کبھی کوئی نقصان نہ کیا تھا۔

وہ اگر زیادہ ذہین تھا تو یہ اس کا قصور نہ تھا' باپ اس کی ذہانت کی وجہ سے اسے زیادہ اہمیت دیتے تھے تو یہ بھی سکندر کی غلطی نہیں تھی۔ اس کی ذہانت پر خوش ہونے اور اس کی کامیابیوں پر فخر کرنے کے بجائے اس نے بھائی سے حسد اور مقابلہ بازی شروع کر دی تھی۔

وہ کبھی اعلا ظرفی کا مظاہرہ کر کے بھائی کی خود سے برتری کیوں تسلیم نہ کر سکا۔ اور اس کے بھائی کا کیریئر' اس کا پروفیشن اور ان سب کے حوالے سے دیکھے اس کے خواب سب بکھر گئے اس کے حسد کی وجہ سے۔

سکندر کے ہارورڈ میں پڑھنے سے جلتا تھا ناں؟ خوش ہو لے آج کہ وہ بھائی ہارورڈ سے ڈگری نہ لے سکا تھا۔ اس کی ذہانت سے حسد کرتا تھا تو جشن منا لے آج کہ وہ بھائی اپنا کوئی بھی خواب پورا نہ کر سکا تھا۔ خود کو مظلوم سمجھتا کل وہ اسی بھائی سے کس نفرت سے فارم ہاؤس پر ملا تھا؟ کس دیدہ دلیری سے وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنی جرأت' اتنی مجال کہاں سے آگئی تھی کہ جسے برباد کر دیا اس کے سامنے نفرت سے کھڑا بھی ہو سکے؟

اس کا شدت سے مر جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ یہ آگہی بہت کڑی تھی۔ یہ آگہی اسے اس کی اپنی بہت کریہہ اور بھیانک شکل دکھا رہی تھی۔

بارہ سال سکون سے رہ لیا مگر اب زندہ کس طرح رہ پائے گا۔ اپنے قدموں پر کھڑا کس طرح رہ پائے گا۔ خود کو بہت اچھا اور بہت مظلوم سمجھتے سمجھتے پتا چلا تھا۔ وہ دنیا کا سب سے سنگ دل اور کم ظرف انسان ہے۔

وہ اپنے ہی بھائی سے ساری زندگی حسد میں مبتلا رہا ہے۔ اس کا حسد' اس کی جلن' اجاڑ گئی اس کے بھائی کی زندگی کو۔ ساری زندگی مظلومیت کا ڈھول پیٹتا رہا تھا۔ مظلوم؟ کس بات کی مظلومیت؟

آخر اس کے ساتھ ظلم ہوا کیا تھا؟

وہ ایک بد کردار لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور یہ شادی ہو نہیں پائی تھی۔ یہ تھی اس کی مظلومیت؟

مظلوم حقیقت میں تھا کون؟ بدترین ظلم جس پر توڑا گیا تھا وہ کون تھا؟ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل نہیں کانپا۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نہیں سوچا' میرا بھائی نجانے کہاں در بدر پھر رہا ہو گا؟ وہ کس حال میں ہو گا؟ میں آسائشوں میں جی رہا ہوں۔ نجانے اسے دو وقت کا کھانا بھی نصیب ہو رہا ہو گا یا نہیں؟ وہ آج بارہ سالوں بعد خوف' درد اور اذیت سے کانپ رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائی پر ہاتھ اٹھایا تھا' اسے بری طرح مارا تھا' گالیاں دی تھیں۔ اس کا بھائی دھکے مار مار کر ذلیل و رسوا کر کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ آخری وقت تک وہ چیخ چیخ کر' رو رو کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

گھر سے نکال دیے جانے کے بعد وہ کہاں گیا ہو گا؟ وہ آج پورے بارہ سالوں بعد یہ بات سوچ رہا تھا۔ 31 دسمبر کی رات جب اپنے گھر کے پر آسائش کمرے میں بیٹھ کر وہ اس بد کردار لڑکی پر ٹوٹے ظلم کا ماتم منا رہا تھا تب اس کا وہ مظلوم بھائی کہاں رہا تھا؟ وہ رات اس نے کہاں بتائی تھی؟ اپنی زندگی کے گزرے بارہ سال اس نے کہاں گزارے تھے؟ کس طرح گزارے تھے' وہ کن مشکلات سے گزرا تھا۔

اسے دنیا نے کس کس طرح اپنی ٹھوکر پر رکھا ہو گا؟ بھائی کی خوشیاں' اس کے خواب چھین کر وہ خود آج کہاں کھڑا تھا؟ ماں' باپ' گھر' بہترین تعلیم' آسائشیں' کامیاب کیریئر' بہترین پروفیشن' بیوی' بچہ' سکھ' چین اور اس کا بھائی؟ اس کے حسد کا نشانہ بن کر ماں' باپ سے دور' گھر سے دور نجانے کن مصائب سے گزرا تھا۔ نجانے کس طرح اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ نجانے کیسے اپنی تعلیم پوری کی تھی۔ نجانے کس طرح وہ بالکل تنہا رہا تھا۔ سکندر کا کوئی ایک خواب بھی پورا نہیں ہوا تھا اور اس کے تمام خواب پورے ہوئے تھے۔

آج ہارورڈ کا ڈگری یافتہ زین شہریار ہے۔ سکندر شہریار نہیں۔

خوش ہو جاؤ زین شہریار! جشن مناؤ۔ تم نے سکندر کو ہرا دیا ہے۔ ٹھیک سوچا کرتے تھے تم' سکندر ہمیشہ ہی تو فاتح عالم نہیں ہوا کرتا۔ سکندر ہار بھی تو سکتا ہے۔ ہاں سکندر ہار سکتا ہے اگر اس کا زین شہریار جیسا حاسد

اور کم ظرف بھائی ہو۔

٭ ٭ ٭

"تم میرے گھر نہیں آئیں ناں لز۔ بہت بری ہو۔"

سیم کا شام میں اس کے پاس فون آیا تھا۔ وہ آج دن بھر میں کئی بار اسے میسج کر کر کے اس سے پوچھ چکی تھی کہ وہ اس کے گھر کب آ رہی ہے۔ وہ سیم کو یہ کیسے بتاتی کہ کل رات اسے پاپا نے منع کیا ہے سیم کے گھر جانے سے۔ وہ سیم کو یہ بھی نہیں بتا سکی تھی کہ کل رات محمود خالد اس کے کمرے میں اس کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے اپنے دل کی بہت سی باتیں پہلی بار اس سے کی تھیں اور وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر روئی بھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ باپ سے اظہار محبت کیا تھا۔ ان کے لیے دل میں محبت محسوس کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خود کو ان کے قریب محسوس کیا تھا۔ یہ محسوس کیا تھا کہ اس کے پاپا ویسے نہیں' جیسا وہ برسوں سے انہیں سمجھتی آ رہی ہے۔

وہ سیم کو بتانا چاہتی تھی کہ ان کے پاپا اندر سے ایک بڑے ہی دکھی انسان ہیں اور وہ اس سے بے حساب پیار کرتے ہیں۔ وہ اس کو ہمیشہ بہت خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی رکوانے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں' ایسا تو اب وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی مگر سیم سے وہ یہ ساری باتیں کہہ نہیں پا رہی تھی۔ پر اتنا طے تھا' وہ پاپا کی بات مانے گی۔ وہ ان کا مان رکھے گی۔ اگر انہوں نے منع کیا ہے تو وہ سیم کے گھر نہیں جائے گی۔

"بس۔ اب میں کچھ بھی نہیں جانتی لز! تم کل میرے گھر آ رہی ہو اور سکندر کو بھی وہیں بلا رہی ہو۔ مل کیا اپنے ہونے والے بہنوئی سے ملوں گی بھی نہیں؟"

اس کے یہ بتانے پر کہ وہ آج تقریباً" سارا دن سکندر کے ساتھ شاپنگ میں مصروف رہی تھی۔ سیم فوراً" بولی تھی۔ اپنے اسی مخصوص رعب بھرے انداز میں جس سے وہ اپنی باتیں اس سے منوالیا کرتی تھی۔

"کل تو میں بالکل بھی نہیں آ سکتی سیم! کل پاپا سے ملنے سکندر کی ممی آ رہی ہیں لنچ پر۔" بہانہ اس کے پاس موجود تھا اور تھا بھی سچ۔ سو وہ فوراً" بولی تھی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ کل تمہاری ہونے والی ساس صاحبہ تشریف لا رہی ہیں؟" سیم ہنس کر بولی تھی پُرمزاح سے انداز میں۔ مگر پھر بھی اسے اس کے لہجے میں کچھ مختلف سی بات محسوس ہوئی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

"ہاں۔ کل لنچ پر سکندر اور اس کی ممی یہاں آ رہے ہیں۔" وہ جواباً" مسکرا کر بولی تھی۔

"چلو پھر میں بھی کل وہیں آ جاؤں گی۔ میں بھی تو ملوں تمہاری ساس صاحبہ اور مسٹر سکندر سے۔"

سیم شرارتی سے انداز میں بولی تھی۔ محمود خالد کو وہ گھر واپس آتے ہی سکندر کی امی جان کی کل ان کے گھر آمد کی بابت بتا چکی تھی۔

وہ اس بات کو سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ شاید ان کے بھی دل میں چھپی خواہش یہی تھی کہ ان کی بیٹی کی بالکل روایتی انداز میں شادی ہو۔ انہوں نے اسی وقت ہی عائشہ کے ساتھ بیٹھ کر کل مہمانوں کی خاطر تواضع شاندار انداز میں کیے جانے کا پورا پروگرام بنا لیا تھا۔ سکندر کی والدہ کے ساتھ اور کتنے افراد نے آنا تھا وہ جانتے تھے' لیزا انہیں بتا چکی تھی مگر پھر بھی انہوں نے اہتمام اس طرح کرنا شروع کیا تھا گویا لیزا کی سسرال سے دس' پندرہ افراد نے آنا تھا۔

٭ ٭ ٭

اگلے روز صبح ہی سے ان کے گھر پر اس طرح شور شرابا اور ہنگامہ تھا۔ جیسے آج ہی گھر پر لیزا کی شادی کی تقریب ہو۔ وہ باپ کی محبتوں کو محسوس کر رہی تھی' وہ ان محبتوں پر خوشی سے سرشار ہو رہی تھی اور دل میں یہ بھی سوچ رہی تھی' وہ ان سے ہمیشہ اتنی دور کیوں رہی کہ کبھی ان کے دل میں جھانک کر اپنی محبت دریافت

نہ کر سکی؟ پانچ سال پہلے تک وہ اپنے باپ ہی کے ساتھ لندن میں رہتی تھی۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ کبھی ان کی محبت کو کیوں نہیں سمجھ پائی تھی؟ صبح وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیم بھی آگئی۔ عائشہ کک اور ملازمہ کو ساتھ لگائے لنچ کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

اس وقت وہ، محمود خالد کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی تھی۔

سیم کی گاڑی پورچ میں رکتی دیکھ کر اگر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی، دل خوش ہوا تھا تو دوسری طرف محمود خالد کا سیم کو دیکھتے ہی موڈ آف ہو گیا تھا۔

وہ جیسے آج کے اس دن، اس موقع پر سیم کی اپنے گھر موجودگی کو پسند نہیں کر رہے تھے۔

"مریم کو تم نے انوائیٹ کیا ہے؟" انہوں نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"جی پاپا۔" وہ انہیں یہ نہیں بتا سکی تھی کہ میں نے انوائیٹ نہیں کیا۔ صرف اسے آج سکندر اور اس کی امو جان کے آنے کا بتایا تھا۔ وہ یہاں خود آگئی ہے۔ اگر سیم آج یہاں آگئی تھی تو اس میں برائی کیا تھی؟ وہ باپ کی ناراضی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"پاپا! آپ کو کیا سیم کا آنا اچھا نہیں لگا؟ وہ میری اکلوتی بہن ہے پاپا۔ میں چاہتی ہوں۔ میری شادی سے جڑے ہر مقام پر وہ میرے ساتھ ہو۔ مجھے سیم کا اپنے پاس موجود ہونا اچھا لگے گا پاپا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اس کے لفظوں میں بہن کے لیے والہانہ پیار تھا۔

محمود خالد بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیسے خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔ پھر جیسے جملے پر نظر ثانی کر کے نرمی سے بولے۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔" اسے یہ جواب دیتے ہی وہ فوراً وہاں سے ہٹے تھے۔ وہ ٹیرس سے جا رہے تھے۔ ایک سیکنڈ حیرت سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ بھی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ وہ سیم سے ملنے نیچے جا رہی تھی۔ مگر سیم اوپر ہی چلی آئی تھی۔

"چلو تمہارے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

اسے گلے لگا کر پیار کرنے کے بعد سیم اس سے بولی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا شاپنگ بیگ تھا۔ وہ سیم کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

سیم نے اس کے کمرے کو بہت غور سے دیکھا تھا جیسے گھر کے اس کمرے میں پہلی مرتبہ آئی ہو۔

"یہ روم تم نے خود سیٹ کیا ہے لز؟" چاروں طرف نگاہیں گھماتے ہوئے سیم نے اس سے پوچھا۔ اس کی نگاہوں میں کمرے کی آرائش و سجاوٹ کے لیے ستائش کی تھی۔

"نہیں، میرے آنے سے پہلے ہی پاپا نے تیار کروا کر رکھا تھا۔" سیم نے ایک پل کے لیے اسے بغور دیکھا بہت سنجیدہ نگاہوں سے۔ پھر وہ مسکرا دی تھی۔

"چلو ہمیں زندگی میں پہلی بار اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ کرنے کا خیال تو آیا۔" سیم کا لہجہ طنزیہ و استہزائیہ تھا۔

"پاپا بہت بدل گئے ہیں سیم! ہم انہیں جہاں جیسا سمجھتے ہیں۔ وہ اب ویسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ ہم دونوں کے ساتھ بچپن میں جو کچھ بھی ہوا۔ اس پر وہ بہت گلٹی فیل کرتے ہیں۔"

وہ بے اختیار سنجیدگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں باپ کی محبت تھی۔

"دو دن ابھی تمہیں یہاں آئے ہوئے ہیں لز..... ذرا ٹھہر جاؤ۔ اتنی جلدی کوئی رائے مت قائم کرو۔ میں آج صرف آئی ہی اس لیے ہوں کہ پاپا سکندر یا اس کی ممی کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر سکیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا سیم! تم فکر مت کرو۔" وہ دونوں ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا پہن رہی ہو تم آج!" سیم نے گفتگو کا موضوع تبدیل کیا تھا۔ وہ مسکرا کر دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

"شلوار قمیص۔ بلکہ چوڑی دار ہے، شلوار نہیں۔

کل شام ہی آنٹی ایمرجنسی میں میرے لیے خرید کر لائی ہیں۔ مجھے خود تو یہاں کی مارکیٹس کا زیادہ آئیڈیا نہیں ہے۔ کل میں نے اور سکندر نے برائیڈل ڈریسز خریدے تھے تو اس کی ممی ہمارے ساتھ تھیں۔"

وہ فوراً ہی اٹھی تھی تاکہ وارڈ روب سے نکال کر سیم کو اپنا آج پہنا جانے والا جوڑا دکھا سکے۔

"تم نے برائیڈل ڈریس بھی خرید لیے؟ بڑی اسپیڈ میں ہو تم دونوں۔ آج ہی نکاح مت پڑھوالینا۔"

وہ وارڈ روب سے ہینگر سمیت جوڑا نکال رہی تھی تب اس نے سیم کی ہنستی ہوئی آواز سنی۔ وہ مسکراتے ہوئے واپس بیڈ پر آگئی تھی۔

"یہ پہن رہی ہوں میں آج۔ شرارہ اور غرارہ تمہیں ابھی دکھاتی ہوں۔"

وہ بیڈ پر سیم کے سامنے پھر بیٹھ گئی تھی۔ بہت خوش ہو کر، مسکرا کر وہ سیم کو اپنا جوڑا دکھا رہی تھی۔ براؤن اور شاکنگ پنک رنگوں کے امتزاج والا بہت خوب صورت ڈریس عائشہ اس کے لیے خرید کر لائی تھیں۔

"تم یہ پہنو گی؟ اتنے فضول اور بورنگ کپڑے؟ حد کرتی ہو تم۔" سیم نے برا سا منہ بنا کر جوڑے کو فوراً" ریجیکٹ کر دیا تھا۔

"اچھا خاصا خوب صورت تو ہے سیم۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے بورنگ کپڑے پہننے کی۔ اپنی ساس ماں اور ہونے والے شوہر صاحب کا دل خوش کرنے کو تمہیں ایسٹرن Looks چاہئیں مجھے پتا تھا۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے کل رات ہی جا کر یہ ساڑھی خریدی تھی۔ اسے پہن کر تم غضب ڈھاؤ گی۔ ساس صاحبہ آج ہی شادی کی ڈیٹ طے کر کے نہ جائیں تو کہنا۔"

سیم نے پاس رکھا شاپنگ بیگ اٹھایا تھا۔ اس نے باکس کھول کر اس میں سے ساڑھی باہر نکالی تھی۔ وہ لیمن کلر کی شیفون کی پلین ساڑھی تھی۔ جس کے ساتھ خوب صورت کام بنا سلیولیس بلاؤز انتہائی مختصر سا تھا۔

"تھینکس سیم! تم میرے لیے ساڑھی خرید کر لائی ہو۔ مگر پلیز مائنڈ مت کرنا۔ میں یہ نہیں پہن سکتی۔ بہت بولڈ ہے یہ۔"

اس نے آہستگی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے سیم سے کہا۔

"پاگل! آج کل پاکستان میں سب لڑکیاں اسی طرح کے کپڑے پہنتی ہیں۔ اس ساڑھی میں تمہارا فگر کیا غضب کا لگے گا۔ پوری قیامت لگو گی تم۔"

سیم اس کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر بات منوانے والے انداز میں بولی۔ مگر اس کا اس ساڑھی کو پہننے کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"آئم سوری سیم! میں یہ نہیں پہن سکتی۔ میں یہ والا ڈریس ہی پہن لوں گی۔"

وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر آہستگی سے بولی تھی۔ اسے دل ہی دل میں سیم کے اوپر تھوڑی سی کوفت بھی ہوئی تھی۔ آخر اس نے اسے کب اس طرح جسم کو نمایاں کرتے کپڑے پہنے دیکھا تھا جو اس کے لیے اتنی پی تھرو ساڑھی اس قدر مختصر بلاؤز کے ساتھ خرید لائی تھی۔ وہ سیم کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کا اس ساڑھی کو پہننے کا قطعاً" کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی سیم بہت شوق اور محبت سے یہ تحفہ اس کے لیے لائی تھی۔ شاید ہاشم سے شادی کے بعد وہ اس طرح کے بولڈ کپڑے پہننے لگی ہو گی مگر وہ تو ایسا نہیں کر سکتی تھی ناں۔ سیم کے چہرے پر ہلکی سی ناراضی آگئی تھی۔

ابھی وہ دونوں شاید اس موضوع پر مزید بھی کچھ بات کرتیں کہ اس کے موبائل پر سکندر کی کال آنے لگی۔ موبائل بیڈ پر ہی پڑا تھا اور اتفاقاً" جہاں سیم بیٹھی تھی وہیں رکھا تھا۔ اس کے فون اٹھانے سے پہلے سیم نے موبائل اٹھا لیا تھا۔ سکندر کالنگ۔ سیم نے با آواز بلند بولا تھا۔ وہ موبائل سیم کے ہاتھ سے لینے لگی تھی۔

"لاؤ مجھے دو سیم۔" سیم اسے چھیڑنے کو موبائل اپنے دوسرے ہاتھ میں لے گئی تھی۔

"یہ کال تو میں ریسیو کروں گی ٹرڈیئر۔ آخر اپنے Brother in law (بہنوئی) سے سلام دعا تو کرنی ہے ناں مجھے۔" سیم شرارت بھرے انداز میں بولتی کال ریسیو کرنے لگی تھی۔

"سیم! پلیز مجھے بات کرنے دو۔ اسے کوئی ضروری بات کرنی ہوگی۔" وہ موبائل سیم سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

"یہ لو کرو بات۔" آخر سیم نے اسے ہنستے ہوئے موبائل دے دیا۔ اس دوران موبائل مسلسل بجتا رہا تھا کہ اسے چھیڑنے کے باوجود سیم نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ موبائل ہاتھ میں آتے ہی اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

"ہیلو! ہاں سکندر۔" سیم شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بالکل برابر میں اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔

"میں نے سوچا، تمہیں بتا دوں، ہم تمہارے گھر کے لیے نکلنے والے ہیں۔ میں امو جان کا انتظار کر رہا ہوں۔ جیسے ہی وہ آئیں گی، ہم تمہارے گھر کے لیے نکل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سیم کی موجودگی کی وجہ سے سنبھل کر بولی۔ سیم اس کے ساتھ چپک کر بیٹھی فون پر سکندر کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے چھیڑنے، زچ کرنے والے انداز میں دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔

"اور کچھ بھی نہیں کہوگی؟" وہ ہنس کر بولا۔

"کیا؟"

"کچھ بھی۔۔۔ "آئی لو یو" ہی کہہ دو۔ مجھے اچھا لگے گا۔"

سیم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنا قہقہہ روکا تھا۔ وہ آواز گھونٹ کر بری طرح ہنس رہی تھی۔ وہ سیم کو گھورتے ہوئے، اسے دھکا دے کر اس کے پاس سے اٹھی۔ بیڈ سے کچھ دور آگئی اور فون پر بہت آہستہ سے بولی۔

"آئی لو یو! بہت بہت، بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے۔"

وہ سیم سے خاصی دور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی تھی۔ قصداً" اس نے اپنا رخ بھی سیم کی طرف سے موڑ لیا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"میرے لیے پینٹنگ اور روما چھوڑ سکتی ہو؟" وہ جیسے اس وقت فارغ بھی تھا اور اچھے موڈ میں بھی۔

"میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔"

"پھر تم پینٹنگ، روما اور مجھے کبھی بھی مت چھوڑنا۔ اب کی بار ٹریوی فاؤنٹین کے پاس بٹھا کر میری پینٹنگ بنانا۔" وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی۔

"ٹھیک ہے سینور سکندر!" وہ سکندر سے بات کرتے ہوئے سیم کو بالکل بھول گئی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ واپس گھومی اور اس کی سیم پر نظر پڑی تو اسے سیم کے چہرے پر عجیب ناقابل فہم تاثر نظر آیا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی آنکھیں؟

وہ سیم کی آنکھوں کے تاثر کو کوئی نام نہ دے سکی۔ پتا نہیں، سیم کی آنکھوں کا تاثر ایسا کیوں لگ رہا تھا، جیسے وہ اس وقت بہت غصے میں تھی۔ وہ بالکل بھی خوش نہیں تھی۔

"کیا ہوا سیم؟" تعجب سے بولتی وہ اس کے پاس آگئی۔

"ہو گیا تمہارا اظہار محبت؟" سیم نے فوراً" ہی اپنا موڈ تبدیل کیا اور ہنس کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔! اور تم کتنی بدتمیز ہو۔ مجھے بات نہیں کرنے دے رہی تھیں۔" سیم کو ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسی تھی۔

سیم کی نگاہوں کا وہ پل بھر کا عجیب سا تاثر فوراً" ہی اس نے سر جھٹک کر ذہن سے محو کیا تھا۔

"اور کیا فرما رہے تھے مسٹر سکندر؟" سیم کا انداز اب پھر اسے چھیڑنے والا تھا۔

"وہ لوگ نکلنے والے ہیں تھوڑی دیر میں۔"

"پھر تم تیار ہو جاؤ جلدی سے۔" وہ سہلاتی فوراً" بیڈ سے اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

آمنہ، لیزا کے گھر جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔

پہلے انہیں سکندر کے ہوٹل جانا تھا۔ وہاں سے پھر ان دونوں کو ساتھ لیزا کے گھر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شہریار خان نے بہت جوش و خروش سے لیزا کے گھر جانے کے لیے آمنہ کی تیاری کروائی تھی۔ آج اپنی ہونے والی بہو کے گھر بھجوانے کے لیے خریدی گئی تمام چیزوں میں ان کی اور آمنہ کی مشترکہ پسند اور مرضی شامل تھی۔

وہ خود آمنہ کے ساتھ پہلے ایک بوتیک اور پھر جیولر کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اور آمنہ نے باہمی پسند کے ساتھ لیزا کے لیے منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی خریدی تھی۔ شہریار خان نے پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے خود اپنی نگرانی میں تیار کروائے تھے۔ شہر کی بہترین دکان سے لیزا کے لیے پھولوں کا زیور منگوایا تھا۔ بہت سارے ہار پھول، کنگن اور گجرے اضافی بھی تھے۔ یوں جیسے انہوں نے اپنی ہونے والی بہو کے گھر کو پھولوں سے بھر دینا تھا۔ وہ آج ہر چیز بہترین اور شاندار چاہتے تھے۔ وہ سکندر سے جو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، کم از کم ان کی بھجوائی چیزوں سے چھلکتی محبت ہی کہہ جائے۔ انہوں نے آمنہ کو تاکید کی تھی کہ وہ لیزا کے گھر والوں کو کل یا پرسوں۔ ان کے گھر کھانے کی دعوت دے کر آئیں۔

وہ لوگ آتے ہیں یا نہیں، سکندر ان لوگوں کو آمنہ کی دعوت قبول کرنے دیتا ہے یا نہیں، مگر وہ لیزا کے گھر والوں کو پھر بھی اپنے گھر مدعو کرنا چاہتے تھے۔ سکندر انہیں اس بات کی کبھی بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا، ورنہ آج لیزا کے والد سے اس کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے مانگنے وہ خود جاتے۔ آمنہ تیار تھیں۔ وہ بہت خوب صورت اور بہت خوش بھی لگ رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب تمہیں نکل جانا چاہیے۔" گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے انہوں نے آمنہ سے کہا۔

"زین ابھی تک گھر نہیں آیا شہریار۔" آمنہ نے قدرے تشویش سے کہا۔

"اس کا فون آگیا تھا آمنہ! وہ شاید شام تک گھر واپس آئے گا۔"

زین کل ان کے چونکا دینے اور دل دہلا دینے والے انکشافات سننے کے بعد سے گھر سے غائب تھا۔ اس کا موبائل بھی بند تھا۔ انہوں نے آمنہ اور نویرہ کی تسلی کے لیے ان دونوں کو کل یہ کہہ دیا تھا کہ کسی کیس کے سلسلے میں زین کو ایمرجنسی میں لاہور جانا پڑ گیا ہے۔ مصروفیت بھی زیادہ ہے اور کیس کی نوعیت بھی حساس ہے، اس لیے اس نے سیل آف کر رکھا ہے۔ زین جہاں کہیں بھی تھا، خیریت سے تھا۔ اتنا ان کے دل کو یقین تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور خود کو کوئی نقصان وہ اس لیے نہیں پہنچا سکتا تھا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کو ایک مرتبہ پھر اولاد کا غم نہیں دینا تھا۔

زین کی تکلیف کا انہیں اندازہ تھا۔ وہ اس وقت کس کرب، کس احساس ندامت اور احساس گناہ سے گزر رہا تھا، وہ اندازہ کر سکتے تھے۔ کئی سال انہوں نے اسے اس احساس گناہ سے بچانے کے لیے سچ نہیں بتایا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ زین کو سچائی پتا چلے۔ اپنی بھی اور سکندر کی بھی۔ زین کو احساس گناہ میں مبتلا کروانا ان کی منشا نہ تھی، مگر سکندر کی بے گناہی کسی اور طرح وہ بتا ہی نہیں سکتے تھے سوائے اس کے کہ زین کو ام مریم کی ساری حقیقت بتا دیں۔

وہ جانتے تھے نویرہ، زین کے کل سے اب تک گھر نہ آنے سے پریشان ہے۔ آمنہ کا دل بھی بے چین تھا۔ انہوں نے سوچا تھا آمنہ لیزا کے گھر جانے کے لیے نکل جائیں، پھر وہ زین کو تلاش کریں گے۔ تمام سامان گاڑی میں رکھوایا جا چکا تھا۔ وہ پورچ میں آمنہ کے ساتھ خود چل کر آئے تھے۔ انہوں نے اطمینان کے لیے ایک بار پھر گاڑی میں رکھی تمام اشیا کا جائزہ لیا تھا۔ کہیں کوئی ٹوکرا، کوئی تھال گھر پر نہ رہ گیا ہو۔ اسی وقت پورچ میں زین کی گاڑی آ کر رکی۔ انہوں نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ بار شکر تھا، زین بخیریت گھر واپس آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑا ہوا تھا۔ اس کے

چہرے پر مردنی سی چھائی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں، وہ بہت رویا تھا۔ وہ بہت تھکے ہوئے، بہت نڈھال قدموں سے چلتا گاڑی سے اترا۔ آمنہ جانے کی خوشی اور جوش میں تھیں۔ انہوں نے زین کی حالت پر زیادہ توجہ نہ دی۔

"شکر ہے زین! تم واپس آگئے۔ اس طرح کسے سنے بغیر تو نہیں جانا چاہیے تھا بیٹا! یہ کیا کہ خالی اپنے پاپا کو فون کر کے بتا دیا اور چلے گئے۔ نوریہ کا سوچنا چاہیے تھا تمہیں۔ بچی بے چاری۔۔۔ تمہاری فکر میں اس نے صبح سے ڈھنگ سے کچھ کھایا تک نہیں ہے۔"

زین خاموشی سے ماں کو دیکھ رہا تھا جیسے اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہی نہ ہو۔ زین کو آمنہ کے مزید سوال و جواب سے بچانے کے لیے انہوں نے فوراً" ہی انہیں وقت کا احساس دلایا تھا۔

"آمنہ! دیر ہو رہی ہے۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

آمنہ کو بھی فوراً" ہی وقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ فوراً" گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ وہ کھڑے آمنہ کو جاتے دیکھتے رہے۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی اور چوکیدار نے گیٹ بھی بند کر دیا، تب وہ واپس گھومے۔ اب زین وہاں پر نہیں تھا۔ وہ نجانے کس لمحے گھر کے اندر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سب تمام تر تیاریوں اور انتظامات کے ساتھ سکندر اور آمنہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ سکندر اپنی گاڑی میں آرہا ہے اور اس کی امو جان اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ۔ سکندر کی انا اور خود داری نے باپ کے گھر کے دروازے تک جانا گوارا نہیں کیا تھا اور اس کی امو جان نے اسے ایسی کسی آزمائش میں ڈالا بھی نہیں تھا۔

انہوں نے خود ہی یہ طے کیا تھا کہ وہ پہلے سکندر کے ہوٹل پہنچیں گی اور وہاں سے وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں لیزا کے گھر جائیں گے۔

محمود خالد تھوڑی تھوڑی دیر بعد عائشہ سے مہمانوں کی تواضع اور لنچ کی تیاری کے حوالے سے مختلف باتیں پوچھ کر اپنی تسلی کر رہے تھے۔ عائشہ ان کی خوشی اور جوش و خروش کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر انہیں اطمینان دلا رہی تھیں کہ سب انتظامات مکمل ہیں۔

"لگتا ہے وہ لوگ آگئے ہیں۔"

محمود خالد کے جیسے کان گیٹ پر لگے تھے۔ گیٹ پر گاڑیوں کے ہارن اور پھر گیٹ کھولے جانے کی آواز انہوں نے اندر بیٹھے بیٹھے سن لی تھی۔ انہوں نے عائشہ کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مہمانوں کا گیٹ پر جا کر استقبال کرنا چاہتے تھے۔ سیم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اسے تیار سیم نے کیا تھا۔ اس نے اس کا میک اپ کیا تھا اور اسے کون سی جیولری پہننی چاہیے، یہ انتخاب بھی سیم نے ہی کیا تھا۔

"تم بیٹھی رہو۔" سیم اس سے بولی۔

"مجھے پتا ہے۔ میں بیٹھی ہوئی ہی ہوں۔"

میں نے سوچا ایکسائٹمنٹ میں کہیں ساس صاحبہ کا استقبال کرنے تم بھی گیٹ پر نہ چل پڑو۔" سیم اسے چھیڑ رہی تھی۔ جواباً" مصنوعی خفگی سے اس نے سیم کو گھورا، یہ تو سچ تھا وہ واقعی بے تحاشا خوش تھی۔

☼ ☼ ☼

سکندر اور آمنہ کی گاڑیاں پورچ میں آگے پیچھے رکیں۔ وہ گاڑی سے اتر کر ماں کے پاس آگیا۔ محمود خالد اور عائشہ اندر سے نکل کر روش پر چلتے نظر آرہے تھے۔ وہ دونوں پورچ ہی کی طرف ان کے استقبال کے لیے آرہے تھے۔ آمنہ ڈرائیور سے گاڑی میں سے پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے نکلوا رہی تھیں۔

"امو جان! یہ سب کیا ہے؟" وہ ناپسندیدگی سے فوراً" بولا۔

"کیا بہو کے گھر رشتہ پکا کرنے خالی ہاتھ آجاتی؟" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر قدرے رعب سے بولیں۔

ڈرائیور اب گاڑی میں سے ایک بڑا سا چاندی کا تھال نکال رہا تھا۔ جس میں پھولوں کا سارا زیور بڑی خوب صورتی سے سجا تھا۔ گلاب اور موتیا کے کنگن ہار کانوں کی بالیاں انگوٹھی پھولوں سے بنا ٹیکا اور ان پھولوں کے زیوروں کے بالکل درمیان نیلے رنگ کی مخملیں ڈبیا جس کے اندر منگنی کی انگوٹھی تھی۔

"پہلے یہ تھال اندر لے جا کر احتیاط سے رکھو۔ پھر یہ ٹوکرے اندر پہنچانا۔" وہ قصداً"اُسے نظر انداز کر کے ڈرائیور سے مخاطب تھیں۔

ڈرائیور نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے دو بڑے بڑے ڈبے بھی نکالے۔ ان ڈبوں میں لیزا کے لیے خوب صورت ملبوسات تھے۔

"آپ مجھ سے کہہ دیتیں۔ جو آپ لانا چاہ رہی تھیں میں خرید کر لے آتا۔" وہ بے تحاشا الجھن اور غصہ محسوس کر رہا تھا۔

"یہ سب چیزیں میں اپنی بہو کے لیے لائی ہوں۔ تمہارے لیے کچھ لاتی تو تم اعتراض کرتے۔"

وہ ماں سے اختلاف کرنا اپنی ناراضی ظاہر کرنا ان سے مزید بحث کرنا چاہتا تھا مگر محمود خالد اور عائشہ کو دیکھ کر اسے چپ ہونا پڑا۔ بہت گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے محمود خالد اور عائشہ اس کے اور آمنہ کے پاس آکر رکے تھے۔

"السلام علیکم۔" محمود خالد نے آمنہ کو سلام کیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر ایسا تاثر آیا تھا جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چند سیکنڈ ان دونوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے پہچاننے میں لگائے تھے۔

"محمود صاحب آپ؟" چند سیکنڈ بعد اس نے اپنی امو جان کی حیرت میں ڈوبی آواز سنی۔ کیا اس کی امو جان لیزا کے پاپا کو پہلے سے جانتی تھیں؟

"مسز شہریار؟" محمود خالد کے منہ سے بھی حیرت زدہ سے انداز میں نکلا تھا۔ صرف سکندر ہی نہیں عائشہ بھی آمنہ اور محمود خالد کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"لیزا آپ کی......" آمنہ جیسے شدید حیرت کے عالم میں تھیں۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"لیزا میری چھوٹی بیٹی ہے۔" محمود خالد جیسے بمشکل بول سکے تھے۔ وہ ان دونوں کے چہروں کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ کوئی عجیب و غریب سی صورت حال تھی جیسے وہ دونوں جس بھی حوالے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے کم از کم یہاں اس جگہ اس حیثیت میں ایک دوسرے سے ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہ رکھتے تھے۔

پیچھے ان کا ڈرائیور بھاگا بھاگا ٹوکرے لے جا لے جا کر اندر رکھ رہا تھا اور یہاں یہ چاروں اسی طرح کھڑے تھے۔ محمود خالد جیسے کسی ایسی پریشانی میں آئے تھے کہ انہیں مہمانوں کو اندر لے جا کر بٹھانا بھی بھول گیا تھا۔ عائشہ نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس تکلیف دہ اور عجیب و غریب خاموشی کو توڑا۔

"آپ لوگ اندر چل کر تو بیٹھیں۔" عائشہ مسکراتے ہوئے مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"ہاں ہاں پلیز! آپ لوگ اندر چلیں۔" محمود خالد جیسے بدقت مسکرائے تھے۔

وہ اپنی ماں اور لیزا کے پاپا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ محمود خالد اور عائشہ کی موجودگی میں وہ آمنہ سے کچھ پوچھ بھی نہیں پا رہا تھا مگر اندر ہی اندر اس کا دل بری طرح پریشان تھا۔

اگر محمود خالد اس کی امو جان یا اس کے پاپا کے کوئی پرانے جاننے والے تھے تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات تھی؟ آخر اس کی امو جان اس طرح سے پریشان کیوں ہو گئی تھیں؟ یہاں آنے سے پہلے اور یہاں پہنچنے کے بعد جو جوش خروش اس نے ان کے چہرے پر دیکھا تھا وہ محمود خالد کو دیکھتے ہی ٹینشن فکر اور پریشانی میں کیوں بدل گیا تھا؟

وہ چاروں اندر آ گئے۔ عائشہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ محمود خالد جیسے اپنی پریشانی چھپانے کو

زبردستی مسکرا رہے تھے۔

"آپ لوگ پاکستان کب آئے؟"

"کافی عرصہ ہو گیا۔ شہریار کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی ہم واپس آ گئے تھے۔" آمنہ سنجیدگی سے بولیں۔ وہ خاموشی سے آمنہ اور محمود خالد کو دیکھ رہا تھا۔

"سکندر آپ کا بڑا بیٹا ہے؟" محمود خالد کی آنکھوں میں اسے اپنی اموجان سے بھی زیادہ پریشانی نظر آ رہی تھی۔ وہ کیوں پریشان تھے آخر؟ صرف وہی نہیں، عائشہ بھی آمنہ اور محمود خالد کے رویے اور انداز پر حیران سی بیٹھی تھیں۔

"جی! زین سے تقریباً" ایک سال بڑا ہے۔"

تو کیا وہ زین کو بھی جانتے تھے؟ وہ بے حد حیران تھا۔ مگر موقع اور صورت حال ایسی نہ تھی کہ وہ ماں سے کچھ پوچھ پاتا۔

"زین بھی پاکستان ہی میں ہے؟" محمود خالد نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

"جی۔" آمنہ آہستگی سے بولیں۔ پھر جیسے کسی ایسی بات کی وضاحت کرنے لگیں جو یہاں پر ان سے کسی نے بھی پوچھی نہیں تھی۔

"شادی ہو گئی ہے زین کی۔ ایک بیٹا ہے اس کا۔"

"اچھا! ماشاء اللہ۔" یہ پہیلیوں کی طرح الجھی باتیں اسے بری طرح الجھا رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ وہ مزید الجھتا ڈرائنگ روم میں ایک ہینڈسم اور باوقار سا مرد داخل ہوا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے سب کو سلام کیا۔

"السلام علیکم۔" محمود خالد اور عائشہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ ہاشم۔" محمود خالد نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ فوراً" آمنہ کو بتانے لگے۔

"یہ ہاشم اسد ہیں۔ میرے داماد۔"

تو یہ لیزا کا بہنوئی تھا۔ سیم کا شوہر۔ اس نے ہاشم کو گرم جوشی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوش اخلاقی سے مسکرا کر فوراً" صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ ہاشم گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملا رہا تھا اس نے بھی جواباً" خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کا غائبانہ تعارف تو انکل نے کرا دیا تھا سکندر!" ہاشم مسکرا کر بولتا اس کے برابر ہی میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اسلام آباد سے کب آئے ہاشم؟" عائشہ نے اس سے مسکرا کر پوچھا۔

"بس ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے آنٹی۔ ویسے تو مجھے آفس جانا تھا، لیکن میں نے سوچا' آج لیزا کا رشتہ طے ہو رہا ہے' مجھے یہاں آ جانا چاہیے۔ مجھے یہاں دیکھ کر انکل بھی خوش ہو جائیں گے اور میری بیگم بھی۔" وہ ہنس کر بولا۔

"پتا نہیں ہے بیگم صاحبہ کو میں یہاں آنے والا ہوں۔ حیران رہ جائے گی مجھے دیکھ کر۔" عائشہ اور ہاشم مسکرا رہے تھے۔ محمود خالد اور آمنہ اس طرح چپ سے تھے' جیسے اندر ہی اندر کوئی پریشانی لاحق ہو۔ وہ دونوں بظاہر اس پریشانی کا اظہار نہیں کر رہے تھے' مگر ان کی آنکھوں سے پریشانی چھلک رہی تھی۔

"محمود صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ پھول اور رنگ میں لیزا کو پہنانا چاہتی ہوں۔"

آمنہ نے محمود خالد کو مخاطب کیا۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھیں۔ ہاشم مسکراتا ہوا اس گفتگو پر دھیان دے رہا تھا۔ سب کی نظریں سامنے رکھے چاندی کے تھال پر تھیں۔

"کلثوم اب آپ کی ہی امانت ہے مسز شہریار! جو آپ کی خوشی ہے' وہی میری بھی خوشی ہے۔" محمود خالد جواباً" ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کلثوم" پر آمنہ حیران ہوئی تھیں۔ وہ محمود خالد سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ جانتا تھا' وہ اسے لیزا نہیں' کلثوم کہتے ہیں۔ آمنہ کی حیرت دیکھ کر عائشہ نے جلدی سے وضاحت کی۔

"محمود' لیزا کو کلثوم کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" آمنہ نے جیسے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ جبراً" مسکرانے کی مسلسل کوشش صرف

وہی نہیں، محمود خالد بھی کرتے نظر آرہے تھے۔

"میں لیزا کو بلاتی ہوں۔" محمود خالد نے عائشہ کو اشارہ کیا تو وہ فوراً صوفے پر سے اٹھیں۔

"میری خواہش ہے، ہم شادی کی تاریخ بھی آج ہی طے کرلیں۔" آمنہ نے محمود خالد سے کہا۔

ماں کے چہرے پر اس نے یہ تاثر دیکھا، جیسے وہ لیزا کے پاپا سے پوچھ رہی ہوں کہ کیا اب یہ شادی ہو سکے گی؟ اس نے لیزا کے پاپا کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر جیسے ایک خاموش بے بسی سی تھی۔ جیسے وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اب یہ شادی ہو سکے گی یا نہیں۔

آخر معاملہ تھا کیا؟

وہ بری طرح پریشان ہو رہا تھا۔ ہاشم بھی ابھی آیا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکا تھا، مگر وہ اس خاموش اور الجھی ہوئی صورت حال پر حیران پریشان سا تھا۔

اسی وقت عائشہ ڈرائنگ روم میں واپس آئیں ان کے پیچھے پیچھے لیزا تھی۔ لیزا کو دیکھتے ہی وہ جیسے ساری کوفت بھولنے لگا۔ اسے اور لیزا کو ایک ہونے سے کون روک سکتا ہے؟ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ خوب صورت لباس پہنے اور سر سے دوپٹا لیے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"السلام علیکم امو جان!" لیزا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ سب کی موجودگی کی وجہ سے وہ اسے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی نہیں تھی۔ وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا!" آمنہ کا انداز محبت سے بھرپور تھا۔ وہ جانتا تھا بظاہر اس کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود بھی لیزا اس کی نگاہوں کی پسندیدگی اور تعریف کو پوری طرح محسوس کر رہی تھی۔ لیزا کے پیچھے پیچھے اس کی بہن ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا۔ اور سلام کرتے ہی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پر رک گئی تھی۔ وہ لوگ بری طرح چونکے۔

ام مریم اور سکندر۔ آمنہ کے چہرے پر عجیب سی پریشانی پھیلی تھی۔ محمود خالد بھی متفکر سے نظر آئے تھے۔

"تم؟" مریم نے اسے شدید حیرت کے عالم میں دیکھتے ہوئے "تم" کہا تھا۔

وہ اس ناگن کو بارہ سالوں میں کیا بارہ صدیوں بعد بھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ وہ یکدم ہی سخت غصے میں صوفے پر سے اٹھا۔ اسے غصے میں صوفے سے اٹھتا دیکھ کر آمنہ بھی بے اختیار صوفے پر سے اٹھیں۔

"سکندر!" انہوں نے اسے آواز دی۔ مگر اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ بارہ سال پہلے کی 31 دسمبر کی اسی شام میں پہنچ گیا تھا، جب اس سے اس کا سب کچھ اس ناگن نے چھین لیا تھا۔ وہ بھی اسے نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے وہ اپنے برابر میں کھڑی لیزا سے مخاطب ہوئی۔

"واہ لیزا! واہ! ساری دنیا میں تمہیں شادی کرنے کے لیے ملا تو کون؟ سکندر شہریار؟" محمود خالد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ آمنہ کے چہرے پر بھی پریشانی تھی جبکہ عائشہ، ہاشم اور لیزا دم بخود تھے جیسے "آنا" "فانا" ماحول میں یہ تبدیلی ان میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

"مریم! اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ سکندر اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔"

محمود خالد نے تنبیہی انداز میں مریم سے کہا۔ وہ بھی صوفے پر سے اٹھ گئے تھے۔ اب وہاں صرف ہاشم اور عائشہ ہی تھے جو ہنوز بیٹھے ہوئے تھے بے حد حیرانی کے عالم میں۔ لیزا سکتے کی سی حالت میں اسے اور مریم کو دیکھے جا رہی تھی۔

"پاپا! آپ سے زیادہ اعلا ظرف بھی دنیا میں شاید ہی کوئی ہو گا۔ جس شخص نے آپ کی ایک بیٹی کی زندگی برباد کرنے کی کوشش کی، آپ اسی کے ہاتھ میں اپنی دوسری بیٹی کا ہاتھ دے رہے ہیں؟"

وہ مٹھیاں بھینچے، جیسے اپنے اشتعال اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس سکندر کے خلاف؟ سکندر اگر زین کا بھائی ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ زین

کے ساتھ اپنی منگنی تم نے خود توڑی تھی۔"
محمود خالد نے مریم سے غصے سے کہا۔

"کیوں توڑی تھی وہ وجہ بھول گئے آپ؟" مریم اسے نفرت سے دیکھتی باپ سے بولی۔

"لیزا! یہ سکندر شہریار' زین کا بڑا بھائی ہے۔ زین جس سے میری امریکا میں منگنی ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہے میں وہ منگنی توڑ کر امریکا سے واپس آگئی تھی صرف اور صرف اس کی وجہ سے۔ اس نے میرا ریپ کرنے کی کوشش کی تھی اپنے گھر پر۔"

"مریم۔" محمود خالد بہت زور سے چلّائے۔

"آپ کو میرا یقین نہیں ہے پاپا! تو پوچھیں اس کی امو جان سے۔ یہ عینی شاہد ہیں اس واقعے کی۔ انہوں نے ہی اپنی چادر سے میرے جسم کو ڈھانکا تھا۔ اسے اس گھناؤنی حرکت کے بعد اس کے پاپا نے اپنے گھر سے نکال تک دیا تھا۔ پوچھیں اس کی امو جان سے..... پوچھیں ان سے۔"

مریم اپنے باپ سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلّائی تھی۔ وہ سکندر کو یہاں دیکھ کر اس طرح اشتعال میں آئی تھی کہ اسے اپنے شوہر کی یہاں موجودگی کی بھی پروانہ رہی تھی۔

"مریم! بیٹا تم..... خدا کے لیے اب یہ باتیں مت کرو۔ ماضی میں جو ہوا تھا' اسے بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتی' ماضی کی تلخیاں سکندر اور لیزا کی زندگی کی خوشیوں کو برباد کریں۔"

اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی ماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر شرمندگی تھی' غم تھا' خوف تھا۔ وہ جیسے اس بات کو ختم کرا دینا چاہتی تھیں مگر ان کے چہرے پر پھیلی شرمندگی یہ بتا رہی تھی کہ مریم جو کچھ کہہ رہی ہے' وہ سب حرف بہ حرف سچ ہے۔ وہ جو کچھ لمحوں کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا' یکدم ہی اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ آمنہ کے مریم سے مزید کسی بھی التجائیہ جملے سے پہلے وہ اس کے مقابل جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر ایک بھرپور تھپڑ مریم کے منہ پر مارا۔

"سکندر! خدا کے لیے یہ تم کیا کر رہے ہو بیٹا۔"

مریم نے تھپڑ لگنے کے بعد خود کو گرنے سے بمشکل بچایا تھا۔ اس کے کانوں میں اپنی ماں کی گھبرائی ہوئی آواز ضرور آئی تھی' مگر وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ وہ اسی طرح ام مریم کے عین مقابل کھڑا تھا۔ عائشہ' ہاشم' لیزا سب کے سب اپنی جگہوں پر ساکت تھے۔ وہ نفرت اور حقارت سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تھپڑ کے بعد مریم کا ہاتھ ابھی تک اس کے گال پر تھا۔ یوں جیسے وہ اس تھپڑ کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ اتنے سارے لوگوں کے بیچ تھپڑ لگنے پر وہ غصے اور نفرت سے پاگل سی ہو رہی تھی۔

"یو باسٹرڈ۔" وہ غصے سے چلّائی۔ وہ مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی' مگر اس نے اسے بولنے نہیں دیا۔

"مزید ایک لفظ بھی تم نے کہا تو میں یہ بھول جاؤں گا کہ یہاں تمہارا شوہر اور والد موجود ہیں۔ بتا دوں کیا ان لوگوں کو تمہاری سچائی؟"

اس کی آنکھوں میں حقیقتاً" خون اتر آیا تھا۔ یہ ناگن کسی آسیب' کسی بددعا کی طرح اس کے پیچھے تھی۔ اس کی زندگی کی ہر خوشی کے ختم ہونے کی وجہ کل بھی یہی تھی اور آج بھی یہی۔ مریم پیچ و تاب کھاتی کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے لگی تھی۔ مگر اس سے پہلے وہ بولا تھا۔ اس بار اس کے مخاطب محمود خالد تھے۔ ڈرائنگ روم میں کھڑے تمام لوگ جیسے سکتے کے عالم میں تھے۔ کسی ایک کے لبوں سے ایک لفظ تک نہیں نکل رہا تھا۔

"آپ کی بیٹی درست کہہ رہی ہے محمود صاحب! آج سے بارہ سال قبل واقعی ایک حادثہ ہوا تھا ہمارے گھر میں۔ بارہ سال پہلے میں نے اسے جو جواب دیا تھا' وہی جواب آج بھی دے کر جا رہا ہوں۔ تب بھی میں نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا تھا' آج بھی اس کے منہ پر تھپڑ مار کر جا رہا ہوں۔"

محمود خالد کی طرف دیکھ کر پرسکون سے لہجے میں بولنے کے بعد اس نے ایک نفرت بھری نگاہ مریم پر ڈالی اور پھر فوراً" ہی وہ تیزی سے گھوما۔ وہ بڑی تیز رفتاری

سے ' مضبوط قدموں سے چلتا ڈرائنگ روم سے جا رہا تھا۔

"سکندر! رکو..... سکندر۔" آمنہ نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ مگر وہ ماں کی بات سننے کے لیے وہاں رکا نہیں ' اسے اندازہ تھا کہ آمنہ اس کے پیچھے تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکلی ہیں۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ وہ آندھی ' طوفان کی رفتار سے اپنی گاڑی تک آیا۔ وہ فوراً" گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے اس نے دیکھا' آمنہ ہانپتی کانپتی بھاگتی ہوئی پورچ تک آئی تھیں۔ ان کے پیچھے محمود خالد بھی وہاں آئے تھے۔ وہ گاڑی گیٹ سے نکال چکا تھا۔ وہ اس بار کسی کے بھی پکارنے پر رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس بار نہیں رکے گا۔ وہ اس بار ہرگز نہیں رکے گا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆
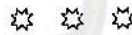
ڈرائنگ روم میں کھڑے چاروں افراد پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔

"واہ لیزا! داد دیتی ہوں تمہارے انتخاب کی۔ اپنی بہن کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنے والے کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے چلی ہو؟ تمہاری جیسی بہن شاید ساری دنیا میں اور کوئی نہیں ہو گی۔"

سیم طنزیہ انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔ سیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ باقی سب کو جیسے سانپ سونگھا ہوا تھا۔ سیم آنکھوں میں آنسو لیے ڈرائنگ روم سے جا رہی تھی۔ وہ اسے روک نہیں سکی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھی۔

سیم اور سکندر' سکندر اور سیم۔

وہ شاک کی ایسی کیفیت میں تھی کہ اسے اپنے اعصاب مفلوج ہوتے لگ رہے تھے۔

سیم کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ ہاشم بھی ایک دم ہی وہاں سے جانے کے لیے مڑا تھا۔ فرق یہ تھا کہ سیم گھر کے اندر گئی تھی۔ ہاشم ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر سے باہر جا رہا تھا۔ عائشہ حیرت اور دکھ میں مبتلا کھڑی تھال میں سجے پھولوں' منگنی کی انگوٹھی اور مٹھائی کے ٹوکروں کو دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آمنہ گاڑی میں بیٹھی گھر واپس جا رہی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے متواتر بہہ رہے تھے۔ ان کا دل جیسے شدت غم سے پھٹ سا رہا تھا۔

کیوں آخر کیوں؟ آخر کیوں زندگی ان کے سکندر ہی کی آزمائش کیے جاتی ہے؟ ساری دنیا میں لیزا کی بہن کسی کو ہونا تھا تو ام مریم کو؟ ساری دنیا میں لیزا کا باپ کسی کو ہونا تھا تو محمود خالد کو؟ بارہ سال پہلے کی وہ شام کیا ان کے سکندر کی زندگی سے نکل نہیں سکتی؟ سب کو معافی مل جاتی ہے۔

ان کے بیٹے کو کیوں نہیں؟ کیوں زندگی بار بار اسی کو آزمائے جا رہی ہے؟

کیا یہ سب جاننے کے بعد اب لیزا سکندر سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گی؟

کیا محمود خالد سکندر کے ہاتھ میں لیزا کا ہاتھ دیں گے؟

اس سے تو کہیں اچھا تھا وہ سکندر کو لیزا کے ساتھ روہایا اٹلی ہی میں شادی کرنے دیتیں۔ یہاں پر بلاتی ہی نہیں۔ ایک بار شادی ہو گئی ہوتی تو شاید لیزا اور محمود خالد اپنے رویوں میں لچک لے آتے مگر اب..... اب کیا ہو گا؟

"یا اللہ! میرے بیٹے کی زندگی میں خوشیاں کیوں نہیں آتیں؟ سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میرے سکندر کو کیوں نہیں؟"

وہ بے آواز آنسو بہاتے ہوئے اللہ سے شکوے کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ان کے ارد گرد شادی کارڈز کے کئی طرح کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں

سے کوئی ایک کارڈ انہوں نے سکندر کی شادی کے کارڈ کے لیے منتخب کرنا تھا۔ آمنہ ساڑھے بارہ بجے گھر سے نکلی تھیں۔ ان کا اندازہ تھا ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے، لنچ کرنے اور پھر شادی کی تاریخ وغیرہ طے کرنے میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ آمنہ کی واپسی تین ساڑھے تین بجے سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

یہ وقت گزارنا انہیں کافی مشکل لگ رہا تھا۔ کب آمنہ واپس آئیں گی اور آکر انہیں یہ خوش خبری سنائیں گی کہ وہ لیزا کو منگنی کی انگوٹھی پہنا آئی ہیں۔ وہ سکندر کی شادی کی تاریخ ٹھہرا آئی ہیں۔ جوش میں ان کی بھوک پیاس بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان کا لنچ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سکندر کی شادی کا کارڈ منتخب کرنے اور اس کارڈ کا مضمون تیار کرنے میں آمنہ کی واپسی سے پہلے کا یہ سارا وقت گزارنا چاہتے تھے۔

زین آنے کے بعد سے اپنے کمرے میں نوریہ اور علی کے ساتھ تھا۔ شاید اس نے نوریہ سے یہ کہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے نوریہ کو زین کے لیے کمرے میں چائے لے جاتے دیکھا تھا۔ اپنی موجودہ حالت اور کیفیت کے بارے میں وہ نوریہ سے اور کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ فی الحال ان کی یہ بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ زین سے کیا کہیں؟ جس احساس ندامت میں وہ مبتلا ہوا ہے، اس سے اسے کیسے نکالیں؟ انہوں نے زین کی طرف سے قصداً" اپنا دھیان ہٹا کر پھر سے شادی کے کارڈز کی طرف دیکھا۔ میز پر سامنے ہی رائٹنگ پیڈ اور قلم بھی انہوں نے رکھا ہوا تھا۔ آمنہ شادی کی تاریخ ٹھہرا کر آجائیں گی تو آج ہی انہوں نے یہ کارڈ چھپنے کے لیے بھجوانے تھے۔

وقت مختصر تھا۔ سکندر اور لیزا کو یہاں زیادہ دن قیام نہیں کرنا، شادی جلدی ہی کرنی ہو گی۔ انہوں نے فوراً" ہی رائٹنگ پیڈ اور قلم ہاتھ میں لیا تھا۔

"الحمد للہ ہمارا بیٹا سکندر شہریار جناب محمود خالد کی صاحبزادی لیزا محمود کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہا ہے۔ ہمارے بیٹے اور بہو کو ان کی نئی زندگی کے اس حسین آغاز پر اپنی دعاؤں سے نوازیے اور ہمارے ساتھ ان کی دعوت ولیمہ۔۔۔۔"

زین وہاں آرہا تھا۔ انہوں نے قلم روک کر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں پر سے پڑھنے والی عینک اتار دی۔ زین شکستہ قدموں سے چل رہا تھا۔ وہ بالکل نڈھال سے انداز میں ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے زین سے شادی کے کارڈز اور دعوت نامے کا مضمون چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں اندازہ تھا اس وقت زین کی نگاہیں ان کارڈز اور رائٹنگ پیڈ پر تھیں۔

"نوریہ کہاں ہے؟" انہوں نے زین کو بغور دیکھا۔

"علی کو سلا رہی ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا؟"

"دل نہیں چاہ رہا۔"

انہوں نے دیکھا۔ زین ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا، یوں جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ انہوں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا بات ہے، کیونکہ جو بات تھی، وہ اسے جانتے تھے۔

"کسی اور سے نفرت کرتے ہوئے زندگی بڑی سہولت سے گزر جاتی ہے پاپا! مگر خود اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے زندہ کس طرح رہا جاتا ہے؟"

وہ بہت بے بسی سے ان سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ابھی وہ جواباً" کچھ بھی نہ کہہ پائے تھے کہ آمنہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اگر آمنہ روتی ہوئی واپس نہ آتیں، وہ تب بھی ان کی اتنی جلدی واپسی پر حیران ہوتے۔ مگر اب جس طرح وہ آنسو بہاتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں، اس نے تو ان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

"آمنہ! کیا ہوا؟" وہ یکدم ہی پریشان ہو کر صوفے پر سے اٹھے تھے۔

یوں لگ رہا تھا آمنہ کسی بھی لمحہ لڑکھڑا کر گر پڑیں گی۔ انہوں نے جلدی سے انہیں سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ زین بھی حیران پریشان سا ماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پاس آگیا تھا۔ آمنہ کی سانسیں اکھڑی ہوئی سی تھیں۔ وہ مسلسل رو رہی

تھیں۔

"کیا ہوا آمنہ؟ تم ٹھیک تو ہو؟ سکندر ٹھیک ہے ناں؟" ایک ہی پل میں نجانے کتنے برے برے خیال ان کے دل میں آ گئے تھے۔ اندر ہی اندر ان کا دل بری طرح لرزا تھا۔ کیا آمنہ یا پھر سکندر کسی حادثے کا شکار ہو گئے تھے؟ آخر وہ اتنی جلدی واپس کیوں آ گئی تھیں اور وہ بھی اس حالت میں۔ اس طرح زارو قطار روتی ہوئی؟ زین ان کے لیے بھاگ کر پانی لے آیا۔

"پانی پی لیں اموجان۔" آمنہ نے اس کے ہاتھ سے پانی کے دو گھونٹ لیے تھے۔ زین ان کے شانے کے گرد ہاتھ رکھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہو گئی اموجان؟" اس نے رسانیت سے ان سے پوچھا۔ صوفے پر آمنہ کے ایک طرف زین بیٹھا تھا اور دوسری طرف وہ۔ آمنہ نے زین کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ شہریار خان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"خوشیوں پر میرے بیٹے کا حق کیوں نہیں ہے شہریار؟ زندگی کا دامن صرف میرے سکندر ہی کے لیے کیوں تنگ پڑ جاتا ہے؟" وہ روتے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھیں۔

سکندر؟ کیا پھر کچھ برا' کچھ غلط ہو گیا تھا ان کے بیٹے کی زندگی میں؟ ان کا دل اندر ہی اندر ڈوبا تھا۔ خوف اور اندیشوں کے سبب وہ آمنہ سے کوئی سوال تک نہ کر سکے۔ آمنہ روتے ہوئے خود ہی بولی تھیں۔

"آپ کو پتا ہے علیزا کی بہن کون ہے؟"

"کون؟" انہوں نے پریشانی سے آمنہ کو دیکھا۔

"ام مریم۔۔۔ ام مریم لیزا کی سگی بہن ہے۔"

صرف وہ ہی نہیں' زین بھی بہت بری طرح چونکا تھا۔

"ام مریم' لیزا کی بڑی بہن ہے۔ وہ اس کی سگی بہن ہے۔" وہ روتے ہوئے بولیں۔

"بارہ سال پہلے جو ہوا تھا' آج مریم نے سب کے سامنے اس واقعہ کو پھر دہرا ڈالا۔ سب پرانے زخم اس نے ادھیڑ ڈالے۔ ماضی کی اس راکھ کو پھر آگ لگا کر اس نے ایک نئی قیامت بپا کر دی۔"

زین دم بخود ماں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اور شہریار خان جیسے آندھیوں کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ خاموش' مہر بہ لب وہ آمنہ کی گریہ زاری سن رہے تھے۔ لاؤنج میں موت کا سا سناٹا تھا۔ سوائے آمنہ کی سسکیوں کے' وہاں دوسری کوئی آواز نہ تھی۔

"بڑے سے بڑے مجرم کو قتل تک کے مجرم کو جب وہ سزا کاٹ لیتا ہے تو معافی مل جاتی ہے۔ میرے بیٹے کی سزا کب ختم ہو گی؟ عمر قید تو وہ کاٹ آیا ہے' پھر اب یہ لوگ اسے معاف کیوں نہیں کر دیتے؟ اللہ معاف کر دیتا ہے پر ہم انسان سزا کاٹ چکے شخص کو بھی بار بار کیوں اس کی غلطی یاد دلاتے ہیں؟ کیا میرے سکندر نے بارہ سال کا بن باس کاٹ نہیں لیا؟ اب بھی اسے معافی کیوں نہیں مل رہی؟"

"کس بات کی معافی اموجان؟" زین سخت غصے میں بولا۔ زارو قطار روتی ہوئی آمنہ نے زین کو تعجب سے دیکھا' جیسے اس کی بات سمجھ نہ سکی ہوں۔ وہ چپ چاپ زین کو دیکھ رہی تھیں۔ لیزا' ام مریم کی بہن اور محمود خالد کی چھوٹی بیٹی ہے' یہ سچائی جانتے ہی وہ جیسے بالکل ہی ہمت ہارنے لگی تھیں۔

"کس جرم کی معافی مل جانی چاہیے سکندر کو؟ وہ جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا؟ جو عمر قید جو بن باس اس نے کاٹا ہے' وہ میری وجہ سے۔ میں مجرم ہوں اپنے بھائی کا۔ اموجان! میں گناہ گار ہوں اپنے بھائی کا بھی اور آپ کا بھی۔ پاپا سے پوچھیں! یہ کئی سالوں سے یہ سچائی جانتے ہیں کہ سکندر کو جس جرم کی پاداش میں گھر بدری نصیب ہوئی تھی' وہ اس سے کبھی سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ اس بدکردار لڑکی کو میں لے کر آیا تھا ہم لوگوں کی زندگیوں میں۔ سزا اگر کسی کو ملنی چاہیے تو مجھے۔ سنگسار کیا جانا چاہیے تو مجھے۔ اپنے بھائی کی زندگی اجاڑ دی میں نے۔ اس کے جسم کو نہیں' اس کی روح کو مار ڈالا۔ اس بدکردار لڑکی کا دکھایا جھوٹ مجھے سچ نظر آیا تھا۔ اپنے بھائی کی چیخ چیخ کر سچ جتاتی آواز میری سماعتوں تک نہیں پہنچی تھی۔"

زین کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ اس کی آواز بولتے بولتے بھر گئی تھی۔ اس کے لہجے میں خود اپنے لیے نفرتیں تھیں۔

آمنہ رونا بھلا کر جیسے شاک کی سی حالت میں زین کی باتیں سن رہی تھیں۔

زین کی طرح شہریار خان کے اندر بھی ایک مرتبہ پھر مایوسیاں اور احساس ندامت پھیل رہا تھا۔ جس بیٹے کے مجرم تھے اس کی زندگی میں تھوڑی سی خوشیاں لانے کی کوشش کی بھی مگر اس کے تو پرانے زخم ادھیڑ کر پھر نئے دکھ بھی دے دیے گئے تھے۔ آمنہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"زین سچ کہہ رہا ہے آمنہ! میں ام مریم کی سچائی گزشتہ کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ تمہارے سامنے بھی یہ اعتراف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جس جرم کی سزا میں 'میں نے سکندر کو گھر سے نکالا تھا' وہ اس بدکردار لڑکی کا سکندر پر لگایا ایک بہتان تھا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔

"کاش! آپ نے امو جان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہوتا پاپا! تو آج امو جان لیزا کے گھر سے یوں روتی ہوئی اور خاموش واپس نہ آتیں۔ وہ اس بیچ لڑکی کو اس کی اوقات یاد دلا کر اور اس کے منہ پر تھوک کر واپس آتیں۔"

جہاں جملے میں ام مریم کا ذکر آیا 'وہاں زین بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ سخت ترین اشتعال اور غصے میں آ گیا تھا۔ جیسے اگر ام مریم اس وقت اس کے سامنے ہوتی تو وہ اسے جان سے مار ڈالتا۔

"آمنہ کو اگر سب کچھ پتا ہوتا 'یہ وہاں پر خاموش نہ رہی ہوتی۔ تب بھی اس سے سکندر کی زندگی میں خوشیاں تو واپس نہیں آ جانی تھیں زین؟ کیا محمود صاحب اور لیزا سکندر کا اعتبار کرتے؟ ان دونوں کے لیے زیادہ قابل اعتبار تو ان کی بیٹی اور بہن ہی ہوتی نا۔ میرے بیٹے کا مقدر ہی خراب ہے۔ تقدیر کو پھر اس کی آزمائش مقصود ہے۔ ورنہ اتنی بڑی دنیا میں کوئی بھی اور لڑکی لیزا کی بہن ہو سکتی تھی۔ مگر ہوئی تو ام مریم۔"

وہ تلخی سے بولتے ہوئے تقدیر سے شاکی تھے۔ اب جبکہ وہ سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوششیں کر رہے تھے' تب سب کچھ پہلے سے بھی زیادہ غلط ہو گیا تھا۔

"آپ اتنی آسانی سے ہار مان رہے ہیں پاپا؟" زین نے افسوس بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ جواباً شکست خوردہ سے انداز میں چپ رہے۔

"مگر میں ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ماضی کو بدلنے سے میں قاصر ہوں۔ مگر اپنے بھائی کے حال میں اور اس کے مستقبل پر اب کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اپنے بھائی کی اور ہمارے گھر کی خوشیوں کو تباہ کرنے والی اس ناگن کا میں سر کچل دوں گا۔ آپ محمود انکل کو فون کیجیے پاپا! انہیں بتائیں کہ سکندر پر لگایا مریم کا ہر الزام جھوٹا ہے۔ بارہ سال پہلے بھی اس نے سکندر پر بہتان لگایا تھا۔ وہ آج بھی اس پر بہتان لگا رہی ہے۔"

زین کے مضبوط اور دو ٹوک سے انداز نے ان کے اندر دم توڑتی امید اور آس کو نئے سرے سے جگایا تھا۔ انہیں کوشش تو کرنی چاہیے سچائی محمود خالد اور لیزا تک پہنچانے کی۔ وہ بے اختیار صوفے پر سے اٹھے تھے۔ زین ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ انہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ سکندر کو اس کے حصے کی خوشیاں دلوانے کے لیے اس بار انہیں دنیا سے لڑنا پڑ جائے 'تو انہیں لڑ جانا چاہیے۔ اس بار کوئی ان کے بیٹے کی خوشیوں کے راستے میں آئے تو انہیں اسے جان سے مار ڈالنا چاہیے۔ ان کے جیتے جی اب کسی میں یہ جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ سکندر سے اس کی خوشیاں چھین سکے۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتے ٹیلی فون تک آگئے۔

"آمنہ! لیزا کے گھر کا فون نمبر بتاؤ۔" انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے آمنہ سے کہا۔ آمنہ اب رو نہیں رہی تھیں۔ جیسے اتنے سارے حواس گم کر دینے والے انکشافات نے انہیں رونا ہی بھلا دیا تھا۔

"میرے پاس لیزا کے گھر کا تو نہیں 'مگر اس کا موبائل نمبر ہے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"ٹھیک ہے! دے دو۔" آمنہ نے پرس سے اپنا

موبائل نکالا۔ وہ لیزا کا فون نمبر ملا رہی تھیں اور وہ اسے کال ملا رہے تھے۔ کال مل گئی تھی۔ وہ دوسری جانب لیزا کی آواز سننے کی توقع کر رہے تھے مگر ان کی کال لیزا نے نہیں، محمود خالد نے ریسیو کی تھی۔ بارہ سال بعد ان کی آواز سنی تھی کیسے پہچان سکتے تھے۔

"ہیلو..... میں شہریار خان بول رہا ہوں۔" انہوں نے سنجیدگی سے اپنا تعارف کروایا تھا۔

"میں محمود بات کر رہا ہوں شہریار صاحب۔ آپ کیا لیزا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں تھی نہیں اس لیے کال میں نے ریسیو کرلی۔"

انہوں نے محسوس کیا کہ محمود خالد بہت محتاط ہو کر بولے تھے۔ جیسے بولنے سے قبل اپنے ایک ایک لفظ پر غور کیا ہو۔

"نہیں! مجھے آپ سے ہی بات کرنی تھی۔ آپ کے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ اس لیے لیزا کے موبائل پر کال کی۔"

ان کا لہجہ سنجیدہ اور بہت مضبوط تھا۔

"آج جو کچھ ہوا شہریار صاحب! مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔" محمود خالد آگے نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے مگر وہ ان کی بات مکمل سنے بغیر فوراً" بولے۔

"میں آپ کی بیٹی ام مریم کے سکندر پر لگائے ہر الزام کی تردید کرتا ہوں۔ میں ام مریم کے متعلق زیادہ کچھ کہہ کر بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ وہ جو کرتی ہے اور جو کچھ کر چکی ہے، وہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ آپ سے میری فقط اتنی درخواست ہے کہ آپ لیزا اور سکندر کے رشتے کو اسی طرح برقرار رکھیں۔ کسی کی بھی باتوں میں آکر اس رشتے کو ختم نہ کیجیے گا۔ یہ سکندر اور لیزا کی خوشیوں کا سوال ہے۔ خدا کے لیے ان دونوں کو ان کی خوشیوں سے محروم نہ کیجیے گا۔"

درخواست کرتے ہوئے واقعی ان کا لہجہ التجائیہ ہی ہو گیا تھا۔

"آپ مجھے تھوڑا وقت دیجیے شہریار صاحب! ان شاء اللہ سب بہتر ہوگا۔"

محمود خالد کا بے حد سنجیدگی سے دیا گیا یہ جواب ان کی سماعتوں سے ٹکرایا اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر فوراً" ہی محمود خالد نے "خدا حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا وہ محمود خالد کے لہجے سے کچھ بھی اخذ نہ کرپائے۔ کیا ان کا لہجہ یہ اشارہ دے رہا تھا کہ وہ اب بھی سکندر اور لیزا کے رشتے کے حق میں ہیں؟ ان کا بے پناہ سنجیدہ انداز انہیں کسی بھی طرح کی رائے قائم کرنے سے روک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

سکندر کے جاتے ہی آمنہ بھی ان کے گھر سے چلی گئی تھیں اور اس کے فوراً" بعد ہی ہاشم بھی چلا گیا تھا۔ ان تینوں کے چلے جانے کے بعد وہ لاؤنج میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بالکل اکیلے بیٹھے تھے۔ عائشہ ان کے پاس آئی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر انہوں نے تسلی آمیز انداز میں کچھ کہا بھی تھا شاید مگر وہ اتنی الجھی بکھری حالت میں تھے کہ انہیں عائشہ کی وہاں موجودگی سے وحشت سی ہوئی تھی۔ معذرت خواہانہ انداز میں انہوں نے عائشہ سے فقط اتنا کہا تھا کہ وہ کچھ دیر بالکل تنہا رہنا چاہتے ہیں۔

عائشہ ان کی کیفیت سمجھتے ہوئے بغیر برا مانے وہاں سے چلی گئی تھیں۔ اسی طرح سر دونوں ہاتھوں میں تھامے انہیں نہ جانے کتنی دیر گزری تھی، جب وہاں صوفے پر پڑا لیزا کا موبائل بجا تھا۔ بے دھیانی میں انہوں نے کال ریسیو کرلی تھی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ یہ کال انہوں نے ریسیو کرلی تھی۔ ورنہ نہ جانے وہ کتنی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھے رہتے۔ یہ وقت اس بات پر بیٹھ کر افسوس کرنے کا تو نہیں تھا کہ سکندر، زین کا بڑا بھائی کیوں ہے۔ نہ اس بات پر افسوس کرنے کا کہ آج جو کچھ ہوا، وہ مریم نے کیوں کیا تھا؟ یہ وقت کلثوم کی فکر کرنے کا تھا۔ اس کی زندگی کی خوشیوں کو بچانے کا وقت تھا۔ کلثوم تھی کہاں؟ ایک، ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ان سب لوگوں کو ان کے گھر سے گئے۔ اس کے بعد سے انہوں نے کلثوم کو نہیں دیکھا۔ انہیں یکدم ہی اس کی بے طرح فکر لاحق ہوئی تھی۔ آج جو کچھ ہوا، اس نے

ان کی بیٹی پر کیا اثر ڈالا تھا۔ وہ ٹھیک تو تھی نا؟ وہ فوراً" ہی لیزا کا موبائل ہاتھ میں لیے صوفے پر سے اٹھے۔

وہ لاؤنج سے باہر جا رہے تھے۔ نہ جانے وہ تھی کہاں؟ سب سے پہلے وہ اسے تلاش کرتے اس کے کمرے میں آئے اور وہاں پر وہ انہیں مل بھی گئی تھی۔

مگر وہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ مریم بھی تھی وہاں پر اس کے ساتھ۔ مریم کو لیزا کے پاس بیٹھا دیکھ کر ان کا دل بری طرح پریشان ہوا تھا۔ آج پھر ——— زہر بھر رہی تھی وہ لیزا کے ذہن میں۔

وہ کمرے کے اندر آگئے۔ لیزا اور مریم نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ لیزا بالکل گم صم سی بیٹھی تھی، جبکہ مریم زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے لیزا سے کہہ رہی تھی۔

"میں سکندر کی منت کرتی رہی کہ میں تمہارے بھائی کی عزت ہوں، پر اس پر تو شیطان سوار تھا لیزا۔ اس نے میرے کپڑے..... میں روتی رہی، چلا چلا کر مدد کے لیے پکارتی رہی، اس سے رحم کی بھیک مانگتی رہی، پر وہ اپنے نفس کا پجاری، ہوس میں اندھا ہو چکا تھا۔ اس نے میری عزت..... پہلی بار پاپا کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہونے کے بعد ممی کے فرنچ شوہر نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور دوسری بار سکندر شہریار نے۔ میری خوب صورتی ساری زندگی میری آزمائش بنی رہی۔ آج بھی ایک زبردستی کا بندھن محض پاپا کی خاطر نبھا رہی ہوں کہ پاپا کے بزنس فرینڈ ہاشم اسد کا دل میری خوب صورتی پر آگیا تھا۔ میری ہاشم کے ساتھ شادی کی وجہ سے پاپا مسلسل اس سے بزنس میں فائدے حاصل کرتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ تو جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، میں سہہ رہی ہوں لیزا۔ پر میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ میں پاپا یا سکندر کو تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کرنے دوں گی۔ تم کل ہی کی فلائٹ سے واپس لندن چلی جاؤ۔ چھوڑ دو سکندر شہریار کو۔ چھوڑ دو پاپا کو۔ یہ سب تمہیں اپنے اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ تم لندن جا کر وہاں پر اپنی مرضی اور پسند سے کسی سے بھی شادی کر لو۔ پاپا کو اپنی شادی کے بارے میں بتانے کی تمہیں نہ کوئی ضرورت ہے، نہ ان سے اجازت لینے کی۔ تمہارا ہونے والا شوہر مسلمان ہو یا نہیں، بس اس کا اچھا انسان ہونا تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے۔ تم پاپا کی اب بالکل بھی پروا مت کرنا۔ آخر دیا کیا ہے انہوں نے ہم دونوں کو....."

وہ مریم کی زہر اگلتی زبان خاموشی سے سن رہے تھے۔ مریم جو پوری طرح لیزا کی طرف متوجہ تھی۔ بولتے بولتے اسے یک دم ہی جیسے کسی کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ پہلے مریم اور پھر لیزا نے انہیں دیکھا مریم یک لخت ہی گھبرا کر چپ ہوئی تھی۔ وہ شاید اس وقت یہاں ان کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئیں مریم؟ اگلو زہر۔ جتنا زہر تمہارے اندر ہے آج سب اگل ڈالو۔" انہوں نے طیش کے عالم میں مریم کو دیکھا۔

"پاپا! وہ میں..... میں چاہتی تھی لیزا کو سکندر کی ساری سچائی بتا دوں، تاکہ اسے اپنی غلط چوائس کا احساس ہو سکے۔" مریم بوکھلا کر فوراً" بولی۔

"کیسا رہے گا اگر آج میں بھی اسے ساری سچائی بتا دوں؟ بہتر رہے گا کہ کلثوم آج اپنی تمام غلط چوائسز کا ادراک کر لے گی۔" وہ طنز اور غصے سے بولے۔

"پاپا! آپ....."

مریم کی بات انہوں نے مکمل نہیں ہونے دی۔ وہ آگے بڑھ کر اس کے بالکل سامنے آئے اور انہوں نے کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے گال پر مارا۔

"پاپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" لیزا گھبرا کر فوراً" بیڈ پر سے اٹھی۔

"تم وہیں رکو کلثوم! آج میرے اور اس کے بیچ میں ہرگز مت آنا۔"

وہ غصہ کرنے اور چیخنے چلانے والے آدمی نہ تھے۔ مگر آج وہ چلا رہے تھے۔ انہیں اس قدر غصے میں دیکھ کر لیزا اپنی جگہ سہم کر رک گئی۔

"آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا پاپا؟" مریم نے بے یقینی اور غصے سے منہ پر ہاتھ رکھے رکھے پوچھا۔ وہ بھی بیڈ پر سے اٹھ گئی۔ لیزا، مریم کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ان

دونوں کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ تھپڑ مجھے تمہارے منہ پر بہت پہلے مار دینا چاہیے تھا مریم۔ کاش! میں نے یہ تھپڑ تمہیں اس روز مار دیا ہوتا' جب تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ مجھے تمہارے تعلقات کا علم ہوا تھا۔"

وہ یہ تمام الفاظ بولتے ہوئے دکھ' کرب اور شرم سے زمین میں گڑے رہے تھے۔ برسوں پہلے جب یہ شرمناک باتیں پتا چلی تھیں' تب بھی اسی طرح وہ شرم اور غیرت سے زمین میں گڑ سے گئے تھے۔ لیزا ان کے انکشافات پر ساکت تھی' بے یقین تھی اور مریم تھپڑ لگنے کی ساری تکلیف اور غصہ بھلائے یوں کھڑی تھی' جیسے یہ توقع مر کر بھی نہیں کر سکتی تھی کہ باپ کو یہ تمام باتیں معلوم ہوں گی۔

"یہ جھوٹ ہے پاپا! یہ سب جھوٹ ہے۔ کسی نے یہ ساری بکواس کی ہے آپ سے میرے متعلق۔ آپ کا دل مجھ سے خراب کروانے کے لیے۔"

مریم بوکھلا کر بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور آنکھوں میں خوف تھا۔

"تمہاری ماں نے مجھے فون پر روتے ہوئے یہ بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا' تم اس کا گھر خراب کرنا چاہتی ہو۔ میں نے اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ تمہارے سوتیلے باپ نے یہ بات بتائی۔ میں نے یقین نہیں کیا تھا' مگر جب ان دونوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے میں اس گائنا کولوجسٹ کے پاس پہنچا جس کا پتا تمہاری ماں اور سوتیلے باپ نے بتایا تھا۔ اس نے تمام ثبوتوں کے ساتھ اس بات کی تصدیق کی' تب میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ میری بیٹی اتنی بدکردار کیسے ہو سکتی تھی؟ آخر کیسے؟ پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک تمہارے افیئرز کا مجھے پتا چلتا رہا اور میں اندر ہی اندر شرم اور ندامت سے گڑتا یہ سمجھتا چلا گیا کہ میری بڑی بیٹی جسے میں نے ہمیشہ چھوٹی بیٹی سے زیادہ چاہا تھا۔ اس نے میری صرف شکل لی تھی' کردار اپنی ماں کا لے لیا تھا۔"

بولتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ شرم' غیرت اور دکھ سے جیسے ان کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ انہیں یکدم ہی چکر سا آیا۔ خود کو لڑکھڑا کر گرنے سے بچانے کے لیے انہوں نے پاس رکھی کرسی کا سہارا لیا تھا۔

"پاپا۔" لیزا پریشان ہو کر' دوڑ کر ان کے پاس آئی۔ ان کے اوسان خطا کر دینے والے ان انکشافات نے لیزا کی حالت بھی غیر کر رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے انہیں تھام کر' سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔ وہ اپنے دل کی پریشانی بھلا کر باپ کے لیے فکر مند ہوئی تھی۔ وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں پاپا؟" انہیں اپنے سینے پر دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کا ہاتھ سینے پر جاتا دیکھ کر وہ بہت بری طرح پریشان ہوئی تھی۔

"میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں پاپا۔"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا۔" اسے تسلی دینے کو وہ بدقت ہلکا سا مسکرائے تھے۔ دکھ اور کرب سے بھری مسکراہٹ۔

✲ ✲ ✲

وہ باپ سے دور کھڑی تھی۔ لیزا ان کے برابر میں بیٹھی تھی۔ وہ ان سے دور ہے۔ لیزا ان کے پاس ہے۔ وہ اپنے حواس کھونے لگی تھی۔ پاپا نے برسوں پہلے اسے خود سے دور کر کے لیزا کو اپنے نزدیک کر لیا تھا۔ اسے ممی کے ساتھ بھیج کر اپنے ساتھ رکھنے کے لیے لیزا کا انتخاب کیا تھا۔

باپ کے ساتھ بیٹھی لیزا پر اس کی نظر پڑی تو اس کے اندر نفرت کا وہی طوفان اٹھا' جو چاہتا تھا' لیزا باپ کی نظروں سے گر جائے۔ لیزا کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے۔ وہ چودہ سال کی عمر سے اس لڑکی سے نفرت کرتی آئی تھی۔ اس نے ساری زندگی اتنی نفرت اور کسی سے بھی نہیں کی تھی' جتنی لیزا محمود سے کی تھی۔ اپنی زندگی کے چودہ برسوں تک اسے یہ بتایا گیا تھا کہ باپ اسے سب سے زیادہ چاہتا ہے' وہ اسے ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔ مگر ماں اور باپ میں طلاق کے وقت اسے اچانک ہی پتا چلا' جو کچھ وہ چودہ برسوں تک سمجھتی رہی' وہ غلط تھا۔ لیزا کو اپنے ساتھ

رکھنے کا انتخاب اس کے پاپا نے کیا تھا۔ پاپا نے اسے نہیں' لیزا کو چنا تھا اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ وہ تو پاپا کی محبت کی بلا شرکت غیرے مالک تھی نا! پر پاپا نے محبت کا فخر' مان اور لاڈلے ہونے کا تاج اس کے سر پر سے اتار کر لیزا کے سر پر پہنا دیا تھا۔ اس روز اسے لیزا سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔ اس روز اسے اپنی ماں سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔

اس کے اندر ایک آگ لگی تھی برسوں سے، جو کبھی کسی طرح ٹھنڈی نہیں ہوسکی تھی۔ اس نے اپنی ماں سے انتقام لینے کے لیے اپنے سوتیلے باپ کو اپنی جانب ملتفت کروایا تھا۔ ماں نے اس سے اس کا گھر اور باپ چھینا تھا۔ اس نے ماں سے اس کا گھر اور شوہر چھین لیا تھا۔ ماں سے انتقام کی آگ میں جلتی وہ تمام حدود عبور کرگئی تھی۔ اسے اس فیشن ڈیزائنر سے شادی نہیں کرنی تھی۔ اسے تو فقط ماں کا گھر اجاڑنا تھا۔ جب یہ کام کرچکی تو ہاسٹل چلی آئی۔

لیزا اس سے پیار بھی بہت کرتی تھی اور وہ بے وقوف بھی بہت تھی۔ وہ ہمیشہ سے اس کے اثر اور حصار میں رہی تھی۔ وہ شروع سے اس کی تابعدار رہی تھی۔ جب تک وہ دونوں ماں' باپ کے ساتھ اٹلی میں رہی تھیں' اس نے لیزا کی تابعداری اور سادگی کو کبھی اس کے خلاف استعمال نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ اس کے فائدے کے بارے ہی میں سوچا تھا۔ مگر جب محبت کا فخر اور عزیز از جان ہونے کا تاج پاپا نے اس کے سر سے اتار کر لیزا کے سر پر سجایا' تب اس نے لیزا کے نقصان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے ماں' باپ کی علیحدگی کے اول روز سے لیزا کا دل باپ سے خراب کروانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے محبت اور پیار کا نام لے کر لیزا سے ہر وہ کام کروایا' جس سے پاپا' لیزا سے دور ہوجائیں۔ اس سے خفا اور بدگمان ہوجائیں۔

وہ جانتی تھی کہ پاپا نے لیزا کو خود سے قریب کرنے کی بہت کوششیں کی تھیں' مگر اس کا حصار لیزا پر اتنا مضبوط تھا کہ پاپا' لیزا کو کبھی بھی خود سے نزدیک نہیں کرپائے تھے۔ اس نے ساری زندگی اسی کوشش میں گزاری تھی کہ لیزا کو پاپا سے دور کروا دے اور پاپا کو لیزا سے بدگمان کر دے۔ وہ پاپا کو لیزا سے بدگمان کبھی نہ کروا پائی تھی۔ ہاں! لیزا کو ان سے دور رکھوانے میں وہ بہت کامیاب رہی تھی۔ لیزا کسی مسلمان اور پاکستانی مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے' یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ اس شادی کو کسی بھی طرح رکوا دینا چاہتی تھی۔ اگر لیزا کی شادی یہاں ہوگئی تو پاپا تو اس سے بہت خوش ہوجائیں گے۔ ان کی مرضی کے مطابق شخص سے شادی کر کے تو لیزا ان کے قریب ہوجائے گی۔

پتا نہیں کون تھا وہ شخص جس سے لیزا محبت کر رہی تھی۔ اس شخص کی محبت اتنی زور آور تھی کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ لیزا پر اپنا حصار کمزور پڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے لیزا کو منع کیا۔ پیار سے' غصے سے' ہر طرح اس نے لیزا کو پاکستان آنے سے روکا۔ کم از کم وہ خود سری دکھا کر' اکیلے شادی کر کے پاپا کے دل کو دکھا دے۔ مگر لیزا پاکستان آگئی تھی۔ اس کی کوششیں ناکام جا رہی تھیں' پھر بھی آج دوپہر سے پہلے تک وہ مایوس نہیں تھی۔ اسے یقین تھا' وہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کرنے میں کامیاب ہوجائے گی کہ لیزا کی یہاں شادی نہیں ہوسکے گی۔ وہ آج یہاں اسی امید پر آئی تھی کہ کسی بھی طرح لیزا یا پاپا کا دل ان لوگوں سے خراب کروا دے' جہاں لیزا شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ شادی کر کے لیزا' پاپا سے قریب ہوجائے گی اور ایسا وہ مر کر بھی نہیں ہونے دے گی۔

سکندر شہریار کو لیزا کے ہونے والے شوہر کے روپ میں دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی وہاں موجود ہے' اسے اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ جنون اور وحشت میں جو اس کے منہ میں آیا وہ بولتی چلی گئی تھی۔

آخر ایسا تھا کیا اس عام سی لیزا میں کہ جس کسی کو بھی وہ سچے دل سے چاہتی ہے' وہ اسے ٹھکرا کر لیزا کو اپنا لیتا ہے۔ اس کے پاپا بھی اور سکندر شہریار بھی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی بھی شعلے نکل رہے تھے۔ یوں

لگ رہا تھا اس کا پورا وجود ایک ان دیکھی آگ میں جل رہا ہو۔ وہ شدید نفرت سے لیزا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا' اس کے پاپا کا ہاتھ ابھی بھی ان کے سینے پر تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہے تھے۔ لیزا اٹھ کر ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔ وہ انہیں اپنے ہاتھ سے پانی پلا رہی تھی۔ یکدم ہی اس پر جنون سا سوار ہوا۔ وہ لیزا کے سامنے آئی۔ اس نے ہاتھ مار کر لیزا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گرا دیا۔

"بس کرو تم یہ ڈرامے لیزا! تم پاپا سے کتنی محبت کرتی ہو' یہ پاپا بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔"

پانی سے بھرا گلاس چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ وہ یکدم ہی باپ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔

"پاپا! یہ آپ سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی مکاری کا یقین مت کریں۔ آپ سے محبت صرف اور صرف میں کرتی ہوں۔"

باپ کے پیروں پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے وہ رو پڑی۔ پاپا کو یہ یقین تو نہیں کھونا چاہیے کہ وہ ان کی مریم ہے' وہ ان سے بہت پیار کرتی ہے۔

"سیم" اس نے لیزا کی روتی ہوئی آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ محمود خالد نے اپنے پیر پیچھے ہٹائے۔ انہوں نے اپنے پیروں پر سے اس کے ہاتھ جھٹک کر ہٹا دیے۔

"پاپا! آپ۔" اس نے روتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ اسے باپ کی آنکھوں میں ناراضی نظر آئی۔ ان کا ایک ہاتھ ابھی تک ان کے سینے پر تھا۔

"مجھے پتا ہے' اس نے کوئی زہر بھرا ہے آپ کے دل میں میرے خلاف۔ اسی نے آپ کو مجھ سے چھینا تھا۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ اس نے لیزا کو نفرت سے دیکھا۔

"سیم! خدا کے لیے پاپا کی حالت کا خیال کرو۔ دیکھو! پاپا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

اس نے دیکھا لیزا نے پاپا کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر ان کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ روتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں بہت دکھ تھا۔

"ہٹو پاپا کے پاس سے۔ معصومیت اور سادگی سے ڈرامے کر کے تم پاپا کو مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔"

وہ یکدم ہی جنونی انداز میں اٹھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر پوری قوت سے کھینچ کر لیزا کو پاپا کے پاس سے اٹھایا۔ وہ لیزا کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ پاپا کی آنکھوں میں اپنے لیے ناراضی اور بے اعتباری دیکھ کر وہ واقعی اپنے حواس کھونے لگی تھی' یہ جیسے کوئی دورہ سا پڑا تھا' وہ جنونی انداز میں چلا رہی تھی۔ لیزا اس کے ساتھ کھنچتی صوفے سے اٹھ گئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"مریم! خدا کے لیے بس کرو۔ اب بس کرو۔" تکلیف اور درد میں مبتلا اس کے پاپا کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ان تک جانا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے لیزا دوڑ کر پھر ان کے پاس چلی گئی۔

"پاپا! اسپتال چلیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز! پاپا چلیں۔" لیزا نے روتے ہوئے ان کی منت کی تھی۔

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔ شاید بی پی ہائی ہو رہا ہے۔ ابھی دوا لے لوں گا۔" وہ اس طرح بول رہے تھے' جیسے انہیں سانس لینے میں دقت کا سامنا ہو۔ لیزا انہیں فکر سے دیکھ رہی تھی۔ لیزا ان کے پاس بیٹھی تھی اور وہ ان کے مقابل ان سے بہت دور' میلوں اور کوسوں دور۔

"میں ٹھیک ہوں کلثوم! تم میری فکر مت کرو بیٹا۔ بس میری ایک نصیحت سن لو' بہت غور سے اور اس پر عمل بھی کرو۔"

وہ جیسے اپنے باپ کو نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ انہیں اگر کوئی نظر آ رہا تھا تو لیزا۔

"جی پاپا!" لیزا سعادت مندی سے بولی۔ اس کی سعادت مندی اس کی آنکھوں میں پھر غیظ و غضب لے آئی تھی۔ اسے پھر نفرت کی انتہاؤں پر لے گئی تھی۔

"بیٹا! خود کو مریم سے دور کر لو۔ یہ تمہیں تباہ کر دے گی۔ یہ تمہاری زندگی برباد کر دے گی۔ یہ ساری زندگی

ہرے خلاف تمہارے اندر زہر بھرتی رہی ہے۔ میں ب سمجھتا تھا' سب جانتا تھا۔ پر چپ رہتا تھا۔ میں اپی ایک بیٹی کے خلاف دوسری بیٹی سے کیا کہتا؟ سکندر ے والدین اور زین سب سکندر کو قصوروار سمجھتے ایں۔ جب یہ زین سے منگنی توڑ کر آئی تھی تب میں نے امریکا فون کرکے شہریار خان سے بات کی تھی۔ وہ بے چارے مجھ سے بہت شرمندہ ہوئے تھے۔ اپنے بیٹے کی غلط حرکت پر مجھ سے انہوں نے معافی تک مانگی تھی۔ میں نہ تو تب سکندر سے کبھی ملا تھا' نہ اس واقعہ کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتا ہے' مگر میں بارہ سال پہلے بھی یہ جانتا تھا کہ بدکردار زین کا بڑا بھائی نہیں' میری بیٹی ہی ہے۔ جو اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ اتنا شرمناک رشتہ قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ منگیتر کے بڑے بھائی کے ساتھ کیوں انوالو نہیں ہو سکتی؟ زین کے ساتھ اس کی منگنی میں نے خود کروائی تھی' یہ سوچ کر کہ چلو! ایک اچھے خاندان کا نیک' شریف اور مہذب لڑکا اس نے اپنے لیے چنا ہے۔ شاید اس کا ساتھ اس کے اندر تبدیلیاں لے آئے۔ یہ اپنی اصلاح کرلے۔ تب میں اس سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا' میری بیٹی راستہ بھول ضرور گئی ہے' بھٹک ضرور گئی ہے' مگر جلد وہ راہ راست پر واپس آجائے گی۔ مگر اس کے بعد آنے والے برسوں میں اس کے غلط راستے پر آگے سے آگے بڑھتے قدم مجھے یہ بتاتے رہے کہ میری بیٹی نے اس بھٹکی ہوئی اور غلط راہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چن لیا ہے۔ میں لاکھ کوششیں کرلوں' اسے راست راستے پر واپس نہیں لا سکتا۔"

وہ لیزا سے مخاطب تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ تک نہیں رہے تھے۔ اب ان کی طبیعت قدرے سنبھل چلی تھی۔ وہ بہت دکھ اور کرب سے بول رہے تھے۔ مگر ان کی سانس نہیں اکھڑ رہی تھی۔ اس کی سماعتوں میں باپ کی اپنے متعلق باتیں گونج رہی تھیں۔ مگر اس کی نظریں لیزا پر تھیں۔ وہ پاپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لیزا' پاپا کی عزیز از جان تھی اور وہ انتہائی قابل نفرت' جس کی طرف پاپا دیکھنا تک گوارا نہیں کررہے تھے۔

"کلثوم! تم محسوس نہیں کررہیں' مگر جس روز سے تم نے سکندر سے شادی کا فیصلہ کیا ہے' یہ تمہاری شادی کسی بھی طرح رکوا دینے کی فکر میں مبتلا ہے۔ جب سے تم پاکستان آئی ہو۔ میں اس کی شکل دیکھ کر محسوس کررہا ہوں کہ یہ تمہاری شادی سے خوش نہیں ہے۔ چہرے پڑھنا سیکھو کلثوم! دلوں میں چھپی نفرتیں جاننا سیکھو۔ یہ بہن نہیں' تمہاری دشمن ہے۔ دور کرلو خود کو اس سے کلثوم!"

اس کے پاپا جیسے بالکل پھٹ پڑے تھے۔ جیسے برسوں کا لاوا باہر نکل آیا تھا۔ ان کے لہجے میں اس کے لیے دکھ بھی تھا' مایوسی بھی تھی اور ناراضی بھی تھی۔ یوں جیسے جو کچھ وہ بول رہے تھے' اسے بولتے ہوئے انہیں بہت تکلیف ہورہی ہو' مگر پھر وہ سب کہہ دینا ضروری لگ رہا ہو' اپنی عزیز از جان لیزا کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے۔ اس نے اس بار اپنے پاپا کو بھی غصے سے دیکھا۔ لیزا کے لیے اس کی آنکھوں میں نفرت تھی اور پاپا کے لیے چہرے پر غصہ۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے پاپا! ہاں میں اس کی دشمن ہوں۔ اس سے نفرت کرتی ہوں۔ اسے میرے اوپر ترجیح دے کر آپ نے اس نفرت اور دشمنی کی بنیاد رکھی تھی۔ اگر میں بری ہوں تو مجھے برا بنایا کس نے تھا؟ آپ نے پاپا! صرف اور صرف آپ نے۔" وہ غصے سے چلائی۔

"آپ نے اپنے ساتھ لندن لے جانے کے لیے اسے چنا تھا نا؟ بولیے چنا تھا کہ نہیں؟" وہ روتے ہوئے حلق کے بل چلائی۔

لیزا اپنے لیے اس کا نفرت بھرا لہجہ سن کر اگر صدمے سے گنگ رہ گئی تھی تو اسے اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔

"آپ نے اسے چنا' سکندر شہریار نے اسے چنا۔ آخر ایسا ہے کیا اس عام سی لیزا میں؟ جس کسی سے بھی میں محبت کرتی ہوں' وہ میرے بجائے اسی کو چاہتا ہے۔ آپ بھی' سکندر شہریار بھی۔ میں نے آپ سے بہت محبت کی ہے پاپا! اپنی جان سے بھی زیادہ' مگر آپ

مجھے ممی کے پاس چھوڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آپ نے اسی کو چاہا' مجھے نہیں اور سکندر نے بھی مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ مجھے رد کر دینے کے بعد آج وہ اسے اپنانا چاہتا ہے اس عام سی لیزا محمود کو؟ جس میں مجھ جیسی کوئی ایک بات نہیں۔ ہاں! میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں نے ساری زندگی اتنی نفرت کسی سے نہیں کی' جتنی اس سے کرتی ہوں۔"

وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ اس کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ پاپا نے لیزا کے سامنے اس کے بارے میں اتنا کچھ بول دیا تھا تو اب اپنی نفرت چھپانے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ وہ لیزا سے اپنی نفرت کا اظہار ببانگ دہل کر رہی تھی۔

"سیم! یہ کیا کہہ رہی ہو۔ پلیز! ایسا مت بولو۔" اس نے لیزا کی روتی ہوئی آواز سنی۔ "میں نے ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیار تمہیں کیا ہے سیم۔ ممی سے بھی زیادہ' پاپا سے بھی زیادہ۔ میرے لیے میری فیملی' میری دوست' میری ماں' میرا باپ سب کچھ تم رہی ہو سیم!"

وہ روتے ہوئے اس سے بول رہی تھی۔ اس کے اوپر لیزا کے آنسو اثر کر رہے تھے' نہ اس کی باتیں۔ وہ اسے دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے پاپا کو دیکھ رہی تھی' جنہوں نے روتی ہوئی لیزا کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ اسے پیار کر رہے تھے۔ اس کا بڑی شدت سے دل چاہا تھا' وہ لیزا کو ان کے پاس سے ہٹا دے' اسے مٹا دے' اسے غائب کر دے' اسے جان سے مار ڈالے۔

"مریم! میں نے کلثوم کو تم پر فوقیت نہیں دی تھی۔ تم بھی جانتی ہو' کلثوم بھی جانتی ہے' میں تمہیں زیادہ چاہتا تھا اور یہ بات تمہاری ماں بھی جانتی تھی۔ تمہاری ماں سے شادی میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تھی۔ میں اپنی اس غلطی کو ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی دونوں میں سے کوئی ایک بیٹی بھی اس بدکردار عورت کے پاس چھوڑنے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وثوریا ایک شاطر اور مکار عورت تھی۔ علیحدگی کے وقت مجھے بلیک میل کرنے اور پریشان کرنے کے لیے اس نے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تمہیں اس لیے چنا تھا تاکہ مجھے تکلیف دے سکے۔ یہ خواہش بھی اسی کی تھی کہ ایک بیٹی اس کے پاس اور ایک میرے پاس رہے گی۔ اسے تم دونوں میں سے کسی سے بھی محبت نہیں تھی۔ مگر مجھے ٹف ٹائم دینا چاہتی تھی۔ اس لیے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کی شرط عائد کر رہی تھی۔ میں اس گھٹیا عورت کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا' کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنی اوقات دکھانے پر آئی تو میری عزت اور نیک نامی تک کو رسوائی اور جگ ہنسائی میں تبدیل کروا دے گی۔ میری عزت کے ساتھ میری بچیوں کی عزت بھی جڑی تھی۔ اپنی اور تم دونوں کی عزت قائم رکھنے کے لیے میں اس وقت وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا۔ مگر میرا اول روز سے تمہیں اس کے پاس چھوڑ دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تم دونوں میں سے ایک کو بھی وثوریا کے حوالے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تمہیں اپنے پاس لندن بلانے کی کوششیں کر رہا تھا اور اس دوران میں تم سے نہ تو غافل ہوا تھا' نہ بے پروا۔۔۔۔ میں مسلسل تمہاری خبر گیری کرتا تھا۔ یاد کرو! میں تمہیں دن میں کتنی بار فون کرتا تھا؟ سال میں ایک بار تمہاری چھٹیوں میں تمہیں اپنے پاس لندن بلواتا تھا۔ کتنی بار اپنے جاننے والوں کو جو کسی کام سے اٹلی جا رہے ہوتے تھے' تم سے بطور خاص ملنے کی تاکید کرتا تھا۔ اس عرصے میں میری مسلسل یہ کوشش رہی تھی کہ تمہیں جلد از جلد وثوریا سے واپس لے سکوں۔ مگر قبل اس کے کہ میری کوششیں کامیاب ہوتیں' مجھے تمہارے مختلف افیئرز کی خبریں ملنی شروع ہو گئیں۔ میں تم سے ظاہری طور پر دور تھا مریم! مگر تمہاری ہر ہر حوالے سے خبر رکھتا تھا۔ ابھی میں تمہارے افیئرز ہی سے پریشان ہوا تھا کہ مجھے تمہارے سوتیلے باپ کے ساتھ تمہارے تعلقات کا پتا چلا۔ تمہاری ماں نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔ میرے جاننے والوں نے مجھے خبر دی

تھی۔ میں تمہیں ان پستیوں میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا' مگر تم مجھ سے اتنی دور جاچکی تھیں' اتنی پستی میں اتر چکی تھیں کہ تمہارے پاس واپسی کا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ تم مجھے لاعلم سمجھتی تھیں اور میں اکیلے میں تمہاری بدکرداری پر پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔ تمہاری حرکتوں کا پتا چلنے کے بعد' چاہے میرا دل تم سے کتنا ہی شاکی کیوں نہ ہوا تھا' مگر میں نے تمہیں ہاسٹل میں رہنے سے منع کیا تھا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جانا چاہتا تھا۔ یاد کرو! میں نے تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ مگر تم میرے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ آزادی اور بے راہ روی کے جس راستے پر تم چل پڑی تھیں' وہاں میرے ساتھ رہنا تمہیں بندش لگتا تھا۔ میں تمہیں مزید پستیوں میں اترنے سے بچانا چاہتا تھا' مگر زور زبردستی کرکے تمہیں اپنے ساتھ کیسے لے جاتا؟ وہ مغربی معاشرہ جہاں میں نے اپنی بیٹیوں کو پروان چڑھایا تھا' وہاں باپ' اولاد پر زور زبردستی کر نہیں سکتا تھا۔"

وہ اب چپ چاپ ساکت کھڑی باپ کی غم زدہ آواز سن رہی تھی۔ وہ اب نہ تو اس پر چلا رہے تھے' نہ غصہ کررہے تھے' وہ بس مدھم آواز میں درد اور کرب آنکھیں میں سموئے اس سے بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کی آنکھوں میں یہ دکھ جھلک رہا تھا کہ جس بیٹی کو انہوں نے دنیا کے تمام رشتوں اور تمام لوگوں سے زیادہ چاہا' اسی نے انہیں سب سے زیادہ دکھ دیے۔ اس کا دل چاہا' وہ دوڑ کر پاپا کے پاس جائے' ان کے سینے سے لگ جائے۔ مگر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔

"تم اخلاقی لحاظ سے ہر برائی میں ملوث رہیں مریم! میں چپ رہا۔ تم کلثوم کے دل میں میرے خلاف زہر بھرتی رہیں' میں چپ رہا۔ اکیلے میں روتا تھا کہ میری دونوں بیٹیاں اپنی اپنی زندگیاں تباہ کررہی ہیں۔ میں انہیں کیسے روکوں؟ کیسے بچاؤں؟ تم نے مجھے یہ بتانے کے لیے کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو' ہاشم سے شادی کا فیصلہ کیا' تاکہ میں تمہیں ایک پاکستانی شخص سے شادی کرتا دیکھ کر خوش ہوجاؤں۔ مگر میں تمہارے اس فعل پر کیسے خوش ہوتا مریم؟ جانتی ہو تمہاری شادی کے چند دنوں بعد ہاشم کی پہلی بیوی مجھ سے آکر ملی تھی۔ اس کی آہیں اور بددعائیں جو اس نے مجھے اور تمہیں دی تھیں' ہر لمحہ میرا تعاقب کرتی ہیں۔ میں ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں اس مظلوم عورت اور اس کے معصوم بچوں کی کوئی بددعا' کوئی آہ تمہیں نہ لگ جائے۔ جتنا بھی مجھے تم پر غصہ ہو' جتنا بھی تم نے مجھے مایوس کیا ہو' پر ہو تو تم میری اولاد مریم! تمہیں اگر کوئی تکلیف پہنچی تو سب سے زیادہ درد تو مجھ ہی کو ہوگا نا؟ میں تم سے درخواست کرتا ہوں مریم! خود کو بدلو۔ اتنی بددعائیں مت سمیٹو کہ میری دعائیں بھی تمہیں کسی پکڑ سے بچا نہ سکیں۔"

اس کے پاپا بھیگی ہوئی آواز میں اس سے بولے۔ وہ صوفے پر سے اٹھے اور وہاں سے جانے لگے۔ بغیر ان دونوں میں سے کسی کی بھی طرف دیکھے۔

وہ ان کے پیچھے جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے پاؤں تو زمین نے جکڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے پاپا کو بہت شکستہ' بہت ہارے ہوئے قدموں سے کمرے سے جاتا دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ پاپا کی نظروں سے گر گئی ہے؟ کیا انہوں نے اسے اپنے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا ہے؟ دہشت زدہ ہوکر اس نے اپنے قدموں کو اٹھانا چاہا۔

اس بار اس کے قدم اٹھ گئے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر جارہی تھی بغیر لیزا کی طرف دیکھے۔ وہ فوری طور پر اس گھر سے چلے جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے گھر واپس جارہی تھی۔ اپنے گھر جاکر وہ سکون سے ساری صورت حال کو دوبارہ سے سوچے گی۔ سوچے گی کہ اب کیا' کیا جاسکتا ہے۔ وہ کمزور اور بزدل لڑکی نہیں ہے۔ وہ ام مریم ہے۔ وہ کبھی بھی ہار نہیں سکتی۔ خدا نے اس کی تخلیق اس مٹی سے کی ہے' جس کی فطرت میں ہار ہے ہی نہیں۔ صرف اور صرف جیت ہے۔ صرف اور صرف جیت۔

✲ ✲ ✲

"کیا کہا محمود صاحب نے؟" شہریار خان واپس صوفے پر آکر بیٹھے تو آمنہ نے ان سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" انہوں نے بے بسی سے آمنہ کو دیکھا۔ "میں ان کے لہجے سے کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ عجیب الجھا ہوا سا انداز تھا ان کا۔"

زین چپ چاپ باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا دل پریشان تھا۔ اس کا دماغ مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ کسی بھی طرح، کسی بھی طرح سکندر کو لیزا کا ساتھ مل جائے۔ کم از کم اس کے بھائی کو زندگی میں یہ ایک خوشی تو مل جائے۔ کل سے پہلے وہ مظلوم تھا، سکندر ظالم تھا۔ کل جب اپنے مظالم اور جرائم کی فہرست سامنے آئی تو دل چاہا تھا، خود کو ختم کر ڈالے، اسی وقت موت کو گلے لگالے۔ کل زندہ رہنا بہت دشوار لگا تھا اور آج.....

آج اسے پتا چلا تھا کہ اس کی وجہ سے، صرف اور صرف اس کی وجہ سے اس کے بھائی کی زندگی میں پھر اندھیرے اور مایوسیاں آگئی تھیں۔ اس لڑکی ام مریم کو وہ لے کر آیا تھا اپنے گھر میں۔ محبت میں اندھا اور پاگل وہ ہو گیا تھا۔ اس کے بھائی کے کردار پر تہمت لگائی گئی تھی۔ اسے گھر بدر کیا گیا تھا۔ مگر زین شہریار کے گناہ یہاں آکر ختم نہیں ہوئے تھے۔ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا وہ واقعہ پھر بیچ محفل دہرایا گیا تھا۔ اس کے بھائی کی عزت اور ناموس پر پھر انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ برسوں بعد اسے ملنے والی ایک خوشی پھر اس کی وجہ سے اس سے چھن رہی تھی۔ اس کا حقیقتاً "دل چاہ رہا تھا" وہ کسی بلند عمارت سے کود جائے یا سمندر میں خود کو غرق کردے۔ وہ کسی بھی تکلیف دہ اور اذیت ناک ترین انداز میں خود کو ختم کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی تو سزا ہی یہی تھی کہ اسے زندہ رہنا تھا۔ اس احساس گناہ کو ساتھ لیے ابھی اسے برسوں زندہ رہنا تھا۔ مُردوں سے بھی بدتر انداز میں، خوف سے نفرت کرتے ہوئے۔

بارہ سال سکندر سے نفرت کی تھی، اب زندگی کے باقی تمام عرصے میں اسے خود سے نفرت کرنی تھی۔

"اب کیا ہوگا شہریار؟" اس کے کانوں میں اپنی ماں کی آواز آئی۔ ڈر، خوف اور اندیشوں میں گھری ہوئی آواز۔

"پتا نہیں۔" گم صم سے انداز میں شہریار خان بولے۔ ان کے چہرے پر پریشانی ہی پریشانی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ یکدم ہی انہوں نے آمنہ سے پوچھا۔

"آمنہ! سکندر کہاں ہے؟" باپ کے اس سوال پر وہ بھی بری طرح چونکا تھا۔

"شاید اپنے ہوٹل چلا گیا ہوگا۔ مجھے نہیں پتا۔ وہ مجھ سے پہلے لیزا کے گھر سے نکل گیا تھا۔" آمنہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ جو اندیشے اس کے باپ کے دل میں پیدا ہو رہے تھے، وہی اس کے بھی دل میں پیدا ہونے لگے تھے۔

"سکندر ٹھیک تو تھا نا؟ وہ ٹھیک تو تھا نا؟" یکدم ہی بے چین ہو کر اس نے آمنہ کا موبائل اٹھایا۔ وہ اس پر سکندر کو کال ملانے لگا تھا۔

کال مل گئی تھی۔ بیل جا رہی تھی۔ مگر کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ شہریار خان جیسے اس کے فون اٹھانے کے انداز سے ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ کسے کال ملا رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" اس کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"سکندر کال ریسیو نہیں کر رہا۔" وہ کئی مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔

"تم اس کے ہوٹل فون کرو۔"

"بابا! فون نہیں کریں۔ ہم اس کے ہوٹل خود چلے جاتے ہیں۔" وہ باپ سے سنجیدگی سے بولا۔

"شہریار! میرا بچہ خیریت سے تو ہوگا نا؟ مجھے اس کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ وہ لیزا کے گھر سے بہت غصے میں نکلا تھا۔"

آمنہ خوف سے کانپتی، رندھی ہوئی آواز میں

بولیں۔ جو خوف آمنہ کے لبوں پر آرہا تھا وہ اس کے اور شہریار خان کے دل اور دماغ میں پھیل رہا تھا۔ سکندر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک کردینے کی فکر سے بھی زیادہ یکلخت ہی یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ وہ کہاں تھا؟ وہ خیریت سے تو تھا نا؟

☆ ☆ ☆

وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ شہریار خان اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ وہ دونوں بہت پریشان تھے۔ اس کے بھائی کی زندگی ایک بار پھر آندھیوں کی زد میں تھی اور اس کی وجہ وہ تھا۔ کل بھی سکندر کی زندگی اسی کی وجہ سے تباہ ہوئی تھی' آج بھی اس کی تباہی کا سبب وہ ہی تھا۔ اس بدکردار لڑکی سے اندھی محبت میں مبتلا ہو کر اس نے بھائی کی زندگی ہی برباد کر ڈالی تھی۔

وہ باپ بیٹا ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ اس کا بھائی اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی برسوں بعد وطن آنے پر ایک ہوٹل میں کیوں رہ رہا ہے؟ اس ہوٹل میں قدم رکھتے ہوئے یہ سوچ اسے رلا رہی تھی۔ وہ کیسا بھائی ہے۔ وہ کیسا بھائی ہے۔ ایسی نفرت تو کوئی اپنے بدترین دشمن سے بھی نہیں کرتا ہوگا' جو حسد کی آگ میں جل کر اس نے اپنے بھائی سے کی تھی۔ وہ دونوں استقبالیہ پر آگئے تھے۔

"ہمیں سکندر شہریار سے ملنا ہے۔ روم نمبر نہیں پتا' مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" استقبالیہ پر موجود اس مہذب' خوش اخلاق لڑکی سے اس نے کہا۔ چند لمحے کہیں پر چیک کرنے کے بعد جو جواب اس لڑکی نے انہیں دیا وہ اس کے اور شہریار خان کے حواس گم کردینے کے لیے کافی تھا۔

سکندر شہریار ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ وہ آج دوپہر سے کہیں گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

بے اختیار شہریار خان نے سہارے کے لیے اس کا بازو تھاما تھا۔ اس نے باپ کو سنبھال لیا تھا۔

"پاپا! سکندر ٹھیک ہوگا۔ آپ فکر مت کریں۔" وہ دونوں ہوٹل سے واپس نکل کر گاڑی میں آکر بیٹھے تو اس نے سکندر کے موبائل پر پھر کال کی۔ ایک' دو' تین نجانے کتنی مرتبہ اس نے کالز ملائی تھیں۔

"زین! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کہیں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچالے۔" اس نے اپنے بہت مضبوط باپ کو پھر ٹوٹتا دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا پاپا! آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔"

"زین! سکندر کو ڈھونڈو۔ کسی بھی طرح اسے ڈھونڈو۔ اس بار اگر ہم نے اسے کھو دیا تو دوبارہ کبھی تلاش نہیں کرپائیں گے۔ وہ یا تو خود کو کوئی نقصان پہنچا دے گا یا پھر خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کردے گا کہ ہم اسے تلاشتے رہ جائیں گے۔ اسے ڈھونڈو زین!" شہریار خان اس کے بازو کو جکڑ کر روتے ہوئے بولے۔

"پاپا! پلیز' خود کو سنبھالیں۔ آپ اس طرح کریں گے تو اموجان تو بالکل ہی حوصلہ ہار دیں گی۔" اندر ہی اندر اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔

"وہ بہت غیرت مند بیٹا ہے میرا۔ ایک بار میں نے اسے گھر سے نکالا' اس سے سب رشتے ناتے توڑ دیے تو وہ پلٹ کر پھر کبھی کوئی مدد مانگنے میرے پاس نہیں آیا۔ اس نے خود کو دنیا کے ہجوم میں گم کرلیا تھا زین! میں اسے ڈھونڈ پایا تھا' یہ میری خوش قسمتی ہے۔ مگر اب کی بار جو پھر سے اس کی عزت اور آبرو کا تماشا لگایا گیا ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میں اور تم اس بار اسے ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔ اگر اس نے خود کو کہیں گم کردیا تو۔"

وہ اپنے روتے ہوئے باپ کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں واپس گھر پہنچ چکے تھے۔ جتنے اشک بہانے تھے' جتنے خوف اور اندیشوں کا اظہار کرنا تھا' وہ شہریار خان راستے میں کرچکے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انہوں نے خود پر جبر کرکے' بہت کوشش کرکے اپنا آپ سنبھالا تھا۔

"آمنہ کو یہ مت بتانا زین! کہ سکندر ہمیں نہیں ملا ہے۔"

انہیں جیسے سکندر کے ساتھ ساتھ بیوی کی صحت کی بھی فکر تھی۔ اس نے خاموشی سے محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اندر ہی اندر اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کرتا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب سکندر کو کہاں ڈھونڈے؟ کیا وہ ایر پورٹ جائے؟ کیا وہ آج دوہا اور امریکا جانے والی فلائٹس کا پتا کرے؟

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ اسی طرح جس طرح محمود خالد اور سیم کی یہاں موجودگی کے وقت بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اسی طرح فرش پر بکھرے تھے۔ وہ بالکل ڈری اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دوپہر سے شام ہو چکی تھی' اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

وہ بالکل خالی خالی نگاہوں سے اپنے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دنیا' زندگی' رشتے' ہر شے بے معنی لگ رہی تھی۔ سیم کی نفرت کی نظریں' اس کے زہر میں بجھے الفاظ اسے اس طرح سہما گئے تھے کہ خوف کے مارے وہ رو بھی نہیں پا رہی تھی۔ اس نے ساری زندگی سیم سے محبت کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے عمر بھر اپنی حسین اور ذہین بہن پر فخر کیا تھا' اس کو ہمیشہ خود سے برتر تسلیم کیا تھا۔ اس سے بے تحاشا محبت کی تھی۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسے فیصلے کرنے کا حق دیا تھا۔ سیم اس سے جو کہتی' وہ آنکھیں بند کر کے کیے جاتی۔ سیم کہہ رہی ہے تو اسی میں اس کی بہتری ہے۔ اس لیے کہ سیم سے زیادہ تو اس کا بھلا کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔ وہ عمر بھر اپنے باپ کو اپنا دشمن سمجھتی رہی۔ اس کی اگر کوئی دوست تھی تو سیم تھی۔ اگر کسی ایک رشتے میں وہ اپنا ہر رشتہ دیکھتی تھی تو وہ اس کی پیاری بہن تھی۔ اس کی پیاری سیم تھی اور سیم کہہ رہی تھی' وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ آج سے نہیں' بلکہ ہمیشہ سے۔ وہ اسے تباہ و برباد کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس سے اس کی ساری خوشیاں چھین لینا چاہتی ہے۔

اپنی سب سے عزیز' جان سے بھی بڑھ کر پیاری بہن کا یہ بھیانک روپ وہ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ واقعی سہم گئی تھی۔ وہ اس تیرہ سال کی لیزا کی طرح ہو گئی تھی' جس سے اس کا گھر اور بہن چھینی جا رہی تھی۔ محبت' وفا' اعتبار' چاہت' بھروسا' رشتے کیا سب بے معنی ہیں؟ جان سے عزیز شخص بھی اگر قابل اعتبار نہیں تو پھر انسان اعتبار کس پر کرے؟ وہ درد کی ان انتہاؤں پر تھی کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہہ رہا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی' وہ سیم کی نفرتوں پر چلا چلا کر رونا چاہتی تھی' پر اس سے رویا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بالکل خشک تھے۔

اس کا دل بالکل بنجر و ویران ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت دنیا کا کوئی شخص یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی رشتہ یاد نہیں رہا تھا۔ یاد رہا تھا تو اتنا کہ سیم اس سے نفرت کرتی ہے۔ سیم کا وہ پیار جس پر وہ فخر کیا کرتی تھی' جھوٹ تھا۔ سیم کی نفرت وہ سہہ نہیں پا رہی تھی۔ یہ تلخ ترین سچائی وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی محبت' اس کا بھروسا' اس کا یقین بے یقین ہو رہے تھے۔ یہ درد اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ کوئی اگر اسے بتا دے کہ سیم نے جو کچھ کہا' وہ سب جھوٹ تھا یا پھر سیم ہی واپس آ جائے۔ آ کر ہنستے ہوئے اسے گلے لگا لے۔

"مجھے ایسا سمجھتی ہو تم؟ پاگل! میں تم سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کیا میں نے تمہیں ممی اور پاپا سے بھی زیادہ پیار نہیں دیا تھا؟ پھر تم میری محبت پر شک بھی کس طرح کر سکتی ہو لز؟"

پیار سے ڈانٹتے ہوئے وہ اسے گلے لگا لے۔ اسے پیار کرے۔

"سیم! آ جاؤ.... سیم! پلیز آ جاؤ۔ آ کر کہو جو تم نے ابھی کہا' وہ سب جھوٹ تھا۔ سیم! آ جاؤ۔ مجھے بے یقین ہونے سے بچا لو سیم! میں کبھی کسی رشتے پر بھروسا نہ کر پاؤں گی اگر تم نہ آئیں تو۔"

اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ چلا چلا کر سیم کو پکارے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

یہ شام کا وقت تھا اور وہ لوگوں کے ہجوم میں گم ساحل سمندر پر تھا۔ اسے اس وقت دنیا کے کسی بھی فرد سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے انتظار تھا تو لیزا کا۔ اسے انتظار تھا تو لیزا کی فون کال کا۔

"سکندر! تم کہاں ہو؟ میں تمہارے ہوٹل پہنچی ہوئی ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو۔ میں تمہارے پاس آرہی ہوں۔"

اس کے موبائل پر کالز آضرور رہی تھیں مگر وہ کالز لیزا کی نہیں تھیں۔ ایک ضد تھی اس کے اندر۔ اسے لیزا سے بات کرنی تھی' صرف ۔۔۔ لیزا سے۔ اسے لیزا کی کال ریسیو کرنی تھی۔ اسے باقی کسی سے بات نہیں کرنی۔ لیزا تو سب لوگوں جیسی نہیں ہے ناں۔ وہ تو اسے بہت چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے میٹنگ' روما اور سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس نے کہا تھا' وہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چاہے وہ اسے دکھ دے گا' مایوس کرے گا' وہ تب بھی اس کا ساتھ نبھائے گی۔ پھر آج وہ اپنے کہے لفظوں کو کیوں نبھا نہیں رہی تھی۔

اس کا دل شدت سے لیزا کی فون کال کا منتظر تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس کے اندر مایوسیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس کے دل اور دماغ میں جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔ دل کہہ رہا تھا' وہ آئے گی وہ دوسرے لوگوں جیسی نہیں۔ وہ اس کے خونی رشتوں جیسی نہیں وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی ہے۔ وہ اس پر بھروسا کرے گی۔

"سکندر! میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتی ہوں' جتنی پہلے کرتی تھی۔ سیم نے جو کچھ کہا' میں اس کے کہے کسی ایک بھی لفظ کا یقین نہیں کرتی۔ میں صرف تمہارا یقین کرتی ہوں سکندر!"

اسے شدت سے انتظار تھا' لیزا کے لبوں سے ان جملوں کو سننے کا۔ وہ اسے فون کرے اور یہ بات کہے۔ مگر اس کا دماغ اسے بتا رہا تھا۔ لیزا آزمائش کی اس گھڑی میں اس کے ساتھ نہیں کھڑی ہوگی۔ جس پل اسے اس کی محبت کا یقین شدت سے چاہیے' اس پل وہ اس کے ساتھ نہیں' بلکہ اس کے مخالف کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑی ہوگی۔ وہ جو اس پر سنگ باری کر رہے ہیں' جنہوں نے اسے زندہ در گور کیا ہے۔ لیزا ان ہی کے ساتھ کھڑی ہوگی اس کے ساتھ نہیں۔ پر لیزا تو ایسی نہیں ہے۔ وہ اسے جانتی ہے۔ وہ اسے سمجھتی ہے۔ وہ تو زندگی ہے ناں سکندر شہریار کی اور زندگی یوں تو ساتھ نہیں چھوڑ دیا کرتی۔

ایک گھنٹہ' دو گھنٹے' تین گھنٹے۔۔۔

گھڑی میں گزرتا ہر اگلا لمحہ اسے یقین دلا رہا تھا' لیزا اس کے ساتھ نہیں۔ وہ اس کے مخالف کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ لیزا کے ہاتھوں میں بھی ان تمام لوگوں کی طرح سنگ ہیں۔ اسے آنا ہوتا تو وہ کب کی آ چکی ہوتی' اسے فون کرنا ہوتا تو وہ کب کا اسے فون کر چکی ہوتی۔

کئی گھنٹے سمندر پر گزار کر وہ وہاں سے پلٹا تھا' بہت مایوس اور ناکام۔ درد سے بھری ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی تھی۔

"تم بھی دنیا کے باقی تمام لوگوں جیسی ہی ثابت ہوئیں۔ تمہاری محبت کی کمزوری پر روؤں یا اپنی حماقتوں پر جو چند روزہ التفات کو زندگی بھر کا ساتھ' ناقابل شکست اعتبار اور کبھی نہ ختم ہونے والی محبت سمجھ بیٹھا تھا۔"

وہ واپس اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر درد اور غم پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی ہی نمی بھری تھی۔

"بار بار ٹھوکر کھاتا ہوں' پھر بھی نہیں سمجھتا کہ محبت میرے لیے نہیں' خوشی میرے لیے نہیں' ہنسی میرے لیے نہیں' زندگی میرے لیے نہیں' لیزا میرے لیے نہیں۔"

اس کے اندر پھیلتی مایوسیاں غصے اور تلخی میں بدل رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ لیزا کے سامنے جائے' اور اس سے لڑے۔

"نبھا نہیں سکتی تھیں تو محبت کی کیوں تھی تم نے مجھ سے؟ اچھا بھلا زندگی کو گھسیٹ رہا تھا ناں۔ مگر اب

"...اب کیسے زندہ رہوں گا؟ بتاؤ! مجھے اب تمہارے بغیر میں کس طرح زندہ رہوں گا؟"

وہ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا' ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ عمر بھر کی سنگ باری کے بعد کیا اب بھی ریزہ ریزہ ہو کر نہ بکھرتا؟ اس کی زندگی کی آخری امید اور آخری خواب بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

"دوسروں کے دیے زخموں کے باوجود میں زندہ رہا تھا۔ مگر تمہارے دیے بے اعتباری کے زخم کے بعد اب میں زندہ کس طرح رہوں گا؟"

ایک پل اس کا دل چاہا' وہ ننھے بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روئے۔ چلا چلا کر اسے بیلا (Bella) کہہ کہہ کر پکارے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہے ناں! جب وہ اسے Bella کہتا ہے۔ اسے اس کا یہ کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ اس لفظ کی کشش سے بندھی اس کے پاس چلی آئے گی۔

اگلے پل وہ تلخی سے خود پر ہنس رہا تھا۔ خود اپنا مذاق اڑا رہا تھا۔ جسے اب کبھی نہیں آنا' وہ اس کا لاحاصل انتظار کرنا چاہتا ہے تو شوق سے کرے۔ کل خونی رشتوں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا' آج زندگی نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ اسے کہاں جانا ہے' اس نے جگہ بتا دی تھی۔ ڈرائیور سے کچھ دیر انتظار کرنے کا کہہ کر وہ اندر چلا گیا تھا۔ وہ واپس گاڑی میں آکر بیٹھا تو اس نے ڈرائیور سے اپنے ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔ آج کی باقی بچی شام اور تمام رات اسے اسی شہر میں گزارنی تھی کیونکہ اسے دوبئی کے لیے کل صبح کی فلائٹ میں سیٹ مل سکی تھی۔

اسے آج کی سیٹ مل جاتی تو وہ آج اور ابھی اس شہر سے نکل جاتا۔ اپنے ہوٹل کی طرف جاتا' وہ شہر کی رونقوں کو تلخی سے دیکھ رہا تھا۔ نکال لے گا' وہ خود کو زندگی کی تمام رونقوں سے باہر۔ کل تو وہ دوبئی جا رہا ہے مگر اب وہاں بھی نہیں ٹھہرے گا۔ وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ کسی انجان جگہ پر' جہاں اسے کوئی نہ جانتا ہو۔ ملٹی نیشنل کمپنی اور لیگل ایڈوائزر کی جاب اسے نہیں چاہیے۔ جب یہ تعلیم یہ موجودہ اسٹیٹس اس کے ماضی سے اس کا پیچھا نہیں چھڑا سکتا تو اس تماشے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ پھر سے بنجارہ بن جائے گا۔ وہ پھر سے اسمارٹ اسٹریٹ چیپس بن جائے گا۔ تلخی اور نفرت سے اپنے مستقبل کے لیے یہ سب سوچ لینے کے باوجود اس کے اندر محبت شدت سے رو رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

وہ لیگل ایڈوائزر سے واپس بنجارہ بن جائے' چیپس بن جائے یا جو کچھ بھی' مگر وہ اس کی محبت اپنے دل سے مرتے دم تک نہیں نکال سکتا۔ کیسی بات تھی محبت کے بڑے بڑے دعوے لیزا نے کیے تھے' اس نے نہیں۔ اس نے تو اس کی محبت قبول ہی بڑی مشکلوں سے کی تھی' مگر آج آکاس بیل کی طرح وہ محبت اس کے وجود سے لپٹ گئی تھی۔ اس کی سانسوں' اس کی دھڑکنوں میں بسی تھی۔ جس روز سانس رکنی تھی' اسی روز ہی یہ محبت اس کے وجود کا ساتھ چھوڑ سکتی تھی اس سے پہلے تو ہرگز نہیں۔

گاڑی اس کے ہوٹل کے سامنے آکر رک چکی تھی۔ وہ دکھ اور کرب سے ہوٹل کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔

تین روز پہلے وہ اس ہوٹل میں کتنی خوشیوں اور امنگوں کے ساتھ آکر ٹھہرا تھا۔ آج وہ مایوس اور شکست خوردہ اس میں واپس قدم رکھ رہا تھا۔ سکندر شہریار کا وجدان اسے ٹھیک بتا رہا تھا' اس کی زندگی میں کبھی بھی کچھ بھی اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی زندگی کی نحوست نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ساری دنیا کی عورتوں میں لیزا محمود کی بہن کون نکلی تھی' وہ بدکردار لڑکی؟ یہ اس کی زندگی کی نحوست ہی تو تھی۔

وہ انہونی ہو گئی تھی جس کا خوف اسے لیزا کی محبت قبول کرنے کے پہلے لمحے سے ڈرا رہا تھا۔ لیزا محمود اسے واقعی کبھی بھی نہیں ملنے والی تھی۔ اس کی بیلا اس کے لیے نہیں تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ

بونے۔ محبت کیا ایسی بے بس کر دینے والی چیز ہے کہ وہ بتیس سال کا مضبوط اور توانا مرد بلک بلک کر رونا چاہتا تھا۔

"کیوں اعتبار نہیں کیا تم نے میرا؟ کیوں ہیلا!" وہ کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔

جب سے وہ زندگی میں آئی تھی اس کے خوف ناک خوابوں اور سروائیکل پین نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر آج خوابوں سے بھی بدترین سچائی جاننے کے بعد اسے پھر سے سروائیکل پین ہونے لگا تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے سے درد کی شدید لہر اٹھ رہی تھی اور اس کے بازوؤں تک پھیل رہی تھی۔ بارہ سال پہلے زندگی ختم نہیں کی تھی۔ اسے گھسیٹا رہا تھا پر آج واقعی مر جانے کو دل کر رہا تھا۔ وہ محبتوں کے دعوے کرتی تھی اور وہ اس سے سچی محبت کر بیٹھا۔ اسے اپنی زندگی مان بیٹھا۔

وہ اس کے لیے سمورائی کی طرح بہادر تھا۔ وہ اسے پانی کی طرح طاقت ور اور گہرا لگتا تھا۔ وہ اسے لیالو سے زیادہ حسین لگتا تھا۔ اپنے دل کے بند دروازے کی چابی اس نے صرف سکندر شہریار کو دی تھی۔ وہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی تھی۔

وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی سوائے اعتبار کے۔ وہ اس پر اعتبار نہیں کرتی تھی۔ باقی سب کچھ کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے گھر واپس آ کر آمنہ کو کچھ نہیں جتایا تھا۔ یہی کہا تھا کہ سکندر اپنے ہوٹل میں ہے مگر کسی سے بھی فی الحال ملنا نہیں چاہ رہا۔ مگر وہ ماں تھیں ناں۔ ان کے دل کو خبر نہیں ہوتی تو کس کو ہوتی؟

مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

"میری سکندر سے بات کرا دیں شہریار! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نجانے کس حال میں ہے میرا بچہ۔ میں اسے فون کروں گی۔ وہ میرا فون ضرور اٹھائے گا۔ بہت پیار کرتا ہے وہ مجھ سے۔" وہ روتے ہوئے شہریار خان کی منت کر رہی تھیں۔

"آمنہ! وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں تمہاری اس سے بات کرا دوں گا۔"

وہ ماں باپ کی بے بسی دیکھ رہا تھا۔ زارو قطار روتی آمنہ ان سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ وہ مسلسل سکندر کا موبائل نمبر ملا رہا تھا۔ کبھی اپنے فون سے، کبھی ماں کے فون سے، کبھی باپ کے فون سے، کبھی گھر کے لینڈ لائن نمبر سے۔

نوریہ بھی وہاں آ گئی تھی۔ وہ بھی آمنہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ ہوا کیا تھا' یہ اسے پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اسے صرف اتنا پتا تھا کہ "آج آمنہ لیزا کے گھر اس کا رشتہ مانگنے گئی تھیں۔ وہاں کیا ہوا' یہ نوریہ کو نہیں پتا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ نہ اس سے کچھ پوچھ پا رہی تھی نہ شہریار خان سے۔

جب نوریہ سے سامنا ہو گا' اسے سچائی پتا چلے گی تو وہ اس سے کیا کہے گا؟ یہ کہ بارہ سال قبل اس نے ایک بدکردار لڑکی سے محبت کی تھی اور کل شام سے پہلے تک اس محبت کو دل سے لگائے بیٹھا تھا؟ وہ کس کس کو جواب دہ تھا... کس کس کو۔

"پاپا! اموجان کو بخار ہو رہا ہے۔"

نوریہ جو آمنہ کے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔ چائے پلانے کے لیے ان کے پاس بیٹھی تو ان کی پیشانی چھوتے ہوئے فوراً بولی۔ فون ملاتا زین گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ابھی بھی زارو قطار رو رہی تھیں۔ انہوں نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔

"اموجان! چائے پی کر دوا لے لیں۔ آپ کو بخار ہو رہا ہے۔" وہ بے اختیار ماں کے پاس آیا۔ ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ ماں کے پیروں پر تھے۔

"جب تک میں سکندر سے نہیں مل لیتی' کچھ نہیں کھاؤں گی۔ مجھے میرے بیٹے سے ملوا دیں۔ آپ لوگوں کی سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی؟ ماں کا دل غلط نہیں کہتا۔ ماں کا دل کبھی غلط نہیں کہتا۔ وہ کھو

جائے گا مجھ سے۔ وہ ایک بار پھر کھو جائے گا مجھ سے۔"

انہوں نے غصے سے چلاتے ہوئے بات شروع کی تھی مگر جملے کے آخر میں آکر ان کی آواز آنسوؤں اور آہوں میں بدل گئی۔

"سکندر! فون اٹھالو۔ اموجان کی خاطر ہی فون اٹھالو۔" اس کے دل نے بڑی شدتوں سے بھائی کو پکارا تھا۔ سکندر کو کال ملانے کے ساتھ ساتھ وہ آج رات میں اور کل دن بھر میں دوہا اور امریکا جانے والی فلائٹس کا بھی پتا کر رہا تھا۔ فون بھی کر رہا تھا اور لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ کے ذریعے بھی معلومات لے رہا تھا فلائٹس کے متعلق۔

لیپ ٹاپ پر وہ کل صبح دوہا جانے والی ایک فلائٹ کے بارے میں معلومات لے رہا تھا اور ساتھ ہی آمنہ کے موبائل سے ایک مرتبہ پھر سکندر کو کال ملا رہا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے دوسری جانب سکندر کی آواز سنی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے بولنے کے لیے لب کھولنے چاہے۔ مگر اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ وہ اس سے کیا کہے اور کیسے؟ وہ فون ہاتھ میں لے کر دوڑتا ہوا باپ کے پاس آیا۔ اس نے فون انہیں تھمایا۔

"سکندر!" اس نے دبی آواز میں کہا۔ آمنہ نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔ آمنہ نے شہریار خان کے ہاتھوں سے لپک کر فون لینا چاہا مگر وہ چاہتا تھا اس کے پاپا بات کریں۔ اموجان روتی رہیں گی فون پر۔ شہریار خان فوراً" بات کر کے یہ پتا لگائیں گے کہ وہ ہے کہاں۔ شہریار خان بھی شاید یہی چاہتے تھے' اس لیے بجائے آمنہ کو فون دینے کے وہ بیڈ پر سے اٹھ گئے۔ آمنہ فوراً" اٹھنا چاہ رہی تھیں۔ اس نے ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے شانے کے گرد ہاتھ رکھا۔ وہ آنکھوں میں محبت لیے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"اموجان! میں سکندر کو آپ کے پاس واپس لاؤں گا' وعدہ کر رہا ہوں۔ آپ اس وقت پاپا کو اس سے بات کرنے دیں۔"

اس نے اپنی روتی ہوئی بیمار ماں کو گلے سے لگالیا۔ چند گھنٹوں میں وہ شدید بیمار نظر آنے لگی تھیں۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔

"سکندر بیٹا! تم کہاں پر ہو؟"

شہریار خان گھبرائے ہوئے سے انداز میں فوراً" بولے تھے' جیسے انہیں خوف تھا کہ کہیں سکندر فون بند نہ کر دے۔

"میں تمہارے پاس آرہا ہوں بیٹا! میرا انتظار کرنا۔ پلیز! میرا انتظار کرنا۔"

اس نے اپنے باپ کے چہرے پر سکندر کے پھر کھو نہ جانے کا خوف اور پریشانی دیکھی۔ انہوں نے مزید کچھ کہے بغیر فوراً" ہی فون بند کر دیا تھا۔

"زین! آؤ میرے ساتھ۔ سکندر اپنے ہوٹل میں ہے۔"

وہ بولتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔ وہ نوریہ کو یہ اشارہ کرتا کہ وہ اموجان کا خیال رکھے' باپ کے پیچھے بھاگا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک بار پھر وہ دونوں ہوٹل جا رہے تھے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ شہریار خان اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔ بہت پریشان' بہت فکر مند۔ گاڑی چلاتا وہ گاہے گاہے باپ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر وہ بہت بوڑھے اور کمزور نظر آنے لگے تھے۔ وہ باپ کی آنکھوں سے چھلکتا درد اور خوف پوری شدتوں سے محسوس کر رہا تھا۔

رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ جب وہ ہوٹل پہنچے۔ اس کے قدم سکندر کے کمرے کی جانب اٹھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ اس کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس کے کانوں میں خود اپنی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"پاپا! میں آج یا تو اس کی جان لے لوں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔ میں اس ذلیل' بے غیرت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

چلتے چلتے وہ رک گیا تھا۔ اس کی نظریں اپنے دونوں

ہاتھوں پر تھیں۔ ان ہاتھوں سے اس نے بڑے بھائی کو مارا تھا اور وہ جواب میں خاموشی سے صرف خود کو بچاتا رہا تھا۔ اس نے بدلے میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

"تمہارا انتخاب درست نہیں ہے زین! کیسے سمجھاؤں تمہیں.... مریم کسی بھی طرح تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔"

بھائی کی محبت بھری صدائیں تھیں اور جواب میں اس کی نفرت سے پھنکارتی آوازیں۔

شہریار خان لفٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے مڑ کر اسے تعجب سے دیکھا۔

"کیا ہوا زین! جلدی آؤ۔"

باپ کے پکارنے پر وہ چونکا۔ وہ فوراً" تیزی سے چلتا ان کے پیچھے لفٹ میں گھسا تھا۔ لفٹ سے نکل کر وہ دونوں سکندر کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سکندر سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ مگر کیسے مانگ پائے گا؟ کسی کی پوری زندگی تباہ کر دو اور پھر معافی مانگ لو۔ کیا آج اس کی معافی سکندر کو اس کی زندگی کے گزرے قیمتی ترین بارہ سال لوٹا سکتی ہے.... ؟ اس کے خواب لوٹا سکتی ہے؟ آج اس کی معافی کھوکھلے لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی۔

سکندر نے دستک پر دروازہ کھولا۔

وہ اسے شہریار خان کے ساتھ وہاں دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے ان دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس کا چہرہ ایسا بے تاثر اور سرد سا تھا' جیسے وہ خوش ہونے' دکھی ہونے' حیران ہونے یا کسی بھی طرح کے جذبات کو محسوس کرنا ہی بھول چکا تھا۔

زین شہریار اس کے پاس آیا تھا' وہ حیران نہیں تھا۔ زین شہریار ساری زندگی اس کے پاس نہ آتا۔ اسے غم نہیں ہوتا۔

اندر داخل ہوتے ہی زین کا دل دھک سے رہ گیا۔ بیڈ پر سکندر کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ ارد گرد اس کے کپڑے اور دیگر سامان یوں بکھرا تھا گویا وہ ان لوگوں کے آنے سے قبل اپنی پیکنگ کا کام کر رہا تھا۔ اس نے شہریار خان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اندر آتے ہی سوٹ کیس دیکھ چکے تھے۔ ان کے چہرے پر بے تحاشا خوف آگیا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو سکندر؟" انہوں نے پریشانی سے فوراً" پوچھا۔

"دوبئی.... میں کل صبح کی فلائٹ سے دوبارہ واپس جا رہا ہوں۔ آفس میں تھوڑا ارجنٹ کام آگیا ہے۔"

وہ بے حد سنجیدگی سے انتہائی غیر جذباتی انداز میں بولا۔ جیسے آج جو کچھ ہوا تھا' اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ جیسے برسوں سے اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچ رہی ہے۔

"تم واپس جا رہے ہو؟" شہریار خان کا لہجہ ان کی پریشانی' خوف اور دکھ کو ظاہر کر رہا تھا۔ اب کی بار یہ بیٹا دور گیا تو پھر کبھی نہیں ملے گا۔ ان کے چہرے پر خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ تینوں کھڑے ہوئے تھے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ سکندر اسے بالکل بھی نہیں دیکھ رہا۔ بے تاثر اور غیر جذباتی سے انداز میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے' وہ صرف باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف ان ہی سے مخاطب تھا۔

"اتنی جلدی مت جاؤ سکندر! میں سب ٹھیک کر رہا ہوں۔ ایک دن تو اور رک جاؤ۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔"

شہریار خان بہت آہستہ آواز میں شکستہ لہجے میں بولے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان کی تمام تر توانائیاں سلب ہو گئی تھیں۔ وہ گھر پر جس مضبوطی سے بول رہے تھے' جس مضبوطی سے انہوں نے محمود خالد سے فون پر بات کی تھی اور پھر جس امید کے ساتھ یہاں آئے تھے سب کچھ یک لخت ہی ناامیدی اور مایوسی میں ڈھل گیا تھا۔ سکندر کو جانے کی تیاری کرتا دیکھ کر جیسے ان کے اندر ساری امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔

"آفس میں ضروری کام نہ ہوتا تو رک جاتا۔"

سکندر اسی غیر جذباتی انداز میں بولا تھا۔ جیسے شہریار

خان کے جملے کا مفہوم اس نے سمجھا ہی نہیں تھا۔ اسے جیسے اب کسی بھی چیز کے ٹھیک ہو جانے یا مکمل طور پر بگڑ جانے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ان سب سے اتنا دور جا چکا تھا کہ اب اپنی تکلیف اور دکھ کا ان کے سامنے اظہار تک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ آج جو کچھ لیزا کے گھر پر ہوا' اس نے اسے توڑ پھوڑ کر نہیں رکھ دیا ہو گا؟ اپنے اندر کی شکست و ریخت وہ ان دونوں سے چھپا رہا تھا اور وہ ٹھیک ہی تو کر رہا تھا' جن کی وجہ سے اس نے سب کچھ کھویا تھا کیا ان ہی کے گلے لگ کر اس سب کچھ۔۔۔ کھو جانے کا ماتم کرتا؟ آنسو بہاتا؟

وہ سکندر کے سرد اور سپاٹ چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آئی نمی کے سبب سکندر اسے دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس کا یہ بھائی ایسا تو نہ تھا۔ کبھی یہ بہت محبت کرنے والا' محبتوں کا بہت مان رکھنے والا' جن سے محبت کرتا تھا' ان کی بہت پروا کرنے والا تھا۔

اس کی نفرتوں کو سہنے کے باوجود بھی وہ آخری وقت تک اسے ام مریم کی مکاریوں سے بچانے کی کوششیں کرتا رہا تھا' محض اس کی محبت میں۔ آج سکندر کو خود سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑا دیکھ کر اسے اپنا وہ محبتوں سے سرشار پیارا بھائی بہت یاد آ رہا تھا۔

"شکر ! تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین !"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

"امو جان سے کہیے گا پریشان نہ ہوں۔ میں جانے سے پہلے ان سے فون پر بات کر کے جاؤں گا۔ صبح آٹھ بجے ہے میری فلائٹ۔"

وہ اسی غیر جذباتی اور فاصلہ لیے انداز میں شہریار خان سے مزید بولا تھا۔ وہ موجودہ طوفان' جس میں اس کی زندگی گھری تھی' اس پر وہ ان دونوں سے ایک لفظ بھی بولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا!" شہریار خان نے سکندر کو دکھ سے دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

"میری ہمدردی کی آڑ میں آئندہ اگر تم نے امو جان سے ام مریم اور میرے رشتے کے خلاف کچھ کہا تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

اس کا دل درد سے پھٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ کوئی اپنے خون' اپنے بھائی سے ایسی نفرت بھی کر سکتا ہے؟

"زین! میں نے تم سے کہا تھا ناں' یہ لڑکی تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔ یہ ایک بدکردار لڑکی ہے۔"

اس کا بھائی شرم اور غیرت کے سبب پوری بات واضح لفظوں میں اسے بتا نہیں پا رہا تھا۔ مگر وہ اسے اس بدکردار لڑکی سے بچا لینا چاہتا تھا اور وہ' بجائے رک کر بھائی کی بات سننے کے اس کی آنکھوں میں جھلکتے کرب کو نظر انداز کر کے اسے مارنے لگا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ اسے بری طرح مار رہا تھا اور وہ صرف خود کو بچا رہا تھا۔ جواب میں اسے مار نہیں رہا تھا۔ وہ چھوٹے بھائی سے پٹ رہا تھا پر جواب میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا۔

وہ یکدم ہی رو پڑا۔ وہ آگے بڑھا اور سکندر کے سامنے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ شہریار خان اور سکندر دونوں اس کی اس حرکت پر حیرت سے ساکت رہ گئے۔

"سکندر! مجھے مارو۔ پلیز! مجھے مارو۔ جیسے میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا' آج تم بھی مجھے اسی طرح مارو۔ مجھے مارو سکندر! میں بھائی کہلانے کے لائق نہیں۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تمہیں مجھ جیسا حاسد اور کم ظرف بھائی ملا۔"

وہ سکندر کے پاؤں پکڑ کر زارو قطار رو رہا تھا۔ ایک پل کی حیرانی کے بعد سکندر نے فوراً" پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے پاؤں چھڑانا چاہتا تھا' مگر وہ اسے ایسا کرنے نہیں دے رہا تھا۔

"زین! اٹھو۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟" سکندر اس کی طرف جھکا۔ اس نے پوری قوت استعمال کر کے اس کے ہاتھ اپنے پیروں پر سے ہٹائے اور اسے بازوؤں سے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔

سکندر کے سامنے کھڑا زاروقطار رو رہا تھا۔ شہریار خان ان دونوں کے نزدیک کھڑے تھے۔ مگریوں جیسے ان میں کچھ بھی بولنے کی سکت نہ ہو۔

"کیا پچھتا ہے زین؟" اس نے روتے ہوئے سکندر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ ناراضی تھی نہ غصہ اور نہ ہی نفرت۔ اس کی آنکھیں لخطہ بے تاثر تھیں۔

"مجھ حاسد اور کم ظرف کو معاف کردو سکندر! ساری زندگی تم سے مقابلہ کرنے کے سوا میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرے حسد نے تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا۔ تمہارے خواب، تمہاری خوشیاں، تمہارا کیریئر، تمہارا گھر۔"

"تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے زین! میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ جو کچھ ہوا، وہ میرے نصیب میں لکھا تھا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ وہ ان سب سے اتنے فاصلے پر جاچکا تھا کہ وہ اس کی معافی بھی سننے کو آمادہ نہیں تھا۔ وہ نہ جذباتی ہوا تھا، نہ اس کی آنکھوں میں نمی آئی تھی، نہ آواز بھرائی تھی، نہ لہجہ تلخ یا شیریں ہوا تھا۔ وہ اس بہت فاصلہ لیے ہوئے سپاٹ سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کا بھائی نہیں تھا، ایک انجان شخص تھا، جس کے ساتھ ناراضی ظاہر کرنا، غصہ کرنا یا جذباتی ہونا سکندر شہریار پسند نہیں کر رہا تھا۔

شہریار خان کی آنکھوں میں بے بسی اور اشک تھے۔ وہ بھی اسی کی طرح بے بسی اور دکھ سے سکندر کو خود سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑا دیکھ رہے تھے۔ اس نے آستین سے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے۔ لہجے کو ہموار کیا اور سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری زندگی میں سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے سکندر! مگر میں اب کی بار کچھ برا نہیں ہونے دوں گا۔ میں لیزا کو واپس لاؤں گا سکندر!"

سکندر کے غیر جذباتی انداز نے اس کے آنسوؤں کو روک دیا تھا۔ ہاں! اس کا لہجہ رندھا ہوا ضرور تھا۔ سکندر کے بے تاثر چہرے پر یکدم ہی بہت سختی اور کھردراپن آیا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے زین! تمہیں کسی کو بھی واپس لانے کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔ صفائیاں دے کر لاساتھ اور وضاحتیں پیش کرکے ملی محبت مجھے ہرگز نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں سے میری درخواست ہے ایسا کچھ مت کیجیے گا۔"

ایسی سختی، ایسا فیصلہ کن انداز، ایسا اٹل لہجہ تھا سکندر کا کہ وہ تو وہ، شہریار خان بھی اسے سمجھانے یا قائل کرنے کی ہمت نہیں کر پائے تھے۔ وہاں مزید رکنا اور کچھ بھی کہنا سننا بے سود تھا۔ سکندر ان سب سے اتنی دوری پر جاچکا تھا کہ ان کی آوازیں اس کے کانوں تک تو ضرور پہنچ رہی تھیں، مگر دل پر دستک نہیں دے سکی تھیں۔ وہ سکندر سے بات کرسکتے ہیں، اسے چھو سکتے ہیں، اسے دیکھ سکتے ہیں، مگر وہ اس کے پاس نہیں جاسکتے۔ وہ ان کے پاس ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس نہ تھا۔ وہ معافیوں، شرمندگیوں اور ندامتوں کے اظہار سے بہت پرے جاچکا تھا۔

اس نے دور جانے میں جلدی نہ کی تھی۔ انہوں نے اس تک آنے میں بہت دیر کردی تھی۔ اتنی دیر کہ اب وہ اپنے دل کے دروازے کسی کے لیے بھی کھولنے کو آمادہ نہیں تھا۔ بہت مایوس، بہت ناکام، بہت دل شکستہ وہ باپ بیٹا گھر لوٹ آئے۔

☆ ☆ ☆

گھر واپس آتے ہی آمنہ کی حالت دیکھ کر ان دونوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ بیڈ پر ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی تھیں۔ نومرہ انہیں ہوش میں لانے کے جتن کر رہی تھی۔

"سکندر بھائی کو پکارے جارہی تھیں امو جان۔ کبھی آپ کو اور زین کو آوازیں دے رہی تھیں کہ سکندر کو واپس لے آؤ۔ ان کو پکارتے پکارتے ہی بے ہوش ہوگئیں۔"

گھبرائی گھبرائی سی نومرہ شہریار خان کو بتارہی تھی۔ اس نے دوڑ کر ڈاکٹر کو فون کیا۔ آمنہ کا بخار پہلے سے

بھی زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر اس کا خود کو کوڑے مارنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ماں کو بارہ برسوں بعد اس کا بچھڑا ہوا بیٹا واپس ملا تھا اور وہ اس سے پھر کھو جانے والا تھا۔ ڈاکٹر آکر جا چکا تھا۔ آمنہ اب ہوش میں تھیں۔ نمیرہ بھی کچھ کم تو ہو گیا تھا مگر رو مسلسل رہی تھیں۔ وہ کسی کے بھی بہلانے سے چپ نہیں ہو رہی تھیں۔

وہ ابھی اپنے اس بھائی سے مل کر آیا تھا' جس کی زندگی اس نے تباہ کی تھی۔ وہ اب اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جس کے دل کو زخم اس نے لگائے تھے۔ مگر کیا وہ اکیلا مجرم ہے۔ سکندر اور امو جان کا؟ وہ بدکردار لڑکی بھی تو اس کے بھائی اور ماں' باپ کی مجرم ہے۔ اس کے اندر ایک جنون سا بھرنے لگا۔ اس کے بھائی اور ماں کی اس حالت کی ذمہ دار وہ لڑکی بھی تو ہے۔ روتی ہوئی ماں کو دیکھتا وہ یکدم ہی جنونی سے انداز میں کمرے سے نکلا۔ وہ لاؤنج میں شہریار خان کے پاس جا رہا تھا۔

شہریار خان کچھ دیر قبل کمرے سے چلے گئے تھے' یوں جیسے آمنہ کا تڑپ تڑپ کر رونا ان سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد سے وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ ہاشم بھی گھر میں ہی موجود تھا' مگر اس کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں تھا۔ ملازمہ نے اسے بتایا تھا کہ ہاشم نے اس سے پانی منگوایا تھا۔ وہ نیند کی گولی کھا کر سو گیا ہے۔ اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ اسے فی الحال ہاشم کا بالکل بھی خیال نہیں آ رہا تھا۔ وہ کمرے میں لباس تبدیل کرنے گئی تو اس نے ہاشم کو گہری نیند سوتا پایا تھا۔ اس وقت اسے لیزا اور سکندر کا بھی خیال نہیں آ رہا تھا۔ ہاشم سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ درحقیقت اسے اس وقت کوئی بھی یاد نہیں تھا سوائے اپنے پاپا کے۔

وہ مسلسل اپنے پاپا کو سوچ رہی تھی۔ پاپا اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ کیا کرے۔ آخر وہ کیا کرے۔

اس نے بے چین ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اگر سب کچھ پتا تھا۔ انہیں سب کچھ شروع سے پتا تھا۔ وہ ماضی کی ہر بات جانتے تھے۔ اس کے دل کی بے چینی اور بے کلی پھر بڑھ گئی تھی۔

نہیں' نہیں پاپا اسے چھوڑیں گے تھوڑا ہی۔ وہ بس یونہی خفا ہو گئے ہیں۔ ماں' باپ وقتی طور پر خفا ہو جائیں' مگر اولاد کو چھوڑ تھوڑا ہی دیتے ہیں۔ اور پاپا اسے' اپنی ام مریم کو کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ وہ ان سے معافی مانگے گی۔ وہ پاپا کے پاؤں پکڑ لے گی۔ وہ انہیں منا لے گی۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لے گی۔ جس وقت اس سے وہ تمام غلطیاں ہوئیں' وہ بہت چھوٹی تھی۔ پھر اس وقت پاپا اس سے بہت دور ایک دوسرے ملک میں رہتے تھے۔ اسے صحیح اور غلط سمجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے وہ لیزا سے بھی معافی مانگ لے گی۔

پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے اب کی بار وہ خود کو واقعی تبدیل کر لے گی۔ وہ پوری وفاداری سے ہاشم کی ہو جائے گی۔ وہ اب جلد سے جلد ماں بننے کی کوشش کرے گی۔

پاپا جب اپنے نواسے یا نواسی کو گود میں لیں گے تو ان کا دل خود بخود ہی اس کے لیے بھی گداز ہو جائے گا۔ بس! اب اسے جلد سے جلد ماں بن جانا چاہیے تاکہ پاپا کا دل اس کے لیے پھر سے نرم ہو جائے اور ہاشم کے دل میں بھی اگر آج کی باتوں سے کچھ بدگمانی آئی ہے تو اسے اپنے بچے کی ماں بنتے دیکھ کر وہ اسی طرح اس کا دیوانہ رہے جیسے ابھی ہے۔ وہ سب ٹھیک کر لے گی۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گی۔ دوسرے رشتے طعنے دیتے ہیں۔ ماں باپ تھوڑا ہی ایسا کرتے ہیں۔ پاپا اگر سب جانتے بھی ہیں تو کیا ہوا۔ وہ پھر سے کبھی وہ سب دہرائیں گے بھی نہیں۔ وہ اسے اس کی گھر گرہستی سنبھالتا دیکھیں گے۔ اسے اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ہنسی خوشی بستے دیکھیں گے تو ساری ناراضی اور کدورت دل سے مٹا دیں گے۔

"بیگم صاحبہ! آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے

ان کے ملازم نے اسے آکر اطلاع دی۔ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

"کون ہے؟ تم نے نام نہیں پوچھا؟" گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے تعجب سے پوچھا۔ رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ اس وقت کون آیا تھا؟

"زین شہریار نام بتا رہے ہیں۔"

"زین شہریار؟" وہ بری طرح حیران ہوئی۔ اگر آج وہ سکندر شہریار سے لیزا کے ہونے والے شوہر کے روپ میں نہ ملی ہوتی تو اس وقت اسے سوچنا پڑتا کہ کون زین شہریار؟ مگر اب اسے معلوم تھا کہ یہ کون تھا

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آتی ہوں۔"

ملازم سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کیوں آیا تھا کیا چاہتا تھا۔ بہرحال اسے زین سے کسی بھی طرح کا کوئی ڈر یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی ہچکچاہٹ یا جھجک محسوس کیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ جیسے اس کے آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ بارہ سال بعد سامنا ہو رہا تھا۔ تب وہ انیس سال کا کم عمر لڑکا تھا۔ اب اکتیس سال کا مرد۔

"کیسے ہو زین؟" اندر آنے کے بعد اس نے پرسکون سے انداز میں کہا۔

"بیٹھو!" وہ مسکرا کر بولی۔ زین اسے خونی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تمہارے بابا کے گھر پر آج جو تماشا ہوا' وہ تم نے کیوں کیا تھا؟ ایک بار سکندر کی زندگی اجاڑ دی تھی کیا وہ کافی نہیں تھا تمہارے لیے؟" وہ تنفر سے بولا۔

"میں نے کسی کی زندگی نہیں اجاڑی۔ تمہارے بھائی نے جو کچھ بارہ سال پہلے میرے ساتھ کیا تھا میں نے وہ سب کے سامنے بیان کیا ہے۔" وہ نڈر اور بے خوف ہو کر بولی۔

"بکواس بند کرو مریم! کم از کم میرے سامنے اب پارسائی کا ڈھونگ مت کرنا۔ میں تمہاری ساری سچائی جانتا ہوں۔ شرم آتی ہے مجھے خود پر کہ تم جیسی بیچ لڑکی سے میں نے محبت کی تھی اور اس محبت کو اب تک دل سے لگائے بیٹھا تھا۔ سکندر ٹھیک کہتا تھا' تم طوائفوں سے بھی بدتر ہو۔ ان کا بھی شاید کوئی کردار ہوتا ہو گا۔ تمہارا تو کوئی کردار......"

"شٹ اپ زین! جسٹ شٹ اپ۔ میرے ہی گھر پر کھڑے ہو کر مجھے گالیاں دینے والے تم ہوتے کون ہو؟" سخت لب و لہجے میں اس نے زین کی بات کاٹی۔

"میں کون ہوں؟ کیا تم نہیں جانتیں' میں کون ہوں؟ میں وہ احمق ہوں' جسے تم نے محبت کا نام لے کر خوب بے وقوف بنایا۔ جس نے تمہاری محبت میں پاگل ہو کر اپنے سگے بھائی سے قطع تعلق کر لیا۔ جو وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کے ہوتے ہوئے آج تک تمہیں یاد کیا کرتا تھا۔"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اپنے بھائی کو چھوڑ دو۔ نہ ہی میں نے تم سے یہ فرمائش کی تھی کہ میری محبت کو دل سے لگائے رکھنا۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولی۔ "یہ احمق تو آج بھی احمق ہی تھا۔"

"میں تمہاری ساری سچائی جانتا ہوں' تمہیں کیا اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے یا تم اتنی بیچ اور بے شرم ہو کہ......"

"زین شہریار! تم میرے لیے نہ تو کل اتنے اہم تھے کہ میں تمہیں سوچتی نہ ہی آج مجھے اس بات سے کوئی فرق پڑ رہا ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرائی۔ وہ بے خوفی سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔

"تمہیں کوئی فرق پڑنا بھی نہیں چاہیے ام مریم! جو لڑکی اپنی ماں کا گھر اجاڑ سکتی ہے' اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ پر ناجائز تعلقات قائم کر سکتی ہے' اس کا بچہ اپنی کوکھ میں پال سکتی ہے' اپنے باپ سے

ساری عمر جھوٹ بول سکتی ہے، اپنی بہن کی خوشیوں کو اجاڑ سکتی ہے۔ اسے زین شہریار کو دھوکا دیتے ذرا سی بھی شرمندگی نہیں ہونی چاہیے۔ اسے زین سے منگنی کرنے کے بعد اس کے بڑے بھائی کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ جو لڑکی اپنے ماں، باپ اور بہن کی خوشیوں کو اجاڑ سکتی ہے، اس کے لیے کسی کی بھی زندگی تباہ کرنا معمولی بات ہونی چاہیے۔" وہ اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بہت تلخی سے بول رہا تھا۔

ایک دم ہی اس نے دیکھا کہ زین ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف کسی کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کی اس طرف پشت تھی۔ وہ بے اختیار مڑی۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہاشم کھڑا تھا۔

ہاشم؟ لیکن ہاشم تو سلیپنگ پلز لے کر سو چکا تھا۔ وہ خود کمرے میں دیکھ کر آئی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ سلیپنگ پلز لینے کے بعد تو وہ اگلی صبح سے پہلے بیدار نہیں ہوا کرتا تھا۔

"ہاشم!" اس کے لبوں سے بے آواز نکلا۔

پیروں کے نیچے سے زمین نکلنا کیا ہوتا ہے، یہ اسے زندگی میں پہلی بار اس لمحے سمجھ میں آیا تھا۔

"ہاشم! یہ سکندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ پاپا نے اس کے ساتھ میری منگنی کروائی تھی، جب میں امریکا میں گریجویشن کر رہی تھی۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے جلدی سے کہا۔ بوکھلاہٹ میں اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا بولے۔

زین اور ہاشم ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ہاشم کے چہرے پر وہ کوئی بھی تاثر پڑھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

"مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی جیسا روایتی جملہ نہیں بول سکوں گا ہاشم صاحب! کیونکہ مجھے آپ سے مل کر ـــــ ہمدردی ہو رہی ہے۔ آپ پر ترس آ رہا ہے۔ میں نے اس لڑکی کی محبت میں بے وقوف بن کر اس سے صرف منگنی ہی کی تھی، آپ نے تو بے وقوفی کی حد کرتے ہوئے اسے اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ آپ کو سادہ کہوں یا اعلا ظرف، جو آپ نے ایک بدکردار عورت کو گھر میں بسا رکھا ہے؟ بہرحال! میں چلتا ہوں۔ میں یہاں اسے صرف یہ وارننگ دینے آیا تھا کہ اب کی بار یہ میرے بھائی کی خوشیوں کے راستے میں آئی یا اس نے سکندر اور لیزا کی شادی رکوانے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گا مگر اس بار میں اسے سکندر کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گا۔"

زین اسے نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سب کہتے ہی واپس گھوما اور وہ بہت تیز قدموں سے ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ اس نے بوکھلا کر ہاشم کی طرف دیکھا۔

"ہاشم! یہ بکواس کر رہا تھا۔ میں نے اس سے منگنی توڑ دی تھی۔ اس بات کی جلن اور غصہ نکالنے کو یہ یہاں آیا تھا، تاکہ تمہارا دل مجھ سے خراب کروا سکے۔"

وہ تیزی سے ـــ ہاشم کے پاس آئی۔ اس نے ہاشم کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ کوشش کر کے مسکرائی۔ ہر بازی الٹ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کرے۔

ہاشم نے بغیر کچھ کہے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹایا تھا۔ بڑی سختی کے ساتھ ... اور بغیر کچھ بھی کہے ڈرائنگ روم سے جانے لگا۔

"ہاشم! میری بات سنو۔ تم اس انجان آدمی کا جس سے تم زندگی میں پہلی بار ملے ہو، اعتبار کرو گے میرا نہیں؟ زین مجھ سے جل گیا ہے ہاشم! وہ میری خوش گوار شادی شدہ زندگی کو دیکھ کر جیلس ہو گیا ہے۔"

وہ دوڑتی ہوئی ہاشم کے پیچھے ڈرائنگ روم سے نکلی۔

ہاشم نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی سخت اور سرد نگاہیں اسے یہ وارننگ دے رہی تھیں کہ خبردار! میرے پیچھے مزید ایک قدم بھی مت آنا۔ وہ ٹھٹک کر ڈر کر اپنی جگہ پر رک گئی تھی۔ ہاشم تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے اپنے

ہے میں جا رہا تھا۔

اس کے ماتھے پر اور ہتھیلیوں پر پسینہ آرہا تھا۔ پہلے اس کے پاپا اور اب ہاشم.... ایک ہی دن میں یہ کیا ہو گیا تھا؟

زندگی میں پہلی بار وہ خود کو بند گلی میں کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اسے مات ہو جانے کا خوف لاحق ہوا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اسے سب کچھ ہار جانے کا اندیشہ در پیش ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ مریم کے گھر سے نکل گیا۔ فوراً ہی وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اس نے ایک جنونی سی کیفیت میں آناً فاناً مریم کے گھر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سکندر سب کچھ چھوڑ کر واپس جا رہا ہے' اس کی ماں اسے جاتا دیکھ کر تڑپ تڑپ کر رو رہی ہے اور جو وجہ ہے آج کے اس سارے واقعہ اور سارے ہنگامے کی وہ سکون سے اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔

اسے سکندر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک کرنا ہے مگر اس سے بھی پہلے مریم سے حساب صاف کرنا ہے۔

اسے یہ دھمکی دینی ہے کہ اب وہ سکندر کی زندگی میں آئی' اس کی خوشیوں کے راستے میں آئی تو وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ اس نے اسی وقت شہریار خان سے مریم کے شوہر کے گھر کا پتا معلوم کیا تھا۔ وہ مریم کے شوہر کو سرسری سا جانتے تھے۔ گھر کا پتا ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ اسے کہیں سے بھی پتا معلوم کر کے دے سکتے تھے مگر اس کی آنکھوں میں پھیلا جنون دیکھ کر جیسے وہ چاہتے تھے کہ وہ مریم سے نہ ملے۔

"چھوڑو وہ ام مریم کو اس کے حال پر زین! اب اس کے پاس جانے' اسے کچھ کہنے سننے کا کیا فائدہ ہے۔" انہوں نے دکھ بھرے انداز میں اس سے کہا تھا۔

"پاپا! میں اسے چھوڑ دیتا' معاف بھی کر دیتا' اگر بات صرف میری ذات کی ہوتی۔ سکندر کا بہت قرض ہے مجھ پر پاپا! اموجان کا بہت قرض ہے۔ مجھے یہ قرض چکانے ایک بار تو ام مریم کے پاس جانا ہی ہوگا۔"

کیا وہ اپنے بھائی کی زندگی کی بربادی کا' اپنی ماں کی موجودہ حالت کا' اپنے گھر کے بکھرے شیرازے کا' اپنے گھر سے روٹھی خوشیوں کا' ان میں سے کسی ایک بھی چیز کا اس بدکردار لڑکی سے حساب نہیں مانگے؟

اس کا اٹل اور دو ٹوک انداز دیکھ کر شہریار خان نے اپنے کسی کاروباری دوست سے ہاشم اسد کا پتا لے کر اسے دیا تھا۔

وہ اس کے پیچھے پورچ تک آئے تھے' اسے یہ سمجھانے کہ وہ جنون میں آکر کوئی غلط قدم نہ اٹھائے۔

"آپ فکر مت کریں پاپا! زندگی میں پہلی بار میں درست کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں وہ کر رہا ہوں جو آپ کے بیٹے اور سکندر کے بھائی کو کرنا چاہیے۔" اس نے ان سے سنجیدگی سے کہا تھا اور گھر سے نکل گیا تھا۔

اور اب جبکہ وہ مریم سے مل آیا تھا۔ اسے بے عزت بھی کیا تھا' اسے دھمکایا بھی تھا تب اس کے گھر سے نکلنے کے بعد اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ اس کے گھر جا کر' اسے سامنے کھڑا دیکھ کر اس کے اندر ام مریم کے لیے نفرتیں ہی نفرتیں تھیں۔ وہ اسے خونی نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا' جیسے بس نہ چل رہا ہو اسے جان سے مار ڈالے۔ مگر اب.... اس نے گاڑی ایک سڑک کے کنارے پر روک دی۔

بارہ سال پہلے اس نے اس لڑکی سے والہانہ محبت کی تھی۔ پچھلے بارہ برسوں سے وہ اس کی محبت دل کے نہاں خانوں میں چھپائے بیٹھا تھا۔ مگر اس سے مل کر ابھی ابھی اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ ام مریم نے اس سے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی محبت نہیں کی تھی وہ اسے دھوکا دینے پر ذرا بھی شرمسار نہ تھی۔ اپنی محبت کی اس تذلیل اور رسوائی پر اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

اس کے سچے اور کھرے جذبوں کا اس لڑکی نے کس بے رحمی سے مذاق اڑایا تھا۔ ام مریم اس کی محبت کیا' اس کی نفرت کے بھی لائق نہیں تھی۔ وہ

اس کی اتنی انمول چاہتیں اور محبتیں پانے کی مستحق ہی نہیں تھی۔

اس کے دل کے کہیں بہت اندر ایک درد پھیل رہا تھا۔ محبت کی رسوائی، محبت کی توہین پر، محبت کے جھوٹا ہونے پر اور محبت کے آج بھی دل میں موجود ہونے پر۔ ہاں! یہ سچ تھا، وہ اس بدکردار اور جھوٹی لڑکی سے آج بھی محبت کرتا تھا۔ اس محبت پر وہ خود سے بھی شرمسار تھا، خفا تھا، مگر وہ اسے دل سے نکال نہیں سکتا تھا۔ وہ اب باقی ساری عمر ام مریم سے نفرت کرے گا۔ ایسی نفرت جس کے اندر درد، ذلت، نارسائی اور کرب شامل ہوگا۔

ام مریم نے محبت کا نام لے کر اس کے ساتھ کھیلا تھا، مگر وہ تو حقیقت میں اس سے محبت کر بیٹھا تھا۔ جب محبت اتنی سچی تھی تو دل سے کیونکر نکل سکتی تھی۔

اسے اپنے اور مریم کے لاس اینجلس میں گزارے وقت کے مختلف مناظر یاد آرہے تھے۔ اس کی وہ محبت، وہ ساتھ، وہ باتیں کیا سب کچھ جھوٹ تھا؟

کیا ام مریم نے تب بھی ایک لمحے کے لیے بھی اس سے محبت نہیں کی تھی؟ اس سچائی کو تسلیم کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

وہ تو آج بھی اتنا ہی بے وقوف اور احمق تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اپنے دل سے اس لڑکی کی محبت نکال کر پھینک نہیں پا رہا تھا۔ وہ دنیا کے سامنے، ام مریم کے سامنے چیخ چیخ کر نفرت کا اعلان کرے گا۔ مگر دل کے اندر سے اسے کبھی بھی نکال نہیں سکے گا۔

اسے گاڑی اس طرح سڑک کے کنارے روکے کافی دیر گزر گئی تھی۔ نجانے کس چیز کی آواز سے وہ چونکا تھا۔ شاید کوئی گاڑی اس کی گاڑی کے پاس سے گزری تھی۔ وہ ایک دم ہی چونک کر سیدھا ہوا۔ اسے سکندر کا اور اپنی ماں کا خیال آیا تھا۔

آج کی رات محبت کا سوگ منانے کی رات تو نہ تھی۔ آج کی رات تو بہت اہم تھی۔ آج رات بھر میں اسے سب کچھ ٹھیک کر دینا تھا، تاکہ کل صبح سکندر واپس نہ جا سکے۔ سکندر ان سب میں سے کسی کے بھی روکنے سے نہیں رک رہا تھا، مگر وہ لیزا کے روکنے سے تو رکے گا ناں؟

گھر سے نکلتے ہوئے وہ یہی سوچ کر آیا تھا کہ پہلے مریم کے گھر جائے گا اور پھر لیزا سے ملے گا۔ اس نے وقت کی پروا نہیں کی تھی۔ اس نے گاڑی محمود خالہ کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

☼ ☼ ☼

رات کے تین بج رہے تھے۔ ہر سو خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں اسی طرح اسی انداز میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ محمود خالہ اور مریم کے جانے کے بعد سے اس نے اپنا بیٹھنے کا انداز تک تبدیل نہیں کیا تھا۔

اس نے ابھی تک وہی لباس پہنا ہوا تھا، جو سکندر اور اس کی امو جان کی آمد کے وقت پہن رکھا تھا۔ وہی میک اپ، وہی جیولری۔ زندگی میں یکدم ہی ایسا طوفان آیا تھا، جس نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ اس نے سیم کی نفرت کے سوا باقی ہر بات بھلا دی تھی۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ سیم اس سے نفرت کرتی ہے باقی کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ سکندر بھی نہیں، اپنے پاپا بھی نہیں۔ سیم نے آج اپنے اور سکندر کے رشتے کے حوالے سے، جو کچھ کہا، وہ اس پر بھی کچھ نہیں سوچ پائی تھی۔

جب ڈرائنگ روم میں سب کے سامنے سیم نے سکندر پر الزامات لگائے، تب وہ حیران پریشان ہوئی تھی۔ وہ فوری طور پر اس صورت حال اور ان تمام باتوں کو بالکل بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ بس اتنا سمجھ میں آیا تھا کہ سیم اور سکندر ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے اور ماضی میں جس بھی حوالے سے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے، آج ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے۔

اس وقت صورت حال ایک دم ہی ایسی عجیب

فریب اور ہنگامی وحادثاتی سی ہوگئی تھی کہ وہ نہ تو کچھ بول پائی تھی نہ کچھ سوچ سمجھ پائی تھی۔

پھر جب وہ شاید اس صورت حال کو سوچ اور سمجھ کر سکندر سے فون پر بات کر پاتی تب نسیم اس کے پاس اس کے کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ نسیم کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ سکندر ایسا تھا ہی نہیں۔ وہ نسیم سے نرمی سے سکندر کی حمایت میں بولی تو اس نے روتے ہوئے مزید سکندر کے خلاف بولنا شروع کردیا۔

وہ اس وقت تک نسیم کو بالکل بھی غلط نہیں سمجھ رہی تھی۔ مگر اس نے ایک پل کے لیے بھی سکندر کو بھی غلط نہیں سمجھا تھا۔ وہ نسیم کے سکندر پر سنگین الزامات کو محض الزامات ہی سمجھ رہی تھی۔ یقیناً "نسیم کو کوئی غلط فہمی ہوگئی تھی۔

وہ نسیم کو سمجھانا چاہتی تھی کہ سکندر بہت اچھا اور باکردار انسان ہے۔ وہ نسیم کے ساتھ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نسیم اس سارے واقعہ کو دوبارہ سوچے گی اسے اندازہ ہوجائے گا کہ اسے کوئی سنگین نوعیت کی غلط فہمی ہوئی تھی سکندر کے متعلق۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ سکندر کی حمایت میں نسیم سے مزید کچھ کہہ پاتی محمود خالد وہاں آگئے۔

وہاں آکر جو کچھ انہوں نے کہا اور اس کے جواب میں جو کچھ نسیم نے کہا اس نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔ اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کردیا تھا۔ جسے آپ ساری زندگی دوسرے ہر رشتے سے بڑھ کر اپنا سمجھتے ہیں، جس میں آپ اپنا ہر رشتہ دیکھتے رہیں، جس کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ جب دنیا کا کوئی ایک فرد بھی میرے ساتھ کھڑا نہیں ہوگا، تب یہ ایک رشتہ میرے ساتھ موجود ہوگا۔ ایک دن اچانک ہی آپ کو اس رشتے کے بارے میں پتا چلے ... وہ جھوٹ تھا، فریب تھا، وہ بے تحاشا نفرتیں دراصل بے حساب نفرتیں تھیں اور یہ جتائے بھی آپ کو خود وہی رشتہ، وہی شخص تو اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ناممکن نظر آنے لگتا ہے۔

پچھلے کئی گھنٹوں میں نسیم کی نفرتوں کو سوچنے کے سوا اس نے کوئی بھی اور بات نہیں سوچی تھی۔ وہ کسی ننھی سی بچی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔

وہ اعتبار، بھروسا، یقین سب کچھ کھو رہی تھی، خود پر دنیا پر، لوگوں پر، رشتوں پر، محبتوں پر۔ اگر نسیم کی محبت جھوٹ ہو سکتی ہے تو پھر دنیا کی ہر محبت اور ہر رشتہ جھوٹا ہو سکتا ہے۔ پھر دنیا ہی جھوٹی ہو سکتی ہے۔

"کلثوم بیٹا! اب تک اسی طرح بیٹھی ہو؟"

اس نے محمود خالد کی آواز سنی۔ وہ کمرے میں کب داخل ہوئے اسے پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے خالی خالی نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ جیسے اس کے دل کی حالت سمجھ رہے تھے۔ فرش پر بکھرے کانچ سے بچتے ہوئے وہ اس کے برابر میں صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔

"بابا! نسیم مجھ سے نفرت کس طرح کر سکتی ہے؟"

اس نے کسی ننھے بچے کی طرح ضدی لہجے میں پوچھا۔

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہے کلثوم! بدی کے جس راستے پر وہ چل پڑی ہے، اس پر اسے ہر غلط، صحیح نظر آنے لگا ہے۔ وہ صحیح اور غلط، نیکی اور بدی میں تمیز بھول بیٹھی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ سیدھے راستے پر پلٹ آئے۔ اس نے بہت سے لوگوں کے دل دکھائے ہیں، بہت سی زندگیاں برباد کی ہیں۔ میں بہت ڈرتا ہوں کہیں اللہ اس کی گرفت نہ کرلے۔ وہ توبہ کرلے، وہ سیدھے راستے پر پلٹ آئے۔ تم بھی بہن کے لیے یہی دعا مانگو کلثوم! کسی گرفت، کسی پکڑ سے پہلے وہ توبہ کرلے۔ اولاد ہے وہ میری۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچا تو میں کیسے سہہ پاؤں گا؟" بولتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی۔

وہ اپنے بابا کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جو آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

"بابا! آپ سب کچھ جانتے تھے۔ آپ نے مجھے کبھی کچھ کیوں نہیں بتایا؟ میں ہمیشہ آپ کو برا سمجھتی رہی، آپ کو غلط سمجھتی رہی۔"

باپ کو نگاہوں کے سامنے دیکھ کر اسے یاد آیا تھا کہ اگر نسیم بہت سے لوگوں کی مجرم ہے تو وہ بھی تو اپنے باپ کی مجرم ہے۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے محض اپنے

باپ کو سزا دینے کے لیے اذیت دینے کے لیے لان سے
ملی تک نہیں تھی۔

"بیٹا! تم مجھ سے ذہنی اور جذباتی طور پر بہت دور تھیں۔ تم مریم سے بہت قریب تھیں۔ تھوڑا دور میں نے کیا تھا تمہیں خود سے۔ مکمل طور پر دور مریم نے کروا دیا۔ تم اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھیں۔ تم مجھ سے اس حد تک متنفر تھیں کہ اگر میں کبھی تمہیں سچائی بتانے کی کوشش کرتا تو تم مجھ سے لڑ پڑتیں۔ پچھلے پانچ سالوں سے تم سے محض فون کی حد تک میرا رابطہ تھا۔ وہ فون کالز جو میں کرتا تھا اور تم انہیں بے زاری سے ریسیو کرتی تھیں۔ تم مختصر اور اکھڑی اکھڑی بات کرتی تھیں مجھ سے۔ تم مکمل طور پر مریم کے زیر اثر تھیں۔ تمہیں مریم کے متعلق کچھ بھی بتانے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا تمہارا اعتبار پانا۔ تم مجھ پر اعتماد اور اعتبار کرتیں تب ہی تو میری باتوں کا تمہیں یقین بھی آتا۔ بولتے ہوئے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مگر مریم نے تمہارا دل اور ذہن میرے خلاف اس حد تک کر رکھا تھا کہ بارہا مجھے خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اس کے کہنے میں آ کر صرف مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے تم کسی غلط آدمی سے شادی نہ کر لو۔ ذرا سوچو کلثوم! اگر تمہارے پاکستان، یہاں میرے پاس آنے سے پہلے میں تمہیں فون کر کے یہی تمام باتیں بتاتا، جو آج میں نے کہی ہیں تو تب کیا تم میرا یقین کرتیں؟ تم یہی سوچتیں کہ ان باتوں کے پیچھے میری کوئی سازش ہے۔ میں تم دونوں بہنوں کو دور کروانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہن ہے میری کیا کہوں مگر مریم کا سازشی ذہن بہت خطرناک منصوبہ ساز ہے۔ میں تمہیں اس کے خطرناک عزائم سے بچانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ مگر تمہارے مستقبل کی بہت فکر تھی بیٹا! مریم تمہاری زندگی برباد کر دینے تک سے دریغ نہ کرتی اور تم اسے اپنا سب سے سچا رشتہ اور عزیز از جان بہن سمجھتے ہوئے مکمل طور پر اس کے زیر اثر خود کو تباہ کر ڈالتیں۔ اس نے جیسے کوئی اسم پڑھ کر پھونک رکھا تھا تم پر۔ وہ کہتی دن ہے۔۔۔ تم کہتیں دن ہے۔ وہ کہتی رات ہے۔۔۔ تم کہتیں رات ہے۔ ایسے میں، میں کوئی ڈائریکٹ اور صاف صاف بات تم سے کیسے کر سکتا تھا کلثوم!"

باپ کی ہر بات حرف بہ حرف سچ تھی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر آج سیم نے خود اپنے منہ سے اس سے نفرت کا اظہار اور اس کی زندگی کی تباہی کی خواہش کا اعتراف نہ کیا ہوتا تو اس کے پاپا ہی کیا، وہ دنیا کے دوسرے کسی بھی اور فرد کے کہنے پر اس کی خود سے نفرت کا یقین نہ کرتی۔

"مجھے معاف کر دیں پاپا! میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

صرف پچھلے پانچ سال ہی تو نہیں، اس سے پہلے جب وہ لندن میں ساتھ رہتے تھے تب بھی اس نے ہمیشہ ہر وہ کام کیا تھا، جس سے باپ نے اسے منع کیا تھا۔ کچھ اور کیا، اپنا نام تک۔ وہ ام کلثوم نہیں علیزا محمود تھی۔ اس نے باپ کے دل کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ محمود خالد نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

"نہیں میری جان! تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر مجھ برا سمجھتی تھیں تو تمہارے بچپن میں، میں نے خود کو تمہارے سامنے بہت لاپروا اور بہت غیر ذمہ دار باپ کے طور پر ہی پیش کیا تھا۔ میں تمہیں وہ توجہ اور پیار کبھی نہ دے سکا تھا، جو میں نے مریم کو دیا تھا۔ تم مجھ سے یونہی دور نہیں ہو گئی تھیں۔ میں نے بھی تمہاری پروا نہیں کی تھی۔ ایک بیٹی کو آنکھوں کا تارا بنا کر میں دوسری کو بھول ہی بیٹھا تھا۔"

وہ باپ کے کندھے پر سر رکھ کر بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ اسے پتا تھا اس کے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے چونک کر اس کا سر اپنے کندھے پر سے اٹھایا۔

"باہر زین آیا ہوا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"زین؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ زین ان کے گھر؟ اتنی رات گئے؟

"کافی دیر ہو گئی اسے آئے ہوئے۔ کافی دیر میری اس کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی ہے۔ بہت کچھ واضح ہو گیا اس سے باتیں کر کے۔ بہت سی الجھی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اب وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ جا کر اس سے مل لو۔ میں نے بہت کہا اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔ مگر وہ کہہ رہا ہے۔ اسے لان میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔"

بابا کے کہنے پر وہ فوراً صوفے سے اٹھی۔

"کلثوم!" اسے محمود خالد نے پیچھے سے پکارا۔ وہ مڑی۔

"جو فیصلہ بھی کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔" وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

"کون سا فیصلہ بابا؟"

"اپنے اور سکندر کے مستقبل کا۔" وہ گزری شام اور رات سکندر کو بھولی رہی تھی۔ اسے ایک پل کے لیے بھی اس کا دھیان نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کا خیال نہ آنے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا کہ وہ اور سکندر الگ ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہے محبت اور رشتوں پر اس کا یقین متزلزل ہوا تھا، مگر سکندر کی محبت اس کے دل میں اسی آب و تاب سے موجود تھی۔

"بابا! میرا مستقبل کل بھی سکندر کے ساتھ وابستہ تھا آج بھی اس کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔"

اس نے باپ کے لبوں پر طمانیت اور سرشاری سے بھری مسکراہٹ آتے دیکھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی کمرے سے نکل گئی۔

وہ لان میں آئی۔ لان میں فقط ایک بلب جل رہا تھا، اس لیے اسے زین فوری طور پر اندھیرے میں نظر نہیں آسکا تھا۔ جب اس مدھم روشنی سے اس کی آنکھیں مانوس ہوئیں تو اسے زین سیڑھیوں پر بیٹھا نظر آیا۔ لان سے بھی سیڑھیاں فرسٹ فلور پر جاتی تھیں۔

"یہیں آجاؤ لیزا!" وہ اس سے مدھم آواز میں بولا۔

وہ آہستگی سے چلتی اسی اسٹیپ پر زین سے قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

زین اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اس کے لیے ایک بھائی اور دوست والی محبت اور نرمی چھلک رہی تھی۔

"جو الزامات مریم آج دوپہر سکندر پر لگا کر گئی تھی میں نے ان سب کے جھوٹا ہونے کا انکل کو بتایا ہے۔ میں تمہیں بھی تفصیل سے وہ سارا واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیوں زین؟"

"تاکہ تمہیں سکندر کا اعتبار آسکے۔ تاکہ تم اسے چھوڑنے کی بات سوچو بھی نہیں۔" وہ اس کی حیرت کے جواب میں سنجیدگی سے بولا۔

"مگر میں سکندر کو چھوڑ کب رہی ہوں؟" وہ متعجب سے انداز میں بولی۔

"چھوڑ نہیں رہیں مگر تم اس کے پاس بھی تو نہیں گئیں لیزا! نہ تم اس کے پاس گئیں نہ اسے فون کیا۔ تم نے کسی بھی طرح اسے یہ یقین نہیں دلایا کہ تم مریم کا نہیں اس کا اعتبار کرتی ہو۔"

زین کے لفظوں نے اسے یکلخت ہی سکندر کے لیے فکر مند کر دیا۔ سکندر کہاں تھا؟ وہ ٹھیک تو تھا؟ آج دوپہر کے بعد سے اب اس وقت پہلی مرتبہ اس نے مکمل توجہ کے ساتھ سکندر کو سوچا۔ زین بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم تو اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ پھر تم ہم لوگوں جیسی کیسے ہو گئیں؟ سکندر سے محبت کی تھی تو اس کا اعتبار بھی تو کرنا تھا ناں لیزا۔ جو ہم سب نے اس کے ساتھ کیا، تم تو وہ مت کرو۔" زین کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔

"مجھے سکندر کا اعتبار ہے زین! میں اس کا اعتبار کیوں نہیں کروں گی؟"

بولتے ہوئے اسے سکندر بڑی شدتوں سے یاد آیا۔

وہ کہاں تھا؟ وہ خیریت سے تو تھا ناں؟ اسے سکندر کی محرومیاں، اس کے دکھ، اس کے خوف سب یاد آگئے تھے۔ وہ اس کا ساتھ قبول کرتے ہوئے کس قدر ڈرا تھا۔ اس کی محبت چھن جانے کا کیسا ایک انجانا سا خوف اسے اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا تھا۔ وہ دکھوں کو خود میں سموئے اپنا داغ داغ دل لیے کس قدر تنہا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ کتنے بھیانک کھیل کھیلے تھے۔ وہ رشتوں اور محبتوں سے کس قدر خوف زدہ رہا کرتا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے کس طرح ڈر کر چپ ہو جایا کرتا تھا، جیسے اسے زندگی سے یہ خوف ہو کہ زندگی کو اس کا ہنسنا گوارا نہ ہو گا۔ زندگی ابھی آکر اس کی مسکان چھین لے گی۔

"تم صاف کیوں نہیں کہتے سکندر شہریار! کہ تم رشتے بناتے ہوئے ڈرتے ہو۔" اس کے کانوں میں اپنی غصے سے چلاتی آواز گونجی۔

"ہاں ڈرتا ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں۔ رشتے نبھانے کی اہلیت گنوا چکا ہوں۔" اس کے کانوں میں سکندر کی دکھ بھری آواز گونجی۔

"کیوں خود کو کانٹوں پر گھسیٹ رہی ہو؟ تمہیں میرے ساتھ میں کانٹوں بھرے راستے کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔" وہ اس کی ضد سے ہار مانتا اس سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تھوڑا وقت دینا لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چلا ہوں۔ میں تمہاری پسند کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بس! تم مجھ سے مایوس مت ہو جانا۔ مجھے تھوڑی رعایت، تھوڑی گنجائش دیتی رہنا۔" پھر سکندر نے بڑے دکھ کے ساتھ اس سے التجا کی تھی۔

"پلیز! مجھے کبھی چھوڑنا نہیں۔ مجھے سب نے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے رشتوں نے اور زندگی نے صرف نفرتیں دی ہیں۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا، اگر تم مجھ سے دور ہو گئیں تو میں زندہ کس طرح رہ پاؤں گا؟"

سکندر کا دکھ بھرا وہ لہجہ اس وقت اسے رلا رہا تھا۔ زین اس کی خاموشی کو نجانے کیا سمجھا تھا۔ وہ اسے بارہ سال قبل گزرے اس واقعہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی باتیں مکمل توجہ سے سن بھی نہیں پا رہی تھی۔ اسے تو سکندر کے خوف، خدشے، اندیشے اور ان کے جواب میں اپنے وعدے یاد آنے لگے تھے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ کل دوپہر سے اب تک اسے سکندر کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ کیا وہ نہیں جانتی سکندر رشتوں کا ڈسا ہوا ہے؟ اس کے بہت اعتبار دلانے پر وہ اس کے ساتھ رشتہ جوڑ پایا تھا۔

آج سیم کو اس کی بہن کے روپ میں دیکھ کر سیم کی الزام تراشیاں سننے کے بعد اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی؟

کیا وہ منتظر نہیں رہا ہو گا اس کا کہ وہ اس کے پاس آئے گی اور آکر کہے گی۔

"سکندر! سیم سمیت دنیا کا کوئی بھی فرد تمہارے متعلق کچھ بھی کہے، مجھے اس کا نہیں صرف اور صرف تمہارا اعتبار ہے۔"

اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ کل دوپہر سے اب تک اسے سکندر کے کسی دکھ کا خیال نہیں آیا تھا۔ اب آرہا تھا۔

وہ سکندر کی زندگی کے نہ ختم ہونے والے دکھوں کو سوچ رہی تھی۔ آخر زندگی کو اس پر رحم کیوں نہیں آتا؟ عمر بھر کی تنہائیوں اور دکھوں کے بعد اسے اس کی محبت ملی۔ وہ ابھی پل بھر کے لیے ہی خوش ہوا تھا کہ زندگی نے یہ بدصورت سچائی اس کے سامنے لا کر کھڑی کر دی کہ لیزا اس ام مریم کی سگی بہن ہے جو اس کی زندگی کی تباہی کی ذمہ دار ہے۔ اسے زندگی میں پہلی بار سیم کی بہن ہونے پر شرم آئی، ندامت ہوئی۔

"پتا نہیں کیوں ایک ڈر سا ہے میرے اندر، کچھ برا ہو جانے کا۔ جب تک تمہیں سمجھا رہا تھا۔ تب تک خود کو بھی سمجھا لیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ مگر اب تمہارے لیے میرا دل ضدی بچے کا سا ہو رہا ہے۔ اب مجھے اپنی زندگی میں لیزا محمود چاہیے۔"

اس شخص کو اس نے بے حساب چاہا تھا۔ بے

بے حساب محبت کی تھی اس سے۔ پھر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ اس کے غم پر رو نہ پڑتی؟ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ زین اسے خود میں کھویا اور بہتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنوز اسے اپنا، سکندر کا اور سیم کا ماضی بتا رہا تھا۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسے کچھ بھی نہ بتائے۔ کچھ بھی جانے بغیر بھی اسے سکندر پر اعتبار ہے۔

"پتا ہے لیزا! آج میری انکل کے ساتھ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں گیا تو اس لیے تھا کہ انہیں اور تمہیں مریم کی سچائی بتا سکوں، تم دونوں پر سکندر کی بے گناہی ثابت کر سکوں۔ مگر انکل نے یہ انکشاف کر کے مجھے حیران کر دیا کہ وہ مریم کی تمام تر بد صورت سچائیوں سے آگاہ ہیں۔"

اس واقعہ کی تفصیلات سنانے کے ساتھ ساتھ زین نے یہ بھی بتایا تھا کہ بارہ سال اس نے سیم کی باتوں پر اندھا اعتبار اس لیے کر لیا تھا کہ سکندر کے خلاف غبار تو اس کے دل میں برسوں سے جمع ہو رہا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی ذہین بھائی سے حسد اور نفرت کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جب اس کی زندگی میں سیم نہیں آئی تھی۔ بولتے بولتے وہ رک گیا۔ وہ دکھ سے بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"انکل نے مجھ سے تمہارے اور مریم کے بارے میں بہت سی باتیں شیئر کی ہیں۔ میں نے ان کی باتوں کو سننے کے بعد تمہارے بارے میں بہت سوچا لیزا!"

وہ زین کی طرف دیکھ ضرور رہی تھی مگر اس کا ذہن و دل سکندر ہی میں الجھا تھا۔

"تم میں اور مجھ میں بڑی عجیب اور حیرت انگیز مماثلت ہے لیزا! تمہاری ایک سال بڑی بہن جو زندگی کے ہر میدان میں تم سے آگے تھی۔ ہائی اچیور (high achiever) تھی اور میرا ایک سال بڑا بھائی جس سے میں ہر لحاظ سے پیچھے تھا۔

ہم دونوں ہی نے اپنے اپنے بھائی اور بہن کی اس برتری کو بڑے عجیب اور ابنارمل انداز میں لیا۔

میں نے اپنے بھائی سے حسد اور مقابلہ بازی شروع کر دی۔ اس سے جیت نہ پایا تو اس سے نفرت دل میں بٹھا لی اور تم نے اپنی بہن کو خود سے اتنا برتر اور عظیم تسلیم کر لیا کہ زندگی بھر جو کچھ وہ تم سے کہتی رہی تم آنکھیں بند کر کے کرتی رہیں۔ وہ تمہیں تباہی کے دہانے تک لے جانا چاہتی تھی اور تم آنکھیں بند کر کے اسے برتر مان کر اس کے پیچھے چلی جا رہی تھیں۔"

زین کی باتوں میں کچھ ایسی سچائی تھی کہ وہ اس کے لفظ لفظ توجہ سے سننے پر مجبور ہو گئی۔ وہ سیم کو خود سے برتر، خود سے بہتر اور اعلا مان کر اس کی ہر بات مانا کرتی تھی، یہ کوئی اسے پہلی بار بتا رہا تھا۔

"کاش! ہم دونوں ہی نے اپنے ہائی اچیور بھائی اور بہن کے غیر معمولی ہونے کو نارمل انداز میں لیا ہوتا تو آج ہماری زندگیاں بہت مختلف ہوتیں۔" زین کے لہجے میں بہت دکھ بہت پچھتاوے تھے۔

وہ زین کی آنکھوں میں پھیلے غم کو سمجھ رہی تھی۔ زین کی آنکھیں۔ جو اس سے کہہ رہی تھیں کہ کاش! اس نے اور زین نے وہ نہ کیا ہوتا جو انہوں نے کیا۔ کاش! ان دونوں نے اپنے برتر اور غیر معمولی ذہین بھائی اور بہن کی برتری کو اس انداز میں نہ لیا ہوتا جیسے انہوں نے لیا۔ زین نے سکندر کو اپنا دشمن اور حریف سمجھ لیا اور اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سیم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس پر اس حد تک انحصار کرنے لگی کہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ بھی خود کر لینے کی اہلیت گنوا بیٹھی۔

"میں تم سے یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں لیزا! کہ میرا اور تمہارا غم اور پچھتاوے کسی حد تک ایک جیسے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم میری باتوں کو سمجھ رہی ہو گی۔ میرا بھائی مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے لیزا۔ مجھے میرا بھائی ڈھونڈ کر واپس لا دو۔ میں اسے واپس لا نہیں پا رہا میں اسے واپس لانا چاہتا ہوں، اس کے گلے لگنا چاہتا ہوں، اس سے بہت پیار کرتا ہوں اسے یہ جتانا چاہتا ہوں۔ میری مدد کر دو لیزا! پلیز میری مدد کر دو۔" بولتے بولتے زین کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

آگئے۔ وہ انہیں بہنے سے روک رہا تھا۔

"سکندر کہاں ہے؟" اس نے اپنے آنسو زین سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"وہ واپس جارہا ہے لیزا۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا؟"

"ہم میں سے کوئی بھی اسے روک نہیں پارہا۔ یہ کام صرف تم کرسکتی ہو۔ اسے روک لو لیزا۔ اسے یہ سوچنے پہ مجبور نہ کرو کہ اس سے محبت کرنے والا ہر فرد اسے دکھ دے گا۔ اسے چھوڑ دے گا۔" زین کی آنکھوں سے دو آنسو گرے تھے۔

"اسے روک لو لیزا! وہ جا نہیں جارہا' وہ زندگی سے دور جارہا ہے اور اب کی بار وہ گیا تو تم سمیت ہم میں سے کوئی بھی اسے واپس زندگی کی طرف نہیں لا پائے گا۔"

وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ وہ سکندر کے جانے کی بات سن کر رونا بھول گئی تھی۔

"پر میں نے اسے چھوڑا کب ہے زین! میں سکندر کے ساتھ کل بھی تھی' آج بھی ہوں۔ مجھے اتنی رعایت تو ملنی چاہیے کہ کل جس لڑکی کو یہاں دیکھ کر سکندر یہاں سے غصے میں فوراً" چلا گیا تھا' وہ میری سگی بہن تھی۔ وہ بہن جو میرے لیے میرے ماں' باپ سے بھی بڑھ کر تھی۔" وہ غصے' ناراضی اور بے بسی سے بولی۔

"سکندر مجھ سے ملے بغیر' مجھ سے بات کیے بغیر جا رہا تھا۔ اتنی بے اعتباری؟ محبت کی تھی تو اعتبار بھی تو کرتا لیزا محمود پر۔

لیزا کو زندگی کہتا تھا تو زندگی کے بنا یہاں سے کیسے جا سکتا تھا؟"

زین بے اختیار طمانیت بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔

"اس کا مطلب ہے تم سکندر سے بدگمان نہیں ہو؟"

"میں اس سے کیوں بدگمان ہوں گی زین! میں نے اس سے محبت کی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ عمر بھر کا ناتا جوڑا ہے۔ بس! میں پریشان ہو گئی تھی' بوکھلا گئی تھی۔ مگر سکندر سے بے اعتبار تو میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہوئی تھی۔"

زین نگاہوں میں پیار اور احترام لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر کو روک لو لیزا! اسے اپنا ساتھ دے دو۔ اسے اتنا پیار دو کہ وہ گزرے ماہ و سال کی تمام محرومیاں اور غم بھول جائے۔"

وہ زین کی آنکھوں میں سکندر کے لیے محبت دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کے پانچ بج رہے تھے' جب وہ زین کے ساتھ سکندر کے ہوٹل جارہی تھی۔ اس کی فلائٹ صبح آٹھ بجے تھی تو ابھی تو وہ ہوٹل ہی میں ہوگا۔ کل دوپہر وہ اس کے گھر سے گیا تھا۔ اور آج صبح وہ اس کے پاس جا رہی تھی۔ یہ بہت وقت تھا۔ اس عرصے میں بہت سارے گھنٹے گزر چکے تھے۔

وہ اتنے بہت سارے گھنٹوں میں اس کے پاس نہیں گئی تھی۔ اسے کوئی فون کال تک نہیں کی تھی۔ سکندر کی اس سے خفگی اور بدگمانی جائز تھی۔ پر ارادتاً" تو اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیا اگر وہ سکندر سے یہ کہے گی کہ اس نے کل ایک لمحے کے لیے بھی سکندر پر شک نہیں کیا تھا تو وہ اس کا یقین کرے گا؟ یا پھر سمجھے گا کہ زین اسے سب سچائیاں بتا کر' منا کر اس کے پاس لایا ہے؟

سکندر کو اس پر اعتبار کرنا چاہیے۔ اسے اس کی حالت کو بھی تو سوچنا چاہیے۔ کل وہ خود ایک بہت بڑے طوفان کی زد میں آگئی تھی۔

وہ عمر بھر جس بہن پر آنکھیں بند کر کے اندھا بھروسا کرتی آئی تھی' جس کے بتائے ہر راستے پر آنکھیں بند کر کے چلتی آئی تھی۔ جس کی بتائی ہر بات

مانتی آئی تھی۔ اک ہی پل میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ بہت چاہنے والی بہن اسے جس راستے پر چلاتی رہی تھی اس کا اختتام ایک گہری کھائی پر جاکر ہوتا تھا۔ تو کیا اتنے بڑے دل دہلا دینے والے انکشاف کے بعد وہ نارمل رہ سکتی تھی۔

سکندر کو اسے اتنی رعایت' اتنی گنجائش تو دینی ہی پڑے گی کہ بہن کی بھیانک سچائی دیکھ کر اس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔ سکندر شہریار علیزا کو اپنی زندگی کہتا ہے۔ اگر لیزا محمود واقعی اس کی زندگی ہے تو پھر زندگی کو اس طرح اتنی آسانی سے کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟

وہ دونوں ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ زین نے گاڑی ہوٹل سے باہر سڑک پر ہی روک دی۔

"تم جاؤ! وہ چیزوں کو بہت منفی انداز میں سوچنے لگا ہے۔ مجھے دیکھے گا تو سمجھے گا' تمہیں میں لے کر آیا ہوں۔"

تو زین بھی راستے بھر وہی سوچتا آیا تھا جو وہ سوچتی رہی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا اور اندر چلی آئی۔ وہ ریسپشن پر آئی۔ اس نے سکندر شہریار کا روم نمبر بتا کر کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے انفارم کردیا جائے۔

"سوری میم! وہ تو چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔"

ریسپشن پر کھڑی خوش پوش و خوش شکل لڑکی نے اسے معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھا۔

"کب؟" اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ کیا اس نے دیر کردی تھی؟ کیا اس نے واقعی بہت دیر کر دی تھی؟

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" ایک ہلکی پیشہ ورانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اسے بتایا۔ اور وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے ہٹ گئی تھی' پلٹ گئی تھی۔ وہ واپس باہر جارہی تھی۔ اس کا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔

"اللہ! اسے مجھ سے دور مت کرنا۔ اسے مجھ سے کھونے مت دینا۔ اسے کھو کر میں کیسے جی پاؤں گی؟"

وہ بے آواز اللہ کو پکار رہی تھی' بڑی شدتوں سے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ ہوٹل کے اندر پارکنگ ہی میں کھڑا تھا۔ کیب ڈرائیور اس کا سوٹ کیس اور بیگ وغیرہ کیب کی ڈکی میں رکھ رہا تھا۔ وہ خود وہاں خاموشی سے کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی نکل چکا ہوتا' مگر کیب کا ٹائر پنکچر ہوجانے کی وجہ سے اسے یہاں مزید رکنا پڑ گیا تھا۔ ٹائر بدلنے کے بعد اب کیب ڈرائیور اس کا سامان کیب میں رکھ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اور بالکل گم صم سا کھڑا تھا۔ وہ یہاں اکیلا نہیں آیا تھا' پر وہ یہاں سے اکیلا واپس ضرور جارہا تھا۔

"تم مجھے آج فون کرکے کہتے' لیزا! کسی بھی طرح کل کی فلائٹ سے دبئی آجاؤ۔ پرسوں ہمیں کراچی جانا ہے۔ میں تم سے بغیر کچھ پوچھے چل پڑتی۔ تمہارے سپرد میں نے اپنی پوری زندگی کردی ہے سکندر!"

کسی کے بڑے یقین سے کہے جملے اس کی سماعتوں میں گونجے۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔ وہ کیب میں بیٹھنے کے لیے ایک قدم آگے بڑھا۔

"تمہیں جتنا جاننا میرے لیے ضروری ہے' میں تمہیں اتنا جانتی ہوں سکندر! میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ بیٹھا یہ شخص ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔"

سماعتوں میں گونجتے یہ جملے اس کے اندر تلخیاں ہی تلخیاں بھر رہے تھے۔ محبت کا نام لینا کتنا آسان ہوتا ہے مگر اسے نبھانا کس قدر دشوار۔ اس نے کیب کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ اندر بیٹھنے کے لیے اپنا قدم اٹھارہا تھا۔

"سکندر!" اسے یوں لگا' لیزا نے اسے پیچھے سے پکارا تھا۔ یوں جیسے وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آرہی تھی۔

وہ مڑا نہیں۔ جانتا تھا یہ آواز اس کا واہمہ ہے۔ یہ آواز سچ ہو نہیں سکتی تھی۔ لیزا محمود کو اس کے پاس کبھی بھی نہیں آنا تھا۔

"سکندر! رکو۔" اس بار اسے دور سے پہلے سے زیادہ زور سے چلا کر پکارا گیا تھا۔

اس بار وہ ٹھٹک کر رکنے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگتی اس کی طرف آرہی تھی۔ وہ رک گیا تھا۔ تیز بھاگنے سے اس کے کھلے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پر آرہے تھے۔ وہ اگلے لمحے اس کے پاس تھی۔ اس کی سانس اتنے بے ہنگم انداز میں بھاگنے کی وجہ سے بری طرح پھولی ہوئی تھی۔

دس از ناٹ فیئر (This is not fair) سینور سکندر! تم میرے ساتھ آئے تھے۔ میرے بغیر تم کس طرح واپس جاسکتے ہو؟ ہم ساتھ آئے تھے۔ ہم کو ساتھ جانا تھا۔"

وہ اسی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ غصے سے بولی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔ وہ غصے سے اس پر چلا رہی تھی۔

"تم نے خود ہی میرے بارے میں سب کچھ سوچ لیا۔ مجھ سے کچھ پوچھنا' بات کرنا تک گوارا نہیں کیا۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا سکندر! کہ لیزا بھی تمہاری طرح ایک انسان ہے؟ جیسے تم دکھ' درد اور غم محسوس کرسکتے ہو' وہ بھی کرسکتی ہے۔ جس لڑکی نے تمہاری زندگی برباد کی تھی' وہ لیزا محمود کی سگی بہن ہے اور لیزا اپنی بہن کے بدترین اور بھیانک کردار سے زندگی میں پہلی بار آگاہ ہو رہی ہے۔ وہ شاک میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ درد اور غم بھی محسوس کرسکتی ہے' وہ رو بھی سکتی ہے۔"

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیب ڈرائیور بھی وہاں موجود ہے' اسے ذرا پروا نہیں تھی۔ آس پاس سے گزرتے لوگ اس کے اس طرح زور سے بولنے پر کیا سوچیں گے اسے بالکل پروا نہیں۔ صبح سویرے کا وقت تھا' مگر ہوٹل میں اس وقت بھی چند لوگ تو آجا رہے تھے۔ سکندر بالکل خاموش کھڑا تھا۔ وہ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"ایسی محبت کرتے ہو مجھ سے کہ مجھے ذرا سی بھی رعایت دینے کو تیار نہیں؟ میرے دل کی حالت' میرا غم سمجھنے پر آمادہ نہیں؟ میں تمہارے بغیر کیسے رہ پاؤں گی' سوچا ہے تم نے؟ کیا ام مریم کی بہن ہونا میرا جرم ہے اور تم اس جرم کی سزا میں مجھے چھوڑ کر جارہے ہو؟"

وہ اس سے لڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ لیزا نے اس کے دونوں بازو کہنی کے پاس سے مضبوطی سے تھام لیے۔

"میں تمہیں صرف بیلا لگی تھی' روما کی باقی سب چیزوں کی طرح خوب صورت لگی تھی مگر انسان نہیں' ہے نا سکندر؟"

"ایسی بات نہیں ہے لیزا!" وہ رسانیت سے بولا۔ لیزا کو پروا نہیں تھی مگر وہ آس پاس سے گزرتے لوگوں کی وجہ سے محتاط ہو رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے تو تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بغیر اکیلے واپس جانے کی؟ مجھے فون کر کے یہ کیوں نہیں کہا تم نے کہ لیزا! میں کل صبح واپس جارہا ہوں۔ تم بھی صبح چھ بجے ائرپورٹ پہنچ جاؤ۔ پھر میں نہ آتی تو تم کہتے۔ مگر تم مجھے کیوں فون کرتے؟ تم کو تو مجھے سزا دینی تھی۔ جو سیم نے تمہارے ساتھ کیا' تم اس کی سزا مجھے دینا چاہتے ہو۔ میں تمہارے دل سے اتر گئی ہوں۔ نکال دیا ہے تم نے مجھے اپنے دل سے' اس لیے کہ میں سیم کی بہن ہوں۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے اس سے لڑ رہی تھی۔

"نہیں لیزا! نہیں۔ میں نے تمہیں ام مریم کی بہن کی حیثیت میں ایک بار بھی نہیں سوچا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"پھر تم مجھے چھوڑ کر کیوں جارہے تھے؟ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ سکندر! مجھے سیم کی بہن ہونے کی سزا مت دو۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو پڑی۔

آس پاس سے گزرتے لوگ بشمول کیب ڈرائیور اس منظر کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"بیلا کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ لیزا کا روما نہیں' کراچی ہے۔" اس نے جھک کر اس کے کان

تیں سر لوٹتی کی۔ وہ کھسیانی اور شرمندہ سی مسکراہٹ سے آس پاس سے گزرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

لیزا جذبات کی شدت سے مغلوب تھی۔ صبح سویرے یہاں سے گزرتے لوگوں کی اسے کیا پروا ہوتی اگر یہاں مجمع بھی جمع ہوتا' وہ تب بھی یہی سب کر رہی ہوتی۔ اس نے لیزا کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا تھا۔

"تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا میں۔ ہم ساتھ جا رہے ہیں۔ ہم ساتھ واپس جا رہے ہیں لیزا۔"

اس لڑکی کی محبت ایسی زور آور تھی کہ پل بھر میں ساری کلفتیں بھول گیا۔ یاد رہا تو اتنا کہ وہ اس لڑکی سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

"چل سکو گی ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ؟" اس نے دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے جیسے اسے آزمانا چاہا۔

"ہاں! چلو۔" وہ فوراً" بولی۔ وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"مجھے آزمانے چلے ہو سکندر شہریار! میں تم سے تمہاری سوچوں سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ میں بغیر کسی سے ملے ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں۔" وہ اسے اپنی آزمائش کرتا دیکھ کر خفگی سے بولی۔

"ارے ہاں' میں تو بھول گیا تھا۔ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔ میری خاطر کچھ بھی چھوڑ سکتی ہو۔"

دل کو غیر متوقع خوشی ایسی ملی تھی' محبت کا یقین ایسا ملا تھا کہ وہ بھی لوگوں کی موجودگی فراموش کر بیٹھا تھا۔ لیزا نے ناراضی سے اسے گھورا۔

"ہاں! میں تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں سکندر شہریار!" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میری خاطر پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟" وہ لبوں پر مسکراہٹ روکتا سنجیدگی سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"ہاں!" وہ اس کی شرارت محسوس کر کے روتے روتے ہنس پڑی۔

"رونا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں!"

"رونا اور لڑنا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں!" اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے اپنی آنکھوں سے گرتے اور رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔ وہ ابھی لیزا سے مزید کچھ اور بول نہیں پایا تھا کہ لیزا کے موبائل پر کال آنے لگی۔

"زین کال کر رہا ہے۔" ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھتے ہوئے وہ بولی۔ ایک دم ہی اس کا چہرہ پھر سے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"زین تمہیں یہاں لایا ہے؟"

"میں تمہیں جان سے مار دوں گی سکندر! اگر اب تم مجھ سے بدگمان ہوئے۔ میں زین کے ساتھ یہاں آئی ضرور ہوں مگر اس کے کہنے سے نہیں۔ میں خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہوں۔ زین اپنی غلطیوں پر بہت شرمندہ ہے سکندر!"

وہ اسے ناراضی سے گھورتے ہوئے بولی۔ وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا تھا۔ نجانے یہ بے اعتباریاں کب اس کا پیچھا چھوڑیں گی۔ اس دوران لیزا' زین کی کال ریسیو کر چکی تھی۔

"ہاں زین! بولو۔" وہ سکندر کو گھورتے ہوئے فون پر بولی۔

"لیزا! سکندر ملا تمہیں؟" زین بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان سا بھی لگ رہا تھا۔

"ہاں! سینور سکندر کی ایئرپورٹ کے لیے نکلنے کی تیاری تھی۔ شکر! میں ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔" وہ ہنوز سکندر کو گھور رہی تھی۔ اس نے زین کے لہجے کی گھبراہٹ پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

"لیزا! سکندر کو بتانا ام موجان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ پاپا انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

زین نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولتے ہوئے

گاڑی بھی اسٹارٹ کردی تھی۔ وہ جیسے فوراً" اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔ زین نے فوراً" ہی خدا حافظ کر کے فون بند کر دیا تھا۔ لیزا کے چہرے پر بھی پریشانی آگئی تھی۔

"کیا ہوا؟" سکندر متعجب انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر! اموجان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔"

☆ ☆ ☆

ہاشم رات سے اسی طرح کمرے میں بند تھا۔ رات وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس نے کمرا اندر سے مقفل کرلیا تھا۔ وہ رات بھر میں کئی بار اس کمرے کے دروازے پر جاچکی تھی۔ ہر بار اسے ناکامی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، وہ کیا کرے۔

ہاشم کو اس نے سدا اپنی غلامی کرتے دیکھا تھا۔ اس کا یہ سرد مہر رویہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ ہمیشہ وہ روٹھا کرتی تھی، ہاشم اسے منایا کرتا تھا۔

اس کی خوب صورتی پر مرتا ہے ناں ہاشم۔ وہ کمرے میں جا کر بہت اچھی طرح تیار ہوئی۔ کوئی بات نہیں آج وہ منالے گی اسے۔ اپنی حسین اور کم عمر بیوی کو وہ کتنی دیر نظرانداز کرپائے گا؟

صبح ہوچکی ہے۔ اب تو وہ کمرے سے نکلے گا۔ وہ آج خود کو اس پر نچھاور کردے گی۔ وہ اسے یہ یقین بھی دلائے گی کہ اب وہ ماں بننا چاہتی ہے۔

وہ تیار ہو کر واپس لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ ہاشم کو اس نے سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے دیکھا۔ شکر! وہ کمرے سے باہر تو نکلا۔ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر فوراً" صوفے پر سے اٹھی اور والہانہ انداز اور خود سپردگی سے اس کے گلے لگ گئی۔

"میری جان پر بن گئی تھی ہاشم! اس طرح ناراض کیوں ہوگئے تھے؟ جانتے ہو ناں میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

ہاشم نے اسے فوراً" ہی دھکا دے کر دور ہٹایا۔ وہ اس چیز کے لیے قطعاً" تیار نہیں تھی۔ اس نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

"ہاشم!" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ نگاہوں میں تلخی اور نفرت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی بھی نرمی نہیں تھی۔

"میں لمبی بات نہیں کرنا چاہتا مریم! تمہارا بدترین کردار اور ماضی میرے سامنے پوری طرح عیاں ہوچکا ہے۔ کل دوپہر میں تمہارے بابا کے گھر پر وہ سارا منظر دیکھ کر ہی حیران پریشان رہ گیا تھا۔ مگر کل رات تمہارے سابقہ منگیتر نے جو کچھ مجھے بتایا۔ اسے جان کر میرا خود کو ختم کردینے کو دل چاہ رہا ہے۔ ایسا گھناؤنا کردار رکھنے والی لڑکی کو میں پچھلے کئی برسوں سے بیوی بنا کر بیٹھا ہوا تھا؟" وہ اسے سخت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاشم! زین بکواس کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اپنے ریجیکٹ کیے جانے کا بدلہ لے رہا ہے وہ مجھ سے منگنی توڑنے کا انتقام لے رہا ہے۔"

"بس مریم! اور جھوٹ نہیں۔" ہاشم نے وارننگ دینے والے انداز میں انگلی اٹھا کر اس کی بات بے حد تختی سے کاٹ دی۔

"میں کل تک اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ تم نے پہلی بار جس مرد کو چاہا وہ میں تھا۔ میں اس معاملے میں بہت انتہا پسند ہوں مریم۔ میری بیوی جب مجھے ملی تھی تو اس کے دل میں کوئی اور تھا۔ اس کے جذبات آن چھوئے نہ تھے' اس سچائی کو جاننے کے بعد میں تمہارے ساتھ رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ اور ہوتے ہوں گے بے غیرت مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ دوسرے مردوں کے ساتھ راتیں گزار کر آئی عورت میری بیوی نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں مریم!"

"نہیں ہاشم! نہیں۔ پلیز ایسا مت کرو۔ تم تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔ تمہاری خواہش ہے ناں میں تمہارے بچے کی ماں بنوں۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں ہاشم!" اس نے روتے ہوئے اس

کے بازو جکڑ لیے۔

ہاشم نے اس کے ہاتھ جھٹک کر دور ہٹائے تھے۔

"میں کل رات سے کئی ہزار مرتبہ اس بات کا شکر ادا کر چکا ہوں کہ تم میرے بچے کی ماں نہیں بنیں۔ اگر ہماری کوئی اولاد ہو گئی ہوتی تو آج جو فیصلہ میں کرنے جا رہا ہوں، وہ کرنا میرے لیے بے حد کٹھن ہو جاتا۔" وہ اسے دیکھ کر تنفر سے بول رہا تھا۔ ہاشم کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت اور حقارت تھی۔ جیسے وہ کوئی بدبودار اور غلیظ شے تھی۔

"تو تم کون سا غیر شادی شدہ اور کنوارے تھے؟ تین بچوں کے باپ تھے تم۔ یہ میرا احسان تھا تم پر کہ میں نے تمہیں اپنا ساتھ دیا تھا۔" وہ یکدم ہی ہذیانی انداز میں چلائی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ وہ جیسے گہرے سمندر میں ڈوبنے سے پہلے ہاتھ پاؤں چلاتی خود کو بچانے کی آخری کوششیں کر رہی تھی۔

"بہت افسوس ہے مجھے اس بات کا۔ بہت شرمندہ ہوں میں اپنے بیوی اور بچوں سے۔ تمہاری محبت میں پاگل ہو کر میں نے ان کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔ بہت زیادتی کی تھی۔"

"تو اب مداوا کر دو اپنی شرمندگی کا۔ دوبارہ نکاح پڑھوا لو اپنی اسی بے چاری بیوی کے ساتھ۔" وہ حلق کے بل چلائی۔ اس کے چلانے کے جواب میں ہاشم بالکل ٹھنڈے پر سکون انداز میں بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ اسے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "تمہاری سب باتیں احمقوں کی طرح مانتے چلے جانے کے باوجود میں نے ایک بات تمہاری نہیں مانی تھی مریم! میں نے روحانہ کو طلاق نہیں دی تھی۔ تب تم سے اس بات کو چھپانے کی وجہ تمہیں دھوکا دینا نہیں، بلکہ تمہاری ناراضی سے بچنا تھا۔ میں تمہارے عشق میں پاگل ہو کر اسے طلاق دے دینا چاہتا تھا، مگر اس نے رو کر مجھ سے منت کی تھی مجھے میری بیٹیوں کے مستقبل کا خیال دلایا تھا۔ میری بیٹیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ کل کو ان کی شادی کا وقت آئے گا تو ان کے رشتے طے کرتے وقت ان کی ماں کی طلاق ان کے لیے سوالیہ نشان بن جائے گی۔ میں نے اپنی بچیوں کی خاطر روحانہ کی بات مان لی تھی۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا مریم۔ روحانہ آج بھی میری بیوی ہے۔ اور آج میں واپس اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ صد ہزار بار شکر! کہ میرے بچوں کی ماں ایک شریف اور باکردار عورت ہے۔ تمہارے ساتھ گزارے وقت کو میں یہ سمجھ کر بھلانے کی کوشش کروں گا کہ میں نے عیاشی کے لیے چند سال ایک بدکردار لڑکی اپنے نکاح میں رکھی تھی۔ جب میرا دل بھر گیا، میں نے اسے طلاق دے دی۔" وہ اس کی تذلیل کر رہا تھا۔ جیسے کل رات خود کو پہنچی ہر تکلیف کا اسے بے عزت کر کے اس سے بدلہ لے رہا تھا۔

وہ ہاشم کی تذلیل پر سکتے میں نہیں تھی۔ وہ اس کے جھوٹ پر سکتے میں تھی۔ روحانہ آج بھی اس کی بیوی تھی؟ ہاشم پچھلے کئی سال سے اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا؟ یہ شہ مات تھی۔

وہ چاروں شانے چت تھی۔ وہ ہاشم سے لڑنا، اس پر چلانا، ہذیان بکنا سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ حیرت سے گم صم، کھڑی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ساری زندگی وہ لوگوں سے جھوٹ بولتی، انہیں دھوکے دیتی آئی تھی۔ کیا کوئی اسے بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

"میں روحانہ اور اپنے بچوں کے پاس واپس جا رہا ہوں مریم! تمہیں طلاق کے کاغذات آج شام تک میرا وکیل پہنچا دے گا۔ میں تمہیں پندرہ دن کا نوٹس دے رہا ہوں۔ اگلے پندرہ دن میں میرا یہ گھر خالی کر دو۔ تمہاری وجہ سے اپنے بچوں کو میں نے یہاں سے نکالا تھا۔ اب انہیں پورے عزت اور احترام سے واپس ان کے گھر لاؤں گا۔" ہاشم سرد سے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری اور سختی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"رہ گئیں تم تو۔ ویسے یہ میرا دردِ سر نہیں کہ تم کہاں جاؤ گی۔ مگر پھر بھی اگر تمہیں یاد ہو اس چند سالہ شادی کے دوران تم نے بہت کچھ مجھ سے تحفے میں

وصول کیا تھا۔ میں نے منہ دکھائی میں اپنا ڈیفنس والا بنگلہ تمہارے نام کر دیا تھا۔ تم وہاں جا سکتی ہو۔ نہ جانا چاہو تو مت جانا ویسے بھی تمہارے لیے کوئی نیا شکار پھنسا لینا کون سا مشکل کام ہے۔ پھنسا لینا کوئی میرا جیسا احمق۔ بہرحال پندرہ دن بعد میں ریمانہ اور بچوں کو یہاں لے آؤں گا۔ آج کے بعد میں کبھی تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" استہزائیہ انداز میں حقارت سے بات شروع کرنے کے بعد آخر میں اس کا لہجہ بالکل سرد و سپاٹ ہو گیا۔

اس نے اب غور کیا' ہاشم کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھی۔ وہ تیار نظر آ رہا تھا۔ پیچھے سے ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاشم کا سوٹ کیس تھا۔ ہاشم سنجیدگی سے اس سے بولا۔

"سوٹ کیس گاڑی میں رکھو۔ میں آ رہا ہوں۔"

ملازم سرہلاتا باہر نکل گیا۔

ہاشم نے ایک سرد' کاٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ وہ دونوں ہاتھ لٹکائے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ہاشم بغیر کچھ کہے لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاؤنج سے نکل گیا۔

"ہاشم!" وہ چلائی۔ "رکو ہاشم! میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے بھاگ کر باہر آئی۔ ہاشم گاڑی گیٹ سے باہر نکال رہا تھا۔ اس کا شوہر اسے دھتکار کر جا رہا ہے۔ وہ اسے طلاق دینے والا ہے۔ نہیں! وہ یہ تذلیل نہیں سہہ سکتی۔ وہ ساری زندگی سر اٹھا کر زندہ رہی ہے۔ اسے کبھی کسی نے نہیں ٹھکرایا۔ اس نے لوگوں کو ٹھکرایا ہے۔

وہ لوگوں کا سامنا کیسے کرے گی؟ وہ اپنے پاپا کا سامنا کیسے کرے گی۔ اسے کچھ تو کرنا چاہیے۔ اسے ہاشم کو طلاق دینے سے روکنا چاہیے۔ وہ بھاگ کر اندر گئی۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ وہ بھاگ کر ہی واپس باہر آئی۔ اس نے طوفانی رفتار سے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نہیں! ام مریم نہیں ہار سکتی۔ ام مریم کو خدا نے جیتنے کے لیے تخلیق کیا ہے۔ ام مریم کو کوئی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا شوہر اسے بدکرداری کا الزام لگا کر طلاق نہیں دے سکتا۔"

اسے روڈ پر اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی اسپیڈ خطرناک حد تک تیز تھی۔ وہ جنونی انداز میں گاڑی چلا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہاشم طلاق کے کاغذات اپنے وکیل سے بنوائے' وہ اپنے پاپا کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ روک سکتے ہیں ہاشم کو ایسا کرنے سے۔ وہ روک لیں گے ہاشم کو اسے طلاق دینے سے۔

جتنی اسپیڈ وہ بڑھا رہی تھی اتنا ہی اسے لگ رہا تھا' وہ دیر کر رہی ہے۔ وہ پاپا کے پاس پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے ایکسیلیٹر پوری قوت سے دبایا۔ اسے سامنے پاپا نظر آ رہے تھے۔

وہ ان کے جتنا نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اسے نفرت سے دیکھتے اتنا ہی اس سے دور جاتے جا رہے تھے۔ اس نے بہت خطرناک موڑ کاٹا۔ وہ غلط طرف مڑی تھی۔

سامنے سے آتے ٹرک کے ڈرائیور نے بریک فوراً" لگانے کی کوشش کی تھی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہت زوردار دھماکا ہوا تھا۔ بہت بلند چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آمنہ آئی سی یو میں تھیں۔ ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ تینوں اسپتال میں موجود تھے۔ شہریار خان بہت پریشان تھے۔ وہ دونوں بھائی اپنی ماں کے لیے بہت پریشان تھے۔

دوپہر تک لیزا بھی ان کے ساتھ یہاں رہی تھی۔ پھر اس کے پاپا کا اس کے پاس فون آ گیا تھا۔ انہوں نے اسے گھر بلایا تھا۔ لیزا فوراً" ہی چلی گئی تھی۔ وہ ماں کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ اسے لیزا سے یہ پوچھنے کا بھی دھیان نہیں آیا تھا کہ اس کے پاپا نے اسے اتنی ایمرجنسی میں گھر کیوں بلایا تھا؟

شہریار خان نے آمنہ کے مستقل معالج کو بھی وہاں بلوا لیا تھا۔ شہر کے بہترین ہسپتال میں بہترین ڈاکٹرز کی

زیر نگرانی آمنہ کا علاج ہو رہا تھا۔

دوپہر سے شام اور شام سے رات ہونے لگی تھی۔ آمنہ کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ انجائنا کے اٹیک کے بعد فوری بہترین طبی سہولیات ملنے کے باعث خطرہ ٹل گیا تھا' مگر ان کے مستقل معالج کے چہرے پر وہ تینوں کچھ فکر سی دیکھ رہے تھے۔

آمنہ ہوش میں تھیں۔ انہیں آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ باری باری وہ تینوں تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس آئی سی یو میں جا رہے تھے۔

آمنہ' سکندر کو دیکھتے ہی رونے لگی تھیں۔ وہ ان کی حالت بگڑنے سے ڈر رہا تھا۔ دوپہر کے بعد سے آمنہ کے مستقل معالج نے ان کے مختلف ٹیسٹ کروانے شروع کر رکھے تھے۔ انجائنا کے اٹیک کے ساتھ ان ٹیسٹوں کا کیا تعلق تھا؟

وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سا خوف محسوس کر رہا تھا۔ گھر پر نوریہ اور علی تھے۔ وہ تینوں اسپتال میں موجود تھے۔ زین نے شہریار خان سے رات میں گھر چلے جانے کو کہا۔ مگر وہ آمنہ کے پاس سے جانے کو آمادہ نہیں تھے۔ دو ہی افراد وہاں رک سکتے تھے' اس لیے مجبوراً" زین کو گھر جانا پڑا تھا۔

وہ تینوں آپس میں آمنہ کی طبیعت کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ ساری رات وہ اور شہریار خان اسپتال میں ساتھ رہے تھے۔ شہریار خان اسے اداسی سے دیکھ رہے تھے' مگر ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

آمنہ خواب آور ادویہ کے زیر اثر ساری رات پرسکون نیند سوتی رہی تھیں۔ بظاہر اب ان کی حالت سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر اگلی صبح ڈاکٹرز انہیں بتا رہے تھے کہ جیسا وہ لوگ سمجھ رہے ہیں' ویسا نہیں ہے۔

یہ اسپتال کا کانفرنس روم کی طرز کا کمرا تھا۔ یہاں آمنہ کے خصوصی معالج کے ساتھ اس اسپتال کے چند اور قابل ڈاکٹرز بھی موجود تھے۔ سکندر اور شہریار خان ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ آمنہ کے کل ہوئے تمام ٹیسٹوں کی رپورٹس ڈاکٹرز کے سامنے رکھی تھیں۔ آمنہ کے مستقل معالج انہیں بہت دل دہلا دینے والی بات بتا رہے تھے۔

"آپ کی مسز کی رپورٹس ٹھیک نہیں آئی ہیں شہریار صاحب! کینسر دوبارہ پھیل رہا ہے اور بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ میں نے احتیاطاً" بلڈ اور یورین ٹیسٹ کروایا تھا۔ مجھے ان کی رپورٹس میں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں نے مناسب سمجھا' تمام ٹیسٹ کروالوں' تاکہ ذہن کلیئر ہو سکے۔"

وہ سکتے کی سی کیفیت میں خوف زدہ سا ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر فاروقی! ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ ابھی چار ماہ پہلے آمنہ کے تمام ٹیسٹ روٹین کے مطابق ہوئے تھے اور ان کی رپورٹس ٹھیک آئی تھیں۔"

جواباً" ڈاکٹر فاروقی نے انہیں ملامت کرتی اور ان کا درد سمجھتی نظروں سے یوں دیکھا تھا' جیسے کہنا چاہتے ہوں بیماری اور شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ کون جانے چار ماہ پہلے بھی بیماری اندر ہی اندر پھر پھیل رہی تھی' مگر چونکہ اس وقت انہیں پتا چلنا خدا کی منشا نہ تھی چنانچہ ٹیسٹوں کی رپورٹوں میں انہیں کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔

"پھر کوئی علاج؟ اب کیا ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب!"

وہ باپ کا خوف اور پریشانی پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

"میجر سرجری ہو گی دوبارہ' مگر اس میں رسک بہت ہو گا۔" ڈاکٹر فاروقی پیشہ ورانہ انداز میں بولے۔

وہ دونوں ڈاکٹرز کے دل دہلا دینے والے انکشافات سن کر باہر نکل آئے تھے۔ شہریار خان اس سے ایک قدم آگے تھے۔ وہ سست روی سے پیچھے چل رہا تھا۔ شہریار خان کو جیسے چکر سا آیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگے۔

"پاپا!" اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا۔ وہ انہیں پکڑ کر بینچ پر بٹھا دینا چاہتا تھا' مگر شہریار خان یکدم ہی اس کے گلے لگ کر رو پڑے تھے۔

"سکندر! اپنی ماں کو بچالو۔ میں نے اس پر بہت ظلم کیے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہوا میں خود کو کیسے معاف کر پاؤں گا؟"

وہ خود اس لمحہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ باپ سے ناراضی' باپ کا خود پر کیا کوئی بھی ظلم اسے اس پل یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو ان کے گرد پھیلا دیے۔ وہ انہیں سنبھال رہا تھا۔

"اموجان کو کچھ نہیں ہوگا پاپا! میں انہیں علاج کے لیے امریکا لے کر جاؤں گا۔ بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے ان کا علاج کرواؤں گا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ شہریار خان نے روتے ہوئے اپنا سر اس کے کندھے پر سے اٹھایا۔

"سکندر! لیزا سے شادی کرلو۔ جلد از جلد۔ آمنہ کو بہت ارمان ہے تمہاری شادی کا۔ جس طرح وہ چاہتی ہے' اسی طرح دھوم دھام سے لیزا سے شادی کر لو۔ اس کا جسم تمہارے ہی غم میں گھائل ہے۔ تمہیں خوش دیکھے گی تو شاید اس کے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہو سکے' پھر شاید وہ اپنی بیماری سے لڑ سکے۔" وہ روتے ہوئے اس سے بول رہے تھے۔

"میں لیزا سے اسی طرح شادی کروں گا پاپا! جس طرح اموجان چاہیں گی۔"

وہ دونوں برسوں بعد ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع تھے۔ شہریار خان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ انہوں نے روتے روتے بے اختیار اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

"سکندر! مجھے معاف کردو بیٹا۔ میں دنیا کا بدترین باپ ہوں۔ میں نے تمہاری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں مجرم ہوں تمہارا بھی' تمہاری ماں کا بھی۔ آج آمنہ اس حال تک پہنچی ہے تو میری وجہ سے۔"

"پاپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ پلیز! ایسا مت کریں۔"

اس نے اپنے سامنے بندھے ان کے ہاتھوں کو کھولا۔ باپ سے معافی منگواتا تو اس کی غلطی کبھی نہ تھی۔ اس کے غم میں اس کی ماں اس حال کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا باپ بہت کمزور اور بوڑھا ہو گیا ہے۔ کبھی جس کی طاقت اور حیثیت کو ایک دنیا تسلیم کرتی تھی' آج وہ اس طرح ٹوٹ کر' بالکل بکھر کر رہ گیا ہے۔ والدین بھی تو اولاد کی بڑی سے بڑی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں' پھر وہ اپنے باپ کے لیے دل کو گداز کیوں نہیں کر سکتا؟

وہ برسوں سے کسی کے سامنے نہیں رویا تھا۔ اس وقت وہ باپ کے سامنے رو پڑا۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ ان کے ہاتھوں کو روتے ہوئے چومنے لگا۔

"مجھے آپ کی اور اموجان کی بہت ضرورت ہے پاپا! مجھے آپ کی اور اموجان کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔" وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے آواز آنسو بہا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

آمنہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ آج شام میں ان کی چھٹی ہو جانی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق فی الحال وہ گھر جا سکتی تھیں۔ ہاں! ان کے کینسر کے علاج میں بہت جلدی کیے جانے کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے کل آمنہ کے معالجین سے میٹنگ کے بعد ہی امریکا میں چند بڑے اسپتالوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ کیا تھا اور وہاں سے ملی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس نے آج صبح سویرے ہی آمنہ کی تمام رپورٹس وہاں انٹرنیٹ کے ذریعے ارسال کر دی تھیں۔

اس وقت وہ تینوں آمنہ کے پاس کمرے میں موجود تھے۔ آمنہ جاگی ہوئی تھیں۔ ان کے ایک طرف وہ بیٹھا تھا' دوسری طرف زین بیٹھا تھا۔ آمنہ باری باری ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بہت کمزور اور بہت بیمار نظر آ رہی تھیں۔

"اموجان! آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ میں لیزا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے آپ چاہیں گی

بالکل اسی طرح۔ آپ جس جس فنکشن کے لیے کہیں گی میں وہ فنکشن رکھوں گا شادی پر۔" وہ مسکرا کر انہیں یقین دلا رہا تھا۔

آمنہ نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"لیزا اور محمود صاحب راضی ہیں شادی کے لیے سکندر؟" انہوں نے نقاہت بھری آواز میں بے یقینی سے پوچھا۔

"سب راضی ہیں امو جان! بس آپ کا انتظار ہے۔ آپ جلدی سے طبیعت ٹھیک کرلیں تاکہ جلد سے جلد یہ شادی ہوسکے۔"

اس مرتبہ آمنہ کو یہ جواب زین نے دیا تھا۔

آمنہ نے پہلے زین کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا' پھر اسے دیکھا تھا۔ وہ زین کی بات کی تصدیق کے لیے سر اثبات میں ہلا کر مسکرا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے پورچ میں آیا۔ اب تک اسے راستے یاد ہوگئے تھے' اس لیے وہ گاڑی خود چلا کر جانا چاہتا تھا۔

وہ باہر نکلا تو اسے پورچ میں زین گھر کے چند ملازمین کے ساتھ سیاہ گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ علی بھی وہیں کھڑا تھا۔ پاس ٹوکرے میں پھول رکھے ہوئے تھے بہت خوب صورت اور تازہ پھول۔ زین ملازمین کو ساتھ لگائے دولہا کی گاڑی سجا رہا تھا۔ وہ دوسری گاڑی کی طرف جارہا تھا۔ زین نے اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کیسی لگ رہی ہے گاڑی؟"

گاڑی کا ایک حصہ پھولوں سے سج چکا تھا۔ زین اسی کو دیکھتا سکندر سے پوچھ رہا تھا۔

"بہت خوب صورت۔" وہ زین کے پاس آکر رک گیا۔ اس نے مسکرا کر تعریف کی۔

"سکندر پاپا! آج آپ کی شادی ہے ناں لیزا آنٹی کے ساتھ؟" علی کے معصومانہ سے انداز میں بولنے پر وہ ہنس پڑا۔

"ہاں علی! آج تمہارے سکندر پاپا اور لیزا آنٹی کی شادی ہے۔" اس کے بجائے علی کو زین نے جواب دیا تھا۔

امو جان کو اسپتال سے آئے پانچ دن ہوچکے تھے۔ وہ فی الحال مکمل بیڈ ریسٹ پر تھیں۔ ان کے اسپتال سے آتے ہی شہریار خان نے محمود خالد سے مل کر آنا" فانا" شادی اور ولیمہ کا دن طے کرلیا تھا۔

آمنہ کی اسپتال سے گھر واپسی کے موقع پر وہ شہریار خان اور زین کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا تھا۔ پورے بارہ سال بعد۔ اس کی خودداری' خودپسندی اور انا سے کہیں زیادہ قیمتی اس کی ماں کی زندگی تھی۔ اسے گھر میں قدم رکھتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی یاد نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں کبھی نہیں آنا چاہتا تھا۔

شادی کی تیاریاں بھاگ دوڑ کر شہریار خان اور زین نے کی تھیں۔ اس نے تو ان پانچ دنوں میں آمنہ کو جلد از جلد علاج کے لیے امریکا لے جانے کے سلسلے میں کوششیں کی تھیں۔ نکولس کا بڑا بھائی سان فرانسسکو میں ایک جانا مانا اور قابل سرجن تھا۔ اسی نے کسی بہت اچھے اور قابل سرجن کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ جس کے علاج سے کینسر کے کئی مریض صحت یاب ہوچکے تھے۔ رپورٹس یہاں سے اس نے بھیجی تھیں۔ وہاں اس قابل ڈاکٹر تک رسائی نکولس کے بھائی کی وجہ سے آسان ہوئی تھی۔

آمنہ کی رپورٹس دیکھنے کے بعد اس ڈاکٹر نے خاصی امید دلائی تھی کہ ان کا علاج ابھی بھی ممکن ہے اور وہ ایک مرتبہ پھر اس موذی مرض سے صحت یاب ہوسکتی ہیں۔ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد اسے آمنہ کو سان فرانسسکو لے جانا تھا۔ شہریار خان بھی ان لوگوں کے ساتھ جارہے تھے۔

کل رات ہی یہ سب کنفرم ہوا تھا اور رات جب اس نے شہریار خان اور زین کو یہ بات بتائی تھی تو ان دونوں کے مایوس چہروں پر امید جگمگانے لگی تھی۔

"امو جان ٹھیک ہوجائیں گی ناں سکندر؟" زین

نے رندھی آواز میں اس سے پوچھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"ہاں زین! ان شاء اللہ اموجان بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کی آدھی بیماری تو کل مجھے اور لیزا کو شادی کرتے دیکھ کر دور ہو جائے گی اور باقی بیماری اللہ ڈاکٹر کے ذریعے ٹھیک کرا دے گا۔" وہ نرم لہجے میں زین سے بولا۔ وہ زین کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے تسلی دینے کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ان شاء اللہ۔" زین اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

زین کے اور اس کے بیچ گزرے ماہ و سال کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بات ہوتی تھی تو صرف ماں کے متعلق۔ ان کی ماں وہ مرکز تھی جس کے گرد وہ دونوں بھائی ایک ہی امید اور دعا کے ساتھ جمع تھے کہ ماں صحت یاب ہو جائے، ماں کے جسم سے ساری بیماری دور ہو جائے، ماں کے دل کا سارا غم مٹ جائے۔ ماں جو برسوں سے روتی رہی ہے، اب اس کے لبوں پر صرف مسکراہٹیں ہوں اور دل میں فقط خوشیاں۔

"تم کہیں جا رہے ہو؟" زین نے اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں! اموجان کی ایک دوا ختم ہو گئی ہے۔ وہ لینے جا رہا ہوں۔" سکندر قدرے سنجیدگی سے بولا۔ دوسری گاڑی کی طرف جانے کے لیے اس نے قدم اٹھائے تھے کہ علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"سکندر پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

سکندر رک گیا۔ اس نے مسکرا کر علی کو دیکھا تھا۔

"آجاؤ علی!"

سکندر کے چہرے پر بھتیجے کے لیے والہانہ چاہت تھی۔ علی بھاگتا ہوا سکندر کے پاس گیا۔ سکندر نے بے ساختہ اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے گالوں پر پیار کیا۔

وہ خاموشی سے بھائی اور بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی علی سکندر سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ سکندر کی زین سے ماں کی بیماری سے ہٹ کر کچھ زیادہ بات ہوتی تھی۔ نہ نویرہ سے سلام دعا سے زیادہ کچھ بے تکلف گفتگو مگر علی سے جیسے اس کی پکی دوستی ہو گئی تھی۔

"آئس کریم کھلائیں گے سکندر پاپا؟"

"میں اپنے علی کو آئس کریم کھلاؤں گا۔" سکندر نے اسے گود میں لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ دونوں تایا بھتیجے میں سالوں پرانی دوستی اور بے تکلفی نظر آ رہی تھی۔

"اور چاکلیٹ بھی دلائیں گے؟" علی کی معصومانہ فرمائشیں جاری تھیں۔

"چاکلیٹ بھی دلاؤں گا۔" سکندر نے اسے آگے اپنی برابر والی سیٹ پر بٹھا لیا۔

وہ بھائی اور بیٹے کو گاڑی میں ساتھ بیٹھ کر جاتا محبت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ سکندر سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ علی کو زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ساتھ رکھا کرے۔ اس کی خواہش تھی اس کی دعا تھی کہ علی بڑا ہو کر سکندر جیسا بنے۔ محبت کرنے در گزر کر دینے والا، معاف کر دینے والا اعلا ظرف رکھنے والا۔

اسے علی میں نہ تو ایک اور شہریار خان چاہیے تھا، نہ ہی ایک اور زین شہریار۔ ان کے دادا جی، ان کے پاپا اور وہ خود انتہا پسند لوگ تھے۔ جنونی اور پاگل لوگ تھے۔ نسل در نسل ان کے خاندان میں چلتا یہ پاگل پن اب ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جیسے سکندر نے ان کے خاندان میں چلی آتی انتہا پسندی و خود پرستی نہیں لی، وہ چاہتا تھا علی بھی نہ لے۔

برسوں کی دوریاں اور فاصلے تھے۔ سب کچھ دوبارہ پہلے جیسا ہونے میں بہت وقت لگنا تھا۔ سکندر اسے گلے لگا سکے، وہ سکندر سے اپنے دل میں آئی یہ تمام باتیں کہہ سکے، یہ سب ممکن ہو پانے میں ابھی بہت وقت لگنا تھا۔ صدیوں کے فاصلے پل بھر میں تو نہیں سمٹ سکتے تھے۔

علی سے باتیں کرتے ہوئے، اس کی معصومانہ باتوں پر مسکراتے ہوئے سکندر نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال لی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھے جا رہا

تھا۔

سکندر سے دوری اور فاصلے کے سبب وہ بہت کچھ جو وہ کہنا چاہتا ہے' نہیں کہہ پا رہا تھا۔ مگر نویرہ سے تو وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے' جو وہ اس سے سننے کی منتظر ہے۔ گزشتہ کئی دن پہلے سکندر کی پریشانی اور پھر ماں کی بیماری کی بھاگ دوڑ میں گزرے تھے۔ اسے سکون سے بیٹھ کر نویرہ سے بات کرنے کی مہلت نہ ملی تھی' مگر اس پریشانی اور بھاگ دوڑ میں بھی اسے نظر آ رہا تھا کہ بظاہر امو جان اور گھر کے تمام افراد کا پہلے کی طرح خیال رکھتی نویرہ اس سے دور ہو گئی تھی۔ اس سے فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر لمحہ ایک شکایت ہوتی تھی۔

اسے شادی کے ان گزرے برسوں میں بھی اس نے یہ تک نہیں جتایا تھا کہ اس کی کبھی کسی سے منگنی ہوئی تھی۔ ام مریم کے ان کی زندگیوں میں کسی طوفان کی طرح واپس آجانے نے ماضی کی ساری راکھ ہی کرید ڈالی تھی۔ جس شوہر کو وہ بلا شرکت غیرے اپنا سمجھتی تھی' کیا وہ ماضی میں کسی کی محبت میں بھی مبتلا رہ چکا تھا؟ اور وہ محبت اتنی زور آور تھی کہ اس نے اپنے سگے بھائی تک کو پورے بارہ سال چھوڑے رکھا تھا؟

اسے نویرہ کے دل کی بدگمانیاں اور ناراضیاں دور کرنی تھیں۔ محبت تو وہ اس سے کرتا ہے ناں! تو کیا حرج ہے' اگر وہ نویرہ کے دل سے بدگمانی مٹانے کو یہ کہہ دے کہ بارہ سال پہلے اسے محبت اور پسندیدگی میں فرق کرنا نہیں آیا تھا۔ ام مریم اپنی غیر معمولی ذہانت اور بے تحاشا حسن کی وجہ سے اسے پسند آگئی تھی۔ تب وہ پسندیدگی کو محبت سمجھ بیٹھا تھا۔ اگر اس کا یہ جھوٹ نویرہ کے دل کو خوشی دے دیتا ہے' اسے پھر سے اس کے نزدیک لے آتا ہے تو وہ اس جھوٹ کو جائز سمجھتا تھا۔

سکندر کی شادی کے دن' جبکہ ان کے گھر میں خوشیاں بکھری ہوئی تھیں' اس سے اچھا موقع اور کون سا ہو سکتا تھا' نویرہ سے یہ سب کہنے کے لیے۔ اس نے گاڑی کی سجاوٹ کا بقیہ کام نوکروں کو سمجھایا اور خود گھر کے اندر جانے کے لیے مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

یہ سکندر اور لیزا کے ولیمہ کی رات تھی۔ کل بہت دھوم دھام سے ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی ماں کی خواہش کے مطابق اس کی بارات باپ کے گھر سے گئی تھی۔

آمنہ دولہا کی گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ علی شہ بالا بنا تھا۔ گاڑی زین نے چلائی تھی۔ نویرہ بھی دولہا کی گاڑی میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

آمنہ نے شادی کے دن وہی ساڑھی پہنی تھی' جو لیزا کے لیے عروسی ملبوسات کی خریداری کے موقع پر اس نے انہیں دلوائی تھی۔ آمنہ بے تحاشا خوش تھیں۔ وہ کسی پل خوشی سے رو پڑتیں اور اگلے ہی پل کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔

انہوں نے شادی اور ولیمہ کی تقریبات میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر شرکت کی تھی۔ برسوں کی آبلہ پائی کے بعد یہ خوشی اللہ نے انہیں دکھائی تھی۔ ان کی فیملی اکٹھا تھی۔ وہ سب ایک ساتھ تھے۔ ان کا ایک بیٹا ان کے دائیں طرف تھا' دوسرا بائیں طرف۔ وہ اپنے بچوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر جیسے پھر سے جی اٹھی تھیں۔

بیماری تو اللہ کے حکم سے آپریشن' علاج اور دواؤں کے ذریعے ہی ان کے جسم سے باہر نکلنی تھی' مگر اتنا اب اسے یقین تھا کہ اس کی امو جان اب اپنی بیماری سے لڑیں گی۔ ان کے اندر زندہ رہنے کی امنگ پھر سے پیدا ہو گئی ہے اور زندہ رہنے کی یہ امنگ ہی انہیں اپنی بیماری سے لڑنے میں مدد دے گی۔

شادی کے تحفے کے طور پر آمنہ نے اسے اور لیزا کو ہنی مون کے لیے اٹلی کا ریٹرن ٹکٹ دیا تھا۔ ماں کی بیماری کے اس مشکل موقع پر نہ اس کا دل تھا ہنی مون کا اور نہ ہی لیزا کا۔ مگر آمنہ کا اصرار تھا کہ وہ دونوں جائیں۔ ابھی ان لوگوں کے امریکا جانے میں دو ہفتے باقی

ہیں تو کیا حرج ہے' اگر اگلا ایک ہفتہ وہ اور لیزا اٹلی میں گزار آئیں۔

وہ جانتا تھا' اس کی ماں اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔ ماں کے دل کو خوشی دینے ہی کے لیے اس نے لیزا کے ساتھ اٹلی جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ولیمہ والی رات ہی ان لوگوں کی فلائٹ تھی۔ نینی بھی ان کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بطور خاص پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ شادی کی تقریبات میں شرکت کر کے آج رات انہیں بھی ان دونوں کے ساتھ ہی روم واپس چلے جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب لوگ انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے آئے ہوئے تھے۔ شہریار خان' آمنہ' زین' نویرہ' علی' محمود خالد اور عائشہ۔ آمنہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں۔ لیزا کے دونوں ہاتھوں پر مہندی رچی تھی۔ وہ اسٹائلش مگر سادہ لباس میں تھی۔ لیکن اس سادگی میں بھی اس کے نئی نئی دلہن ہونے کا پتا چل رہا تھا۔ لیزا شہریار خان' آمنہ اور نویرہ سے مل رہی تھی۔ شہریار خان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیں' آمنہ نے پیار سے اس کی پیشانی چومی' نویرہ نے پیار سے گلے لگا لیا تھا۔ علی سکندر کی گود میں چڑھا ہوا تھا۔ اس کی سکندر سے بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔

زین خاموشی سے سکندر کو دیکھے جا رہا تھا۔ جب سکندر کی بارات لے کر وہ لوگ گھر سے نکل رہے تھے اس کا دل چاہا تھا' وہ بھائی کے گلے لگ جائے' اسے مبارک باد دے۔ جب سکندر اور لیزا کا نکاح ہوا' اس پل سب کو سکندر سے گلے ملتے اس نے دور سے اور حسرت سے دیکھا تھا۔ اس کا بھی دل چاہا تھا' وہ اس کے پاس جائے' اسے گلے لگا کر خوشیوں کی دعائیں دے مگر ایک جھجک تھی' جو اسے سکندر کے پاس جانے سے روک رہی تھی۔ نجانے سکندر اس کے گلے لگنا چاہے گا بھی یا نہیں؟ سب سے ملنے کے بعد اب لیزا' محمود خالد سے مل رہی تھی۔ وہ اسے خوش دیکھ کر بہت خوش تھے' مگر پھر بھی ان کی آنکھوں میں ایک دکھ جھلک رہا تھا۔ اس دکھ کی وجہ وہ جانتی تھی۔ وہ باپ کے گلے لگ گئی۔

"خوش رہو' بیٹا!" اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے انہوں نے دعا دی تھی۔

"اپنا خیال رکھیے گا پاپا!" باپ کا دکھ محسوس کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم نے مریم کو فون کیا تھا؟" چند لمحوں بعد بہت دھیمی آواز میں انہوں نے اس سے پوچھا۔ لیزا باپ کے ہاتھ تھامے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جواباً" نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نے بہت کوشش کی پاپا! مگر ابھی خود میں اتنا ظرف پیدا نہیں کر سکی کہ اس سے مل سکوں' اس سے بات کر سکوں۔ اگلی بار پاکستان آؤں گی تو اس سے ضرور ملوں گی۔ ہے تو وہ میری بہن ناں پاپا! اسے زندگی بھر کے لیے چھوڑ تو نہیں سکوں گی۔ محبت نہیں رہی مگر خون کا رشتہ تو ہے ناں پاپا۔" بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

سیم کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع پا کر محمود خالد نے اسے بلایا تھا۔ وہ اور محمود خالد اسپتال میں سیم کے پاس موجود رہے تھے۔ جب تک سیم ہوش میں نہیں آئی تھی' وہ وہاں موجود رہی تھی' مگر اس کے ہوش میں آتے ہی وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہ اس سے نہیں ملی تھی۔ ان کی فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔ اب انہیں اندر چلے جانا تھا۔ نینی نے اس کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر جیسے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔ وہ لیزا اور محمود خالد کا دکھ محسوس کر رہی تھیں۔

"چلو لیزا! دیر ہو رہی ہے۔" وہ اس سے بولیں۔
سکندر بھی اب ماں' باپ' نویرہ' محمود خالد اور عائشہ سے مل رہا تھا۔

"پاپا! اموجان کی ساری تیاری کروا دیجیے گا۔ میں اگلے ہفتے واپس آجاؤں گا۔"

"فکر مت کرو بیٹا! ساری تیاری ہو جائے گی۔ تم

"اور لیزا بس دل بھر کر گھومو' پھرو اور انجوائے کر کے آؤ۔" شہریار خان شفقت اور محبت سے بولے۔

اس نے زین کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ زین کے سامنے کھڑا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا سکندر!" زین مسکرا کر بولا۔

وہ اب بھی بھائی کے گلے نہیں لگ سکا تھا۔ سکندر نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اسے گلے لگا لیا۔ جیسے اس کے دل کی بات وہ اس کے کہنے بنا ہی جان گیا تھا۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا زین!" وہ اسے گلے لگائے لگائے بولا۔

اور زین شہریار نے زندگی میں پہلی بار اپنے بڑے بھائی پر فخر کیا تھا۔ رشک کیا تھا۔ کسی نفرت یا حسد میں مبتلا ہو کر نہیں' مگر اسے رشک سے دیکھتے یہ سوچا تھا کہ کاش! وہ بھی سکندر جیسا ہوتا۔ اس کی طرح اعلا ظرف اور درگزر کا حوصلہ رکھنے والا۔ اسی کی طرح محبتوں کو بنا لفظوں کے سمجھ لینے والا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے فلیٹ میں تنہا تھی۔ ساحل سمندر سے نزدیک یہ فلیٹ کئی برس پہلے اس نے اس وقت خریدا تھا' جب محمود خالد نے اپنی کچھ پراپرٹی ان دونوں بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی تھی۔ تب لیزا نے روم میں اور اس نے کراچی میں اپنے لیے فلیٹ خریدا تھا۔ اس کے فلیٹ کے لیونگ روم کی بڑی بڑی فرنچ ونڈوز سے سمندر کا خوب صورت منظر نظر آتا تھا۔ تب اس منظر کی دلکشی سے مسحور ہو کر اس نے یہ فلیٹ خریدا تھا۔

اب یہ منظر اس کے چوبیں گھنٹوں کا ساتھی تھا۔ وہ دن کے چوبیں گھنٹے یہاں ان کھڑکیوں کے سامنے وہیل چیئر پر بیٹھ کر سمندر کو دیکھتے ہوئے گزار دیا کرتی تھی۔ اس خوفناک ایکسیڈنٹ میں اس کی جان بچ گئی تھی۔ کاش! نہ بچی ہوتی۔ مگر اس کی قسمت میں بچ جانا اور معذور اور اپاہج ہو کر وہیل چیئر آجانا لکھا تھا۔ ہاشم کے کسی پیسے کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ اس کے تحفے میں دیے گھر میں بھی نہیں گئی تھی۔ طلاق کے بعد اب اس کا اس کی کسی بھی چیز پر کیا حق تھا۔ اس کے پاپا نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اسپتال سے آنے کے بعد ان کے ساتھ ان کے گھر چلی جائے مگر باپ کی نظروں سے گر کر' معذور اور اپاہج ہو کر' ایک بوجھ بن کر وہ ان کے گھر پر کیسے جا سکتی تھی؟

ام مریم ساری زندگی سر اٹھا کر زندہ رہی تھی۔ اسے وہیل چیئر سے اٹھنے بیٹھنے' لیٹنے' باتھ روم جانے ہر چیز کے لیے مدد درکار ہوتی تھی۔ سو اس کام کے لیے اس نے ایک کل وقتی میڈ رکھ لی تھی۔

محمود خالد روز شام میں اس کے پاس آتے تھے۔ وہ چند گھنٹے اس کے پاس گزارتے تھے۔ اس دوران وہ دونوں ہی خاموش رہتے تھے۔ بہت بولنے بہت چہکنے' بہت تیز تیز زندگی کی دوڑ میں شامل ام مریم بولنا ہی بھول گئی تھی۔ اس کے پاس لفظ گم ہو چکے تھے۔ اس کے اور اس کے باپ کے درمیان چند مختصر جملوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ جیسے آج اسے ان سے پتا چلا تھا کہ لیزا اور سکندر ہنی مون کے لیے اٹلی گئے ہوئے تھے۔

"لیزا بہت خوش ہوگی؟" اس نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں باپ سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ باپ کی نظروں میں اپنے لیے دکھ اور مایوسی نہیں دیکھ پاتی تھی' اس لیے ان سے نظریں نہیں ملایا کرتی تھی۔

"یہاں سارا دن اکیلے رہ کر پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو بیٹا! میرے ساتھ گھر چلو۔" آج پھر جانے سے پہلے انہوں نے اسے سمجھایا تھا اور روزانہ کی طرح اس نے پھر انکار کیا تھا۔

"پاپا! مجھے اس قید تنہائی میں رہنے دیں۔ میں دنیا کا اور لوگوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔"

روزانہ کی طرح اسے سمجھانے میں ناکام ہو کر محمود خالد مایوس اپنے گھر لوٹ گئے تھے۔

ماں' باپ کیا ہوتے ہیں۔ باپ کا دل دکھانے میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر آج جو بلاناغہ

روز اس کے پاس آتا تھا' اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا تھا' اس کے لیے سب سے زیادہ مضطرب رہا کرتا تھا اور جو اسے معذور واپاہج دیکھ کر پہروں رویا کرتا تھا' وہ اس کا باپ ہی تھا۔ وہ ان کی نظروں سے گر چکی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ مگر باپ کی نظروں سے گر کر اس کے لیے جینا بہت دشوار ہو گیا تھا۔

ساری زندگی کبھی رک کر کچھ سوچا نہیں تھا کہ زندگی کے ہنگامے فرصت نہیں لینے دیتے تھے۔ آج سوچنے کے لیے فرصتیں ہی فرصتیں تھیں۔ سچا دوست زندگی میں کوئی بنایا نہیں تھا' جو ماسک لگے چہرے اور مصنوعی محبتیں اس نے اپنے گرد جمع کر رکھی تھیں' وہ اس کے وہیل چیئر پر آتے ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ پارٹیز' ورک شاپس' کانفرنسز' سیمینارز' چیریٹی شوز' فنڈ ریزنگ کیمپین۔ اب اس کے کسی بھی دوست کو ایسے کسی بھی موقع پر اس کی یاد نہیں آئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک دم ہی اس کی زندگی سے باہر نکل گیا تھا۔

حاصل زندگی یہ تھا کہ اس کے پاس صرف ایک رشتہ۔

اس کا باپ۔

جو مجبور تھا آج بھی اس سے محبت کرنے پر۔

زندگی اسی طور گزر رہی تھی کہ صبح سے شام اور شام سے رات یونہی خاموشی سے سمندر کو دیکھتے تمام ہو جایا کرتی تھی۔ وہ ہر روز سکندر کو بھی سوچتی تھی اور لیزا کو بھی۔ سکندر کا خیال اسے پہروں بے چین رکھتا تھا۔ وہ شخص' جسے اس نے چاہا تھا۔ وہ شخص جس نے اسے ٹھکرایا تھا اور جس سے اپنے ٹھکرائے جانے کا بدلہ اس نے اسے اس کے گھر والوں کی نظروں سے گرا کر اور اس کے گھر سے نکلوا کر لیا تھا۔ جو اس نے بارہ سال قبل سکندر کے ساتھ کیا تھا' آج وہی سب کچھ اس کے ساتھ ہو گیا تھا۔

سمندر اس سے باتیں کرتا تھا۔ سمندر اسے بعض دفعہ بہت سچی اور کڑوی باتیں کہہ جاتا تھا۔ سمندر اسے کہتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا' وہ خدا کا انصاف ہے۔ وہ اپنے باپ کی نظروں سے گر گئی تھی۔ اس کی بہن اسے عمر بھر کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے اسے ذلتوں کے ساتھ اپنے گھر سے اور اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

سمندر کہتا تھا' اسے سکندر کی آہ لگی تھی۔ سکندر نے قبولیت کے کسی لمحے میں بڑے سچے دل سے اسے بددعا دی ہو گی۔ تب ہی تو اس کے مقدر میں اللہ نے موت نہیں' یہ معذوری والی زندگی لکھ دی.... کسی کو اپنے آگے خاطر میں نہ لانے والی ام مریم کے ارد گرد سے اس کے تمام چاہنے والے' اس پر نثار ہونے والے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ تنہا رہ گئی تھی۔ صبح سے رات تک اس کے پاس سوچیں ہی سوچیں ہوتی تھیں۔ کسی کسی پل پچھتاوے بھی ہوتے تھے۔ کاش! وقت ایک بار پھر پیچھے کی طرف چلا جائے کاش! اب کی بار وہ وہ سب کچھ کرے گی' جو پاپا اس سے چاہتے ہیں۔ وہ ممی کا گھر خراب نہیں کروائے گی۔ وہ ممی کے شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کروائے گی۔ وہ پاپا کے پاس لندن چلی جائے گی۔ وہ اپنے اندر وہ سب خوبیاں پیدا کرے گی' جو لیزا میں ہیں۔

وہ لیزا سے کہے گی' وہ اس کی ذہانت لے لے' اس کا حسن لے لے۔ بدلے میں اپنا بہت عام اور معمولی ہونا اسے دے دے۔ اپنا بے وقوف ہونا اسے دے دے۔ کوئی اسے بے وقوف بنائے' اسے استعمال کرے تو اسے پتا بھی نہ چلے۔ اپنا ایسا احمق اور سادہ ہونا اسے دے دے۔

اسے اس کے حسن اور ذہانت کے عوض محمود خالد اور سکندر شہریار دے دے۔ جب وہ لیزا جیسی ہو گی تو ملیں گے ناں اسے محمود خالد اور سکندر شہریار؟ ملیں گی ناں اسے ان دونوں کی محبتیں اور ان دونوں کا ساتھ؟

کاش وہ مریم نہ ہوتی۔ کاش وہ لیزا ہوتی۔ اسے حسن نہیں چاہیے۔ اسے ذہانت نہیں چاہیے۔ اسے لیزا جیسا دل چاہیے۔ وہ لیزا کیوں نہیں؟ وہ لیزا جیسی

کیوں نہیں؟

☼ ☼ ☼

یہ اٹلی میں ان کا آخری دن تھا۔ ان آٹھ دنوں میں وہ دونوں نیپلز، فلورنس، Tivoli سب جگہ گئے تھے جیسے تمام یادوں کو تازہ کر رہے ہوں۔ انہوں نے پہلے ساتھ گئی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ تب روم میں جو جگہیں وہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ لیزا نے اب اسے دکھا دی تھیں۔

وہ لیزا کے فلیٹ پر ہی ٹھہرے ہوئے تھے، جہاں نینی انہیں مزے مزے کے کھانے پکا پکا کر کھلایا کرتی تھیں۔ روبرٹو نے ان دونوں کی اپنے گھر پر دعوت کی تھی۔ وہ ان دونوں کی شادی پر بہت خوش تھا۔

"مجھے تب ہی لگتا تھا، کوئی چکر ہے تم دونوں کے بیچ لیزا جس طرح تمہارے ایکسیڈنٹ پر پریشان ہوئی تھی، تمہیں اپنے گھر لے گئی تھی، میں تب ہی سمجھ گیا تھا، معاملہ گڑبڑ ہے۔" وہ ہنستے ہوئے ان دونوں سے بولا اور جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

آج روم میں اس آخری دن وہ دونوں ٹریوی فاؤنٹین آئے ہوئے تھے۔ لیزا بڑے اہتمام سے پینٹنگ کا سامان ساتھ لائی تھی۔ وہ آج ٹریوی کو پس منظر میں رکھتے ہوئے اس کی پینٹنگ بنانا چاہتی تھی۔

"پھر پانی؟" اس نے مسکرا کر لیزا سے پوچھا۔

"ہاں! پھر پانی سینور سکندر۔" وہ شرارتی انداز میں ہنسی۔

"ہاں میں بھول گیا تھا، تمہیں پانی اور مجھ میں بہت کچھ ایک جیسا لگتا ہے۔" وہ دونوں فاؤنٹین کے نزدیک کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح وہاں سیاحوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

"میں سکہ اچھالوں؟" سکندر نے اس سے پوچھا۔ لیزا ایک طرف اپنا پورٹیبل ایزل سیٹ کر رہی تھی۔

"اچھالو۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ٹھیک ہے! میں سکہ اچھالتا ہوں۔ تم میری تصویر کھینچو۔" اس نے جیب سے والٹ نکال کر ایک سکہ نکالا۔ کسی ٹورسٹ کی طرح کیمرا اس کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے وہ لیزا کو پکڑا دیا۔ وہ بالکل صحیح انداز سے سکہ پکڑ کر کھڑا تھا۔ اس کی پشت فاؤنٹین کی طرف تھی ہاتھ کندھے سے اونچا تھا اور اس میں اس نے مضبوطی سے سکہ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے سکہ پانی میں اچھالا۔ لیزا نے اس کی کئی تصاویر لی تھیں۔ تصاویر لینے کے بعد وہ اس کے پاس آگئی۔

"تم نے کیا خواہش کی؟"

"بتا دوں؟"

"ہاں! بتاؤ ناں۔"

"تم پینٹنگ، روما اور مجھے کبھی بھی نہ چھوڑو۔ یہ دعا کی ہے میں نے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں چاہتوں کے ہزار رنگ جھلملا رہے تھے۔ لیزا کھلکھلا کر ہنسی۔

"جانتی ہو لیزا! تمہارا روما مجھے کیوں پیارا ہے؟" اس نے لیزا کا ہاتھ تھاما۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ لیزا کو اپنا روما بہت پیارا ہے۔ میں تمہارے ساتھ یہاں بار بار آنا چاہتا ہوں لیزا!"

اور لیزا اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبتیں ہی محبتیں پا رہی تھی۔

☼